عکس

از

عمیرہ احمد

پاکیزہ بہنوں

السلام علیکم!

پاکیزہ کے لیے میرا پہلا سلسلے وار ناول اور مجموعی طور پر میری تیسری تحریر ہے۔ تقریباً چار سال بعد میں کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے کوئی ناول لکھ رہی ہوں۔ قارئین سے زیادہ میں خود ایکسائٹڈ ہوں۔ آپ کی توقعات سے واقف ہوں لیکن اب اس کی عادی ہو چکی ہوں۔

اپنے کیریئر کی ایک اسٹیج پر آ کر میں ڈائجسٹ کے لیے مزید نہ لکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن میں اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ پڑھنے والوں کے اصرار، دباؤ، تنقید اور بہت سی دوسری وجوہات نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کروں اور اس نظرِ ثانی کا نتیجہ عکس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

آئندہ آنے والے سالوں میں اگر زندگی رہی تو میں پاکیزہ کے لیے انشاءاللہ تعالیٰ ہر سال باقاعدگی سے کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ڈائجسٹ کے ذریعے مزید شہرت، شناخت یا پیسے کی ضرورت ہے بلکہ صرف اس لیے کہ پاکستان کے بہت سے علاقوں میں لوگ میری تحریریں کتاب کی شکل میں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس کا ادراک مجھے پہلے نہیں تھا۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں واپسی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کا وہ قرض لوٹانا چاہتی ہوں جو انہوں نے عزت، پسندیدگی، ستائش اور نام کی صورت میں مجھے دیا۔

میرے تحریری سفر میں یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایک وقت میں دو مکمل ناولز پر کام کر رہی ہوں۔ درنجات اور عکس...... ورنہ اس سے پہلے میں نے ہمیشہ ایک وقت میں ایک مکمل ناول پر کام کیا ہے۔ درنجات کو میں پہلے شائع کروانا چاہتی تھی لیکن پھر بالکل آخری لمحات میں، میں نے عکس کو پہلے شائع کروانے کا فیصلہ کیا۔

درنجات اپنے موضوعات کے اعتبار سے زیادہ complex اور hard hitting ہے۔ کہانی کا کینوس بھی بڑا ہے تو میں نے سوچا درنجات کی صورت میں seven course meal دینے سے پہلے آپ کو عکس کی صورت میں ایک appetizer دے دیا جائے۔

پاکیزہ کے قارئین کے لیے میرا کام ویسے بھی نسبتاً نیا ہوگا، میرے طرزِ تحریر سے زیادہ متعارف نہیں ہوں گے تو پھر یہ اور بھی بہتر تھا کہ میں آسان سے مشکل کی طرف جاؤں۔ عکس آسان ہے، درنجات مشکل ہے۔

اور اب کچھ عکس کے بارے میں جو آپ انشاءاللہ تقریباً ایک سال پاکیزہ میں دیکھتے رہیں گے۔ عکس میرے مخصوص طرزِ تحریر کی کہانی نہیں ہے۔ آج تک لکھی ہوئی میری تحریروں میں سے میرا سب سے پسندیدہ کردار آپ کو عکس میں ملے گا۔ میں ان رائٹرز میں سے ہوں جنہیں اپنے تخلیق کردہ کردار متاثر نہیں کرتے لیکن یہ پہلا موقع ہے جب مجھے اپنے ایک کردار نے متاثر نہیں انسپائر کیا۔

عکس میں آپ کو اور کیا ملے گا......؟ آپ دیکھیں... کہانی کیا ہے؟ آپ بوجھیں مقصد کیا ہے؟ آپ طے کریں۔ دیکھنا، بوجھنا، بتانا سب آپ پر چھوڑتی ہوں...... ایک پہیلی کی طرح اور میرا دعویٰ ہے آپ اس پہیلی کو نہیں بوجھ سکیں گے جو بوجھ لیں گے وہ حل نہیں کر سکیں گے...... تو آئیں عکس کے ونڈر لینڈ میں چلیں اور محبت اور تعلق کی کچھ نئی بنیادیں، نئی جہتیں کھوجیں۔

اس کائناتِ محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اِک رابطہ مسلسل ہے اِک فاصلہ مسلسل ہے

عمیرہ احمد

عکس

عمیرہ احمد

قسط 01

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

کہاں کے عکس کیسے عکس اور کیا ان کی قیمت
اے میرے شیشہ گر یہ سب تماشا چل رہا ہے
یہ سب کردار اصلی ہیں اور ان کا ماجرا بھی
جو باقی ہے مگر یہ سب تماشا چل رہا ہے

وہ کھلے داخلی دروازے سے اندر جانے کے بجائے وہیں برآمدے میں ہی رک گئی تھی۔ داخلی دروازے کے دائیں طرف یہ ایک Cheval Standing Floor Mirror تھا جس نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔ Oak Tree سے بنا ہوا لیکن آبنوسی رنگت کا وکٹورین اسٹائل کا ایک بہت پرانا Cheval Mirror جس کے ساتھ دونوں اطراف میں ہک تھے۔ اچھی پالش نہ ہونے کے باوجود بے حد اچھی حالت میں تھا۔ فرنیچر میں تھوڑی سی دلچسپی اور پہچان رکھنے والا بھی ایک نظر میں ہی لکڑی کی عمدگی اور اس پر بنے ہوئے ڈیزائن کی نفاست کو جانچ لیتا۔ وہ ایک اینٹک پیس تھا اور کم از کم شہر بانو کی نظر سے چوک نہیں سکتا تھا۔

وہ کچھ تجسس اور دلچسپی کے عالم میں فریم کے پاس آئی تھی۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس نے لکڑی پر بنے ڈیزائن کے نشیب و فراز کو جیسے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پوریں گرد آلود ہوئی تھیں۔ فریم کو یقیناً باقاعدگی سے صرف سرسری انداز میں جھاڑا جاتا تھا۔ اوول شکل کا آئینہ اب شفاف نہیں رہا تھا، اس میں ہلکے ہلکے نشان نظر آرہے تھے یقیناً دوسری طرف موجود کروم اب اپنی مدت پوری کرنے کے بعد فنا پذیر تھا لیکن اپنے وجود پر زمانے کے تغیر و تبدل کے تمام نشانات رکھنے کے باوجود وہ Cheval Mirror کسی بھی آرٹ لور کو سحر زدہ کرسکتا تھا جیسے اس وقت وہ ہو رہی تھی۔

اس نے Cheval Mirror میں اپنے عکس کو دیکھا۔ غیر محسوس طور پر سر پر ٹکائے گلاسز کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے ماتھے پر آئے ہوئے اپنے کچھ بالوں کو دوبارہ سن گلاسز کی مدد سے قابو کرنے کی کوشش کی تھی اور مرر کے سامنے سے ذرا سا ہٹتے ہی اس نے آئینے میں اپنے عقب میں ابھی تک ڈرائیو وے میں کھڑے اپنے عملے کے افراد سے باتیں کرتے شیر دل کو دیکھا تھا۔ وہ رہائش گاہ کے سامنے موجود لان کے حوالے سے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پی اے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ شہر بانو کے برعکس اس کے گلاسز اس کی آنکھوں پر تھے۔ سیاہ ٹراؤزر کے اوپر سفید شرٹ اور سیاہ ہی جیکٹ پہنے وہ casual ڈریس میں ہونے کے باوجود بے حد فارمل حلیے میں لگ رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتے قد کے ساتھ اپنے تیکھے نقوش اور کسرتی جسم کے ساتھ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح picture perfect لگ رہا تھا۔ ڈرائیو وے کی آرچ میں سامنے لان کے داخلی راستے میں کھڑے اس کے چہرے پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ شہر بانو کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ ایک عجیب سے استحقاق نے اسے سرشار کیا تھا۔ آئینے میں نظر آنے والا قابلِ رشک مرد اس کا تھا یا شاید وہ اس کی تھی۔ نہیں..... وہ دونوں ایک دوسرے کے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے تھے۔ وہ عکس جو کسی بھی عورت کی نظر کو بھٹکانے کا باعث بن سکتا تھا صرف اس کا تھا..... شہر بانو کا شیر دل۔

اسے یاد نہیں وہ زندگی میں کتنی بار اسے دیکھ کر فریز ہوئی تھی۔ کتنی بار اس پر فدا ہوئی تھی۔ کتنی بار اسے اپنے آپ پر رشک آیا تھا کہ شیر دل کا نام اس کے نام کا حصہ تھا۔ آئینے میں نظر آنے والا مرد اس کے وجود کو اتنے سالوں سے اسی طرح اپنی انگلی کے گرد لپیٹے ہوئے تھا۔

شیر دل بالآخر مرکزی لان اور وہاں موجود flag pole کے بارے میں ہدایات سے فارغ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی تین سالہ مثال نے اس کی انگلی دوبارہ پکڑ لی تھی۔ شیر دل نے ذرا سا جھک کر بڑی سہولت کے ساتھ مثال کو اٹھا لیا پھر اپنے عملے کے افراد کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اس

cheval mirror کے سامنے کھڑی شہر بانو کو دیکھا۔ شہر بانو تب تک آئینے میں نظر آنے والے اس کے عکس سے نظریں ہٹا چکی تھی۔ اس نے آئینے میں شیر دل کو اندرونی دروازے کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ ذرا سا پلٹ کر وہ شیر دل کے انتظار میں رکی، ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظریں ملیں۔ شیر دل اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ اس گھر میں پہلے آچکا تھا اور وہ جانتا تھا داخلی دروازے کے قریب رکھا یہ آئینہ اس کی بیوی کے قدموں کی زنجیر بننے والا تھا۔ شہر بانو وہاں نہ رکتی تو وہ حیرت سے مر جاتا۔ وہ اپنی بیوی کی پسند ناپسند سے کسی psychic کی طرح واقف تھا۔ اس حد تک کہ وہ اس گھر میں موجود ان تمام چیزوں کی لسٹ بنا کر دے سکتا تھا جن کے سامنے شہر بانو آج رکنے والی تھی..... اور قیام لمبا ہوتا یا چھوٹا وہ یہ بھی بتا سکتا تھا..... نہ صرف یہ بلکہ وہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ اس گھر کی کون کون سی چیز اسے پسند نہیں آنے والی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کی تبدیلی کے انتظامات کر کے آیا تھا۔

"Isn't it beautiful" اس نے شیر دل کے قریب آتے ہی اس کے بازو پر غیر محسوس انداز میں ہاتھ رکھتے ہوئے اس تک اپنی ستائش پہنچائی تھی۔

"It is" شیر دل نے تائید کی۔ اس نے بھی اپنے سن گلاسز اب..... سر پر ٹکا لیے، وہ دونوں اب اس اسٹینڈنگ مرر کے بالکل سامنے ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے۔ مثال کو گود میں لیے وہ ایک خوش و خرم خاندان کا عکس تھا۔ اوول مرر میں ان کا عکس گلے میں پہنے جانے والی کسی لاکٹ میں لگی تصویر کی طرح دکھ رہا تھا۔ مثال نے شیر دل کی گود سے اترنے کے لیے جدوجہد کی۔ شیر دل نے اسے جھک کر نیچے اتار دیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ٹیڈی بیئر کے ساتھ داخلی دروازے سے اندر بھاگ گئی تھی۔

"بہت پرانا لگتا ہے؟" شہر بانو اب اس مرر پر تبصرہ کر رہی تھی۔

"150 سال پرانا تو یہ گھر ہے اور یہاں موجود بہت سا فرنیچر انگریزوں کے زمانے کا ہی ہے۔ استعمال سے زیادہ ڈیکوریشن اور maintainance budget خراب کرنے کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا ہے تب سے شاید....." شیر دل اندر جاتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔ عملے کے افراد نے ایک خوشامدی مسکراہٹ دی تھی صاحب کے اس تبصرے پر..... شیر دل اب اندر چلا گیا تھا۔ شہر بانو بھی اندر داخل ہو گئی۔ داخلی دروازے کو ان کے لیے کھول کر پکڑے ہوئے ملازم نے جیسے سکون کی سانس لی تھی۔ وہ دروازہ پکڑے پچھلے پندرہ منٹ میں وہاں اکڑ گیا تھا۔

وہ ایک راہداری نما کمان کی شکل کا برآمدہ تھا جس میں وہ داخل ہوئے تھے۔ وہ راہداری دونوں اطراف سے آگے گھر کے ان کمروں تک جاتی تھی جن کے دروازے فی الحال ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ پوری راہداری میں قدِ آدم کھڑکیاں تھیں جن کے اوپر پڑی ہوئی آرائشی چقیں اس وقت اٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں اطراف میں مختلف جگہوں پر کرسیاں، تپائیاں اور دیوان پڑے ہوئے تھے۔ وہ راہداری اس ٹپیکل انگلش آرکیٹیکچر کی ایک شاندار مثال تھا جو انگریزوں نے برصغیر میں یہاں کے موسمی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے استعمال کیا تھا۔ اس راہداری کی قدِ آدم کھڑکیوں سے برصغیر کی مون سون اور یورپ کے سن باتھ دونوں سے لطف اندوز ہوا جاسکتا تھا۔

دیواروں پر اب اکثر جگہوں پر سیلن نظر آ رہی تھی، باہر کھڑکیوں اور دیواروں پر چڑھی بیلیں اس کی بنیادی وجہ تھی شاید۔

شہر بانو نے وہاں کھڑے کھڑے ایک ہی نظر میں اس پوری راہداری کا جائزہ لے لیا تھا۔ شیر دل اب داخلی دروازے کے بالکل سامنے اندر مین ہال میں کھلنے والے دروازے کی طرف جا رہا تھا جس کے دونوں پٹ پہلے ہی کھلے تھے اور اس ہال میں دور مثال مٹرگشت کرتی نظر آ رہی تھی۔ اس ہال نما کمرے کے آدھے حصے میں ڈائننگ ایریا تھا اور باقی کا آدھا حصہ سٹنگ ایریا کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔

شیر دل نے ٹھیک کہا تھا وہاں اندر واقعی بہت سے ایسے فرنیچر آئٹمز تھے جو استعمال کرنے سے زیادہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر بانو اب مکمل طور پر awe میں تھی۔ وہ جیسے کسی اینٹک گیلری میں آ گئی تھی۔

''کیا فرنیچر ہے!'' وہ داد دیے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ اب ایک ایک چیز کے پاس جا کر جیسے اسے چھو کر اسے اپنا خراج پیش کر رہی تھی۔

چھت کے درمیان میں ایک فانوس بھی لٹکا ہوا تھا اور سٹنگ ایریا کا فرش کارپٹ اور rugs سے covered تھا۔ وہاں معمولی اضافوں کے باوجود سب کچھ اسی طرح رکھنے کی کوشش کی گئی تھی جیسے وہ کسی زمانے میں ہوتا ہوگا..... آتش دان تھا جہاں اب گیس ہیٹر نظر آ رہا تھا۔ بڑے بڑے روشن دان جو کبھی کھلے رہتے ہوں گے اب بند تھے اور ایک بہت بھاری بھرکم اسپلٹ یونٹ نے ان کے فرائض اپنے ذمے لے لیے تھے سب سے آکورڈ چیز اس ہال کمرے کا ٹائل فلور تھا جو اس کمرے میں داخل ہوتے ہی شہر بانو کی نظر میں آ گیا تھا اور جسے تبدیل کروانے کے لیے شیر دل کے عملے کا ایک آدمی ایک کیٹلاگ لیے وہاں کھڑا تھا۔ ہال کے بالکل سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بے حد کشادہ سیڑھی اوپر والی منزل پر جا رہی تھی۔

''I hate the floor'' شہر بانو نے جیسے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

''And I have tha alteenative'' شیر دل نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''کیٹلاگ ہے پی اے کے پاس اس میں سے ابھی ٹائل سلیکٹ کر لیتے ہیں..... وہ کچن ہے۔'' شیر دل نے اس سے کہتے کہتے دائیں طرف کمرے کے آخری کونے میں موجود ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چلتے کچن میں آ گئے تھے جہاں کام کرنے والا عملہ اب بے حد مستعد کھڑا تھا۔

''اور وہ دروازہ کچن گارڈن اور سرونٹ کوارٹر تک جاتا ہے۔'' شیر دل اسے مزید بتا رہا تھا۔ وہ دونوں اب ساتھ عملے کو کچن کے حوالے سے ہدایات بھی دے رہے تھے۔

ڈی سی آفیسر کے طور پر شیر دل کی وہ پہلی پوسٹنگ تھی..... اس صوبے کے قابل ترین نوجوان آفیسرز میں وہ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ایک بے حد ممتاز مقام رکھتا تھا۔

شہر بانو ابھی تک کچن کا جائزہ لے رہی تھی جو نئے اور پرانے طرز تعمیر کا ایک funny display تھا وہ اس گھر کا واحد حصہ تھا جہاں ضرورت تخلیقی ذوق پر حاوی نظر آ رہی تھی۔ بڑے بے ڈھنگے انداز میں کچن اور pantry میں کیبنٹس اور ریکس کا اضافہ کیا گیا تھا اور مناسب صفائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کیبنٹس اور ریکس کے ساتھ دیواروں اور فرش کا حلیہ بھی خراب تھا۔ بڑے بڑے روشن دان وہاں بھی تھے اور کھانا پکانے والی جگہ

پر ایک بے حد شاندار چمنی بھی..... لیکن شہر بانو کو یقین تھا کہ وہ چمنی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر نہ سہی لیکن بڑی حد تک بلاکڈ ہوگی۔ مکڑی کے جالوں، گرد و غبار اور شاید پرندوں وغیرہ کے گھونسلوں کی وجہ سے بھی جو کچن کے عقب میں دیواروں پر چڑھی بیلوں اور سبزے کی بہتات کی وجہ سے اگر روشن دانوں اور چمنی تک پہنچ گئے ہوں تو یہ ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ چمنی میں چڑیوں کے نہیں چمگادڑوں کے ٹھکانے تھے جن کا سامنا اسے بعد میں ہونے والا تھا۔

چمنی ہی کے حصے میں چولہا رکھنے کی جگہ سے کچھ اوپر دیوار میں ایک ایگزاسٹ فین لگایا گیا تھا جس کی باہر والی جالی چکنائی سے اٹی ہوئی تھی اور دھوئیں سے سیاہ تھی۔ نیچے موجود کوکنگ رینج بہت پرانا تو نہیں تھا لیکن کثرت استعمال اور ناقص صفائی سے وہ بھی اس وقت کم سے کم سو سال پرانا لگ رہا تھا۔ سنک کے پاس ایک جگہ واٹر فلٹر لگا ہوا تھا اور وہ اندر اور باہر سے جتنا گندا لگ رہا تھا اگر کوئی دیکھنے والا فلٹر کا نہیں بلکہ نلکے کا پانی پینے پر اصرار کرتا تو یہ سمجھداری بھی جاتی۔ ایسی ہی کچھ حالت پاس موجود سنک کی تھی۔

کچن میں جو تھوڑی بہت صفائی فی الحال موجود تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ وہاں پچھلے کئی دنوں سے کچھ نہیں پک رہا تھا۔ کم از کم اس کے علاوہ شیر دل کو اور کوئی وجہ نظر نہیں آئی تھی اگر اس کے وزٹ کو anticipate کرتے ہوئے کچھ صاف کرنے کی کوشش کی گئی تھی تو وہ بھی اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ایسے متوقع اور یقینی وزٹ پر سرکاری عملے کی لیپا پوتی کی اس سے کئی بہتر کوششیں دیکھی تھیں..... ملامت اور ڈانٹ پھٹکار کا فی الحال کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ پروگرام بعد میں بھی منعقد کیا جا سکتا تھا فی الحال ضروری تھا کہ کچن میں جو تبدیلیاں مطلوب تھیں، ان کے بارے میں ہدایات دی جائیں سو شیر دل وہی کرتا رہا اور شہر بانو خاموشی سے کچن کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ ہدایات کی صرف یہ پہلی قسط تھی۔ ایسی کئی اقساط آگے چل کر بھی ادا کرنی تھیں اسے اور شیر دل کو..... کیونکہ وہ گھر بلا شبہ شاندار تھا لیکن فرنیچر کے علاوہ وہاں مرمت کے کافی ایشوز تھے۔

''مجھے یہ تو نہیں پتا کہ شہر کی ایڈمنسٹریشن کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ اس شہر میں ہیپاٹائٹس سی کا وائرس پھیلا تو اس کی وجہ سے ڈی سی ہاؤس میں اس کچن میں پکا ہوا کھانا کھا کر جانے والے گیسٹ ہوں گے۔'' شہر بانو نے کچن سے نکلتے ہوئے اپنے عقب میں شیر دل کو کہتے سنا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ وہ شیر دل کے ان ٹنگ ان چیکس ریمارکس کی عادی تھی۔

''ماسٹر بیڈروم کہاں ہے؟'' واپس ہال میں آتے ہوئے اس نے شیر دل سے پوچھا۔

''اوپر.....'' اس نے سیڑھی کی طرف اشارہ کیا۔ شہر بانو حیران ہوئی وہ پہلا سرکاری گھر تھا جس کا ماسٹر بیڈروم اوپر تھا۔

''نیچے کیا بیڈروم ہی نہیں ہیں؟'' اس نے شیر دل سے پوچھا۔

''تین بیڈروم ہیں نیچے لیکن ماسٹر بیڈروم اوپر ہے۔'' وہ ایک بار پھر مثال کو گود میں لیے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ماسٹر بیڈروم ایک وسیع و عریض کمرا تھا لیکن شہر بانو کو اس کی حالت دیکھ کر حیرت ہوئی۔ واضح طور پر وہ

بہت عرصے سے زیر استعمال نہیں تھا۔ فرش، دیواریں، کھڑکیاں، دروازے ہر چیز ابتر حالت میں تھی۔

''یہ کوئی استعمال نہیں کر رہا تھا؟'' شہر بانو نے جیسے کچھ حیرانی سے کمرے میں گھومتے ہوئے شیر دل سے پوچھا۔ کمرے میں برائے نام فرنیچر تھا اور وہ بھی خاصا خستہ حالت میں۔

''نہیں، برہان صاحب صرف نیچے کا فلور ہی استعمال کر رہے تھے...... وہیں کا ایک بیڈ روم ماسٹر بیڈ روم کے طور پر ان کے استعمال میں تھا۔'' شیر دل نے اسے بتایا۔

''یہ ماسٹر بیڈ روم تو بہت عرصے سے کوئی بھی ڈی سی صاحب استعمال نہیں کر رہے...... بند ہی رہتا ہے یہ...... سب لوگ نیچے ہی رہتے رہے ہیں۔'' پی اے نے شیر دل کی بات میں اضافہ کیا۔

''نیچے والے کمرے کیا زیادہ اچھے ہیں......؟'' شہر بانو نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہاں سے وہ آس پاس پھیلے وسیع و عریض لان اور لان سے دور سڑک تک دیکھ سکتی تھی۔ ویو زبردست تھا۔

''نہیں میڈم، وہ زیادہ اچھے تو نہیں ہیں لیکن شروع سے وہی استعمال ہوتے آرہے ہیں۔ وہاں ساری سہولیات ہیں۔ اس کمرے کے باتھ روم میں بھی ابھی پرانے fixtures ہی ہیں...... پھر چھت بھی کبھی کبھار ٹپکنے لگتی ہے اگر زیادہ بارش ہو جائے۔'' شہر بانو اور شیر دل نے پی اے کی بات پر بے اختیار سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ چھت کی حالت واقعی کافی خراب تھی اور وہ بھی کبھار نہیں یقیناً باقاعدگی سے ٹپکتی تھی اور ایک جگہ سے نہیں بلکہ دو تین جگہ سے۔

''اور بھی کچھ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے یہ کمرا استعمال نہیں ہوتا۔'' پی اے نے بات جاری رکھتے ہوئے آخری جملہ کچھ ہچکچا کر کہا۔ شیر دل نے چونک کر اسے دیکھا

''اور کیا وجوہات ہیں؟'' پی اے چند لمحے جیسے کچھ تامل کرتا رہا...... پھر اس نے کہا۔

''اس کمرے میں کچھ اثرات ہیں۔'' شیر دل اور شہر بانو بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''کیسے اثرات......؟'' شیر دل نے ماتھے پر چند بلوں کے ساتھ کہا۔ پی اے نے سر ہلایا۔

''آپ کا مطلب ہے جن بھوت؟'' اس نے پی اے کے جواب سے پہلے ہی کہا۔ پی اے نے سر ہلایا۔ شیر دل نے اور شہر بانو نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

''مجھے تو پہلے نہیں بتایا تم نے یہ؟'' شیر دل نے کچھ تجسس کے عالم میں کہا۔

''میں نے سوچا آپ کو پتا ہی ہوگا۔'' پی اے نے کہا شہر بانو اب جیسے از سر نو اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

''مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے...... اور کیا بیک گراؤنڈ ہے ان جن صاحبان کا...... تنگ کرتے ہیں یا صرف رہائش پزیر ہیں......؟'' شیر دل بھی اب اس کمرے کو ایک نئی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

''جن نہیں ہیں وہ......'' پی اے کچھ ہچکچایا...... شیر دل اور شہر بانو نے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ ''وہ بونے ہیں۔'' پی اے نے بات مکمل کی۔

''بونے......؟'' شہر بانو نے شیر دل کو دیکھا۔

''Dwarfs'' اس نے جواب دیا اور ہنسا۔

''انٹرسٹنگ!'' وہ جیسے اس انکشاف سے لطف اندوز ہوا تھا۔

''تو بونے ہیں اس کمرے میں۔'' اب وہ مسکراتی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پی اے زیادہ سنجیدہ ہوا، اس کی ہنسی پر اسے لگا شیر دل کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

''کتنے بونے صاحبان ہیں یہاں......؟'' شیر دل نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''یہ مجھے تو نہیں پتا...... کتنے بونے ہیں یہاں؟'' پی اے نے وہاں کھڑے گھر کے ایک ملازم سے پوچھا۔

''ٹھیک سے تو نہیں پتا لیکن کہتے ہیں چار پانچ ہیں۔'' اس ملازم نے اس اچانک آنے والے سوال پر کچھ گڑبڑا کر جواب دیا۔

''اور کب سے ہیں یہ یہاں......؟'' شیر دل نے اب براہ راست اس ملازم سے سوال جواب شروع کر دیے۔

''یہ بھی ٹھیک سے نہیں پتا سر جی...... کہتے ہیں ہمیشہ سے ہیں۔'' اختر، شیر دل کے براہ راست سوال سے کچھ اور گڑبڑایا تھا۔

''ہمیشہ سے کب سے؟ جب سے گھر بنا ہے؟'' شیر دل نے بے ساختہ مسکرا کر شہر بانو کو دیکھا، وہ نہیں مسکرائی وہ کچھ متوحش تھی وہ وہمی نہیں تھی لیکن وہ بہرحال ان چیزوں پر یقین رکھتی تھی۔

''جن بھوتوں کا تو میں نے سنا ہے لیکن یہ بونوں کے بارے میں میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ تمہارا کوئی ایکسپیرینس یا انفارمیشن ہے؟'' شہر بانو نے شیر دل کے سوال کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ وہ جانتی تھی وہ سوال نہیں تھا وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ اسے ہورر اسٹوریز پڑھنے کا شوق تھا اور خاص طور پر supernatural چیزوں کے حوالے سے۔

''تنگ کرتے ہیں؟'' شیر دل نے دوبارہ اختر سے پوچھا۔

''جی کبھی کبھی......''

''مثلاً کیا کرتے ہیں؟'' شیر دل نے مزید دلچسپی لی۔

''چیزیں چھپا دیتے ہیں...... آوازیں دیتے ہیں...... اسی طرح کے کام کرتے ہیں......'' اختر کچھ ہچکچا رہا تھا اس کمرے میں کھڑے ہو کر بونوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ جیسے کچھ پریشان تھا۔

''آوازیں دیتے ہیں؟ اچھا......'' شیر دل کو مزید تجسس ہوا۔ ''کسی نے دیکھا ہے انہیں......؟''

''بہت دفعہ۔'' اختر نے بے ساختہ کہا۔

''کس نے؟'' شیر دل سنجیدہ ہوا۔

''گھر میں جو ملازم ہیں انہوں نے دیکھے ہیں کئی بار۔''

''بس اس کمرے میں رہتے ہیں......؟'' شیر دل اب جیسے تفتیش کرنے کے موڈ میں تھا۔

''نہیں، صرف اس کمرے تک نہیں رہتے۔ گھر میں گھومتے پھرتے ہیں خاص طور پر کچن میں۔'' شیر دل، اختر کی سنجیدگی سے کہی بات پر بے اختیار ہنسا۔

''اچھا، کچن میں بھی گھومتے پھرتے ہیں۔''

اس کمرے کے بعد سب سے زیادہ کچن میں ہی اثر ہے ان کا۔'' اختر نے سنجیدگی سے بتایا۔ شیر دل بے حد معنی خیز انداز میں شہر بانو کو دیکھ کر مسکرایا پھر اس نے اختر سے کہا۔

''تو اس کمرے کو صرف بھوتوں کے رہنے کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے......؟'' اختر چند لمحوں کے لیے ہچکچایا پھر اس نے کہا۔

''اس کمرے میں کچھ اور بھی مسئلہ ہے۔'' اس نے بالآخر کہا۔

''اچھا ابھی کچھ اور باقی ہے...... فرمائیں اور کیا مسئلہ ہے اس کمرے کا۔'' شیر دل نے ایک گہری سانس لی۔ اسے ان تمام باتوں میں سے کسی ایک بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن فی الحال وہ ان ملازمین کے ساتھ بحث کے موڈ میں نہیں تھا خاص طور پر شہر بانو کے سامنے۔

''وہ جی...... وہ...... انگریزوں کے زمانے میں کسی ڈپٹی کمشنر کو اس کی بیوی نے قتل کیا تھا یہاں......'' شہر بانو کو جیسے کرنٹ لگا۔۔۔ شیر دل اپنے سوال پر اب پچھتایا..... تجسس یقیناً ایک انتہائی مضر چیز ثابت ہوئی تھی اس کے لیے اب اگر شہر بانو اس گھر میں رہنے سے انکار کر دیتی تو یہ بالکل سمجھداری کی بات سمجھی جاتی۔

''اس کمرے میں قتل کیا تھا......؟'' شیر دل نے اب سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اس کمرے میں نہیں اوپر چھت سے گرایا تھا اس نے اپنے شوہر کو۔'' شیر دل نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''چلو، کم از کم اس کمرے میں تو کچھ نہیں کیا اس نے۔'' شیر دل نے جیسے شہر بانو کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کا جملہ اس کے منہ میں ہی رہ گیا۔

''اس کمرے میں اس نے خودکشی کی تھی۔'' اختر نے باقی بات بتائی، شیر دل نے شہر بانو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اسے جو کچھ بتا رہا تھا اس کے بعد اس کمرے کو بے حد پسند کرنے کے باوجود شیر دل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کمرے میں رہائش اختیار کرنے کا اس کا خواب صرف خواب ہی رہنے والا تھا شہر بانو اب یہ saga سننے کے بعد اگر اس گھر میں رہائش اختیار کرنے پر تیار ہو جاتی تو یہ بھی بہت بڑی فیور ہوتی اس کے لیے، وہ کمرا بھی اب تک اس سے پہلے وہاں آنے والے کسی بھی ڈی سی او نے کیوں استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اب وہ جان گیا تھا۔

''اور قتل کیوں کیا تھا، اب یہ بھی بتا دیں اختر صاحب؟'' شیر دل نے کچھ استہزائیہ انداز میں کہا۔ وہ ہفتہ پہلے اس گھر کا ایک سرسری جائزہ لینے کے لیے یہاں ہو کر گیا تھا اور یہ ماسٹر بیڈ روم اس نے تب بھی دیکھا تھا جب کسی نے اتنی لمبی چوڑی تفصیلات بتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''اس افسر کا کسی عورت کے ساتھ چکر تھا..... اس کی بیوی نے دونوں کو دیکھ لیا تھا پھر اس کے بعد ہی اس نے اپنے شوہر کو قتل کیا۔'' اختر نے سنجیدگی سے کہا

''اس کہانی سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اگر کوئی چکر ہو تو کم از کم بیوی کے ہاتھوں پکڑے نہیں جانا چاہیے۔ برا افسر تھا جو پکڑا گیا..... اچھا افسر ہوتا تو کبھی پکڑا نہ جاتا...... یقیناً وہ اس سزا کا مستحق تھا۔'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے اس بار انگریزی میں تبصرہ کیا تھا جو صرف شہر بانو سن اور سمجھ سکی لیکن وہ بالکل محظوظ نہیں ہوئی تھی۔

''اس عورت کا کیا ہوا؟'' شیر دل نے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے خودکشی کر لی۔'' اختر پیچھے آتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں اس عورت کا پوچھ رہا ہوں جس کے ساتھ اس نے شوہر کو پکڑا تھا۔'' شیر دل نے کہا۔

''پتا نہیں سر اس کا تو مجھے پتا نہیں۔'' اختر گڑبڑایا۔ ''مجھے بس اتنی ہی کہانی آتی ہے۔''

''نہیں پتا تو پتا کر کے بتانا مجھے۔''

''شیر دل!'' ساتھ آتی شہر بانو نے جیسے اسے ٹوکا تھا۔ وہ جانتی تھی شیر دل کو کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا اور وہ اسے گوسپ کے سوا کچھ نہیں سمجھ رہا۔ شیر دل نے مسکرا کر اس کو دیکھا اور کہا۔

"Myths and fabrication" شہر بانو نے کہا۔

"Whatever but that 's what they believe"

''ذرا چھت پر بھی لے جاؤ...... دیکھیں ڈی سی صاحب کہاں سے گرائے گئے تھے۔'' شیر دل نے شہر بانو کی بات کا جواب دینے کے بجائے عملے سے کہا۔ عملے کے لوگوں میں یک دم افراتفری کے آثار پیدا ہوئے، چھت کے دروازے کی چابی ان کے پاس نہیں تھی۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد بھی مسٹر اور مسز ڈی سی او چھت پر جانے کی خواہش کا اظہار کریں گے یا دوسرے لفظوں میں اس کی ہمت کر پائیں گے۔ یہاں مسز ڈی سی او کو تو چھت دیکھنے کا کوئی اشتیاق نہیں تھا لیکن ڈی سی او صاحب اگر چھت دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہے تھے تو اس کی وجہ جائے وقوع کے نظارے کی خواہش سے زیادہ چھت کے معائنے کی خواہش تھی اگر اوپر والی منزل کی چھت پچھلے کئی سالوں سے اس لیے ٹپک رہی تھی کیونکہ وہاں کوئی رہائش پذیر نہیں تھا تو 150 سال پرانی چھت کی یقیناً مناسب مرمت بھی نہیں کی جا رہی ہو گی اور زیادہ مخدوش ہو جانے پر وہ heavy چھت پورے مون سون میں زمین بوس بھی ہو سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے تک گھر میں چھت کی چابی کی تلاش کے لیے بھگدڑ مچی رہی اور جب عملے کو یقین ہو گیا کہ شیر دل کا چھت دیکھے بغیر ٹلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا تو بالآخر چابی برآمد ہو گئی۔ شیر دل اس دوران بڑے اطمینان سے دو کرسیاں منگوا کر شہر بانو کے ساتھ ماسٹر بیڈ روم میں بیٹھا اپنے پی اے کے ساتھ مل کر ٹائلز کی کیٹلاگ دیکھتا رہا، شہر بانو بری طرح بیزار بیٹھی رہی لیکن اس نے شیر دل کو وہاں سے چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس کا فائدہ بھی نہیں تھا شیر دل وہاں سے جانے والا تھا بھی نہیں۔ شادی کے شروع کے دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیر دل اپنے پروفیشنل معاملات میں اس کی رائے کو نہ تو اہمیت دیتا تھا اور نہ ہی پسند کرتا تھا۔ شہر بانو نے کبھی اس کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی وہ زندگی میں کبھی کوئی ایسا کام کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی جو شیر دل کو ناپسند ہوتا۔ وہ اس سے ڈرتی نہیں تھی، وہ صرف پاگل پن کی حد تک اس کے عشق میں مبتلا تھی۔

عملے کے افراد نے چابی کی تلاش کے دوران چند بار شیر دل کو باقی گھر دکھانے کے لیے آمادہ کرنے کی

کوشش کی تھی۔
"باقی گھر چھت کے بعد۔" شیر دل کا جواب دوٹوک تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک بار وہ اسے اوپر والی منزل سے نیچے لے گئے تو پھر وہ نیچے اس کا اتنا وقت ضائع کرائیں گے کہ وہ یاد رہنے کے باوجود اوپر نہیں آپائے گا۔ اپنی سرکاری ملازمت کے دوران وہ ماتحت عملے کے سارے ہتھکنڈوں اور حربوں سے واقف ہو چکا تھا۔

جس چابی کی تلاش میں آدھا گھنٹا لگا تھا چھت کا تالا اس سے نہیں کھلا تھا۔ وہ زنگ آلود ہونے کے باعث توڑ کر کھولا گیا اور چھت پر پہلا قدم رکھتے ہی شیر دل کو پتا چل گیا تھا کہ عملہ چھت کو اس سے چھپانے کی کوشش میں کیوں مصروف رہا تھا۔ وہ چھت نہیں تھی جڑی بوٹیوں، جھاڑیوں، گھاس پھونس کا ایک جزیرہ نما جنگل تھا سردیوں کے موسم کے باوجود چھت پر کائی کی تہیں تھیں کئی جگہوں پر وہ کائی جیسے دلدل جیسی شکل اختیار کر گئی تھی اور کائی سے بھری ہوئی چھت پر جگہ جگہ مختلف جھاڑیوں نما پودے اگے ہوئے تھے۔ وہ کس طرح وہاں اگ آئے تھے اس کا جواب سائنس دے سکتی تھی یا وہ سرکاری عملہ جن کے تعاون سے وہ نباتاتی گارڈن وہاں معرض وجود میں آیا تھا۔

شیر دل دو قدم سے آگے نہیں بڑھا۔ وہ اپنے جوتوں کا ستیاناس نہیں مار سکتا تھا اور اسے یقین تھا کہ کائی اور گھاس پھونس کے اس جزیرے میں ہر طرح کے حشرات الارض بھی ہوں گے اگر سانپ وغیرہ پائے جاتے تو بھی اسے حیرت نہیں ہوتی۔

"اگلی بار جب میں اس گھر میں آؤں گا تو سب سے پہلے چھت پر آؤں گا۔" اس کے اعلان میں کیا تنبیہہ تھی اس کا ماتحت عملہ جانتا تھا۔

"ماسٹر بیڈ روم میں استعمال کروں گا اور چھت اب لاک نہیں ہوگی۔" وہ یہ کہتے ہوئے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ شہر بانو اس سے پہلے ہی نیچے اتر رہی تھی اور اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا جملہ سن لیا تھا۔ وہ کسی صورت اس بیڈ روم میں رہنے کو تیار نہیں تھی۔ وہاں بو نہ ہوتے نہ ہوتے لیکن یہ دوسرا قصہ اس کا دل اٹھانے کے لیے کافی تھا۔

پی اے نے ٹھیک کہا تھا نیچے والے بیڈ رومز بے حد اچھی حالت میں تھے۔ وہاں تمام جدید سہولیات میسر تھیں اور شہر بانو نے بھی وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس نے فی الحال شیر دل سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔

گھر سے باہر نکلتے ہوئے شہر بانو اتنی خوش نہیں تھی جتنی وہ اندر جاتے ہوئے ہوئی تھی۔ بلاشبہ وہ گھر بہت شاندار طرز تعمیر کا حامل تھا اور آرکیٹیکچر شہر بانو کا میجر رہا تھا۔ وہ آرکیٹیکچر نہ بھی پڑھتی تب بھی اسے جنون کی حد تک اس سبجیکٹ میں دلچسپی تھی خاص طور پر راج کے زمانے میں بنائی جانے والی برصغیر کی پرانی عمارتوں میں۔

"بابا میرا ٹیڈی......" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مثال نے یک دم شیر دل سے کہا وہ چونکا۔

"ٹیڈی کہاں چھوڑ دیا تم نے؟" اس نے مثال سے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔" جواب آیا تھا۔ عملے کے چند ارکان اندر دوڑے گئے تھے اور پندرہ منٹ ہر جگہ تلاش

کے باوجود وہ ٹیڈی کہیں نہیں ملا تھا۔

"Leave it miso ... baba will get you another tedy" شہر بانو نے بالآخر اس تلاش سے کچھ بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ مثال بڑی آسانی سے راضی ہو گئی تھی۔

"Miso is a good girl" ریسٹ ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے شیر دل نے مثال کو بہلاتے ہوئے کہا۔

"Yes Miso is a very good girl" شہر بانو نے مسکرا کر مثال کو دیکھا جو شیر دل کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی ضد نہیں کرتی اب۔" شہر بانو نے کہا۔

"Baba I think I know who took my toy" مثال نے ان کے جملوں کے جواب میں یک دم بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"who?" شیر دل نے پوچھا۔

"There was a boy there, he was asking for my tedy, he wanted to play with it"

"I didn 't see any boy there" تم نے کہاں دیکھا؟" شیر دل نے کچھ حیران ہو کر کہا۔

"In the kitchen" مثال نے کہا۔

"When?" شیر دل حیران ہوا۔

"When I went in to that small room next to the kitchen"

مثال نے ہاتھ کے اشارے سے لوکیشن سمجھانے کی کوشش کی شہر بانو سمجھ گئی وہ pantry کا ذکر کر رہی تھی۔ یقیناً وہ وہیں ٹیڈی بھول آئی تھی۔

"شاید کسی سرونٹ کا کوئی بچہ ہوگا۔" شہر بانو نے شیر دل سے کہا۔

"سرونٹ کے بیوی بچے کہاں سے آ گئے مشکل سے ملازموں کو ہی اکاموڈیٹ کیا ہوتا ہے۔ دیکھوں گا میں۔" شیر دل نے شہر بانو کو جواب دیا۔

"He was very ugly" مثال اب بھی بول رہی تھی۔

"who?" شیر دل پھر چونکا۔

"That boy" مثال نے سنجیدگی سے کہا۔

"No, that's not nice" شہر بانو نے اسے ٹوکا۔

"Mummy he was really ugly" مثال نے جیسے احتجاج کیا۔ "And very Small" مثال نے اضافہ کیا۔

"How small?" شیر دل نے پوچھا۔

"Only this much" مثال نے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے جیسے اس لڑکے کی جسامت بتائی۔ وہ تقریباً ایک فٹ کا سائز بتا رہی تھی۔ شہر بانو ہنس دی۔

"تمہاری بیٹی اور اس کی Fairy tales۔" شہر بانو نے شیر دل پر طنز کیا۔ مثال کہانیاں سنانے کی

عادی تھی اور شیر دل اس کی کہانیاں شوق سے سنتا تھا۔ شیر دل مسکرایا۔

"And then he disappeared" شیر دل نے مثال کے اگلے جملے پر دھیان دینے کے بجائے شہر بانو سے کہا۔

"تمہیں گھر کیسا لگا ہے؟"

"میرا خیال ہے ریسٹ ہاؤس پہنچ کر بات کرتے ہیں۔" شہر بانو نے جیسے شیر دل کو ڈرائیور کی موجودگی کا احساس دلایا۔ شیر دل کو اسی جواب کی توقع تھی...... یعنی شہر بانو کو اعتراضات تھے شیر دل نے بے اختیار گہری سانس لی۔

☆☆☆

کاؤنٹر پر پڑا شیشے کا گلاس بہت آہستگی سے کاؤنٹر پر سرک رہا تھا۔ سبزی والی ٹوکری میں سے ٹماٹر اٹھاتے ہوئے وہ ٹھٹکی تھی۔ شیشے کے اس گلاس میں پانی پی کر تھوڑی دیر پہلے اسی نے ہی اسے کاؤنٹر پر رکھا تھا۔ گلاس ابھی بھی آدھا پانی سے بھرا ہوا تھا اور کاؤنٹر پر حرکت کرنے سے وہ پانی مسلسل ہل رہا تھا۔ خیر دین آٹا گوندھتے ہوئے ابھی بھی اسے قصہ سنانے میں مشغول تھا۔

"تو پھر صاحب نے مجھے کہا خیر دین میں نے تم سے اچھا خانساماں آج تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں آٹھ شہروں میں پوسٹ رہا ہوں...... لیکن جیسی دال تم بناتے ہو میں نے آج تک کہیں اور نہیں کھائی...... اگر پورے پاکستان میں بیسٹ دال پکانے کا مقابلہ ہو جائے تو تم کو پہلا انعام ملے گا۔ تمہاری دال کے سامنے کسی کی دال نہیں گلے گی۔" وہ قصہ سناتے ہوئے آٹے کی پرات پر مکمل طور پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے اپنی بات پر خود ہی ہنسا۔ اس نے نوٹس نہیں کیا تھا کہ چڑیا نہ تو اس کی طرف متوجہ تھی نہ ہی اس کی بات سن رہی تھی۔

وہ اچنبھے کے عالم میں بس اس گلاس کو دیکھ رہی تھی جو کاؤنٹر پر خود ہی حرکت کر رہا تھا...... یا شاید چل رہا تھا۔ اس کے ننھے ذہن نے اس کی حرکت کو نام دینے کی کوشش کی۔ اس دن اس کی ٹیچر نے اسکول میں یہی سکھایا تھا ہر ایکشن کے لیے درست لفظ کا استعمال کرنے کی کوشش...... ہر حرکت کا ایک خاص نام بھی ہوتا ہے۔

"The glass is moving" اس کے ننھے ذہن نے اس حرکت کرتے ہوئے گلاس پر پہلی نظر ڈالتے ہوئے بے اختیار سوچا تھا اور پھر وہ اس موومنٹ کے لیے لفظ کی تلاش میں مشغول ہو گئی۔

"The glass is walking" اپنے محدود علم اور ذخیرہ الفاظ کا استعمال اس نے گلاس کی حرکت کو نام دینے کے لیے کیا اور اس کے دماغ نے جیسے اسے ریڈ سگنل دیا۔

"واک تو زندہ چیزیں کرتی ہیں۔" اس وقت پہلی بار اس کا ذہن گلاس کی حرکت کو نام دینے کی جدوجہد سے ہٹ کر اس بات پر اٹکا کہ ایک بے جان چیز "واک" بھی کیسے کر رہی تھی۔ وہ اب بے جان اور جان دار چیزوں کی خصوصیات کو Skim کر رہی تھی۔ چند سیکنڈز میں اس کے ذہن نے Skinming اور screening کے بعد گلاس کو بے جان کی کیٹگری میں ہی ڈالا...... اور تب اس نے اپنے ذہن کو جیسے اس اچنبھے کا شکار ہونے کی اجازت دی جس کا شکار وہ اس وقت تھی۔

"گلاس تو بے جان ہے پھر یہ حرکت کیسے کر رہا ہے؟" یہ سوال تھا جو اس وقت اسے کنفیوز کر رہا تھا اور کنفیوز کرنے سے زیادہ اسے متجسس کر رہا تھا۔ "کیا کوئی ایسی حالت ہوتی ہے جس میں بے جان گلاس بھی حرکت کر سکتا ہے......؟" اس کا ذہن اب جیسے کوئی نئی دریافت کرنا چاہ رہا تھا...... اور وہاں کھڑے اس پُراسرار انداز میں حرکت کرنے والے گلاس اور اس کے اندر تھرکتے پانی کو دیکھتے ہوئے چڑیا کو خوف یا دہشت نام کی کوئی چیز محسوس نہیں ہوئی تھی...... محسوس ہونا تو دور کی بات تھی اس نے خوف نامی عنصر کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی جگہ کوئی بڑا اچانک ایک گلاس کو اس طرح حرکت کرتے دیکھ لیتا تو یا تو چیخیں مارتے ہوئے اس کچن سے بھاگ جاتا یا پھر پورے گھر کو وہاں اکٹھا کر لیتا مگر کوئی بھی اس کی طرح وہاں کھڑے اپنے آج کے سبق کو اس گلاس پر اپلائی کرنے کی کوشش نہ کر رہا ہوتا۔

"صاحب نے جب کمشنر صاحب کو کھانے پر بلایا تھا تب بھی انہوں نے خاص طور پر مجھ سے وہ دال پکوائی۔ کمشنر صاحب کو اتنی پسند آئی کہ وہ پچاس روپے انعام دے کر گئے مجھے، ان کی جو بیگم صاحبہ تھیں انہوں نے تو باقاعدہ ترکیب لکھوائی مجھ سے۔" خیر دین اب بھی مگن انداز میں آٹا گوندھتے ہوئے دال نامہ سنا رہا تھا۔

"کہہ رہی تھیں کہ کسی رسالے میں بھی بھیجیں گی وہ اس دال کی ترکیب کو...... میں نے بھی کہا بیگم صاحبہ جہاں مرضی چھپوا لیں جو ذائقہ خیر دین کے ہاتھ کا ہے وہ خیر دین کی پکی ہوئی دال میں ہی ملے گا اور......"

"نانا کوئی گلاس چل سکتا ہے کیا خود ہی؟" چڑیا نے ایک دم خیر دین کو ٹوکا، وہ اب اپنے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کترتے ہوئے بے حد الجھے انداز میں گلاس پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ یوں جیسے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

"ہیں...!" خیر دین آٹا گوندھتے گوندھتے گڑبڑایا۔ اس نے چڑیا کو دیکھا اس کو لگا اس نے سننے میں کوئی غلطی کی تھی۔

"کیا پوچھ رہی تھیں تم؟" اس نے چڑیا کی نظروں کا تعاقب کیے بغیر صرف ایک نظر اسے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا کوئی گلاس چل سکتا ہے؟" چڑیا نے اسی سنجیدگی کے ساتھ گلاس پر نظریں جمائے سوال دہرا دیا۔ خیر دین بے اختیار ہنسا یوں جیسے وہ چڑیا کے سوال سے بے حد محظوظ ہوا ہو۔

"لو بھلا، گلاس کیسے چل سکتا ہے؟ گلاس کوئی زندہ تھوڑی ہوتا ہے۔" وہ دوبارہ آٹا گوندھنے لگا۔

"ہو سکتا ہے کوئی گلاس زندہ ہوتا ہو۔" اس بار خیر دین اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسا تھا لیکن آٹا گوندھتا رہا۔

"نہیں بیٹا، کوئی بھی گلاس زندہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی چل سکتا ہے۔" اس نے بڑی محبت سے چڑیا کے سوال کا جواب دیا وہ سارا دن یہی ایک کام کرتا تھا...... صبح سے لے کر رات تک چڑیا کے سوالوں کا جواب دیتا رہتا تھا اور یہ اس کی زندگی کا پسندیدہ ترین کام تھا اس سے وہ کئی گنا زیادہ شوق سے اس کے سوالوں کا جواب دیتا تھا جتنے شوق سے وہ اپنی مشہور زمانہ دال بناتا تھا۔

وہ اس کی اکلوتی نواسی تھی...... اس کی اکلوتی بیٹی کی اکلوتی اولاد حلیمہ کے دوسرے شوہر سے زندہ بچ جانے والی واحد اولاد حلیمہ اور خیر دین کی متاعِ حیات۔

پنجاب کا ایک پسماندہ گاؤں خیر دین کا آبائی علاقہ تھا اور وہ اس علاقے سے دس جماعتیں پڑھنے والا تو

پہلا لڑکا نہیں تھا لیکن سرکاری ملازمت میں آنے والا پہلا آدمی ضرور تھا اور وہ سرکاری ملازمت بھی ڈپٹی کمشنر کے گھر کا مالی...... تقرر نامہ ملتے ہی گاؤں میں خیر دین کے گھر کا اسٹیٹس ہی بدل گیا تھا۔ وہ ذات کا لوہار تھا اور گاؤں کا کمی کمین اور سارا بچپن اور نوعمری اس نے گاؤں کے کمی کمین کی حیثیت سے چوہدری، نمبردار، پٹوری اور اونچی ذات اور زمینوں والوں کی رعایا کے طور پر ان کی جی حضوریوں ہی میں گزاری تھی گاؤں میں تھانے دار نہیں تھا ورنہ ان کے آقاؤں میں ایک اور اضافہ ہو جاتا اور ویسی زندگی اس نے اپنے ماں باپ اور ددھیال ننھیال کے لوگوں کو گزارتے دیکھی تھی۔ ان کے گھر کا راشن فصلوں کی کٹائی سے ملنے والے دانوں سے نکلتا تھا اور اس گاؤں میں ان کی زمین بس ایک کنال کا وہ احاطہ تھا جس کے ایک کونے میں اس کے باپ نے لوہے کے اوزار بنانے اور مرمت کرنے کی بھٹی لگا رکھی تھی اور دوسرے کونے میں ماں نے دانے بھوننے کی اور تیسرے کونے میں ایک گدھے، دو بھینسوں، چار بکریوں پچیس مرغیوں، تین کتوں، چار بلیوں، آٹھ بطخوں اور خرگوشوں کے تین جوڑوں کا ایک خاندان آباد کیا گیا تھا اور احاطے کے چوتھے کونے میں چار کمروں، برآمدے اور دالان پر مشتمل ان کا گھر 21 افراد کے زیر رہائش تھا جن میں خیر دین کے دس بہن بھائیوں کے علاوہ دادا دادی اور کچھ ددھیالی رشتے دار بھی شامل تھے اور اکیس افراد کے اس کنبے کو رزق فراہم کرنے کی مستقل ذمے داری صرف خیر دین کے ماں باپ پر تھی۔

ان اکیس افراد میں خیر دین واحد خواندہ تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور خیر دین کے ماں باپ کی دوسری اولاد سات سال بعد ہوئی تھی تو وہ سات سال اپنے محدود وسائل اور غربت کے باوجود خیر دین نے بادشاہ کی طرح گزارے تھے۔ اس کے ماں باپ کو اسے پڑھانے کا شوق گاؤں میں انگریزوں اور ان کے ساتھ آنے والے سوٹ بوٹ میں ملبوس ان ہی کی طرح گٹ پٹ کرنے والے ہندوستانیوں، کالے انگریزوں اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر ہوا تھا۔

''میں نے تو اپنے خیر دین کو پڑھا لکھا کر افسر بنانا ہے۔'' خیر دین ابھی دو سال کا تھا جب اس کی ماں نے ایک دن ڈپٹی کمشنر کے دورے کے بعد خیر دین کے باپ کے سامنے اعلان کیا تھا۔

''یہ تیری میری طرح بھٹی میں نہیں جھونکے گا اپنی زندگی... افسر بنے گا، جیپ میں آیا کرے گا...... اس کے ساتھ بندوقوں والے سنتری ہوں گے اور جو بھی اس سے ملنے آئے گا وہ پہلے کئی کئی گھنٹے انتظار کرے گا پھر لائن میں لگے گا پھر میرے بیٹے کو ملے گا۔'' خیر دین کا باپ حقے کی نے اپنے منہ میں دبائے بیوی کے خیالی پلاؤ سن سن کر ہنستا رہا۔ ان کے گاؤں کے پاس سے نہر گزاری جا رہی تھی اور اس کی تعمیر و توسیع کے سلسلے میں ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی سرکاری افسر اپنے چھتے کے ساتھ وہاں آن موجود ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ان دوروں کے عادی ہو گئے تھے۔ انگریز کا زمانہ تھا اس لیے افسروں کی بڑی تعداد انگریزوں ہی کی تھی۔ ہندوستانی صرف ان کے ماتحت کے طور پر دم ہلاتے ان کے ساتھ چلتے پھرتے رہتے صرف ایک بار ایک ہندوستانی افسر وہاں آیا تھا اور گاؤں میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس ہندوستانی افسر کے پاس ہاجرہ بی بی بھی پہنچی تھی اور واپس آتے ہوئے دو سال کے خیر دین کو اٹھائے وہ طے کر چکی تھی کہ خیر دین نتھو لوہار کی بھٹی نہیں سنبھالے گا بلکہ وہ دفتر میں کام کرے گا۔ گدھے اور ریڑھے پر سفر کرتے اپنی زندگی نہیں گزارے گا بلکہ اس ہندوستانی افسر کی شاندار جیپ میں بیٹھ کر کہیں بھی آیا جایا کرے گا۔

سات سال تک نتھو لوہار اور ہاجرہ بی بی یہ خواب پالتے رہے ایک ایک ٹکا بچا کر خیر دین کو تعلیم دلوانے کی کوشش کرتے رہے پھر ساتویں سال دوسرے بچے اور اس کے بعد ہر سال ایک بچے کی پیدائش نے ہاجرہ اور نتھو کے ذہن سے اسٹیٹس تبدیل کرنے کے بھوت کو نکال کر بھوک کے جن کو ان کے پیٹ میں قید کر دیا تھا لیکن خیر دین تب تک بگڑ چکا تھا...... ماں باپ کے دھکے، گالیاں، گھونسے کھانے کے باوجود وہ بستہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا لیکن دس دس میل دور پیدل اسکول جانے کے لیے تیار تھا۔

ملازمت کی تلاش اس نے دفتر میں شروع کی تھی اور یقیناً اسے مل جاتی لیکن ڈپٹی کمشنر کے گھر میں مالی کی نوکری کے لیے اس نے دفتر میں کلرکی چھوڑ دی تھی۔ یہ اس کی ماں کا خواب تھا اور وہ جیسے اپنی ماں کے خواب کی تعبیر کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اگر انگریزی زبان اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنتی تو وہ مالی کے بجائے اس گھر کا صاحب بننے کی کوشش بھی کرتا لیکن انگریز نے برصغیر کے عوام کو پاور اور اتھارٹی سے دور رکھنے کے لیے انگریزی زبان کی باڑ رعایا اور حاکم کے درمیان لگائی تھی۔ کسی زمین پر نہیں لگائی تھی، ذہن میں لگا دی تھی یہ جیسے پول والٹ کا پول تھا بلندی تک پہنچنے کا واحد ذریعہ۔

اور خیر دین کے ساتھ وہی ہوا تھا جو ہو سکتا تھا...... ڈپٹی کمشنر کے گھر ہیڈ مالی کے ساتھ کام کا آغاز کرنے میں اس کی دس جماعتوں سے زیادہ اس کی گاؤں میں کھیتی باڑی کا تجربہ کام آیا تھا۔ وہ اس ضلع کا پہلا اور واحد فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس مالی تھا اور چند مہینوں میں اس نے اپنی محنت اور ذہانت سے صاحب کا اعتماد جیت لیا تھا۔ مالی کا کام کرتے کرتے وہ صاحب کے کچن میں پارٹ ٹائم خانساماں کے فرائض بھی انجام دینے لگا...... شروع میں اس نے بیرا گیری کی اور خانساماں کے معاون کے طور پر کام کرتا رہا لیکن پھر ایک وقت آیا کہ جس دن خانساماں چھٹی پر ہوتا اور خیر دین کھانا بنا کر ٹیبل سجاتا...... کھانے کی میز کی شکل ہی کچھ اور ہوتی، کھانے کے ذائقے کی تو خیر بات ہی الگ تھی...... صاحب نے اس کو پھر آؤٹ آف داوے پرموشن دینے میں دیر نہیں کی تھی۔

خیر دین گھر کے باہر سے گھر کے اندر آ گیا تھا...... وہ گاؤں میں فخر یہ سب کو بتاتا تھا کہ وہ سارا دن ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں گزارتا ہے...... اتنا وقت جتنا صاحب بھی نہیں گزارتا...... چند اور مہینوں میں خیر دین نے جیسے ڈپٹی کمشنر ہاؤس کا حلیہ بدل کر رکھ دیا۔ وہ صاحب اور بیگم صاحبہ کا رائٹ ہینڈ مین تھا جس پر اب وہ اندھا اعتماد کرتے تھے...... خیر دین اب خانساماں نہیں بٹلر تھا...... وہ انگریزی زبان جو وہ تعلیم حاصل کرنے کے دوران کہیں سے نہیں سیکھ سکا تھا وہ اس نے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر اور اس کی میم صاحب سے سیکھی تھی اور دو سال کے دوران وہ انگریزی اس لہجے میں بولنے لگا تھا جس میں صرف لندن کے west end میں رہنے والے بولتے۔ وہ کوئک لرنر تھا اور اپنی اس کوالٹی کی وجہ سے اپنے صاحب کا چہیتا تھا کیونکہ یہ خصوصیت ہندوستانیوں میں بہت کم پائی جاتی تھی۔

گاؤں میں اب خیر دین کے گھر کے باہر اس کی نیم پلیٹ تھی جس پر خیر دین کے نام کے نیچے اس کی designation اور اس کی مختصر سی designation کے نیچے اس کے صاحب کا نام اور صاحب کی designation کی تفصیلات مع صاحب کے سرکاری گھر اور سرکاری دفتر کے موجود تھیں اور اس نیم

چلپیٹ نے خیر دین کے خاندان کو کمی کمین نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ اب انگریز کا ملازم تھا۔' ' اسے گاؤں کے ہر اونچی ذات کے چوہدری، برہمن، بنیے، پٹواری کے سامنے جھکنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

وہ اس گاؤں کا پہلا اور خاص طور پر اپنی برادری کا پہلا رول ماڈل تھا۔ بد قسمتی سے اور روایتی طور پر اس کے اپنے بہن بھائیوں میں سے کوئی اور ایک بھی اس رول ماڈل سے انسپائر ہو کر اس کے نقشِ قدم پر چلنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ ان کے بڑھا نکلنے کو بڑے بھائی کا اسٹیٹس کافی تھا۔ اس کے چھ کے چھ بھائی پہلی دوسری جماعت سے ہی اسکول چھوڑ آئے تھے اور بہنوں کو تو خیر اس زمانے میں تعلیم دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خیر دین کے بھائیوں کے لیے یہ بہت کافی تھا کہ بڑا بھائی کچھ بن گیا تھا اور وہ اس کے فخر کو اپنے سینے پر میڈل کی طرح لگا کر پھرتے رہتے تھے۔ خیر دین اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ گھر ہی بھیجتا تھا اور اس آمدنی نے اس کے گھر کی حالت تو بہتر کرنا شروع کر دی لیکن خود اس کے خاندان میں سے بہت سوں نے کمانا چھوڑ دیا۔ خیر دین کو بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ ماں باپ کی بھٹیوں پر نہ بیٹھنے کے باوجود بھی اسے اپنی زندگی کو محنت کی بھٹی میں جھونکنا ہی تھا۔

سترہ سال کی عمر میں صاحبِ روزگار ہوتے ہی اس کی شادی ہو گئی تھی۔ خیر دین کو اسی مالی نے اپنا داماد بنا لیا تھا جس کے ساتھ خیر دین نے کمشنر کے گھر میں نوکری شروع کی تھی۔ اس کا سسرالی گاؤں اس کے شہر سے قریب تھا اور طور طریقوں کے اعتبار سے اس کے اپنے گاؤں سے زیادہ بہتر حالت میں تھا۔ اس کی بیوی اختری بی بی بھی کئی حوالوں سے اس کے لیے بے حد خوش قسمتی اور ترقی کا باعث بنی تھی۔ شہر میں آتے جاتے رہنے کی وجہ سے پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود اختری کو اوڑھنے پہننے کا سلیقہ تھا اور وہ اور خیر دین آگے بڑھنے کے لیے ایک جیسا passion رکھتے تھے۔ ان کی صرف ایک بیٹی ہوئی تھی حلیمہ اور خیر دین نے اپنے خاندان کے دباؤ کے باوجود مزید اولاد نہ ہونے پر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس نے حلیمہ کو دسویں تک تعلیم دی...... خیر دین کی طرح وہ بھی اپنی برادری میں دس پاس کرنے والی پہلی لڑکی تھی اور پھر خیر دین نے اس کی شادی اپنے خاندان سے آنے والے تمام رشتوں کو چھوڑ کر ایک سرکاری دفتر کے اردلی سے کی تھی۔ چھ ماہ میں وہ سرکاری اردلی طاعون کی وبا کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا اور تب خیر دین کے ہی ایک اور اچھے صاحب نے اپنی کوشش سے حلیمہ کی دوسری شادی اپنے ڈرائیور سے کروائی تھی۔ خیر دین کو اپنی طرح اپنی بیٹی کی قسمت پر بھی رشک آتا تھا۔ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کے ذاتی ڈرائیور کی بیوی تھی اور اس کا شوہر شادی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اسے بھی اپنے سرکاری کوارٹر میں لے آیا تھا۔

چڑیا کی پیدائش ایک ڈپٹی کمشنر ہاؤس کے کوارٹر میں ہوئی تھی جہاں اس کا باپ ڈرائیور اور اس کی ماں ڈپٹی کمشنر کے بچوں کی آیا تھی۔ شادی کے چار سالوں میں چڑیا کے بعد حلیمہ کے ہاں وقفے وقفے سے دو مرتبہ اولادوں کی ولادت ہوئی اور دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا۔ شادی کے چوتھے سال اس کا شوہر نہر میں نہاتے ہوئے ڈوب گیا...... حلیمہ کا گھر دوسری بار اجڑ گیا تھا۔ دو بیٹوں کی موت نے جو زخم لگائے تھے شوہر کی موت نے انہیں انمٹ کر دیا تھا لیکن بہر حال حلیمہ کا شوہر کوئی بہت آئیڈیل شوہر نہیں تھا اس کے رزق کا وسیلہ اور سائبان اس کی وفات کے فوراً بعد اس ڈپٹی کمشنر کی بیرون ملک ڈیپوٹیشن آگئی تھی۔ حلیمہ باپ کے کوارٹر میں نہیں رہ سکتی تھی۔ شاید صاحب اور ان کی بیوی اسے رہنے کی اجازت دے ہی دیتے لیکن اب وہ

سرکاری رہائش گاہ کسی اور کے زیر استعمال آگئی تھی۔ حلیمہ، چڑیا کو لے کر مجبوراً گاؤں چلی گئی۔ چڑیا اب خیر دین اور حلیمہ کی زندگی کا محور تھی اور خیر دین کے لیے اس سے الگ رہنا بے حد مشکل تھا۔ نیا صاحب اور اس کی بیوی نوکروں سے بہت فاصلہ رکھتے تھے اور خیر دین کسی بھی طرح اپنے سرکاری کوارٹر میں حلیمہ اور چڑیا کو لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

تبھی خیر دین اور حلیمہ کی قسمت کے ستارے ایک بار پھر گردش سے باہر آئے۔ خیر دین نے کسی زمانے میں ایک ڈپٹی کمشنر کے ساتھ کام کیا تھا جو بعد میں دوسرے صوبے میں چلا گیا تھا لیکن اسی دوران وہ دوبارہ پوسٹ ہو کر اسی ڈویژن میں آگیا اور اس نے وہاں پوسٹ ہوتے ہی خیر دین کی اپنی سرکاری رہائش میں ٹرانسفر کروالی تھی نہ صرف یہ بلکہ ان میاں بیوی نے حلیمہ کو بھی ایک بار پھر بچوں کی آیا کے طور پر رکھ لیا تھا۔

وہ تین سال چڑیا کی زندگی کے سب سے اہم سال ثابت ہوئے تھے۔ چڑیا نے اپنی ابتدائی تعلیم ماں اور نانا سے حاصل کی تھی۔ وہ خیر دین کی طرح بے حد ذہین اور کوئک لرنر تھی۔ اپنی عمر کے دوسرے بچوں کے مقابلے میں اس کا کونسنٹریشن اسپین بہت زیادہ تھا۔ وہ ایک کام کو شروع سے آخر تک ایک جیسے انہماک اور لگن سے کرتی تھی۔

گاؤں میں حلیمہ اسے تختی لکھوایا کرتی تھی اور تختی پر الف سے یے تک لکھے کسی حرف میں فرق نہیں ہوتا تھا۔ کہیں لکھنے والے کی اکتاہٹ، تھکاوٹ یا عدم دلچسپی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ہاتھ کی لکھائی بعد میں خیر دین کی لکھائی کی طرح ہوتی گئی تھی۔ الف ب خیر دین کا چیلنج نہیں تھا۔ خیر دین کا چیلنج abc تھا اور چڑیا کے لیے وہ دونوں تفریح تھے۔ وہ ماں سے جوڑ توڑ سیکھتی اور نانا کے آنے پر ان سے اسپیلنگ...... اس کا ذہن جیسے ایک اسفنج تھا جو سب کچھ چوس رہا تھا اور اسے اندر اسٹور کرتا جا رہا تھا۔ ساری زندگی چڑیا کا ذہن اسفنج کی طرح

روزہ کس چیز سے کھولنا مستحب ہے

حضرت سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کوئی روزہ کھولے تو اسے چاہیے کہ خشک کھجور سے روزہ کھولے اگر (کھجور) نہ ملے تو پانی سے روزہ کھول لے کیونکہ وہ پاک کرنے والا ہے۔" (ترمذی)

مرسلہ: ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس

اعتکاف کی حالت میں

سنن ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "معتکف کے لیے سنت ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے نہ جائے اور نہ کسی جنازے پر حاضر ہو اور نہ اپنی عورت کے قریب جائے اور کسی حاجت کے لیے اپنی جگہ سے باہر نہ نکلے مگر جس کے لیے نکلنا بے حد ضروری ہو جیسا کہ کھانا پینا یا قضائے حاجات کے لیے جانا۔ اگر معتکف ایسے کاموں کے لیے نکلا اور مسجد سے خارج ہی وضو کر کے واپس آگیا تو اس کے اعتکاف میں کوئی خلل نہ ہوگا۔"

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

سے ہی کام کرتا رہا تھا۔ صرف علم نہیں تھا جو وہ چوس کر اپنے اندر رکھتی تھی...... اپنے خیالات، مشاہدات، تکلیف، خوشی...... اور بہت کچھ وہ اپنے اندر ہی سمیٹے رکھنے کی عادی تھی۔

وہ ساڑھے تین سال کی عمر میں حلیمہ کے ساتھ گاؤں کے اسکول گئی تھی اور وہاں جا کر حلیمہ کو پتا چلا کہ گاؤں کا وہ پرائمری اسکول چڑیا کے ایک ہاتھ کی مار تھا۔ وہاں کوئی بچہ نہ علم میں چڑیا کے سامنے ٹھہر سکتا تھا نہ اپنی تمیز میں۔

وہ اسکول میں آنے والی واحد بچی تھی جو پورے یونیفارم میں آتی تھی اور وہ بھی صاف ستھرے...... اور وہ تقریباً ایسا ہی صاف ستھرا یونیفارم لے کر جاتی اگرچہ کئی بار اسے اسکول کے صحن میں درخت کے نیچے کھلے میدان میں زمین پر بیٹھ کر پڑھنا پڑتا۔ چھٹی کے وقت تک بھی اس کی چھوٹی سی چٹیا اور سر پر لگی ہیئر پنز یوں ہوتے جیسے اس نے ابھی کنگھی کر کے بال بنائے ہوں، اس کی قمیص کی فرنٹ پاکٹ میں ایک رومال ہوتا تھا جس سے چڑیا وقتاً فوقتاً اپنا پسینہ صاف کرتی رہتی یا فلو ہو جانے پر چھینکنے پر ناک سے بہنے والا پانی...... وہ واحد چیز تھی جو وہ دانستاً گندہ کرتی ہوگی۔ شروع شروع میں اسکول میں اس کا وہ رومال استانیوں کے لیے مذاق اور تفریح کا باعث بنا تھا۔ وہ اسکول جہاں سب کچھ ہاتھوں، آستینوں، دوپٹوں اور قمیص کے دامن سے صاف کرنے کا رواج تھا وہاں ساڑھے تین سال کی ایک بچی جس کی عمر داخلے سے بھی کم تھی بلو پھولوں والے ایک سفید رومال کو اتنے طریقے اور سلیقے سے کھولتی استعمال کرتی اور پھر تہ کر کے رکھتی کہ استانیوں کے لیے یہ جیسے ہنسی کا سامان ہوتا۔ چڑیا کی سنجیدگی اور سلیقے پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ استانیوں کے جملوں پر سرخ ہوتی مسکراتی، شرماتی لیکن رومال کو اسی طرح استعمال کرتی اور رکھتی جیسے خیر دین نے اسے سکھایا تھا۔

اس کے بستے میں موجود نوٹ بکس اور کتابیں اگر کبھی خراب ہوئی ہوں گی تو استانیوں کے ہاتھوں سے ہوئی ہوں گی ورنہ چڑیا خود انہیں ایک خزانے کی طرح سنبھال کر طریقے اور احتیاط سے رکھتی تھی۔ کوئی اس کا بستہ کھول کر دیکھتا تو نوٹ بکس اور کتابوں کی ترتیب دیکھ کر بھی حیران رہ جاتا۔ اس کے بستے میں ہر چیز اس کی پراپر جگہ پر تھی اور ہمیشہ پراپر جگہ پر ہی رہتی تھی۔ چڑیا اگر پچاس دفعہ پینسل نکالتی تو ہر بار اسے واپس رکھتے ہوئے جیومیٹری باکس میں ہی رکھتی۔ اسی ترتیب سے جس ترتیب میں اس کے جیومیٹری باکس میں چیزیں تھیں۔

چھ ماہ چڑیا اس اسکول جاتی رہی اور چھ ماہ اس کی استانیوں کو اسے کچھ پڑھانا نہیں پڑا وہ جیسے ایک ritual تھی جو پوری ہو رہی تھی۔ چھ ماہ بعد حلیمہ اور چڑیا دوبارہ نئے شہر میں خیر دین کے پاس آ گئے تھے اور یہاں جیسے چڑیا کا ایک نیا جنم ہوا تھا۔

ڈپٹی کمشنر کی بیوی ڈاکٹر فرح ایک بے حد رحم دل عورت تھی۔ حلیمہ اس کے تین بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی اور حلیمہ کی وجہ سے چڑیا بھی دن میں کئی بار ماں کے پیچھے گھر میں جاتی۔ ڈاکٹر فرح کو چڑیا اپنی عادتوں اور ذہانت کی وجہ سے بے حد اچھی لگتی تھی۔ ایک گورنمنٹ کے سرکاری اسکول سے ایک انگلش میڈیم اسکول تک چڑیا کو لے جانے والی وہی تھیں اور اس انگلش میڈیم اسکول کے سلیبس کو چڑیا کے لیے آسان بنانے والی بھی وہی تھیں جو اکثر اوقات اپنے بچوں کو پڑھاتے ہوئے چڑیا کو بھی پاس بٹھا لیتی تھیں۔

چڑیا اردو میڈیم نصاب سے انگلش میڈیم نصاب میں جتنی آسانی اور سہولت سے ایڈجسٹ ہوئی تھی اس نے ڈاکٹر فرح کو حیرانی سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ چڑیا gifted تھی اور اس کا اظہار سب سے پہلے انہوں نے ہی خیر دین اور حلیمہ سے کیا تھا۔ چڑیا پر انہیں محنت نہیں صرف کچھ توجہ دینی پڑی تھی اور اس توجہ کا ثمر چڑیا نے

ایک کے بعد ایک کلاس میں ٹاپ کر کے دیا تھا۔

مناسب سے نقش و نگار اور بے حد سیاہ گہری چمکتی آنکھوں اور سانولی رنگت والی چڑیا ایک چڑیا ہی کی طرح دبلی پتلی لیکن پھرتیلی تھی۔ اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں سے جھلکتی ذہانت اور اس کی بے حد ملائم میٹھی سریلی آواز اس کی دو امتیازی خصوصیات تھیں۔ جو اگر نہ ہوتیں تو چڑیا کو بچوں کے ہجوم میں پہچاننا مشکل ہوتا...... لیکن وہ عجیب طریقے سے نوٹس ہوتی تھی۔

ڈاکٹر فرح کے بچوں کو ہفتے میں ایک بار میوزک ٹیچر موسیقی سکھانے آتے تھے اور وہ سارا وقت چڑیا کو سرگم سکھاتے رہتے۔ چڑیا کوئل کی طرح گاتی تھی اور فرح اور اس کا شوہر عابد مسعود اگر گھر پر ہوتا تو چڑیا کے گیت سننے کے لیے خود بھی آ کر اپنے بچوں کے پاس بیٹھ جاتا۔

"کیا بنو گی تم چڑیا بڑی ہو کر؟" ڈاکٹر فرح کو اس سے گپ شپ لگانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اکثر اس سے بھی بات چیت کرتی رہتی تھی۔

"میں ڈاکٹر بنوں گی۔" چڑیا بے حد اعتماد سے اسے بتاتی۔

"پھر کیا کرو گی؟" وہ اسے مسکراتے ہوئے مزید کریدتی۔

"پھر میں علاج کروں گی۔" کھٹاک سے جواب آتا۔

"کس کا علاج کرو گی؟"

"جو بیمار ہوگا۔"

"اور اگر کوئی بیمار نہ ہوا تو؟" فرح اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس سے کہتی۔

"پھر ریسٹ کروں گی۔" بلاتوقف جواب آتا۔

"لیکن ڈاکٹر تو ریسٹ نہیں کرتے۔"

"پھر آپ کیوں کرتی ہیں۔" ڈی سی کی بیوی بے اختیار ہنستی، وہ لاجواب ہو جاتی اور یہ اکثر ہوتا تھا۔ اس بچی کی زبان بے حد صاف تھی اعتماد بلا کا تھا۔ لب و لہجہ بے حد شستہ اور آواز میٹھی۔

"حلیمہ تمہاری بیٹی بڑی ترقی کرے گی۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ اسے بہت پڑھانا۔" وہ ہر بار چڑیا سے ایسے کسی مباحثے کے بعد کہتی۔ حلیمہ کا سیروں خون بڑھتا یہ سن سن کر باپ بیٹی چڑیا کی تعریفیں اگلے کئی دن

ایک دوسرے کو دُہرا کر سناتے اور ہر بار یوں سنتے اور سناتے جیسے پہلی بار ہو۔

بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کا خواب حلیمہ نے ڈی سی کی اس بیوی کو دیکھ دیکھ کر ہی کیا تھا چڑیا کی جگہ اس کا بیٹا ہوتا تو وہ اسے ڈپٹی کمشنر بنانے کا خواب دیکھتی جیسے اس کی دادی نے خیر دین کے بارے میں دیکھا تھا مگر چڑیا لڑکی تھی اور وہ لیڈی ڈاکٹر ہی بن جاتی تو بھی بہت بڑی بات ہوتی۔ وہ ان کے گاؤں اور برادری کی پہلی ڈاکٹر ہوتی...... جیسے خیر دین پہلا سرکاری ملازم...... حلیمہ دسویں جماعت پاس کرنے والی پہلی لڑکی...... اور چڑیا......

☆☆☆

خیر دین نے چڑیا کی بات پر چونک کر کاؤنٹر پر دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔ گلاس ابھی بھی اسی طرح اِدھر سے اُدھر جا رہا تھا...... خیر دین نے بے اختیار آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ چڑیا نے الجھے انداز میں خیر دین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نانا اگر یہ گلاس زندہ نہیں ہے تو پھر یہ گلاس کیوں چل رہا ہے؟''

''بیٹا آیت الکرسی پڑھو۔'' خیر دین نے جواباً اسے کہا۔ چڑیا کچھ حیران ہوئی لیکن پھر اس نے آیت الکرسی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ چند منٹوں بعد گلاس کی حرکت رک گئی خیر دین اطمینان سے دوبارہ آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گیا یوں جیسے چند لمحے پہلے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

''اب صاحب نے کہا ہے کہ مونگ کی بھنی ہوئی دال اور......'' اس نے دوبارہ قصہ شروع کیا۔ چڑیا نے اسے ٹوکا۔

''نانا یہ گلاس کیوں چل رہا تھا؟'' اگر خیر دین کی یہ کوشش تھی کہ چڑیا کا دھیان اس گلاس کی طرف سے ہٹ جائے تو وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ ٹماٹر چھوڑ کر خیر دین کے پاس آ گئی تھی۔ یہ جیسے اس بات کا اعلان تھا کہ اسے دال کی فتوحات سے زیادہ اس چلتے ہوئے گلاس میں زیادہ دلچسپی تھی۔ خیر دین نے گہری سانس لی۔

''یہ جو دنیا ہے نا بیٹا اس میں ہمارے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں رہتی ہیں۔'' خیر دین نے اسے سمجھانا شروع کیا۔

''اور کون سی چیزیں......؟'' چڑیا نے ٹوکا۔

''کچھ ایسی چیزیں جو نظر نہیں آتیں۔'' خیر دین نے کہا۔

''جیسے ہوا، حرارت۔'' چڑیا نے بے ساختہ جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے خیر دین لاجواب ہوا۔

''اس کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں...... جیسے جن بھوت، پریاں اور بونے وغیرہ......'' خیر دین نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ جن بھوت، پریوں پر نہیں اٹکی تھی بونوں کے لفظ پر اٹک گئی تھی۔ جن بھوتوں اور پریوں سے تو وہ ماں اور نانا کی سنائی ہوئی کہانیوں کے ذریعے پہلے ہی متعارف تھی لیکن بونوں کا لفظ اس کے لیے نیا تھا۔

''یہ بونے کیا ہوتے ہیں؟'' اس نے کچھ الجھ کر خیر دین سے پوچھا۔

''یہ ہماری طرح بہت چھوٹے چھوٹے لوگ ہوتے ہیں۔''

''کتنے چھوٹے؟'' خیر دین نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا۔

''اتنے چھوٹے۔'' چڑیا کی آنکھیں اور ہونٹ اکٹھے پھیلے تھے۔

''سچی میں نانا......؟'' تجسس، اشتیاق اور ایک عجیب سی خوشی کے ساتھ اس نے خیر دین سے پوچھا۔

''جیسے snow white dwarfs کے دوست تھے۔'' برق رفتاری سے اس کے ذہن نے اسے ایک illustrated اسٹوری بک کی یاد دلائی۔ خیر دین کو سنو وائٹ کا پتا تھا نہ اس کے دوست سیون ڈارف کا...... لیکن اس نے سر ہلا دیا تھا۔ چڑیا کا دل جیسے بلیوں اچھلا تھا۔

''نانا یہاں ڈارفس ہیں کیا؟'' اس نے بے حد جوش سے خیر دین سے پوچھا۔

''بیٹا آہستہ، اتنی اونچی آواز سے ان کا نام نہیں لو، وہ ناراض ہو جائیں گے۔'' خیر دین نے اسے ٹوکا۔

''نانا آپ مجھے دکھا سکتے ہیں، وہ کہاں ہیں؟'' اس بار چڑیا نے خیر دین کے ساتھ چپک کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔ اس کے ذہن میں اس فیری ٹیل کی رنگین illustration گھوم رہی تھیں۔ خوب صورت ٹوپیوں اور لباس میں ملبوس کیوٹ، موٹے اور شرارتی ٹھگنے بونے جو سنو وائٹ کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے اور سنو وائٹ کے سو جانے پر غم سے بے حال ہو گئے تھے۔

''نہیں، میں نہیں دکھا سکتا لیکن جب بھی تمہیں گھر میں کوئی عجیب چیز ہوتی نظر آئے تو تم بس کلمہ پڑھنا، الحمد شریف پڑھنا، قل ہو اللہ پڑھنا، آیت الکرسی پڑھنا...... اور ڈرنا نہیں......'' خیر دین اسے سمجھا رہا تھا۔

وہ کئی سالوں سے اس گھر کے بارے میں بہت کچھ سنتا آ رہا تھا اور وہاں کام کرنے کے دوران اس نے بہت سارے عجیب و غریب واقعات ہوتے دیکھے تھے۔ وہ شروع میں خوفزدہ ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا خوف ختم ہوتا گیا۔ وہ سب کچھ جیسے معمول کی بات تھی اس کے لیے بلکہ گھر میں کام کرنے والے دوسرے نوکروں کے لیے بھی...... گھر میں موجود ان بونوں نے آج تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

''لیکن میں یہ سب کیوں پڑھوں؟'' چڑیا الجھی۔

''تاکہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں وہ...... ابھی تم نے دیکھا گلاس چلنا بند ہو گیا۔'' خیر دین نے اسے رسانیت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے کچھ مایوسی سے اس ساکت گلاس کو دیکھا وہ خیر دین کو بتا نہیں سکی کہ گلاس کی حرکت بند ہو جانے پر وہ مایوس ہوئی تھی مطمئن نہیں، وہ اب ہر قیمت پر ان بونوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔

سنووائٹ کے ساتھیوں جیسے نٹ کھٹ تیز وطرار اور کیوٹ ڈارف۔

اپنی زندگی کے چھٹے سال میں یہ اس گھر میں ہونے والا پہلا غیر معمولی واقعہ تھا جو چڑیا نے دیکھا۔ اگر اس سے پہلے اس نے کچھ دیکھا تھا تو اس کا ذہن اسے مافوق الفطرت سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ وہ اب خیر دین کی وجہ سے اس گھر کے اندر باقاعدگی سے آرہی تھی اور ڈی سی کی بیوی کی نرم مزاجی اور رحم دلی کی وجہ سے گھر کے ان حصوں میں بھی آجا رہی تھی جہاں عام طور پر نوکر یا نوکروں کے اہل خانہ میں سے کبھی کوئی نہیں جاتا تھا۔ اس سرکاری رہائش گاہ میں ویسے بھی حلیمہ اور چڑیا کسی نوکر کے واحد اہل خانہ تھے جنہیں رہائش کی اجازت دی گئی تھی ورنہ ان کے علاوہ وہاں موجود تمام نوکر اپنی بیوی کو ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔

وہ چلنے والا گلاس اور وہ بونے چڑیا کے ذہن پر سوار ہو گئے تھے۔ اگلے دن اسکول جا کر اس نے ریڈنگ روم میں پڑی اسٹوری بکس میں سے سنووائٹ کی اسٹوری بک دوبارہ نکال لی تھی۔ کتاب کے صفحات پر ڈارفس کی illustration اسے مکمل طور پر مسحور کیے رہیں۔ پورا دن وہ ڈارف اس کے سر پر ناچتے رہے وہ جیسے سنووائٹ بنی ہوئی تھی۔

وہ چڑیا کی زندگی کا جیسے ایک نیا باب تھا۔ وہ گھر پہلے اس کے لیے گھومنے پھرنے کی جگہ تھا اب ایک دریافت گاہ تھا۔ وہ ان ڈارف سے دوستی کرنا چاہتی تھی ویسی دوستی جیسی سنووائٹ نے کی تھی اور وہ اس فرینڈ شپ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ بالکل سنووائٹ کی طرح جو ان بونوں کے لیے کھانا بناتی، ان کے کپڑے دھوتی، ان کا گھر صاف کرتی۔

خیر دین نے اسے یہ نہیں کہا تھا کہ گھر میں سات بونے ہیں کیونکہ گھر میں کتنے بونے تھے یہ مکمل یقین کے ساتھ کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن چڑیا نے خود ہی اپنے ذہن میں ان بونوں کی تعداد متعین کر لی تھی...... وہ بھی سات تھے...... اور اس نے ان کے نام بھی رکھ لیے تھے...... انہیں دیکھے بغیر صرف اسٹوری بک کی illustrations کو دیکھ دیکھ کر اس کے ذہن میں سات بونوں کی شکلیں اور حلیے بیٹھ گئے تھے۔

سب سے بڑا بونا بہت موٹا تھا اور اس کی اس کے پیروں جتنی داڑھی تھی اس کا نام ٹوکو تھا، دوسرا بونا بہت ہی پتلا اور بے حد چالاک لگتا تھا اس کی آنکھیں بٹن کی طرح گھومتی رہتی تھیں اس کا نام کٹو تھا، تیسرا بونا جو کر جیسی گول اور موٹی ناک والا تھا جو ہر وقت چھینکتا رہتا تھا اس کا نام ہٹکو تھا، چوتھا بونا گنجا تھا اور اس کا موٹا سا پیٹ تھا وہ دونوں پاؤں پورے کھول کر بہ مشکل چلتا تھا۔ اس کا نام ٹوفو تھا، پانچواں بونا عینک لگائے رہتا تھا اور پھر بھی چیزوں سے ٹکراتا پھرتا تھا اس کا نام منفا تھا، چھٹا بونا لمبے لمبے بالوں والا تھا اور چلتے ہوئے بے مقصد ہانپتا تھا، اس کا نام کنفا تھا اور ساتواں بونا سب سے چھوٹا اور سب سے شرارتی تھا اس کا نام ڈیڈو تھا اور ڈیڈو چڑیا کا فیورٹ بونا بھی تھا۔

چڑیا کی زندگی میں یک دم جیسے بہت سارے رنگ بھر دیے تھے ان سات تصوراتی بونوں نے...... جو اس گھر میں کہیں رہتے تھے لیکن کہاں رہتے تھے یہ کوئی یقینی طور پر نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کسی کو یہ اشتیاق تھا کہ ان کا جدود اربعہ دریافت کرے ماسوائے چڑیا کہ جو اس گھر کے ہر کونے کھدرے میں اب ٹوکو، کٹو، کنفا، منفا ہٹکو، ٹوفو اور ڈیڈو کو ڈھونڈتی رہتی تھی۔

اسکول سے واپسی کے بعد وہ ہمیشہ اس وقت خیر دین اور حلیمہ کے پاس ضرور جا کر کچھ وقت گزارتی تھی جب وہ گھر میں کچن کا کام کرتے یا ڈاکٹر فرح کے بچوں کو سنبھال رہے ہوتے تھے لیکن اب وہ بے مقصد ایک چکر گھر میں ان بونوں کی تلاش میں ضرور لگاتی تھی۔ یہ اس کا وہ راز تھا جس کے بارے میں خیر دین اور حلیمہ نہیں جانتے تھے۔

چڑیا نے دوبارہ ان بونوں سے متعلقہ کوئی چیز چند مہینوں بعد ایک دن لنچ کے لیے ڈائننگ ٹیبل ارینج کرتے دیکھی تھی۔ ٹیبل کے سینٹر میں ایک vase میں کچھ پھول شاخوں سمیت رکھے ہوئے تھے۔ چڑیا ہمیشہ خیر دین کی ٹیبل سیٹ کرنے میں مدد کرتی تھی اور اس وقت بھی وہ ٹیبل پر میٹس رکھنے میں مصروف تھی جب اس نے ان پھولوں میں سے ایک کی پتیاں نیچے گرتے ہوئے دیکھی تھیں، وہ ٹھٹک گئی، پتیاں یوں نیچے گر رہی تھیں جیسے کوئی انہیں نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا۔ چڑیا کے دل کے دھڑکن تیز ہوگئی..... اس نے ایک نظر خیر دین کو دیکھا، وہ اپنے کام میں مصروف تھا اس کا دھیان پھولوں کی طرف نہیں تھا۔ چڑیا نے اس دن خیر دین کی توجہ ان گرتی پتیوں کی طرف نہیں کرائی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سب کچھ پہلے کی طرح رک جائے اس نے آیت الکرسی پڑھنے پر..... وہ کن انکھیوں سے گرتی پتیوں کو دیکھتے ہوئے ٹیبل پر کانٹے چھریاں لگاتی رہی۔

ایک کے بعد ایک پھول کی پتیاں گرتی گئی تھیں چند منٹوں میں ٹیبل کے درمیان..... ایک vase میں صرف پھولوں والی کچھ ڈنڈیاں پڑی تھیں، ان کی تمام پتیاں vase کے اردگرد ایک سرکل کی شکل میں بکھری ہوئی تھیں۔ خیر دین نے اپنے دوسرے چکر میں وہ پتیاں اور پھولوں کی خالی ڈنڈیاں نوٹس کر لی تھیں۔ وہ ٹھٹکا تھا۔

''یہ تم نے کیا ہے چڑیا؟'' اسے یقین نہیں تھا کہ چڑیا ایسا کام کر سکتی ہے لیکن اس نے پھر بھی پوچھا۔ چڑیا خیر دین کے سوال پر چونکی پھر اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''نہیں نانا..... میں نے تو کچھ نہیں کیا، یہ خود بخود گر گئیں۔'' خیر دین اس کی بات پر ایک دم پھر کچھ گھبرائے انداز میں اسی طرح لاحول اور آیت الکرسی پڑھنے لگا چڑیا نے بے اختیار گہری سانس لی۔ نانا اب پھر ان بونوں کو بھگا رہا تھا۔ وہ آج بھی ان کو نہیں دیکھ سکتی تھی وہ بری طرح مایوس ہوئی تھی۔

اور پھر اکثر ایسی بہت ساری چیزیں وہ دیکھنے لگی تھی جس پر دوسرے آیت الکرسی پڑھتے اور چڑیا دعا کرتی..... کہ وہ کسی نہ کسی طرح کوئی بونا دیکھ لے۔

گھر کا ایک صرف اوپر والا حصہ تھا جہاں چڑیا کبھی نہیں گئی تھی اور جہاں جانے کا اسے بے حد اشتیاق تھا۔ ایک آدھ بار وہ اوپر گھوم پھر کر آئی بھی تھی مگر اوپر کے سارے کمرے بند تھے اور چھت بھی..... اور اوپر والے حصے میں ایک عجیب سی خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ اسے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس کے لیے وہ دوبارہ اوپر والی منزل پر جاتی۔

اس ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں یہ چڑیا کی زندگی تھی۔ اسکول جانا..... اور اسکول کے بعد ڈاکٹر فرح کے پاس پڑھنا..... اس کے بچوں کو کھلانا..... خیر دین کے ساتھ کچن میں چھوٹے موٹے کام کرنا..... کچن گارڈن میں لگی سبزیوں کی دیکھ بھال کرنا..... اور گھر میں بونوں کی تلاش کرنا..... ٹوکو، کٹو، منفا، کنتا، شنتو، ڈیڈو، ٹوٹو سے خود ہی باتیں کرتے رہنا وہ اس کے ساتھ اس کے کچن گارڈن کی سبزیاں اتارتے تھے، پچھلے لان میں لگے آم کے درخت پر جھولا جھولتے اور اسے جھلاتے تھے۔ اس کے ساتھ جامن اور لوکاٹ اور انگور توڑ کر کھاتے تھے اور

اسے پتا نہیں کن کن دنیاؤں کے قصے سناتے تھے...... یا پھر آپس میں جھگڑا کرتے رہتے تھے...... اس کے ساتھ شرارتیں کرتے تھے، اس کی پونی کھینچ لیتے...... جوتا لے کر بھاگ جاتے...... اس کی کتابیں چھپا دیتے...... اس کے کھلونوں سے کھیلتے...... اس کی قمیص کھینچتے...... اس کی جرابیں پہن لیتے، وہ ہنستی، کبھی غصہ کرتی، کبھی ڈانٹتی، کبھی ان کی پٹائی کر دیتی۔

چڑیا کو گھر میں بونے نظر نہیں آتے تھے لیکن اس نے اپنے تصوراتی سات بونوں کو اس گھر میں جگہ دے دی تھی، وہ ان بونوں کی سنو وائٹ تھی اور وہ اس کے loyal friends جو اس پر جان دیتے تھے...... اور یہ وہ راز تھا جو صرف چڑیا کو پتا تھا۔ خیر دین اور حلیمہ کو بھی نہیں۔

خیر دین اور حلیمہ اسے کئی بار اکیلے میں کھیلتے، پڑھتے، کام کرتے اپنے آپ سے باتیں کرتے دیکھتے تھے...... یہ ایک نئی عادت تھی جو چڑیا میں آئی تھی لیکن انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ بچے اس عمر میں یہی سب کرتے تھے...... کنا، منا، شنٹو، ٹوفو، ڈیڈو، کٹو، ٹوکو کے نام بھی انہوں نے کئی بار سنے تھے۔ وہ یہی سمجھے تھے کہ یہ چڑیا مختلف چیزوں کے لیے یہ نام استعمال کرتی ہے۔ کسی بونے تک ان کا ذہن بھی نہیں گیا تھا لیکن چڑیا اب بہت خوش رہنے لگی تھی ان دونوں نے صرف یہ نوٹس کیا تھا۔

انہی دنوں ڈاکٹر فرح کے شوہر کی پوسٹنگ آ گئی تھی۔ یہ خیر دین اور حلیمہ کے لیے پریشانی کی چیز تھی۔ اس بار وہ کوشش کے باوجود خیر دین اور حلیمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ البتہ انہوں نے آنے والے ڈپٹی کمشنر سے بات کر کے خیر دین کو حلیمہ اور چڑیا کو سرکاری کوارٹر میں ساتھ رکھنے کی اجازت لے لی تھی نہ صرف یہ بلکہ ڈاکٹر فرح نے اس نئے ڈپٹی کمشنر کی بیوی سے حلیمہ کو اپنی بچی کی آیا کے طور پر رکھنے کے لیے بھی بات کی، وہ حلیمہ کے لیے ایک مستقل آمدنی کا سلسلہ برقرار رکھ کر جانا چاہتی تھی تاکہ حلیمہ کو چڑیا کے تعلیمی اخراجات کے لیے دقت نہ ہو۔ نیا ڈپٹی کمشنر اس کے شوہر کا کالج میٹ تھا اور اس حوالے سے ڈاکٹر فرح اس کی بیوی کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

''آپ لوگ فکر نہ کریں...... وہ دونوں میاں بیوی بہت اچھے ہیں، بہت اچھے خاندان کے ہیں دونوں اور نوکروں اور عملے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' ڈاکٹر فرح نے جانے سے پہلے خیر دین اور حلیمہ کو تسلی دی تھی۔

''میں نے ان سے چڑیا کی تعلیم کے حوالے سے بھی بات کی ہے...... آیا کے طور پر حلیمہ کو تو شاید وہ نہ رکھیں کیونکہ ان کی ابھی ایک ہی بیٹی ہے اور وہ بھی چھوٹی ہے لیکن ڈی سی کی بیوی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ چڑیا کی تعلیم کا خیال رکھیں گے۔ تعلیم کے اخراجات اٹھانے پڑے تو وہ بھی اٹھا لیں گے لیکن چڑیا کی اسکول فیس تو میں ہی بھجواتی رہوں گی۔ اس لیے اس کے بارے میں تو آپ پریشان نہ ہوں۔''

چڑیا نے اس گھر میں بونے تو نہیں دیکھے تھے لیکن خیر دین اور حلیمہ کو ڈاکٹر فرح کی شکل میں ایک پری ضرور ملی تھی۔ جس کے چلے جانے پر خیر دین اور حلیمہ ہی نہیں چڑیا بھی بے حد رنجیدہ تھی۔

ڈپٹی کمشنر ہاؤس میں نیا ڈپٹی کمشنر اپنی بیوی اور تین سالہ بیٹی کے ساتھ آنے والا تھا...... اور چڑیا اپنی زندگی کا پہلا حقیقی، بدصورت اور خوفناک بونا دیکھنے والی تھی۔

باقی آئندہ

وہ اس اسٹینڈنگ مرر کے سامنے کھڑی چند لمحوں کے لیے جیسے فریز ہوگئی تھی، خیر دین ہمیشہ اسے نصیحت کیا کرتا تھا۔
''بیٹا شام کے بعد بھی گھر میں لگے آئینوں کے سامنے مت جانا اور خاص طور پر برآمدے میں پڑے اس بڑے آئینے کے سامنے۔'' چڑیا، خیر دین کی نصیحت پر کچھ حیران ہوگئی تھی۔
''پر کیوں نانا؟''
''کہتے ہیں شام کے بعد وہ آئینے دیکھنے آتے ہیں۔'' خیر دین نے کچھ اٹک کر اسے بتایا۔ چڑیا نے وہ کا حدود اربع نہیں پوچھا تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ کون تھے؟ اس کا چہرہ خوشی اور جوش سے سرخ پڑ گیا تھا۔ خیر دین کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اپنی احتیاطوں میں اس نے چڑیا کو جیسے خزانے کی کنجی دے دی تھی۔ تو بالآخر اب سارے گھر میں ماری، ماری پھرنے کے بجائے اسے صرف شام کے بعد گھر میں لگے ہوئے آئینوں کے آس پاس رہنا تھا۔ چڑیا نے دل ہی دل میں اپنی نئی حکمت عملی طے کی۔
''نانا آپ نے کبھی ان آئینوں میں ان کو دیکھا؟'' چڑیا نے جیسے بڑی احتیاط کے عالم میں سرگوشی کی۔ خیر دین نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بار بار ان کا نام نہیں لینا چاہیے ورنہ وہ ناراض ہوسکتے ہیں تو چڑیا اب اکیلے میں بھی ان کو بونا نہیں کہتی تھی البتہ ان بونوں کے نام لینے میں اسے تامل نہیں ہوتا تھا۔
''نہیں، میں نے تو نہیں دیکھا لیکن گھر میں رہنے والے دوسرے نوکروں نے دیکھا ہے...... خاص طور پر وہ باہر والے بڑے آئینے میں۔'' خیر دین روانی میں بتاتا گیا۔ چڑیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسی وقت چڑیا کی طرح اڑتے ہوئے ان آئینوں کے ارد گرد منڈلانے لگے۔
اگلے دن ڈی سی ہاؤس میں آتے ہی چڑیا نے سب سے پہلے گھر کے آئینے گننے شروع کر دیے تھے۔ بیرونی آئینے کے علاوہ گھر کے مرکزی ہال، اندرونی برآمدے اور چند دوسرے کمروں میں ملا کر پانچ چھوٹے بڑے آئینے تھے۔ کچھ کمرے جو بند تھے وہ وہاں کے آئینے نہیں گن سکتی تھی اور ان میں سے صرف ایک آئینہ تھا جو چڑیا شام کے بعد آسانی سے دیکھ سکتی تھی اور وہ مرکزی دروازے کے باہر برآمدے میں لگا...... شیوال اسٹینڈنگ مرر تھا۔ اس آئینے نے سات آٹھ سال کی اس بچی کو پہلے کبھی اس طرح فیسنیٹ نہیں کیا تھا جس طرح اب کرنے لگا تھا۔ وہ دن میں بھی کئی بار اب اس آئینے کے پاس جانے لگی تھی۔ کئی بار آئینے کے سامنے کھڑی وہ اس کے اکھڑے ہوئے پینٹ پیلنگ میں کنٹا، منٹا، شنٹو، ڈیڈو، ٹوفو، ٹوکو، کیٹو کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہتی...... بعض دفعہ گلیکسی کے ستاروں کی شکل کی طرح وہ بھی اس پینٹ میں ان سات بونوں کو کسی نہ کسی حد تک ڈھونڈ ہی لیتی...... اور بعض دفعہ وہ اسے حرکت کرتے بھی نظر آتے صرف اسٹیٹک نہیں...... لیکن پھر بھی اس کا لاشعور کہیں نہ کہیں اس سے کہہ رہا تھا کہ جو وہ آئینے میں پہچان رہی ہے، وہ غیر مرئی نہیں ہے...... وہ ویسا پُراسرار اور مافوق الفطرت نہیں تھا جتنا گھر میں خود بخود حرکت کرنے والی چیزیں جواب اس کے لیے Para normal چیز نہیں رہی تھی۔ وہ ان حرکت کرنے والی چیزوں کے تعاقب میں جاتی تھی، تجسس اور اشتیاق کے عالم میں...... خیر دین کی طرح آیات نہیں پھونکتی تھی...... بلکہ کئی دفعہ اس حرکت کرنے والی چیز کو بعد میں بھی الٹ پلٹ کر دیکھتی رہتی یوں جیسے وہ اس نظر نہ آنے والے بونے کی کوئی نشانی اس چیز پر دیکھنا چاہتی تھی جو اسے حرکت دیتا رہا تھا۔ اسے کبھی کچھ نظر نہیں آیا تھا...... کیونکہ وہ یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ آخر وہ ان گلاسوں، پلیٹوں اور دوسری چیزوں پر دیکھنا کیا چاہتی تھی...... کوئی بڑا شاید ان چیزوں پر فنگر پرنٹس تلاش کرتا کوئی دوسرا نشان یا پھر کوئی بالوں کا ٹکڑا...... چڑیا ان بونوں کے کپڑوں، جوتوں اور پہنی ہوئی دوسری چیزوں کا کوئی حصہ دیکھنا چاہتی تھی...... ان کی رنگین پھندنے والی ٹوپی کے کوئی دھاگے، ان کے رنگین رومال، کوئی سونے یا چاندی کا سکہ...... کوئی بٹن...... یا کوئی ایسی چیز جسے وہ اپنے پاس فخریہ طور پر رکھ سکے اور پھر سب کو دکھا سکے۔
لیکن دن گزرتے گئے اور اسے وہاں کوئی بونا نظر نہیں آیا اور جب وہ انتظار اور امید ختم کر بیٹھی تب یک دم اس شام اسے باہر برآمدے میں لگے آئینے میں پہلی بار کچھ نظر آیا تھا۔ وہ اس شام خیر دین اور گھر کے دوسرے ملازمین کے ساتھ نئے ڈپٹی کمشنر کے انتظار میں گھر کے باہر کھڑی تھی، نیا ڈپٹی کمشنر اس گھر میں منتقل ہونے سے پہلے اس گھر کا جائزہ لینے کے لیے اس شام وہاں آنے والا تھا اور خیر دین اس کے اصرار پر اسے بھی وہاں ساتھ لے آیا تھا۔ وہ خود دوسرے ملازمین کے ساتھ گپ شپ لگانے لگا اور چڑیا ہمیشہ کی طرح سامنے والے لان میں بیٹھی ہوئی بلیوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ ان بلیوں کے ساتھ دوڑتے بھاگتے وہ پسینے سے شرابور ہوگئی تھی اور کسی بلی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہی وہ لان سے ڈرائیو وے اور وہاں سے برآمدے میں آئی تھی اور برآمدے میں آتے ہی بلی کو بھول کر وہ اس آئینے کی طرف آئی تھی۔ شام ہو رہی تھی، پھولی ہوئی سانس اور پسینے سے شرابور وہ آکر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ اس وقت آئینے میں اپنے بال اور چہرہ صاف کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے آئینے میں کچھ دیکھا تھا۔ ایک نظر میں وہ اسے اپنا وہم لگا تھا لیکن وہاں آئینے میں کچھ تھا...... کوئی کھڑا تھا...... وہاں کسی کا عکس تھا...... بہت چھوٹے سے قد کا کوئی......
اس سے پہلے کہ وہ غور کر پاتی خیر دین نے اسے آواز دی تھی، ڈپٹی کمشنر کی گاڑی گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ تمام ملازمین مستعد ہوگئے تھے۔ چڑیا نے خیر دین کی آواز پر لاشعوری طور پر ایک لمحے کے لیے پلٹ کر دیکھا پھر دوبارہ گردن موڑ کر اس آئینے کو دیکھا...... وہاں اب وہ نہیں تھا...... جو اسے نظر آیا تھا...... سیاہ رنگت والا ایک بے حد چھوٹے قد اور بڑی بڑی موٹی آنکھوں اور سرخ موٹے ہونٹوں والا ایک آدمی...... جو اسے دیکھ رہا تھا...... نظریں جمائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے...... وہ بے حد بدصورت تھا...... اور ایک لمحے کے لیے چڑیا کا جسم پتے کی طرح کانپا تھا۔ اس نے زندگی میں اس جسامت کا کوئی انسان پہلی بار دیکھا تھا...... لیکن اس کا تجسس غائب نہیں ہوا تھا...... خوف اور تجسس...... لیکن اس کے نظر ہٹاتے ہی وہ آئینے سے غائب ہوگیا تھا...... اور اب جب وہ دوبارہ آئینے کو دیکھ رہی تھی تو وہ وہاں نہیں تھا...... آئینے پر برآمدے میں جلنے والی روشنیوں کا عکس پڑ رہا تھا۔ چڑیا چند قدم اور آگے بڑھ آئی یوں جیسے وہ آئینہ کوئی دیوار تھا جس کے پار وہ دیکھنا چاہتی تھی...... وہاں اس آئینے میں اب اس کا اپنا عکس تھا...... اپنے چہرے اور آنکھوں کی حیرانی کے ساتھ...... اس کے ذہن نے اس آدمی کو بونا نہیں سمجھا تھا...... بونے ایسے نہیں ہوسکتے تھے...... وہ کیوٹ، شرارتی، رنگین کپڑوں اور معصوم چہروں والی مخلوق تھی چڑیا کے ذہن میں...... اور آئینے میں نظر آنے والے آدمی کا سیاہ جسم کسی ریچھ کے جسم کی طرح بالوں سے ڈھکا ہوا تھا صرف اس کا چہرہ تھا جو نسبتاً صاف تھا۔
ایک لمحے کے لیے اس نے آنکھیں بند کیں پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے دوبارہ آئینے کو دیکھا اور اس بار اس کی آنکھیں ایک بار پھر حیرانی کے عالم میں کھلی تھیں۔
آئینے میں اب ایک بے حد خوبرو، دراز قد آدمی کا عکس تھا جو برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔ چڑیا نے حیرانی سے آئینے کو دیکھا، وہ ٹھگنا، بدصورت آدمی اتنا خوب صورت اور لمبا کیسے ہوگیا تھا......؟ وہ ایک لمحے کے

لیے جیسے حیران ہوئی...... پھر اس نے اس آدمی کے پیچھے خیر دین اور دوسرے لوگوں کا عکس دیکھا اور وہ جیسے کرنٹ کھا کر حال میں واپس آ گئی تھی، وہ نیا ڈپٹی کمشنر تھا۔

''سر یہ میری نواسی ہے۔'' چڑیا نے پلٹ کر دیکھا۔ نیا ڈپٹی کمشنر اور باقی تمام لوگ اب اس کے سامنے تھے اور خیر دین بڑے عاجزانہ انداز میں ڈپٹی کمشنر سے اس کا تعارف کروا رہا تھا جو پہلے ہی اسے دیکھ رہا تھا۔ چڑیا نے خیر دین کے تعارف پر سلام کرتے ہوئے بڑے اعتماد انداز میں اپنا ہاتھ اس ڈپٹی کمشنر کی طرف بڑھایا تھا جس نے کچھ دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا پھر خیر دین سے کہا۔

''ہاں، عابد نے بتایا تھا مجھے۔'' وہ کہتے ہوئے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چڑیا نے ایک لمحے کے لیے ان تمام لوگوں کو اندر جاتے ہوئے دیکھا پھر وہ دوبارہ پلٹ کر اس آئینے کو دیکھنے لگی جس میں اس نے آج ایک بونا دیکھا تھا لیکن وہ اسے پہچان نہیں پائی تھی۔

☆☆☆

''میں یہاں نہیں رہوں گی۔'' اعلان دوٹوک تھا۔ شیر دل نے ایک لمحے کے لیے پلٹ کر ہاتھ کے اشارے سے شہر بانو کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے کندھے سے لگی مثال کو بیڈ پر لٹا رہا تھا جو راستے میں گاڑی میں ہی سو گئی تھی۔ وہ دونوں ابھی DPO ہاؤس میں ڈنر سے واپس آئے تھے جو ان کے اعزاز میں تھا اور ڈنر سے واپسی پر شہر بانو کا موڈ بری طرح آف تھا۔ وہ اس کے پیچھے اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی اور اس نے اپنے کانوں سے ایئر رنگز اتارتے ہوئے شیر دل کو بتا دیا۔ شیر دل نے مثال کو توجہ سے بیڈ پر لٹاتے ہوئے بڑی بے پروائی سے شہر بانو کا اعلان سنا تھا۔ اسے DPO ہاؤس میں ڈنر ٹیبل پر ہی آنے والے طوفان کا اندازہ ہو گیا تھا۔

شہر بانو اس کے اشارے پر خاموش ہو گئی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر سینڈلز کے اسٹریپس کھولتے ہوئے وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ شیر دل کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ شیر دل نے مثال کو بستر پر لٹانے کے بعد اس کو کمبل سے ڈھانپا پھر اس نے اپنا کوٹ اتار کر بیڈ پر پھینکا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر اٹھاتے ہوئے وہ بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ والے بیڈ روم میں لے آیا۔

''کیا ہو گیا شہی......؟'' دونوں بیڈ رومز کا درمیانی دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے شہر بانو کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ وہ دونوں اب مثال کے بیڈ روم میں تھے، وہ الگ بیڈ روم ہونے کے باوجود اس گھر کے بونوں کے قصے سننے کے بعد شہر بانو نے اسے کبھی رات کو اس کے بیڈ روم میں اکیلا سلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ تین ہفتوں کی تزئین و آرائش کے بعد ایک ہفتہ پہلے ہی اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ اور اب مختلف انتظامی افسران کی طرف سے استقبالیے اٹینڈ کرتے پھر رہے تھے۔ اپنے تمام تر خدشات اور تحفظات کے باوجود شہر بانو، شیر دل کے اصرار اور سمجھانے بجھانے کے بعد اس گھر میں رہائش اختیار کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔

وہ شیر دل کی سرکاری رہائش گاہ تھی وہاں رہائش نہ رکھنے کے لیے شیر دل کے پاس کوئی بہت بڑی وجہ ہونی چاہیے تھی خاص طور پر اس صورت میں جب اس سے پہلے آنے والے تمام افسران اس عمارت کو استعمال کرتے آ رہے تھے اور یہ بات شہر بانو کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ ایک ہفتے کے قیام میں وہاں ایسی کوئی چیز رونما نہیں ہوئی تھی جس سے شہر بانو کے خدشات کی تصدیق ہوتی۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ شیر دل ٹھیک کہتا ہے۔ وہ

سب سنی سنائی باتیں اور قصے تھے اور ان میں کوئی صداقت ہوتی تو وہ ڈی سی ہاؤس اس وقت HAUNTED قرار دیا جا چکا ہوتا اور اس شہر میں ڈی سی کی سرکاری رہائش گاہ کہیں اور منتقل ہو چکی ہوتی۔ ایک ہفتہ وہاں قیام کے دوران شہر بانو کا اطمینان اور اعتماد آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا تھا اور مزید ایک آدھ ہفتے میں یہ مکمل طور پر بحال ہو جاتا اگر آج وہ اختر درانی کے ڈنر ٹیبل پر اس گھر کے بارے میں وہ سب کچھ نہ سنتی جو اس نے سنا تھا۔

ڈنر بڑے خوشگوار ماحول میں شروع ہوا تھا۔ اختر درانی، شیر دل سے پانچ کامن سینئر تھا۔ شیر دل اور شہر بانو، اختر درانی اور اس کی بیوی تزئین سے بہت کم عمر تھے لیکن اس کے باوجود ان کے دوستانہ رویے کی وجہ سے شیر دل اور شہر بانو کو ان سے مل کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ شیر دل، اختر سے پہلے بھی چند بار مل چکا تھا لیکن اس کی بیوی سے ان کے گھر پہ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ ڈنر کے آغاز سے پہلے ڈرنکس سرو ہونے کے دوران تزئین اور اس کے درمیان گپ شپ ہونے لگی، دونوں ایک دوسرے کی فیملیز کا تعارف حاصل کر رہی تھیں۔ شیر دل اور اختر درانی کمرے کے دوسرے کونے میں صوفوں پر بیٹھے کسی انتظامی معاملے کو ڈسکس کر رہے تھے۔

''ماشاء اللہ بڑا گڈ لکنگ کپل ہے آپ دونوں کا۔'' تزئین نے اپنا پہلا ستائشی جملہ اس تک پہنچایا۔ شہر بانو مسکرا دی۔ یہ کمپلیمنٹ ان کو اب اتنی بار مل چکا تھا کہ اس کے لیے یہ ایک روٹین کی بات ہو گئی تھی۔

''میاں اتنا ہینڈسم اور اتنی اچھی پوسٹ پر ہو تو بیوی کی تو راتوں کی نیند بھی اڑ جاتی ہے۔'' تزئین نے مشروب کا گلاس بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ شہر بانو نے دور اختر درانی کے ساتھ باتوں میں مصروف شیر دل کی جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے تزئین سے کہا۔

''نہیں، مجھے بڑی گہری نیند آتی ہے۔''

''یہ سمجھداری کا کام نہیں ہے...... رسیاں وغیرہ ڈال کر رکھنا چاہیے شوہروں کو...... خاص طور پر اتنے خوش شکل شوہروں کو۔'' شہر بانو اس بار اس کی بات پر ہنس دی پھر اس نے کہا۔

''یہ رسیوں سے قابو آنے والا مرد نہیں ہے، اعتماد کے دھاگے سے جکڑا ہوا ہے اسے۔'' شہر بانو نے سپ لیتے ہوئے جیسے فخریہ انداز میں اس سے کہا۔

''لو میرج ہے کیا......؟'' تزئین نے یک دم جیسے کچھ اور دلچسپی لیتے ہوئے تجسس سے کہا۔

''لو میرج......؟'' شہر بانو نے ایک لمحے کے لیے سپ لیتے ہوئے رک کر سوچا پھر وہ شیر دل کو تیسری بار دیکھتے ہوئے مسکرائی اور اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

''ہاں، اس طرح کی باتیں تبھی کرتا ہے بندہ۔'' تزئین اس بار ہنسی تھی۔

''کیسے اور کہاں ملے تھے تم دونوں پہلی بار......؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

☆☆☆

شہر بانو نے شیر دل کو پہلی بار ہارورڈ یونیورسٹی کے Winthrop House کی ویب سائٹ پر دیکھا تھا۔ یونیورسٹی میں Freshman کے طور پر ابھی اسے چند دن ہوئے تھے، وہ Winthrop House میں تھی اور ویب سائٹ پر اسپورٹس کی ایکٹیویٹیز کو چیک کرتے ہوئے اس نے شیر دل کی ایک تصویر دیکھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ اس تصویر پر رک گئی تھی۔ تصویر میں نظر آنے والے مرد کی عشنلٹی کا اندازہ لگانا

مشکل تھا..... وہ اپنے رنگ اور نقوش کے لحاظ سے عرب، ایرانی، افغانی، پاکستانی کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ بیس لائن پر پوری قوت سے کسی شاٹ کو ریٹرن کرتے ہوئے اس مرد کی شرٹ پسینے سے تر ہونے کے باوجود ناف سے اوپر تک اٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں پاؤں کورٹ سے چند انچ اوپر ہوا میں تھے، ہارورڈ یونیورسٹی کے Go Crimson کی تحریر والا ایک یونیورسٹی کلر کا Wrist Band اس کے دائیں بازو کے ابھرے ہوئے مسلز کو جیسے کلائی پر قید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہونٹوں کو پوری قوت سے بھینچے..... بیس لائن کے اندر پڑ کر باہر جانے والی گیند کو پوری طاقت اور مہارت سے سنگل Handed شاٹ کے ساتھ کھلاڑی ریٹرن کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ کوشش اور جنون کسی پروفیشنل فوٹو گرافر کے لینز نے اسی مہارت کے ساتھ محفوظ کر لی تھی۔ وہ ایک بے حد Unusual شاٹ تھا اور شاید کھلاڑی کی غیر معمولی Looks اس تصویر کے وہاں موجود ہونے کی وجہ بھی بنی تھی۔ یہ شہر بانو کا تجزیہ تھا۔

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ Ivy league میں ہونے والے Straus cup کے فائنل کا وننگ شاٹ تھا اور وہ کھلاڑی Crimson Tennis Team کا کیپٹن تھا۔

شہر بانو کئی منٹ تک اس ایک تصویر کو دیکھتی رہی..... پھر وہ اپنے ہاؤس کی اسپورٹس Facilities میں ٹینس کو دیکھنے لگی تھی۔ جن چند اسپورٹس میں اسے بچپن سے دلچسپی رہی تھی، ان میں سے ایک ٹینس بھی تھا اور وہ ہائی اسکول میں جن دو گیمز کو باقاعدگی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی، اس میں سے وہ ایک تھا۔ اس وقت بھی وہ یونیورسٹی میں ٹینس کھیلنے کے طریقۂ کار کو جاننا چاہتی تھی۔ ٹینس کے Link پر ٹینس ٹیم کے کیپٹن اور کوچ کا نام دیکھتے ہوئے اس نے کیپٹن کے نام کی جگہ شیر دل کا نام دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹکی تھی۔ ہارورڈ ٹینس ٹیم کے کیپٹن کے طور پر کسی مسلمان کا نام دیکھنا اور جو ساؤتھ ایشین بھی لگتا ہو، غیر معمولی تھا۔ اس وقت پہلی بار اسے خیال آیا کہ شاید وہ پاکستانی بھی ہو..... کم از کم نام کے اس ایک حصے سے یہ ممکن تھا جو اس کے سامنے تھا۔ کوچ اور شیر دل کا ای میل ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد وہ اب اس شش و پنج میں تھی کہ ٹینس کیمپس کو اٹینڈ کرنے اور یونیورسٹی ٹینس ٹیم کو جوائن کرنے کا طریقۂ کار جاننے کے لیے وہ کسے ای میل کرے۔ اس نے بالآخر کوچ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا، اینڈریوز کا آٹو رسپانس فوراً آیا تھا، وہ چھٹی پر تھا اس نے اسسٹنٹ کوچ اور شیر دل کا ای میل ایڈریسز مزید معلومات کا بھیجے تھے۔ اس بار شہر بانو نے شیر دل کو ہی ای میل کی تھی۔ وہ ابھی اپنی دوسری ای میلز چیک ہی کر رہی تھی جب شیر دل کی ای میل آ گئی۔ ایک فارمل ای میل میں رسمی علیک سلیک کے ساتھ اس نے شہر بانو کو ایک اٹیچمنٹ بھیجی تھی جس میں وہ تمام معلومات تھیں جو شہر بانو کو درکار تھیں۔ ای میل میں اس نے مزید کسی رہنمائی یا معلومات کے لیے اپنا فون نمبر بھی دیا تھا۔

شہر بانو نے اس کی ای میل کے نیچے Signatures میں اس کا ڈیپارٹمنٹ اور سال دیکھا۔ وہ فنانس اور مینجمنٹ میں اپنی بیچلر ڈگری کے آخری سال میں تھا اور یقیناً پاس آؤٹ ہونے والا تھا۔ ایک سرسری نظر اس کے نام پر ڈالتے ہوئے وہ یہ تو جان گئی تھی کہ وہ واقعی پاکستانی تھا۔ ای میل کا جواب بھی چند منٹوں کے اندر ہی آیا تھا۔ وہ شیر دل سے اس کا پہلا غائبانہ تعارف تھا۔

☆☆☆

شیر دل سے اس کا دوسرا تعارف چند دنوں کے بعد Intramural ٹینس میچز کے دوران ہوا تھا۔ وہ Adams House کے خلاف اپنے ہاؤس کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنی ٹیم کو سپورٹ کرنے گئی تھی اور کورٹ میں اترنے والے پہلے کھلاڑی کو وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گئی تھی۔ وہ ویب سائٹ پر اس تصویر والا کھلاڑی تھا..... اور وہ شیر دل تھا..... اور وہ حقیقی زندگی میں صنفِ نازک کے لیے اس سے کئی گنا زیادہ پُرکشش تھا جتنا وہ اس ویب سائٹ کے فوٹو شاٹ میں لگ رہا تھا۔ وہ شہر بانو کا ساتواں Crush تھا اس سے پہلے تین فلم ایکٹرز، دو ٹینس اسٹارز، ایک رگبی پلیئر اس فہرست میں تھے..... شیر دل کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ ان سات میں سے پہلا تھا جسے وہ اصلی زندگی میں دیکھ بھی رہی تھی اور کوشش کر کے مل بھی سکتی تھی۔

شیر دل وہ میچ اسٹریٹ Sets میں جیتا تھا اور میچ کے دوران ہی شہر بانو کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کم از کم یونیورسٹی کی ٹینس کھیلنے اور دیکھنے والی خواتین میں انتہائی پاپولر تھا۔ Winthrop House کی ٹینس ٹیم کی سپورٹ کے لیے GTTC پہنچنے والوں کی آدھی سے زیادہ تعداد شیر دل کا حلقۂ احباب تھا..... حلقۂ احباب شاید کچھ زیادہ موزوں لفظ نہیں تھا اس گیدرنگ کے تعارف کے لیے جو شیر دل کی وجہ سے وہاں اکٹھا تھا کیونکہ ان میں سے بہت سے شہر بانو ہی کی طرح صرف اس کی Looks کی وجہ سے اس کے مداحوں میں شامل ہو گئے تھے۔ مداح بھی شاید ایک موزوں لفظ نہیں تھا ان سب کے لیے..... کیونکہ ان میں سے کوئی بھی شیر دل کے کھیل کے لیے وہاں نہیں آتا تھا، وہ سب شیر دل کے کھیلنے کی وجہ سے وہاں آئے یا آئی تھیں۔

شہر بانو نے Intramural میچز میں سے شیر دل کا کوئی ایک میچ Miss نہیں کیا تھا۔ Winthrop House ایونٹ جیت گیا تھا اور ایونٹ کا اختتام شہر بانو کے لیے جیسے مایوسی لایا تھا۔ شیر دل کو دیکھنے کا اب اور کوئی موقع اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ شیر دل کے ہر میچ کے بعد شیر دل کو ایک تہنیتی ای میل بھیجتی تھی۔ جواب چند گھنٹوں میں نہیں تو دوسرے دن ضرور آ جاتا تھا اور شہر بانو چند لائنز کی اس شکریہ کی ای میل کو گھنٹوں پڑھتی رہتی تھی۔ شیر دل جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگا تھا۔ اس کے لیپ ٹاپ میں میچز کے دوران شیر دل کی لی ہوئی سیکڑوں تصویریں اور ویڈیو کلپس تھے۔ ان تصویروں کو دیکھنا اس کا پسندیدہ ٹائم پاس تھا۔

ٹورنامنٹ کے اختتام پر اس نے کچھ ڈرتے جھجکتے شیر دل کو فون کیا۔ بے حد نروس انداز میں اپنا تعارف کروایا۔

''I know you Shahar Bano'' اس نے جواباً اسے کہا تھا اور چند لمحوں کے لیے شہر بانو ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''آپ کیسے جانتے ہیں مجھے؟'' اس نے اسی حیرت کے عالم میں اس سے پوچھا۔

''آپ بہت باقاعدگی کے ساتھ میرے میچز دیکھنے آتی رہی ہیں۔'' شہر بانو اب جیسے بالکل فریز ہو گئی تھی۔ شیر دل کو یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس کی ہر گیم دیکھنے جاتی رہی ہوں۔

''آ..... آ..... یہ کیسے پتا چلا آپ کو؟'' اس نے کچھ اٹک کر ہلکی خوش فہمی کے ساتھ کہا۔

''آپ ہر میچ کے بعد ایک ای میل بھیجتی تھیں..... Full of Compliments بعض دفعہ بُرے میچز کھیل کر آنے کے بعد بھی صرف آپ کی ای میل میں میری گیم کی تعریف ہوتی تھی..... حالانکہ کوچ سے گالیاں پڑی ہوتی تھیں۔'' دوسری طرف سے بے حد اطمینان کے ساتھ کہا گیا۔ شہر بانو پر گھڑوں پانی پڑا..... اس تبصرے کے بعد کسی پر بھی پڑ جاتا۔ شیر دل سے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اس کی..... چند

رسمی کلمات کے ساتھ اس نے سیکنڈز کے اندر فون بند کیا۔ شرمندگی کی انتہا سی انتہا تھی جو اگلے کئی دن اسے گھیرے رہی، وہ چاہتی تھی شیر دل اس کو نوٹس کرتا اور یاد رکھتا لیکن وہ اس طرح نوٹس ہونا اور یاد رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا اندازہ تھا شیر دل کو سیکڑوں نہیں تو درجنوں لڑکیاں تو ای میلز ضرور کرتی ہوں گی، اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اسے باقاعدگی سے ای میلز کرنے والی درجنوں لڑکیاں اپنی درجنوں ای میلز کو صرف ٹینس پر فوکس نہیں رکھتی تھیں...... دو نہیں تو تین اور تین نہیں تو چار پانچ ای میلز کے بعد ای میل کا سیاق وسباق بدلنا شروع ہو جاتا تھا۔ لڑکیاں شیر دل سے اسی طرح دوستی کا آغاز کرتی تھیں وہ جو اس سے کھیل کے ذریعے متعارف ہوتیں لیکن شہر بانو کی صورت میں شیر دل کو پہلی بار ایک انتہائی مستقل مزاج مداح ملا تھا۔ جس کی پوری ای میل صرف ٹینس کے گرد گھومتی تھی......اور اگر وہ واقعی صرف شیر دل کے کھیل میں ہی دلچسپی رکھتی تو یہ اس کے حلقۂ احباب میں ایک انوکھا اضافہ تھا۔ شیر دل اس کو نوٹس نہ کرتا تو کیسے نہ کرتا......

شہر بانو نے اس کے بعد دوبارہ شیر دل کو ای میل نہیں کی، شرمندگی کچھ اس حد تک ہوئی تھی اسے لیکن شیر دل اس کے دل ودماغ سے کوشش کے باوجود محو نہیں ہو سکا۔ وہ چند ہفتوں میں اپنا سمسٹر ختم کرنے والا تھا اور شہر بانو کو ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ ماسٹرز کے لیے وہاں رکے۔ وہ برائٹ اسٹوڈنٹس میں سے تھا یہ وہ جانتی تھی اس لیے ایڈمیشن اس کے لیے زیادہ مسئلہ نہیں تھا لیکن اس وقت شہر بانو کو شدید دھچکا پہنچا۔ جب پاکستان جانے سے پہلے اس نے شہر بانو کو ایک ای میل کی تھی۔ اپنے In-box میں شیر دل کا نام دیکھ کر شہر بانو کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ شیر دل نے اسے ای میل کی تھی...... کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے ای میل کھولی تھی اور اس کے حواس اسی برق رفتاری سے بحال ہو گئے تھے۔ وہ ایک گروپ ای میل تھی۔ شیر دل کی طرف سے ہارورڈ میں گزارے ہوئے یادگار وقت کے حوالے سے ایک الوداعی پیغام جو اس کی ایڈریس بک میں موجود تمام Contacts کو بھیجا گیا تھا۔ شہر بانو نے See more کے Option کو دبا کر Hidden Contacts کو دیکھنا چاہا اور اس پر جیسے منوں کے حساب سے برف پڑی تھی۔ کم سے کم تین صفحات پر پھیلی ہوئی Contact list میں سیکڑوں ایڈریس تھے اور اگر ان میں سے ایک شہر بانو بھی ہو گئی تھی تو کون سی خاص بات ہو گئی تھی۔ مایوسی کچھ اتنی زیادہ تھی کہ اس نے شیر دل کے Contacts میں موجود ایک ایک نام کو پڑھا، حسب توقع 70 فیصد خواتین ہی تھیں اس فہرست میں۔

شہر بانو کا دل نہیں چاہا کہ وہ اس ای میل کا جواب دے اور اسے الوداع کہے اسے یقین تھا کہ سیکڑوں Contacts میں اگر ایک کی طرف سے اسے جواب نہ بھی ملا تو کیا فرق پڑے گا لیکن اگلے کئی دن ان Contacts سے Reply to all کے آپشن کے ساتھ آنے والے جوابات اور پیغامات ایک طرف اس کو بار بار ریمائنڈ دیتے رہے اور دوسری طرف بہت سی ای میلز میں شیر دل کے لیے خواتین کی طرف سے دکھائی جانے والی بے تکلفی اور اپنائیت اسے بے چین کرتی رہی اور کسی حد تک اسے ان لڑکیوں پر رشک بھی آتا رہا کہ وہ شیر دل کے ساتھ اس طرح بات کر سکتی تھیں...... وہ کتنا پاپولر تھا، پہلے اسے صرف اندازہ تھا لیکن ان میسجز سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ وہاں Heart Throb تھا اور کتنوں کے دل توڑ کر جا رہا تھا اور نہ ماننے کے باوجود شہر بانو جانتی تھی کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک ان کتنوں میں شامل تھی جن کا Crush شیر دل پر تھا۔

اگر اتنی لڑکیاں شیر دل کو ای میل کا جواب نہ دے رہی ہوتیں تو شہر بانو یقیناً اسے اس الوداعی پیغام کا جواب ضرور دے دیتی لیکن ان ای میلز کو پڑھ پڑھ کر شہر بانو کا دل شیر دل سے اٹھتا گیا تھا...... یا کم از کم اب اسے ہیرو سے ولن بنانا ضروری تھا تا کہ وہ اپنی اسٹڈیز، یونیورسٹی اور زندگی پر توجہ کر سکے۔

شیر دل آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے محو ہوتا گیا۔ ویب سائٹ پر دوسری تصویریں آ گئی تھیں اور اس کی زندگی میں بھی بہت کچھ بدلتا جا رہا تھا۔ تھرڈ ائیر میں اسے اپنی ممی کی بیماری کی وجہ سے U-Pen میں مائیگریشن کروانی پڑی تھی۔ اپنی گریجویشن مکمل کرنے کے بعد اسے خوش قسمتی سے ایک بار پھر ہارورڈ میں ماسٹرز کے لیے ایڈمیشن مل گیا تھا۔ اس بار وہ Dudley House میں تھی اور یونیورسٹی میں آنے کے چوتھے دن اس نے اپنے اپارٹمنٹ کے لاؤنج میں شیر دل کو دیکھا تھا، وہ پانچ دوسرے لوگوں کے ساتھ اس چار بیڈ روم اپارٹمنٹ کو شیئر کر رہی تھی اور اس وقت یونیورسٹی سے واپس آئی تھی جب سیدھے اپنے بیڈ روم کی طرف جانے کے بجائے وہ پانی پینے کے لیے کچن میں آئی تھی اور لاؤنج میں قدم رکھتے ہی اس نے جس شخص کو وہاں مارٹن کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا تھا اس نے شہر بانو کے ہوش اڑا دیے تھے۔ سیاہ جینز اور سیاہ ٹی شرٹ پہنے وہ شیر دل تھا جو بڑے ریلیکس انداز میں اپنی ٹانگیں سینٹر ٹیبل پر ٹکائے صوفے پر نیم دراز کسی ڈرنک کا کین ہاتھ میں لیے برابر بیٹھے مارٹن کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ شہر بانو کی ہیلو کے جواب میں مارٹن کے ساتھ اس نے بھی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ہیلو سے آگے کچھ نہیں کہہ سکی۔ وہ اسی طرح فریز ہوئی تھی۔ شیر دل نے سینٹر ٹیبل سے اپنی ٹانگیں ہٹاتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اس کی ہیلو کا جواب ایک خیر مقدمی مسکراہٹ سے دیا۔ شہر بانو کی بھوک پیاس لمحوں میں غائب ہو گئی تھی۔ اس اپارٹمنٹ کے ایک بیڈ روم کو ہائر کرتے ہوئے اس نے سنا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کے پانچ مکینوں میں سے ایک پاکستانی بھی تھا لیکن وہ اس ''پاکستانی'' کو آج پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ وہ ساڑھے پانچ سال پہلے کی طرح ایک ٹین ایج، بے وقوف نہیں تھی پھر بھی شیر دل کو دیکھ کر اس کے طوطے، کبوتر اسی طرح اڑے تھے۔ شیر دل نے اپنا تعارف کروایا اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ فل برائٹ اسکالر تھا اور ہارورڈ کینیڈی اسکول میں ماسٹرز کے لیے زیرِ تعلیم تھا۔ شہر بانو ہارورڈ کے آرکیٹیکچر اسکول میں ماسٹرز کے لیے Enrolled تھی۔ اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے اسے بار بار گریجویشن کے دوران اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ کرنا پڑتا تو وہ اس وقت فائنل سمسٹر میں ہوتی اور پھر شاید شیر دل سے اس کی ملاقات نہ ہوتی۔ بعض دفعہ تاخیر بھی زندگی بدل دیتی ہے جیسے اس سال اس کی بدلی تھی۔

شیر دل اور اس کے درمیان صرف چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا وہاں لاؤنج میں کھڑے...... پھر وہ کچن ایریا میں گئے بغیر وہیں سے واپس اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی لیکن اپنا دل ودماغ سب کچھ باہر لاؤنج میں بیٹھے شیر دل کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں ایک جن کی طرح آیا تھا۔

☆☆☆

''تم نے بتایا نہیں؟'' شہر بانو چونکی۔ تزئین کی آواز اس کو ماضی سے واپس کھینچ لائی۔ تزئین اپنا سوال دہرا رہی تھی۔ شہر بانو نے ایک نظر پھر شیر دل کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

''ہم لوگ کزن ہیں۔''

''اوہ، اچھا.....یعنی خاندان میں ہی شادی ہوئی ہے۔'' تزئین نے دلچسپی لی۔
''جی۔'' شہر بانو مسکرائی۔
''فرسٹ کزن؟''
''جی، فرسٹ کزن۔'' اس سے پہلے کہ تزئین کچھ اور کہتی ملازم نے آکر ڈنر لگنے کی اطلاع دی۔ اور سارے مسئلے کا آغاز ڈنر ٹیبل پر تزئین کی گفتگو سے ہوا تھا۔
''بھائی آپ نے اس گھر کے بارے میں کچھ سنا ہے؟'' شیر دل اور شہر بانو بیک وقت چونکے۔ ان کا ذہن ڈی پی او ہاؤس کی طرف گیا تھا۔
''اس گھر کے بارے میں بھابی؟'' شیر دل نے کچھ حیرانی سے تزئین سے کہا۔
''ارے نہیں، میں آپ لوگوں کے گھر کے بارے میں کہہ رہی ہوں۔''
''چلیں شکر ہے، میں سمجھا تھا یہاں کا ہر سرکاری گھر Haunted ہے۔'' اختر، شیر دل کے تبصرے پر ہنسا۔
''اس اعتبار سے تو پاکستان کا ہر سرکاری گھر Haunted ہے.....Ask a common man۔'' اختر نے برجستہ کہا۔ اس بار وہ سب اس تبصرے سے محظوظ ہوئے تھے۔ ملازم کھانا سرو کر رہا تھا جب شہر بانو، تزئین کے جملے پر اپنی پلیٹ میں کھانا نکالتے ہوئے ٹھٹکی۔
''تو تم لوگوں نے اپنے گھر کے قصے سن لیے؟'' تب ہی شیر دل نے کچھ استہزائیہ انداز میں مسکرا کر ایک نظر شہر بانو کو دیکھتے ہوئے تزئین سے کہا۔
''وہ تو آتے ہی سن لیے تھے۔ بونے اور افیئر اور مرڈر اور Suicide.....اور What not.....'' شیر دل کا انداز بے پروائی لیے ہوئے تھا۔
''اور یہ بھی سنا کہ اس گھر میں رہنے والا ہر جوڑا الگ ہو جاتا ہے؟'' تزئین نے سنجیدگی سے کہا۔ شیر دل اور شہر بانو نے بیک وقت تزئین کو دیکھا۔ ان کے انداز میں حیرانی نے تزئین کو حیران کیا۔
''یعنی تم لوگوں نے یہ قصہ نہیں سنا؟''
''جھوٹی باتیں ہیں ساری.....میری بیگم کو ایسے قصوں میں بڑی دلچسپی رہتی ہے.....تم سنجیدگی سے مت لینا۔'' اختر درانی نے مداخلت کرتے ہوئے شیر دل کو خبردار کیا۔ شیر دل نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔
''Unfortunately میری بیوی کو بھی ان قصوں میں بھابی جیسی ہی دلچسپی ہے اس لیے میں سنجیدہ لوں نہ لوں، وہ سنجیدگی سے ہی لے گی۔''
''آپ کیا کہہ رہی تھیں بھابی؟'' شہر بانو نے شیر دل کے تبصرے کو نظر انداز کیا۔
''آپ کو پتا ہے اختر میں کوئی غلط بات نہیں کر رہی.....ہسٹری اٹھا کر دیکھ لیں ان تمام آفیسرز کی.....آج تک کوئی ایک کپل یہاں پوسٹ ہونے کے بعد اکٹھا نہیں رہ سکا.....یا میاں نے دوسری شادی کر لی یا بیوی نے.....یا دونوں میں سے کسی کی ڈیتھ ہو گئی۔'' تزئین نے جیسے اپنے میاں کی بات کا برا منایا تھا۔ شہر بانو کے چہرے کی رنگت فق ہوئی تھی۔
''تو اس میں اس گھر کا کیا رول ہے.....قسمت کی بات ہے۔'' اختر نے صورتِ حال سنبھالنے کی کوشش

کی۔ شیر دل اب بھی اسی بے پروائی سے کھانا کھا رہا تھا لیکن شہر بانو کی بھوک غائب ہوئی تھی۔
''گھر کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے.....اب کچھ ہے اس گھر میں تو ایسی بات مشہور ہے اگر گھر کا کوئی عمل دخل نہ ہوتا تو.....'' اختر نے مداخلت کی۔
''میرا خیال ہے کھانے پر دھیان دینا چاہیے۔''
''اتنا پیارا کپل ہے آپ دونوں کا.....بھائی میں تو کہہ رہی ہوں آپ لوگ ریسٹ ہاؤس میں ہی رہ لیں یا کوئی اور انتظام کر لیں۔ وہ گھر ٹھیک نہیں ہے۔'' تزئین نے اختر کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
''بھابی میری Official Residence ہے وہ.....اور میں بزدل تو نہیں ہوں کہ صرف قصے کہانیاں سن کر گھر ہی نہ جاؤں.....اللہ مالک ہے۔'' شیر دل نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ لیکن بے حد دوٹوک انداز میں تزئین سے کہا۔
''میں نے کہا تھا نا شیر دل میری بیگم کچھ وہمی ہیں بالکل بھی اسپرٹ ہونی چاہیے۔ ہم لوگ ایک بار ایبٹ آباد میں پوسٹڈ تھے اور وہاں مشہور تھا کہ ہماری سرکاری رہائش گاہ.....'' اختر درانی کوئی اور قصہ سنانے لگا۔ بات موضوع سے ہٹ گئی تھی لیکن شہر بانو کے ذہن میں اب کچھ اور نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

''میں تم کو اس قدر احمق نہیں سمجھتا تھا شی۔'' شیر دل نے کچھ خفگی کے عالم میں اس سے کہا وہ اب مثال کے بیڈ روم میں بیٹھے بات کر رہے تھے۔ شیر دل لائٹر سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔
''اس میں حماقت والی کیا بات ہے؟'' شہر بانو نے بھی جواباً اتنی ہی خفگی سے کہا۔
''تم نے کہا کہ اوپر والے ماسٹر بیڈ روم میں نہیں رہنا.....میں نے کہا ٹھیک ہے.....تم نے کہا چھت کو بند کروا دو.....میں نے وہ بھی کروا دیا.....پورے گھر پر چڑھی ہوئی بیلیں کٹوا دیں تم نے.....جو درخت کھڑکیوں تک آ رہے تھے وہ بھی کٹوا دیے تم نے.....میں نے ہر بات مانی تمہاری.....But this is Just ridiculous۔'' شیر دل کچھ خفگی کے عالم میں اس سے کہہ رہا تھا۔
''میں Superstitious نہیں ہوں شیر دل لیکن میں رسک بھی نہیں لے سکتی۔'' شہر بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔
''یہ Myths ہیں اور کچھ نہیں.....تم نے ایک Myth اس گھر کے بارے میں یہ سنی تھی کہ یہ Haunted ہے اب کتنے دنوں سے ہم لوگ یہاں رہ رہے ہیں کچھ ہوا کیا؟'' شیر دل نے جواباً اس سے پوچھا۔ وہ اب سگریٹ پیتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔
''نہیں ہوا.....ہو تو سکتا ہے۔'' شہر بانو نے کچھ Irritate ہو کر کہا۔
''مثلاً کیا ہوگا؟'' شیر دل چلتے چلتے بالکل اس کے بالمقابل رک گیا۔
''اب مجھے کیا پتا کہ کیا ہوگا۔'' شہر بانو اس کے اس انداز پر کچھ اور خفا ہوئی۔
''کچھ نہیں ہوگا یار.....Trust me۔'' وہ اس کے قریب صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اس نے شہر بانو کے گرد ایک بازو پھیلایا تھا یوں جیسے اسے کسی چھوٹے بچے کی طرح سہلانے اور بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''مجھے یہاں نہیں رہنا شیر دل۔'' شہر بانو نے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی وہ اب اس کی توجہ اس ایشو سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں تمہارا ہوں شی، میں ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا...... تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...... کوئی مجھے تم سے چھین نہیں سکتا۔'' سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھٹکتے ہوئے شیر دل نے نرم گہری آواز میں اس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شہر بانو ننھے بچوں کی طرح شیر دل سے لپٹ جاتی۔ وہ شخص اس کے لیے صرف شوہر نہیں تھا۔ سب کچھ تھا...... اور ''سب کچھ'' میں شیر دل کے ساتھ اس کے کتنے رشتے تھے، وہ کم از کم انگلیوں کی پوروں پر نہیں گن سکتی تھی۔

''میں جانتی ہوں تم میرے ہو...... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکتا...... مجھے تم پر اندھا اعتماد ہے شیر دل۔'' اس نے جواباً شیر دل سے کہا۔

''پھر؟'' وہ مسکرایا۔

''لیکن وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔'' شہر بانو نے کچھ کمزور آواز میں کہا۔

''یہ آسیب، بھوت پریت اور بونے بکواس چیزیں ہیں، میں ان کو نہیں مانتا۔'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے...... کسی گھر کسی جگہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ میری آفیشل ریذیڈنس ہے اور میں یہیں رہوں گا۔ میں یہاں سے بھاگ کر اپنے اسٹاف کو خود پر ہنسنے کا موقع نہیں دوں گا۔''

وہ اب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بے حد سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ گرفت نرم تھی، لہجہ سخت تھا۔

''لیکن......'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھ سے پہلے جتنے آفیسرز یہاں آئے وہ اسی گھر میں رہے...... تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے یہ سب قصے کہانیاں نہیں سنی ہوں گی؟'' وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ وہ شیر دل سے ہر بات نہیں منوا سکتی تھی یہ اس نے اپنی اور شیر دل کی کورٹ شپ کے دوران ہی جان لیا تھا لیکن وہ اس کے باوجود بہت سارے معاملات پر ضد کرتی تھی اور شیر دل اسے ضد کرنے دیتا تھا۔ اس میں وقت کے علاوہ دونوں کا کچھ نہیں جاتا تھا۔

''تو سویٹ ہارٹ ہم یہیں رہیں گے۔'' شیر دل نے اس کو خاموش دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ کی پشت پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''یہ ونڈوز مجھ کو زہر لگتی ہیں۔'' شہر بانو نے اپنی جھنجلاہٹ اس کھڑکی پر اتاری جس کے سامنے اس وقت وہ صوفہ تھا جس پر وہ دونوں بیٹھے تھے۔ شیر دل نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ روکی۔

''بدلوا دیتے ہیں صبح ہی۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ وہ جانتا تھا وہ اپنا غصہ اب کسی اور چیز پر اتارے گی۔

''تم کبھی میری کوئی بات نہیں مانتے۔'' اس نے اپنے عقب میں شہر بانو کو کہتے سنا۔ وہ اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے رکا پھر بڑے اطمینان سے بولا۔

''یہ تو ہے...... But I Love You Shaib۔'' صوفے پر بیٹھی ہوئی شہر بانو نے بے حد خفا انداز میں اسے دیکھا۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''Smile Please۔'' وہ اب ایک بار پھر اس کو بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

''No۔'' شہر بانو نے بے حد خفگی سے کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس مرد سے اسی طرح لاڈ کروانے، ناز اٹھوانے کی عادی تھی اور اسی لیے اس پر مرتی تھی۔

''Honey۔''

''No۔''

''Sweet Heart۔''

''No۔''

''Darling۔''

''No۔''

وہ اسے منا رہا تھا، وہ صوفے پر آنکھیں بند کیے اسی انداز میں انکار کر رہی تھی مگر اس کا ہر اندازِ تخاطب اسے موم کی طرح پگھلا رہا تھا۔ اس کے ماتھے کے بل، ہونٹوں کے تبسم میں بدل رہے تھے۔ شیر دل کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی تھی۔ وہ ہنوز آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی لیکن اس کے ہونٹ اب مسکرا رہے تھے۔ بعض دفعہ مثال شہر بانو سے یا شہر بانو مثال سے اس قدر مشابہ لگتی کہ اس کے لیے یہ تخصیص کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ اس وقت کس کو دیکھ رہا ہے جیسے اس وقت شہر بانو کو دیکھتے ہوئے اسے مثال کا خیال آ رہا تھا۔

''میں سونے کے لیے جا رہا ہوں۔'' شیر دل نے جماہی لیتے ہوئے اس کی مسکراہٹ سے جیسے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ ان کی ازدواجی زندگی میں کبھی ایک رات بھی ایسی نہیں گزری تھی جب شیر دل نے اسے خفا ہو کر سونے یا رونے دیا ہو۔ وہ اپنے معاملات میں اپنی مرضی کرتا تھا لیکن وہ اسے ناراض بھی نہیں رہنے دیتا تھا۔

شہر بانو نے آنکھیں کھول دیں۔ شیر دل وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے کمرے میں پڑی چیزیں سمیٹنے لگی۔ وہ اس وقت ٹیبل پر پڑا شیر دل کا سگریٹ پیک اور لائٹر اٹھا رہی تھی جب اس نے کسی کو اپنا نام پکارتے سنا۔

''شہر بانو۔'' وہ ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی، ایک لمحے کے لیے اسے لگا شیر دل نے اسے پکارا تھا مگر شیر دل وہاں نہیں تھا۔

''شاید دوسرے کمرے سے پکار رہا ہے۔'' شہر بانو نے سوچا اور اس کا لائٹر اور سگریٹ پیک اٹھا کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ شیر دل وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے واش روم میں تھا۔ اس کے سائڈ ٹیبل پر اس کا لائٹر اور پیک رکھتے ہوئے شہر بانو نے اس آواز کو اپنا وہم سمجھ کر جھٹکا۔ اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ رات کے اس پہر اسے پکارنے والا شیر دل کے علاوہ کوئی دوسرا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

''میں نے ایک جن دیکھا تا نا۔'' اس رات چڑیا نے خیر دین کو آئینے میں نظر آنے والے عکس کے بارے میں بتایا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ وہ بونا ہو سکتا تھا اور کنفیوژن اسے یہ تھی کہ اگر وہ بونا نہیں تھا تو پھر کیا تھا...... بدصورتی اور خوف ناکی نے اسے اس دیکھی جانے والی چیز کے لیے جن کا لفظ استعمال کرنے پر اکسایا تھا لیکن اس کے تصور میں جن ایک Huge جسم کا مالک ہونا چاہیے تھا اور یہاں...... لیکن اس کے باوجود اس نے اس عکس کے لیے جن کا لفظ ہی استعمال کیا تھا۔

خیر دین اس کے انکشاف پر چونکا تھا۔ ''کہاں دیکھا؟'' اس نے پوچھا۔

''اس آئینے میں جو باہر برآمدے میں لگا ہے۔'' چڑیا نے بے حد سنجیدگی کے عالم میں کہا۔ خیر دین نے چڑیا کو گود میں لیتے ہوئے جیسے تحفظ دینے والے انداز میں اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''تم کو منع کرتا ہوں نا میں کہ مت جایا کرو شام کے بعد آئینوں کے پاس۔''

''لیکن نانا وہ جن بہت چھوٹا سا تھا...... اتنا...... نہیں...... اتنا۔'' چڑیا نے خیر دین سے الگ ہوتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کچھ الجھے انداز میں جن کے سائز کا تعین کرنے کی کوشش کی۔

''بیٹا جن نہیں ہے وہ...... بونا ہے۔'' خیر دین نے اسے ٹوکا۔

''نہیں نانا...... وہ بونا نہیں تھا...... وہ بدصورت تھا...... اتنا ڈراؤنا...... اور کالا سیاہ۔'' چڑیا یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس کے تصوراتی بونوں میں سے کوئی بھی اس حلیے کا ہو سکتا ہے جو اس نے دیکھا تھا۔

''وہ بونا ہی تھا بیٹا...... بونے بھی اتنے ہی خوف ناک ہوتے ہیں دیکھنے میں جتنے جن، بھوت...... بلکہ بعض تو جن بھوتوں سے بھی زیادہ ڈراؤنے ہوتے ہیں...... بس جسم اور قد کا فرق ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔'' خیر دین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ چڑیا کی تصوراتی دنیا کو ڈھانے کی جیسے پہلی کوشش تھی لیکن وہ بچی تھی اتنی آسانی سے کیسے مان جاتی، چنٹو، منٹو، ٹوکو اور دوسرے بونوں کو کیسے منٹوں میں ہوا میں تحلیل ہونے دیتی۔ خیر دین کے علم کو اس نے اس سے پہلے بھی چیلنج نہیں کیا تھا۔ وہ نانا کے علم پر اندھا ایمان رکھتی تھی۔ خیر دین کا وجود وہ آنکھیں تھیں جس سے وہ دنیا دیکھتی تھی۔ وہ اس کو اپنے بچپن کے انگریزوں کے قصے سناتا...... وہ پلکیں جھپکائے بغیر سنتی...... انگریز اس نے ٹی وی پر دیکھے تھے۔ کتابوں میں یا پھر خیالوں میں...... لیکن اس کے لیے یہ سوچنا مشکل تھا کہ وہ بھی وہاں تھے ان کے ملک میں...... حاکم کے طور پر...... اس کے لیے انگریز بھی ایک خلائی مخلوق جیسے تھے اور ان کا دیس کوہ قاف جیسا...... اور خیر دین اس خلائی مخلوق کی عجیب عجیب باتیں سناتا تھا...... ان کی اصول پرستی کی...... ان کی دیانتداری کی...... ان کی محنت اور جانفشانی کی...... ان کی خوب صورتی اور ذہانت کی...... اور ان کی زبان کی...... وہ زبان جو وہ خیر دین کے منہ سے سنتی تو متاثر ہوتی اور خود بولتی تو فخر کے احساس کے ساتھ۔

مگر آج وہ پہلی بار خیر دین کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ کتابوں میں دیکھا جانے والا خوب صورت Image خیر دین کے بتائے ہوئے سچ اور حقیقت سے زیادہ طاقتور اور زیادہ پُراثر تھا۔ اس نے ... خیر دین سے نہیں کہا تھا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ غلط تھا اس گھر میں کہیں نہ کہیں چنٹو، منٹو، ٹوکو وغیرہ ہی تھے...... وہ بدصورت شے نہیں جسے اس نے آئینے میں دیکھا تھا۔

وہ خیر دین اور حلیمہ کے ساتھ نئے ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو سلام کرنے گئی تھی اور وہ پہلی نظر میں ہی اس ڈپٹی کمشنر کی بیوی پر بری طرح فریفتہ ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے وہ اسے انگریز لگی تھی وہی انگریز جسے اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا اور جن کے ہزاروں قصے اس نے خیر دین سے سنے تھے۔ دراز قد، بے حد دبلی پتلی اور بے حد حسین...... جس کا لب ولہجہ بھی انگریزوں جیسا تھا...... حالانکہ وہ ان لوگوں کے ساتھ اردو میں بات کر رہی تھی۔

اس نے چڑیا سے چند رسمی سوال جواب کیے اور پھر خیر دین اور حلیمہ سے گفتگو کرنے لگی تھی۔ چڑیا کی توجہ اس تین سالہ، ماں ہی کی طرح خوب صورت، بچی نے کھینچ لی تھی جو اس وقت بھی اس کمرے میں ایک کھلونا پکڑے

ادھر سے اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی حلیمہ اور خیر دین کے ساتھ بات چیت کے دوران وقفے وقفے سے اپنی بیٹی کو ہدایت بھی دے رہی تھی۔

چڑیا کا دل بار بار چاہ رہا تھا کہ وہ بچی اس کی طرف متوجہ ہو اور وہ اس سے بات کر سکے لیکن وہ بچی اپنے کھلونے اور بھاگ دوڑ میں اس قدر مگن تھی کہ اس نے حلیمہ اور خیر دین کے پاس کھڑی چڑیا کو دیکھا تک نہیں۔

چڑیا وہاں سے واپس جاتے ہوئے بھی بار بار پلٹ کر اس بچی کو دیکھتی رہی جس کے گھنے سیاہ ریشمی خوب صورت بالوں کو وہ چھونا چاہتی تھی...... اور جس کے گالوں پر ہاتھ لگا کر وہ جیسے ان کی نرمی محسوس کرنا چاہتی تھی اور جس کے فراک کی مڑی ہوئی فرل کو سیدھا کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ان میں سے کوئی کام بھی نہیں کر سکی۔

نئے ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی فرح اور عابد کی طرح فرینڈلی نہیں تھے۔ وہ دونوں بے حد ریزروڈ تھے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہاؤس وائف تھی اور وہ گھر کے نوکروں کو ایک فاصلے پر رکھتی تھی۔ وہ ہر جگہ نوکروں کا آنا جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ چڑیا کا گھر میں آنا جانا بھی بے حد محدود ہو گیا تھا اور وہ اس بچی کے ساتھ کھیلنے کی بے انتہا خواہش کے باوجود بھی اس کے قریب نہیں جا پائی تھی۔ وہ کبھی کبھار اسے اپنے ماں باپ کے ساتھ لان میں کھیلتے ہوئے دیکھتی لیکن وہ اس وقت بھی وہاں اس کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ نئے صاحب کا حکم تھا کہ ملازم صرف اس وقت وہاں آئیں جب بلائے جائیں اور صاحب کی بیٹی جب لان میں ہو تو کوئی ملازم وہاں نہیں آئے گا اور چڑیا ایک ملازم کی نواسی تھی۔ طبقاتی تقسیم کو چڑیا نے تب پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس سے پہلے صرف کوارٹر نہیں وہ پورا ڈی سی ہاؤس اس کا تھا۔ وہ اپنے ونڈر لینڈ میں گھومتی رہتی تھی اور وہاں کی ہر جگہ کو Own کرتی تھی۔

جس دن خیر دین نے چڑیا کو نئے صاحب اور ان کی بیوی کی ہدایات پہنچائیں وہ حیران رہ گئی تھی۔

''کیوں نانا......؟ وہ تو میرا بھی گھر ہے، میں وہاں کیوں نہ جاؤں؟'' اس نے حیرانی میں خیر دین سے سوال کیا۔

''نہیں بیٹا، وہ ہمارا گھر نہیں ہے...... وہ بڑے صاحب کا گھر ہے...... ہمارا گھر تو یہ کوارٹر ہے۔'' خیر دین نے چڑیا کو سمجھایا تھا۔

''لیکن صاحب کا گھر اتنا بڑا اور ہمارا اتنا چھوٹا کیوں ہے؟'' چڑیا نے اعتراض کیا۔

''کیونکہ صاحب زیادہ پڑھا لکھا ہے، اس نے زیادہ محنت کی ہے اس لیے اس کو بڑا گھر ملا۔'' خیر دین نے اپنی طرف سے ایک آسان جواب دینے کی کوشش کی۔

''پر نانا محنت تو آپ زیادہ کرتے ہیں...... آپ صبح جلدی اٹھتے ہیں...... کھانا بناتے ہیں...... سارا دن صاحب کے گھر میں کام کرتے ہیں...... رات تک...... صاحب تو صبح بھی دیر سے اٹھتا ہے، دیر سے آفس جاتا ہے...... آپ جتنی محنت تو نہیں کرتا۔'' سات سال کی وہ بچی اپنے نانا کو کام چور اور کم محنتی سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔

خیر دین نے گہری سانس لی۔

''ہاں بیٹا...... پر میرا سارا کام ہاتھوں کا کام ہے...... صاحب کا کام دماغ کا کام ہے، دماغ کے کام کی ویلیو ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے...... اب اس گھر میں دیکھو میری طرح محنت کرنے والے کتنے ہوں گے...... دروازوں پر کھڑے گارڈز...... لان میں کام کرنے والے مالی...... غسل خانہ صاف کرنے والے جمعدار...... صفائی کرنے والے...... اور میرے ساتھ کچن میں کام کرنے والے ملازم...... فون والے آپریٹر...... لیکن اس گھر میں صاحب

صرف ایک ہے......اور اس میں اور ہم سب میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ بہت پڑھا لکھا ہے اور اس کا سارا کام ذہن سے ہوتا ہے......'' خیر دین اس بچی کو گرو دے رہا تھا جو اس بچی کے ذہن پر نقش ہو رہا تھا۔

''پورے جسم میں دماغ چھوٹا سا ہوتا ہے لیکن یہ جسم میں سب سے اوپر ہوتا ہے سر میں......اور پورا جسم اس کے کنٹرول میں ہوتا ہے جیسے صاحب یہاں بیٹھا اس پورے شہر کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ بادشاہ ہے، جیسے Chess کا King ہوتا ہے نا۔'' خیر دین نے اسے شطرنج کی مثال دی۔ وہ چڑیا کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا اور چڑیا Chess Board اس کے Pieces سے ہی نہیں بلکہ کھیل سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔

''پر کنگ تو بڑا کمزور ہوتا ہے وہ تو بس ایک خانے تک چلتا ہے۔'' چڑیا نے جیسے اس کے Metaphor پر اعتراض کیا۔

''ہاں پر ہوتا تو وہ بادشاہ ہی ہے نا اور صرف بادشاہ ہے جو ایک ہوتا ہے......باقی سارے Pieces بادشاہ کے لیے کام کرتے ہیں......اس کو بچانے اور جتوانے کے لیے......تو بادشاہ اس لیے سب سے طاقتور ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک ہوتا ہے...... Horse,Bishop,Pawn اور Rook سب ایک سے زیادہ ہوتے ہیں۔'' خیر دین نے اسے سمجھایا۔

''Queen تو بھی تو ایک ہوتی ہے۔'' خیر دین بے اختیار ہنسا......اس نے کوئین کو جان بوجھ کر چھوڑا تھا لیکن اسے اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ سب مہروں کے نام گنواتے ہوئے کوئین کو چھوڑنے پر چڑیا اسے نوٹس ضرور کرے گی۔

''اور کوئین تو بہت پاورفل ہوتی ہے......آپ نے ہی کہا تھا چیس بورڈ پر کوئین ہی سب سے زیادہ پاورفل اور ڈینجرس ہے......کیونکہ وہ دائیں بائیں آگے پیچھے، ترچھا ہر طرف موو کر سکتی ہے اور جتنے مرضی خانے۔'' چڑیا نے خیر دین کا دیا ہوا علم اس کے سر پر الٹا، خیر دین ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ وہ چڑیا کے ہاتھوں لاجواب ہوا تھا وہ اس کے جوابوں سے اسی کو باندھنے میں استاد تھی......اور خیر دین کو اس کی ذہانت اس کے علم اور اس کے ہاتھوں لاجواب ہونے پر بھی فخر ہوتا تھا......وہ اس کی اگلی نسل تھی......اس کا اثاثہ تھی......اکلوتا، قیمتی، واحد اثاثہ......وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

''ہاں، ہوتی تو کوئین ہی سب سے طاقتور ہے لیکن چیس بورڈ پر کوئین بھی بادشاہ کے لیے لڑتی ہے بادشاہ سے نہیں لڑتی۔'' خیر دین نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کوئین بادشاہ کیوں نہیں ہو سکتی نانا......؟'' خیر دین کو ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ لاجواب وہ اس سوال پر بھی ہوا تھا۔ اس چھوٹی سی بچی کو وہ کیا سمجھاتا کہ Issue صرف Gender کا تھا اور تفریق Man-Made تھی۔

''چیس میں تو کوئین کا کوئین ہی رہنا ضروری ہے ورنہ کھیل بدل جائے گا چڑیا......لیکن دنیا میں تو کوئین بھی بادشاہ ہو سکتی ہے......میں نے تمہیں انگلینڈ کی کوئین کا بتایا تھا نا......وہاں کوئین ہی بادشاہ ہے۔'' خیر دین نے اسے یاد دلایا۔

''میں جب بڑی ہو جاؤں گی تو میں ایک کھیل بناؤں گی چیس کی طرح کا......جس میں سب کوئین کے لیے لڑیں گے......اور کوئین ہی بادشاہ ہو گی......جب سب سے زیادہ پاورفل کوئین ہے تو پھر بورڈ کوئین کا ہونا چاہیے بادشاہ کا نہیں نانا۔'' چڑیا نے چند لمحوں بعد بے حد سنجیدگی سے خیر دین کو مطلع کیا۔ ''اور نانا اس کھیل میں بادشاہ بھی کوئین ہی کے لیے لڑے گا۔'' اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ خیر دین کو بتایا۔ خیر دین ایک گہری سانس لیتے ہوئے مسکرایا۔

''ہم تو پیادے ہیں چڑیا......نہ بادشاہ......نہ ملکہ......'' اس بار خیر دین نے اسے سمجھانے کے لیے Metaphor بدل لیا۔ ''سب سے چھوٹا مہرہ......''

''پر نانا جب Pawn چیس بورڈ پر مخالف کی آخری رو تک پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی بڑا پاورفل ہو جاتا ہے۔ وہ جو چاہے بن سکتا ہے۔'' چڑیا نے ترکی بہ ترکی خیر دین سے کہا۔ اس کا اشارہ چیس کی اس مشہور موو کی طرف تھا جس میں اگر ایک طرف کا پیادہ مخالف کی آخری Row تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی پروموشن ہو جاتی اور وہ Horse,Bishop,Rook,Queen میں سے جو چاہے بن جاتا اور تب زیادہ تر وہ پیادہ کوئین بننا ہی منتخب کرتا تھا۔ خیر دین کے ساتھ چیس کھیل کھیل کر چیس کی کم از کم ساری مشہور موو چڑیا کو مکمل طور پر ازبر تھیں۔

''پر چڑیا تم کو پتا ہے ایک Pawn کا دوسری طرف آخری رو تک جا پہنچنا کتنا مشکل ہے؟'' خیر دین نے گفتگو کو چڑیا کو زندگی کا ایک اور سبق دینے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔

''پورا بورڈ پار کر کے مخالف کی آخری رو تک جاتا ہے وہ......ان کے سارے Pawns, Horses, Rooks, Bishops اور Queen اور King سے لڑتا ہوا......بیٹا یہ بہت مشکل کام ہوتا ہے......بہت ہی مشکل...... Pawn سے Queen بننا۔'' وہ خیر دین کے چہرے پر نظریں جمائے خیر دین کی بات سن رہی تھی۔

''لیکن نانا یہ ہو سکتا ہے؟'' سات آٹھ سالہ اس بچی نے اپنی چمکتی نظریں خیر دین کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

''بہت محنت سے......ذہانت سے......اور قسمت سے۔'' خیر دین نے جواب دیا۔ چڑیا ان تین اجزا میں سے صرف قسمت پر اٹکی تھی۔

''قسمت......؟ نانا قسمت کیا ہوتی ہے؟''

''اللہ کی مدد اور مرضی۔'' خیر دین نے کہا۔ بات سمجھ میں آئی نہ آئی لیکن بات چڑیا کے ذہن میں رہی......دوسری بہت سی باتوں کی طرح۔

''قسمت بڑی چیز ہوتی ہے چڑیا......'' خیر دین نے مزید کہا۔

''کتنی بڑی؟'' چڑیا نے تجسس سے پوچھا، وہ اس کو بھی کوئی مادی وجود رکھنے والی مافوق الفطرت چیز سمجھی تھی۔

''بہت بڑی۔'' خیر دین نے سنجیدگی سے کہا۔

''نظر آتی ہے؟''

''ہمیشہ۔''

''ہر ایک کو؟''

''تقریباً......'' خیر دین نے مسکرا کر کہا۔

سات بونوں کے علاوہ اب چڑیا کو قسمت سے ملنے اور اسے دیکھنے کا شوق بھی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شیر دل کی آنکھ کس وجہ سے کھلی تھی، اسے فوری طور پر اندازہ نہیں ہوا۔ کمرے میں زیرو واٹ کی روشنی تھی اور یہ یقیناً اس کی صبح خیزی نہیں تھی جو رات کے پچھلے پہر اس کو یوں جگانے کا باعث بنی تھی۔ اپنے ساتھ لیٹی ہوئی مثال کو بہت آہستگی سے ہٹاتے ہوئے اس نے بایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑا الارم کلاک اٹھا کر دیکھا۔ آج پھر 2:30 کا وقت تھا۔ اس نے الارم کلاک واپس رکھ دیا۔ یہ پچھلے کئی دن سے ہو رہا تھا۔ وہ کئی دن سے رات کے اس پہر بالکل اس وقت بغیر کسی وجہ کے جاگ جاتا اور پھر اسے کوشش کے باوجود نیند نہیں آتی تھی۔ آج رات وہ ایک ٹور سے واپس آیا تھا اور رات کو تقریباً ایک بجے سویا تھا۔ بے حد تھکاوٹ کے باوجود وہ صرف ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دوبارہ اسی مقررہ وقت پر جاگ گیا تھا۔ چند لمحے اس نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ برابر میں لیٹی مثال کا چہرہ کمبل سے ڈھکتے ہوئے اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل لیمپ آن کیا اور پھر اپنے بیڈ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح شہر بانو کو دیکھا۔ وہ آج پھر بیڈ کے دوسری طرف بالکل بیڈ کے آخری سرے پر تھی۔ ایک کروٹ لینے پر وہ بستر سے نیچے گر جاتی۔ وہ آج بھی کمبل سے باہر تھی نائٹ شرٹ اور پاجامے میں ایک ننھے بچے کی طرح سکڑی سمٹی ہوئی۔

شیر دل اپنے بستر سے اٹھ گیا، یہ جیسے اس کی زندگی کا معمول تھا۔ رات کو کبھی بھی جاگنے پر وہ لاشعوری طور پر سب سے پہلے شہر بانو کو چیک کیا کرتا تھا اور اس کا یہ معمول ان کی شادی کے چوتھے دن سے شروع ہوا تھا جب وہ رات کے وقت بستر سے گر کر بیڈ سائڈ ٹیبل کے دراز کی ناب سے اپنا سر زخمی کروا بیٹھی تھی، شیر دل اس کے گرنے کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور کچھ دیر کے لیے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا تھا پھر شہر بانو کو بیڈ کی دوسری طرف فرش پر بیٹھا دیکھ کر اسے پلک جھپکتے میں سمجھ آ گیا تھا کہ کیا ہوا تھا۔ بیڈ کے دوسری طرف پہنچنے پر اس نے سب سے پہلے شہر بانو کا خون آلود چہرہ دیکھا تھا، وہ تکلیف میں تھی لیکن ابھی بھی جیسے آدھی نیند کی حالت میں اپنے سر کی داہنی طرف ہاتھ رکھے جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہوا کیا تھا۔ چوٹ داہنی کنپٹی سے کچھ اوپر سر میں لگی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سر پر چوٹ کی جگہ پر رکھے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے گال پر پھیلے خون کو چھوتے ہوئے بے یقینی سے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

”فار گاڈ سیک..... کیا کر لیا شہی؟“ شیر دل بے اختیار اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھ گیا، شہر بانو کچھ بول نہیں سکی۔ شیر دل نے اس کا ہاتھ ہٹا کر اس کے زخم کا جائزہ لیا پھر وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ زخم گہرا نہیں تھا اور شہر بانو زخم سے زیادہ اس طرح بستر سے گر جانے پر شرمندہ تھی۔

”لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ تم مجھ سے اتنی دور چلی کیسے گئیں؟“ شیر دل کو یہ بات واقعی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ رات کو اس کے سینے پر سر رکھے اس سے باتیں کرتے کرتے سوئی تھی اور پھر صرف گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں بستر کے دوسری طرف جا گرنا..... شہر بانو اسے یہ نہیں بتا سکی تھی کہ وہ پہلی بار بستر سے اس طرح گر کر زخمی نہیں ہوئی تھی، وہ بچپن سے بستر سے گرتی آ رہی تھی..... شیر دل کا افسوس کئی دن تک باقی رہا لیکن یہ راز زیادہ دیر تک اس کے لیے راز نہیں رہا تھا کہ شہر بانو اکثر بستر سے گرنے کی عادی تھی۔

پہلا کام جو شیر دل نے اس کی اس عادت کو جاننے کے بعد کیا تھا وہ اس کی سائڈ ٹیبل ہٹانے کا تھا یہ جیسے

اسے دوبارہ کسی نقصان سے بچانے کی کوشش تھی۔ شہر بانو اس کے اس فیصلے پر ہنستی رہی تھی۔

”کوئی ہمارے بیڈ روم میں آ کر دیکھے تو کیا کہے گا۔ بیڈ کے ایک طرف سائڈ ٹیبل ہی نہیں۔“ اس نے جیسے شیر دل کو اس کے اس فیصلے کے مضمرات سمجھانے کی کوشش کی۔

”کون آئے گا بیڈ روم میں.....؟“ شیر دل نے جواباً پوچھا۔

”کوئی بھی آ سکتا ہے۔“ شہر بانو نے کہا۔

”جو آئے اسے بتا دینا کہ کیوں ایک طرف سائڈ ٹیبل نہیں ہے۔“ شیر دل نے کہا۔

”میں اتنا زیادہ تو نہیں گرتی شیر دل۔“ شہر بانو نے جیسے وضاحت دینے کی کوشش کی۔

”I can,t take risk پچھلی بار بہت چوٹ لگی تھی..... میں دوبارہ تمہیں تکلیف میں دیکھنا نہیں چاہتا۔“ شیر دل نے اسے کہا وہ اب اسے اپنے بہت قریب سلاتا تھا اور رات کو وقتاً فوقتاً اسے دیکھتا رہتا تھا اس کے باوجود شہر بانو صبح تک اسے ہمیشہ بیڈ کے دوسرے سرے پر ہی ملتی تھی۔ جیسے اسے اس وقت ملی تھی۔ مثال کی پیدائش کے تو مہینے شہر بانو نے نہیں شیر دل نے تقریباً جاگ کر گزارے تھے..... شہر بانو کے بیڈ کی سائڈ پر فلور کشنز کا ڈھیر لگا دینے کے باوجود اسے یہی خدشہ رہتا تھا کہ وہ بستر سے گر نہ جائے۔

شہر بانو نیند میں اس کے ہاتھ لگانے پر کسمسائی تھی۔ شیر دل نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے بیڈ کے سرے سے دوسری طرف مثال کے قریب کیا پھر کمبل اس کے گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے خود بیڈ روم سے باہر آ گیا۔ اس کا جسم بے حد تھکا ہوا تھا لیکن ذہن مکمل طور پر تر و تازہ تھا اور یہ ایک بے حد عجیب کیفیت تھی۔ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے ایک جرسی پہن آیا تھا۔ کمرے کے باہر کاریڈور کی بند لائٹس آن کرتے ہوئے وہ ہال کی طرف جانے لگا۔ وہ اسٹڈی میں جا کر کچھ دیر کام کرنا چاہتا تھا۔ اسٹڈی کی طرف جاتے جاتے گھر کے مرکزی دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ بری طرح ٹھٹکا۔ بیرونی دروازے کی چٹخنی اتری ہوئی تھی۔ وہ پرانی طرز کا ڈبل دروازہ تھا۔ اندرونی طرف لکڑی کا دروازہ اور بیرونی طرف جالی کے دروازے اور اس وقت اندرونی دروازے کی چٹخنیاں نیچے تھیں۔ شیر دل رات کو سونے سے پہلے کچن کے عقبی دروازے سے اور مرکزی دروازے کو خود اندر سے بند کیا کرتا تھا اور یہ عادت اسے ہمیشہ سے تھی۔ وہ صبح سویرے جاگنگ کے لیے نکلتے ہوئے مرکزی دروازہ کھولتا تھا۔ خانساماں یا گھر کا کوئی دوسرا ملازم رات کو دروازے بند ہو جانے کے بعد اندر نہیں آ سکتے تھے جب تک وہ اندر سے دروازہ نہ کھول دیتا..... اور اب وہ دروازے کھلے تھے۔ اس نے اندرونی دروازہ کھولا، جالی کے دروازے کی دونوں چٹخنیاں بھی کھلی تھیں، وہ کچھ اضطراب کے عالم میں باہر نکلا۔ باہر ہلکی دھند اور شدید سردی تھی لیکن راؤنڈ لیتے ہوئے گارڈ نے گھر کے اندر جلنے والی لائٹس دیکھی تھیں اور وہ چوکنا ہو گیا تھا۔ شیر دل جب تک باہر نکلا، ایک گارڈ اسے ڈرائیو وے کے پاس ہی مل گیا تھا۔

”سر خیریت ہے؟“ رات کے پونے تین بجے اس طرح باہر نکلنے پر شیر دل اس سے یہی سوال کی توقع کر سکتا تھا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ گارڈ کو کیا کہے یا اس سے کیا پوچھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ شیر دل پہلے آفیسرز کے برعکس کچن کے عقبی دروازے کو ملازموں کے لیے کھلا نہیں چھوڑتا تھا اور رات کو عقبی اور مرکزی دروازہ خود بند کر کے سوتا تھا اگر وہ گھر سے کسی ملازم کو رات کو نکلتے دیکھیے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر دیتے۔

”گھر سے آج کوئی باہر تو نہیں نکلا؟“ شیر دل نے لہجہ نارمل رکھتے ہوئے گارڈ سے پوچھا۔
”کس وقت سر......؟“ گارڈ نے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔
”ابھی رات کو۔“
”نہیں سر...... میں نے تو کسی کو نکلتے نہیں دیکھا...... خیریت تو ہے سر؟“
”کچھ نہیں...... دروازہ کھلا تھا ابھی جب میں نے دیکھا...... اور میں رات کو دروازہ بند کر کے سویا تھا۔“

شیر دل نے اس سے کہا۔
”سر میں اندر چیک کرتا ہوں۔“ گارڈ ایک دم مستعد ہو گیا۔
”نہیں، میں خود دیکھ لیتا ہوں شاید میں ہی رات کو دروازے بند کرنا بھول گیا۔“ شیر دل نے اسے روک دیا۔ گارڈ کو کچھ دوسری ہدایات دے کر شیر دل واپس پلٹ آیا تھا۔ اس نے اندر آ کر باری باری تمام کمرے بڑی احتیاط سے چیک کیے تھے۔ اندر کوئی نہیں تھا اور بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا۔ شیر دل کچھ الجھ کر ہال میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ دروازے بند کرنا وہ شاید بھول گیا تھا اور یہ ایک اتفاق تھا لیکن اس کا لاشعور یہ ماننے پر تیار نہیں تھا۔

اسے بہت اچھی طرح دروازے بند کرنا یاد تھا کیونکہ وہ رات کو کسی ٹور سے بہت لیٹ واپس آیا تھا، اس کی آمد پر شہر بانو نے اندرونی دروازہ کھولا تھا۔ شیر دل اگر خود کبھی گھر پر نہ ہوتا یا اسے لیٹ واپس آنا ہوتا تو شہر بانو ڈنر کے بعد ملازمین کے کچن صاف ہو جانے کے بعد گھر اندر سے بند کر لیتی تھی۔ یہ شیر دل کی ہدایات تھیں اور شیر دل کیوں اس معاملے میں اس قدر احتیاط پسند تھا یہ شہر بانو کو کبھی سمجھ نہیں آیا لیکن وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔

دروازے میں کھڑے ہو کر شیر دل نے ڈرائیور کو اپنے کل کے کسی وزٹ کے لیے ہدایات دی تھیں اور اس کے جانے کے بعد اس نے دروازے بند کیے تھے۔ شہر بانو اس سے باتیں کر رہی تھی جب شیر دل نے اس سے پوچھا تھا۔
”کچن کا دروازہ بند کر لیا؟“

”ہاں، ڈنر کے بعد ہی کر لیا تھا۔“ شہر بانو نے اس سے کہا تھا لیکن شیر دل پھر بھی اس کو وہیں چھوڑ کر خود اندر ایک بار دروازہ دیکھنے گیا تھا تو کم از کم یہ سوال کہیں نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ دروازہ خود بند کرنا بھول گیا تھا اور اب حیرانی کی بات یہ بھی تھی کہ کچن کا دروازہ بند تھا لیکن گھر کا مرکزی دروازہ کھلا تھا۔

ہال میں کھڑے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں شیر دل کو ایک سگریٹ کی طلب ہوئی۔ وہ ہال سے اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ مثال اور شہر بانو دونوں اسی طرح گہری نیند سو رہی تھیں۔ شیر دل نے اپنا سگریٹ کا پیک اور لائٹر اٹھایا اور وہاں سے دوبارہ ہال میں واپس آ گیا اور تبھی اسے پہلی بار یاد آیا کہ اس نے صرف گھر کے گراؤنڈ فلور کو چیک کیا تھا۔ وہ اوپر والی منزل پر نہیں گیا تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر پیک اور لائٹر وہیں میز پر چھوڑتے ہوئے شیر دل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ اس نے اوپر والے فلور کی لائٹس آن کرنا شروع کر دی تھیں۔ تمام دروازوں کے باہر اسی طرح تالے موجود تھے۔ جس طرح وہ ہمیشہ دیکھتا تھا۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے وہ کچھ مطمئن انداز میں دروازوں کو دیکھتے ہوئے ماسٹر بیڈروم کے سامنے سے گزرا اور پھر وہ چھت کے دروازے کو دیکھنے اس سے اوپر والی سیڑھیاں چڑھنے لگا اور آدھی سیڑھیوں میں ہی وہ جیسے کرنٹ کھا کر رکا تھا۔

چھت کا دروازہ مکمل طور پر کھلا تھا۔ شیر دل کے کسی بدترین خدشے کی جیسے تصدیق ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے چھت کو صاف بھی کروا لیا تھا اور اس کی مرمت بھی کروائی تھی شفٹ ہونے سے پہلے۔ چھت پر اب وہ لاک نہیں لگایا جاتا تھا کیونکہ شیر دل کبھی کبھار چھت کا چکر لگایا کرتا تھا۔ سردیوں میں وہاں دھوپ ہی نہیں بلکہ وہاں سے شہر کا View بھی بہت شاندار ہوتا تھا لیکن شہر بانو کی ناپسندیدگی کی وجہ سے یہ کام بھی کبھار ہی ہو پاتا تھا۔ وہ اس چھت سے خوف کھاتی تھی اور چھت عام طور پر بند رہتی تھی۔ لاک نہ ہونے کے باوجود یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی ملازم چھت پر جاتا اور پھر دروازہ اس طرح چوپٹ کھلا چھوڑ آتا۔

شیر دل برق رفتاری سے آدھے راستے سے نیچے آ گیا تھا۔ ہال کمرے کے انٹر کام سے اس نے گیٹ پر موجود گارڈز کو اندر آنے کی ہدایت دی۔ ان کے آنے تک وہ اپنے بیڈروم میں آ کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا اپنا ریوالور نکال لایا تھا۔ بیڈروم سے نکلتے ہوئے اس نے بیڈروم کے دروازے کا بولٹ باہر سے چڑھا دیا۔

اندر آنے والے گارڈز میں سے ایک کو وہ وہیں چھوڑتے ہوئے دوسروں کے ساتھ اوپر چلا آیا تھا۔
چھت کا کھلا دروازہ دیکھ کر گارڈز بھی اسی کی طرح متوحش ہوئے تھے، شیر دل ان کے ساتھ بڑی احتیاط کے عالم میں چھت پر نکلا۔ دھند میں لپٹی ہوئی وہ وسیع و عریض چھت بالکل خالی تھی۔ گارڈز نے ٹارچ کے ساتھ چھت کا ایک ایک حصہ چیک کر لیا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور چھت پر کھڑا شیر دل خود کو جیسے اس وقت دنیا کا احمق ترین انسان محسوس کر رہا تھا۔ ایک گارڈ نے چھت کا دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ سوال و جواب کے کسی تبادلے کے بغیر شیر دل واپس نیچے آیا۔ نیچے والا گارڈ برآمدے نما محرابی کاریڈور میں اسی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔ چند رسمی ہدایات کے بعد انہیں بھیج کر شیر دل دروازے بند کرتا ہوا ریوالور رکھنے اپنے بیڈروم کی طرف آیا اور کچھ دیر پہلے ہی کی طرح وہ ایک بار پھر شاکڈ ہوا۔ بیڈروم کے دروازے کا بولٹ اترا ہوا تھا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر دیوانہ وار کمرے میں داخل ہوا...... مثال اور شہر بانو اسی طرح بستر پر پُرسکون سو رہی تھیں۔

شیر دل کی جیسے جان میں جان آئی تھی، چند لمحوں کے لیے بے مقصد کمرے میں کھڑے وہ بستر پر لیٹی مثال اور شہر بانو کو دیکھتا رہا پھر اس نے باتھ روم اور برابر والا کمرا چیک کیا۔ ریوالور واپس سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر شیر دل کمرے میں رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔
پورے گھر میں سب کچھ ٹھیک تھا اس کے باوجود شیر دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسے دو دروازوں پر لگی ہوئی

چٹخنیوں کے بارے میں غلط فہمی ہوسکتی تھی خاص طور پر اپنے بیڈروم کے دروازے کے بولٹ کے بارے میں۔

اس رات پہلی بار وہاں بیٹھ کر اس نے اس گھر کے بارے میں سنے ہوئے تمام قصے ذہن میں دہرائے تھے اور گھر کی تاریخ یاد کی پھر پتا نہیں کیا خیال آنے پر وہ دوبارہ کمرے سے نکل آیا۔ ہال میں آکر اس نے اوپر جانے والے کمروں کی چابیاں نکالیں اور دوبارہ اوپر کے فلور پر آ گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس طرح کے واقعات کے بعد رات کے اس وقت دوبارہ اوپر والی منزل پر اکیلا موجود نہ ہوتا لیکن وہ اپنے نام کا ایک تھا۔

اس نے ماسٹر بیڈروم کے تالے کو ساری چابیاں لگا لگا کر دیکھنا شروع کیا، ایک چابی سے دروازہ کھل گیا۔ شیر دل نے دروازہ کھول دیا۔ تاریک کمرے میں اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ یوں جیسے بہت سی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہوں۔ دروازے کے پیچھے سوئچ بورڈ کو ٹٹول کر اس نے کمرے کی لائٹس آن کردیں، کمرے کو بند رکھنے کے باوجود اب باقاعدگی سے صاف کیا جارہا تھا تو دروازہ کھلنے پر بھی اسے وہ وحشت نہیں ہوئی تھی جو پہلی بار اس کمرے کا دروازہ کھلنے پر اندر کا ابتر حال دیکھ کر ہوئی تھی۔ کمرے میں اب بھی بہت پرانا فرنیچر تھا اور وہ بھی نہ ہونے کے باوجود...... شیر دل آگے بڑھ آیا۔ وہ وہاں کیا دیکھنے آیا تھا، وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ وہاں موجود تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا تھا جب یک دم اپنے قدموں کے قریب پڑی کسی چیز نے اسے روک دیا۔ پہلی بار خوف کی لہر اسے مَس کر گئی تھی۔

☆☆☆

شہر بانو کی آنکھ انٹرکام کے مسلسل بجنے کی آواز پر کھلی تھی۔ مندھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے برابر میں مثال سو رہی تھی اور شیر دل کا بستر خالی تھا۔ بیڈروم ٹیبل لیمپ آن تھا اور ٹیبل پر پڑا انٹرکام بج رہا تھا۔ کسلمندی کے عالم میں اس نے لیٹے لیٹے شیر دل کو آواز دی۔

''شیر دل...... شیر دل۔'' پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ باتھ روم میں نہیں ہوسکتا۔ باتھ روم کی لائٹ آف تھی۔ کچھ الجھ کر اس نے باتھ روم کے دروازے کو دیکھتے ہوئے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر انٹرکام کا ریسور اٹھایا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف گیٹ پر موجود چوکی میں تعینات سیکیورٹی انچارج تھا۔

''میڈم سر سے بات کروادیں۔'' اس نے شہر بانو کی آواز سنتے ہی کہا۔

''وہ کمرے میں نہیں ہیں، ابھی آتے ہیں تو بات کرواتی ہوں۔''

''اوپر والے کمرے کی لائٹ آن کی ہوئی ہے کسی نے...... کوئی وہاں ہے؟'' سیکیورٹی انچارج نے کچھ ہڑبڑائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کہاں......؟'' وہ نیند میں الجھی تھی۔

''اوپر والے بڑے کمرے میں۔''

''ماسٹر بیڈروم میں۔'' شہر بانو کی نیند پہلی بار اڑی۔

''جی...... سر کو بتادیں اور دروازہ کھول دیں، ہم اوپر جا کر چیک کرتے ہیں۔'' سیکیورٹی انچارج نے اس سے کہا۔ چند لمحوں کے لیے شہر بانو کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''میں تھوڑی دیر میں بتاتی ہوں۔'' اس نے انٹرکام رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اسے یک دم یہ احساس ہوا تھا کہ ماسٹر بیڈروم میں اس وقت شیر دل بھی ہوسکتا تھا۔ وہ اس طرح کے ایڈونچر کا شوقین تھا۔ بے حد حواس باختہ وہ صوفے پر پڑی شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے ننگے پاؤں بیڈروم سے باہر نکل آئی۔ باہر راہداری کی کھڑکیوں سے اس نے سکیورٹی گارڈز دیکھ لیے تھے۔ وہ لوگ اب مرکزی دروازے کے بالکل باہر الرٹ کھڑے تھے۔ شہر بانو بیرونی دروازہ کھولنے کے بجائے ہال کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

''شیر دل...... شیر دل...... تم اوپر ہو کیا؟'' اس نے اوپر والے فلور کی لائٹس آن دیکھ کر شیر دل کو آواز دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ شہر بانو کی حواس باختگی میں اضافہ ہوگیا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھی تھی۔ اس وقت اسے یہ بھول گیا تھا کہ اوپر والا حصہ آسیب زدہ سمجھا جاتا تھا اور اس وقت اس ماسٹر بیڈروم کی لائٹس آن تھیں جہاں کسی زمانے میں کوئی خودکشی کرچکا تھا اس کو حواس باختہ کرنے کے لیے یہ کافی تھا کہ اس نے شیر دل کو آواز دی تھی اور اس کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

عقبی لان کے درخت میں پڑا جھولا جھولتے ہوئے اس دن چڑیا نے گھر کی دائیں طرف والے لان میں ٹینس کورٹ بنتے دیکھا۔ چند آدمی بڑی جانفشانی کے عالم میں گھاس کی تراش خراش کرنے کے بعد پیمائشی ٹیپ کے ساتھ پیمائش کرتے ہوئے سفید پینٹ سے زمین پر لکیروں کا ایک جال سا بنا رہے تھے پھر اس نے ان لکیروں کے بیچ میں ایک نیٹ کو استادہ ہوتے دیکھا۔ وہ بے حد دلچسپی سے اپنے تمام کام چھوڑ کر بار بار وہاں آکر اس ٹینس کورٹ کی تیاری کے مراحل دیکھتی رہی۔ نئے ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی کے آنے کے بعد اس گھر میں بہت سی نئی نئی چیزیں ہو رہی تھیں۔

کچن گارڈن میں مقامی سبزیوں کے علاوہ چائنیز سبزیوں کی کاشت شروع ہوگئی تھی۔ لان کی از سرِ نو تزئین و آرائش کی گئی تھی۔ گلاب کی نئی کیاریاں بنائی گئی تھیں اور سامنے والے لان میں ایک روکری کا اضافہ بھی ہوگیا تھا۔ بچوں کے چند جھولے بھی نصب کیے گئے تھے۔ چڑیا اندازہ نہیں کرسکتی تھی کہ ان میں سے کون سا کام کس کی فرمائش پر ہو رہا تھا لیکن وہ بیگم صاحبہ کو ہر جگہ موجود پا رہی تھی۔ ٹینس کورٹ وہ واحد جگہ تھی جہاں اس نے صاحب کو بار بار آتے دیکھا تھا۔ دو دن میں وہ ٹینس کورٹ تیار ہوگیا تھا۔ اور تیسرے دن چھٹی والے دن اس نے صاحب اور بیگم صاحبہ کو اس ٹینس کورٹ پر ٹینس کھیلتے ہوئے دیکھا۔ چڑیا جیسے مسمرائزڈ ہوگئی تھی۔ اس

نے یہ کھیل پہلے کتابوں میں اور ٹی وی کی جھلکیوں میں دیکھا تھا، آج پہلی بار آنکھوں کے سامنے دیکھ رہی تھی اور وہ Fascinated صاحب اور بیگم صاحبہ کے جانے کے بعد لان کی ان تمام کیاریوں میں جا جا کر وہ گیند ڈھونڈتی رہی تھی جو صاحب اور ان کی بیوی کھیل کے دوران شاٹ کے کورٹ سے باہر چلے جانے کے بعد نہیں ڈھونڈ سکے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ڈیڑھ گھنٹے کے کھیل کے دوران چھ گیندیں تھیں جو گم ہوئی تھیں اور اسے جیسے کسی مشین کی طرح ازبر تھا کہ وہ چھ گیند کن اطراف میں گئی تھیں، پانچ گیندیں اس نے بے حد آسانی سے ڈھونڈ لی تھیں۔ چھٹی گیند وہ کنزا، مثنا، ٹوکو، ٹوفو، ٹیڈو، شنٹو، کٹو کے ساتھ وہ نہیں ڈھونڈ سکی تھی اس نے وہ پانچوں گیند کورٹ کے باہر رکھی کرسیوں اور میز کے اوپر رکھ دی تھیں۔ اس کے سات کے سات دوست بونے مل کر بھی اس چھٹی گیند کو نہیں ڈھونڈ سکے تھے۔

اسے اگر صاحب اور ان کی بیوی سے اپنی اس کارکردگی کے بدلے میں کسی داد یا ستائش کی توقع تھی تو وہ اسے نہیں ملی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے اگلے دن وہاں دوبارہ ٹینس کھیلتے ہوئے شاید غور تک نہیں کیا تھا کہ ٹینس کی وہ گمشدہ گیند کون وہاں میز پر رکھ گیا تھا لیکن چڑیا کے لیے یہ جیسے ایک اور نیا دلچسپ مشغلہ تھا۔ وہ اپنے کوارٹر میں پڑھتے ہوئے یا کوئی کام کرتے ہوئے شام کے اوقات میں ٹینس شاٹس کی آواز سنتی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر باہر بھاگ جاتی۔ پھر عقبی لان کے کسی درخت یا پودے کے پیچھے دبک کر وہ صاحب کو اپنی بیوی یا کبھی کبھار کسی دوسرے آفیسر کے ساتھ ٹینس کھیلتا دیکھتی رہتی اور صاحب کے جانے کے بعد وہ گیند تلاش کرتی رہتی۔ اس نے کبھی کوئی گیند گھر لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تمام گیندیں ڈھونڈ کر بھی ان کے ساتھ تھوڑا بہت کھیل کر انہیں وہیں میز پر ایک رو میں سجا کر چلی آتی تھی۔ خیر دین نے زندگی میں اسے بہت سی چیزیں سکھائی تھیں اور ان میں سے ایک چیز ایمانداری بھی تھی۔

”وہ انگریز صاحب اور ان کی میم صاحب میرے لیے پورا گھر کھلا چھوڑ کر جاتے تھے..... کئی بار میں صاحب کا والٹ اور میم صاحب کی جیولری بھی اِدھر اُدھر سے اٹھا کر انہیں دیتا تھا۔“ وہ چڑیا کو بڑے فخریہ انداز میں بتایا کرتا تھا۔

”تو صاحب اسی لیے مجھ پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔“ چڑیا نے خیر دین سے دیانتداری سیکھی تھی اور قناعت لی تھی اور محنت کرنا پایا تھا۔ ایک بچے کی معصوم فطرت اور ناسمجھی کے باوجود اس نے کبھی ڈی سی ہاؤس میں موجود ان چیزوں کو اپنے کوارٹر میں لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی جو اسے فیسینیٹ کرتی تھیں۔

اور ایسی ہی ایک فیسینیٹ کرنے والی چیز اس کے لیے ٹینس ریکٹ تھا جس کو بھی چھونے اور اس سے کھیلنے کی شدید خواہش رکھنے کے باوجود وہ کبھی صاحب یا بیگم صاحبہ کے ریکٹس کو ہاتھ نہیں لگا سکی تھی۔ ان کا کھیل ختم ہوتے ہی ایک ملازم دونوں ریکٹس اور گیند کا ڈبا اٹھا کر اندر کہیں لے جاتا تھا اور چڑیا ہر بار کچھ مایوس سی ہو کر رہ جاتی تھی۔ اسے انتظار تھا کسی ایسے دن کا جب صاحب یا وہ ملازم ریکٹ اٹھانا بھول جاتے لیکن وہ دن کبھی نہیں آیا البتہ ایک آ گیا تھا..... چڑیا نے سات بونے نہیں دیکھے لیکن اس نے وہ قسمت دیکھ لی تھی جسے خیر دین بہت بڑی شے کہتا تھا۔ ایک اس کی زندگی کا سیاہ ترین اور خوب صورت ترین باب تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آ جاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے.. جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی علیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد علیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں علیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب یعنی شیر دل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔

اب آگے پڑھیں۔

قسط نمبر 3

ایبک اس شیول مرر کے سامنے کھڑا اپنا ریکٹ گھماتے گھماتے رک گیا تھا۔ یہ آئینے میں ابھرنے والا ایک عکس تھا جس نے اسے روکا تھا اور وہ یہ نہیں جانتا تھا وہ چہرہ ساری عمر ہر بار سامنے آنے پر اسی طرح فریز کر دیا کرے گا۔ اس نے چڑیا کو پہلی بار اسی آئینے میں دیکھا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ چڑیا پچھلے کئی دنوں سے اسے کئی بار دیکھ چکی تھی... ٹینس کورٹ پر صاحب۔ کے ساتھ ٹینس کھیلتے...... لان میں صاحب کی بیٹی اور اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلتے...... Frisbee پکڑنے میں ناکامی پر اپنے چھوٹے بہن بھائی پر چلاتے اور خفا ہوتے ہوئے...... وہ صاحب کے گھر آئے ہوئے مہمان تھے اور صاحب کے گھر ویک اینڈ پر مہمانوں اور ان کے ساتھ ان کے بچوں کا آنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی مگر یہ صاحب کے ہاں لمبی چھٹیاں گزارنے کے لیے آئے ہوئے مہمان تھے۔

صاحب کے گھر کا سناٹا ان تین بہن بھائیوں کی سرگرمیوں سے ٹوٹنے لگا تھا جن میں سے ایبک سب سے بڑا تھا...... آٹھ سالہ وہ بچہ اپنے قد و قامت سے دس سال کا لگتا تھا...... وہ جب بھی گھر سے باہر نظر آتا اس کے ہاتھ میں زیادہ تر ٹینس ریکٹ ہی ہوتا جسے وہ بے مقصد گھماتا، ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرتا رہتا...... کبھی کبھار اس کی چھ سالہ بہن اس کے ساتھ ٹینس کھیلتی لیکن وہ کسی بھی اعتبار سے ایبک کا مقابلہ نہیں کر پاتی تھی۔ وہ جسمانی طور پر بہت مضبوط تھا...... لڑکا تھا...... بہن سے عمر میں دو سال بڑا تھا...... اور تکنیک کے اعتبار سے بہت Sound تھا...... اور پانچ سال کی عمر سے ٹینس ریکٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ ٹینس جیسے ان کا خاندانی کھیل تھا، ان کی ننھیالی اور ددھیالی فیملی میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ٹینس نہ کھیلتا ہو...... مگر ان میں سے کسی میں بھی ٹینس کے لیے ایبک جیسا پیشن نہیں تھا...... وہ سوئمنگ کرتا تھا یا پھر ٹینس کھیلتا تھا اور اس گھر میں آنے کے ایک ہفتے میں ہی چڑیا یہ جان چکی تھی۔

ایبک کے آنے کے بعد صاحب باقاعدگی سے شام کے وقت اس کے ساتھ لان میں ٹینس کھیلا کرتے کبھی کبھار ایبک کی ممی، بہن، بھائی اور صاحب کی بیوی اور بیٹی بھی وہاں موجود ہوتے لیکن عام طور پر صرف صاحب اور ایبک ہی کھیل رہے ہوتے اور صاحب مسلسل ایبک کو ہدایات دے رہے ہوتے۔ ایبک صاحب سے کبھی جیت نہیں پاتا تھا لیکن کبھی کبھار وہ کوئی اچھا شاٹ مار دیتا اور صاحب اس شاٹ کو Miss کر دیتے اور تب کورٹ میں فاتحانہ انداز میں چلانے والا صرف ایبک نہیں ہوتا تھا کسی پودے یا درخت کے پیچھے چھپی ہوئی چڑیا بھی اتنی ہی مسرور ہوتی تھی اور اس کے سات بونے بھی...... وہ آٹھوں اس کے اس اتفاقی شاٹ کو بھی اس طرح سیلیبریٹ کرتے جیسے وہ ایک پوائنٹ نہیں میچ جیت گیا ہو۔ ایبک چڑیا کو کیوں اچھا لگا تھا؟ اس وقت اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ Awe میں تھی۔ اس وقت تک وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کا ہم عمر تھا...... اس کے لیے متاثر ہونے کے لیے یہ کافی تھا کہ وہ ٹینس کھیلتا تھا اور بہت اچھی کھیلتا تھا اور جب وہ فریزبی پھینکتا تھا تو کوئی نوکر بھی اس کو نہیں پکڑ پاتا تھا۔ وہ ان تین بچوں کا سردار تھا جو اس وقت اس گھر میں تھے اور وہ جس طرح ان تینوں بچوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ وہ کہیں سے بھی ایک آٹھ سالہ بچہ نہیں لگتا تھا۔

چڑیا، صاحب کے ریکٹ کو دیکھ کر ہمیشہ فیسینیٹ ہوتی تھی لیکن وہ کبھی خواہش کے باوجود اس ریکٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکی۔ اس کے ساتھ کھیلنا تو خیر بہت دور کی بات تھی۔ اس وقت تک اسے وہ ٹینس ریکٹ بہت ہلکی پھلکی کوئی چیز لگتا تھا کیونکہ اس نے صاحب کو اسے ایک ہلکی پھلکی چیز ہی کی طرح اٹھائے اور کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ اس ریکٹ کو موقع مل جانے پر اٹھا کر گھما بھی نہیں سکے گی۔

ایبک اپنا ریکٹ اکثر لان میں چھوڑ کر چلا جاتا تھا اور موقع ہونے کے باوجود چڑیا اس ریکٹ کے قریب جانے کی ہمت بھی نہیں کر پاتی تھی، اسے خوف ہوتا تھا کہ ایبک کسی بھی وقت دوبارہ نمودار ہو سکتا تھا اور چند بار واقعی ایسا ہوا تھا کہ وہ ہمت کر کے اس ٹیبل کے پاس جانے کی تیاری کر رہی ہوتی جہاں ایبک اپنا ریکٹ چھوڑ کر گیا تھا اور ایبک کھانے پینے کی کوئی چیز لیے یک دم دوبارہ لان میں آ جاتا۔ وہ ہمیشہ اتنے دبے قدموں آتا تھا کہ چڑیا اس سے خائف رہنے لگی تھی اسے لاشعوری طور پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ جب بھی اس کے ریکٹ کو پکڑنے کے لیے اس ٹیبل کے پاس جائے گی۔ ایبک وہاں آ جائے گا۔

وہ اب پہلے کی طرح کیاریوں میں سے ٹینس بالز بھی نہیں نکال پاتی تھی کیونکہ ایبک کھیل ختم ہونے کے بعد تمام بالز خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹینس بالز کے ڈبے میں بالز پوری کر کے ہی لان سے روانہ ہوتا۔ اس نے چڑیا کی زندگی کی ایک سب سے پسندیدہ سرگرمی چھین لی تھی لیکن اس کے باوجود چڑیا کو ایبک اچھا لگتا تھا۔ وہ اکیلے ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرتے ہوئے کورٹ پر خود ہی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا...... چڑیا اور اس کے سات بونے اس کی ان خود کلامیوں سے محظوظ ہوتے رہتے۔ چڑیا نے پہلی بار اپنے علاوہ کسی دوسرے کو خود سے گفتگو کا شوقین پایا تھا اور ایبک کے لیے اس کی پسندیدگی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار اس کی باتیں سنتے

ہوئے اس کا دل چاہتا وہ ان کی باتوں کا جواب دے اور وہ دیتی بھی لیکن سرگوشی میں اپنے بونوں کو۔ لیکن ایبک کی وہ ساری باتیں، جھلاہٹیں، خودکلامیاں چڑیا کے لیے جیسے ایک شاندار تفریح تھی۔ وہ اس کی Vocabulary بڑھا رہا تھا...... ایبک کے منہ سے سننے والا ہر نیا لفظ وہ خیردین کے سامنے رکھ دیتی تھی اور ان میں سے زیادہ تر لفظ خیردین کے لیے بھی نئے تھے۔ چڑیا خیردین کو یہ نہیں بتاتی تھی کہ اس نے وہ لفظ کہاں سنا تھا لیکن وہ خیردین کی لاعلمی اور کم علمی کو کسی اعتراض کے بغیر قبول کر لیتی تھی۔

بعض دفعہ ایبک کو اپنے بہن بھائیوں یا اکیلے کھیلتے ہوئے دیکھ کر چڑیا کا بے تحاشا دل چاہتا تھا کہ وہ خود بھی اس کے ساتھ جا کر کھیلنے لگے۔ ایبک کی اچھالی ہوئی ہوا میں اڑتی اس فریزبی کو جسے کوئی پکڑ نہیں پاتا وہ پکڑ لے۔ ایبک کی ٹینس Serve کو وہ دوسرے کورٹ سے اتنی ہی طاقت کے ساتھ Return کرے جس قوت سے وہ پھینکی گئی تھی اور اسے یقین تھا وہ ایسا کر سکتی تھی۔ ایک بچے کی معصومیت اور خوش فہمی اسے یہ بتا ہی نہیں پا رہے تھے کہ کھیل کھیلنے اور اچھا کھیلنے کے لیے صرف خواہش اور موقع نہیں Skill کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹینس کا وہ ریکٹ جسے ایبک بڑی آسانی سے گھماتا اور ہلاتا نظر آتا تھا اس کے پیچھے Will نہیں Skill ہی اس کے تین سالوں کا تجربہ تھا۔ فریزبی کی وہ ڈسک تھی جو ہوا میں تیرتی کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے بھی اسی طرح چھوٹ کر گرتی جس طرح دوسروں کے ہاتھوں سے...... لیکن بچے آدھی زندگی اور آدھی خواہشات خوابوں اور فینٹسی میں پوری کرتے ہیں...... نہ نپولین کی ڈکشنری میں ناممکن کا لفظ تھا نہ اس کی زندگی میں ہوتا ہے...... اور چڑیا کے ساتھ تو سات دوست بونے بھی تھے۔

''نانا جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں ٹینس کی پلیئر بنوں گی۔'' ایبک کے آنے کے چند دنوں کے بعد ایک دن چڑیا نے خیردین سے ریکٹ کی فرمائش کرتے ہوئے اسے اپنے کیریئر میں تبدیلی کا عندیہ دیا۔

''نہیں بیٹا، لڑکیاں ٹینس نہیں کھیلتیں۔'' خیردین نے فوراً اسے ٹوکا۔

''ٹی وی پر تو کھیلتی ہیں...... وہ جو ومبلڈن ہوتا ہے۔'' چڑیا نے پی ٹی وی پر دیکھے جانے والے کسی میچ اور ٹورنامنٹ کی اسے یاد دلائی۔

''ہاں پر وہ تو انگریزوں کے ملک میں ہوتا ہے اور انگریز عورتیں کھیلتی ہیں۔'' خیردین جواب دیتے ہوئے صاحب کی بیوی اور اب ایبک کی ممی کو بھول گیا تھا چڑیا نہیں، اس نے خیردین کو یاد دلانے میں دیر نہیں کی۔

''بیٹا وہ صاحب لوگ ہیں، وہ کھیل سکتے ہیں ہم نہیں کھیل سکتے۔'' خیردین نے بے اختیار گہری سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔ چڑیا کو اب بار بار صاحب اور اپنی کلاس کا فرق سمجھانا اور بتانا خیردین کو بڑا مشکل لگتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے کیونکہ ساری عمر وہ چڑیا کے سامنے ایک ''بڑا آدمی'' بنا رہا تھا اور اب اس بڑے آدمی کو اس بچی کے سامنے یہ خول اتارنا پڑ رہا تھا اور یہ آسان نہیں تھا مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے اپنی استطاعت سے بڑھ کر کھلا پلا رہا تھا۔ اسے انگلش میڈیم اسکول بھی بھیج رہا تھا۔ اس انگلش میڈیم اسکول میں جہاں اس جیسا آدمی اپنی اولاد کو بھیجنے کے صرف خواب دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ چڑیا کے پاؤں زمین پر بھی رکھنا چاہتا تھا۔ اس کو پرواز سے روکنا چاہتا تھا۔

''بہت سارے کام صاحب لوگ کر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں۔'' ...... نہیں چڑیا کو اس فلاسفی کی سمجھ آئی تھی یا

نہیں لیکن یہ ایک جملہ اس نے کسی طوطے کی طرح اپنے سسٹم میں بغیر بحث کے فیڈ کیا تھا۔

خیردین نے اسے کیریئر بدلنے کی اجازت تو نہیں دی تھی لیکن اگلے دن اس کو ایک ریکٹ لا دیا تھا...... وہ بیڈمنٹن ریکٹ تھا۔ لکڑی کا ایک معمولی سا...... کم قیمت...... پہلی نظر میں ہی چڑیا نے اس ریکٹ کو ناپسند کر دیا تھا...... لیکن اس نے اپنی ناپسندیدگی خیردین تک نہیں پہنچائی تھی...... بھاری دل کے ساتھ اس نے وہ ریکٹ اٹھا لیا تھا اور اس نے اس کے ساتھ چند بار اس گیند کو ہٹ کرنے کی کوشش کی تھی جو خیردین ریکٹ کے ساتھ لے کر آیا تھا...... تیسرے یا چوتھے شاٹ پر ریکٹ کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ چڑیا نے بوجھل دل کے ساتھ وہ ریکٹ اٹھا کر کمرے میں پڑی اکلوتی سیف کے اوپر رکھ دیا۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ بعض چیزیں صرف صاحب لوگ کیوں کر سکتے ہیں، وہ کیوں نہیں۔

اس شام اس آئینے میں دیکھے جانے سے پہلے ایبک نے کبھی چڑیا کو اس گھر میں نہیں دیکھا تھا اور اب یک دم اس آئینے میں ابھر آنے والے ایک ہم عمر کے عکس نے اسے حیران کیا تھا۔ اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ریکٹ کے ساتھ ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرنا اس کا روز کا معمول تھا اور اسے پریکٹس کرتے دیکھنا چڑیا کا۔ پہلی بار اس نے اتفاقی طور پر ایبک کو اس وقت شام کو اس آئینے کے سامنے موجود پایا تھا جب وہ ہمیشہ کی طرح اپنے معمول کے مطابق شام کے وقت اس آئینے میں ''کچھ'' دیکھنے آئی تھی اور جو کچھ اسے نظر آیا تھا اس نے چڑیا کو بے حد محظوظ کیا تھا۔ ایبک آئینے کے سامنے کھڑا اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا ریکٹ کو گھماتا پھر رہا تھا۔ وہ آئینے میں کسی کھلاڑی کے کھیل کے انداز کی نقل اتار رہا تھا، نہ صرف کھیل کے انداز کی بلکہ اس کھلاڑی کے کھڑے ہونے، سر جھٹک کر اور کندھے اچکا کر بات کرنے کی بھی...... وہ ریکٹ کو ایک کپ کی طرح پکڑے جیسے ومبلڈن سینٹر کورٹ پر کھڑا چیمپئن شپ جیتنے کے بعد تقریر کر رہا تھا۔ وہ کس کھلاڑی سے متاثر تھا اور کس کی نقل کر رہا تھا چڑیا کو کچھ اندازہ نہیں تھا لیکن ایبک کے اس چارمنٹ کے "Skit" یا ''رول پلے'' کو دیکھتے ہوئے اسے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا اور ایبک کو اگر یہ پتا چل جاتا کہ اس کی وہ ونرز اسپیچ کسی کو اس طرح گدگدا رہی تھی تو وہ شرم سے ڈوب کر مر جاتا، بونوں کو دیکھنے کی خواہش کے علاوہ اب چڑیا اس آئینے کے سامنے ایبک کے "Acts" دیکھنے بھی آتی تھی۔ وہ ہر روز وہاں نہیں ملتا تھا لیکن اکثر وہاں مل جاتا تھا۔

اور آج اس آئینے میں پہلی بار ایبک نے چڑیا کو دیکھ لیا تھا۔ برآمدے میں رکھے گئے اس آئینے کی پوزیشن صفائی کے دوران کچھ تبدیل ہوئی تھی اور برآمدے کے ایک ستون پر چڑھی بوگن ویلیا کے ساتھ چپکی اندر جھانکتی چڑیا جو آئینے کی پہلی پوزیشن میں نظر نہیں آ سکتی تھی اب بڑی آسانی سے نظر آ گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ پلٹ کر اپنے عقب میں اس ستون کو دیکھا تھا۔ ستون اور اس آئینے میں فاصلہ بے حد کم تھا۔ چڑیا کچھ دیر کے لیے جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑی جا سکتی ہے اور پکڑی گئی کیسے تھی وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ ایبک اب اس پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ پرتجسس...... حیران...... مسکراتی ہوئی نظریں...... چڑیا کی سمجھ میں نہیں آیا وہ فوری طور پر کیا کرے...... برآمدے کے ستونوں کی آڑ میں بھاگتی ہوئی فرار ہو جائے...... ایبک کے سامنے آ جائے یا آہستہ سے اپنی کسی چڑیا کی طرح نکلی ہوئی گردن کو اسی آہستگی کے ساتھ واپس کھینچ کر ستون کے عقب میں چھپ جائے...... یہاں تک کہ ایبک وہاں سے چلا جاتا...... اسے

فیصلہ نہیں کرنا پڑا تھا۔ یہ کام ایبک نے کیا تھا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھ آیا تھا۔ اب وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چڑیا اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اپنی گردن ستون کے پیچھے سے نکالے ہوئے تھی۔ اب ایبک کے بالکل سامنے آجانے پر وہ گھٹنوں سے ہاتھ اٹھا کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی اور کنفا، منفا منٹوں میں کہیں غائب ہوگئے تھے...... حد تھی ویسے یہ بھی۔

''ہیلو۔'' ایبک نے دوستانہ انداز میں اس کو مخاطب کرنے میں پہل کی اور چڑیا کو اس سے ہیلو سننے کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے حیران ہو کر ایبک کو دیکھا پھر اس نے جواباً ہیلو کہا۔ بھاگنے کا ارادہ اس نے فی الفور ترک کر دیا تھا۔

''تم کون ہو؟'' ایبک نے فوراً سے بیشتر کہا۔ چڑیا کے حلیے سے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ کسی نوکر کی بیٹی ہوسکتی ہے اور کسی ملازم کے بچے میں ایبک دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ یہ اس کے پیرنٹس کی ہدایات تھیں۔ اس کے پیرنٹس ملازمین کو ہی فاصلے پر نہیں رکھتے تھے، ان کی فیملیز کو بھی اپنی فیملیز سے فاصلے پر رکھنے میں یقین رکھتے تھے اور ایبک اسی طرح کی ویلیوز کے ساتھ پروان چڑھا تھا۔

چڑیا کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنا تعارف کیسے کروائے۔ ''میرے نانا کک ہیں۔'' چند لمحے الجھ کر اس نے بالآخر کہا۔

''اوہ خیر دین۔'' ایبک نے بے ساختہ کہا۔ چڑیا کو اس کے منہ سے یوں اپنے نانا کا نام اچھا نہیں لگا تھا۔ خیر دین کو دوسرے ملازمین چاچا کہتے تھے اور آفیسرز نام سے پکارتے تھے لیکن اس نے آج تک کسی بچے کو خیر دین کا نام لیتے نہیں سنا تھا۔

''چاچا خیر دین۔'' اس نے جیسے برا منا کر ایبک کو جتانے والے انداز میں بتایا۔ ایبک نے اس کی خفگی نوٹس نہیں کی تھی۔ چڑیا میں اس کی دلچسپی فوری طور پر کم ہوئی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ایبک نے ریکٹ گھماتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ وہاں کیا کر رہی تھی، یہ تو چڑیا ایبک کو مر کر بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟'' ایبک نے اسے ڈانٹا۔

''میں یہ مرر دیکھنے آئی تھی۔'' چڑیا نے بے ساختہ کہا۔ ایبک نے حیرانی سے پلٹ کر مرر کو دیکھا۔

''کیوں؟''

''یہ پسند ہے مجھے۔'' جواب سادہ تھا لیکن ایبک پھر بھی حیران ہوا تھا۔

''کیا کرتی ہو تم؟'' ایبک نے جواباً اس سے پوچھا۔

''پڑھتی ہوں۔''

''کس کلاس میں؟''

''4th۔''

''کس اسکول میں؟'' اور اسکول کے نام نے ایبک کو چند لمحوں کے لیے کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ نوکروں کے بچے کانونٹ میں نہیں پڑھتے تھے اور چڑیا پڑھ رہی تھی۔ اس کی اپنی بہن بھی ایک کانونٹ اسکول میں ہی تھی۔ ایک بچہ ہونے کے باوجود وہ ایک ''اچھے'' اور ''برے'' اسکول کا فرق جانتا تھا...... اردو میڈیم اور انگلش

میڈیم کی تفریق اور ریٹنگ سے بخوبی واقف تھا۔

''میں بھی 4th میں ہوں...... ایچی سن میں۔'' اس نے اب اپنے بارے میں چڑیا کو بتایا۔

''اوہ......'' چڑیا حیران ہوئی۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ بھی کلاس فور کا اسٹوڈنٹ ہوگا اور اس نے یہ کہنے میں تامل بھی نہیں کیا۔ ایبک پہلے خجل ہوا پھر بلش۔

''کتنا بڑا لگتا ہوں میں؟'' اس نے جیسے اپنے کسی خدشے کو جھٹلانے کے لیے چڑیا سے پوچھا۔

''پتا نہیں لیکن تم مجھ سے بڑے لگتے ہو...... جیسے 5th، 6th اسٹینڈرڈ میں ہو۔'' چڑیا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''That,s because I,m a boy۔'' ایبک نے اپنی خفت مٹانے کی کوشش میں بڑی رکھائی سے کہا۔ وہ اب چڑیا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے پلٹ کر دوبارہ آئینے کے سامنے جا کر اپنے ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرنے لگا تھا۔ چڑیا کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے...... لیکن اس کی موجودگی سے پوری طرح باخبر...... چڑیا دونوں ہاتھ پشت کے پیچھے باندھے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی...... اب چھپنے کی ضرورت نہیں رہی تھی...... اور کیا طمانیت محسوس کی تھی اس نے۔

''You Play Very Well۔'' چند منٹ کی خاموشی کے بعد چڑیا نے اس تک اپنی ستائش پہنچانا ضروری سمجھا۔ ریکٹ گھماتا ایبک کا ہاتھ چند لمحوں کے لیے رکا۔

''Thank You'' وہ دوبارہ پریکٹس کرنے لگا۔ وہ چڑیا کی نظریں آئینے میں بھی خود پر جمی نوٹس کر رہا تھا اور اس احساس نے جیسے اس کی پریکٹس کے انہماک کو بڑھا دیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک فین مل گیا تھا اسے...... اور یہ اپنے خاندان سے باہر ملنے والا اس کا پہلا فین تھا۔ اس آٹھ سالہ بچے کے لیے فوری طور پر یہ تعریف ہضم کرنا تھوڑا مشکل ہوگیا تھا۔

''تم نے کبھی کورٹ میں دیکھا ہے مجھے؟'' اس نے یک دم چڑیا کے ساتھ گفتگو جاری رکھنا ضروری سمجھا۔

''بڑا نظر آنے'' کا غم تھوڑی دیر کے لیے ہلکا پڑ گیا تھا۔

''روز دیکھتی ہوں جب تم کورٹ میں کھیلنے کے لیے جاتے ہو۔'' چڑیا نے روانی سے کہا۔ ایبک کے سر پر اچانک نمودار ہونے والے سرخاب کے پروں میں ایک اور پر کا اضافہ ہوگیا تھا۔

''میں نے کورٹ میں کبھی نہیں دیکھا تمہیں...... تم کہاں سے دیکھتی ہو مجھے کھیلتے ہوئے۔'' ایبک نے بے حد لوجیکل سوال پوچھا تھا۔ اس نے واقعی اتنے دنوں میں ایک بار بھی چڑیا کو نہیں دیکھا تھا۔ اس بار بلش ہونے کی باری چڑیا کی تھی۔

''ہمارا کوارٹر ہے پیچھے...... میں وہاں سے دیکھتی ہوں۔'' وہ پہلے ہکلائی پھر اس نے گول مول انداز میں کہا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ جھاڑیوں اور پودوں میں اپنے ساتھی بونوں کے ساتھ چھپ کر وہ سارے میچز اور ایبک کی سرگرمیاں دیکھتی تھی۔

''سرونٹ کوارٹرز تو پیچھے ہیں اور بہت دور...... وہاں سے کیسے نظر آجاتا ہے؟'' ایبک نے حیران ہو کر کہا تھا۔ اس بار چڑیا جواب نہیں دے سکی۔

''تم کہیں اور سے دیکھتی ہو۔'' ایبک نے پورے یقین سے کہا۔ ''اور چھپ کر۔'' چڑیا کا چہرہ رنگین ہو گیا...... اسے اندازہ نہیں تھا ایبک کا اگلا اندازہ یہ ہوگا۔ وہ چیس کے Knight کی چال تھی...... سیدھے سے الٹی...... بے حد اچانک...... اور بظاہر سادہ پر انتہائی کاری...... اور چیس کا Knight چڑیا کا پسندیدہ ترین مہرہ تھا...... کوئین کے بعد...... خیر دین کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ سب سے پہلے خیر دین کے Knight پکڑنے کی کوشش کرتی تھی...... باقی مہروں سے اس کو نہ اتنا شغف تھا نہ خوف...... لیکن Knight سے اس کی عجیب Love - Hate Relationship تھی...... تو اس دن چڑیا نے ایبک کو چیس کا Knight بنا لیا تھا۔

''کہاں سے چھپ کر دیکھتی ہو؟'' Knight نے ایک اور مہلک چال چلی۔

''پودوں کے پیچھے چھپ کر۔'' کوئین نے ہتھیار ڈال دیے۔ ایبک فخریہ انداز میں مسکرایا۔

''چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ویسے بھی دیکھ سکتی ہو۔'' اس نے بڑی فیاضانہ آفر کی۔ چڑیا کا چہرہ چمک اٹھا...... وہ یہ بھول گئی تھی کہ یہ ایبک کا گھر نہیں تھا۔ یہ اس کے انکل کا گھر تھا اور وہ پابندیاں جو اس پر لگی تھیں، وہ وہی اٹھا سکتے تھے۔

''تم کو ٹینس کھیلنا آتا ہے؟'' ایبک نے یک دم اگلا سوال کیا۔ یہ جیسے ایک پارٹنر کی تلاش تھی۔ اس کے انکل کے پاس وقت نہیں تھا۔ چھوٹے بہن بھائی اس کے مقابلے کے نہیں تھے...... اور گھر میں کوئی دوسرا ایسا بچہ نہیں تھا جو اس کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ ٹینس کورٹ میں اپنا وقت ضائع کر سکے۔ اب اگر ایک ہم عمر نظر آ گیا تھا تو کیا پتا ایک ٹینس پارٹنر ہی مل جاتا۔ چڑیا اس کے سوال پر گڑبڑائی۔

''میں سیکھ رہی ہوں۔'' انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور یہ جھوٹ نہیں تھا کہ وہ سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی...... بیڈمنٹن کے ریکٹ سے ہی سہی...... اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

''کون سکھا رہا ہے؟'' اگلا سوال آیا۔

''میں خود سیکھ رہی ہوں۔'' ایبک نے بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھا پھر کھلکھلا کر ہنسا۔ چڑیا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''خود کیسے سیکھ سکتے ہیں؟'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''تم بھی تو خود سیکھتے رہتے ہو۔'' جواب اسی انداز میں ملا...... جس انداز میں سوال کیا گیا تھا۔ اس بار ایبک گڑبڑایا۔ بات ٹھیک تھی۔ وہ بھی آئینے کے سامنے کھڑا یہی کر رہا تھا۔

''اگر تم چاہو تو میں سکھا سکتا ہوں تمہیں۔'' چڑیا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایبک سے اس آفر کی توقع وہ نہیں کر سکتی تھی۔

''او کے۔'' اپنے بلیوں اچھلتے دل کو سنبھالتے اس نے ایبک سے کہا۔

''کون سا ریکٹ ہے تمہارے پاس؟'' ایبک اب ایک تجربے کار کوچ کی طرح بولنے لگا تھا۔ چڑیا کا رنگ زرد پڑا۔ وہ یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ اس کے پاس ریکٹ نہیں تھا۔

''ریکٹ تو نہیں ہے۔'' بے حد مدھم آواز میں اس نے جیسے اعترافِ ندامت کیا۔

''تو پھر تم سیکھ کیسے رہی ہو؟'' ایبک حیران ہوا تھا۔

''تمہیں دیکھ کر۔'' چڑیا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''خالی دیکھنے سے ٹینس کھیلنا تھوڑی آتا ہے۔'' ایبک نے اس بار جھنجلا کر کہا۔ لڑکیاں ہمیشہ اتنی بے وقوف کیوں ہوتی ہیں۔ اس نے ساتھ ہی سوچا...... چڑیا نے چہرہ جھکا لیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر وہ اس کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس نے اپنے کوارٹر کی دیوار کے ساتھ بیڈمنٹن ریکٹ کے ساتھ ٹینس کھیلنے کی پریکٹس کی تھی۔ ایبک نے آئینے میں اس کے لٹکے ہوئے منہ کو دیکھا وہ اداس اسے اچھی نہیں لگی تھی۔

''اچھا چلو، میرے پاس ایک اور ریکٹ ہے تم اس کے ساتھ کھیل لینا۔'' اس نے بے ساختہ اسے آفر کی اور چڑیا کا چہرہ سیکنڈز میں چمک اٹھا۔

☆☆☆

وہ بالکل پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس کمرے میں جس کے بارے میں وہ اتنا بہت کچھ سن چکی تھی کی طرف جانے سے پہلے...... سو بار سوچتی اور خاص طور پر رات کے اس پہر...... لیکن فی الحال وہ حواس باختہ تھی...... شیر دل کی طرف سے جواب نہ آنا اس کے حواس کو ماؤف کرنے کے لیے کافی تھا۔

ایک ہی وقت میں دو، دو، تین تین زینے پھلانگتی وہ اوپر آ گئی...... اور اس کے اوپر آتے ہی اس نے کاریڈور میں اس ماسٹر بیڈروم کے دروازے کی جھری سے آتی روشنی کو بند ہوتے دیکھا۔ کاریڈور روشن تھا لیکن وہ کمرا ایک بار پھر تاریک ہو چکا تھا۔ شہر بانو ٹھٹکی تھی۔ کمرے میں کوئی تھا اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے کمرے کی لائٹس کو آف ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ شیر دل وہاں بھی کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ وہ بے اختیار اس کمرے کے دروازے کے سامنے آئی...... اور تبھی کمرے کا دروازہ یکدم کھل گیا۔ چند لمحوں کے لیے شہر بانو کی سانسیں، دھڑکن اور خون کی گردش بیک وقت تھمی...... اور پھر جیسے ایک الیکٹرک شاک کے ساتھ وہ اپنے حواس میں واپس آ گئی۔ اندر سے نکلنے والا شیر دل تھا...... مطمئن انداز میں نائٹ ڈریس پر ایک سیاہ جرسی چڑھائے بے حد Casual انداز میں وہ اس طرح باہر نکلا تھا جس طرح کوئی اپنے گھر کے ایک کمرے سے اچانک نکل آتا ہے۔ شہر بانو ننھے بچوں کی طرح ایک لمحے کے توقف کے بعد اس سے لپٹ گئی تھی۔ اس کی زندگی میں شیر دل اور مثال کے علاوہ اور کوئی قیمتی چیز نہیں تھی ایسی چیز جس کو کھونے کے خدشے سے اس کی راتوں کی نیند اڑ جاتی یا وہ کھانا پینا بھول جاتی۔ مثال، شیر دل کے بہت بعد آئی تھی اور شیر دل یہ بات جانتا تھا...... شہر بانو کے کہے بغیر...... جتائے اور بتائے بغیر بھی...... شیر دل نے اس کے گرد اپنے بازو لپیٹتے ہوئے کسی بڑے کی طرح اس کی پشت کو تسلی دینے والے انداز میں نرمی سے رگڑا۔

''تم پھر بیڈ سے گری ہو؟'' شیر دل اس کے اس طرح اٹھ کے آ جانے کی وجہ یہی سمجھا تھا۔ اس کے سینے میں سر چھپائے شہر بانو اس کو یہ نہیں بتا سکی کہ چند منٹوں میں وہ خدشات کے کتنے جنگل پار کر آئی تھی۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ تم نے وعدہ کیا تھا اس کمرے کو بند رکھنے کا۔'' اس کی پشت پر اس کی جرسی کو دونوں مٹھیوں میں بھینچے سر اٹھائے بغیر اس نے بے حد خفگی کے عالم میں اپنی سانس کو بحال کرنے کی کوشش میں کہا۔

''کام تھا۔'' شیر دل نے بے حد گول مول انداز میں اس کے سر کو چومتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔

وہ اب پلٹ کر اس دروازے کے باہر لگے ہوئے بولٹ کو چڑھا کر تالا بند کر رہا تھا۔
"مجھے آپریٹر نے جگایا ہے...... اس کمرے میں لائٹ دیکھ کر انٹر کام کر رہے تھے وہ تمہیں۔" شہر بانو نے اسے اطلاع دی۔
"اوہ...... مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اوپر والے فلور پر اچانک لائٹس دیکھ کر......" شیر دل بات کرتے کرتے رک گیا۔ وہ شہر بانو کو اس کی نیند کے دوران ہونے والے کسی واقعے کے بارے میں کوئی کلیو نہیں دینا چاہتا تھا۔
"ایسی کسی چچویشن میں تمہیں گارڈ کو بلا کر اسے اوپر بھیجنا چاہیے تھا تم بے وقوفوں کی طرح خود اوپر آ گئیں۔" اس کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ہوئے شیر دل نے اسے ڈانٹا۔
"لیکن تم اوپر آئے کیوں تھے؟" شہر بانو نے اس کی ڈانٹ کا برا منائے بغیر کہا۔
"کام تھا کوئی یار۔" شیر دل نے اس کے ماتھے، چہرے پر بکھرے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اسے ایک بار پھر ٹالا۔
ہال کمرے سے باہر نکلتے ہی شیر دل نے بھی برآمدے نما کاریڈور کی کھڑکیوں سے باہر اکٹھے ہوئے گارڈز کو دیکھ لیا تھا۔
"تم بیڈ روم میں جاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ شہر بانو سے کہتے ہوئے خود بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا...... شہر بانو اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔ مثال اسی طرح اپنے بستر میں گہری نیند سو رہی تھی۔ شہر بانو کو بیڈ روم میں آ کر پہلی بار سردی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اوپر تک پھر آئی تھی۔ وہ کمبل ہٹاتے ہوئے دوبارہ بستر میں گھس گئی۔ بستر میں چیت لیٹے وہ کچھ دیر تک شیر دل کا انتظار کرتی رہی...... اسے نیند آ رہی تھی لیکن وہ شیر دل کو واپس کمرے میں موجود دیکھے بغیر سونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ شیر دل تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آیا...... اور وہ تب بھی جاگ رہی تھی۔
"سو جاؤ یار...... کیوں جاگ رہی ہو؟" شیر دل نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے جاگتے دیکھ کر کہا۔
"تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" شہر بانو نے کچھ مطمئن انداز میں جماہی لیتے ہوئے کہا۔
"میں واپس آ گیا ہوں...... تم سو جاؤ۔" شیر دل نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ وہ اب سائڈ ٹیبل پر پڑا اپنا لائٹر اور سگریٹ پیک اٹھا رہا تھا۔ شہر بانو آنکھیں بند کیے چند لمحے جیسے اس کے بستر پر لیٹنے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بیڈ سائڈ ٹیبل لیمپ کو آف کر رہا تھا لیکن بستر میں نہیں تھا۔
"تم کہاں جا رہے ہو اب؟" شہر بانو نے کچھ ہڑبڑا کر کہا۔
"میں مثال کے بیڈ روم میں ہوں ایک دو سگریٹ پی کر واپس آ جاؤں گا۔" شیر دل نے دھیمی آواز میں اس سے کہا اور برابر والے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ شہر بانو نے کچھ الجھ کر کمرے کی نیم تاریکی میں اس کے ہیولے کو برابر والے کمرے میں غائب ہوتے دیکھا...... وہ کیوں سو نہیں پا رہا تھا، وہ سمجھ نہیں پائی تھی اور وہ آدھی رات کو کس کام سے اوپر والی منزل پر گیا تھا وہ اس سے یہ بھی پوچھ نہیں پائی تھی...... وہ بہت دیر تک آنکھیں کھلی نہیں رکھ پائی۔
برابر والے کمرے میں شیر دل بیٹھا ایک کے بعد ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ بہت زیادہ تھکن ہونے کے باوجود نیند اب بھی اس سے کوسوں دور تھی اور جو کچھ وہ اوپر والے بیڈ روم میں دیکھ آیا تھا اس کے بعد اسے نیند

ابھی نہیں سکتی تھی۔ وہ گھر کسی نہ کسی حد تک Haunted تھا اسے اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا لیکن وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ اثرات کس حد تک تھے...... اور کیا اس سے اس کی فیملی کے متاثر ہونے کے امکانات تھے؟ کسی آسیب زدہ گھر میں اپنی بیوی اور کم سن بیٹی کو رات کے وقت اکیلے چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا...... اس کی فرض شناسی اور دلیری اس ایک چیز پر آ کر ختم ہو جاتی تھی اور صرف اسی کی نہیں کسی بھی آفیسر کی ہو جاتی...... وہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ شام ہوتے ہی ہر روز گھر بھاگ آتا۔ کئی بار اسے گھر آ کر رات کو پھر آفس جانا پڑتا تھا...... اور کئی بار وہ آج رات کی طرح کسی وزٹ سے رات گئے واپس آتا...... اور کئی بار وہ چند دنوں کے لیے کسی نہ کسی کام سے گھر سے غیر حاضر بھی ہوتا۔ وہ اس غیر حاضری کے دوران اپنی فیملی کو لاہور اپنے پیرنٹس کے پاس بھجوا سکتا تھا لیکن وہ روزمرہ امور کی انجام دہی کے دوران ہونے والی تاخیر کا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہ کرے کیا۔ اس کا سر بری طرح چکرایا ہوا تھا۔

☆☆☆

"سر، آپ پریشان نہ ہوں۔" خانساماں نے شیر دل کو تسلی دی۔ اگلے دن ویک اینڈ تھا اور شیر دل نے کچھ دیر پہلے ناشتے کے بعد خانساماں کو اپنی اسٹڈی میں بلوایا تھا۔ وہ اب اس گھر کے بارے میں اس سے تفصیلی بات چیت کرنا چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ گفتگو کا آغاز کرتا خانساماں نے خود ہی بات کا آغاز کر دیا تھا۔ رات کے واقعات صبح ہونے تک تمام ملازمین کے علم میں آ چکے تھے اور شیر دل کو اس پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیئر ٹیکر اور لوئر اسٹاف کی نیٹ ورکنگ آفیسرز کی نیٹ ورکنگ سے کہیں زیادہ مؤثر اور تیز ہوتی ہے۔
"یہ دروازے وغیرہ کھل جانا تو عام چیز ہے اس گھر میں اور آج تک اس سے کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا۔" وہ اب شیر دل کو بتا رہا تھا۔ "بلکہ آج تک اس گھر میں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوا کسی بھی صاحب کا، بس چھوٹی موٹی چیزیں غائب ہو جاتی ہیں...... کبھی کبھار کچھ آوازیں آنے لگتی ہیں۔ دروازے خود ہی بند اور کھلتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار گھر میں پڑی مشینیں خود ہی چل پڑتی ہیں بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔" خانساماں اسے تفصیل سے بتا رہا تھا۔
"ابھی" "یہ" "بس ہے؟" شیر دل نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا۔ "میری بیوی نے اگر ایک بھی چیز دیکھ لی ان میں سے ہوتے ہوئے تو وہ زندگی میں دوبارہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے پہلے والے آفیسر کے ساتھ بھی ہوا تھا یہ سب کچھ؟" شیر دل نے اچانک پوچھا۔
"سب کے ساتھ ہوتا ہے جو بھی آ کر یہاں رہتا ہے لیکن آہستہ آہستہ سب کو عادت ہو جاتی ہے، میں نے آپ کو بتایا نا کہ یہاں آج تک کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔" خانساماں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔
"شہر بانو کو کل رات کے واقعات کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔" شیر دل نے اسے تحکمانہ انداز میں کہا۔
"جی سر۔"
"اور گھر میں قرآن خوانی کا انتظام کرواؤ...... کسی مسجد یا مدرسے سے مولوی صاحب اور طلبہ کو بلواؤ ختم قرآن کے لیے۔" شیر دل نے مزید ہدایات دیں۔ اسے یہ ہدایت دیتے ہوئے حیرانی ہوئی کہ اسے پہلے اس

چیز کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ خانساماں کو ہدایات دے کر فارغ کرنے کے بعد اس نے آپریٹر سے اس گھر سے پوسٹ آؤٹ ہونے والے آفیسر سے رابطہ کروانے کا کہا تھا۔ وہ خانساماں کی تسلیوں سے مطمئن نہیں ہوا تھا لیکن وہاں اس سے پہلے پوسٹڈ رہنے والے آفیسر کا بیان بھی خانساماں کے بیان سے مختلف نہیں تھا۔ اس گھر میں کچھ اثرات تھے لیکن وہاں رہنے والے ہر آفیسر کے لیے وہ قابلِ قبول تھے۔ شیر دل کچھ مطمئن ہونے لگا۔ اس نے ایک کے بعد ایک کتنے ہی آفیسرز کو کال کی تھی۔ ان سے سوال و جواب کرتے ہوئے اسے ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا کہ وہ ان سے یہ پوچھتا کہ اس گھر میں رہائش کا ان کی ازدواجی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا۔ نہ ہی اس نے یہ چیک کرنے کی کوشش کی کہ ان میں سے کتنے ابھی تک اپنی پہلی شادی نبھا رہے ہیں اور کتنے لائف پارٹنر تبدیل کر چکے ہیں اگر وہ یہ تحقیق کر لیتا تو اسے پتا چل جاتا کہ اس گھر میں رہنے والے تمام آفیسرز......

''شیر دل تم ویک اینڈ بھی کام کرتے گزارو گے؟'' شہر بانو نے اسٹڈی میں داخل ہو کر شیر دل کا انہاک توڑا۔ شیر دل نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسیور واپس رکھ دیا۔ وہ آپریٹر کو ایک اور آفیسر سے رابطے کا کہتے کہتے رک گیا تھا۔

''بس ختم ہو گیا ہے کام۔'' اس نے مسکراتے ہوئے شہر بانو سے کہا۔ یہ اس کے گھر کا ایک Unsaid rule تھا کہ ویک اینڈ پر کام نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کئی بار یہ Rule توڑتا آرہا تھا اور اس میں اس کی اپنی نیت سے زیادہ ملکی حالات کا قصور تھا۔ شہر بانو اس کی پروفیشنل مجبوریوں اور مصروفیات سے واقف ہونے کے باوجود اس ایک چیز کو بے حد ناپسند کرتی تھی۔ وہ خود حتی المقدور اس لائف اسٹائل سے بچتی آرہی تھی جو ایک انتظامی آفیسر کی بیوی کا ہو جاتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے طور پر یہ شیر دل کی پہلی پوسٹنگ تھی اور شہر بانو اب بھی بڑی محدود سوشل سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھی۔ اسے ایک عام ڈپٹی کمشنر کی بیوی کی طرح اسکولز اور کالجز کے فنکشنز میں مہمان خصوصی بن کر جانے، فیتے کاٹنے اور بے مقصد تقریریں کرنے میں دلچسپی نہیں تھی۔ نہ وہ مزاجاً ایسی تھی نہ شیر دل اس کا ایسا سوشل پروفائل چاہتا تھا کہ جس میں گھر آنے پر اسے وہ نظر نہ آتی۔ اس کے باوجود پہلے کی نسبت اب شہر بانو کو بہت سے ایسے فنکشنز میں جانا پڑتا تھا جہاں پر انتظامی آفیسر کی بیوی کی موجودگی ناگزیر تھی۔

''کیا پروگرام ہے آج کے لیے؟'' شیر دل نے اس سے پوچھا۔ پچھلے تین ویک اینڈز سے وہ اتنا مصروف تھا کہ کسی ذاتی سیر و تفریح کے پروگرام پر عملی جامہ پہنانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ایک آدھ بار ویک اینڈ پر انہوں نے باہر کھانا کھایا تھا اور شہر بانو کے لیے شیر دل کے ساتھ اتنا وقت گزارنا بھی غنیمت تھا۔ آج تین ہفتوں کے بعد شہر بانو نے کہیں جا کر دن گزارنے کا پروگرام بنایا تھا اور شیر دل پھر صبح سے اسٹڈی میں بند تھا۔

''تم فارغ ہوئے تو کوئی پروگرام بنے گا۔'' شہر بانو نے شکایتاً کہا۔

''I'm totally free now۔'' شیر دل نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کرسی کھسکاتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''مثال کہاں ہے؟''

''باہر Swings پر ہے...... شیر دل رات کو کیا ہوا تھا؟'' شہر بانو نے اسے بتاتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا ہوا تھا؟'' شیر دل نے جواباً پوچھا۔

''تم اوپر اس کمرے میں کیوں گئے تھے؟'' شہر بانو نے گفتگو کا سلسلہ پچھلی رات سے جوڑنے کی کوشش کی۔

''میں سوچ رہا ہوں اس کمرے کو بند نہ رکھا جائے، میں اپنی اسٹڈی وہاں شفٹ کرنے کا سوچ رہا ہوں۔'' شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے، تم اب روز رات کو اس کمرے میں جا کر بیٹھا کرو گے۔'' شہر بانو نے بے اختیار تلملا کر کہا۔

''کیا حرج ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کمرا بند ہی رہے گا۔'' شہر بانو نے جیسے اسے یاد دلایا۔

''میں نے کل کہیں پڑھا ہے کہ جن جگہوں پر اثرات ہوں انہیں ویران اور غیر آباد نہیں رکھنا چاہیے۔'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''اوہ، رئیلی......'' شہر بانو نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور اس کمرے کو آباد کرنے کے لیے تم اپنی خدمات پیش کر رہے ہو...... واہ کیا بات ہے، اس سے وہاں اثرات ختم ہو جائیں گے؟ شیر دل تم واقعی احمق ہو یا اس گھر میں آ کر ہو گئے ہو؟'' شیر دل کا دل بے ساختہ چاہا تھا وہ کہے کہ اس گھر میں آ کر ہو گیا ہوں۔ پچھلی رات اگلی کئی راتوں تک اسے یاد رہنے والی تھی۔ خاص طور پر اس کمرے میں دیکھا جانے والا مثال کا وہ ٹیڈی جسے بری طرح ادھیڑ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا کر رہی ہو چڑیا؟'' خیر دین سوتے سے اٹھ کر باہر آگیا تھا۔ چڑیا نے اسے باہر آتے نہیں دیکھا وہ یک دم اس کی آواز سن کر ڈر گئی تھی۔

''کچھ نہیں نانا، میں ٹینس کی پریکٹس کر رہی ہوں۔'' چڑیا نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ تختی کے ساتھ گیند کو وارٹر کی بیرونی دیوار پر مار مار کر ٹینس کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی اور خیر دین اسی آواز سے جاگا تھا۔

''تم نے وقت دیکھا ہے؟'' خیر دین نے خفگی کے ساتھ اس سے کہا۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ پتا نہیں چڑیا کب اٹھی تھی اور کب گیند اور تختی لے کر باہر آگئی تھی۔ کوارٹر کے سامنے دس فٹ لمبا ایک صحن تھا جس کے ایک حصے میں ایک کچن باتھ روم اور دوسرے میں ایک چارپائی پڑی رہتی تھی۔ اس صحن کے گرد چھ فٹ اونچی چار دیواری تھی اور اب اسی چار دیواری کے اندر صحن میں جلتے بلب کی روشنی میں چڑیا پریکٹس میں مصروف تھی۔ وہ اگلے دن ایبک کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ اسے کھیل کی الف بے بھی نہیں آتی...... وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے بچوں کی جس دنیا میں وائلڈ کارڈ انٹری ملی تھی، وہ موقع اس سے چھن جائے۔ بچکانا سوچ تھی اور بچکانا ہی کوشش تھی لیکن صرف لگن تھی جو بچکانا نہیں تھی۔

''نانا ابا آپ سو جائیں میں ابھی آ کر سو جاؤں گی۔'' اس نے گیند کو ایک اور ہٹ کرتے ہوئے خیر دین سے کہا۔ تختی کے ساتھ ٹینس بال کو ہٹ کرنا بے حد مشکل کام تھا۔ نہ وہ ہموار طریقے سے تختی پر لگ کر اچھل رہی تھی اور نہ ہی دیوار سے لگنے کے بعد ٹھیک سے تختی پر آرہی تھی لیکن چڑیا کوشش ترک کرنے پر تیار نہیں تھی...... یہ ایبک کے ساتھ پہلے پریکٹس سیشن کی تیاری تھی۔

''بیٹا صبح کھیلنا...... ابھی بہت رات ہو گئی ہے۔'' خیر دین نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''نہیں نانا مجھے ابھی کھیلنا ہے۔'' وہ نہیں مانی تھی۔ خیر دین چند لمحوں میں ہی ہار مان کر اندر واپس سونے چلا گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد بالآخر تختی ٹوٹ گئی تھی۔ مایوسی اور صدمے سے چڑیا کا برا حال ہو گیا...... کھیلنے

کے لیے اب اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ بے حد رنجیدہ کوارٹر میں سونے گئی اور نیند کی وادی میں بھی وہ اس رات ٹینس ہی کھیلتی رہی تھی۔

''ریکٹ پکڑنا آتا ہے نا؟'' اگلی سہ پہر ایبک نے کورٹ پر اسے ریکٹ پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' چڑیا نے بڑے اعتماد سے ریکٹ پکڑ لیا۔

''تو پھر ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں تمہارے؟'' ایبک نے اس کے ہاتھوں کی Grip کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ چڑیا اسے کیا بتاتی کہ وہ ایکسائٹمنٹ کی وجہ سے تھا۔ وہ ریکٹ جسے ہاتھ لگانے کے لیے وہ کئی مہینوں سے ترس رہی تھی اب اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس سے کھیلنے جا رہی تھی۔

''اس طرح نہیں...... یہاں سے پکڑتے ہیں۔'' ایبک نے ریکٹ پر اس کے ہاتھوں کی پوزیشن کو ٹھیک کیا۔ چڑیا نے میکانیکی انداز میں اس کی ہدایات کے مطابق اپنے ہاتھ کی پوزیشن تبدیل کی۔

اس دن وہ دونوں ایک گھنٹے کھیلتے رہے اور ایک گھنٹے کے اختتام پر چڑیا کی Serve جو شروع میں Net کے دوسری طرف جا ہی نہیں رہی تھی وہ اب دوسرے کورٹ تک پہنچنے لگی تھی۔ ایبک کسی ایکسپرٹ کوچ کی طرح اسے ٹینس سکھا اور کھلا رہا تھا، یہ اندازہ تو اسے بھی بخوبی ہو گیا تھا کہ چڑیا کی ٹینس پریکٹس اور نالج واقعی صرف دیکھنے تک ہی محدود تھی لیکن وہ بہت اسمارٹ تھی اس کا اندازہ ایبک کو ہو گیا تھا۔

''you are a quick learner'' اس نے اپنی ستائش کھیل کے دوران ہی چڑیا تک پہنچا دی تھی۔ ایبک کی ستائش چڑیا کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ کھیل میں اس کی لگن اور انہماک کچھ اور بڑھ گیا تھا، ایک گھنٹے میں انہوں نے صرف ٹینس نہیں کھیلی تھی انہوں نے بہت ساری باتیں بھی کی تھیں۔ ایبک اس کی کمپنی انجوائے کر رہا تھا۔ وہ باتونی تھا اور وہ بہت اچھی سامع تھی۔ عام بچوں کے برعکس وہ زیادہ باتیں نہیں کرتی تھی لیکن دلچسپ باتیں کرتی تھی اور ایبک کو وہ ''لڑکی'' نہیں لگی تھی۔ وہ Talkative, Loud, Silly، Goofy گرلز جن سے اس کی جان جاتی تھی جو ہر بات میں رونے بیٹھ جاتی تھیں یا پھر جھگڑا کرنے...... چڑیا کے ساتھ وہ اس طرح اور اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا جو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا تھا...... All the boy talk اور چڑیا اس کی باتوں کو سمجھ رہی تھی جواب دے رہی تھی۔ تبصرہ کر رہی تھی اور اختلاف کر رہی تھی...... اور یہ صرف آغاز تھا...... ان کی دوستی کا، ان کی پارٹنر شپ کا...... ان کی Compatability اور Understanding کا۔ وہ دونوں عجیب طریقے سے ایک دوسرے کے قریب ہوئے تھے۔

ایک گھنٹا آنے والے دنوں میں کئی گھنٹوں میں بدلتا چلا گیا اور ٹینس کورٹ کے علاوہ بھی اب وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔ ایبک نے اسے بتایا تھا کہ وہ ٹینس پلیئر بننا چاہتا ہے لیکن ساتھ سول سروس بھی جوائن کرے گا کیونکہ اس کے فادر سول سرونٹ تھے اور اسے بھی بنانا چاہتے تھے اور وہ باہر جا کر Plane اڑانا بھی سیکھے گا اور کسی باہر کی یونیورسٹی سے پڑھے گا...... Most probably harvard کیونکہ اس کے فادر بھی وہاں سے پڑھے تھے...... اس نے اس کے علاوہ بھی اپنے تمام عزائم اور ارادے چڑیا کو بتائے تھے۔ جن میں ایک پولو پلیئر بننا، پیانو سیکھنا اور نوبل پرائز جیتنا بھی شامل تھا لیکن وہ کس فیلڈ میں نوبل پرائز جیتنا چاہتا تھا یہ ابھی اس نے طے نہیں کیا تھا۔

چڑیا نے اسے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور ڈاکٹر ہی بنے گی۔

''اور؟'' ایبک نے اسے خاموش ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''اور کچھ بھی نہیں بس ڈاکٹر۔'' چڑیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس صرف ڈاکٹر بنو گی تم...... اور کچھ بھی نہیں...... کوئی اور کام نہیں کرو گی...... کوئی اور پلان نہیں تمہارا۔'' ایبک کو جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ چڑیا ایسی بات کر سکتی تھی۔ وہ پہلی لڑکیوں والی بات تھی جو اس نے چڑیا کے منہ سے سنی تھی۔ Typical پروفیشن اور بس ایک ہی کام۔

''اتنی لمبی زندگی میں تم بس ایک کام کرو گی؟'' ایبک نے جیسے اس کا مذاق اڑا کر اسے Motivate کرنے کی کوشش کی۔

''میرے نانا کہتے ہیں ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا چاہیے۔ اس طرح کام آسان بھی ہو جاتا ہے اور اچھا بھی ہوتا ہے۔'' چڑیا نے خیر دین کا گر ایبک کو کسی طوطے کی طرح سادہ لہجے میں بتایا۔

''I don't agree with your Nana'' ایبک نے سر جھٹک کر کہا۔ ''زندگی تو بڑی چھوٹی ہوتی ہے ایک وقت میں ایک کام کریں گے تو پھر تو زندگی میں تھوڑے سے کام ہوں گے بس۔'' چڑیا نے بغور اس کی بات سنی۔ ''تم بس ڈاکٹر بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرنا چاہتیں؟'' ایبک نے اس سے پوچھا۔

''کرنا چاہتی ہوں۔'' چڑیا نے کہا۔

''کیا کرنا چاہتی ہو اور؟'' ایبک نے دلچسپی لی۔

''میں دنیا کی سیر کرنا چاہتی ہوں۔''

''Me too'' ایبک بے اختیار چلایا۔ ''یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا تھا۔'' چڑیا مسکرائی۔

''اور میں امی اور نانا کے لیے ایک گھر بنانا چاہتی ہوں...... بڑا اور خوب صورت۔''

''اور؟''

''اور میں ایک سنگر بھی بننا چاہتی ہوں۔''

''تمہیں گانا آتا ہے؟'' ایبک نے یک دم اس سے پوچھا۔ چڑیا بلش ہوئی لیکن اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''رئیلی؟'' ایبک کو جیسے یقین نہیں آیا۔

''یس۔''

''اچھا، کل میں اپنا کی بورڈ لاؤں گا تم گانا۔'' وہ خوش ہوا۔

''او کے۔'' چڑیا نے بھی ایکسائٹڈ انداز میں سر ہلایا۔

''اور کیا کرنا چاہتی ہو تم؟'' ایبک نے مزید پوچھا۔

''اور میں ایک کھیل بنانا چاہتی ہوں چیس کی طرح کا۔ جس میں کوئین ہی کنگ ہو۔'' ایبک اس بار پھر چونکا۔

''یہ کیا بات ہوئی''

''ہاں تو جب کنگ اتنا ویک ہے تو پھر وہ کنگ کیسے ہو سکتا ہے...... کوئین پاورفل ہے تو کوئین کو کنگ بنا دینا چاہیے۔'' چڑیا نے اپنا Argument پیش کیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" ایک بالکل متفق نہیں ہوا۔ "کنگ، کنگ ہوتا ہے اور کوئین، کوئین۔"

"لیکن کوئین بھی تو کنگ بن سکتی ہے نا!"

"At least not in chess" ایک نے حتمی انداز میں کہا۔ "تمہیں کو چیس کھیلنا آتا ہے؟" ایک نے ساتھ ہی اس سے اگلا سوال کیا۔ چڑیا نے سر ہلا دیا۔

"جیسے تم کو ٹینس کھیلنا آتا تھا۔" ایک نے اس کا مذاق اڑایا۔ چڑیا سرخ ہوگئی۔

"نہیں، چیس واقعی کھیلنا آتا ہے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"Favourite piece کون سا ہے تمہارا؟" ایک نے پوچھا۔

"کوئین کے بعد Horse۔" چڑیا نے بے ساختہ کہا۔

"ہیں، یہ Horse کون سا Piece ہے؟" ایک ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ "تم Knight کو horse کہہ رہی ہو۔" اس نے چڑیا کو تقریباً ڈانٹ دیا۔

"میں Horse ہی کہتی ہوں ہمیشہ۔" چڑیا نے کچھ شرمندگی سے کہا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ اس چیس Piece کا نام نہیں جانتی تھی لیکن وہ اس Piece کو Horse کہنے کی عادی تھی۔

"لیکن نہیں کہنا چاہیے نا Horse اور Knight میں تو بڑا ڈیفرنس ہوتا ہے۔"

"کیا ڈیفرنس ہوتا ہے؟" چڑیا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"Horse تو ایک Animal ہوتا ہے لیکن Knight تو ایک Soldier ہوتا ہے۔ Daring، Brave، Strong، Powerful...... وہ سنگل Handedly wars لڑ اور Win کر سکتا ہے کنگ کے لیے اور گھوڑا تو بس گھوڑا ہوتا ہے۔" ایک نے اپنے لحاظ سے دونوں مہروں کی تعریف کی۔

"میرا فیورٹ چیس پیس ویسے صرف کوئین ہے۔" ایک نے بے ساختہ کہا۔

"Knight بھی کوئین کی طرح پاورفل ہے۔" چڑیا نے اس کی تشریح سننے کے بعد تبصرہ کیا۔

"کوئین کی طرح کوئی نہیں۔ کوئین، کوئین ہوتی ہے۔" ایک نے اپنا فیصلہ دیا۔ "اور اس کو Knight کی طرح کا کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ نہ Wars لڑنی پڑتی ہیں...... نہ Sword سے Fight کرنی پڑتی ہے...... نہ ہارس رائڈنگ کرنی پڑتی ہے...... But she is still powerful" ایک اسے سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

"اور ایسا کیوں ہے؟" چڑیا نے بے ساختہ پوچھا۔ ایک ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑا۔

"Because she is the king's wife and king loves her" ایک نے روانی میں کہا۔ چڑیا حیرانی سے ایک کا منہ دیکھ کر رہ گئی تھی...... Love کا لفظ اس کی Vocabulary میں موجود تھا لیکن ایک دوسرے مفہوم کے ساتھ...... جو فیلنگز وہ اپنے نانا، ماں، بونوں اور کتابوں اور اسکول اور کھلونوں کے لیے رکھتی تھی۔ وہ اس کے نزدیک Love تھا۔ اس نے فیری ٹیلز میں بھی شہزادوں اور شہزادیوں، بادشاہوں اور ملکاؤں کے درمیان محبت کا لفظ پڑھا اور سنا تھا مگر وہاں بھی اس لفظ نے اس سے کوئی مفہوم کوئی چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ ایک کی Interpretation نے پہلی بار اسے اس لفظ کی طرف متوجہ کیا

تھا۔ کوئین پاورفل اس لیے ہوتی ہے کیونکہ وہ King کی وائف ہوتی ہے اور کنگ اس سے محبت کرتا ہے۔ اس نے چند لمحوں کے لیے ایک کے بیان کو اپنے لفظوں میں دُہراتے ہوئے اس پر غور کیا لیکن سوال اب بھی یہ تھا کہ King خود کیوں اتنا ویک تھا اور اس نے یہ بات ایک سے پوچھ بھی لی تھی۔ ایک خود بھی چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ چیس کھیلتے ہوئے آج تک اس نے ان مہروں اور ان کی پاورز کے بارے میں اتنا تھوڑی سوچا تھا جتنا چڑیا سوچتی رہتی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کنگ نے اپنی ساری پاورز کوئین کو دے دیں اس لیے وہ پھر خود ویک ہوگیا۔" ایک نے چند لمحوں کے غور و خوض کے بعد نتیجہ نکالا۔

"ہاں، پر کیوں دیں پاورز۔" چڑیا نے اعتراض کیا۔

"مجھے لگتا ہے وہ کوئین سے بہت پیار کرتا ہوگا...... اس لیے دی ہوں گی۔ جیسے میرے پاپا میری ممی سے بہت پیار کرتے ہیں تو سارا گھر ممی چلاتی ہیں...... سارے پیسے بھی ان کے پاس ہوتے ہیں...... ساری چیزیں بھی وہ لاتی ہیں...... سارے سرونٹس سے بھی وہی بات کرتی ہیں۔" ایک اپنی طرف سے بڑی دور کی کوڑی لایا تھا...... چڑیا اس لوجیک کو نہیں سمجھ سکتی تھی اس نے باپ نہیں دیکھا تھا۔ ماں کو ایک کوئین کی طرح پاورفل دیکھا تھا۔ اس نے صرف خیر دین دیکھا تھا ہر ذمے داری نبھاتا ہوا...... اس نے ایک سے مزید سوال جواب نہیں کیے تھے۔ اس کا عزم برقرار تھا۔ اگر کوئین سب سے پاورفل تو پھر بورڈ کوئین کا...... لیکن ایسا کون سا کھیل بن سکتا تھا جس میں یہ ہو پاتا یہ اس نے طے نہیں کیا تھا۔

"کسی دن کھیلیں گے چیس بھی...... میرے پاس بورڈ ہے نہیں...... لیکن انکل کے پاس ہے ایک Magnetic chess...... انکل سے مانگوں گا۔" ایک نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

"میرے پاس ہے ایک چیس بورڈ۔" چڑیا نے جلدی سے بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں کہا۔ کم از کم اس کے پاس کچھ تو تھا جو وہ ایک کو آفر کر سکتی تھی۔

"اچھا، پھر کل لے کر آنا۔" ایک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

کم از کم چیس وہ کھیل نہیں تھا جس میں ایک کے ساتھ کھیلنے سے پہلے چڑیا کو پریکٹس کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اگر ایک پانچ سال کی عمر سے ٹینس کھیل رہا تھا تو چڑیا اسی عمر سے خیر دین کے ساتھ چیس بورڈ پر مہروں کو اکھاڑتی، پچھاڑتی آ رہی تھی۔ خیر دین نے کئی سالوں سے اکیلے کھیلتے کھیلتے پچھلے تین سالوں سے اکیلے کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ جب بھی بورڈ لے کر بیٹھتا...... چڑیا میکانکی انداز میں آ کر پاس بیٹھ جاتی۔ بورڈ پر مہرے سجانا اس کی پسندیدہ سرگرمیوں میں سے ایک تھا اور مہرے سجاتے سجاتے وہ ان مہروں کی اکھاڑ پچھاڑ میں بھی شریک ہوگئی تھی۔ اس نے خیر دین کو پہلی بازی ایک سال کھیلتے رہنے کے بعد ہرائی تھی۔ خیر دین اسے اتفاق سمجھا تھا اور ہار کا سبب اس نے اپنی بے دھیانی کو قرار دیا تھا لیکن پھر ہر تیسرے چوتھے دن ایسا ہونے لگا تھا کہ چڑیا چیک میٹ کی پوزیشن میں آ جاتی اور خیر دین کو اپنا بادشاہ بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا پڑتے...... اور اب تین سال بعد خیر دین اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے اسی طرح محتاط اور مستعد رہتا تھا جس طرح اپنے کسی ہم عمر کے ساتھ کھیلتے ہوئے۔ جیت کا تناسب اب بھی خیر دین کے حق میں تھا لیکن ایک آٹھ سال کی بچی سے بھی

کبھار ہارنا بھی بڑا کٹھن کام تھا اور خاص طور پر اس بچی سے جس کو آپ نے خود کھیل سکھایا ہو۔ چڑیا سے ہار کے سارے لمحات خیر دین کے لیے فخر کے لمحات تھے، اپنی اگلی نسل سے ہارنا ہر ایک کو اچھا لگتا ہے۔

چڑیا اگلے دن اپنا وہ ڈبا لے کر ایبک کے پاس پہنچ گئی تھی جس میں ایک سستا پلاسٹک کے مہروں والا چیس بورڈ تھا۔

"You know chirya چیس مجھ کو کیوں زیادہ اچھی نہیں لگتی۔" ایبک نے اسے بورڈ پر مہرے سجاتے دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"کیوں؟" چڑیا ٹھٹکی تھی۔ اسے یہ اندازہ تو تھا ہی نہیں کہ ایبک کو چیس زیادہ پسند نہیں تھی۔

"اس میں وقت بڑا لگتا ہے۔ بیٹھے رہو...... سوچتے رہو...... مجھے جلدی ہونے والے کام پسند ہیں۔" ایبک نے کہا۔

"نانا کہتے ہیں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔" ایبک لاجواب ہو کر گڑبڑایا۔

"نہیں، اتنی جلدی کی بات نہیں کر رہا میں۔" اس کو محاورے کی سمجھ آئی ہو نہ آئی ہو شیطان سے وہ اچھی طرح متعارف تھا۔

"پہلی بازی کا فیصلہ سات منٹ میں ہو گیا۔ دوسری کا آدھے گھنٹے میں تیسری کا 20 منٹ میں۔ چوتھی Stalemate تھی۔ 45 منٹ جاری رہی...... اور پانچویں کا فیصلہ ایک بار پھر 20 منٹ میں ہوا تھا...... اور یہ تمام بازیاں چڑیا نے جیتی تھیں۔ ایبک اس دن ٹینس کھیلنا بھول گیا تھا۔ وہ ایک ہفتے سے چڑیا کا گاڈ فادر بنا بیٹھا تھا۔ وہ Instruct کر رہا تھا، وہ Direct کر رہا تھا اور اب وہ ایک ایسے کھیل میں آ گیا تھا جہاں وہ اسی چڑیا کے ہاتھوں منٹوں میں چت ہوا تھا...... شکست کا وار کاری پڑ رہا تھا پر بورڈ پر نہیں ایبک کے ذہن پر...... وہ ایک نرم اور ہمدرد طبیعت والا باتونی لیکن مدد کرنے والا بچہ تھا...... خاندان کا بڑا اور فیورٹ بچہ تھا۔ لائم لائٹ میں رہنے والا اور فیورز ملنے کا عادی۔ اس یقین اعتماد کے ساتھ پرورش پانے والا بچہ کہ وہ جو بھی کرے گا ہمیشہ اچھا اور Above average ہی کرے گا کوئی کسی چیز میں اس سے بہتر نہیں ہو سکتا، اس کو Beat نہیں کر سکتا۔ وہ کھیل میں ہارنے والے کو جا کر خود گلے لگا سکتا تھا۔ اپنی ٹرافی اس کو تھما سکتا تھا۔ اس کے ساتھ رو بھی سکتا تھا لیکن وہ جیتنے والے کے گلے میں ہار نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کے لیے تالیاں نہیں بجا سکتا تھا اور اس کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو نہیں کھنچوا سکتا تھا۔ اس میں اسپورٹس مین اسپرٹ تھی لیکن وہ ایک بچہ تھا۔ ایک ایسا بچہ جو ہر چیز میں جیتتا تھا۔

"اب ہم کل کھیلیں گے۔" مسلسل پانچویں بازی میں سر دھڑ لگا دینے کے باوجود بھی ہارنے پر اس نے بالآخر کہا۔

"اوکے۔" چڑیا فوراً مان گئی، اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کھیلتے کھیلتے اس دن انہیں بہت دیر ہو گئی تھی ابھی اسے ہوم ورک کرنا تھا اور ایبک کو بھی۔

وہ پہلا دن تھا جب ایبک کے سر پر چڑیا سوار رہی تھی۔ وہ باقی کا سارا دن بھی چڑیا اور چیس کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں سوچ نہیں سکا۔ شام کو اس نے اس دن ٹینس کے بجائے اپنے انکل کے ساتھ چیس کی

پریکٹس کی تھی۔

"یہ چیس میں بیٹھے بٹھائے تمہیں کیسے دلچسپی ہو گئی؟" اس کے انکل کو حیرت اور تجسس ساتھ ہوا تھا۔

"بس ایسے ہی...... دل چاہ رہا تھا کھیلنے کو۔" ایبک نے اگلی چال سوچتے ہوئے بورڈ پر نظریں جمائے گول مول جواب دیا۔ وہ اپنے انکل کو جو اس کے آئیڈیل تھے، یہ کیسے بتا دیتا کہ وہ ایک لڑکی سے ہارا تھا چیس میں...... ایک بار نہیں کئی بار۔ ایک بچے کے طور پر بھی اس کی Ego بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔

اگلے دن چڑیا سے مقابلے کے لیے وہ اگر چیس کی پریکٹس کرتا رہا تھا تو چڑیا اپنی نئی تختی سے ٹینس کی پریکٹس کرتی رہی تھی۔

"چیس ہی کھیلیں گے آج بھی۔" ایبک نے اس سے کہا۔

"ٹینس کیوں نہیں؟" چڑیا کچھ جز بز ہوئی...... دو دن ٹینس نہ کھیلنے کا مطلب تھا کہ اس کے بہتر ہوتے ہوئے شاٹس پھر پہلے جیسے ہونے لگتے...... Weak and wayward

"بس چیس کھیلنے کو دل چاہ رہا ہے۔" ایبک نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اس کی سوئی اب تب تک چیس میں ہی اٹکنے والی تھی جب تک وہ اس کھیل میں اسے کم از کم ایک بار ہرا نہیں لیتا۔ چڑیا کو زیادہ اعتراض نہیں ہوا تھا۔ پاپ کارن کھاتے ہوئے وہ اس دن بھی چڑیا سے سات بازیاں ہارا تھا...... اور سات ہی کھیلی گئی تھیں۔ چڑیا نے ایبک کی الجھن اور ٹینشن نوٹس نہیں کی تھی۔ نہ ہی اسے یہ اندازہ ہو پایا تھا کہ مسلسل شکست ایبک کو کسی حد تک خفا کر رہی تھی۔ وہ دوسرے دن بھی رات گئے تک اپنے انکل کو مجبور کر کے ان کے ساتھ چیس کھیلتا رہا تھا لیکن تیسرے دن بھی ایک کے بعد ایک بازی ہارنے کے بعد اس نے بالآخر ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ چڑیا چیس میں اس سے بہت بہتر تھی اور اس اعتراف نے چڑیا سے اس کی مرعوبیت کا آغاز کیا تھا۔

"چڑیا تم بہت اچھا کھیلتی ہو۔" ایبک نے آخری بازی ہارنے کے بعد ایک گہری سانس لیتے ہوئے چڑیا سے کہا۔ تین دنوں میں یہ پہلی بار تھا کہ چڑیا کو ایبک سے داد ملی ہو۔ وہ بے حد خوش ہوئی تھی۔ "اگر تم کھیلتی رہو گی تو اور بھی اچھا کھیلو گی۔" ایبک نے تین دن کے بعد بالآخر ٹینس ریکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"But I promise میں Next year جب Summers میں آؤں گا تو تم سے زیادہ اچھا کھیلوں گا۔" ایبک نے اعلان کیا۔ چیس اس کے Work Sheet کا حصہ بن گئی تھی۔

"تم اگلے سال پھر آؤ گے؟" چڑیا نے بہت خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں، ہم ہر سال Summers میں انکل کے پاس ضرور آتے ہیں لیکن اتنا لمبا Stay شاید نہ کریں۔ اس بار تو پاپا کورس کے لیے امریکا میں ہیں اس لیے ہم ساری Vacations ادھر ہی گزار رہے ہیں۔" ایبک نے تفصیل سے بتایا۔ "ویسے تم اگر میرے انکل کے ساتھ کھیلو تو مجھے لگتا ہے You will beat him too" ایبک نے بات کرتے کرتے پھر موضوع بدلا۔ چڑیا مسکرا کر چیس بورڈ اور مہرے سمیٹنے لگی تھی۔ اس نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے انکل اپنی بیٹی کے آس پاس بھی اس کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔

"نانا، ایبک کہتا ہے میں بہت اچھا کھیلتی ہوں۔" اس شام چڑیا نے بے حد خوشی کے عالم میں خیر دین کے ساتھ ایبک کی ستائش شیئر کی تھی۔

''وہ تو تم کھلاڑی ہو...... میں تو ہمیشہ بتاتا ہوں تمہیں۔'' خیر دین نے مسکرا کر اس کی بات سنتے ہوئے کہا۔

''اور ایبک کہتا ہے اگر میں صاحب کے ساتھ کھیلوں تو ان کو بھی Beat کر سکتی ہوں۔'' چڑیا نے فخریہ انداز میں ایبک کا اگلا جملہ دہرایا۔

''نہیں...... نہیں چڑیا۔ ہمیں صاحب کو ہرانے کا نہیں سوچنا چاہیے...... صاحب تو بڑا لائق ہے...... بہت بڑا افسر ہے...... اس کو ہرانا آسان تھوڑی ہوتا ہے...... اور پھر کیوں ہرائیں......'' خیر دین نے فوراً چڑیا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''جی نانا۔'' وہ کچھ بجھ گئی۔ اس کا خیال تھا خیر دین ایبک کی اس تعریف پر بہت خوش ہوگا۔

اس دن ایبک نے بھی گھر میں چڑیا کا ذکر کیا تھا۔ اپنے انکل کے ساتھ چیس کھیلتے ہوئے اور وہی لفظ دہرائے تھے جو اس نے چڑیا سے کہے تھے۔

''انکل! وہ اتنا اچھا کھیلتی ہے کہ آپ کو بھی Beat کر سکتی ہے۔'' اس کے انکل اس کی بات پر ہنس دیے۔ وہ بچوں کی تعریفوں اور دعووں پر غور کرنے کے عادی نہیں تھے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں انکل۔'' ایبک کو جیسے ان کا ہنسنا یا دوسرے الفاظ میں اس کا مذاق اڑانا اچھا نہیں لگا تھا۔

''وہ تم کو ہرا سکتی ہوگی لیکن مجھے نہیں ہرا سکتی...... سمجھے تم...... اناطولی کارپوف نہیں ہے وہ...... اور نہ تم۔'' اس کے انکل نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''اچھا تو پھر آپ اس کے ساتھ کھیل کر دیکھیں۔'' ایبک نے جیسے چیلنج کیا۔

''اور مجھے اناطولی پسند نہیں ہے۔ کیسپروف پسند ہے۔'' اس نے اس پلیئر پر اعتراض کیا جس کے ساتھ اس کے انکل اسے اور چڑیا کو ملا رہے تھے۔

''چلو دیکھوں گا کسی دن فی الحال تو تمہارے لیے چیک میٹ ہے۔'' اس کے انکل نے اپنا مہرہ اس کے بادشاہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے وہ اس لیے نہیں جیتتی کہ وہ اچھا کھیلتی ہے، تم اس لیے ہارتے ہو کیونکہ تم اس سے زیادہ برا کھیلتے ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر ٹیبل چھوڑ گئے۔

☆☆☆

عقبی لان میں پڑی ایزی چیئرز کے درمیان پڑے ریڈیو پر برائن ایڈمز کا Summer of 69 بج رہا تھا جب شہر بانو باہر نکلی تھی۔ شیر دل کچھ دیر پہلے وہیں ایک ایزی چیئر پر براجمان شارٹس میں نیم دراز آج کے نیوز پیپرز دیکھتے ہوئے چائے پی رہا تھا۔ صبح ہلکی بارش ہوئی تھی اور آسمان پر ابھی بھی ہلکے بادل تھے اور ان دونوں چیزوں نے اس وقت باہر کے موسم کو بے حد خوشگوار کر دیا تھا اور اس موسم میں برائن ایڈمز کے اس Song نے شہر بانو کو بہت کچھ یاد دلایا تھا...... بہت سے خاص...... خوش گوار...... زندگی بھر نہ بھولنے والے لمحے...... یادیں...... جو برائن ایڈمز کے اس Song کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ اس کے قدموں کو باہر کھینچ لانے والی چیز بھی اس گانے کی آواز ہی تھی...... موسم نہیں...... وہ ویک اینڈ تھا اور وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی جاگی تھی اور اب انٹرکام کے کام نہ کرنے کی وجہ سے کچن میں ملازم کو ناشتے کے لیے ہدایات دے کر آئی تھی جب کاریڈور سے

گزرتے ہوئے اس نے لان میں بجتا ہوا یہ Song سنا تھا۔ شیر دل میوزک کا شوقین تھا اور ویک اینڈز پر فرصت میں پرانے انگلش Songs سننا اس کی ہابیز میں سے تھا۔ اس وقت بھی لان میں وہی ہو سکتا تھا۔

شہر بانو ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گئی...... سامنے ٹیبل پر پڑے چائے کے کپ کو اس نے ہاتھ بڑھا کر چھوا، وہ ہلکا سا گرم تھا۔ کپ میں ہمیشہ کی طرح چائے کی کچھ مقدار موجود تھی۔ وہ یقیناً ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر گیا تھا۔ شیر دل کو عادت تھی ہمیشہ چائے کے کپ میں چائے چھوڑنے کی...... وہ چائے بہت پیتا تھا لیکن وہ چائے اسی طرح پیتا تھا۔ برائن ایڈمز کی آواز اور گٹار ماحول کی خاموشی کو عجیب انداز میں رومینٹک کر رہے تھے یا یہ ہمارے اپنے دل کی کیفیت ہوتی ہے جو ایک عام گانے کو ہر بار بجنے پر یا کسی خاص گانے کو کسی خاص لمحے میں بجنے پر یادگار بنا دیتی ہے۔ شہر بانو نے زیر لب گانے کے بول گنگناتے ہوئے چائے کے مگ میں کچھ اور چائے بنائی۔ شیر دل کو اپنی چائے کپ میں چھوڑنے کی عادت تھی اور اگر وہ اکیلا چائے پی رہا ہوتا اور شہر بانو پاس ہوتی تو وہ ہمیشہ اس کے چھوڑے ہوئے وہ تین چار گھونٹ خود پی لیتی تھی۔ یہ عجیب سی عادت تھی اور اس کا آغاز ان کے ہنی مون کے دوران ہوا تھا۔ وہ چائے کی شوقین نہیں تھی اور امریکا میں اکٹھے تعلیم حاصل کرنے کے دوران وہ شیر دل کی اس عادت سے واقف تھی کہ وہ کپ میں بہت سی چائے چھوڑ دیتا تھا اور وہ جتنی چائے چھوڑتا تھا وہ چائے کی وہ مقدار تھی جو شہر بانو عام طور پر ایک وقت میں پی پاتی تھی اور ہنی مون کے دوران ایسا ہونے لگا تھا کہ وہ کہیں باہر گھومتے پھرتے چائے کا ایک کپ لیتے۔ شیر دل عادتاً چائے چھوڑتا اور شہر بانو وہ چائے پی لیتی۔ اس عادت پر سب سے پہلا اعتراض شیر دل کو ہی ہوا تھا۔

''تم کیوں پی رہی ہو یار...... Leave it...... مجھے تو عادت ہے۔'' اس نے پہلی بار اس کی بقیہ چائے پینے کی کوشش پر کپ اس کے ہاتھ سے لے کر خفگی کے عالم میں پھینک دیا تھا۔

''کیا ہو گیا...... ویسے ایک دوسرے کی جھوٹی چیزیں نہیں کھا رہے کیا؟'' شہر بانو بھی جواباً خفا ہوئی۔

''پر یہ تو میری بچی ہوئی چائے ہے۔'' شیر دل نے اسے جتایا۔

''تو؟''

''یار میں عورتوں کی Equality پر Believe کرتا ہوں...... یہ شوہروں کا جھوٹا کھانے والی بات میں

Digest نہیں کرسکتا ''You don't have to do this'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''تم میرے شوہر نہیں ہو شیر دل...... اور میں اپنے شوہر کا جھوٹا نہیں کھا رہی۔ نہ میں جھوٹا کھانے والی لڑکی ہوں...... تم بس وہ مرد ہو جس سے میں دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتی ہوں...... ٹرسٹ کرتی ہوں......

And I find it very romantic to sip your tea'' شہر بانو نے جواباً اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تو یار تم پہلے پی لیا کرو نا۔'' شیر دل نے آفر کی۔

''تم پھر بھی کپ میں چائے چھوڑ دو گے۔'' شہر بانو نے چیلنج کیا۔

''تو؟''

''تو یہ کہ مجھے پینے دیا کرو اگر میں پینا چاہتی ہوں۔'' شیر دل کچھ دیر الجھی نظروں سے اسے دیکھتا رہا... پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''وحشی لڑکیوں کے دماغ میں کسی نہ کسی حد تک خرابی ضرور ہوتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے...... خرابی نہ ہو تو ہم شادی کیوں کریں؟'' اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''On the way you held my hand
I knew that it was now or never
Those were the best days of my life
Back in the summer of 69''

چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ بے اختیار مسکرائی۔ وہ اب بھی ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ شیر دل ارد گرد کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ بجتا ہوا ریڈیو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ آس پاس ہی کہیں تھا اور تھوڑی دیر میں واپس وہاں آ جاتا۔

دور مالی لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھے۔ شہر بانو کی طرح متوجہ نہ ہونے کے باوجود وہ اس کی یا شاید شیر دل کی باہر موجودگی کی وجہ سے بڑی مستعدی سے کام کر رہے تھے۔

انگریزوں کے زمانے کی ہر سرکاری رہائش گاہ کی طرح وہ ڈی سی ہاؤس بھی وسیع و عریض رقبے پر شہر کی ایک پرائم لوکیشن پر تھا جو یقیناً انگریزوں کے زمانے میں شہر سے بہت ہٹ کر واقع ہوگا۔ عمارت کے چاروں طرف لان کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی اور عمارت کے عقب میں سرونٹ کوارٹرز کے لیے کچھ حصہ مختص تھا۔ شیر دل اور وہ کچھ مہینوں پہلے جب یہاں منتقل ہوئے تھے تو گھر کے سامنے والے لان اور عقب میں موجود کچن گارڈن کے علاوہ گھر کے چاروں اطراف میں موجود لان گھاس پھونس اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ سالوں پرانے درخت اور پودے تراش خراش سے محروم چلے آ رہے تھے۔ بیرونی دیواروں پر چڑھی بیلوں کے نیچے موجود دیواروں نے شاید صدیوں سے سورج کی روشنی نہیں دیکھی تھی اور کی دیوارں کا جو حال کر سکتی تھی اس نے وہی کیا تھا۔ بہت سے پودے مناسب نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے سوکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ عدم توجہی کی بنا پر اپنی جگہ پر اسی حالت میں موجود تھے۔ انہیں زمین سے اکھاڑ نکالنے کے لیے جس دقت اور محنت کی ضرورت تھی وہ گھر کے مالک کی ہدایات اور دلچسپی کے بغیر کسی مالی کی طرف سے ملنا مشکل تھا۔ عمارت کے

عقب میں موجود کوارٹرز کے ساتھ ایک حصے میں پھل دار درختوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جن میں سے کچھ درخت اب اپنی مدت پوری کر چکے تھے اور پتوں کے ڈھیر سے زمین بھر دینے کے علاوہ کوئی اور خدمت کرنے سے قاصر تھے۔ اگر ان پھل دار درختوں سے گھر کے مکین مستفید ہو رہے ہوتے اور مسلسل لان کا جائزہ لیتے رہے ہوتے تو وہ درخت مناسب وقت پر Replace ہو جاتے مگر اتنے وسیع و عریض لان میں ہر طرف جانا اور خاص طور پر سرونٹ کوارٹرز والے حصے میں کبھی بھی کسی آفیسر یا اس کی فیملی کے لیے دلچسپی کا کام نہیں تھا۔ ان درختوں سے اترنے والا پھل وہیں سرونٹ کوارٹرز میں موجود ملازم استعمال کرتے یا پھر صاحب کے کچن میں اس کی تھوڑی بہت سپلائی جاری رکھتے۔ سرونٹ کوارٹرز کی اپنی حالت ان کے شفٹ ہونے پر بے حد مخدوش تھی۔ سفیدی یا رنگ روغن نام کی کوئی شے وہاں مستقبل قریب میں تو ایک طرف ماضی بعید میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ کوارٹرز کی سیلن زدہ دیواریں کئی جگہوں پر کائی اور بے ہنگم چڑھی ہوئی بیلوں سے بھری ہوئی تھیں جوان سرونٹ کوارٹرز میں مقیم ملازمین کی کانٹ چھانٹ کے باوجود بار بار پھیل جاتی تھیں...... عمارت کے عقب میں کچن گارڈن وہ واحد جگہ تھی جہاں بے حد منظم انداز میں باغبانی ہو رہی تھی اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ کچن گارڈن اس عمارت میں مقیم تمام سرونٹس کے کھانے کی ضروریات پوری کر رہا تھا ورنہ شاید وہاں بھی موسمی سبزیوں کے بجائے وہی جھاڑ جھنکاڑ ہوتا جو عمارت کے باقی دو اطراف کے لان میں تھا۔

عمارت کے داہنی طرف کے لان میں کسی زمانے میں شاید ٹینس کورٹ بنایا گیا ہوگا۔ اس کا اندازہ شیر دل اور شہر بانو کبھی نہ کر پاتے اگر وہ خود ٹینس پلیئر نہ ہوتے اور گھاس پھونس کے اس جنگل سے گھاس کے نشیب و فراز کو جانچتے ہوئے ایک عدد گراس کورٹ کے Fossils نہ دریافت کر لیتے۔

عمارت اور اس سے ملحقہ لانز کی زبوں حالی کی اگر ایک وجہ اس میں رہائش پذیر آفیسر کی اس کی تزئین و آرائش میں عدم دلچسپی تھی تو دوسری وجہ مینٹیننس کے لیے مناسب فنڈز کی عدم دستیابی بھی تھی۔ اتنی بڑی عمارت کا انتظام و انصرام کسی کے لیے بھی خالہ جی کا گھر نہیں تھا خاص طور پر ایک ایمان دار آفیسر کے لیے اور وہ بھی ایسا آفیسر جو خاندانی اعتبار سے بھی خاصا سفید پوش ہو...... سرکاری خزانے کو ایک خاص حد اور بجٹ سے زیادہ ڈی سی ہاؤس پر خرچ کرنے کے لیے جس جرأت، چالاکی اور ہاتھ کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیر دل کے پیش رو

میں نہیں تھی، شیر دل میں تھی۔ اس لیے عمارت اور اس کے لانز کے ساتھ ساتھ سرونٹ کوارٹرز کی حالت بھی دنوں میں بدلی تھی۔ شیر دل ہارڈ ٹاسک ماسٹر تھا اور اس کے ساتھ ساتھ Workaholic بھی...... دوسرے آفیسرز کی طرح وہ صرف عمارت کے اس حصے تک خود کو محدود نہیں رکھتا تھا جو اس کی رہائش گاہ تھی۔ وہ کسی بھی وقت عمارت کے کسی بھی حصے میں پہنچ جاتا اور اس کی اس عادت نے جہاں عملے کو بے حد مستعد اور پریشان کر رکھا تھا وہاں دوسری طرف ڈی سی ہاؤس کے دن واقعی پھر گئے تھے۔ سرونٹ کوارٹرز میں تقریباً پندرہ سالوں بعد بڑے پیمانے پر مرمت کا کام ہوا تھا۔ ڈی سی کی اپنی رہائش تو خیر ہر سال ہی Renovate ہوتی تھی۔ شیر دل اپنے ماتحت عملے کے حوالے سے خاصا فیاضانہ رویہ رکھتا تھا اور وہ جہاں بھی پوسٹڈ رہا تھا اس نے اس معاملے میں اپنے لیے خاصی پسندیدگی اور نیک نامی کمائی تھی۔ جب تک سرونٹ کوارٹرز میں کام ہوتا رہا وہ تقریباً ہر روز آفس جانے سے پہلے یا واپس آنے کے بعد پیچھے کا ایک چکر ضرور لگا کر آتا۔ عمارت کے عقب میں وہ تمام پھل دار درخت کاٹ دیے گئے تھے جو اب اپنی مدت پوری کر چکے تھے اور بہار کے موسم میں کچھ نئے پودوں کی قلمیں بھی لگائی گئی تھیں۔ صرف سرونٹ کوارٹرز اور عمارت کی ہی کایا کلپ نہیں ہوئی، لانز کی شکل صورت بھی بدل گئی تھی۔ چند مہینے پہلے بہار کے موسم میں لگائے ہوئے بیجوں کی پنیری اب ہر جگہ کو سرسبز اور رنگین کیے ہوئے تھی۔ گرمیوں کا موسم آجانے کے باوجود لان میں پھولوں کی ایک بڑی تعداد مختلف کیاریوں میں کسی نہ کسی حالت میں تھی۔ بہت سارے نئے دیسی اور بدیسی پودوں اور پھولوں کا اس ڈی سی ہاؤس میں اضافہ ہو گیا تھا اور ٹینس کورٹ ایک بار پھر ''معرضِ وجود'' میں آگیا اور تمام تبدیلیوں میں شیر دل کے ساتھ شہر بانو کا بھی کلیدی کردار تھا۔ Horticulture اس کا سبجیکٹ نہیں تھا لیکن اسے اس میں دلچسپی تھی۔

وہ اب تک جہاں بھی پوسٹڈ رہے تھے شہر بانو گھر کی Renovation ضرور کرتی تھی اور جب تک اس کی Renovation ختم ہوتی ان کی اگلی پوسٹنگ کے آرڈرز آجاتے۔ اسے یقین تھا کہ ان کے بعد آنے والوں کو اس سے Well maintained گھر زندگی میں نہیں ملے ہوں گے۔ شہر بانو کے لیے یہ ایکٹیوٹی جیسے اپنے پروفیشن کے ساتھ کسی نہ کسی طریقے سے جڑے رہنے کی ایک کوشش بھی تھی جس کو وہ شیر دل کی جاب کی وجہ سے بالائے طاق رکھے ہوئے تھی۔ اس گھر میں آنے کے بعد ابتدائی طور پر چھوٹے موٹے پرابلمز ہونے کے بعد سب کچھ آہستہ آہستہ سیٹ ہوتا گیا تھا۔ وہ خوف اور عدم تحفظ کا احساس جس کا شکار شہر بانو وہاں آتے ہی ہو گئی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا۔ شیر دل نے اگرچہ اسے پہلی بار خود بخود دروازے کھلنے کے بارے میں نہیں بتایا لیکن اس کے بعد اوپر نیچے ایسے کئی واقعات ہوئے کہ شیر دل کو ہر بات شہر بانو سے چھپانی مشکل ہو گئی تھی۔ شہر بانو نے بھی آہستہ آہستہ وہاں ایسی کئی چیزیں محسوس کی تھیں جنہیں وہ اگنور نہیں کر پائی لیکن کمروں کے دروازے خود بخود بند ہونا اور کھل جانا جیسے اب ایک معمول کی بات تھی......
اس کے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی چیزیں خود بخود غائب ہوتیں پھر کچھ دنوں بعد واپس آجاتیں۔ استری کے لیے نکالے ہوئے کپڑے غائب ہو جاتے اور ایک بار تو استری ہی تین دن غائب رہی۔ مثال کے گم ہونے والے کھلونے واحد چیز تھی جو دوبارہ نہیں ملتے تھے۔ شہر بانو اور شیر دل شروع کے شاکس اور Set backs کے بعد آہستہ آہستہ ان تمام Experiences اور واقعات کے عادی ہوتے چلے گئے۔ خوف کی وہ کیفیت جو

شروع میں شہر بانو کے سر پر سوار رہتی تھی اب ختم ہو چکی تھی۔ وہ لوگ وہاں باقاعدگی سے قرآن خوانی کروانے کے عادی تھے، ہفتے میں ایک بار ہونے والی قرآن خوانی کے اثرات چند ہی ہفتوں میں نظر آنا شروع ہو گئے۔ پہلے کی نسبت ان غیر معمولی واقعات کا تناسب بہت کم ہو گیا تھا خاص طور پر گھر میں کبھی کبھار رات کو آنے والی آوازوں کا، اوپر والا ماسٹر بیڈ روم اب شیر دل کے زیرِ تصرف ایک اسٹڈی روم کی شکل اختیار کر چکا تھا اور جب سے وہ کمرا آباد ہوا تھا اس گھر میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات بڑی تیز رفتاری سے کم ہوئے تھے۔ شہر بانو نے اسٹڈی بننے کے بعد شروع میں بہت عرصے تک شیر دل کو رات کو اکیلے اس اسٹڈی میں کام کرنے نہیں دیا۔ وہ خود بھی کام کے دوران اس کے پاس کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی تھی اور تب تک وہیں موجود رہتی جب تک شیر دل کام کر رہا ہوتا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ مطمئن ہوتی چلی گئی کہ اس گھر اور خاص طور پر اس کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے شیر دل کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا۔

گرمیوں کا سیزن شروع ہو چکا تھا اور اب اس سیزن کے آغاز کے ساتھ ہی ان کے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ شہر بانو کے اپنے ننھیالی رشتے دار زیادہ تر ملک سے باہر تھے۔ اس کے والدین اور دونوں بھائی بھی امریکا میں ہی تھے۔ شیر دل سے شادی کے بعد اتنے سالوں میں وہ بہت کم امریکا گئی تھی اور اس کی فیملی میں سے کوئی ایک بار بھی اس سے ملنے پاکستان نہیں آ سکا تھا لیکن شیر دل کی اپنی فیملی بہت لمبی چوڑی تھی۔ فرسٹ اور سیکنڈ کزنز کی ایک بڑی تعداد جن میں سے زیادہ تر سول سروس سے ہی منسلک تھے یا پھر مختلف انٹرنیشنل آرگنائزیشنز اور باڈیز کے ساتھ اور وہ سب آپس میں بہت میل جول رکھے ہوئے تھے۔ خود شیر دل کو بھی اپنے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا بہت پسند تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور فیملی کے پسندیدہ ترین انکلز اور کزنز میں سے تھا اور اتنا پاپولر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ یا وہ ہر وقت کہیں نہ کہیں انوائٹ ہوتے یا پھر کوئی نہ کوئی ان کو وزٹ کر رہا ہوتا۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بھی اس کے رشتے داروں ہی کی طرح وسیع تھا۔ شہر بانو، شیر دل کے برعکس زندگی کا بڑا حصہ امریکا میں گزارنے کی وجہ سے بے حد محدود میل جول کی عادی تھی۔ اس کی فیملی زیادہ سوشل نہیں تھی اور وہ ان سے زیادہ Aloof...... اس کے گنتی کے چند دوست تھے اور شیر دل سے شادی کے بعد ان سے بھی اس کا رابطہ بہت محدود ہو گیا تھا...... تہواروں اور برتھ ڈے Greetings کے علاوہ وہ کم ہی کسی سے رابطہ رکھ پاتی تھی۔ اس کی زندگی شیر دل اور مثال سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو جاتی تھی اور بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ بھی شیر دل کے ذریعے اور اس کے ساتھ ہی

تھا۔ شیر دل کے لائف اسٹائل اور فطرت کے مطابق خود کو ایڈجسٹ کرنے میں شہر بانو کو وقت لگا تھا لیکن یہ تبدیلی اسے اچھی لگی تھی۔ سالوں لوگوں سے نہ ملنے کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں سے ملنا اور ان سے تعلقات بنانا مشکل سہی لیکن دلچسپ تھا۔

شیر دل کی بہن ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے ان کے ہاں آئی ہوئی تھی، آئزہ شیر دل سے بہت کلوز تھی اور اس کے بچے بھی.... ہر سال Summers میں وہ ضرور کچھ دنوں کے لیے شیر دل کے پاس آتی تھی۔ آئزہ اور اس کے بچوں کی وجہ سے شہر بانو کے پاس ایک دم جیسے ایک نئی مصروفیت آ گئی تھی۔ وہ دونوں تقریباً روز ہی شہر کو Explore کرنے نکلی ہوتیں۔ وہ کام جو شہر بانو امریکا میں اکیلے کر سکتی تھی لیکن پاکستان میں نہیں خاص طور پر شیر دل کی بیوی ہونے کی وجہ سے......

ریڈیو پر اب کوئی اور Song چلنے لگا تھا جب شیر دل اور اس کا ناشتا ایک ہی وقت میں آئے تھے۔ ملازم ٹیبل پر ناشتا لگا رہا تھا جب شیر دل اس کے پاس آ کر بیٹھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل فون ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''مجھے بھی ایک کپ چائے بنا دو۔'' شیر دل نے ملازم کو ہدایت دی اور ساتھ ہی ریڈیو اٹھا کر اس نے اس کی ٹیوننگ شروع کر دی۔

''Summer Of 69 چل رہا تھا ابھی۔'' شہر بانو نے مسکراتے ہوئے شیر دل سے کہا۔

''اوہ..... اچھا۔'' وہ بھی چونک کر مسکرایا اپنی چپل اتار کر اس نے سینٹر ٹیبل کے ایک کونے میں اپنی ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے نکالی تھیں۔ ریڈیو پر دوبارہ وہی چینل ٹیون کرنے کے بعد اس نے ریڈیو ٹیبل پر رکھا اور ملازم سے چائے کا کپ تھام لیا۔ ملازم چائے کے پہلے برتن سمیٹ کر لے گیا تھا۔

''آئزہ سو رہی ہے ابھی؟'' شیر دل نے اپنی بہن کے بارے میں پوچھا۔

''ہاں، میرا خیال ہے..... نوریہ کو بخار تھا کل رات اس کی وجہ سے کافی لیٹ ہی سوئی..... تم کہاں تھے، میں بہت دیر سے یہاں آ کر بیٹھی ہوں۔'' شہر بانو نے دلیے کا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے شیر دل سے پوچھا۔

''گیٹ تک گیا تھا یار...... اب مجھے پتا تھوڑی تھا کہ تم بھی باہر آ جاؤ گی۔'' شیر دل نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ شہر بانو کچھ کہتی ٹیبل پر پڑا شیر دل کا فون بجنے لگا۔ شیر دل چونک کر فون کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ فون اٹھانے کے لیے سیدھا ہوتا شہر بانو نے فون اٹھا کر اسے پکڑا دیا۔

''اب کوئی لمبی کال کرنے مت بیٹھ جانا۔'' اس نے ساتھ ہی شیر دل کو وارننگ دی۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے مسکرا دیا۔ پھر اس نے فون پکڑتے ہوئے چائے کا کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

''ہیلو...... وعلیکم السلام فیاض...... کیسے ہو یار؟'' وہ اب کسی سے بات کرنے لگا تھا۔ شہر بانو نے پیالے میں موجود دلیہ تقریباً ختم کر لیا تھا جب اس نے شیر دل کو کہتے سنا۔

''اچھا، پوسٹنگ آرڈرز آ گئے ہیں تمہارے..... کہاں پوسٹنگ آئی ہے..... Great..... تو تمہاری جگہ کون آ رہا ہے؟..... عکس؟..... Is she back?'' شیر دل کے انداز میں کچھ تھا کہ وہ بے ساختہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے شیر دل کو ٹیبل سے بے اختیار اپنی ٹانگیں ہٹاتے اور سیدھے ہو کر بیٹھتے دیکھا تھا۔ شہر بانو نے یہ بھی نوٹس کیا تھا۔

(جاری ہے)

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بھوت مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی ترمین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔ ترمین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ باجرہ اور اس کے شوہر خیر دین نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب یعنی شیر دل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔ ایک شیر دل کی چھوٹی بہن آرزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے شیر دل کے گھر آتے ہیں ایک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو شیر دل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرواتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیر دل کے کولیگ فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ (اب آگے پڑھیں)

اس نے اسٹینڈنگ مرر میں اپنے آپ کو دیکھا، اپنے خوب صورت بالوں کو دیکھا۔ اپنے بے حد نازک گولائی میں پھولے ہوئے پنک فراک کو ذرا سا گھوم کر دیکھا پھر اس نے بے حد فخریہ انداز میں چند قدم پیچھے کھڑی چڑیا کو دیکھا جو بے حد ستائشی نظروں سے اس ساڑھے تین سالہ باربی ڈول کو دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ نام تھا جس سے وہ اس کو پکارتی تھی اور یہی وہ نام تھا جو اس نے پہلی بار اسے دیکھتے ہی دے دیا تھا۔ اس کے تمام ساتھی بونوں کو بھی باربی ڈول سے اتنا ہی عشق تھا جتنا چڑیا کو اور وہ بھی اس کو پہلی بار دیکھتے ہی اس پر اسی طرح فریفتہ ہوئے تھے جس طرح چڑیا دیکھ کر ہوئی تھی۔

”میں اچھی لگ رہی ہوں؟“ اب باربی ڈول چڑیا سے پوچھ رہی تھی۔

”بہت، بہت، بہت اچھی اور پیاری۔“ چڑیا نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی خوب صورتی اور ستائش کی جیسے پیمائش پیش کی۔ باربی ڈول کا رنگ سرخ ہوا، اس نے ناک کو ہلکا سا دائیں طرف سکیڑ کر اپنے ہونٹوں کو بھینچ کر جیسے اپنی خوشی اور مسکراہٹ کو ایک ساتھ چھپانے کی کوشش کی۔

”میں تمہاری پونی کر دوں؟“ چڑیا نے باربی ڈول کے بکھرے ہوئے سیاہ ریشمی بالوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے پوچھا۔ باربی ڈول سر ہلاتی فوراً پونی بنوانے پر تیار ہو گئی تھی۔ چڑیا نے اپنے بالوں سے ربڑ بینڈ اتارا اور آئینے کے سامنے باربی ڈول کے عقب میں جا کر بڑے انہماک سے اس کی پونی بنانے لگی۔ ان دونوں کے اس تعلق کا آغاز باربی ڈول کے اس کے اسکول میں ایڈمیشن کے ساتھ ہوا تھا۔

چڑیا کلاس مانیٹر تھی اور وہ اس دن اپنی کلاس سے کسی کام سے باہر نکلی تھی جب اس نے مانٹیسوری کے لنچ بریک کے دوران پلے ایریا کے سامنے سے گزرتے ہوئے باربی ڈول کو وہاں لنچ باکس ہاتھ میں پکڑے see

saw پر جھولتے دو بچوں کے پاس کھڑے دیکھا۔ چند لمحوں کے لیے چڑیا کو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ وہ باربی ڈول جس کے بالوں کو چھونے اور جس کے ساتھ بات کرنے اور کھیلنے کی خواہش میں وہ کئی بار ڈی سی ہاؤس میں لان کے اس حصے میں منع کرنے کے باوجود جاتی رہتی تھی جہاں وہ اپنی ماں اور کبھی کبھار باپ کے ساتھ بھی شام کو کھیلنے کے لیے نکلتی تھی۔ باربی ڈول کے قریب جا کر اس سے کچھ کہنے کی ہمت اسے کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن دور سے بہت بار ان دونوں کے درمیان خاموش نظروں اور مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ وہ اس گھر کے مستقل رہائشی دو واحد بچے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں تجسس کا شکار نہ ہوتے اور ایک دوسرے کو مستقل طور پر اگنور کر پاتے۔ چڑیا فرینڈلی تھی، باربی ڈول نہیں تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی طرح بہت مہذب اور سلجھی ہوئی ہونے کے باوجود بے حد ریزروڈ تھی۔ پتا نہیں یہ طبعاً تھا یا پھر اس کے ماں باپ نے اسے بھی کچھ ہدایات دی تھیں۔ چڑیا سوچتی رہتی تھی لیکن کبھی اندازہ نہیں کر سکی تھی اور اب وہی باربی ڈول اس سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ چڑیا کے لیے کیسے یہ ممکن تھا کہ وہ اسے اگنور کر کے گزر جاتی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ شاید باربی ڈول کو بھی اپنے ہی اسکول میں دیکھ کر خوشی سے چھلانگیں لگاتی۔

”ہیلو۔“ وہ ایکسائٹمنٹ کے باوجود کچھ ڈرتی جھجکتی باربی ڈول کے پاس گئی تھی اور ہیلو کا چھوٹا سا لفظ کہنے کے لیے بھی اسے پتا نہیں کتنی ہمت کرنی پڑی تھی۔ باربی ڈول نے چونک کر گردن گھما کر اسے دیکھا اور پھر اس نے بھی اسی برق رفتاری سے چڑیا کا چہرہ پہچانا تھا جس طرح چڑیا نے اس کا...... وہ چڑیا کو فراموش کر بھی کیسے سکتی تھی۔ وہ گھر میں اس کے لیے دلچسپ چیزوں میں سے ایک تھی۔ لان میں کھیلتے کھیلتے اچانک کسی پھولدار جھاڑی یا پودے کی شاخ کے درمیان سے جھانکتا ہوا پُرتجسس آنکھوں والا ایک معصوم چہرہ، کبھی راہداری کی کھڑکیوں میں یک دم نمودار ہونے والی وہ روشن شرارتی آنکھیں جو باربی ڈول کے ساتھ اس کی ماں یا باپ کو دیکھ کر اسی طرح چھپا کے سے غائب ہو جاتی تھیں۔ بہت دفعہ پودوں سے جھانکتی چڑیا کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی تھی...... اپنے کھلونوں کے ساتھ لان میں کھیلتے یا سائیکل چلاتے ہوئے اور شروع شروع میں وہ اپنی ممی کو چڑیا کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش بھی کرتی تھی لیکن وہ اس کوشش میں ہمیشہ ناکام رہی۔ وہ جب تک اپنی ممی کو اس پودے یا جھاڑی کی طرف متوجہ کر پاتی جہاں اس نے چڑیا کو دیکھا تھا چڑیا وہاں سے غائب ہو چکی ہوتی۔

”ممی وہاں ایک Girl ہے۔“ اس نے پہلی بار چڑیا کو دیکھنے پر فٹ بال کو کک لگاتے لگاتے رک کر اپنی ماں کو اشارے سے بتایا تھا لیکن جب تک وہ اس پودے کی ان شاخوں کو دوبارہ فوکس کر پاتی جن میں سے اسے چڑیا کا چہرہ نظر آیا تھا، چڑیا غائب ہو چکی تھی۔ اس کی ماں نے چند لمحوں کے لیے چونک کر اس پودے کو دیکھا پھر پوچھا۔

”کہاں؟“

”وہاں...... پر وہ اب نہیں ہے۔“ وہ اب فٹ بال کھیلنا بھول گئی تھی۔

”ہاں وہی بچی ہو گی جو اس دن ملنے آئی تھی...... وہی بچی تھی کیا؟“ اس کی ممی نے کسی خاص حیرت اور تعجب کے اظہار کے بغیر کہا۔ ”وہ جو ہمارے کک کے ساتھ آئی تھی۔“ باربی ڈول نے ماں کے سوال پر اتنا غور نہیں کیا تھا نہ ہی اس نے اس بچی کے خدوخال کو ذہن میں لانے کی کوشش کی جسے اس نے کک کے ساتھ ملاقات میں دیکھا تھا۔ اسے زیادہ تجسس اس بات پر تھا کہ وہ اس پودے کے پیچھے سے اچانک کیسے غائب ہو گئی تھی اور

کہاں غائب ہوگئی تھی۔ یہ چڑیا سے اس کے تعارف کا آغاز تھا اور پھر جیسے یہ ایک معمول ہوگیا تھا۔ اس نے کئی بار چڑیا کو پودوں کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھا تھا۔ شروع شروع میں وہ ایکسائٹڈ ہو کر اپنی ممی کو بتانے کی کوشش کرتی تھی لیکن آہستہ آہستہ اسے اندازہ ہوتا گیا کہ اس کی ایسی ہر کوشش کے دوران چڑیا غائب ہوجاتی تھی اور اس کی ممی کو بھی لان کی جھاڑیوں اور پودوں میں چھپی کسی بچی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر اس نے اپنا یہ معمول بہت جلد بدل لیا تھا اب وہ لان میں کھیلنے کے لیے داخل ہوتے ہی دور تک پھیلے ہوئے پودوں اور جھاڑیوں میں چڑیا کی تلاش شروع کردیتی تھی اور اکثر بڑی آسانی سے اسے ڈھونڈ لیتی تھی پھر وہ اپنی ماں کو کچھ بھی کہے بغیر اسی طرح کھیل میں مصروف رہتی اور وقتاً فوقتاً کھیل سے دھیان ہٹا کر چڑیا کو بھی دیکھتی رہتی۔

چڑیا نے اب پہلے کی طرح غائب ہونا بند کردیا تھا۔ خاموش نظروں کا تبادلہ آہستہ آہستہ مسکراہٹوں کے تبادلے میں بدلنے لگا تھا۔ اگرچہ کچھ نہیں ٹوٹا تھا تو ان دونوں کے بیچ خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ ڈی سی کی بیوی لان میں کرسی پر بیٹھی یا تو کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا پھر پینٹنگ کرتی رہتی اور وہ لان میں سائیکل چلاتے یا فٹ بال کھیلتے ہوئے دور پودوں میں چھپی چڑیا کو دیکھ کر مسکراتی رہتی۔ کبھی کبھار وہ سائیکل چلاتے چلاتے جان بوجھ کر چڑیا کے بہت قریب سے ہو کر گزرتی اور کبھی وہ کھیلتے ہوئے جان بوجھ کر اس پودے کے قریب فٹ بال پھینک دیتی جہاں چڑیا چھپی ہوتی۔ یہ چھپے چڑیا کو کھیل کی دعوت دینے کی ایک غیر ارادی کوشش تھی جسے چڑیا نے کبھی قبول نہیں کیا تھا، وہ یہ جرأت کر ہی نہیں سکتی تھی کہ لان میں صاحب یا ان کی بیوی کی موجودگی میں وہ باہر نکل آتی۔ خیر دین نے اسے سختی سے منع کیا تھا، وہ ایک بچگانہ تجسس کی وجہ سے وہاں آتو جاتی تھی لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے کبھی اس کے نانا کو ڈانٹ پڑے۔ اس نے بہت بار مختلف آفیسرز کے ہاتھوں اپنے نانا کو ڈانٹ کھاتے دیکھا تھا اور اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اگرچہ خیر دین ہر بار ایسے کسی موقع پر اس کی موجودگی پر بعد میں اسے بٹھا کر اپنے صاحب کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

”دیکھو چڑیا جب غلطی ہوتی ہے تو ڈانٹ پڑتی ہے اور نہ ہر ڈانٹنے والا برا ہوتا ہے نہ ہی ہر ڈانٹ۔“

”پر نانا..... آپ کی زیادہ غلطی تو نہیں تھی۔“ وہ اپنے نانا کا دفاع کرتی۔

”تھوڑی تھی پر تھی تو سہی نا..... اب اگر صاحب غلطی پر کسی کو بھی نہ ڈانٹا کرے تو ہر ایک کام خراب کرنا شروع کردے گا۔“ چڑیا خیر دین کی بات پر سر ہلا دیتی لیکن اس کے باوجود خیر دین جانتا تھا کہ وہ خیر دین کو پڑنے والی کسی ڈانٹ پر بہت ناخوش ہوتی تھی۔

”ہیلو!“ باربی ڈول نے جواباً مسکرا کر کہا تھا۔ اسکول میں پہلے دن وہ پہلا شناسا چہرہ تھا جو اسے نظر آیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چڑیا سے لپٹ ہی جاتی۔

”تم یہاں اسٹڈی کے لیے آئی ہو؟“ چڑیا اس کے ہیلو پر مسکرائی تھی، باربی ڈول نے سر ہلایا۔

”ممی پاپا کے ساتھ آئی ہو؟“ باربی ڈول کا سر ایک بار پھر ہلا لیکن ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آئے تھے۔ اسے یک دم یاد آگیا تھا کہ اس کے ممی پاپا اسے صبح وہاں چھوڑ گئے تھے اور وہ وہاں اکیلی تھی۔ چڑیا اس کے آنسو دیکھ کر جیسے تڑپ اٹھی تھی۔

”رونا نہیں باربی ڈول، اچھے بچے تو نہیں روتے نا؟“ اس نے آگے بڑھ کر باربی ڈول کے گالوں پر لڑھکتے آنسو پہلے اپنے ہاتھوں سے پونچھے پھر اپنے فراک کی جیب سے رومال نکال کر اس سے باربی ڈول کا چہرہ صاف کیا۔

”دیکھو سارے بچے پڑھنے آتے ہیں۔“ چڑیا اب اسے سمجھا رہی تھی، باربی ڈول کے آنسو یک دم تھم گئے تھے۔ یہ چڑیا کی باتوں کا اثر نہیں تھا اس نام کا اثر تھا جس سے وہ اس کو پکار رہی تھی۔

”اور اسکول میں تو کتنا مزہ آتا ہے..... اتنی اچھی اچھی ٹیچرز ہوتی ہیں، بکس ہوتی ہیں..... پھر فرینڈز بھی تو بنیں گے نا تمہارے؟“ چڑیا اب وہ کام بھول چکی تھی جس کام سے وہ کلاس سے باہر آئی تھی اسے کچھ یاد تھا تو بس باربی ڈول یاد تھی۔ اپنی جیب میں رومال واپس رکھتے ہوئے اس نے جیب سے باربی ڈول کو ایک ٹافی نکال کر دی۔ باربی ڈول ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر اس نے ٹافی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ٹھیک ہے ممی اور پاپا تو یاد آرہے تھے لیکن ٹافی کھانے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ چڑیا مسکرائی پھر اس نے باربی ڈول کی دونوں پونیوں کو پیار سے چھوا۔

یہ ان کے تعارف کا آغاز تھا لیکن تعارف، تعارف تک ہی رہا تھا ویسی دوستی نہیں ہو سکی تھی جو چڑیا اور باربی ڈول دونوں کی خواہش تھی۔ دونوں کے سیکشنز الگ الگ تھے اور باربی ڈول کی بہت جلد اسکول سے چھٹی ہوجاتی تھی۔ مانٹیسوری ونگ کی لنچ بریک کا وقت بھی جونیئر ونگ سے مختلف تھا۔ اس کے باوجود چڑیا کو جب موقع ملتا وہ نرسری ریڈ کے سامنے سے صرف باربی ڈول کے لیے ضرور گزرتی یا لنچ بریک کے دوران واش روم جانے کے بہانے ایک بار مانٹیسوری کے پلے ایریا میں آکر باربی ڈول سے ضرور ملتی۔ باربی ڈول کو ٹافیاں اور لالی پاپ پسند تھے اور چڑیا جب بھی وہاں آتی اس کے لیے ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے کر آتی۔ وہ خود ٹافیاں وغیرہ کھانے کی بہت شوقین نہیں تھی۔ خیر دین کی دی ہوئی پاکٹ منی وہ سنبھال کر رکھ لیتی تھی۔ اسکول میں وہ گھر سے لایا ہوا کھانا ہی کھایا کرتی تھی۔ انڈا پراٹھا، میٹھے توس، جیم یا مکھن لگے سلائسز یا خیر دین کی اپنی بیک کی ہوئی کوکیز اور پلین کیک یا کپ کیک، ٹافی اور چیونگم کبھی اتفاقاً ہی کھاتی تھی، وہ اور لالی پاپ تو کبھی بھی نہیں لیکن باربی ڈول کی وجہ سے اس نے باقاعدگی سے اسکول کینٹین پر جانا شروع کردیا تھا۔ اس کی ان عنایات کی وجہ سے باربی ڈول بھی اس کے انتظار میں رہتی تھی۔

اسکول ڈی سی ہاؤس سے بہت دور نہیں تھا۔ خیر دین صبح جس وقت چڑیا کو سائیکل پر چھوڑنے جایا کرتا تھا اسی وقت باربی ڈول بھی اپنی ممی کے ساتھ گاڑی میں اسکول کے لیے نکلتی تھی۔ کبھی خیر دین پہلے اسے سائیکل پر بٹھا کر گھر کے فرنٹ گیٹ سے نکلتا اور پھر چند ہی منٹوں میں ڈی سی کی گاڑی ان کو اوورٹیک کرتے ہوئے ان کے قریب سے گزرتی۔ چڑیا سائیکل پر اور باربی ڈول گاڑی کی کھڑکی کے شیشے سے چپک کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے مسکراتیں اور ہاتھ ہلاتی جاتیں..... تب تک جب تک گاڑی اگلا موڑ نہ مڑ جاتی اور کبھی ڈی سی کی گاڑی ان سے پہلے گھر کے فرنٹ گیٹ سے نکل رہی ہوتی اور تب باربی ڈول پچھلی ونڈ اسکرین پر تقریباً چڑھی ہوئی چڑیا کو خیر دین کے آگے سائیکل پر بیٹھے دیکھتی رہتی..... اور کبھی ان دونوں کے اسکول جانے کی ٹائمنگ میں چند منٹوں کا فرق پڑ جاتا یا خیر دین پہلے چلا جاتا یا باربی ڈول پہلے اسکول چلی جاتی اور اس دن وہ دونوں سڑک پر ایک دوسرے کو بے چینی کے عالم میں ڈھونڈتی رہتیں۔

”نانا آپ سائیکل تیز کیوں نہیں چلاتے؟“ چڑیا کو ان حالات میں ڈی سی ہاؤس کی بیرونی روڈ پر ڈی سی کی گاڑی نہ دیکھ کر سائیکل کی رفتار پر اعتراض ہوتا۔ اسے یقین تھا کہ رفتار ذرا سی بھی تیز ہوتی تو موڑ پر لگے ٹریفک سگنل پر وہ اس گاڑی اور گاڑی کے اندر موجود باربی ڈول کو ضرور دیکھ لیتی۔

”بیٹا تیز تو چلا رہا ہوں۔“ خیر دین سائیکل کی رفتار کچھ مزید تیز کرتے ہوئے اس سے کہتا۔

”ہاں پر گاڑی جتنی تیز تو نہیں ہے نا؟“ وہ بے ساختہ شکایت کرتی۔ خیر دین ہنستا۔

"یہ سائیکل ہے بیٹا، وہ گاڑی ہے، یہ ٹانگوں سے چلتی ہے وہ پٹرول سے۔ اب سائیکل گاڑی کی طرح تو نہیں بھاگ سکتی نا۔" چڑیا، خیر دین کی بات تو سمجھتی تھی پر مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی صورت بھی ہر صبح باربی ڈول کو ایک بار ضرور دیکھ لینا چاہتی تھی۔

وہ ایک ایسے اسکول میں پڑھتی تھی جہاں صبح بچوں کو چھوڑنے کے لیے شاندار گاڑیوں کی قطاریں ہوتی تھیں یا پھر کچھ اسکول وینز اور بسیں وہ سائیکل پر وہاں آنے والی واحد اسٹوڈنٹ تھی۔ ان شاندار گاڑیوں کے ہجوم میں خیر دین بڑی مشکل سے اپنی سائیکل کے لیے رستہ بناتا۔ گاڑیوں سے بچتا بچاتا اسے اسکول کے مین گیٹ پر چھوڑتا تھا اور پھر اسی طرح چھٹی کے وقت اسے لینے کے لیے موجود ہوتا۔ یہ ڈی سی اور اس کی بیوی کی طرف سے ایک فیور تھی اور گاڑیوں کے اس ہجوم میں سائیکل پر سفر کرتے ہوئے چڑیا کا دل بھی ویسی گاڑی میں بیٹھنے کو تو چاہتا تھا جو وہ اپنے اسکول کے باہر دیکھتی تھی جس میں اس کے کلاس فیلو اور اسکول فیلو آتے تھے لیکن اسے کبھی اس سائیکل پر شرمندگی نہیں ہوتی تھی جس کے پیڈل گھماتا اس کا نانا اسے سال کے ہر موسم میں وقت کی پابندی کے ساتھ وہاں لاکر چھوڑتا اور وہاں سے لے کر جاتا تھا۔ سائیکل کے اس دس منٹ صبح اور دس منٹ دوپہر کے سفر میں وہ اور خیر دین بہت ساری باتیں کرتے تھے۔ وہ خیر دین کو سڑک پر اور اسکول کے باہر نظر آنے والی کوئی نئی گاڑی دکھاتی، خیر دین اسے ماڈل بتاتا۔ وہ اسے کوئی سرکاری جیپ یا سرکاری نمبر پلیٹ والی اسٹاف کار دکھاتی تو وہ اسے اس آفیسر کا عہدہ بتاتا۔ وہ اسے اپنے اسکول میں ہونے والے قصے سناتی اور وہ اسے گھر میں اپنی نوکری کی اس دن کی مصروفیات بتاتا...... اور ان ساری باتوں کے درمیان چڑیا یک دم عجیب وغریب سوال کرتی یا اپنے کسی مستقبل کے منصوبے سے خیر دین کو آگاہ کرتی۔

"نانا میں جب بڑی ہوں گی نا تو ایک کار بناؤں گی۔" دوسرے بچوں کے ارادے خریداری سے شروع ہوتے تھے چڑیا کے ایجادات سے۔ "اچھی بڑی سی کار جیسے صاحب کی اسٹاف کار ہے نا ویسی کار۔" وہ خیر دین کو بتاتی، وہ ہنستا، سنتا رہتا۔

"لیکن چڑیا تم تو ڈاکٹر بنو گی...... ڈاکٹر تو علاج کرتے ہیں گاڑیاں تھوڑی بناتے ہیں۔" خیر دین لقمہ دیتا۔ چڑیا سوچ میں پڑ جاتی۔

"اچھا نانا پھر میں ایک کار خرید لوں گی۔" وہ چند لمحوں بعد اپنا ترمیم شدہ منصوبہ پیش کرتی۔

"پر گاڑی تو بہت مہنگی ہوتی ہے اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟" خیر دین ہنستے ہوئے کہتا۔

"میں جب ڈاکٹر بنوں گی تو اسپتال میں جاب کروں گی اس سے جتنے پیسے ملیں گے میں سب جمع کرلوں گی پھر گاڑی خرید لوں گی۔" وہ اپنا طویل المدتی پلان بتاتی۔

"اچھا پھر گاڑی خرید کر کیا کرو گی؟" خیر دین اگلا سوال کرتا۔

"پھر ہم اس میں جایا کریں گے۔ آپ، امی اور میں...... تینوں اس میں بیٹھیں گے۔"

"تم ایسا کرنا مجھے ڈرائیور رکھ لینا اس گاڑی کا۔" خیر دین ہنس کر کہتا۔

"نہیں نانا، ایک ڈرائیور بھی رکھ لیں گے بس ہم سب پیچھے بیٹھ کر جایا کریں گے مزے مزے سے۔" وہ مسکراتے ہوئے خیر دین کو بتاتی۔

"چلو ٹھیک ہے چڑیا لیکن بیٹا یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ تمہیں لوگوں کا علاج کرنے کے لیے ڈاکٹر بننا ہے، بڑی گاڑیوں کے لیے نہیں۔" خیر دین اسے نصیحت کرنا نہ بھولتا۔

"جی نانا۔" وہ فرمانبرداری سے سر ہلاتی۔

"شاباش!" خیر دین اسے سراہتا۔

"اور نانا جو غریب اور بوڑھے لوگ ہوں گے میں ان سے پیسے نہیں لوں گی، فری میں علاج کیا کروں گی۔" چڑیا چند لمحوں بعد یک دم سنجیدگی سے کہتی اور خیر دین خوش ہو جاتا۔

☆☆☆

شیر دل اب کرسی پر سیدھا بیٹھا فیاض سے بات کر رہا تھا۔ "کب آئی ہے واپس؟"

"اچھا اور چارج کب سے لے رہی ہے؟"

"ہاں دے دو نمبر۔"

شہر بانو سلائس کھاتے ہوئے شیر دل کو فون پر بات کرتے دیکھتی رہی۔ کوئی چیز تھی جو شیر دل کے انداز میں منٹوں میں تبدیل ہوئی تھی، اس کی باڈی لینگویج میں اس کے لب و لہجے میں اس کی آنکھوں میں اور اس میں اور وہ یہ ہمیشہ سے ہوتے دیکھتی آئی تھی۔ ہمیشہ عکس مراد علی کے نام پر وہ شیر دل پر ایسے ہی اثرات دیکھتی تھی۔ وہ تبدیلی پہچان لیتی تھی لیکن وہ اس تبدیلی کو کبھی کوئی نام نہیں دے سکی تھی کیونکہ وہ یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ عکس کے نام پر شیر دل میں جو جھلکتا تھا وہ کیا تھا۔

اس نے پہلی بار عکس مراد علی کا نام اپنی انگیج منٹ (Engagement) کے ایک ہفتے کے بعد سنا تھا۔ شیر دل کا کوئی بیچ میٹ اور دوست اپنی بیوی کے ساتھ بوسٹن آیا ہوا تھا۔ شیر دل نے انہیں شہر بانو سے ملوانے کے لیے ڈنر پر انوائٹ کیا تھا اور ڈنر کے دوران ہی نافع نے شیر دل سے کہا۔

"اور ہاں...... عکس بھی مبارک باد دے رہی تھی تمہیں۔" شیر دل فورک سے مچھلی کا ٹکڑا اٹھاتے اٹھاتے ٹھٹکا تھا۔

"تم کب ملے ہو اس سے؟" شیر دل اب نافع سے پوچھ رہا تھا۔

"یہاں امریکا آنے سے پہلے۔" نافع بتا رہا تھا۔ "ڈی ایم جی والوں کی گیٹ ٹو گیدر تھی وہیں ملا ہوں۔ وہاں تمہارا ذکر ہوا تمہاری انگیج منٹ کا ذکر ہوا تو اس نے مبارک باد دینے کے لیے کہا۔" نافع بتا رہا تھا۔

"کیسی ہے وہ؟" شیر دل پوچھ رہا تھا۔

"پشاور میں رہ رہ کر پشتون ہو گئی ہے آدھی...... مذکر، مونث خراب ہو گئے ہیں اس کے۔" نافع، شیر دل کے سوال پر ہنسا تھا۔

"میرا خیال ہے وہ پشتونوں کے اس کو دیکھ کر صحیح ہو گئے ہوں گے۔" شیر دل نے بے ساختہ بے حد سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔ دونوں اپنی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ شہر بانو گفتگو سنتے ہوئے چپ چاپ ڈنر کرتی رہی۔

وہ پہلا موقع نہیں تھا جب اس نے شیر دل کو کسی لڑکی کے بارے میں بات کرتے یا اس کا حال احوال پوچھتے دیکھا تھا۔ اس کے حلقہ احباب میں لڑکیوں کی لمبی چوڑی تعداد تھی اور ان میں سے بہت سی اس کی بہت پرانی اور کلوز فرینڈز تھیں۔ وہ ان سب سے رابطے میں رہتا تھا اور گرم جوشی کا یہی عالم دوسری طرف سے بھی تھا اور اگر میل ملاپ والیاں فرینڈز نہیں تھیں تو پھر بیچ میٹس تھیں۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گیا تھا جب وہ شیر دل کی کسی نئی دوست سے متعارف نہ ہوئی ہو اور اس بار یہ نیا نام عکس مراد علی کا تھا۔ ڈنر ٹیبل پر نافع کی بیوی تاباں سے باتیں کرتے ہوئے شہر بانو نے سوچا تھا۔

"Still Single?" تاباں کی کوئی بات سنتے ہوئے اس نے کچھ حیران ہو کر شیر دل کا چہرہ دیکھا تھا اور اس

وقت پہلی بار اس نے شیر دل کے چہرے اور آنکھوں میں وہ چیز دیکھی تھی جو پھر ہمیشہ اسے اس نام پر نظر آئی تھی۔

''بتایا تو نہیں اس نے کچھ...... اگر Status تبدیل ہوا ہوتا تو بتاتی تو سہی لیکن میں نے سنا ہے کہ غنی اور وہ کافی قریب ہیں آج کل۔'' شہر بانو نے ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے شیر دل کو بے اختیار اپنی کرسی پر پہلو بدلتے دیکھا۔

''غنی حمید؟'' شیر دل کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ "Don,t tell me" تاباں کی باتوں میں شہر بانو کی دلچسپی یک دم کم ہونی شروع ہو گئی تھی۔ کوئی چیز تھی شیر دل کے انداز میں جس نے اسے مضطرب کیا تھا۔ ہاتھ میں پہنی منگنی کی بیش قیمت انگوٹھی کے باوجود، اپنے بیڈ روم کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس کارڈ کے باوجود جو شیر دل نے اسے منگنی پر دیا تھا اور جس میں اس نے شہر بانو کے ساتھ زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ شیر دل کے والٹ اور اپنے والٹ میں رکھی ایک دوسرے کی تصویروں کے باوجود...... کچھ تھا جس نے شہر بانو کو ہلا یا تھا۔

''وہ عکس اور غنی...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ اب شیر دل کو دو ٹوک انداز میں کہتے دیکھ رہی تھی۔

Roasted Salmon کو بھول کر اس وقت نیپکن سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے نافع سے کہہ رہا تھا۔

''لیکن میں نے فی الحال کافی لوگوں سے یہی سنا ہے۔ میرا خیال ہے دو چار مہینوں میں شادی کرنے والے ہیں وہ دونوں۔ کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ شاید منگنی ہو چکی ہے دونوں کی۔'' شہر بانو نے شیر دل کو یک دم چپ ہوتے دیکھا تھا اس نے نافع سے دوبارہ عکس کے حوالے سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن شہر بانو کو یوں لگا تھا جیسے وقتی طور پر وہ ذہنی طور پر مکمل طور پر غائب دماغ ہو گیا تھا۔ وہ اب اتنے عرصے سے اس کے ساتھ تھی اور اس کے اتنے قریب تھی کہ شیر دل کے ماتھے پر آنے والی شکن کو بھی کتاب کے صفحے کی طرح پڑھ لیتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی اس اچانک خاموشی اور آف ہو جانے والے موڈ کو نہ محسوس کرتی۔ عکس مراد علی کا نام بہت بری طرح رجسٹر ہوا تھا۔ اس رات ڈنر سے ان کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی اور واپسی کے پورے راستے شیر دل اس سے گفتگو کے دوران مکمل طور پر عدم توجہی کا شکار تھا۔

اگلے دن وہ نارمل تھا جیسے وہ ہمیشہ ہوتا تھا اور اسے نارمل دیکھ کر ساری رات بستر میں کروٹیں لے لے کر جاگتے رہنے والی شہر بانو بھی نارمل ہو گئی تھی لیکن عکس کا نام ایک عجیب سی بازگشت بن گیا تھا جو رہ رہ کر گونجی تھی۔

''تم نے کبھی کسی سے محبت کی مجھ سے پہلے؟'' اس ڈنر کے ایک ہفتے کے بعد شہر بانو نے شیر دل سے وہ سوال کیا تھا جو عکس کا نام اسے بار بار پوچھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ سوال کر کے کیا چاہتی تھی۔ کوئی تصدیق یا کوئی تسلی......؟

''یہ ایک انتہائی احمقانہ سوال ہے۔'' جواب تڑاق سے آیا تھا۔ وہ رات کے وقت بے مقصد سڑک پر ٹہلتے ہوئے روسٹڈ کاجو کھا رہے تھے۔

''خیر احمقانہ والی تو کوئی بات نہیں۔'' شہر بانو نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''کسی بھی مرد سے یہ سوال احمقانہ ہی ہوتا ہے۔'' شیر دل نے شہر بانو کے ہاتھ میں پکڑے کاجو کے لفافے سے چند کاجو نکال کر انہیں پھانکتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

''احمقانہ کیوں؟'' شہر بانو کو اعتراض ہوا۔

''یار مرد شادی کے بعد بیوی بچوں کی موجودگی میں محبت کر سکتا ہے تو منگیتر کی آمد سے پہلے مہاتما بدھ بن کر کیوں رہے گا۔''

''ہاں تو یہی پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کسی سے محبت کی ہے؟''

''کسی سے......؟ کیوں سے۔'' شیر دل نے کچھ اور کاجو پھانکے۔

''محبت کا پوچھ رہی ہوں فلرٹ کا نہیں پوچھ رہی۔'' شہر بانو نے اسے ٹوکا۔

''دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا......'' وہ اسی انداز میں بولا تھا۔

''تم میرے ساتھ محبت کر رہے ہو یا فلرٹ؟'' شہر بانو نے یک دم اس سے پوچھا۔ وہ بے ساختہ ہنسا۔ شہر بانو کو بھی ہنسی آئی تھی...... حالانکہ آنا غصہ چاہیے تھا۔

''پھر بتاؤ نا......'' شہر بانو نے دوبارہ پوچھا۔

''یار بتایا تو ہے...... بہت محبتیں کی ہیں۔'' شیر دل نے بے پروائی سے کہا۔

''کبھی کسی سے شادی کرنے کا کیوں نہیں سوچا۔'' شہر بانو نے کہا۔

''کس سے شادی؟'' وہ چونکا۔

''کسی بیچ میٹ یا گرل فرینڈ سے؟''

اس بار شہر بانو نے بڑے نپے تلے انداز میں مچھلی کو چارا پھینکا تھا۔ اس نے عکس کا نام لیے بغیر عکس کا ذکر کیا تھا۔

''تم اپنی تعریف سننا چاہتی ہو تو میں ویسے ہی کر دیتا ہوں۔ تم ماضی کی کسی محبوبہ کا نام اگلوانا چاہتی ہو تو اس کے لیے تم مجھے 60 سال کا ہونے دو۔'' مچھلی نے چارے کو کاٹنے اور چھری کی مدد سے ہک سے اتار کر کھایا تھا۔ وہ شیر دل سے کبھی کچھ اگلوا نہیں سکتی تھی، اسے جو بات نہیں بتانی ہوتی تھی وہ نہیں بتاتا تھا۔ شہر بانو نے بے اختیار گہری سانس لی تھی۔

''آہیں بھرنے والی کیا بات ہے؟'' شیر دل ساتھ چلتے چلتے یک دم چونکا۔

''تم سوال کا جواب نہیں دو گے تو اور کیا کروں گی؟'' شہر بانو نے کہا۔

''چلو پھر دے دیتا ہوں...... کم از کم ماضی میں 10 لڑکیاں ایسی ضرور ہوں گی جن سے میں نے سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچا ہوگا...... لیکن میں خوش ہوں کہ میں نے صرف سوچا اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''کیوں؟'' شہر بانو کی سنجیدگی ختم ہونے پر نہیں آ رہی تھی۔

''کیونکہ اپنی زندگی کے سنہری دن تباہ کرنے کے شادی کے علاوہ بھی اور بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے غیر سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہر بانو نے بات ختم کر دی تھی۔

عکس کا ذکر پھر اس کے بعد کئی بار ان کی زندگی میں سامنے آتا رہا تھا۔ ہر بار اگر شیر دل اس پر ٹھٹکتا تھا تو شہر بانو بھی چونکتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ زندگی اتنی مصروف ہونے لگی تھی کہ اسے شیر دل کے حوالے سے جو تھوڑے بہت خدشات تھے وہ جاتے رہے تھے۔ وہ ایک Exceptional شوہر تھا۔ محبت کرنے والا۔ خیال رکھنے والا، وفادار...... شہر بانو کو یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اپنے حلقہ احباب میں خواتین کی لمبی چوڑی تعداد رکھنے اور ہر عورت سے بے تکلفی سے بات کر لینے کے باوجود شیر دل جہاں گئے داستانیں چھوڑ آنے والے مردوں میں سے نہیں تھا۔ وہ اگر کسی عورت سے بے تکلف ہو سکتا تھا تو اس بے تکلفی کو حدود و قیود میں رکھنا بھی اسے آتا تھا اور اس میں شادی شدہ ہونے کے لیبل سے زیادہ شیر دل کے اپنے مزاج کا دخل تھا۔ شہر بانو نے شیر دل کے حوالے سے سارے تحفظات اپنے ذہن سے نکال دیے تھے، وہ بھی جو ایک بیوی کے طور پر فطری

طور پر ہر بیوی کے ہوتے تھے...... لیکن اس کے باوجود صرف عکس مراد علی ایک ایسا نام تھا جس پر شہر بانو کبھی بھی شیر دل کا چہرہ دیکھنا نہیں بھولتی تھی اور اتنے سالوں میں بھی اس کے چہرے پر آنے والا تاثر ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔

''عکس مراد علی آرہی ہے فیاض کی جگہ پر؟'' شیر دل کے فون بند کرنے پر شہر بانو نے چائے پیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں، فیاض نے ہی ابھی بتایا ہے مجھے...... چائے کا ایک کپ بنا دو مجھے۔'' شیر دل نے فون ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر یہ پہلی وومن آفیسر ہے شاید؟'' شہر بانو نے چائے بناتے ہوئے شیر دل سے پوچھا۔

''اس وقت تو ہاں...... پنجاب میں کوئی اور وومن آفیسر اس پوسٹ پر کام نہیں کر رہی لیکن پہلے چند خواتین ڈپٹی کمشنر کے طور پر Serve کر چکی ہیں۔'' شیر دل نے دور لان میں کام کرتے مالیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اب کسی سوچ میں ڈوبا لگ رہا تھا۔ چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے شہر بانو نے پوچھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' شیر دل نے مسکرا کر اسے ٹالا تھا وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ عکس مراد علی کے ایک ہی ڈویژن میں ہونے کا مطلب اس کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا Stress تھا۔ وہ خاتون آفیسر 24 گھنٹے کو 48 گھنٹے سمجھ کر کام کرنے والوں میں سے تھی اور وہ جہاں بھی کام کرتی تھی، اس کی Competence وہاں پر دوسرے مرد آفیسرز کے لیے بہت مسائل پیدا کر دیتی تھی۔

وہ ڈی ایم جی کی ان چند خاتون آفیسرز میں سے ایک تھی جن سے پروفیشنل جیلسی رکھنے کے باوجود ان کے کولیگز ان سے مرعوب ہونے پر مجبور تھے۔ وہ واحد نوجوان آفیسر جس کی قابلیت کو ماننے اور سراہنے میں اس کے میل کولیگز کا شاؤ ونزم آڑے نہیں آتا تھا اور اس میں اس کی قابلیت کے ساتھ ساتھ اس کی پرسنالٹی کا بہت زیادہ دخل تھا اور اس قابلیت اور ٹریک ریکارڈ کے ساتھ اس کا کسی بھی جگہ پر ہونے کا مطلب تھا کہ انہیں عکس مراد علی کے سامنے Over shadow ہو جانے سے بچنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ لگن اور مستعدی کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا جتنا کسی دوسرے مرد آفیسر کے ساتھ کام کرنے میں۔

''وہ تو فل برائٹ اسکالرشپ پر امریکا گئی ہوئی تھی؟'' شہر بانو کو یک دم یاد آیا۔ آخری بار ان کے گھر پر کسی گیٹ ٹو گیدر پر عکس اور شیر دل کے کسی بیچ میٹ نے اس کا ذکر اسی حوالے سے کیا تھا۔

''واپس آگئی ہے۔'' شیر دل نے چائے کا سپ لیتے ہوئے مختصراً کہا۔

''Isshesingle'' شہر بانو نے اچانک پوچھا۔ چائے پیتے ہوئے شیر دل ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تھا۔

''I don,t know...... مثال کو لے کر آؤ ذرا!'' شیر دل نے جواب دیا پھر اسی سرعت سے سوال بدلا۔ عکس منٹوں میں شہر بانو کے ذہن سے غائب ہوئی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں اسے...... اسے آج ویسے بھی بابا سے بہت سی شکایتیں کرنی ہیں۔'' شہر بانو نے جاتے ہوئے جیسے اسے وارن کیا تھا۔ شیر دل مسکرا دیا۔ چائے کا ایک اور سپ لیتے ہوئے اس نے سیل فون نکال کر وہ بزنس کارڈ دیکھا تھا جو فیاض نے اسے ٹیکسٹ کیا تھا۔ وہ، وہ نمبر نہیں تھا جو شیر دل کے پاس تھا یقیناً ان نے نمبر تبدیل کر لیا تھا۔ چند لمحے وہ نمبر اور نام دیکھتا رہا پھر اس نے نمبر پر کال کرنا شروع کی۔

☆☆☆

عکس کا نام اس نے پہلی بار اپنے باپ سے سنا تھا۔ بختیار فون پر پبلک سروس کمیشن کے کسی ممبر سے بات کر رہا تھا جو اس کا دوست تھا۔ سی ایس ایس کے تحریری امتحان کا نتیجہ ایک ڈیڑھ ہفتے میں آنے والا تھا اور بختیار کے کسی دوست نے اسے شیر دل کے رزلٹ کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ تحریری امتحان میں دوسرے نمبر پر تھا کہ شیر دل بختیار اور مجتبیٰ سلیمی کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے دوران کمرے میں ہی تھا۔

''اوہ، اچھا دوسری پوزیشن ہے......'' بختیار نے مسکراتے ہوئے شیر دل کو دیکھا تھا وہ بھی جواباً مسکرایا تھا۔

''تھینک یو...... اور پہلی پوزیشن پر کون ہے؟'' شیر دل باپ کے سوال پر بے اختیار مسکرایا۔ اس کے ذہن میں بھی اسی وقت یہی سوال آیا تھا۔

''وہ کون ہے؟'' اس نے بختیار کے ماتھے پر چند سوالیہ بل دیکھے۔ وہ یقیناً پہلے نمبر پر آنے والے امیدوار کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ شیر دل نے اندازہ لگایا۔

''Ok...oh...hmm'' اس نے بختیار کو وقفے وقفے سے کہتے سنا...... پھر چند اور رسمی جملوں کے بعد انہوں نے فون رکھ دیا۔ شیر دل نے تب ان سے پوچھا تھا۔

''فرسٹ پوزیشن پر کون ہے؟'' اور اس وقت شیر دل نے پہلی بار عکس کا نام سنا تھا۔

چند ہفتوں بعد شروع ہونے والے انٹرویوز Intelli gence اور سائیکولوجیکل ٹیسٹ کے دوران وہ جیسے لاشعوری طور پر...... پہلے نمبر پر براجمان اس خاتون امیدوار سے کہیں نہ کہیں ٹکرانے کا منتظر رہا تھا، وہ آمنا سامنا کہیں نہیں ہو سکا تھا۔

عکس کا نام اس نے دوسری بار ایک بار پھر اپنے باپ سے ہی سنا تھا...... سر توڑ کوشش کے باوجود شیر دل تحریری امتحان کے رزلٹ کو تبدیل نہیں کر سکا تھا۔ فائنل رزلٹ میں پہلے دس امیدواروں کی فہرست میں صرف پہلی دو پوزیشنز پر موجود امیدوار تھے جنہوں نے تحریری امتحان کے رزلٹ کو برقرار رکھا تھا باقی آٹھ امیدواروں کی پوزیشن میں تبدیلی ہوئی تھی اور ان میں سے کوئی بھی لڑکی نہیں تھی اور دراصل پہلی بیس پوزیشنز میں صرف پہلی پوزیشن کے علاوہ باقی تمام لڑکوں کے پاس تھیں۔ ہیڈ آف دا ٹیبل پر کسی لڑکی کو دیکھ کر پاکستان میں کسی مرد کی انا کو جتنا جھٹکا لگتا ہے، وہ جھٹکا شیر دل کو بھی لگا تھا اور اسے یقین تھا تین سے دس نمبر تک موجود باقی تمام لڑکوں کو بھی پہلی پوزیشن پر آنے والا صرف اگر کسی کو دیکھتا ہے تو دوسری پوزیشن پر آنے والے کو...... یہ جیسے فاصلہ چیک کرنے کی ایک محتاط کوشش ہوتی ہے لیکن پہلی پوزیشن پر آنے والے کو سب دیکھتے ہیں باقی ساری پوزیشنز پر موجود لوگ بیچ کی کسی پوزیشن سے اپنا فاصلہ نہیں ناپتے وہ ٹاپ پر موجود شخص سے ہی کمپیر زن کرتے ہیں...... اور یہ فرق شیر دل سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا تھا جو ہمیشہ top ladder پر بیٹھتا آیا تھا۔

اس کا خیال تھا اس کے اور عکس کے درمیان Neck toneck فائٹ ہوئی ہوگی، مارکس اور پرسنٹ ایج کی...... لیکن ایک اور کاری ضرب اسے اس وقت لگی تھی جب بختیار نے اس کی یہ خوش فہمی بھی دور کر دی تھی۔ عکس اور اس کی پرسنٹ ایج میں بہت فرق تھا اور پہلی پوزیشن سے ہاتھ دھونے کے بعد یہ دوسری ہزیمت تھی جو شیر دل نے اٹھائی تھی۔

عکس سے اس کا تیسرا تعارف نیوز پیپر میں ٹاپ کرنے والے امیدوار کے انٹرویو کے ذریعے ہوا تھا۔ شیر دل،

بختیار کی وجہ سے عکس کے فیملی بیک گراؤنڈ سے تحریری امتحان کے بعد ہی واقف ہوگیا تھا۔ اب اگر اسے دلچسپی باقی تھی تو وہ چہرے کے حوالے سے شناسائی تھی۔ وہ ایک انگلش نیوز پیپر کا یوتھ ایڈیشن تھا جس میں اس نے پہلی بار عکس کی شکل دیکھی تھی۔ بندھے بالوں، ڈھلے چہرے اور جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان آرکیٹکٹ لڑکی جو خوب صورتی کے بہر حال اس معیار پر نہیں آتی تھی جس پر شیر دل رکھ کر کسی بھی لڑکی کو خوب صورت قرار دیتا تھا۔ وہ اس کے باوجود اس کی تصویر کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ یہ جیسے اکیڈمی میں اپنے rival سے ملاقات سے پہلے اس کو Judge کرنے کی ایک کوشش تھی۔ شیر دل نے عکس کے انٹرویو کے ہر جواب کو بہت غور سے پڑھا تھا۔ ان جوابوں کے بغیر بھی اسے اس لڑکی کی ذہانت اور قابلیت پر شبہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود شیر دل نے بہت وقت صرف کیا تھا ان سوالات اور ان کے جوابات پر۔ وہ ڈی ایم جی کی ایلوکیشن میں ایک بار پھر پہلے نمبر پر تھی۔ شیر دل کے کامن کے 18 لوگ ڈی ایم جی میں جا پائے تھے اور Elite18 کے اس گروپ میں صرف ایک لڑکی تھی...... اور یہ تیسری بار تھا جب نیوز پیپر میں شیر دل نے اپنا نام اس کے نام کے نیچے دیکھا تھا...... ہتک سی ہتک تھی۔

☆☆☆

”تیری ہے زمیں، تیرا آسماں
تو بڑا مہرباں، تو بخشش کر
سبھی کا ہے تو، سبھی تیرے
خدا میرے تو بخشش کر“

اسمبلی کا وسیع و عریض ایریا صبح کے اس وقت صرف ایک آواز سے گونج رہا تھا...... چڑیا کی آواز سے جو اس اسمبلی کے سامنے ایک Cemented پلیٹ فارم پر مائیک کے سامنے بے حد جذب سے یہ دعائیہ کلام پڑھ رہی تھی۔ اسمبلی ایریا میں موجود تمام لوگ جیسے کسی ٹرانس میں تھے...... اور یہ مہینے میں ایک بار ضرور ہوتا تھا جب چڑیا کو سسٹر ایگنس خاص طور پر اسمبلی میں یہ دعائیہ کلام پڑھنے کے لیے بلواتی تھی۔ اسکول میں ہونے والی تقریبات میں بھی چڑیا کو اسی دعائیہ کلام کے لیے بلوایا جاتا تھا...... مسلمان ہونے کے باوجود۔

”تیری مرضی سے اے مالک
ہم اس دنیا میں آئے ہیں
تیری رحمت سے ہم سب نے
یہ جسم و جاں پائے ہیں“

سماں باندھنا شاید چڑیا کے اس دعائیہ کلام کے لیے بہت چھوٹا لفظ تھا۔ اس کی آواز میٹھی اور ملائم تو تھی ہی لیکن اس میں ایک عجیب سا سوز تھا۔ وہ وہاں موجود سسٹرز اور فادر پیٹر پر رقت طاری کر دیتی تھی۔ ان کا اگر بس چلتا تو وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود اسے اسکول Choir کا حصہ بنا دیتے اور انہیں یقین تھا کہ اگر چڑیا اس Choir کا حصہ ہوتی تو وہ کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن کے زیر اہتمام ہونے والے تمام Regional مقابلے جیت آتی۔

”تیری ہے زمیں تیرا آسماں
تو بڑا مہرباں تو بخشش کر
سبھی کا ہے تو سبھی تیرے
خدا میرے تو بخشش کر“

میوزک ٹیچر سر جیمز کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے لاشعوری طور پر اسے ہدایات دے رہے تھے لیکن وہ جانتے تھے چڑیا کو ان کی ہدایات کی ضرورت نہیں ہے، وہ اس کلام کو گانے میں استاد تھی۔ تمام اسمبلی اب چڑیا کے ساتھ اس Devotional Song کو گا رہی تھی۔

”خدا میرے تو بخشش کر“

پہلی تین لائنز کورس کی شکل میں گانے کے بعد آخری لائن پھر صرف چڑیا نے گائی تھی...... وہ ایک Ritual تھی۔ وہ میٹھی ملائم، مدھر آواز اب کی بورڈ کے C-Major نوٹس پر high notes سے Low میں آتے ہوئے اس Song کا اختتام کر رہی تھی۔ اسمبلی میں گونجتی تالیوں کے درمیان چڑیا ایک اور Flawless rendition کے بعد اسٹیج سے اتری تھی اور اس وقت اس نے باربی ڈول کو بھی دائیں جانب بنی لائنز میں کھڑے دیکھا تھا جو اس کے لیے جوش کے عالم میں تالیاں بجا رہی تھی۔ مانٹیسوری ونگ ہفتے میں ایک بار کمبائنڈ اسمبلی اٹینڈ کرتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ باربی ڈول اس دن مکمل طور پر چڑیا کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس کی آواز کے عشق میں، اس کے اسٹارڈم کے عشق میں جو اس کا اسکول میں تھا...... اور اس Red sach کے عشق میں جو اس کے کندھے پر سجی ہوئی تھی۔

اس دن سہ پہر کو ہوم ورک کرتے ہوئے باربی ڈول لاشعوری طور پر وہی Devotional Song گا رہی تھی جو اس نے اسمبلی میں چڑیا سے سنا تھا اور اس کی ماں نے یہ نوٹس کیا تھا۔ اس کے پوچھنے پر باربی ڈول نے اسے چڑیا کے Heroics کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کی ممی مسکراتے ہوئے اس سے یہ سب سنتی رہی تھیں پھر انہوں نے باربی ڈول سے کہا تھا۔

”اچھا چلو سنوں گی میں بھی اس سے کسی دن کچھ......“ لیکن اس کی ممی نے چڑیا سے کچھ سننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گھر میں ایڈجسٹ ہو جانے کے بعد وہاں ان کی نئی مصروفیات شروع ہو چکی تھیں اور ان مصروفیات میں نوکر کی ایک نواسی سے کوئی Devotional Song سننے میں کس کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔

البتہ چڑیا اور باربی ڈول اب اسکول میں ایک دوسرے کے کچھ زیادہ کلوز ہو گئی تھیں لیکن گھر میں یہ دوری اب تک برقرار تھی لیکن ایبک کی آمد نے جہاں اور بہت سی جگہوں سے برف پگھلائی تھی وہاں یہ برف بھی پگھلا دی تھی۔ چڑیا اب آہستہ آہستہ اس وقت وہاں آنے لگی تھی جب گھر میں موجود بچے کھیل رہے ہوتے ہاں البتہ بڑوں کی موجودگی میں وہ ایک بار پھر اسی طرح چھپ کر سب کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

ایبک کے بعد باربی ڈول اس گھر کا دوسرا فرد تھی۔ آٹھ سالہ وہ بچی غیر معمولی حد تک دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور ایک بے حد Likable پرسنالٹی کی مالک تھی۔ اس کے نام اور کام کی بازگشت صرف باربی ڈول اور ایبک تک ہی محدود نہیں رہی تھی وہ آہستہ آہستہ گھر کے دوسرے افراد تک بھی پہنچنے لگی تھی۔

ایبک نے ایک دن اپنے انکل کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے کہا۔ ”انکل جب شطرنج بورڈ پر کوئین سب سے پاورفل ہے تو پھر بورڈ تو کوئین کا ہونا چاہیے...... کوئین ہی کو کنگ ہونا چاہیے۔“ ایبک نے چڑیا کی زبان سے سنی ہوئی

لا جک اپنے انکل کے سامنے پیش کر دی تھی۔ ایبک کی ممی بھی اس وقت کوئی میگزین دیکھتے ہوئے وہیں موجود تھیں۔
''انٹرسٹنگ!'' انکل نے چال چلتے ہوئے بے اختیار ایک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''ہونا چاہیے نا؟'' ایبک نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
''ہونا چاہیے لیکن ہو نہیں سکتا۔'' اس کے انکل نے مسکراتے ہوئے لیکن دوٹوک انداز میں اس سے کہا۔
''لیکن کیوں؟'' ایبک نے جواب کے لیے اصرار کیا۔ وہ جیسے چڑیا کے لیے اس جواب کو کھوج رہا تھا جو چڑیا کی اس لا جک کو غلط ثابت کر دیتا۔
''کیونکہ یہ رول ہے...... لیکن تمہیں یہ کہا کس نے ہے؟'' سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کے انکل کو جیسے اچانک خیال آیا تھا کہ یہ سوال ایبک کا اپنا نہیں ہو سکتا تھا۔
''چڑیا نے کہا۔'' ایبک نے مدھم آواز میں کہا اور پھر اس نے سوچ سوچ کر چڑیا کی لا جک بتائی تھی۔ ایبک کی ممی میگزین ہاتھ میں لیے بے حد سنجیدگی سے اس کی گفتگو سنتی رہی تھیں پھر بات ختم کرنے پر انہوں نے اسی سنجیدگی کے عالم میں اپنے بھائی سے کہا تھا۔
''Over-ambitious۔'' انہوں نے جیسے ایک لفظ میں چڑیا کو Describe کیا۔
''تم ذرا دیکھو، آج کل نوکروں کے بچے اگر اچھے اسکول میں پڑھنا شروع ہو جائیں تو وہ بیٹھ کر کیا کیا خیالی پلاؤ بنانا شروع ہو جاتے ہیں اور اپنے بچوں کو کیا کیا باتیں سکھانا شروع ہو جاتے ہیں۔ عمر سے پہلے میچور اور چالاک بنا دیتے ہیں انہیں اب تم اس لڑکی کی باتیں سنو، لگتا ہے یہ کہیں آٹھ، نو سال کی بچی کی باتیں ہیں۔ یقیناً یہ سب خیر دین اور اس کی بیٹی کی باتیں ہیں جو یہ بچی سن سن کر اپنی Interpretations کے ساتھ دیتی پھر رہی ہے۔'' ایبک کی ممی اب بے حد خفا انداز میں بات کر رہی تھیں۔ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ اس گفتگو میں ایسا تھا جو انہیں بری طرح چبھا تھا۔
ایبک کے انکل جواباً صرف مسکراتے ہوئے ایبک کے ساتھ چیس بورڈ پر چیس کے مہرے آگے پیچھے کرتے رہے۔
''تم دیکھو ذرا، سی ہاؤس کے سرونٹ کوارٹرز میں بیٹھ کر یہ نوکر کیسی باتیں کرتے رہتے ہیں...... یہ یہاں بادشاہ کے محل میں بیٹھ کر بغاوت کی تیاری کی کوششیں ہیں۔'' انہوں نے جیسے بے حد خفگی کے عالم میں اپنے بھائی سے کہا تھا۔ ''اور اس بچی کو کانونٹ میں ایڈمیشن دلوانے کا کارنامہ یقیناً تمہاری بیوی کا ہوگا۔ یہ مدر ٹریسا بننے کے دورے اسی کو پڑتے ہیں، پوچھوں گی میں اس سے۔'' ایبک کی ممی کو چڑیا کی وہ باتیں واقعی میں ہی بری لگ گئی تھیں ورنہ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر اس طرح ری ایکٹ کرنے والی خاتون نہیں تھیں اور خاص طور پر کسی بچے کی بات پر ری ایکٹ کرنے والی، وہ ریزرو طبیعت کی مالک تھیں مگر بہرحال خوف خدا رکھنے والی خاتون تھیں۔
''نہیں، یہ ہمارا کارنامہ نہیں ہے۔'' ایبک کے انکل نے اپنا اگلا مہرہ آگے بڑھاتے ہوئے بے ساختہ بہن کی خفگی دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''یہ ہم سے پہلے یہاں Serve کر کے جانے والے آفیسر اور اس کی بیوی کا کمال ہے۔ اس بچی کی فیس وغیرہ بھی وہی پے...... کرتے ہیں۔ ہم لوگوں نے تو صرف کوارٹر میں رکھنے کی اجازت دی ہوئی ہے خیر دین کو۔ But she is a bright girl میں جب بھی اسکول جاتا ہوں، سسٹر ایگنس اس کی بہت تعریف کرتی ہیں......'' انہوں نے تفصیل سے بہن کو بتایا تھا۔
''Whatever...... ذرا دیکھو تو سہی کیسی باتیں کر رہی ہے وہ......'' ان کے بھائی نے ایک بار پھر

چڑیا کا دفاع کیا تھا۔
''آج کل کے بچے ویسے ہی ضرورت سے زیادہ اسمارٹ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایبک نے بتایا تھا کہ وہ شطرنج وغیرہ بھی کھیلتی ہے تو Definitely وہ Exceptional ہی ہوگی...... اس لیے ضروری نہیں کہ خیر دین اور اس کی بیٹی ہی ایسی باتیں کرتے ہوں اس کے ساتھ خیر دین اچھا سمجھدار شریف آدمی ہے۔''
''انکل صرف کھیلتی نہیں ہے...... وہ بہت اچھا کھیلتی ہے۔ I She beat me everytime played with her اور اس نے مجھے بتایا وہ اپنے نانا کو بھی ہرا دیتی ہے چیس میں اور انکل وہ آپ کو بھی ہرا سکتی ہے۔'' ایبک نے چڑیا کی حمایت کرتے کرتے ایک دم اپنے انکل کو یاد دلایا۔
''یہ اس نے کہا تھا؟'' ایبک کی ممی نے کچھ مزید خفا ہو کر اس سے کہا، ان کا بھائی بے اختیار ہنسا اور اس نے ایبک کے بولنے سے پہلے کہا۔
''یہ میرے Nephew کی assesment ہے کہ وہ اتنا اچھا کھیلتی کہ وہ مجھے بھی ہرا سکتی ہے۔''
ایبک کی ممی نے اس بار ایبک سے کہا۔
''ایبک تم اب اس کے ساتھ نہیں کھیلو گے۔'' ایبک ماں کی تنبیہ پر حیران ہوا۔
''لیکن ممی...... کیوں؟'' اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتیں اس کے انکل کسی وزیٹر سے ملنے کے لیے اٹھ کر چلے گئے تھے۔
''کیونکہ یہ مجھے پسند نہیں ہے۔'' ایبک کی ممی نے بے حد مستحکم آواز میں اس سے کہا۔
"But she is a good girl" ایبک نے اس کا دفاع کیا۔
"I,am sure she is a good girl" لیکن بیٹا وہ ایک سرونٹ کی بچی ہے اور میں آپ کو ہمیشہ سے کیا سمجھاتی آئی ہوں...... ان کے اور ہمارے سیٹ اپ میں بہت فرق ہوتا ہے، ہمیں ان سے تھوڑا فاصلے پر رہنا چاہیے۔'' اس بار اس کی ممی نے اس کو بڑے پیار سے اور رسانیت سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''اور پھر وہ تو ہے بھی ایک لڑکی...... آپ کو لڑکیوں کے ساتھ فرینڈ شپ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ بھائی کے ساتھ دوستی کریں، بہن کے ساتھ دوستی کریں Stay away from her! ایبک نے ایک لمحے کے لیے چیس بورڈ کو دیکھا پھر ممی کو پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔
''لیکن ممی میں تو اس کو ٹینس کھیلنا سکھا رہا ہوں اگر میں اس کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دوں گا تو پھر اس کو ٹینس کھیلنا نہیں آئے گا۔'' اس نے جیسے اپنے لیے چڑیا کے ساتھ رہنے کا کوئی بہانہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی یہ جانے بغیر کہ وہ کتنا بچگانہ بہانہ تھا۔
''اس کو ٹینس سکھانا تمہاری ذمے داری تو نہیں ہے، وہ کہیں سے بھی سیکھ سکتی ہے۔'' ایبک کی ممی نے ذرا سا جھنجلا کر کہا۔
''لیکن ممی وہ افورڈ نہیں کر سکتی...... آپ کو پتا ہے اس کے پاس ریکٹ بھی نہیں ہے۔'' ایبک کو چڑیا سے ایک بار پھر ہمدردی ہوئی۔
''تو یہ بھی ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ اس کی ممی اور نانا کی ذمے داری ہے۔''

"لیکن ممی اس کے پاپا بھی تو نہیں ہیں نا، آپ ہی تو کہتی ہیں ہمیں ان کے ساتھ بہت Kind ہونا چاہیے جن کے پاپا نہ ہوں...... اور ہم کو ان کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔" ایبک نے اپنی ممی کو ان کی کبھی کہی جانے والی بات یاد دلائی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی ممی کچھ جواب نہیں دے پائی تھیں۔ بڑوں کا سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں چھوٹوں کو نصیحت کے ذریعے اچھائی اور عمل کے ذریعے برائی سکھانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں اور اس کوشش کے نتیجے میں تربیت نہیں کنفیوژن دیتے ہیں۔

"اس کے نانا ہیں نا!" اس کی ممی نے ایک کمزور لاجک دی۔

"پر اس کے پاپا تو نہیں ہیں نا۔" ایبک نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"دیکھو کسی سے دور رہنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم اس کے ساتھ Unkind ہیں...... میں یہ تھوڑی کہہ رہی ہوں کہ تم اس سے بدتمیزی کرو یا اس کو تکلیف پہنچاؤ۔ بیٹا، میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ تم اس سے دور رہو۔" ایبک نے اس بار ماں سے کچھ نہیں کہا تھا وہ چیس بورڈ پر اپنے مہروں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے مصروف دکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا بچہ ہونے کے باوجود اس کو اپنی ممی کے Argument کے کمزور ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔

اگلے دن وہ ٹینس کورٹ پر تھا جب ہمیشہ کی طرح اپنے مقررہ وقت پر چڑیا وہاں آ گئی تھی۔ ایک بچے کی زندگی کا سب سے مشکل ترین مرحلہ اس کو بھی درپیش تھا۔ ایک چیز جو اس کی پسندیدہ تھی اور دوسری طرف اس کی ممی کی ہدایت تھی۔ ایک بچہ ہوتے ہوئے بھی وہ یہ جان سکتا تھا کہ چڑیا کے بارے میں اس کی ممی کی رائے اور اندازہ ٹھیک نہیں تھا، وہ واقعی ایک اچھی لڑکی تھی...... پر دوسری طرف وہ ایک Obedient بچہ بھی تھا۔ بڑا بھائی...... اور ایک ایسا بچہ جس کی فرمانبرداری کی سب مثالیں بھی دیتے تھے۔

چڑیا نے آتے ہی اسپورٹس کٹ کو کھول کر اس میں سے ہمیشہ کی طرح دوسرا ریکٹ نکالنے کی کوشش کی۔ کٹ میں آج خلافِ معمول دوسرا ریکٹ نہیں تھا۔ اس نے حیرانی سے ایبک کو دیکھا جو اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے اپنے ریکٹ سے گیند کو دوسرے کورٹ میں پھینکنے میں مگن تھا۔ وہاں اس کی ہیلو کا جواب نہیں تھا۔ کوئی eye-contact نہیں تھا۔

"ایبک...... ایبک!" اس نے ایبک کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ متوجہ نہیں ہوا، وہاں مکمل خاموشی تھی۔

☆☆☆

سیل فون بج رہا تھا لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ شیر دل فون ہاتھ میں لیے بے حد تحمل سے کال ریسیو ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کو زندگی میں جتنا انتظار اس عورت نے کرا دیا تھا کسی نے نہیں کروایا تھا۔ سیل فون بہت دیر تک بجتا رہا پھر شیر دل نے کال ختم کر دی۔

ایک "Shair dil here. please call me back" Text لکھ کر اس نے عکس کو بھیجتے ہوئے اس نے اپنا سیل سامنے پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔ سگریٹ کے کیس سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا کر سلگاتے ہوئے اس نے ٹانگیں دوبارہ ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے بھی اس کی نظریں مسلسل سیل فون کی تاریک اسکرین پر جمی تھیں۔ اگر وہ ایک رانگ نمبر سے کال نہیں لے رہی تھی تو کم از کم اب وہ اپنا تعارف کروا چکا تھا اور تعارف کروائے بھی تین منٹ ہو چکے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ذرا سا جھنجلایا تھا اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اس نے یاد کیا آخری بار دونوں کی بات کب ہوئی تھی، تقریباً ایک سال پہلے جب اس نے عکس کو اس کی

برتھ ڈے پر مبارک باد دینے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت امریکا میں تھی، ان کی بات آدھے گھنٹے تک ہوتی رہی تھی پھر دونوں عیدوں پر ان کے درمیان بات نہیں ہو سکی۔ عکس کا فون نمبر بند تھا اور آنسر فون آن تھا۔ شیر دل نے اس کے لیے مبارک باد کے پیغامات چھوڑ دیے تھے۔ دونوں بار مبارک باد کا کوئی جواب نہیں آیا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس نے شیر دل کے میسج نہ سنے ہوتے۔ شیر دل کو ایک مبہم انتظار تھا اور کیوں تھا اس کا جواب بھی وہ اپنے آپ کو نہیں دے سکتا تھا۔

پچھلے پانچ چھ سالوں میں ان کی بہت کم ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ خاص طور پر شیر دل کی شادی کے بعد تو تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ اس کے باوجود شیر دل کو اس کے بارے میں سب کچھ پتا چلتا رہتا تھا یا پھر وہ خبر رکھتا تھا۔

شہر بانو سے منگنی کے چند مہینوں بعد ہی اسے عکس کی اسلام آباد میں پوسٹنگ کے بارے میں پتا چلا تھا۔ شیر دل بوسٹن میں بیٹھا تین دن اس اطلاع کو ہضم کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ وہ اس سے پہلے پشاور میں تھی۔ پشاور سے سیدھا اسلام آباد جیسی Coveted position پر جہاں تمام Political اور ملٹری Big wigs اپنے بچوں اور بھانجے بھتیجوں کو پوسٹ کروانے کے لیے جوڑ توڑ کرتے پھرتے تھے وہاں ایک خاتون آفیسر اور وہ بھی عکس مراد علی کی تعیناتی حیران کن تھی اور شیر دل سے یہ کیسے ہضم ہو سکتی تھی جب وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر وہ فل برائٹ اسکالر کے طور پر ہارورڈ میں نہ ہوتا تو اس وقت اسلام آباد کی اس سیٹ پر اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر وہ تعینات ہوتا۔ ایک سیکریٹری کے بیٹے کے طور پر وہ جیسے اپنا حق سمجھتا تھا، کسی امتحان کو ٹاپ کر کے سول سروس میں آنا اور بات تھی لیکن عملی میدان میں اچھی پوسٹنگز پر ہونے کے لیے کچھ دوسری قابلیتوں کا ہونا ضروری تھا اور شیر دل کے پاس وہ چیک لسٹ پوری تھی۔

اسلام آباد کی وہ تعیناتی میرٹ پر ہوتی تب بھی ٹائی DMG کے انہیں دو جونیئر آفیسرز کے درمیان ہوتی اور شیر دل کو ایک مرد آفیسر کے طور پر ترجیح دی جاتی لیکن اب عکس مراد علی وہاں تھی جہاں وہ ہونا چاہتا تھا اور نہیں ہو سکتا تھا۔

"She is lady luck's blue-eyed girl" اس کے اسی کے بیچ میٹ نے ہنستے ہوئے شیر دل کو بتایا تھا جس نے اسے اس کی فیڈرل کیپیٹل میں پوسٹنگ کے بارے میں بتایا تھا۔

"وہ تو وہ ہمیشہ سے ہے لیکن یہ پوسٹنگ......" شیر دل اب بھی اسی طرح ہکا بکا تھا۔

"پشاور میں امریکن ایمبیسی اور US Aid والوں کے ساتھ بہت کام کیا ہے اس نے۔ کہتے ہیں اس کی اس پوسٹنگ میں انہی کی کارفرمائی ہے، وہ بڑے متاثر ہیں اس خاتون کی قابلیت سے۔" ظفر نے ان وجوہات کو بیان کیا جو اس کے خیال میں عکس کی...... پوسٹنگ کی اصلی وجہ تھی۔ شیر دل نے ظفر کے اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا وہ جانتا تھا اسلام آباد کی اس پوسٹنگ پر پاکستان کے اندر اور باہر موجود DMG کے تمام جونیئر آفیسرز اس وقت اسی طرح کے تبصرے فرما رہے ہوں گے۔ وہ کچھ انگور کھٹے والی صورت حال تھی اور شیر دل عکس سے بے حد جیلس ہونے کے باوجود اپنے حسد میں اس حد تک نہیں جاتا تھا کہ وہ اس کے پروفیشنلزم یا قابلیت کے حوالے سے سوال اٹھاتا یا اعتراضات کرتا۔

شہر بانو سے منگنی کے بعد عکس اور اس کے درمیان غنی حمید کے حوالے سے Argument ہوا تھا۔ وہ غنی کو شدید ناپسند کرتا تھا اور اکیڈمی میں ٹریننگ کے دوران غنی واحد آفیسر تھا جس کے ساتھ شیر دل کی بول چال بھی نہیں تھی اور عکس اور غنی کی قربت اور متوقع شادی کے حوالے سے نا واقف سے علم ہونے کے بعد شیر دل کوشش کے باوجود اپنے آپ کو ری ایکٹ کرنے سے روک نہیں سکا تھا۔ جواباً وہی ہوا تھا جس کی شیر دل کو توقع نہیں تھی

لیکن اسے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ غنی کے معاملے پر ان کی آپس میں جس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد شیر دل نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ عکس سے دوبارہ کبھی رابطہ نہیں کرے گا۔

بوسٹن سے واپس آنے کے بعد اپنی شادی کے بعد لاہور میں پوسٹنگ کے دوران اس نے عکس کو اسلام آباد میں 14 اگست کی پرچم کشائی کی تقریب کی لائیو کوریج میں TV پر دیکھا تھا۔ وہ تقریب کے مختلف انتظامات کے سلسلے میں بار بار اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھی۔ بالوں میں اٹکائے یا پھنسائے سن گلاسز، کندھے پر لٹکائے ایک بیگ اور ہاتھ میں پکڑے ایک وائرلیس کے ساتھ وہ پنڈال میں سینئر آفیسرز اور غیر ملکی مندوبین کے درمیان شٹل کاک بنی نظر آرہی تھی۔ وہ ان بہت کم مواقع میں سے ایک موقع تھا جب شیر دل اسے کسی افراتفری میں دیکھ رہا تھا اور پرچم کشائی کی اس تقریب کو پاکستان پرچم کے لیے اور شیر دل، عکس کے لیے دیکھ رہا تھا۔ اگر اس تقریب میں وہاں جامرز کام نہ کررہے ہوتے تو شیر دل سیل پر اسے کوئی نہ کوئی ٹیکسٹ ضرور کردیتا اور اس ٹیکسٹ کے جواب میں شیر دل کو جو جواب ملنا تھا اس سے اس کے چودہ طبق صاف ہوجاتے لیکن وہ پھر بھی یہ رسک لینے میں تامل نہ کرتا۔

شیر دل کی سوچوں کا تسلسل ایک دم ٹیبل پر پڑے سیل فون کی آواز سے ٹوٹا تھا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر سیل فون اٹھایا وہاں عکس مراد علی کا نام چمک رہا تھا۔ وہ اسے کال بیک کررہی تھی۔

☆☆☆

وہ پہلی بار تھا جب کسی نے چڑیا کا دل اتنی بری طرح سے توڑا تھا، وہ پندرہ منٹ زرد چہرے کے ساتھ ٹینس کورٹ پر اس کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے بار بار سروس کرنے والے ایبک کو چپ چاپ دیکھتی رہی۔ کٹ میں دوسرا ریکٹ اس لیے نہیں تھا کہ ایبک اس کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتا تھا اور یہ فیصلہ اس نے کیوں کیا تھا، یہ چڑیا کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن خود کو اس طرح نظر انداز کیے جانے کی تکلیف اسے شدت سے ہوئی تھی خاص طور پر اس لیے کیونکہ ایبک اتنے ہفتوں سے اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیتا آرہا تھا۔

''تم مجھ سے ناراض ہو؟'' چڑیا نے جیسے مصلحت کی کوشش کی تھی' جواب نہیں ملا تھا۔

''ایبک!'' چڑیا نے اسے ایک بار پھر پکارا۔ وہ اس بار اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے دور ایک کیاری میں جاکر ٹینس بالز ڈھونڈنے لگا۔ مصالحت کی ساری کوششیں بری طرح ناکام ہوئی تھیں۔ وہ چند منٹ اور وہاں کھڑی رہی پھر جتنے جوش و خروش کے ساتھ وہ ٹینس کورٹ پر آئی تھی اتنی ہی خاموشی اور رنجیدگی کے ساتھ وہ ٹینس کورٹ سے چلی گئی تھی لیکن ٹینس کورٹ سے اپنے کوارٹر تک واپسی میں چڑیا آنسوؤں سے روتی رہی تھی۔ اس دن اس نے کئی ہفتوں کے بعد کنٹا، متلا، ڈیڈو، ٹوٹو کو اپنے ساتھ پایا ورنہ اتنے ہفتوں میں وہ پتا نہیں کہاں غائب ہوچکے تھے۔

ایبک جب کیاریوں میں پڑی ہوئی گیندوں کو اکٹھا کرکے پلٹا...... چڑیا وہاں سے غائب ہوچکی تھی، ٹینس سے یک دم اس کا دل اچاٹ ہوا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی، اسے اچھی لگتی تھی اور وہ اتنے دن سے اس کے ساتھ کھیل رہی تھی جس کے لیے اس کو اس طرح اگنور کردینا آسان نہیں تھا۔ ٹینس کٹ کو وہاں سے اٹھائے بغیر وہ بے حد خراب موڈ میں اندر چلا گیا تھا۔

چڑیا نے اس دن رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ سہ پہر سے رات تک خیر دین کے واپس آجانے تک کنٹا متلا سے باتیں کرتی رہی تھی، اس کی ماں نے بار بار آکر اس کو کھانے کے لیے کہا تھا لیکن وہ بہانے بناتی

رہی۔ اس نے ماں کو ایبک کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن خیر دین کو دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''کیا ہوا چڑیا؟ کیوں رو رہی ہو؟''

''نانا، ایبک مجھ کو ٹینس نہیں کھلاتا۔'' اس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ خیر دین کے مسلسل استفسار پر کہا۔

خیر دین ٹھٹکا پھر اس نے اسے ساتھ لپٹا کر بہت پیار کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں بیٹا؟''

''پتا نہیں نانا...... بس وہ مجھ سے بات بھی نہیں کررہا اور مجھ کو ٹینس بھی نہیں کھلا رہا۔'' گالوں پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ چڑیا نے خیر دین سے کہا۔

''میں تمہیں اسی لیے منع کرتا تھا ناکہ تم وہاں مت جایا کرو اور ان کے ساتھ مت کھیلا کرو۔'' خیر دین نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا نانا۔'' آنسوؤں کا ایک نیا سیلاب چڑیا کی آنکھوں میں امڈ آیا تھا۔

''میں جانتا ہوں بیٹا تم نے کچھ نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے ایبک کو صاحب یا اس کی ممی نے تمہارے ساتھ کھیلنے سے منع کیا ہو۔'' چڑیا کے دل کو ایک نیا دھچکا پہنچا تھا۔

''لیکن کیوں نانا؟''

''بیٹا وہ افسر لوگ ہیں، صاحب لوگ ہیں۔ ہم تو غریب لوگ ہیں نا۔'' خیر دین اس کو جو سمجھا رہا تھا وہ ایک بچّے کا ذہن نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ سماجی فرق اور عدم مساوات...... بڑوں کی دنیا کے معیار اور تعریفیں تھیں۔ بچوں کی دنیا کے ضابطے کچھ اور ہوتے ہیں۔

''تم اب وہاں مت جانا۔'' اسے بہت کچھ سمجھانے کے بعد خیر دین نے اسے کہا۔ چڑیا نے بوجھل دل کے ساتھ سر ہلا دیا۔ اس کی فیری ٹیل کا خاتمہ ہوگیا تھا۔

ایبک اگلی سہ پہر ٹینس کورٹ پر آتے ہی چڑیا کو ڈھونڈتا رہا۔ وہ کسی پیڑ پودے کے پیچھے نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اس دن ٹینس کورٹ پر آئی تھی۔ وہ اکیلا اور کچھ نہیں تو ٹینس سروکی ہی پریکٹس کرلیتا تھا لیکن اب اس سے وہ بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ چڑیا کا حیران اور اداس چہرہ اسے کل سے اپ سیٹ کررہا تھا اور اب اس کی عدم موجودگی اس کے لیے مزید پریشان کن تھی۔ مسئلہ ٹینس یا چیس کا نہیں تھا مسئلہ ان باتوں کا تھا جو وہ اس سے شیئر کرتا تھا۔ وہ باتونی تھا اور گھر میں موجود تمام بچّے اس سے چھوٹے تھے اور اس کو بے وقوف لگتے تھے۔ واحد چڑیا تھی جس کو اس کی ہر بات کی سمجھ آتی تھی۔ اس کے نہ آنے کا مطلب اس کے پارٹنر کا کھو جانا بھی تھا۔

اس دن ایبک سارا دن کسی نہ کسی بات پر اپنی ممی سے ضد کرتا رہا، اس نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ ہوم ورک بہت خراب کیا تھا۔ اپنی ممی کے سمجھانے کے باوجود اس نے ایک بار چھوٹی بہن پر ہاتھ اٹھایا، ایک بار بھائی پر...... اس کی ممی اس کے اس خراب موڈ کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھیں اور ایبک خود بھی کسی کو یہ سمجھا نہیں سکتا تھا کہ مسئلہ تھا کیا۔ پہلے وہ چڑیا کو اگنور کررہا تھا اور وہ ٹھیک تھا اور اب چڑیا اسے اگنور کرنے لگی تھی تو سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

شہربانو نے اپنی ممی کو وہ تیسری کال کی تھی جو دوسری طرف سے ریسیو نہیں کی گئی تھی۔ وہ یقیناً فون کے قریب نہیں تھیں یا پھر کسی کام میں مصروف تھیں، اس نے انہیں دوبارہ کال کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اس بار وہ انہیں تقریباً چھ مہینے کے بعد کال کر رہی تھی اور وہ بھی کسی فارمیلٹی سے زیادہ بڑی چیز نہیں تھی۔ ان کے درمیان فون کالز کا سلسلہ اس کی شادی اور پاکستان سیٹل ہونے کے بعد آہستہ آہستہ اسی طرح کم ہوتا گیا تھا۔ پہلے وہ ہفتے میں کم سے کم ایک بار ضرور بات کر لیتی تھیں، آہستہ آہستہ وہ مدت بڑھنے لگی۔ مثال کی پیدائش کے بعد تو یہ وقت اور بھی زیادہ ہو گیا...... اور ہر دفعہ فون پر بات ہونے پر دونوں کے درمیان کسی جذباتی گرم جوشی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ حال احوال دریافت کرتیں، پندرہ بیس منٹ ایک دوسرے کو اپنی نجی اور پروفیشنل مصروفیات کے بارے میں بتاتیں۔ شہربانو ان سے پاکستان آنے کا پوچھتی وہ اس سے امریکا...... اور دونوں ایک چھوٹے ایکسکیوز کے ساتھ گفتگو ختم کر دیتیں۔ پھر اگلے کئی مہینے دونوں کے درمیان کسی رابطے کے بغیر گزر جاتے اور پھر دوبارہ اچانک ایک دن یا تو اس کی ممی فون کر لیتیں یا شہربانو کو بیٹھے بٹھائے فون کی فارمیلٹی نبھانا یاد آ جاتا۔

وہ کبھی بھی اپنی ممی سے زیادہ کلوز نہیں رہی تھی۔ بچپن میں اس کی کل کائنات اس کا باپ ہی تھا۔ ماں ہمیشہ اس کے لیے ایک سیکنڈری فگر تھی۔ زندگی میں صرف ایک وقت ایسا آیا تھا جب وہ اپنی ماں کے بہت قریب ہوئی تھی اور وہ ان کی بیماری کا زمانہ تھا۔ انہیں بریسٹ کینسر ہو گیا تھا اور زندگی میں پہلی بار شہربانو نے ان کے علاج کے دوران تحمل سے ان کا خیال رکھنے اور ان کے پاس رہ کر ان کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کی ماں اس کے لیے بہت عرصہ شکر گزار رہی تھی۔ وہ واحد وقت تھا جب ان کے درمیان موجود کئی سال پرانی تلخی کچھ عرصے کے لیے غائب ہو گئی تھی اور شکوے، شکایات اور الزامات کی وہ بوچھاڑ جس کا وہ ہمیشہ ایک دوسرے کو نشانہ بناتی تھیں رک گئی تھی۔

دس سال کی عمر میں اپنے باپ کی پُراسرار حالات میں ہونے والی موت کے بعد شہربانو کبھی پاکستان نہیں آ سکی تھی اور امریکا شفٹ ہو جانے کے بعد ایک لمبا عرصہ وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ رہی تھی۔ وہ ایک گھر سے یک دم جیسے کسی جنگل میں آ گئی تھی۔ مزید خرابی شرمین کی دوسری شادی نے کی تھی۔ وہ ماں سے پہلے ہی زیادہ اٹیچ نہیں تھی اور رہی سہی کسر اس احساس نے پوری کر دی تھی کہ اس کی ممی نے اس کے پاپا کی جگہ کسی اور کو دے دی تھی۔ وہ دو تین سال کی زندگی کے بدترین سالوں میں سے تھے۔ اس نے کبھی اپنے باپ کی کمی کو اس طرح محسوس نہیں کیا تھا جس طرح وہ اب کرتی تھی۔ شرمین، شہباز کی کوئی چیز اپنے ساتھ امریکا نہیں لائی تھی حتیٰ کہ اس کی کوئی تصویر تک۔ وہ جیسے دانستہ یہ کوشش کر رہی تھی کہ شہربانو کے ذہن سے اس کے باپ کا تصور تک ختم کر دے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ تصور اس کے ذہن کے پردوں پر کچھ اور پکا ہو گیا تھا۔ دو تین سال ایک بچے کے طور پر وہ ہر جگہ اپنے باپ کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ مر چکا تھا وہ کبھی کسی پارک، کسی سڑک، کسی شاپنگ مال میں اپنے پاس سے گزرتے ہر مرد کے چہرے میں ایک ہی چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔ وہ چہرہ جو اسے یک دم اس کی بے خبری میں اٹھا کر اپنی بانہوں کے گھیرے میں اپنے سینے میں چھپا لیتا تھا۔ وہ ہاتھ جو اسے ہوا میں اچھالتے تھے اور اس کی کھلکھلاہٹوں پر اسی کی طرح کھلکھلا کر ہنس دینے والا چہرہ۔ وہ انگلی جسے پکڑ کر چلتے ہوئے وہ جیسے دنیا بھر عبور کر سکتی تھی۔ وہ جس کے سامنے وہ فرمائشوں کا انبار لگا دیتی تھی۔ شہربانو کئی سال لوگوں کے چہروں میں اپنے پاپا کا چہرہ تلاش کرتی رہی تھی اور اس ساری Effort نے شرمین سے اس کی نفرت اور بیزاری میں اضافہ کیا تھا۔

سوتیلا باپ برا آدمی نہیں تھا۔ اس کے اور شرمین کے درمیان شادی کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ شرمین شہربانو کو اپنے ساتھ رکھے گی۔ شادی کے بعد بھی اگرچہ شہربانو نے پوری کوشش کی تھی کہ شرمین اسے نانا کے گھر پر ہی چھوڑ دے جہاں رہنے کی وہ اب عادی ہو چکی تھی لیکن شرمین اس پر تیار نہیں ہوئی تھی۔

فاروق ایک اچھا انسان تھا اور اس نے شہربانو کے ساتھ بہت محبت اور شفقت دکھائی۔ شہربانو پر ایک خاص حد تک اس محبت اور شفقت کا اثر بھی ہوا تھا۔ ماں سے اس کی ناراضی اور رنجشیں تو ختم نہیں ہوئی تھیں لیکن وہ باپ سے قریب ہو گئی تھی لیکن اس قربت کو فاروق اور شرمین کی پیدا ہونے والی بیٹی نے ختم کر دیا تھا۔ فاروق کی اپنی پہلی وائف سے دو بیٹے تھے۔ شرمین سے اس کی بیٹی ہو گئی تھی۔ شہربانو کی اہمیت یک دم ایک بار پھر ختم ہو گئی تھی۔ یہ خیال شہربانو کا تھا اور شرمین کی بے انتہا کوشش کے باوجود وہ یہ خیال ترک کرنے پر تیار نہیں تھی۔ ڈیڑھ سال بعد اس بچی کا انتقال ہو گیا تھا۔ شرمین اور فاروق نے اس کے بعد کوئی اور بچہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک اور سال تھا جب شرمین نے اپنے اور شہربانو کے ریلیشن شپ کو بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اگلے چند سال اس کے اور شہربانو کے اچھے سالوں میں سے تھے۔ شہربانو باپ کو اب بھی اپنی زندگی اور ذہن سے الگ نہیں کر پائی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ تلخی اور رنجیدگی اس کے اندر سے کم ہونے لگی تھی جو پورے لڑکپن میں اس کا حصہ رہی تھی۔ شہربانو کے یونیورسٹی جانے کے بعد یہ تعلقات کچھ اور بھی بہتر ہو گئے تھے لیکن شرمین کی بیماری وہ واحد ٹائم پیریڈ تھا جس میں شہربانو کی طرف سے شہباز کی موت کے بعد سے پہلی بار شرمین کے لیے کسی قسم کی جینوئن ایموشنل وابستگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہ ماں کے لیے Concerned چاہتی تھی۔ شرمین کی صحت یابی اس وقت اس کی سب سے بڑی ترجیح تھی۔ شرمین کو صحت یاب ہوتے ہوئے تقریباً دو سال لگ گئے تھے لیکن ان دو سالوں میں شہربانو اور شرمین کی جیسے نئے سرے سے Bonding ہوئی تھی اور اس Bonding کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا تھا جب شہربانو نے پہلی بار شرمین کو شیر دل میں اپنی دلچسپی اور اس کے پروپوزل کے بارے میں بتایا تھا۔ شرمین نے شیر دل کے آدھے تعارف کے بعد ہی اسے روک دیا تھا اور بے حد سرد مہری سے کہا تھا۔

”میں جانتی ہوں اسے اور میں مر کر بھی تمہاری شادی اس سے نہیں ہونے دوں گی۔“

☆☆☆

وہ اگلے تین دن ایبک کو نظر نہیں آئی تھی اور کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ نہ عقبی باغ میں کہیں گلہریوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے، نہ کوارٹرز کے پاس آم کے درخت پر پڑے جھولے میں جھولا جھولتے ہوئے، نہ برآمدے میں لگے اس آئینے کے سامنے جس میں وہ پتا نہیں کتنی دیر اپنا عکس دیکھتی رہتی تھی۔ بعض دفعہ ایبک کو لگتا تھا وہ شاید اس میں کچھ ڈھونڈ رہی ہوتی تھی...... نہ باربی ڈول کے باہر نکل آنے پر اس کی پونیاں کرنے آئی تھی، نہ فریزبی کھیلتے ہوئے آکر ان کے کھیل میں شامل ہوئی تھی، نہ کسی پیڑ پودے سے جھانکتی پائی گئی تھی اور نہ ہی وہ خیر دین کے ساتھ اس کی سائیکل پر گھر سے باہر جاتے دیکھی گئی تھی۔ چڑیا جیسے کہیں چھپ گئی تھی اور ایبک کی بے چینی اور اضطراب جیسے ساتویں آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

تیسرے دن ایبک کی ہمت بالآخر جواب دے گئی تھی۔ وہ سہ پہر کو ٹینس کورٹ پر جانے کے بجائے سیدھا خیر دین کے کوارٹر گیا تھا۔ خیر دین دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے بعد اس وقت کچھ دیر کوارٹر میں آرام کرنے جایا کرتا تھا۔

''چاچا چڑیا گھر پر ہے؟'' دروازے پر دستک پر خیر دین باہر گیا تھا۔ اندر کوارٹر میں ایک کونے میں بیٹھی ہوم ورک کرتی چڑیا ایبک کی آواز پر کرنٹ کھا کر کچھ لکھتے لکھتے رکی تھی۔

''بیٹا وہ سو رہی ہے۔'' چڑیا ایبک کی آواز پر اپنا ہوم ورک بند کرنے لگی تھی جب اس نے خیر دین کو کہتے سنا۔ نانا جھوٹ نہیں بولتے پھر اب کیوں بول رہے ہیں؟ وہ نوٹ بک ہاتھ میں لیے حیران ہوئی تھی۔

''اچھا...... وہ کب سو کر اٹھے گی؟'' چڑیا نے ایبک کی آواز میں تھوڑی مایوسی دیکھی۔

''وہ کافی دیر تک سوتی رہتی ہے شاید شام تک سوئے گی پھر اٹھ کر اپنا ہوم ورک کرے گی۔'' خیر دین بڑے تحمل سے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا اور اندر بیٹھی چڑیا حیران تھی۔

''اچھا پھر اس کو بتا دیجیے گا کہ میں آیا تھا۔'' اس نے ایبک کو کہتے سنا۔ چند لمحوں کے بعد خیر دین اندر آ گیا۔

''نانا ایبک آیا تھا؟'' خیر دین تو شاید ایبک کی آمد کے بارے میں اسے کچھ نہ بتاتا لیکن چڑیا نے کچھ بے قراری کے عالم میں اس سے خود ہی پوچھ لیا تھا۔

''ہاں چڑیا...... لیکن بیٹا دیکھو اب تم دوبارہ اس کے ساتھ جا کر کھیلنا مت شروع کرنا...... وہ لوگ ویسے بھی ایک دو ہفتے میں چلے جائیں گے۔ کیا فائدہ ہے اس کھیل کود اور دوستی کا۔ پچھلی بار بھی تم کتنا روئی ہو، میں برداشت نہیں کر سکتا تمہاری تکلیف۔'' خیر دین نے جیسے اسے صاف لفظوں میں کہا تھا۔ چڑیا جواب دینے کے بجائے سر جھکا کر ہوم ورک کرنے لگی۔ چارپائی پر لیٹتے ہوئے خیر دین کو پتا چل گیا تھا کہ اس کا کیا مطلب تھا۔

''اچھا تم مل لیا کرو ان سب سے...... لیکن اب ان کے ساتھ کھیل کود میں حصہ مت لینا۔'' خیر دین نے اپنی ہی ہدایات اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر واپس لی تھیں۔ چڑیا کا چہرہ چند لمحوں میں کھل اٹھا تھا۔

برق رفتاری سے ہوم ورک آدھے گھنٹے میں ختم کر کے وہ اپنے کوارٹر سے نکل کر ٹینس کورٹ پر آئی اور وہاں اس نے کورٹ سے باہر پڑی کرسیوں میں سے ایک پر ایبک کو اپنا ریکٹ پکڑے بے حد اداسی کے عالم میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ ریکٹ کی String کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے چڑیا کو آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن پاس آنے پر اس کے قدموں کی آہٹ پر اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا، چڑیا کو دیکھ کر اس کا چہرہ یک دم جیسے ہزار واٹ کے بلب کی طرح جل اٹھا تھا۔ چڑیا بھی جواباً مسکرائی تھی۔ وہ آ کر اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''تم سو رہی تھیں؟'' ایبک کو فوری طور پر اس سے بات کا آغاز کرنے کے لیے اور کچھ نہیں سوجھا تھا۔

''ہاں، میں سوتی ہوں اس وقت۔'' چڑیا نے نظریں ملائے بغیر خیر دین کے جھوٹ کا پردہ رکھا۔

''لیکن تم تو اس وقت میرے ساتھ کھیلتی تھیں۔'' ایبک نے اسے یاد دلایا۔

''اب میں سوتی ہوں۔'' چڑیا نے مدھم آواز میں کہا۔

''چلو بس اب کھیلتے ہیں، تم یہ ریکٹ پکڑو میں دوسرا ریکٹ نکالتا ہوں۔'' ایبک نے جلدی سے بات جیسے بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''نہیں...... اب میں ٹینس نہیں کھیلوں گی۔'' چڑیا نے اس کے بڑھائے ہوئے ریکٹ کو نہیں پکڑا تھا۔

''کیوں؟'' ایبک چونکا۔

''کیونکہ میرے پاس ریکٹ نہیں ہے۔'' دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے چڑیا نے بڑے تحمل سے کہا تھا۔

''میں دے رہا ہوں نا تم کو۔'' ایبک نے دوبارہ ریکٹ بڑھایا۔

''یہ میرا نہیں ہے۔'' چڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو کیا ہوا چڑیا؟ میں خود دے رہا ہوں تمہیں۔'' ایبک نے کہا۔

''لیکن اب مجھے ٹینس اچھا نہیں لگتا۔'' ایبک اس بار ریکٹ پکڑے کچھ دیر بیٹھا رہا تھا پھر اس نے بے حد متانت سے کہا۔

''تم مجھ سے ناراض ہو؟'' چڑیا نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم ہو۔'' ایبک نے بے ساختہ کہا۔ ''I am sorry۔'' چڑیا نے بے ساختہ سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔'' وہ ساتھ مسکرائی بھی تھی۔ ایبک بھی مسکرایا۔

''چلو پھر کھیلتے ہیں نا!''

''نہیں، ہم ویسے ہی باتیں کرتے ہیں بیٹھ کر...... مجھ کو ٹینس بورنگ لگتی ہے اب۔'' وہ دونوں بچے تھے لیکن کسی Psychic کی طرح ایک دوسرے کا ذہن پڑھ رہے تھے۔ ایبک کو اندازہ ہو گیا تھا کہ چڑیا اب دوبارہ اس کا ریکٹ نہیں لے گی۔ وہ خیر دین کی ہدایات تھیں یا چڑیا کی اپنی ضد جو بھی تھا ایبک نادم ہونے کے ساتھ ساتھ چڑیا کے حوالے سے بے حد محتاط بھی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے چڑیا دوبارہ ہرٹ ہوتی یا روٹھ جاتی۔

وہ سبق جو خیر دین اسے ہمیشہ دیتا تھا اور وہ سمجھ نہیں پاتی تھی وہ ایبک کی ایک چھوٹی سی حرکت نے اسے سمجھا دیا تھا۔ چڑیا جان گئی تھی کہ صاحب لوگ اس لیے ان جیسے نہیں تھے کیونکہ وہ کوئی بھی چیز خرید کر استعمال کرتے تھے مانگ کر نہیں اور وہ چیز جو مانگ کر لی جاتی ہے وہ کبھی بھی کوئی چھین سکتا ہے۔ اس نے اس ریکٹ کو چھونے اور ٹینس کھیلنے کا شوق پورا کر لیا تھا اور اس کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

وہ چند ہفتوں میں کھیل میں ماہر نہیں ہو سکتی تھی اور کھیل سیکھ لینے کے بعد بھی وہ دوبارہ اس کھیل کو کھیلنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی۔ اسکول میں ٹینس کی سہولیات نہیں تھیں اور ڈی سی ہاؤس میں اب کوئی ایبک نہیں ہوتا جو اسے اپنا ریکٹ بھی دیتا، کوچنگ بھی کرتا اور اس کے ساتھ کھیلتا بھی...... وہ بڑے لوگوں کا کھیل تھا...... صاحب لوگوں کا... وہ چڑیا کا کھیل نہیں تھا۔ یہ سب اسے خیر دین نے پیار سے سمجھایا تھا اور اس بار چڑیا کو پہلی بار تکلیف سے ہی سہی لیکن اپنی سوشل Standing سمجھ آ گئی تھی۔

لیکن ایبک سے وہ دور نہیں رہ سکتی تھی۔ خاص طور پر اب جب وہ ایک بار پھر سے چڑیا کو اپنا دوست بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اسے نہ یہ پروا تھی کہ ممی ناراض ہوں گی نہ اس بات کی پروا کہ وہ چڑیا کی وجہ سے کئی بار اپنا ہوم ورک بھی چھوڑ رہا تھا اور کچھ ایسا ہی حال چڑیا کا بھی تھا۔ ایک آدھ بار خیر دین کی نصیحتوں کے زیر اثر رہنے کے بعد وہ ایک بار پھر ایبک کی گرویدہ تھی۔ چڑیا نے ٹینس کھیلنا بند کیا تھا تو ایبک کی دلچسپی بھی ٹینس میں یک دم ختم ہو گئی تھی۔ وہ انکل اور ممی کے کہنے کے باوجود ٹینس کی پریکٹس کے لیے نکلنے سے کتراتا لیکن ٹینس نہ کھیلنے کے باوجود وہ دونوں دن میں کئی بار ایک دوسرے سے ملتے۔ فریزبی کھیلتے، شطرنج کھیلتے۔ ایبک کی پھینکی ہوئی ڈسک آہستہ آہستہ چڑیا کے ہاتھ میں آنے لگی تھی۔ صرف پہلی بار فریزبی کھیلتے ہوئے ایسا ہوا تھا کہ ڈسک پکڑنے کی کوشش میں ڈسک چڑیا کے ہاتھ میں تو آ گئی تھی لیکن اس کے ہاتھ کو بری طرح زخمی بھی کر گئی تھی۔ چڑیا نے شدید تکلیف کے باوجود منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔ وہ ایبک پر کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ کہتا وہ ایک ڈسک بھی کیچ نہیں کر سکتی۔ شدید تکلیف کے ساتھ اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈسک دوبارہ ایبک کی طرف پھینکنے کی کوشش کی تھی لیکن ٹھیک سے پھینک نہیں سکی تھی اور اس وقت ایبک نے بہت دور کھڑے بھی اس کی تکلیف کا اندازہ کر لیا تھا۔

''تمہیں ہاتھ پر چوٹ لگی ہے کیا؟'' ایبک نے دور سے ہی آواز دے کر پوچھا۔

''نہیں تو......'' چڑیا نے بے ساختہ کہا لیکن ایبک اس کی طرف بھاگتا آیا تھا۔ اس نے پاس آ کر چڑیا کا ہاتھ دیکھا جو صحیح طرح سیدھا بھی نہیں ہو رہا تھا اور ہلکی سی نیلاہٹ اور سوجن نظر آنے لگی تھی۔

''تم کو چوٹ لگ گئی اور تم نے بتایا بھی نہیں۔'' ایبک اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے افسوس سے بولا۔

''تم نے بہت زور سے ڈسک پھینکی تھی۔'' چڑیا نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

''احمق تم کو نہیں پکڑنا چاہیے تھی ڈسک اگر یہ زیادہ زور سے آ رہی تھی تو۔'' ایبک نے اسے ڈانٹا۔ وہ اکثر ٹینس سکھاتے ہوئے بھی اس کو ڈانٹ دیتا تھا۔ چڑیا خاموش ہو گئی۔ وہ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بہت دیر تک دباتا رہا تھا پھونکیں مار مار کر...... یہ اس کی فرسٹ ایڈ تھی۔ اور اس انجری کے بعد ایبک نے فریزبی پھینکنے کے اسٹائل کو تبدیل کیا تھا اور اس کی رفتار کو بھی کم کر دیا تھا۔ جب وہ شطرنج یا فریزبی نہ کھیلتے تو پھر وہ سارا دن بے مقصد ان وسیع و عریض لانز میں پھرتے، تتلیاں اور کیڑے مکوڑے اکٹھے کرتے رہتے۔ تتلیاں چڑیا پکڑا کرتی تھی اور کیڑے

مکوڑوں کی Collection بنانے کا آئیڈیا ایبک کا تھا۔ جیم، اچار اور Syrup کی خالی بوتلوں میں وہ بڑی بے جگری سے لان کی کیاریوں میں مٹی اور پودوں پر رینگتے کیڑے اکٹھے کرتا پھرتا۔ یہ جیسے اس کے نزدیک چڑیا کو متاثر کرنے کی کوششوں کا ایک حصہ تھا اور چڑیا متاثر ہوئی تھی۔ دل میں اسے گھن بھی آئی تھی جب ایبک گندے مندے کیڑے مکوڑے کئی بار خالی ہاتھ سے ہی پکڑ لیتا لیکن پھر وہ مسکراتے ہوئے ایبک کو سراہتی تھی۔ اور کبھی وہ لان میں پھولوں اور پتوں کی کلیکشن بناتے پھرتے اور مالیوں سے ان کے نام پوچھ پوچھ کر لکھتے رہتے اور جب وہ یہ عجیب و غریب کلیکشن نہ کر رہے ہوتے تو پھر وہ عمارت کے عقب میں سرونٹ کوارٹرز کے قریب لگے ہوئے مختلف پھلدار درختوں پر چڑھے جامن، کیریاں اور کھٹے انگور، شہتوت اتار اتار کر املی اور نمک مرچ کے ساتھ کھاتے یا پھر غلیلوں سے ان اونچے لمبے درختوں پر بیٹھے پرندوں کا شکار کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ وہ چڑیا کی زندگی کا سب سے بہترین موسم گرما تھا۔ ایسے دن جب وہ واپس کوارٹر میں آنا ہی نہیں چاہتی تھی اور کچھ یہی حال ایبک کا بھی تھا۔ ایچی سن میں پڑھنے والا وہ کلچرڈ اور گرومڈ بچہ جو اس گھر میں ہر وقت نک سک سے درست رہنے والے حلیے میں آیا تھا جو فورک اور نائف کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتا تھا اور جو ٹینس، سوئمنگ اور فریزبی کھیلتا تھا۔ اب لان میں چھپن چھپائی کھیلتا پھرتا تھا۔ جوتیں گھٹنے پاؤں پر موجود موزے اب لان کے مختلف حصوں سے دریافت ہوتے تھے۔ اس کی جیبوں میں اب کیریاں اور کچے انگور بھرے ہوتے تھے اور وہ اس تمام موج مستی میں ساتویں آسمان پر تھا، ماں کی چیخم پکار بھی اب اس پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ماں کو پتا تھا کہ وہ چڑیا کے ساتھ کھیلتا تھا لیکن وہ جب بھی اسے ڈھونڈنے آتی، چڑیا کا نام و نشان بھی اسے کہیں نہیں ملتا تھا۔ وہ بالکل اکیلا لان میں کہیں نہ کہیں کچھ کرتا پایا جاتا اور وہ اس بات کو کسی طرح ماننے پر تیار نہیں ہوتا کہ وہاں آس پاس کہیں چڑیا تھی۔ چڑیا جیسے ایبک کا Well-kept سیکرٹ تھی۔
اس کی ممی اسے ڈانٹتے کھینچتے وہاں سے لے جاتیں اور وہ چند منٹوں کے بعد پھر لان میں موجود ہوتا۔

☆☆☆

شیر دل نے فون انگیج کیا۔ پھر کال ڈس کنیکٹ کرنے کے بعد دوبارہ عکس کو کال کی۔ اس بار پہلی بیل پر کال ریسیو کی گئی تھی۔

"السلام علیکم۔" شیر دل کے پورے وجود سے کوئی چیز گزری تھی۔ اس عورت کی آواز سن کر وہ چند لمحوں کے لیے اس کیفیت کا شکار ضرور ہوتا تھا۔

"کب آئی ہو پاکستان؟" رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے عکس سے پوچھا۔

"22 کو۔" مختصر جواب ملا تھا اسی Soothing آواز اور بے حد شستہ لب و لہجے میں۔ چند لمحوں کے لیے شیر دل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے مزید کیا پوچھے۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے پاس سوال نہیں تھے لیکن ان سوالوں کے جواب ان دونوں کے لیے بڑے تکلیف دہ ہوتے تھے۔ ان کے درمیان جب بھی کبھی بات ہوتی تھی بڑے ہلکے پھلکے موڈ میں ہوتی تھی۔ آج پہلا موقع تھا جب گفتگو کو شروع کرنا ہی دونوں کے لیے مشکل ہو رہا تھا شاید اس لیے کہ ان دونوں کی زندگی میں اس وقت کوئی دوسرا آچکا تھا۔

"شہر بانو کیسی ہے؟" اس نے عکس کو کہتے سنا۔ شیر دل کو لگا وہ شاید ساتھ کوئی کام بھی کر رہی ہے۔

"وہ بھی ٹھیک ہے، تم کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ پیکنگ وغیرہ کر رہی ہوں اور بیٹی کا کیا حال ہے تمہاری؟" وہ دوسری طرف بڑے Casual انداز میں بول رہی تھی۔ ساتھ کچھ کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

"مثال بالکل ٹھیک ہے۔" شیر دل نے کہا۔

"میرے ہمسائے میں آرہی ہو تم؟" شیر دل کا اشارہ پوسٹنگ کی طرف تھا۔ عکس دوسری طرف سے مدھم آواز میں ہنسی تھی۔

"میری تو ویسے خواہش تھی تمہاری خالی سیٹ پر آتی۔" اس نے عکس کو کہتے سنا۔

"ارے...... اچھا...... یہاں آنا چاہتی ہو تم؟" شیر دل نے چونک کر کہا۔

"تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" شیر دل کو محسوس ہوا وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھی۔

"مجھے کیا اعتراض ہوگا...... ابھی آجاؤ۔" شیر دل نے بے ساختہ کہا۔ وہ پھر ہنسی۔ اس بار شیر دل چپ نہیں رہ سکا تھا۔

"تم نے کچھ زیادہ ہنسنا شروع نہیں کر دیا؟"

"تمہیں کوئی مسئلہ ہے اس سے؟" جواب اسی انداز میں ملا تھا۔

"یار پوچھ رہا ہوں۔" شیر دل نے کچھ مدافعانہ انداز میں کہا۔

"تم ہمیشہ الٹے سوال ہی پوچھا کرو مجھ سے۔"

"خیر ہر سوال تو الٹا نہیں کیا میں نے...... کچھ سیدھے بھی تھے۔" شیر دل نے بے ساختہ کہا۔

"ان سیدھے سوالوں کے بھی جواب الٹے تھے۔"

"تم نے تو سیدھے سیدھے ہی دیے۔" وہ اس بار کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ دونوں دوسرے کی بات کے Context کو سمجھ گئے تھے۔ شیر دل بھی ہنس دیا۔

"کسی مدد وغیرہ کی ضرورت ہے؟" اس نے عکس سے کہا۔

"نو تھینکس۔" شیر دل کو اسی جواب کی توقع تھی۔ وہ خوشی سے مر جاتا اگر وہ کسی کام کے لیے کہہ دیتی۔ وہ اب اس سے امریکا میں اس کے Stay کے حوالے سے بات کرنے لگا تھا۔ عجیب بات تھی لیکن وہ جب بھی ایک دوسرے سے بات کرنا شروع ہوتے کرتے ہی چلے جاتے، انہیں خود پر بند باندھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پتا نہیں کیا، کیا تھا جو انہیں ایک دوسرے سے شیئر کرنا یاد آجاتا تھا اور یہ اکیڈمی کے دنوں سے تھا۔ وہ Argument کرنا بھی شروع کرتے تو وہ بھی لمبا ہوتا جاتا تھا اور اتنا لمبا ہوتا کہ اس کا اختتام کسی اور ڈسکشن پر ہوتا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔

شیر دل اب اس کو اپنے ڈویژن کے حوالے سے انفارمیشن دے رہا تھا۔ دو سال پاکستان سے باہر رہنے کے باوجود وہ ill informed نہیں تھی اور پاکستان میں آئے ایک ہفتہ ہونے کے باوجود اسے اس ڈسٹرکٹ کے بارے میں تمام بنیادی معلومات تھیں جہاں اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ شیر دل سے وہ بس اپنے نوٹس Tall y کر رہی تھی۔

"Oh...... السلام علیکم۔" بات کرتے کرتے شیر دل نے اسے کسی سے کہتے سنا تھا پھر اس نے کسی مرد کی آواز سنی جو بڑی بے تکلفی سے عکس سے بات کر رہا تھا۔

"اچھا شیر دل...... تم سے دوبارہ بات ہوگی...... مجھے لنچ پر جانا ہے...... خدا حافظ۔" اس نے شیر دل کے ساتھ بات کرتے کرتے یک دم بہت عجلت کے عالم میں فون بند کیا تھا۔ وہ سیل فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔ چند لمحے اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس نے جیسے کچھ بے چینی اور خفگی کے عالم میں عکس کو ایک Text کیا تھا۔ چند منٹوں میں اس Text کا جواب آگیا تھا۔

"Shut up" شیر دل کا رنگ ہمیشہ کی طرح سرخ ہوا تھا۔ اس کے سیل فون میں عکس کی طرف سے پچھلے تمام سالوں میں آنے والے Shut up131 کے میسجز محفوظ تھے۔ اور شیر دل ان 131 میسجز کو تاریخ پڑھے بغیر بھی پہلی Shut up کال سے موجودہ تک کی ہسٹری، سیاق و سباق، تاریخ اور لوکیشن بتا سکتا تھا۔ زندگی میں شیر دل نے عکس کے علاوہ کسی اور سے یہ لفظ نہ سنا تھا اور نہ وہ برداشت کر سکتا تھا۔ زندگی میں عکس صرف ایک شخص سے Rude ہوتی تھی۔ صرف ایک شخص تھا جس کو وہ دھڑلے سے Shut up کال دیتی تھی اور وہ شیر دل تھا۔ شیر دل نے اس 132 ویں شٹ اپ کال کو msg folder میں Save کیا اور پھر اس نے سرخ چہرے اور بے حد خفگی کے عالم میں لان سے اٹھتے ہوئے عکس کو ایک طویل Text کیا۔

☆☆☆

نیند میں وہ ہڑبڑا کر کسی کی چیخوں اور رونے کی آواز سے اٹھا تھا۔ چند سیکنڈز میں اس نے وہ آواز پہچانی تھی۔ وہ چڑیا کی آواز تھی۔ ایک نیم خوابیدگی کے عالم میں جیسے بستر سے نکل کر باہر بھاگا تھا۔ وہ تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ نیم خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکلنے پر اس نے وہ منظر دیکھا تھا جو اگلے کئی سال اس کے ذہن کے ساتھ ایک آسیب کی صورت میں چپکا رہا تھا۔ وہ اوپر والی منزل پر اپنے کمرے کے دروازے سے آگے نہیں جا سکا تھا۔ ہذیانی انداز میں چیخیں مارتی ہوئی چڑیا بھاگتے ہوئے ناہموار قدموں سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

"نانا...... نانا" وہ چلاتے ہوئے خیر دین کو آوازیں دے رہی تھی۔

وہ سیڑھیوں کے وسط میں تھی اور سیڑھیوں کے بالکل اوپر اس نے اپنے انکل کو بے حد تیز رفتاری کے عالم میں اس کے پیچھے بھاگتے اور سیڑھیاں اترتے دیکھا تھا۔ ریلنگ کے پاس کھڑا ایک لرزنے لگا تھا، اس نے زندگی میں اس سے زیادہ خوف کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ چڑیا کی ہذیانی چیخیں نہیں تھیں جس نے اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑائی تھی۔ یہ اس کا برہنہ جسم تھا جس نے ایک کو دہشت زدہ کیا تھا۔ ریلنگ کو پکڑے...... وہ تھر تھر کانپتے ہوئے کسی مجسمے کی طرح کھڑا رہا۔ اس کے انکل نے چند جستوں میں نیچے کے زینوں پر پہنچ جانے والی چڑیا کو پکڑ لیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں چلاتے ہوئے خیر دین کو پکار رہی تھی۔ پھر ایک نے اپنے انکل کو یکے بعد دیگرے چڑیا کے چہرے پر تھپڑ مارتے دیکھا پھر اس نے اپنے انکل کو دونوں ہاتھوں سے چڑیا کا منہ اور گلا دباتے ہوئے دیکھا۔ وہ اب زمین پر گری ہوئی تڑپ رہی تھی۔ اس کی وہ ہذیانی چیخیں بند ہو چکی تھیں۔ اس کے انکل فرش پر چڑیا کے اوپر جھکے اپنا ایک ہاتھ چڑیا کے منہ پر سختی سے جمائے دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبا رہے تھے۔ ڈی سی ہاؤس میں اب ایک بار پھر وہی سناٹا تھا جو ہمیشہ رات کے اس پہر ہوتا تھا اور جسے یا تو باہر درختوں سے الوؤں کی آواز توڑتی تھی یا جھینگروں کی...... یا باہر رات کو لان میں کھلے چھوڑے جانے والے گارڈز کے کتوں کی۔

ریلنگ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے پتے کی طرح کانپتے ایک نے سب کچھ نیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ کھلی آنکھوں اور پلکیں جھپکائے اور سانس لیے بغیر دیکھا تھا اور دیکھ رہا تھا۔ فرش پر گری چڑیا کا تڑپتا ہوا وجود آہستہ آہستہ ہلنا بند ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں اس کی آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا ایک اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اپنے ماؤف نیم خوابیدہ ذہن اور کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ۔ چڑیا رات کے وقت وہاں کیوں آئی تھی؟ ایک کو یاد آگیا۔

"Magnetic chess board دیکھا ہے کبھی؟" اس نے تین دن پہلے لان میں ایک خرگوش کو

پکڑنے کی کوشش میں اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے یک دم پلٹ کر چڑیا سے کہا۔ جو اسی کی طرح اس خرگوش کو پکڑنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی۔

"نہیں تو...... تمہارے پاس ہے کیا؟" چڑیا بھاگتے بھاگتے رک گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی، اس نے رک کر جیسے اپنی بے قابو ہوتی ہوئی سانس کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

"میرے پاس نہیں ہے، انکل کے پاس ہے۔ اتنا بڑا اور بہت خوب صورت۔" ایبک نے ہاتھوں کے اشارے سے اس کا سائز بتایا۔ چڑیا بے اختیار امپریس ہوئی۔

"کہاں ہے؟"

"وہ جو اوپر ان کی لائبریری ہے نا، اس میں رکھا ہے۔" ایبک نے لوکیشن بتائی۔

"مجھے لا کر دکھاؤ نا۔" چڑیا نے بے ساختہ فرمائش کی۔ ایبک چند لمحے سوچ میں پڑ گیا۔ یہ ذرا مشکل اور ناممکن سا کام تھا۔ وہ بہت وزنی چیس بورڈ تھا اور اس کا سائز اتنا تھا کہ وہ اس کو کسی طرح بھی چھپا کر اوپر والی منزل سے نیچے والی منزل پر گھر میں موجود نوکروں اور دوسرے افراد کو دھوکا دے کر نہیں لا سکتا تھا۔ سر کھجاتے ہوئے اس نے چڑیا کو یہ بتایا۔ چڑیا کا چہرہ بجھ گیا۔

"اوکے۔" اور اس بجھے چہرے اور اوکے نے ایبک کو بے چین کر دیا۔

"اچھا میں کوئی راستہ تلاش کرتا ہوں۔" اور وہ راستہ اس نے بالآخر دو دن کے بعد تلاش کر لیا تھا۔ اس کی ممی اور آنٹی ویک اینڈ پر کسی فیملی فنکشن میں شرکت کے لیے لاہور چلی گئی تھیں۔ اس کے انکل ساتھ نہیں گئے تھے اور ایبک بھی ماں کے اصرار اور خفگی کے باوجود ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ ماں کو کیسے یہ بتا دیتا کہ اس کے پاس چڑیا کو Magnetic board دکھانے کا ایک سنہری موقع آیا تھا اور وہ اسے کسی قیمت پر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

ویک اینڈ پر دونوں فیملیز کے گھر سے چلے جانے کے بعد گھر پر صرف ایبک اور اس کے انکل تھے۔ وہ دونوں بہت دیر تک ان کے گھر سے چلے جانے کا انتظار کرتے رہے اور پھر بالآخر مایوس ہو گئے۔ وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ہال کمرے میں بیٹھے تھے جہاں سے گزر کر ہی وہ اوپر والی منزل پر جا سکتے تھے۔ شام ہو جانے پر بھی جب اس کے انکل گھر پر ہی رہے تو ایبک نے جیسے ایک اور منصوبہ بتایا۔ ان دونوں نے طے کیا تھا کہ ایبک کچن کا عقبی دروازہ جو نوکروں کے جانے کے بعد بند ہو جاتا تھا وہ رات کو اسے کھول دے گا۔ چڑیا، خیر دین اور حلیمہ کے سونے کے بعد اپنے کوارٹر سے نکل کر کچن میں آ جائے گی اور پھر وہ دونوں اوپر لائبریری میں جا کر نہ صرف وہ Magnetic chess دیکھیں گے بلکہ چیس کھیلیں گے بھی۔ وہ یہ پلان بنانے کے بعد شام کو ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے تھے۔ ایبک نے نوکروں کے جانے کے بعد دروازہ کھول دیا تھا اور بہت دیر وہ چڑیا کے انتظار میں نیچے ٹہلتا بھی رہا پھر وہ اوپر جا کر ویڈیو گیم کھیلنے لگا اور اسے نہیں پتا وہ گیم کھیلتے کھیلتے کب سویا تھا۔

"ہم نے تو چیس کھیلنی تھی۔" ایبک کو جیسے کرنٹ لگا۔ "اور چڑیا تو چیس کھیلنے آئی تھی...... تو پھر...... انکل...... اور چڑیا کے کپڑے...... اور چڑیا کی چیخیں...... وہ اس کو کیوں مار رہے تھے؟" ایبک نے ریلنگ کو پکڑے پکڑے کچھ آگے جھک کر دہشت زدہ ذہن کے ساتھ چڑیا کے تڑپتے ہوئے جسم کو دیکھنے کی کوشش کی۔ چڑیا کا جسم اب آہستہ آہستہ حرکت کرنا چھوڑ رہا تھا...... ایبک اس لمحے بھی کچھ اور نہیں سمجھ پایا تھا...... ایک چیز کے سوا...... چڑیا مر رہی تھی یا شاید مر گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا۔ اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں تین بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آ جاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں اٹک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب یعنی شیر دل کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ رابطہ و ضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایک نظر آتا ہے۔ ایبک شیر دل کی چھوٹی بہن آتزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے شیر دل کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو شیر دل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرواتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیر دل کے کولیگ فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے، عکس سے پہلا تعارف شیر دل کا پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیر دل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایبک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایبک کی مما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایبک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت حیرت ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرے تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شیر دل عکس کو فون کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اس کی عکس سے بات اور ملاقات کب ہوئی تھی، شہر بانو سے منگنی کے بعد اس کو پتا چلا تھا کہ عکس کی منگنی سے شادی متوقع ہے۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیر دل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایبک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میکنٹک چیس دکھائے لیکن ایبک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔

(اب آگے پڑھیں)

اس اسٹینڈنگ مرر میں اپنے عکس پر پہلی نظر ڈالتے ہی اس نے اپنی یادداشت کے سارے خانوں کو جسم سے اترے ہوئے لباس کی جیبوں کی طرح کھنگالنا اور جھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ کتنے سال بعد اس نے اس مرر کو دیکھا تھا اور اس مرر میں کیا کیا دیکھا تھا۔

آئینہ اتنے سالوں کے بعد آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ کم آب و تاب کے ساتھ لیکن اسی وقار کے ساتھ جس کے ساتھ اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ گھر کا ایکسٹیریئر مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ آئینہ جیسے کسی شہزادی کا رومال تھا جسے وہ پھاڑ کر چھٹنے اور غائب ہونے سے پہلے شہزادے کی رہنمائی کے لیے باہر چھوڑ گئی تھی۔ واحد سراغ...... ہر ہر بھید تک لے جانے اور اسے پانے والا۔ چند لمحوں کے لیے اس آئینے کو دیکھتے ہوئے اسے یوں لگا تھا

جیسے وہ بھی تب ہی وہاں سے ہٹے گا، غائب ہوگا جب حضرت سلیمانؑ کے عصا کی طرح اسے بھی کھڑے کھڑے دیمک لگ جائے گی، پھر ایک دن وہ برادے کے ایک ڈھیر اور آئینے سے شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ پتا نہیں وہاں کھڑا وہ کس کس کا عکس دیکھتا اور دکھاتا رہا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں نظر آتی عمارت کے بیرونی حصے کے عکس کو دیکھنے لگی۔ انگلیوں کی پوروں پر اس نے جیسے وہ سال گنے تھے جب وہ آخری بار اس گھر سے گئی تھی۔ وہ گھر جو اس کی زندگی کا خوب صورت ترین اور سیاہ ترین باب تھا۔ وہ گھر جس سے زیادہ محبت اور نفرت اسے کبھی کسی جگہ سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ گھر جو وہاں آ کر بسنے والے انسانوں کے تمام احساسات سے بے نیاز آج بھی اسی تمکنت سے وہاں کھڑا تھا۔

اور پھر آئینے میں اپنے اور اس گھر کے عکس کے درمیان اس نے یک دم کسی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار مسکرائی۔ اس نے زندگی میں اس مرد کے علاوہ صرف ایک مرد کو...... وہ آگے کچھ سوچ نہیں پائی، وہ اب اس کے عقب میں کھڑا اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"You look lovely" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"Thank you for flattering me" اس نے جواباً کہا۔ وہ اس کے عکس پر نظر جمائے ہوئے بے اختیار مسکرایا۔ گہری، گرم جوش، بہت کچھ یاد دلا دینے والی آنکھیں...... بے حد باریک ہونٹوں پر آنے اور کھلنے والی بے ساختہ اور خمار مسکراہٹ...... اور یہ مسکراہٹ کیا کیا طوفان نہیں اٹھا دیتی تھی۔ کون کون سی قیامت تھی جو بپا نہیں کر دیتی تھی۔

"You are more than welcome" اس نے ذرا سا ہنس کر اس کی بات پر جیسے کسی ندامت کا اظہار کیے بغیر دھڑلے سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے میں پہلی بار اس گھر میں کب آئی تھی؟" اس نے آئینے میں اس کے عکس کے عقب میں موجود عمارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب بھی اس کے کندھے پر اسی طرح دونوں ہاتھ جمائے ٹکائے کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی، نرم، سہارا دیتا ہوا دباؤ۔ چند لمحوں کے لیے جیسے اس کا دل اس سے لپٹ جانے کو چاہا تھا۔

"جب......" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق سے نہیں نکل سکی۔ آنسوؤں کے ایک ریلے نے اس کی قوتِ گویائی اور بینائی دونوں کو بیک وقت مفلوج کیا تھا۔ یادیں تھیں...... درد کے آبلے تھے جو گرم پانی کے چشموں کی سطح پر ابھرنے والے بلبلوں کی طرح پھٹنے لگے تھے۔ کندھوں پر ٹکے وہ دونوں ہاتھ سرعت سے بازوؤں پر آئے پھر انہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ حصار جس نے زندگی میں کبھی اس کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا، وہ حصار جو اس کے لیے ایک عطا تھا کسی کا تحفہ۔ اس کے بازوؤں کے حصار میں روتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کون سے کانٹے پہلے نکال کر اس کو دکھائے...... وہ جو پاؤں میں تھے یا وہ جو دل میں تھے۔ سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ جو یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کو دوبارہ بھلانے کے لیے وہ کیا کرے گی۔

اس گھر کے برآمدے میں لگا وہ آئینہ، شہزادی تک پہنچانے والا واحد سراغ، اب جیسے شہزادے کو اس کے

پاس لے آیا تھا، پہاڑ کی اس کھوہ میں جہاں ایک شہزادی کو کئی سال پہلے گہری نیند سلا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

شیر دل نے اس کو کاریڈور میں داخل ہوتے ہی بہت دور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ کمشنر آفس کے میٹنگ روم کے داخلی دروازے پر کھڑی اپنے عملے کے کسی رکن کو ہدایت دینے میں مصروف تھی۔

چیف کمشنر کے ساتھ ڈویژن کے تمام ڈی سی اوز کی دس بجے ہونے والی میٹنگ کا انتظام اس کی ذمے داری تھی۔ شیر دل کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ رینگی تھی اور ایسا کیوں تھا وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

عکس مراد علی کو اپنے سامنے پا کر اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی یا پھر غصہ آتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بے تاثر رہ پایا ہو...... خوشی کا وہ حال ہوتا تھا کہ وہ بہت دن تک اس کے ٹرانس سے باہر نہیں نکل پاتا تھا...... اور غصہ سمندر کی ایک شوریدہ سر لہر کی طرح آ کر گزر جاتا تھا۔

ایمرلڈ گرین لانگ شرٹ میں سیاہ چوڑی دار پاجامے اور دوپٹے میں کندھوں سے کافی نیچے تک جاتے اسٹیپس میں کٹے ہوئے گھنے سیاہ بالوں کو وہ اب بھی بات کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جھٹک رہی تھی۔ وہ اس کو کئی سالوں بعد دیکھ رہا تھا لیکن شیر دل کو کم از کم دور سے اس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے شخص کے ساتھ بات کرتے کرتے اپنا رخ موڑا تھا اور تب اس نے بھی شیر دل کو دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شیر دل نے اس کو بھی بات کرتے کرتے ٹھٹکتے دیکھا پھر اس کے ہونٹوں پر بھی ایک مسکراہٹ آئی تھی۔ نظروں اور مسکراہٹوں کے تبادلے کے بعد اس نے عملے کے اس فرد کو کچھ آخری ہدایات دیں۔ شیر دل کے اس کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا عملہ وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس کے بالمقابل جا کر کھڑے ہوتے ہوئے شیر دل کا دل بے اختیار مچلا تھا کہ وہ اپنے عقب میں آنے والے اپنے اسٹاف کو وہاں سے رخصت کر دے...... کم سے کم چند لمحوں کے لیے۔ عکس کو دیکھ کر اس کے دل میں ہر قسم کی احمقانہ اور بچگانہ خواہشات پیدا ہوتی رہتی تھیں اور یہ ہمیشہ سے تھا۔ ہاں پہلے کبھی اس نے اپنی ان تمام خواہشات کو احمقانہ اور بچگانہ کا لیبل نہیں لگایا تھا، اب لگانے لگا تھا۔ یہ کام وہ نہ کرتا تو وہ کرتی جو اس سے تین فٹ کے فاصلے پر اس کے سامنے کھڑی اپنی سیاہ، چمکدار، شفاف، گہری آنکھوں اور بے حد جان لیوا مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو!'' اس کے خیر مقدمی کلمات کے آغاز سے پہلے ہی شیر دل نے کہا تھا۔

''سر آپ کیسے ہیں؟''

''I am good آپ کیسی ہیں میم؟''

''I am fine too آپ کا سفر ٹھیک رہا؟''

''جی، چیف آ چکے ہیں؟''

''وہ بس راستے میں ہیں، دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔'' کمشنر آفس میں کھڑے اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے انتظامی عملے کے بیچ میں وہ ایک دوسرے سے یہی کہہ سکتے تھے جو کہہ رہے تھے...... فارمل انداز اور کلمات۔ صرف ان کی مسکراہٹ اور آنکھیں تھیں جو ایک دوسرے کو وہ پہنچا رہی تھیں جو اُن کے احساسات تھے۔ صرف چند منٹ وہ وہاں کھڑا رہا تھا پھر میٹنگ روم میں چلا گیا تھا، اس کے پاس سے نہ ہٹنے کی خواہش کے باوجود۔

میٹنگ ٹھیک وقت پر شروع ہوئی تھی۔ شیر دل کمشنر کے بائیں جانب میز کی پہلی کرسی پر تھا اور وہ اس کے بالمقابل کمشنر کے داہنی جانب پہلی سیٹ پر براجمان تھی۔ اور اس سیٹنگ ارینجمنٹ سے شیر دل کو کم از کم یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے لیے ٹیبل کے سرے پر بیٹھے ہوئے کمشنر اور میٹنگ پر توجہ مرکوز رکھنا آج کافی مشکل ثابت ہونے والا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا...... وہ بار بار بھٹک رہا تھا، اسے دیکھتے اور سنتے ہوئے۔ وہ اب بھی اسی طرح بات کر رہی تھی جس طرح ہمیشہ کرتی تھی۔ نپا تلا انداز، تول کر بولنے کی عادت، بے حد ٹھہراؤ والا دھیما، ملائم لہجہ اور بے حد شستہ اور مدلل گفتگو۔

شیر دل نے اکیڈمی میں اس کے ساتھ ٹریننگ کے دوران اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ کام کے دوران کبھی اس کو اسٹریس میں آ کر ٹمپر لوز کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ خود بھی بے حد ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا لیکن عکس مراد علی جیسا تحمل اور Composure اس نے بہت کم کسی میں دیکھا تھا۔ وہ کم گو نہیں تھی لیکن بات چیت میں بے حد محتاط تھی۔ شیر دل نے اکیڈمی میں بھی اسے دوسری لڑکیوں کے ساتھ کبھی بے مقصد گپیں ہانکتے نہیں دیکھا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ عکس کی بہت کم بات کبھی کہیں Misquote ہوئی تھی۔

وہ کمشنر کو کسی پروجیکٹ کی بریفنگ دے رہی تھی اور وہ اسے دیکھتے ہوئے بیٹھا بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ میٹنگ میں بریفنگ دیتے ہوئے بھی عکس اپنے بالمقابل ٹیبل کے دوسری طرف بیٹھے اس شخص کی خود پر مرکوز نظروں سے آگاہ تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کبھی اس کے سامنے بیٹھی ہوتی اور شیر دل کسی اور چیز کو دیکھ پاتا۔ بریفنگ ختم کر کے اپنے سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس نے سامنے بیٹھے شیر دل کو دیکھا۔ وہ بھی پانی پی رہا تھا۔

☆☆☆

شیر دل نے عکس مراد علی کو اکیڈمی میں ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے ایک ہفتے کے بعد دیکھا تھا۔ وہ میڈیکل لیو پر تھی اور پہلی پوزیشن پر آنے والے امیدوار کے بارے میں سب کا تجسس اور اشتیاق آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ شیر دل ان میں شامل نہیں تھا اور وہ واقعی ہی ان میں شامل نہیں تھا۔ شروع شروع میں اسے عکس کے بارے میں جاننے میں تجسس اور دلچسپی ضرور تھی لیکن عکس کی ٹریننگ شروع ہونے پر بھی وہاں موجود نہ ہونے پر دوسروں کی طرح اس کا اشتیاق بڑھنے کے بجائے کم ہو گیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی نے جیسے شیر دل کو وہاں سب کی توجہ کا مرکز بننے کا موقع دے دیا تھا۔ پہلی پوزیشن والے امیدوار کی عدم موجودگی میں دوسری پوزیشن والا امیدوار قائم مقام کی حیثیت سے تمام مراعات اور اضافی سہولتیں پا رہا تھا۔ عکس مراد علی کے آنے تک شیر دل اکیڈمی کی تمام خواتین Commoners کا Heartthrob بن چکا تھا۔ وہ اپنے Common میں آنے والے چند بااثر ترین خاندانوں کے سپوتوں میں سے ایک تھا اور ضرورت سے زیادہ ہینڈسم تھا۔ یہ Expression اس کے لیے اکیڈمی کے ایک انسٹرکٹر نے ازراہِ تفنن استعمال کیا تھا جو پھر اس کے لیے اکثر دوسرے بھی چھیڑ چھاڑ میں استعمال کرنے لگے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد شیر دل کا تختہ کسی بغاوت کے بغیر دن دہاڑے الٹایا گیا تھا جب عکس مراد علی اکیڈمی میں اپنی جگہ لینے آ گئی تھی۔ شیر دل نیوز پیپر میں اس کی تصویریں دیکھ لینے کے بعد کم از کم شکل کی حد تک اس سے واقف تھا

لیکن ایک ہفتے کی میڈیکل لیو کے بعد اکیڈمی میں آنے والی لڑکی شیر دل کو اس سے کہیں زیادہ ان انٹریکٹو لگی تھی جتنی اسے نیوز پیپر میں لگی تھی۔ وہ کسی اسکن انفیکشن کا شکار تھی اور قدرے صحت یاب ہونے کے باوجود اس کے چہرے، گردن، ہاتھوں اور بازوؤں پر سرخ رنگ کے چھوٹے بڑے ان گنت دھبے تھے اور اس الرجی نے عکس مراد علی کو کافی مضحکہ خیز سی حالت میں ہر ایک سے متعارف کروایا تھا۔ وہ اپنی اس حالت کے باوجود اور بے حد بیزرد طبیعت رکھنے کے بعد بھی اپنے کامن کے ساتھیوں سے علیک سلیک کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر وہاں کسی کو یہ غلط فہمی تھی کہ پہلی پوزیشن لینے والی امیدوار خراب اور الٹے دماغ کے ساتھ وہاں پہنچے گی تو وہ غلط فہمی دور ہوگئی تھی۔ عکس مراد علی بے حد نرم خو اور دوستانہ مزاج رکھنے والی لڑکی تھی۔ اگلے ایک ہفتے میں شیر دل نے اس کو ہر ایک کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھ لیا تھا سوائے اپنے...... اور یہ چیز جیسے اسے بری طرح کھلی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے عکس نے اسے دانستہ نظر انداز کیا تھا...... اپنے سب سے قریبی اور سب سے خطرناک حریف کو۔

چند بار اکیڈمی میں مختلف جگہوں پر ان کا آمنا سامنا بھی ہوا تھا مگر تب بھی دونوں کے درمیان سرد مہری اور خاموشی نہیں ٹوٹی تھی اگر عکس نے شیر دل سے علیک سلیک میں پہل نہیں کی تھی تو شیر دل نے بھی اسے گھاس نہیں ڈالی تھی۔ وہ بھی اسے ہر جگہ پر اسی طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تھا جس طرح وہ لے۔ وہ اس کے وہاں ہوتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں پھیرے رہتی تھی اور اس سرد مہری میں کچھ اضافہ اس حقیقت نے بھی کر دیا تھا کہ اس کی آمد کے چند دنوں میں ہی عکس نے کلاسز میں شیر دل جیسے ماہتاب کو گرہن لگانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کلاس میں ہمیشہ کم پوائنٹس پر بولتی تھی لیکن ان پوائنٹس اور ان مواقع پر بولتی تھی جن پر دوسروں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا یا جب دوسرے بحث کر کر کے کسی لوجیکل نتیجے پر پہنچنے میں ناکام ہو چکے ہوتے...... اور پھر جیسے ہر ایک کو لاشعوری طور پر کلاس کے کسی کونے سے سب سے آخر میں ابھرنے والی اس بے حد خوب صورت آواز کا انتظار رہتا تھا جو مسئلے کے الجھے ہوئے دھاگے کا سرا الجھن میں سے بال کی طرح نکال کر یوں پلیٹ میں سب کے سامنے رکھتی کہ چند لمحوں کے لیے سب کو اپنا آپ چغد اور احمق محسوس ہوتا......

اور بہت آہستہ آہستہ عکس مراد علی نے اپنے آپ کو کلاس کا فوکل پوائنٹ بنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ 188 لوگوں کے اس کامن میں سب سے برتر کیوں تھی یہ بہت جلد ہی سب کو پتا چلنا شروع ہو گیا تھا۔ وہاں موجود تمام لڑکے لڑکیاں غیر معمولی ذہانت کے حامل تھے اور تمام ہی اپنے اپنے علاقوں اور فیلڈز میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے آئے تھے تو اکیڈمک ریکارڈ کی بنیاد پر عکس اور دوسرے لوگوں میں بہت زیادہ فرق نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ کسی بھی ڈسکشن میں کسی بھی پوائنٹ کو سمجھنے میں ریزر شارپ تھی اور اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کرسٹل کلیئر اور ٹو دا پوائنٹ۔ کلاس میں یہ اس کی امتیازی خصوصیات تھیں جو بعض مواقع پر دوسروں کو مرعوب کرتی تھیں لیکن کئی مواقع پر دوسروں کو خائف اور Insecure کر دیتی تھیں۔ وہ دوسروں کی بات کاٹ کاٹ کر جذباتی انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی عادی نہیں تھی، نہ ہی اسے کلاس میں ہر سوال کا جواب سب سے پہلے دینے کا خبط تھا۔ وہ ہر ایک کی بات بہت دیر تک اور بے حد سکون سے سن لینے کے بعد اپنا اختلافی نقطۂ نظر دوسروں کے سامنے رکھتی تھی۔ کم سے کم اس معاملے میں وہ اپنے کامن کی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔

عکس مراد علی شہد کی دلدل ہے۔ میس میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے شیر دل نے ایک دن عکس

کے بارے میں کسی کا تبصرہ سنا تھا اور وہ جیسے اش اش کر اٹھا تھا۔ عکس مراد علی کے لیے اس سے زیادہ موزوں ٹائٹل کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

اور شہد کی وہ دلدل پاکستان واپسی کے بعد چیف کمشنر کو دی جانے والی اس پہلی بریفنگ میں بھی اسی طرح تباہ کن حد تک پُراعتماد اور مستعد تھی۔

میٹنگ کا اختتام لنچ کے بعد ہوا تھا اور اپنی گاڑیوں کی طرف جاتے ہوئے پورے دن میں پہلی بار شیر دل اور عکس کو ایک دوسرے سے انفارمل گفتگو کا موقع ملا تھا۔ ان کا اسٹاف ان کی گاڑیوں کے پاس پہنچ چکا تھا اور وہ خود رستے میں رک کر ایک دوسرے سے گپ شپ کرنے لگے۔

''تم کیا کر رہی ہو اب؟'' شیر دل نے اس کی اگلی مصروفیات کا پوچھا۔ چار بجنے والے تھے اور آفس ٹائم تقریباً ختم ہونے والا تھا۔

''میں ابھی تو گھر جاؤں گی پھر شام کو دوبارہ آفس جانا ہے کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' عکس نے اس سے پوچھا۔

''میں سوچ رہا تھا بیٹھتے ہیں کہیں...... چائے، کافی پیتے ہیں، گپ شپ لگاتے ہیں، کافی عرصہ ہو گیا بیٹھ کر بات کیے۔'' شیر دل نے اس سے کہا وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے چلتے ہیں کہیں...... گھر چلو گے یا گالف کلب چلیں؟'' عکس نے اس سے کہا۔

''I'm at your disposal'' شیر دل نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جواباً قدم بڑھاتے ہوئے مسکرائی۔

''Then you would be disposed off soon'' شیر دل اس کی بات پر بے اختیار ہنسا۔

''وہ تو تم نے سالوں پہلے کر دیا۔ dumped...discarded'' شیر دل نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اسے جتایا۔

''گالف کلب چلتے ہیں۔'' بات کو اس نے اسی مہارت سے بدلا تھا جس کی توقع شیر دل کو تھی۔

''شہر بانو کیسی ہے؟'' گالف کلب کے ریسٹورنٹ کی گلاس ونڈوز کے پاس پڑی ایک ٹیبل پر اپنی نشست سنبھالتے ہی عکس نے اس سے پوچھا۔

''بڑے خراب موڈ میں ہے آج کل۔'' شیر دل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟...... کیا ہوا......؟'' وہ بھی مسکرائی۔

''میرا خیال ہے میں وجہ ہوں۔'' شیر دل نے سگریٹ کا پیک کھولا اور بڑی سنجیدگی سے کہتے ہوئے ایک سگریٹ نکالا۔

''ہاں وہ تو میں جانتی ہوں تم ہی وجہ ہو گے...... مگر اس بار کیا کیا ہے تم نے۔'' عکس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس بارے کیا مراد ہے تمہاری۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے ٹھٹکا۔ "پہلے کیا کرتا رہا ہوں میں؟"

"میں تمہاری Biography (سوانح) نہیں لکھ رہی۔" عکس نے اطمینان سے کہا۔ وہ ہنسا۔

"یار میرا خیال ہے اگر میری طلاق ہوئی تو اس میں ایک بنیادی رول چیف کا ہوگا۔" وہ اب سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بے حد سنجیدگی اور جیسے کچھ تشویش سے کہہ رہا تھا۔ عکس کو ہنسی آ گئی۔ اس کا اشارہ چیف کمشنر کی طرف تھا جو ڈویژن کے ڈی سی اوز کو چرکی کی طرح گھمانے میں کمالِ شہرت رکھتا تھا...... وہ خود Workaholic تھا اور اس کو بعض دفعہ آدھی رات کو کوئی فائل چیک کرتے ہوئے کوئی بھی ڈی سی او یاد آ جاتا تھا اور جو اسے آدھی رات کو یاد آ جاتا وہ فجر تک اپنی جان اس سے چھڑا نہیں پاتا تھا۔ این ڈی لطیف اپنا کام آفس میں کر کے آتا تھا اور باقیوں کا کام اپنے گھر میں نبٹاتا تھا اور وہ بھی بے حد فرصت سے۔ ڈی ایم جی کے سینئر آفیسرز میں بہت کم این ڈی لطیف کی طرح 18 گھنٹے کام کرنے کا اسٹیمنا رکھتے تھے اور وہ جس ڈویژن میں بھی ہوتا اس کے ماتحتوں کی جان حلق میں اٹکی رہتی اور آج کل شاید شیر دل اس کی توجہ کا خاص مرکز تھا اور اس کی وجہ اس کے ڈسٹرکٹ میں شروع ہونے والے بڑے بڑے پروجیکٹس تھے۔

"تم ہنس سکتی ہو کیونکہ I think the chief has a crush on you" شیر دل نے اس کی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے بتانے کی دانستہ کوشش کی۔ عکس نے ایک دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے پڑے ہوئے گلاس میں پانی انڈیلنا شروع کر دیا۔ وہ شیر دل کی اس بکواس کی عادی تھی اور آج کی میٹنگ میں عکس کے علاوہ شیر دل سمیت تمام DCO's اپنے اپنے حصے کی کافی بے عزتی سمیٹے بیٹھے تھے...... اور اس "جھاڑ پونچھ" کے بعد شیر دل سے وہ اسی طرح کے ردِ عمل کی توقع کر رہی تھی۔

"تم مجھے شہر بانو کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔" عکس نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے اس کی کوششوں پر جیسے پانی ڈالتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس سے پہلے میں تمہیں چیف کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔" شیر دل نے بات کو پھر وہیں لے جاتے ہوئے کہا۔ "چیف تمہیں پسند کرنے لگا ہے شاید۔" وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"شاید نہیں یقیناً...... تمہیں اس سے کوئی پرابلم ہے کیا؟" وہ بری طرح لاجواب ہوا تھا۔

"نہیں ہونی چاہیے کیا؟" اس نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔

"بالکل نہیں ہونی چاہیے۔" عکس نے ترکی بہ ترکی کہا اور ساتھ ہی اسے کھانسی آئی اور پھر وہ کھانستی ہی چلی گئی۔

"کیا ہوا یار؟" شیر دل نے اس کا گلاس اٹھا کر اسے تھمانے کی کوشش کی۔

"یہ تمہارے سگریٹ کا کمال ہے۔" عکس نے بہ مشکل اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ شیر دل نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی طرف دیکھا۔

"کیوں سگریٹ نے کیا کیا ہے؟" وہ قدرے حیران ہوا اس سے پہلے اس کی اسموکنگ نے کبھی عکس کی یہ حالت نہیں کی تھی۔

"Asthma ہے مجھے۔" عکس نے پانی کا ایک اور گھونٹ لیا۔

"ارے یہ کب سے؟" شیر دل نے چونک کر بے اختیار سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھاتے ہوئے کہا۔

"امریکا کی سوغات ہے۔" وہ مسکرائی۔ "اور تم جو چیف کے بارے میں بکواس کرتے رہتے ہو نا سیما اگر ان تک پہنچ گئی تو دن میں تارے دکھا دیں گے وہ تمہیں۔" عکس نے جیسے اسے تنبیہ کی۔

"یار آدھی رات کو کال کر دیتے ہیں...... میری ساری رات آج کل فون پر چیف کے ساتھ ہی گزر رہی ہے۔" شیر دل واقعی تنگ آیا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے اصلی crush ان کا آج کل تم پر ہے۔" عکس نے مسکراتے ہوئے اسے tease کیا۔

"شہر بانو کہتی ہے میں مستقبل کا این ڈی لطیف ہوں۔" شیر دل نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"یعنی تم چیف کا ماضی ہو؟" عکس مسکرائی۔ "اگر چیف تمہارے جیسے ہینڈسم ہوتے تو ان کا لائف اسٹائل تمہارے جیسا ہی ہوتا، پھر تو ان کے پاس رات چھوڑ دن کو بھی کام کرنے کا وقت نہ ہوتا۔" شیر دل نے ایک بار پھر اس کے چوٹ کرتے جملے کو نظر انداز کیا۔

"اس دن فون پر کس کے ساتھ بات کر رہی تھیں تم؟" شیر دل نے اس کے تبصرے کے جواب میں وہ سوال کیا جو اتنے دنوں سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ عکس نے بے اختیار گہری سانس لی۔

"اس ایک سوال کے لیے کتنی لمبی تمہید باندھی تم نے، میرے ساتھ چائے پیتے آ گئے، گھما پھرا کر ادھر ادھر کی باتیں کیں، سیدھا سیدھا اسی دن کیوں نہیں پوچھ لیا تم نے...... اتنا لمبا صبر اور انتظار...... That's so unlike you Sherdil...... کیسے گزار لیے تم نے اتنے دن اس بے چینی کے ساتھ کہ میں کس سے بات کر رہی تھی اس دن...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کس کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔" اس نے مونو سیکنڈ میں شیر دل کا مدعا جانا تھا اور اسی رفتار سے شیر دل کی گفتگو کو مذاق اڑاتے ہوئے ادھیڑا تھا۔ شیر دل نے اس عورت کے ہاتھوں شرمندہ ہو کر برا منانا بہت پہلے چھوڑ دیا تھا...... فائدہ نہیں تھا خواہ مخواہ اس کی باتوں کو دل سے لگانے کا۔

"اچھا تو پھر کون تھا وہ؟" شیر دل نے اسی ڈھٹائی کے ساتھ پوچھا۔

"پیرنٹس آئے ہوئے ہیں آج کل میرے، ساری فیملی ہے یہاں۔ تمہارا کیا خیال تھا...... کون ہوگا؟" شیر دل ہی کی طرح عکس نے بھی اس کے ان الٹے سیدھے سوالوں اور باتوں کا برا منانا اکیڈمی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اسے کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ شیر دل بے اختیار مسکرایا۔

"اوہ پیرنٹس آئے ہوئے ہیں...... گریٹ۔" عکس کے سوال کو اس نے بھی اسی طرح گول کیا تھا مگر کیا اطمینان تھا جو اس نے محسوس کیا تھا۔

"لیکن تمہاری فیملی کیوں آئی ہوئی ہے یہاں......؟" شیر دل کو مسکراتے ہوئے یک دم خیال آیا۔

"مجھ سے ملنے...... میں دو سال پاکستان سے باہر رہی ہوں وہ تو ہر سال آتے ہیں یہاں...... اس بار میری وجہ سے کچھ جلدی آ گئے ورنہ دسمبر میں آتے۔" عکس نے تفصیل سے بتایا۔ ویٹر اب انہیں کافی اور اسنیکس سرو کر رہا تھا۔

"تمہارے اسٹیٹس میں کوئی تبدیلی ہوئی؟" ویٹر کے جانے کے بعد کیک کے ایک سلائس کو کاٹ کر اٹھاتے ہوئے شیر دل نے اس سے وہ سوال کیا جو وہ بہت عرصے سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" کیک کا ٹکڑا شیر دل کو یک دم کڑوا لگا۔

"مطلب؟" وہ کیک کا دوسرا ٹکڑا اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔

"تم یہ کیوں چاہتے ہو شیر دل کہ میں تمہیں اپنی ہر پرسنل بات بتایا کروں۔ یہ بھی بتاؤں کہ میری فلاں شخص سے منگنی یا شادی ہونے والی ہے یا ہو رہی ہے...... یا......" شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"So you are seeing some one these days?"

"اگر تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ اس کے بعد اس ایشو کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے تو میں تمہیں اس سوال کا جواب دوں گی۔" عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"او کے...... اب بتاؤ۔" شیر دل نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں۔" اس نے بھی فوراً ہی جواب دیا۔

"بیچ میٹ ہے ہمارا کوئی؟" شیر دل بے اختیار ٹیبل پر کچھ آگے جھک آیا۔

"تم نے کیا وعدہ کیا ہے ابھی؟" عکس نے کچھ خفگی سے کہا۔

"میں تمہارے بارے میں نہیں اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" وہ بھی اتنا ہی سنجیدہ تھا۔

"تمہیں کیا کرنا ہے اس کے بارے میں کچھ بھی جان کر؟"

"اور تم کیوں اس کو مجھ سے چھپا رہی ہو؟" اس نے ترکی بہ ترکی عکس سے کہا۔ وہ بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"جب تمہیں شادی کا کارڈ ملے گا تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ کون ہے وہ......"

"میں شادی کے کارڈ پرنٹ ہونے سے بہت پہلے تمہیں بتا دوں گا کہ کون ہے وہ......" شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

"میں نے شہر بانو کے بارے میں تم سے کچھ پوچھا تھا؟" عکس نے بے حد خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

"میں نے خود تمہیں سب کچھ بتا دیا تھا...... چھپایا کیا تھا؟" وہ لاجواب ہو گئی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا وہ واقعی اس سے کبھی کچھ نہیں چھپاتا تھا...... کم از کم عکس کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے شیر دل سے کچھ بھی پوچھا ہو اور اس کو جواب دینے میں تامل رہا ہو۔ وہ چند لمحے یہی سوچتی رہی تھی۔

"بیچ میٹ ہے ہمارا کوئی؟" شیر دل نے اسے خاموش دیکھ کر پھر کہا۔

"نہیں۔" اس بار عکس نے کسی اعتراض کے بغیر کہا۔

"سول سرونٹ ہے؟"

"نہیں۔"

"اوہ......" شیر دل نے بے اختیار کہا۔

"گورنمنٹ سروس میں نہیں ہے۔" شیر دل کو اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ دلچسپی ہوئی۔

"نہیں۔"

"تو......؟" وہ جواب دینے میں ایک بار پھر متامل نظر آئی شیر دل کو اس سوال کا جواب دینے کا مطلب

کیا تھا وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کی زندگی کی بہت ساری fantasies کو ختم کرنے کا باعث بنتا رہا تھا...... اپنی نیک نیتی کے باوجود...... اور اس سے معلومات کے تبادلے کا مطلب عکس کو خائف کر رہا تھا۔ شیر دل بے حد تحمل سے اس کے سامنے بیٹھا کافی پیتا ہوا اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ وہ سالوں بعد مل رہے ہیں...... درمیان میں بہت کچھ آیا تھا اور بہت کچھ ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ایک ملاقات میں ہی وہ ایک بار پھر یوں شیر و شکر ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور یہ ان کے تعلق کا حیران کن پہلو تھا۔ وقت، فاصلہ، اختلافات، کوئی چیز ان کے باہمی تعلق اور ذہنی ہم آہنگی کو ختم نہیں کر پائی تھی۔ وہ جب بھی ملتے تھے بے حد کوشش کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ بہت دیر تک ریزرو اور فارمل نہیں رہ پاتے تھے۔ بات شروع کرتے اور پھر بات سے بات نکلتی جاتی۔ کون سی چیز ذاتی ہونے کی وجہ سے دوسرے کے لیے قابلِ مداخلت نہیں تھی انہیں یہ بھی بھول جاتا...... ان کے لیے جیسے ایک دوسرے کی ذات اور زندگی میں کوئی نو گو ایریا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم شیر دل ایسا ہی سمجھتا اور محسوس کرتا تھا اور اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔ کافی کے ایک کپ سے شروع ہونے والی گفتگو چند منٹوں میں کہاں پہنچ گئی تھی۔ دونوں کو وہاں آنے سے پہلے اندازہ بھی نہیں تھا۔ عکس اب پچھتا رہی تھی اسے شیر دل کی آفر قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ شیر دل نے کافی کا مگ خالی کر کے ٹیبل پر رکھا اور پھر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"وہ جو اس دن میں نے جس مرد کی آواز سنی تھی وہ یقیناً یہی صاحب ہوں گے اور اپنی فیملی کے ساتھ تمہارے گھر پر تھے وہ۔" شیر دل کے ذہن کو صرف وہ Psychic کی طرح نہیں پڑھتی تھی، وہ بھی اس کی ہر بات اور ارادے کو ڈی کوڈ کرنے میں ماہر تھا۔ چھپاتے تو ایک دوسرے سے کیا چھپاتے وہ...... اور کس طرح......؟ صرف ایک صورت تھی اگر اندھے اور گونگے بن کر بیٹھ جاتے دونوں تو...... اور یہ ان دونوں کے لیے ہی ممکن نہیں تھا۔ عکس نے بھی بالآخر اپنی کافی ختم کر لی۔

"منگنی ہوئی ہے یا شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے؟" شیر دل یوں اطمینان سے پوچھ رہا تھا جیسے اسے اپنے تکّے کے تیر ہونے کا الہامی یقین ہو۔

"وہ صرف ہمارے گھر آئے تھے...... دونوں فیملیز ایک دوسرے سے ملیں اور بس...... اور کچھ فائنل نہیں ہوا ابھی۔" عکس نے مزید کچھ چھپانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اسے بتایا۔

"اور کون ہیں یہ موصوف؟" شیر دل نے کانٹے کے ساتھ کڑوے کیک کا ایک اور ٹکڑا اٹھایا۔

"میرے ساتھ امریکا میں ہی تھا، بوسٹن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے اس سال اس نے ماس کمیونیکیشنز میں...... پولیٹیکل فیملی سے تعلق ہے اس کا...... اور اس کے فادر پارلیمنٹیرین ہیں...... اور اب تم مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے بارے میں کچھ ایسی معلومات دینا کہ مجھے اس کی شکل دیکھنے میں بھی دلچسپی نہ رہے۔" بے حد سنجیدگی سے کہے گئے آخری جملے پر شیر دل کو بے اختیار ہنسی آئی تھی لیکن عکس کو نہیں...... وہ جانتا تھا کہ عکس کا اشارہ کس طرف تھا...... غنی حمید کی طرف...... اور ان تمام مردوں کی طرف جنہیں ماضی میں وقتاً فوقتاً عکس شادی کی نیت سے کنسیڈر کرتی رہی اور شیر دل ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی چیز ان لوگوں کے حوالے سے اس کے سامنے پیش کرتا رہا کہ وہ کچھ دیر کیا لیے سکتے میں آ جاتی۔ شیر دل جیسے فیملی بیک گراؤنڈ اور پہنچ کے ساتھ کسی کا کچا چٹھا

نکال کر پیش کر دینا دومنٹ کا کام تھا لیکن ان دومنٹوں کی محنت کا نتیجہ عکس کے کئی ہفتوں کے خوابوں کا دھڑن تختہ کر دیتے تھے۔ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ شیر دل کی معلومات اسے بہت سارے غلط فیصلوں اور غلط انتخاب سے بچاتی رہی تھیں، وہ کم از کم اس ایشو پر شیر دل کی اس پروا ئیکٹو سروس سے خوش نہیں تھی۔

''وہ تو میں تب کروں گا نا جب تم مجھے اس لڑکے اور اس کے والد صاحب کے نام بتانے کی زحمت بھی کرو گی۔'' شیر دل نے بڑے اطمینان سے اس سے کہا۔ یوں جیسے عکس خود اسے اپنی مدد کے لیے کہہ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر کے لیے دیکھتے رہے پھر عکس نے کہا۔

''احسان ملہی کا بیٹا ہے..... جواد ملہی۔'' شیر دل نے فوری طور پر ردِعمل نہیں دیا۔ عکس کچھ دیر جیسے اس کے ردِعمل کی منتظر رہی۔

''تم کچھ نہیں کہو گے اس کے بارے میں؟'' اس نے بالآخر شیر دل سے خود پوچھا۔

''تم اسے پسند کرتی ہو؟'' شیر دل نے غیر متوقع سوال کیا۔

''نہیں، میں نے اسے بھائی بنایا ہوا ہے۔''

''نہیں، بھائی تو تم نے مجھے بنایا ہوا ہے۔'' اس کی بے حد سنجیدگی سے کہی ہوئی بات پر عکس کو بری طرح ہنسی آئی۔ وہ اس کے اس طنز کا Context بھی سمجھ گئی تھی۔

''وہ اچھا ہے..... پولیٹیکل بیک گراؤنڈ کے باوجود بہت سوبر اور ڈیسنٹ ہے.....'' عکس نے شیر دل کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے پہلے سوال کا جواب دیا۔

''لاہور کے چھچھورے ترین خاندانوں میں سے ایک یہ خاندان بھی ہے..... If I remember correctly تو جواد ملہی احسان ملہی کی دوسری بیوی سے ہے..... ایک ہی بیٹا ہے اس کا دوسری بیوی سے..... پہلی بیوی سے شاید چار پانچ بیٹے ہیں۔'' شیر دل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اسے احسان ملہی کے خاندان کا تعارف دیا۔ عکس کو حیرت نہیں ہوئی۔ لاہور کی کوئی ایسی نامور فیملی نہیں تھی جس سے شیر دل واقف نہیں تھا اور یہ کوئی ایسی حیرانی والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ اور اس کی فیملی جس سوشل سرکل میں موو کرتے ہیں وہاں ہر ایک کسی نہ کسی کو کسی نہ کسی کے حوالے سے جانتا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے انکشافات سنتی رہی۔

''ڈاکٹریٹ تو کر لیا اس نے..... اب آگے کیا کر رہا ہے یہ؟ امریکا میں سیٹل ہوگا کیا.....؟'' شیر دل نے بات کرتے کرتے اچانک اس سے پوچھا۔

''نہیں یہاں فیملی بزنس ہے، اسی کو سنبھالے گا۔'' عکس نے بتایا۔

''اور ملہی فیملی کے بزنس کے حوالے سے آپس میں ہی بہت سارے جھگڑے چل رہے ہیں..... میں اس حوالے سے زیادہ نہیں جانتا لیکن تم چاہو تو پتا کر کے بتا سکتا ہوں۔'' شیر دل نے کہا۔

''تھینک یو ویری مچ..... میرا نہیں خیال اس کی ضرورت ہے۔'' عکس نے بے حد سنجیدگی سے اس کی آفر ٹھکرائی۔ شیر دل مسکرایا۔

''ویسے تمہارا خیال ہے کہ تم کسی پولیٹیکل فیملی میں ایڈجسٹ کر لوگی؟ I don't think so'' شیر دل نے اپنے سوال کا جواب اس کے منہ کھولنے سے پہلے خود ہی دے دیا۔

''جواد بہت اچھا لڑکا ہے۔'' عکس نے بے اختیار اس کا دفاع کیا۔ ''میری اور اس کی بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے، مجھے نہیں لگتا زیادہ مسئلہ ہوگا۔''

''مجھے یقین ہے وہ بہت اچھا ہوگا لیکن تم پھر بھی بہت جلدی مت کرو..... تھوڑا سوچ لو۔'' شیر دل نے سنجیدگی سے کہا۔

''دو سال سے سوچ رہی ہوں۔'' عکس نے بے اختیار کہا۔

''اوہ تو دو سال سے اس لیے مجھ سے ہر طرح کا رابطہ ختم کر کے بیٹھی ہوئی تھیں۔'' شیر دل نے عجیب جتانے والے انداز میں کہا۔

''بزی تھی بہت۔'' عکس نے اسے دیکھے بغیر کہا۔

''Obviously..... وہ تو میں جان ہی گیا ہوں کہ اسٹڈیز کے علاوہ کس چیز نے تمہیں وہاں مصروف رکھا ہے۔'' شیر دل طنز کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ عکس نے ایک بار پھر بڑے تحمل سے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''واٹر سپلائی پروجیکٹ کی فزیبلٹی رپورٹ ذرا شیئر کر لینا مجھ سے۔'' اس نے بات کا موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی اور شیر دل نے اس کی اس کوشش کو کامیاب ہونے دیا۔ وہ دونوں اب اپنے پروفیشنل معاملات ڈسکس کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

باربی ڈول اپنے باپ کی گود میں چڑھی اسے مسلسل اس فنکشن کی تفصیلات سنانے میں لگی ہوئی تھی جو وہ فیملی کے ساتھ ویک اینڈ پر اٹینڈ کر کے آئی تھی۔ اس کا باپ مسلسل ہوں، ہاں کے ساتھ اس کے سوالوں کے جوابات دے رہا تھا لیکن وہ باربی ڈول سے ہمیشہ کی طرح وہ سب نہیں پوچھ رہا تھا جو وہ پوچھتا تھا۔ باربی ڈول نے اس کی الجھن بھری خاموشی نوٹس نہیں کی تھی، یہ اس کی بیوی نے کی تھی اور رات سونے سے پہلے اس نے اپنے شوہر سے اس کے رویے کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی۔ ''تم کچھ پریشان ہو؟'' وہ اس کے سوال پر ایک کتاب پڑھتے پڑھتے چونک گیا۔

''نہیں تو..... کیوں؟''

''بس ایسے ہی..... تم بہت پریشان اور الجھے ہوئے لگ رہے ہو جب سے میں واپس آئی ہوں۔''

''وہم ہے تمہارا۔'' اس کے شوہر نے بے ساختہ کہا اور دوبارہ کتاب پڑھنے لگا۔

''نہیں کچھ نہ کچھ تو ہے..... تم شیئر نہیں کرنا چاہتے تو اور بات ہے۔'' اس نے شوہر کے جواب کو قبول نہیں کیا تھا۔

''یار بس آفس کے کچھ پرابلمز کی وجہ سے ٹینس ہوں شاید اس لیے ایسا لگ رہا ہے تمہیں۔'' اس نے اس بار مسکرا کر اپنی بیوی کو وضاحت دینے کی کوشش کی۔

''آفس تو ہمیشہ ٹینشن کا باعث ہے تمہارے لیے..... پھر اب کیا ہوگیا؟'' اس کی بیوی نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کام بہت ہے آج کل آفس میں۔'' اس نے بیوی کو ایک گہرا سانس لے کر دیکھا۔

''اتنا کام ہوگیا کہ تمہارے پاس میرے یا اپنی بیٹی سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں رہا۔'' اس کی بیوی نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پاس ہی تو ہوتا ہوں ہر وقت..... جیسے ابھی۔'' اس نے جیسے اپنی بیوی کی تشویش کم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں ہوتو تم پاس ہی لیکن پتا نہیں کہاں پہنچے ہوئے ہو، پچھلے چند دنوں سے۔'' اس بار اس کے شوہر نے کتاب کو دوبارہ کھول لیا۔ وہ جیسے اس سے اور اس ٹاپک سے مکمل طور پر بچنا چاہتا تھا۔

''اور یہ خیر دین کہاں چلا گیا ہے؟'' شوہر سے بات کرتے کرتے اسے یک دم گھر کا سب سے اہم ایشو یاد آیا۔ کتاب پر اس کے شوہر کی گرفت کچھ اور سخت ہوگئی۔

''خیر دین کو نکال دیا ہے میں نے۔'' ایک صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے بیوی کو دیکھے بغیر کہا۔ بعض باتوں پر کسی سے بھی نظریں ملانا مشکل ہو جاتا ہے خاص طور پر اس شخص سے جو آپ کی زندگی کا ساتھی ہو، آپ سے اندھی محبت کرتا ہو اور آپ کی ہر بات پر آمنا وصدقنا کہہ کر یقین کرنے کا عادی ہو۔

''نکال دیا؟'' وہ بری طرح چونکی۔ ''کیوں؟'' خیر دین جیسے خانساماں کو ملازمت سے نکال دینا اور وہ بھی اس طرح اچانک کسی وارننگ کے یا اس کو بتائے بغیر..... وہ حیران نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔ وہ آج تک جہاں جہاں پوسٹڈ رہے تھے اور جن جن ملازمین سے ان کا واسطہ پڑتا رہا تھا ان میں خیر دین بلاشبہ سب سے بہترین تھا اور اس حقیقت کو انہوں نے پہلے چند دنوں میں ہی تسلیم کر لیا تھا۔

''چوری کی تھی اس نے۔'' اس کے شوہر نے کتاب کا ایک اور صفحہ پلٹا۔ وہ اب بھی اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا۔

''خیر دین نے؟'' اس کو جیسے شوہر کی بات پر کرنٹ لگ گیا۔

''ہاں.....''

''کیا چرایا تھا اس نے؟'' وہ اب بھی یقین نہیں کر پا رہی تھی۔

''چرا لیتا اگر میں اچانک بیڈروم میں نہ آ جاتا..... تمہاری جیولری نکال کر بیٹھا ہوا تھا۔'' کتاب کے صفحے اب بہت رفتار سے پڑھے جا رہے تھے۔

وہ بے یقینی سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اپنے شوہر کو دیکھتی رہی۔ کتاب پر نظریں جمائے ہوئے بھی اس نے بہت بری طرح سے خیر دین کے لیے بیوی کی زبان سے لعنت و ملامت سننے کی خواہش کی تھی، یہ جیسے ایک تصدیق ہوتی کہ اس کی بیوی نے اس کی بات کا ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یقین کر لیا ہے مگر بیوی خاموش تھی اور جب وہ اگلے کئی منٹ تک خاموش ہی رہی تو اسے کتاب سے نظریں ہٹانی پڑیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''Impossible۔'' وہ کم از کم یہ لفظ اپنی بیوی کے منہ سے سننے کا خواہش مند نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بے ساختہ گردن نفی میں ہلا رہی تھی۔

''Impossible والی کیا بات ہے اس میں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ تند و تیز ہو گیا۔ ''نوکر تو نوکر ہوتے ہیں..... کبھی بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں..... ہم ان پر اعتماد تو نہیں کر سکتے..... چاہے وہ کتنے بھی اچھے کیوں نہ ہوں۔'' وہ خیر دین کے لیے بیوی کی پسندیدگی سے واقف تھا۔ ''مجھے بھی تمہاری ہی طرح شاک لگا تھا لیکن میں اگر اچانک بیڈروم میں نہ آ جاتا تو تمہاری جیولری غائب ہو چکی ہوتی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میری تھوڑی بہت رقم اِدھر سے اُدھر ہوتی رہی..... میں نے تم سے ذکر نہیں کیا لیکن میں محتاط ہو گیا تھا بہت۔ خیر دین تو شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ تم لوگ گھر میں نہیں ہو..... میں رات گئے اسٹڈی میں بیٹھا رہتا ہوں تو وہ بڑے اطمینان سے جیولری کا صفایا کر دے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔'' اس نے اتنی لمبی بات کیوں کی تھی اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید یہ اس کی بیوی کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات تھے جن کو ختم کرنے کی ایک desperate کوشش تھی جو وہ کر رہا تھا یا پھر یہ اس کی اپنی آواز کا کھوکھلا پن تھا جس کی بازگشت سے بچنے کے لیے اسے مسلسل بولنا پڑ رہا تھا۔

وہ بات ختم کر کے چند لمحے بیوی کو دیکھتا رہا پھر جیسے اس نے کچھ بے بس ہو کر کہا۔ ''تم اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟..... میں جانتا ہوں خیر دین بہت اچھا کک تھا But you just don't worry...... ایک آدھ ہفتے میں اس سے بھی اچھا کک مل جائے گا تمہیں..... میں نے ایک دو لوگوں کو بتایا ہے تب تک جمشید سے کام چلاؤ......'' اس نے کچن میں خیر دین کے مددگار کا نام لیا اور دوبارہ کتاب کھول لی۔

''میری جیولری بیڈروم میں نہیں تھی۔'' وہ چند لمحوں کے لیے ہل نہیں سکا، آئینہ دیکھے بغیر بھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ اس وقت زرد ہوگا۔ سر اٹھا کر اس نے اپنی بیوی کو دیکھا جس کے چہرے پر بے یقینی اور الجھن اب بھی ویسے کی ویسی تھی۔

''بیڈروم میں نہیں تھی تو کہاں تھی؟'' اس نے خود کو نارمل دکھانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس تھی..... میں ساتھ لے کے گئی تھی۔''

اس کا رنگ اب زرد سے یقیناً سفید پڑا ہوگا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہا تھا..... کم از کم یہ جھوٹ بولنے سے پہلے اسے ایک بار الماری میں جیولری کی موجودگی کو ضرور کنفرم کر لینا چاہیے تھا۔

''میرا خیال ہے خیر دین کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے تمہیں.....'' اس نے بالآخر اپنی بیوی کو کہتے سنا۔

''شاید جیولری اسے الماری میں نہیں ملی اسی لیے اتنی دیر لگ گئی اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ورنہ وہ تو میرے آنے سے بہت پہلے تمہاری جیولری نکال کر غائب ہو جاتا۔'' وہ اپنی بیوی کو یہ موقع نہیں دے سکتا تھا کہ وہ خیر دین کو بے گناہ سمجھے۔

''میں کمرے میں آیا تو وہ الماری اور دراز کھولے کھڑا تھا۔ میں تو یہی سمجھا کہ تمہاری جیولری نکال رہا ہے، یہ تو بہت اچھا ہوا کہ وہ وہاں تھی ہی نہیں تم ساتھ لے گئیں.....'' بات کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ایک بار پھر اسے بے یقینی کے انہی تاثرات کے ساتھ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی، اب کیا تھا؟ اس نے جیسے کراہتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔ وہ اتنا برا جھوٹ بولنے والا تو نہیں تھا کہ وہ اس پر یقین ہی نہ کر پاتی۔

''الماری اور دراز کی چابیاں تو میرے پاس تھیں..... خیر دین نے انہیں کیسے کھول لیا؟'' چند لمحوں کے لیے اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے چہرے کا رنگ اب کیسا ہو گیا ہوگا یا کوئی رنگ اب رہا ہی نہیں تھا۔

اس نے اپنے آپ کو پھر کوسا۔ وہ DMG کے قابل ترین آفیسرز میں سے تھا اور اس نے خیر دین کے

خلاف چارج شیٹ تیار کرتے ہوئے اپنی تقریباً ڈیڑھ سال کی ٹریننگ کے تقریباً ہر اصول کو نظر انداز کیا تھا...... ”جھوٹ کو دلائل اور ثبوتوں کے ساتھ پیش کریں۔“ اسے اکیڈمی میں وہ مزاحیہ ڈیبیٹ یاد آئی جو اس نے جیتی تھی...... سچا جھوٹ بولنے کے سو کارآمد طریقے...... ہر خیالی پلاؤ پر ڈالنے کے لیے اصلی قورمہ تیار کریں۔

اسے اکیڈمی کے ایک انسٹرکٹر کا Proverb یاد آیا۔

”یقیناً اس نے بنوالی ہوں گی چابیاں...... یہ کون سا مشکل کام ہے...... یا پھر کسی اور چابی سے کھول لی ہوگی...... کوئی پہلی بار تو چوری نہیں کر رہا ہوگا وہ کہ بغیر تیاری کے کرے گا۔“ کتاب کے صفحے ایک بار پھر برق رفتاری سے پلٹے جانے لگے...... اس کی بیوی نے اس کی اس بات کے جواب میں بھی کچھ نہیں کہا اور اس کی اس خاموشی نے جیسے اس کی جان حلق میں اٹکا دی تھی۔ ان کی شادی کے تمام سالوں میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کی بیوی نے کبھی اس کے ساتھ اس طرح کے معاملات پر سوال جواب کیے ہوں، وہ اپنے شوہر کی رائے اور ہر بات کو جوں کا توں قبول کرنے کی عادی تھی۔ یہ اپنے شوہر پر اندھا اعتماد کی سنہری مثال تھی اور ایسا اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ اپنے شوہر سے دیوانہ وار محبت کرتی تھی، یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی کسی بات پر یقین کرنے میں وہ جذبات اثر انداز نہ ہوتے۔

”میں سونے جا رہا ہوں...... بہت تھک گیا ہوں......“ اس نے اپنی بیوی کی خاموشی سے جیسے کچھ خائف ہوتے ہوئے وہاں سے اٹھنے میں عافیت جانی۔ پتا نہیں اس کی خاموشی میں اب مزید کون سا سوال یا اعتراض چھپا ہوتا جو اسے لاجواب اور جھوٹا ثابت کر دیتا۔

اور اس کا یہ اندازہ اور خدشہ ٹھیک تھا۔ شوہر کے بستر پر جا کر لیٹنے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھی رہی تھی۔ وہ اس کے جہیز کی لکڑی کی الماری تھی جس کی ایک دراز میں وہ جیولری رکھتی تھی۔ الماری کا ایک حصہ وارڈ روب پر مشتمل تھا مگر وہاں پر بہت قیمتی کپڑے لٹکے ہوتے تھے۔ ایسے ملبوسات جو وہ عام طور پر بہت بڑے لیول کے فیملی یا دوسرے فنکشنز میں استعمال کرتی تھی۔ ان کے اپنے بیڈ روم میں پرانے زمانے کی طرز کی ایک وارڈ روب دیوار میں موجود تھی اور اس کے اور شوہر کے روزمرہ کے ملبوسات اسی میں ہوتے تھے اور وہ وارڈ روب کھلی رہتی تھی۔ خیر دین خود ہی اس وارڈ روب میں اس کے اور اس کے شوہر کے ملبوسات پریس کرنے کے بعد لٹکا دیتا تھا...... اور ایسا کئی بار اس کی عدم موجودگی میں بھی ہوتا تھا اور وہ وارڈ روب خیر دین کے لیے ممنوعہ چیز نہیں تھی...... لیکن اس کا شوہر یہ کہہ رہا تھا کہ خیر دین وہ الماری کھولے کھڑا تھا جس میں اس کی جیولری تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ویک اینڈ شہر سے باہر گزارنے کے بعد واپس آنے پر اس نے اپنی الماری اور دراز کو اسی طرح لاکڈ پایا تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اگر خیر دین نے انہیں توڑ پھوڑ کر کھولا تھا تو وہ اسے کھلے ہی ملنے چاہیے تھے اور اگر وہ کسی چابی سے کھولے گئے تھے تو خیر دین کے کھلی الماری اور دراز کے پاس پکڑے جانے کی صورت میں اسے انہیں دوبارہ لاک کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس صورت میں بھی اس کی الماری کو کھلا ہونا چاہیے تھا...... اور اگر انہیں بعد میں اس کے شوہر نے لاک کیا تھا تو پھر اس کے شوہر کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ شاید اس نے چابیاں بنوالی ہوں گی اور ان کے ساتھ کھولا ہوگا۔

اس کے شوہر کے بیان میں تضادات تھے لیکن اس کے لیے یہ بات پریشان کن نہیں تھی۔ پریشانی اسے

اپنے شوہر کے گھبرانے سے ہو رہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے شوہر کو کنفیوزڈ دیکھا تھا۔ اس کا شوہر اگر اسے جھوٹ کے اس پلندے کے بغیر سیدھا سیدھا کوئی وجہ بتائے بغیر یہ کہہ دیتا کہ اس نے خیر دین کو نوکری سے نکال دیا ہے تو اسے شاید اس طرح کی عجیب فیلنگز کا احساس نہ ہوتا جو اب ہو رہا تھا۔ کچھ غلط تھا...... مگر کہاں......؟ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ مسئلہ اس کے شوہر کی سائیڈ پر تھا خیر دین کی سائیڈ پر نہیں...... اور عقل یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ جو کچھ اس کا شوہر کہہ رہا تھا وہ ٹھیک تھا۔ وہ رات گئے تک بے مقصد بیٹھی رہی تھی پھر سونے سے پہلے اس نے پتا نہیں کیا خیال آنے پر ایک بار اٹھ کر الماری اور دراز چیک کیے جن کے حوالے سے اس کے شوہر نے خیر دین پر اتنے سنگین الزامات لگائے تھے۔ وہاں کسی لاک کو زبردستی کھولنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دراز میں اس کی چیزیں جوں کی توں موجود تھیں جس طرح اور جس ترتیب سے وہ رکھا کرتی تھی۔

اس رات اسے نیند مشکل سے آئی تھی۔ اگلی صبح اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان خیر دین کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر نے جیسے سکون کا سانس لیا تھا لیکن شوہر کے گھر سے جانے کے بعد اس نے جمشید سے خیر دین کے بارے میں سوال کیا اور اس وقت اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ گھر کے تمام ملازم کچھ عجیب سے طریقے سے ری ایکٹ کر رہے تھے۔ خیر دین کے نام پر وہ سب جیسے گونگے ہو جاتے تھے یا ان کے چہروں پر عجیب سی ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔ جمشید وہ پہلا ملازم تھا جس سے اس نے خیر دین کے بارے میں پوچھا تھا۔ جواب عجیب رٹے رٹائے انداز میں ملا تھا۔

”وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔“ جواب اس سے مختلف تھا جو اس کے شوہر نے دیا تھا۔ وہ کھٹکی لیکن اس نے نظر انداز کر دیا۔

”کہاں چلا گیا؟“

”گاؤں۔“ جمشید اس سے نظریں ملائے بغیر میکانیکی انداز میں بول رہا تھا یوں جیسے وہ کوئی روبوٹ تھا اور پھر اگلے دو تین دن میں اس نے خیر دین کے نام پر گھر کے تمام ملازموں کو روبوٹ بنتے دیکھا تھا۔ وہ الجھنے اور چڑنے لگی تھی ان کے اس ایک جیسے ردعمل سے۔ وہ جیسے کسی تھیٹر کے ایکسٹراز تھے جو اپنی لائنز کو بے حد ناقص اور بھونڈے انداز میں ادا کر کے اپنے رول کو مضحکہ خیز بناتے ہوئے audience سے نوٹس ہو رہے تھے۔ داد تو خیر کیا لیتے...... وہ ہوٹنگ کے مستحق بھی نہیں ہو پا رہے تھے۔

وہ چند دن سے زیادہ خیر دین کا معما سمجھنے کی کوشش نہیں کر سکی۔ اس کی نند اپنے بچوں کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر واپس جا رہی تھی اور اس کا بیٹا ایبک پچھلے کئی دن سے بری طرح بخار میں پھنک رہا تھا۔ اگلے چند دن ایبک کو ہاسپٹلائز کرنا پڑا اور خیر دین کی پراسرار گمشدگی بڑے آرام سے پس پشت چلی گئی۔ ایبک اس کے شوہر کو بہت عزیز تھا یہ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ایبک کی بیماری اس کے شوہر کو اس طرح اپ سیٹ کرے گی۔ اس نے اپنے شوہر کو اپنی بیٹی کی چھوٹی موٹی بیماریوں پر اس طرح پریشان دیکھا تھا یا وہ اب اسے ایبک کی بیماری پر پریشان دیکھ رہی تھی۔ ایبک بیماری کے دوران بے حد چڑچڑا ہو گیا تھا خاص طور پر اسے شیر دل کے ساتھ ایبک کے رویے کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے انکل کو دیکھتے ہی بے وجہ ضد کرتا، بدتمیزی کرتا یا رونے لگتا اور اس کا شوہر جیسے اسے بہلانے کی ہر کوشش میں بری طرح ناکام ہو رہا تھا۔ وہ شاندار

چھٹیاں جو شروع میں اس کے لیے بے حد خوشگوار اور یادگار تھیں اب آخری دنوں میں ایبک کی بیماری اور اس کے رونے کی وجہ سے جیسے مستقل ٹینشن کا ایک ذریعہ بن گئی تھیں۔ اس کی نند کے پاس اب اس کے ساتھ آؤٹنگ یا شاپنگ کا ٹائم نہیں تھا۔ اس کی مکمل توجہ اپنے بیٹے کی صحت یابی کی طرف تھی اور انہی حالات میں جب اسپتال میں ایبک کی حالت کچھ بہتر ہونے پر اس کی نند نے واپس لاہور جانے کا فیصلہ کیا تو اس نے جیسے سکون کی سانس لی۔ نند اور اس کی فیملی کے ساتھ بے حد دوستی ہونے کے باوجود وہ اب گھر میں ہونے والی اس مستقل تیمارداری سے بیزار ہونے لگی تھی جو گھر آنے کے بعد اس کے شوہر کا بچا کھچا وقت بھی لے لیتی تھی۔

انہی دنوں میں باربی ڈول نے چند بار اس سے چڑیا کا پوچھا۔ وہ اتنے دن سے چڑیا کو کہیں نہ دیکھنے پر جیسے کچھ تجسس کا شکار تھی۔ اصل تشویش شاید اسے لالی پاپس اور کینڈیز کی اس سپلائی کے بند ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی جو پہلے چڑیا کی وجہ سے باقاعدگی سے جاری تھی۔

"چڑیا یہاں سے چلی گئی ہے۔" اس نے باربی ڈول کے استفسار پر اسے بتایا۔

"کہاں چلی گئی ہے؟" باربی ڈول بری طرح حیران ہوئی تھی۔ اسے یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ چڑیا اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور کیسے چلی گئی تھی۔

"وہ اپنے نانا کے ساتھ اپنے گاؤں چلی گئی۔" اس نے باربی ڈول کے سوالوں کے جواب میں مختصراً کہا۔

"کیوں؟" باربی ڈول پریشان ہوئی۔

"وہاں ان کا گھر ہے...... وہ اب وہاں رہیں گے۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"ہمارے جتنا بڑا گھر ہے؟" باربی ڈول نے کچھ دیر خاموش رہ کر جیسے کچھ بے قراری کے عالم میں ماں سے کہا۔

"شاید......" ماں نے کچھ گول مول سا جواب دیا۔

"اب وہ کبھی یہاں نہیں آئے گی؟" باربی ڈول نے ایک بار پھر سے بے قرار ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔" اس بار اس نے دوٹوک جواب دیا۔

"اور اسکول بھی نہیں؟" باربی ڈول کو مزید تشویش ہوئی۔

"اسکول تو آئے شاید۔" اس نے چند لمحے سوچ کر باربی ڈول کو تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی۔

"او کے......" باربی ڈول بے ساختہ مطمئن ہوئی۔ یعنی چڑیا سے ملاقات کے امکانات ابھی باقی تھے۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کے بعد باربی ڈول نے اسکول جانا دوبارہ شروع کیا۔ چڑیا سے دوبارہ ملاقات کی خواہش جیسے اسکول جانے میں اس کی بنیادی دلچسپی کی وجہ بن گئی تھی۔ پہلے دن اسکول میں وہ متلاشی نظروں سے بریک ٹائم میں چڑیا کو ڈھونڈتی رہی۔ اس سے پہلے پورا دن ہر بار کلاس روم کے دروازے کے سامنے سے کسی کے گزرنے پر وہ بے اختیار دروازے کو اس مسکراتے ہوئے چہرے کے نظر آنے کی امید میں دیکھتی رہی تھی۔ وہ بہت اداس پہلے دن اسکول سے واپس آئی تھی۔ اگلے دو دن چڑیا کا انتظار کرنے کے بعد وہ چوتھے دن خود چڑیا کی کلاس میں چلی گئی تھی۔

"وہ تو اسکول ہی نہیں آ رہی۔" اس کی ایک فرینڈ نے باربی ڈول کو دیکھنے پر اسے بتایا اور ساتھ ہی اس سے پوچھا۔ "وہ بیمار ہے کیا؟"

باربی ڈول کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی فرینڈ کے سوالات کا کیا جواب دے۔ چڑیا تو واقعی اس کے گھر میں تھی، اسے پتا ہونا چاہیے تھا اس کے بارے میں۔

"وہ گاؤں چلی گئی ہے۔" اس نے سوچ سوچ کر اس کی فرینڈ کو وہ وجہ بتائی جو اس کی ممی نے بتائی تھی اور وہاں سے آ گئی۔

ایک ہفتہ گزرنے کے بعد چڑیا کی کلاس ٹیچر اس کے پاس آئی تھیں اور انہوں نے ایک وارننگ لیٹر اس کی ڈائری میں چڑیا کو دینے کے لیے اسٹیپل کر دیا تھا۔ وہ ایک ہفتے سے اسکول سے بغیر اطلاع اور بغیر ایپلیکیشن کے غائب تھی۔ کچھ دن اور گزر جاتے تو اسکول سے اس کا نام کاٹ دیا جاتا۔ اسکول کے پاس چڑیا سے رابطے کا واحد ذریعہ باربی ڈول تھی کیونکہ چڑیا اور باربی ڈول کا ہوم ایڈریس ایک ہی تھا۔

چڑیا کی کلاس ٹیچر کو اپنی کلاس کی سب سے برائٹ بچّی کے یوں اچانک غائب ہونے پر بے حد تشویش تھی۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اسکول سے چھٹی نہیں کی تھی...... بغیر اطلاع چھٹی کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ باربی ڈول سے چڑیا کے بارے میں سوالات کرتی رہیں اور اس کے یہ بتانے پر کہ چڑیا گاؤں چلی گئی وہ گاؤں میں اس کا ایڈریس پوچھنے کی کوشش کرتی رہیں۔

اس دن شام کو ہوم ورک کے لیے بیگ کھولتے ہوئے اس کی ممی نے اس کی ڈائری میں چڑیا کو اسکول کی طرف سے ملنے والا وہ وارننگ لیٹر دیکھا جو DC ہاؤس کے پوسٹل ایڈریس پر بھیجا جاتا اگر باربی ڈول خود اسکول نہ جا رہی ہوتی۔ خیر دین کے دیے ہوئے فون نمبر پر رابطہ کرنے پر یقیناً اسکول کلرک کو کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا اور خاطر خواہ جواب ملتا بھی کیسے۔ DC ہاؤس کا آپریٹر چڑیا کے اسکول سے آنے والی ایک کال پر خیر دین کے بارے میں انہیں کتنی تفصیلات دے سکتا تھا۔ خاص طور پر جب گھر کا ہر ملازم اندر کی کہانی سے واقف تھا لیکن خاموش تھا تو آپریٹر کے پاس بھی یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خیر دین جاب چھوڑ گیا تھا۔

وہ بہت دیر تک اس وارننگ لیٹر کے میٹر کو پڑھتی رہی۔ الجھنوں کی اس ڈوری میں ایک گرہ اور لگی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خیر دین کتنے شوق اور محنت سے چڑیا کو پڑھا رہا تھا اور وہ اس بات سے بھی واقف تھی کہ اس کی تعلیم کے اخراجات وہاں سے پوسٹ آؤٹ ہونے والے ایک پرانے آفیسر اور اس کی بیوی اٹھا رہے تھے...... اور وہ اس بات سے بھی آگاہ تھی کہ چڑیا ایک آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھی۔ وہ جتنی بار بھی باربی ڈول کے لیے اسکول جا کر سسٹر ایگنس سے ملی تھی ہر بار اس نے ان سے چڑیا کے قصیدے سنے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس بچی کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھنے لگی تھیں۔ کئی بار اندر بیٹھے ہوئے اس نے چڑیا کو لان میں باربی ڈول کے ساتھ نرسری rhymes گاتے ہوئے سنا۔ اس کی آواز اور لب و لہجہ اتنا خوب صورت اور عمدہ تھے کہ وہ بہت بار اس کی rhymes سننے بیٹھ جاتی تھی اور باقی رہی سہی کسر باربی ڈول کے سنائے ہوئے قصوں نے پوری کر دی تھی۔ ایبک کی ماں کے برعکس چڑیا کے بارے میں یہ سب کچھ جان لینے کے بعد اس نے باربی ڈول کو کبھی اس کے ساتھ کھیلنے سے روکا نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اسے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ

وہ بچی خود ہی ان لوگوں کے سامنے باربی ڈول یا دوسرے بچوں کے قریب آنے سے اجتناب کرتی تھی اور اب بیٹھے بٹھائے اس بچی کا اس طرح غائب ہو جانا اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔

''خیر دین کی نواسی نے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے کیا؟ آدھے گھنٹے بعد اپنے شوہر کے گھر آنے پر اس نے چڑیا کے وارننگ لیٹر کا تذکرہ اس کے سامنے چھیڑا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر پہلے ہی شام کی چائے پینے کے لیے بیٹھے تھے۔ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بری طرح بدکا۔

''خیر دین کی نواسی کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟'' وہ اپنے شوہر کے جواب پر جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ یقیناً وہ اپنے سوال کے جواب میں اپنے شوہر کے منہ سے یہ جواب سننے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

''میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ کا اس سے کوئی تعلق ہے...... میں تو صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ اسکول نہیں جا رہی۔'' اس نے دوبارہ اپنا سوال دہراتے ہوئے کہا لیکن اس بار اس نے سوال کو اطلاع بنا کر پیش کیا تھا۔

''اس کا اسکول جانا نہ جانا ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔'' اس بار اس کے شوہر نے کچھ بہتر جواب دیا تھا۔

''چڑیا کی کلاس ٹیچر نے اس کا وارننگ لیٹر ہماری بیٹی کو دیا ہے۔'' سرسری انداز میں یہ اطلاع اپنے شوہر کو دیتے ہوئے اگر اسے اپنے شوہر کے ردِ عمل کا اندازہ ہوتا تو وہ شاید ایسی اطلاع اسے دیتے ہوئے سو بار سوچتی۔

''کیا مطلب؟ انہوں نے اس کا وارننگ لیٹر میری بیٹی کے ذریعے بھجوایا ہے۔'' اس کے شوہر نے چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔ how dare they......انہیں ایک آفیسر اور نوکر کے بچے میں کوئی فرق نظر نہیں آیا......ان کی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ وہ میری بیٹی سے آکر ایک نوکر کی بچی کے حوالے سے بات بھی کرتے۔'' اس نے زندگی میں اپنے شوہر کو کبھی اس طرح اتنی معمولی سی بات پر اتنا غضبناک نہیں دیکھا تھا۔

''وہ ہمارے سرونٹ کوارٹرز میں رہ رہی ہے تو شاید اس لیے انہوں نے پوچھ لیا...... یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے......'' اس نے بے حد حیرانی کے عالم میں اپنے شوہر کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بری طرح ناکام ہوئی تھی۔ شیر دل نے چند منٹوں کے اندر آپریٹر سے باربی ڈول کے اسکول کی پرنسپل سے بات کروانے کا کہا تھا۔

''تم اوور ری ایکٹ کر رہے ہو۔'' اس نے اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''میں اوور ری ایکٹ کر رہا ہوں......؟'' وہ اس پر الٹ پڑا تھا۔

''میں اسے اس لیے شہر کے مہنگے ترین اسکول میں پڑھا رہا ہوں کہ وہ نوکروں کے بچوں کے لیے مینیجر کا کام کرے...... وہ اتنی فیس لیتے ہیں انہوں نے ڈائریکٹ خیر دین کو اپروچ کیوں نہیں کیا...... اس کے پوسٹل ایڈریس پر ڈائریکٹ کانٹیکٹ کرتے، میری بیٹی سے انہوں نے اس طرح کا کام کیوں کروایا۔'' وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ غصے میں اس طرح آؤٹ آف کنٹرول کیوں ہو رہا تھا...... کیا یہ کسی اور مسئلے کی وجہ سے تھا......؟ کسی آفس کی ٹینشن کی وجہ سے......؟ یا پھر وہ مسئلہ واقعی اتنا بڑا تھا کہ اس پر اس طرح ہنگامہ کیا جاتا۔ وہ جس وقت فون پر سسٹر ایگنس کے ساتھ بدزبانی کر رہا تھا وہ اس وقت بھی اسے اسی طرح بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ اگر اسے یہ پتا ہوتا کہ وہ اسکول کی پرنسپل سے اس طرح بات کرنے والا تھا تو وہ اسے کبھی ان سے بات

کرنے نہ دیتی۔ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ سسٹر ایگنس نے اسے جواباً کیا کہا تھا لیکن اسے اس کی گفتگو سے یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ اس کے انداز گفتگو کو بے حد ناپسند کر رہی تھیں اور انہوں نے ایک پوائنٹ پر آکر کال بند کر دی تھی۔ اس کے شوہر کی انا پر یہ جیسے ایک اور کاری ضرب تھی وہ اس شہر کا ڈپٹی کمشنر تھا...... جس کا مطلب اس معاشرے میں بادشاہ کا ہوتا تھا اور ایک معمولی نن نے DC کی کال ڈسکنیکٹ کرنے کی جرات دکھائی تھی...... یہ بے عزتی سی بے عزتی تھی۔ وہ بار بار آپریٹر کو دوبارہ کال ملانے کے لیے کہتا رہا اور آپریٹر اسے بار بار یہ اطلاع دیتا رہا کہ کانوینٹ کے رہائشی حصے سے اس کی کال اٹینڈ نہیں کی جا رہی اور اس تمام عرصے کے درمیان وہ بار بار اپنے شوہر کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ اسی طرح غضبناک رہا تھا اور اس کا یہ رویہ اس کے لیے شرمندگی کا باعث بن رہا تھا۔ وہ جس بیک گراؤنڈ سے تھی وہاں استاد اور تعلیم و تدریس سے متعلقہ لوگوں کی بے حد عزت کی جاتی تھی خود اس نے اپنے شوہر اور اس کی فیملی کو اس حوالے سے بے حد تمیز و تہذیب والا پایا تھا اور اب ایک چھوٹی سی بات پر وہ جیسے ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ اس سارے argument کے بعد چائے اسی طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اس کی بیوی ایک عجیب مخمصے کا شکار وہاں بیٹھی رہ گئی تھی۔

رات تک وہ نارمل ہو چکا تھا اور اس نے دوبارہ فی الحال اپنے شوہر کے ساتھ یہ معاملہ ڈسکس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ خیر دین اور اس سے متعلقہ ہر چیز سے فی الحال بری طرح چڑا ہوا تھا اور اس کے بات کرنے پر پھر اوور ری ایکٹ کر سکتا تھا۔

''پاپا اسکول آئے تھے......'' باربی ڈول نے اگلی شام ہوم ورک کرتے ہوئے ماں کو اطلاع دی...... وہ بری طرح چونک گئی۔

''اسکول آئے تھے...... پاپا؟'' وہ بری طرح حیران ہوئی تھی۔ اس کا شوہر کم از کم صبح ناشتے کی ٹیبل پر ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کر کے گیا تھا۔

''Yes'' باربی ڈول کلرنگ بک میں کلر کرنے میں مصروف رہی۔

''تم اسکول گئے تھے؟'' وہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے شوہر کے گھر آتے ہی اس سے کسی مسئلے پر

باز پرس شروع کر دی تھی۔

"ہاں......" وہ ٹھٹکا اور پھر اس نے بغیر کسی تامل کے کہا۔

"کس لیے؟" وہ بے حد سنجیدگی سے اپنے شوہر کو دیکھتی رہی جو اپنی ٹائی اتارنے کے بعد اب کوٹ اتار رہا تھا۔

"مسٹر سے بات کرنی تھی مجھے۔" اس نے مختصراً کہا۔

"چڑیا کے بارے میں؟ اس نے بے اختیار کہا۔ وہ بری طرح جھنجلایا۔

"تمہارے لیے کیوں ضروری ہے کہ تم ہر بات پر مجھ سے انٹیروگیٹ کرو؟" وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے اس طرح بات کر رہا تھا۔ ان دونوں کی لو میرج ایک مثالی شادی سمجھی جاتی تھی اور ان کا کپل ایک آئیڈیل کپل...... وہ دیوانہ وار ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے تھے...... اور اس رشتے میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے ایک سوال پر وہ اسے اس طرح کی بات کہتا جس طرح کی بات اس نے کہی تھی۔

"میں ایک سوال کر رہی ہوں...... انٹیروگیٹ کیوں کروں گی؟" اس نے جواباً جز بز ہوتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔

"تم سوال بھی مت کرو۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تم مسٹر ایلکس سے کوئی جھگڑا تو نہیں کر کے آئے؟" اس نے اس کی بات پر Argue کرنے کے بجائے اس سے اس بات کے بارے میں پوچھا جس کے حوالے سے اسے تشویش تھی۔

"نہیں۔" اس نے آنکھیں ملائے بغیر اپنی بیوی سے جھوٹ بولا۔ اس سے سچ بولنے کا مطلب گھر میں ایک نئے جھگڑے کا آغاز تھا۔

"Thank God میں سوچ رہی تھی تم مسٹر ایلکس کے ساتھ جھگڑا کرنے گئے تھے۔"

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔"

"ہاں لیکن تم بعض دفعہ بہت عجیب سی ایکٹ کرتے ہو۔" وہ چند لمحے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا پھر وہ بے حد خاموشی سے واش روم چلا گیا۔

باربی ڈول آہستہ آہستہ چڑیا کو بھولتی گئی تھی۔ اس کے باپ کے اسکول کے چکر کے بعد دوبارہ کبھی کسی نے باربی ڈول سے چڑیا کا ذکر نہیں کیا تھا...... صرف چڑیا کی کچھ فرینڈز تھیں جو باربی ڈول سے وقتاً فوقتاً چڑیا کے بارے میں پوچھتی رہتیں...... لیکن آہستہ آہستہ ان کے سوال بھی ختم ہوتے گئے تھے۔ چڑیا بہت خاموشی سے ان سب کی زندگی سے نکل گئی تھی۔

☆☆☆

عکس اور شیر دل کا اکیڈمی میں پہلا آمنا سامنا ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے تقریباً ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ عکس لائبریری میں کوئی کتاب ایشو کروانے کے لیے کھڑی تھی اور شیر دل کوئی کتاب واپس کروانے کے لیے کچھ دیر پہلے ہی لائبریری آیا تھا۔ لائبریرین کا ڈیسک خالی تھا۔

"ہیلو۔" شیر دل نے عکس کے ساتھ رسمی ہیلو ہائے کا تبادلہ کیا جو اُن کے درمیان اب تک ہونے والی واحد گفتگو رہی تھی۔ اور پھر وہ خاموشی سے خود بھی لائبریرین کے انتظار میں ڈیسک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ پہلا موقع تھا جب وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے اور دونوں کو ہی بہت جلدی تھی ورنہ شاید وہ دونوں وہاں کھڑے لائبریرین کا انتظار کرنے کے بجائے لائبریری میں گھوم پھر کر کوئی اور کتاب دیکھ لیتے۔

تقریباً پانچ منٹ ایک دوسرے کے برابر بے وقوفوں کی طرح کھڑے رہنے کے بعد شیر دل نے بالآخر عکس کی طرف مڑ کر کہا۔

"یہ ڈیسک کب سے خالی ہے؟" عکس اس کے سوال پر چونکی۔

"آ...... جب سے میں یہاں کھڑی ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لیے ہڑبڑائی اور پھر شیر دل نے کہا۔

"اور آپ یہاں کب سے کھڑی ہیں؟" وہ پہلا موقع تھا جب شیر دل کو اتنے قریب سے عکس مراد علی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی اسکن انفیکشن ختم ہو چکی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے شیر دل کو اندازہ ہوا کہ وہ اتنی ان اٹریکٹو نہیں تھی جتنا وہ اسے سمجھ رہا تھا۔

"آپ کے آنے سے چند منٹ پہلے ہی آ کر کھڑی ہوئی ہوں میں۔" عکس نے کہا۔

"بہت زیادتی ہے یہ تو پندرہ منٹ ہو گئے ہیں۔" شیر دل نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں؟ لائبریری کا سارا اسٹاف ہی غائب ہو گیا ہے۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آپ نے کتاب ریٹرن کروانی ہے؟" عکس نے اس سے کہا۔

"ہاں...... اور صرف اتنے سے کام کے لیے بھی آدھا گھنٹا ہو گیا ہے مجھے۔" شیر دل نے اسے جواب دیا۔ عکس نے مسکراتے ہوئے ان ساتھ منٹوں کو پہلے پندرہ اور اب آدھے گھنٹے میں تبدیل ہوتے سنا۔

"آپ مجھے دے دیں کتاب...... میں ریٹرن کروا دوں گی جب اسٹاف میں سے کوئی آئے گا۔" شیر دل نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بڑے شستہ انداز میں اسے آفر کر رہی تھی، ایک غیر متوقع آفر۔ وہ چند لمحوں کے لیے حیران ہوا پھر اس نے کہا۔

"تھینک یو...... آپ کو جلدی نہیں ہے کیا؟"

"بہت زیادہ جلدی نہیں ہے۔" وہ مسکرائی تھی، وہ بھی مسکرا دیا۔ برف پگھلنے لگی تھی۔ شیر دل نے اپنی کتاب اس کے پاس کاؤنٹر پر چھوڑ دی اور خود وہاں سے چلا گیا۔

عکس سے اس کی دوسری ملاقات ایک ویک اینڈ اکیڈمی کے گراؤنڈ میں صبح سویرے جوگنگ کے دوران ہوئی تھی۔ ان کے بہت کم بیچ میٹ چھٹی کے دن سورج کے نکلنے سے بھی پہلے اس طرح کی کسی جسمانی سرگرمی میں مصروف پائے جاتے تھے۔ شیر دل نشے کی حد تک رننگ اور جوگنگ کا عادی تھا اور عکس صبح سویرے طلوع آفتاب کو دیکھنے اور اس وقت چہل قدمی کی۔ شیر دل اس کو اکثر رننگ کے دوران وہاں دیکھا کرتا تھا لیکن عام دنوں میں اس وقت کچھ دوسرے کامنرز بھی وہاں پائے جاتے تھے اور شیر دل کو پہلے کبھی موقع ملا بھی تو اسے عکس کو مخاطب کرنے میں دلچسپی نہیں تھی...... لیکن لائبریری والے واقعے کے بعد اس نے پہلی بار رننگ کے دوران عکس کو اکیلے دیکھا تھا اور وہ اس کو دیکھتے ہوئے رک گیا تھا۔

"بہت ہمت ہے آپ کی سنڈے کو بھی نکلی ہوئی ہیں۔" شیر دل نے اس کے قریب رکتے ہوئے علیک سلیک کے بعد کہا۔

"آپ سے کم ہی ہے ہمت...... میں تو صرف ہلکی پھلکی چہل قدمی کے لیے نکلی ہوں...... آپ کی طرح ڈھائی تین میل کی رننگ تو نہیں کرتی سنڈے کو۔" شیر دل نے بے حد حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا وہ واقعی ڈھائی تین میل رننگ کیا کرتا تھا اور عکس کے منہ سے یہ بات اسے بے حد حیران کن لگی تھی۔ یہ تبھی ہو سکتا تھا جب وہ اسے ٹریک کے چکر لگاتے باقاعدگی سے دیکھتی رہی ہو۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں یک دم شاید اتنی حیرانی آئی تھی کہ عکس بھی پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں......" شیر دل نے مسکراتے ہوئے ٹالا۔

"چلیں پھر آپ چہل قدمی کریں اور میں اپنے تین میل پورے کرتا ہوں۔" اس نے رننگ دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے عکس سے کہا۔ چند منٹوں کے بعد ٹریک کے بینڈ پر اس نے اپنے عقب میں عکس کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ حیران رہ گیا تھا، وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو سکتی تھی۔ اس کے چلنے کی رفتار اتنی زیادہ تو نہیں تھی کہ وہ منٹوں میں وہاں سے اپنے ہاسٹل پہنچ جاتی...... باقی رننگ کرتے ہوئے وہ مسلسل اس جگہ پر عکس کو کھوجتا رہا جہاں وہ اس سے ملا تھا لیکن وہ اسے نظر نہیں آئی اور پھر اچانک اس نے اسے ایک درخت کے ساتھ پشت ٹکائے کھڑے دیکھا تھا وہ اب ٹریک پر اسی طرف تھا جس طرف وہ پہلے عکس سے مل چکا تھا۔ ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا اسے جیسے عکس کو ڈھونڈ لینے پر۔ رننگ کرتے ہوئے وہ وقتاً فوقتاً نظریں اٹھا کر اس کو دیکھتا رہا وہ اسی طرح درخت کے ساتھ ٹکی کھڑی تھی۔ ٹریک پر اس کی طرف بڑھتے ہوئے شیر دل کو احساس ہوا کہ وہ کچھ دور کسی چیز کو دیکھنے میں مگن تھی۔ اس نے بھاگتے بھاگتے عکس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ ٹریک کے بالمقابل روش کے دوسری طرف نظر آنے والے لان کی ایک باڑ کے پاس بلی اپنے کچھ بچے لیے پھر رہی تھی۔ شیر دل نے ٹریک پر بھاگتے ہوئے اس سے بات کرنے کی شدید خواہش کے باوجود بھی اس درخت کو کراس کیا جس کی دوسری طرف وہ کھڑی تھی۔

"میں ڈراپ کردوں آپ کو؟" ایک ہفتے کے بعد ان کی تیسری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی ایک ویک اینڈ تھا۔ سہ پہر کے قریب شیر دل اپنے گھر کا ایک چکر لگانے کے لیے نکلا تھا جب اس نے اکیڈمی کے داخلی دروازے کی طرف جاتی ہوئی عکس کو دیکھا۔ اس نے گاڑی روک کر اسے آفر کی۔

"نہیں تھینک یو...." اس نے انکار کیا۔

"او کے....." شیر دل نے اصرار نہیں کیا۔ وہ شاید اس انکار کے بارے میں سوچتا تک نہیں اگر اکیڈمی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بیک ویو مرر میں وہ مجتبیٰ فرقان کی گاڑی کو اس کے قریب آ کر رکتے اور اسے اس کی گاڑی میں بیٹھتے نہ دیکھ لیتا۔ خفگی کا ایک شدید احساس تھا جو اسے ہوا تھا۔ اس کے لیے شیر دل کے ساتھ جانا قابلِ قبول نہیں تھا مجتبیٰ کی گاڑی میں جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ عکس سے ایک بار پھر بری طرح چڑا تھا وہ۔

"اکیڈمی کی سب سے خوب صورت لڑکی عالیہ نعیم اور سب سے hot لڑکی عکس ہے۔" وہ اس رات میس میں بیٹھا چند دوسرے کامنرز کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا جب ان کی ساتھی لڑکیوں کا ذکر شروع ہوا اور نافع نے تبصرہ کیا۔ شیر دل کو جیسے کرنٹ لگا تھا...... اور اس کرنٹ کی وولٹیج میں اس وقت کچھ اور اضافہ ہوا جب اس نے وہاں بیٹھے باقی تینوں کامنرز کو بھی نافع سے متفق پایا۔ عالیہ نعیم کو بیوٹی کوئین ماننے میں اسے بھی تامل نہیں تھا لیکن عکس کو ہاٹیسٹ وومین ماننے میں اسے تذبذب تھا۔

"عکس سب سے ہاٹ ہے؟ کم آن۔" اس نے جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"تو تمہیں کون ہاٹ لگتی ہے؟" نافع نے جواباً اس سے کہا۔ شیر دل نے دومنٹ میں اپنے کامنرز کی تمام لڑکیوں کی اسکریننگ کی اور پھر غیر محسوس طور پر وہ عکس کے نام پر آ کر رکا۔

"ہاٹ" وہ اب بھی جیسے کچھ نہ ماننے والے انداز میں اس کو the most wanted وومین کے معیار پر پرکھ رہا تھا۔ اور بالکل اس لیے عکس مراد علی نے میس میں قدم رکھا تھا اور اکیڈمی میں کئی ہفتے گزارنے کے بعد اس دن پہلی بار شیر دل کو پتا چلا کہ عکس اپنے کامن میں پاپولر نہیں تھی؛ وہ اس کامن کے تمام لڑکوں میں پاپولر تھی اور اس کی وجہ اس کی پہلی پوزیشن سے بڑھ کر بھی کچھ تھی۔ نافع اگر کہہ رہا تھا کہ اس کی فگر وہاں موجود لڑکیوں میں سب سے اچھی تھی تو وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شیر دل نے اتنے ہفتوں میں پہلی بار اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو کچھ بھی پہن لیتیں ان پر اچھا لگتا تھا...... کامن کی کچھ دوسری لڑکیوں کی طرح وہ میک اپ زدہ نہیں تھی۔ ہلکے شیڈز کی ایک لپ اسٹک اور بڑے نفاست سے پن اپ کیے ہوئے شانوں سے کچھ نیچے تک جاتے گھنے بال جو اسٹیپس میں کٹے ہوئے تھے اور جنہیں وہ صرف وہاں سوشل ایوننگز میں کھلے رکھتی تھی...... اس کا سنگھار تھی اور یہ اس کی شاندار فگر تھی جو اسے باقی تمام لڑکیوں میں غیر محسوس طور پر ممتاز کیے ہوئے تھی...... اس دن وہاں بیٹھے ہوئے شیر دل کو پہلی بار اسے دیکھتے دوسرے لڑکے عجیب انداز میں جچھے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ عکس مراد علی کے حوالے سے اس طرح کی فیلنگز وہاں موجود تقریباً ہر اس لڑکے کی تھیں جو پہلے سے کہیں انٹرسٹڈ نہیں تھا۔

باقی آئندہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزمین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔ تزمین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لومیرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دے دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط وضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایبک نظر آتا ہے۔ ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرواتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیر دل کے کولیگ فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے، عکس سے پہلا تعارف شیر دل کا پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیر دل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایبک کی مما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایبک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرے تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شیر دل عکس کو فون کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اس کی عکس سے بات اور ملاقات کب ہوئی تھی، شہر بانو سے منگنی کے بعد اس کو پتا چلا تھا کہ عکس کی غنی سے شادی متوقع ہے۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیر دل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایبک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میلٹنگ چیس دکھائے لیکن ایبک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ شیر دل نے عکس مراد علی کو اکیڈمی میں ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے ایک ہفتے بعد دیکھا اور کچھ دنوں میں اسے لگا کہ عکس مراد علی کامن کی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلدل کا ٹائٹل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

عکس نے گاڑی سے اترتے ہوئے سر اٹھا کر اس آئینے کو دیکھا جو اس گھر کے برآمدے میں دروازے کے پاس رکھا تھا اور جس میں اس وقت شیر دل اور شہر بانو کی پشت نظر آ رہی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ کمشنر اور اس کی بیوی کا استقبال کر رہے تھے جن کی گاڑی اس وقت پورچ میں داخل برآمدے کے بالکل سامنے کھڑی تھی، خود اس کی گاڑی پورچ کی چھت سے باہر تھی۔ نظریں آئینے سے ہٹا کر اس نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں سے ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پانی کی ہلکی پھوار نے اس کے چہرے، بالوں اور لباس کو ذرا سا نم کیا اور برآمدے میں کمشنر اور اس کی بیوی سے ملتے ہوئے شیر دل نے بالکل اس لمحے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ سیاہ موتیوں سے ایمبرائڈرڈ ایک فٹنگ والا سیاہ شیفون کا لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے متناسب جسم کو کچھ اور بھی متناسب کر رہا تھا۔ عام طور پر کھلے رہنے والے گھنے سیاہ بال اس وقت ایک سیاہ نیٹ میں ڈھیلے جوڑے کی شکل میں اس کی گردن کے پیچھے سمٹے اس کی پتلی اور لمبی گردن کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ دائیں کندھے پر اسٹول کی شکل میں تہ شدہ دوپٹا ڈالے وہ بائیں ہاتھ میں ایک بہت چھوٹا اور خوب صورت سیاہ پرس پکڑے ہوئے تھی۔ شیر دل نے اس سے نظریں ہٹائیں مشکل کام تھا یہ اور اس نے مشکل سے ہی کیا۔ وہ کمشنر اور ان کی فیملی کے ساتھ آئی تھی اس لیے کمشنر اور ان کی بیوی گاڑی سے اتر کر سیدھا اندر جانے کے بجائے چند لمحوں کے لیے وہیں برآمدے میں رک گئے تھے۔ کمشنر کا استقبال کرنے کے بعد شیر دل برآمدے سے نکل کر اس کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کی طرف جاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس نے اپنی جیب میں پڑا ٹشو پیپر ٹٹولا تھا۔

ڈرائیور سے کچھ کہتے ہوئے عکس جب تک پلٹی وہ اس کے سامنے تھا۔ دونوں بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ بلیک ڈنر سوٹ کے ساتھ ایک سرخ Striped ٹائی لگائے، سلور کف لنکس اور ٹائی پر ایک کرسٹل کی ٹائی پن لگائے وہ اپنے اس حلیے میں اس کے سامنے کھڑا تھا جو اس کی ایک وجہ شہرت تھی۔ اکیڈمی میں کوئی اور کامنر اپنی ڈریسنگ سینس میں شیر دل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ عکس مراد علی نے اپنے اتنے سال کی سروس میں بھی شیر دل سے زیادہ خوش لباس مرد نہیں دیکھا تھا۔

عکس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ ستائشی نظروں سے شیر دل کو دیکھا۔ ہوا کے ایک جھونکے نے شیر دل کی ٹائی کو اڑایا۔ عکس کی نظر بھٹکی۔ اس کی ٹائی کو بے اختیار اڑنے سے روک دینے کی خواہش کو اس نے اتنی ہی بے اختیاری کے ساتھ دبایا جس طرح وہ ابھری تھی۔

دونوں کے درمیان اب خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہی رسمی جملے...... اور وہی ان کہے مفہوم......

وہ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بات کر رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے شیر دل کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے پر موجود کون سی شے کس کو ماند کر رہی تھی۔ اس کے کانوں کی لوؤں میں دمکتے سفید موتیوں کے studs اس کی شفاف چمکدار سیاہ آئی لائنز سے سجی آنکھوں کو یا اس کی آنکھیں سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں سے جھلکتی دودھیا دانتوں کی قطار کو جو اس کی مسکراہٹ کو اور بھی دلکش کر رہی تھی۔ بارش کی پھوار کے ننھے ننھے قطرے اوس کے قطروں کی طرح اس کے بالوں اور چہرے پر چمک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے شیر دل کا دل چاہا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کر دے...... صرف ایک لمحے کے لیے پھر اس نے نظر چرائی تھی...... جیب سے ایک ٹشو نکال کر غیر محسوس انداز میں عکس کی طرف بڑھاتے ہوئے شیر دل نے کہا۔

''تم نے بڑا رسک لیا۔'' عکس نے کسی سوال کے بغیر وہ ٹشو تھام کر اسی غیر محسوس انداز میں چہرہ اور سر تھپتھپاتے ہوئے کچھ حیرانی سے اس سے پوچھا۔

”کیا؟“ وہ دونوں اب ساتھ چل رہے تھے۔
”بارش میں گاڑی سے نکل آئیں۔“ قدم بڑھاتے ہوئے شیر دل نے کچھ سنجیدگی سے کہا۔
”تو؟“ وہ الجھی۔
”اگر میک اپ بہہ جاتا تو؟“ اس بار شیر دل کے ہونٹوں اور آنکھوں میں شرارت لہرائی تھی یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ایک سیاہ آئی لائنر اور لپ اسٹک کے سوا شاید ہی کچھ لگائے ہوئے تھی۔
”ہاں رسک تو تھا، میک اپ صاف ہوجاتا تو تم اس سے زیادہ گھورتے مجھے...... جتنا ابھی گھور رہے تھے۔“ عکس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو کو بڑی نفاست سے لپیٹ کر پرس میں بے نیازی سے رکھتے ہوئے کہا۔ جواب ویسا ہی آیا تھا جیسا سوال کیا تھا۔ اسے دیکھے بغیر شیر دل نے بے اختیار سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ وہ باقی لوگوں کے قریب پہنچ چکے تھے اور وہ اسے جواباً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔
کمشنر کی بیوی کے ساتھ بات کرتی شہر بانو عکس کے استقبال کے لیے چند قدم آگے بڑھ آئی تھی۔
”شہر بانو...... عکس مراد علی......“ ایک لفظ میں شیر دل نے باری باری دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ دونوں ناموں کے ساتھ کوئی سیاق وسباق نہیں تھا پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو اس سے کہیں زیادہ جانتی تھیں جتنا شیر دل نے ان کا تعارف کروایا تھا۔
سفید شیفون کے کلیوں والے کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں شہر بانو ایک باربی ڈول لگ رہی تھی۔ دودھیا رنگت، سیاہ لمبی خمدار پلکیں، ننھی سی نوک والی تیکھی ناک اور بے حد باریک مسکراتے ہونٹ۔ عکس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی تھی اس کو دیکھ کر۔ شیر دل کو اس سے زیادہ پرفیکٹ لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ واقعی صرف شیر دل کے ساتھ سجتی تھی۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے عکس نے سوچا تھا۔
شہر بانو نے اس سے پہلے عکس مراد علی کا نام سنا تھا یا اس کو شیر دل کی گروپ فوٹو گرافس میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ لاکھ غور کرنے کے باوجود بھی اس کی شکل وصورت اور حلیے میں وہ خاص چیز کھوجنے میں ناکام رہی تھی جو اس کے ذہن میں کسی خدشے یا اندیشے کو جنم دیتی لیکن آج اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ عکس مراد علی سے بری طرح خائف ہوئی کیوں ہوئی؟ یہ اسے کئی دن سمجھ نہیں آیا۔ نہ اسے شیر دل سے کوئی خدشہ تھا نہ عکس مراد علی اس حسن وجمال کی مالک تھی جس سے اسے کوئی احساسِ کمتری ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود اسے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ عکس مراد علی کو نظر انداز کرنا بے حد مشکل تھا اور اس کو پسند نہ کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔
برآمدے کی انٹرنس پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ دونوں شہر بانو کو کسی فوٹو فریم کا حصہ لگے تھے۔ ایک پرفیکٹ پکچر، دراز قد، اٹریکٹو، پُراعتماد، اسمارٹ...... سیاہ لباس میں ملبوس وہ ایک ایسا کپل لگے تھے جو گھر سے نکلتے ہوئے پرفیکٹ میچنگ کرکے آئے تھے۔ کوئی بھی ایک نظر میں دیکھ لیتا کہ عکس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک کا رنگ شیر دل کی ٹائی کے رنگ کا ایک حصہ لگ رہا تھا...... شہر بانو نے بھی نوٹس کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے کسی رشتے اور تعلق کے بغیر بھی ان دونوں کی باڈی لینگویج میں ایک عجیب کیمسٹری تھی۔ ایک عجیب سا رابطہ اور تعلق جس کو نہ چھپانے کی کوشش تھی نہ دکھانے کی...... لیکن پھر بھی وہ چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ شہر بانو الجھی نہیں...... اور پھر چاہنے کے باوجود وہ عکس سے ویسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کرسکی جو وہ دوسرے

مہمانوں کے ساتھ کررہی تھی۔ وہ نپے تلے انداز میں عکس کی طرف بڑھی تھی اور عکس نے بھی مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ گرم جوشی پر اسی احتیاط سے پکڑا تھا جس کے ساتھ وہ بڑھایا گیا تھا۔ شہر بانو نے اس کے ہاتھ کے لمس کی حدت اور نرمی کو بیک وقت محسوس کیا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔
”آپ کیسی ہیں؟“ اس نے عکس کو کہتے سنا۔ اس کی آواز کی ملائمت نے شہر بانو کے وجود کی سرد مہری کو عجیب انداز میں پگھلایا۔
”I am fine. How are you“ اس نے جواباً اپنی مسکراہٹ کو کچھ گرم جوش کرنے کی کوشش کی۔
”I am good too“ عکس نے جواباً ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ شیر دل اب کمشنر کے ساتھ اندر جارہا تھا۔ شہر بانو نے ایک عجیب سا اطمینان محسوس کیا اس فوٹو فریم کے ایک حصے کو ہٹتے دیکھ کر۔
”شیر دل سے بہت سنا ہے میں نے آپ کے بارے میں۔“ عکس نے شہر بانو سے کہا۔
”اچھا......؟ میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔ شہر بانو نے کچھ جتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے واقعی شیر دل سے عکس مراد علی کے نام کے سوا اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا، اس کے باوجود وہ اتنا احساس ضرور رکھتی تھی کہ عکس مراد علی شیر دل کا وہ بلیک ہول ہے جسے کھوجنا صبر آزما اور خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں اور شہر بانو کو کسی بلیک ہول میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شیر دل کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی مثالی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی آئیڈیل نہیں بنایا تھا لیکن شیر دل کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے بعد وہ جانتی تھی کہ وہ اگر ایک آئیڈیل شوہر کا کوئی خاکہ بناتی تو وہ شیر دل ہی کا ہوتا۔ وہ پیار کرنے والا، خیال رکھنے والا، وفادار شوہر تھا جس سے شہر بانو کو اس کی مصروفیات کے علاوہ کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو شوہر کی زندگی اور ہر سرگرمی کو قابلِ درانداز سمجھتی تھیں۔ شیر دل نے اسے ایک عورت اور بیوی کے طور پر بہت space دی تھی اور شہر بانو نے وہی space اس کو دی تھی۔ شیر دل اب اس کا تھا اور جب تک وہ اس کا تھا اسے یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس سے پہلے کون کون شیر دل کو اپنا بنانا چاہتا تھا یا شیر دل کس کو اپنا...... اور صرف یہ ایک بات اور سوچ تھی جس پر ہمیشہ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رکتی تھی جس کو وہ ہمیشہ سر سے جھٹک دیتی تھی۔ اس کا دل یہ کبھی نہیں مان سکتا تھا کہ شیر دل اس سے پہلے کسی سے محبت کرتا تھا، کرچکا تھا یا کرسکتا تھا...... یہ خیال بھی اس کو جسم میں ٹھکنے والی میخوں کی طرح لگتا تھا۔
”شیر دل کی زندگی میں بہت لڑکیاں آئی ہوں گی لیکن محبت...... وہ اس نے صرف مجھ سے کی، مجھ سے کی تو مجھ سے شادی کی ورنہ وہ کسی سے بھی شادی کرسکتا تھا۔ کوئی لڑکی شیر دل کو انکار تو نہیں کرسکتی تھی۔“ پتا نہیں کیا کیا تاویلیں اور جواز دے کر وہ خود کو یہ یقین دلاتی تھی کہ محبت نام کی شے شیر دل نے صرف اسی کے لیے محسوس کی ہوگی...... باقی سب کچھ...... کچھ بھی نہیں تھا اور شیر دل نے ازدواجی زندگی کے اتنے سالوں میں اپنے رویے سے جیسے اس کے اس بلی کے سامنے آنکھیں بند کیے کبوتر جیسے اعتماد اور یقین پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی...... اس نے شہر بانو کی ماں کی ان تمام پیش گوئیوں اور اعلانات کو غلط ثابت کردیا تھا جو شرمین نے شیر دل

کے ساتھ شادی کی ضد پر اسے شیر دل اور اس کی فیملی کے حوالے سے بتائی تھیں۔
ضلع کی تمام ایڈمنسٹریشن ہال کمرے میں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ شیر دل کے گھر پر ہونے والے اس ڈنر کے لیے موجود تھی اور کمشنر اور ان کی بیوی وہ آخری مہمان تھے جنہیں پہنچنا تھا۔ عکس وہاں بہت پہلے آچکی ہوتی اگر کمشنر اور ان کی بیوی نے ایک ہی شہر سے جانے کی وجہ سے اسے اپنے ساتھ جانے کی دعوت نہ دی ہوتی۔
ڈنر کے دوران شہر بانو کی نظریں وقتاً فوقتاً عکس پر بھٹکتی رہیں۔ وہ عکس مراد علی کو سننا چاہتی تھی جیسے اسے جاننا چاہتی تھی لیکن عکس مراد علی نے سارا وقت بے حد خاموشی سے وہاں ہاتھ میں ڈرنک یا چائے لیے مسکراتے دوسروں کی باتیں سنتے ہوئے گزارہ تھا۔ چند ایک بار ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ شہر بانو نے ایک مہمان نواز میزبان کی طرح اس سے کھانے وغیرہ کے حوالے سے پوچھا۔ عکس نے ایک مہذب مہمان کی طرح اپنی سیری کا اظہار کیا۔ شہر بانو کسی اور کی طرف متوجہ ہوگئی اور گفتگو کہیں سے کہیں چلی گئی۔
ڈنر کے اختتام پر مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے شہر بانو اور عکس کا ایک بار پھر آمنا سامنا ہوا تھا۔ شہر بانو اب اس سے پہلے کی طرح نہیں ملی تھی۔ وہ ایک گرم جوش میزبان کی طرح اس سے گلے ملی تھی۔ عکس مراد علی کی پورچ سے نکلتی ہوئی گاڑی کو دیکھتے ہوئے شہر بانو کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ چند ہفتوں میں عکس سے دوبارہ وہاں ایک مہمان کے طور پر ملے گی اور وہ اس سے میزبان کے طور پر۔

☆☆☆

کریٹ میں سے ایک ایک آم نکال کر وہ ساتھ ساتھ اس پر لگے اسٹیکرز چیک کر رہی تھی جس آم پر اسٹیکر نظر نہ آتا وہ ایک لحظے کے لیے رک کر آم کو گھما پھرا کر اس کا اسٹیکر تلاش کرنے کی کوشش کرتی پھر اسٹیکر کو آم کے کسی نہ کسی حصے پر موجود پا کر وہ جیسے مطمئن ہو جاتی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے ریڑھی پر پھلوں کو سجانا اور ترتیب سے رکھنا اس کے پسندیدہ کاموں میں سے ایک تھا لیکن آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی کے دن وہ خیر دین کے ساتھ آتی اور فٹ پاتھ پر ایک اسٹول پر بیٹھی اپنا سبق یاد کرتے ہوئے پھلوں کی ترتیب کو بگڑنے نہ دیتی۔
کسی بھی گاہک کے آنے پر وہ بے حد ایکسائٹڈ انداز میں گاہک کے سب سے اچھا پھل چننے کی کوشش میں جیسے اس گاہک سے بھی زیادہ پھرتی اور دلچسپی دکھاتی، وہ اس کو پھلوں کی سجائی ہوئی ڈھیریوں میں سے اچھے سے اچھا پھل نکال کر دکھاتی اور پھر ترازو پر رکھ دیتی جس پر خیر دین پھل تول رہا ہوتا اور جب وہ گاہک چلا جاتا تو وہ نئے سرے سے بچے ہوئے پھلوں کو ترتیب دیتی۔ پھلوں کی بڑی بڑی ڈھیریوں کو گھٹتے دیکھنا اس کا جیسے ایک اور پسندیدہ مشغلہ تھا۔ خیر دین نے کیا کمایا اور کیا بچایا سے زیادہ چڑیا کو خوشی اس بات کی ہوتی تھی کہ اس کی ریڑھی کا پھل ضرور بکتا اور شام تک ختم ہو جاتا تھا۔ بالکل دال کی اس دیگ کی طرح جو صبح لبالب بھری ہوتی اور خیر دین کے لیے اسے ہلانا بھی مشکل ہوتا لیکن شام تک وہ اس طرح خالی ہو جاتی کہ بعض دفعہ خیر دین کو اسے ٹیڑھا کر کے چمچ کے ساتھ اس کے پیندے کو کھرچ کھرچ کر بھی اپنے کسی گاہک کی فرمائش پر اس کا پیالہ بھرنا پڑتا۔
خیر دین دال سے جتنا کماتا تھا پھلوں سے اتنا نہیں کماتا تھا لیکن چڑیا کو دال کے بزنس سے زیادہ پھلوں کی اس رنگین ریڑھی میں دلچسپی تھی جسے وہ خود سجاتی تھی۔ وہ جیسے اس کا کینوس تھی جس پر وہ مختلف رنگوں اور شکلوں کے پھلوں سے اپنی Creativity کا اظہار کرتی تھی۔ وہ ریڑھی اس فٹ پاتھ پر خیر دین کی دال مشہور اور مقبول

ہو جانے سے پہلے اس فٹ پاتھ کی سب سے خوب صورت پھلوں کی ریڑھی تھی جس پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد کوئی پھل خریدنے کی خواہش نہ رکھنے کے باوجود بھی ایک دوسری ستائشی نظر ضرور ڈالتا تھا۔ کسی نے کبھی اس ریڑھی پر بدنظمی اور بے ترتیبی نہیں دیکھی تھی، نہ ہی گندگی اور اس میں خیر دین کے اپنے سلیقے کے ساتھ ساتھ چڑیا کے مزاج کی نفاست کا بھی عمل دخل تھا۔ شروع شروع میں خیر دین صرف پھلوں کی ایک ریڑھی لے کر ہی اس فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ لیکن چند ہفتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ صرف پھلوں کی ریڑھی کے ساتھ گھر کا خرچہ چلانا مشکل تھا...... خاص طور پر اب جب کچھ بھی مفت نہیں تھا...... چند ہفتوں میں ہی خیر دین نے اسی پھلوں کی آدھی ریڑھی کو خالی کرتے ہوئے وہاں اس دال کا دیگچہ رکھ لیا تھا جس کے لیے وہ ڈی سی ہاؤس میں مشہور تھا...... اور اس کی دال کچھ دنوں کے اندر اس کی توقعات سے بھی زیادہ بکنے لگی تھی۔ چند ہفتے گزرتے ہی اسے اس دال کے دیگچے کو دیگ میں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھلوں کی ریڑھی کو بھی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ صبح صبح منڈی جا کر پھل لانا اور دال پکانا بہت وقت طلب کام تھے لیکن چڑیا کی آنکھوں اور چہرے پر اترتی مایوسی اسے اس کے فیصلے پر عمل درآمد نہ کرا سکی۔
خیر دین نے اپنی زندگی کی مشقت کچھ بڑھا لی تھی لیکن پھلوں کی وہ ریڑھی اس نے ختم نہیں کی البتہ اب اس ریڑھی سے دال کا بزنس اس نے ایک دوسری ریڑھی پر منتقل کر لیا تھا اور ایک نو عمر لڑکا اس نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے بھی رکھ لیا تھا۔
خیر دین کی رہائش اس فٹ پاتھ سے ملحقہ رہائشی علاقے میں تھی اور اسکول سے واپس آنے کے بعد چڑیا خیر دین کے پاس آ کر اس کی ریڑھی پر بیٹھ جاتی۔ وہ وہیں اپنا اسکول کا ہوم ورک بھی کرتی اور اس کی ریڑھی کی حفاظت اور نگرانی بھی۔ جب تک خیر دین نے اپنا ہاتھ بٹانے اور ادھر اُدھر کے کاموں کے لیے وہ لڑکا نہیں رکھا تھا چڑیا ہی تب تک خیر دین کا ”چھوٹا“ تھی۔ جو اس کا ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ سڑک پر لوگوں اور گاڑیوں کے شور سے بے نیاز اور بے پروا اپنا سبق یاد بھی کرتی تھی اور لکھنے والا ہوم ورک بھی۔ اس کے آس پاس ہونے والا کوئی شور اس کے فوکس اور توجہ کو بانٹنے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ہی چڑیا نے اپنے آپ کو آس پاس کی شور مچاتی دنیا کو شٹ آف کرنا سیکھا بالکل اس طرح جیسے اس نے اس رات اپنی زندگی کے سب سے بھیانک اور تکلیف دہ تجربے پر ایک مینٹل بلاک لگایا تھا اور جب تک وہ اس پر مینٹل بلاک نہیں لگا سکی چڑیا تب تک ذہنی طور پر مفلوج ہوئی رہی۔ نو سال کی اس بچی نے بڑوں کی دنیا کا ”جنس“ نام کا آسیب بہت غلط عمر میں دیکھا تھا۔ اس آسیب نے اس کی بچوں کی دنیا کی ساری خوب صورتی اور رنگینی کو پلک جھپکتے میں غائب کر دیا تھا۔ چند ہولناک گھنٹوں نے اس کی زندگی میں نیپام بم سے زیادہ تباہی برپا کی تھی۔ زندگی وہ fairytale نہیں تھی جو وہ گزار رہی تھی بلکہ وہ تھی جس کی ایک جھلک نے اس کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔
وہاں اس رات اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ یہ سوال چڑیا کو گونگا کر دیتا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ یاد نہیں کر پائی تھی، صرف تاریکی اور اپنی گردن پر کسی کے ہاتھوں کی گرفت۔ ایک کی ہذیانی چیخیں اور اس ساری تکلیف سے زیادہ تکلیف دہ اپنی عریانی اپنے برہنہ جسم کا تصور...... اور اس کے بعد چڑیا کا ذہن مفلوج ہو جاتا۔
وہ کانپتے جسم اور بھینچے ہونٹوں کے ساتھ سرد جسم اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ ماں کو دیکھتی بے آواز اور بے حس و

حرکت روتی جاتی اور اس کے جسم پر ٹھنڈے پسینے آتے.....اور اس کی ماں اس کی حالت دیکھنے کے بعد بلک بلک کر روتی جاتی۔ اس نے چڑیا سے کچھ بھی پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ جس حالت میں خیر دین نے اسے ڈی سی ہاؤس میں دیکھا تھا اس کے بعد کسی سوال جواب کے بغیر بھی وہ جانتا تھا وہاں کیا ہوا تھا؟ چڑیا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ حلیمہ کی طرح وہ چڑیا سے کبھی کچھ نہیں پوچھ سکا تھا، وہ سوال یا کوئی بھی سوال۔ وہ خیر دین کی عمر بھر کی کمائی سے کھڑی کی ہوئی ایک شاندار عمارت تھی جسے اس حالت میں اس گھر میں دیکھ کر خیر دین پلک جھپکتے میں خود ڈھے گیا تھا۔ کوئی ظلم سا ظلم ہوا تھا اس پر.....سوال جواب کیا رہ گئے تھے، کس نے کرنے تھے اور کیوں کرنے تھے۔

اس نے ہذیانی اور جنونی انداز میں صرف ڈی سی کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ وہی ہوا تھا جو ہو سکتا تھا۔ چند منٹوں میں ڈی سی کے حفاظتی عملے نے اسے زدوکوب کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا تھا جہاں وہ اگلے دو دن تشدد کا نشانہ بنتا رہا۔ راتوں رات اس کی بیٹی کو چڑیا اور کوارٹر کے سامان کے ساتھ ڈی سی ہاؤس سے باہر پھنکوا دیا گیا تھا۔ رات کے وہ آخری چند گھنٹے چڑیا نے اپنی ماں کے ساتھ ڈی سی ہاؤس سے باہر پھنکوائے ہوئے ان کے سامان کے ڈھیر پر اپنی روتی ہوئی ماں سے لپٹے ایک عجیب خوف اور دہشت کے عالم میں گزار دیے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد دن ہونے پر اس کی ماں سامان کے اس ڈھیر کو وہیں چھوڑے اسے ساتھ لیے وہاں سے کئی فرلانگ دور ایک pco سے اپنے کسی جاننے والے کو فون کر کے وہاں پہنچنے کا کہہ کر جب تک واپس آئی سامان کے اس ڈھیر سے بہت کچھ راستے سے گزرنے والے اٹھا کر لے جا چکے تھے۔ اس سامان کا ماتم چڑیا کی ماں تب کرتی اگر ماتم کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اور سامان نہ ہوتا۔ اگلے چند گھنٹوں میں اس جاننے والے نے اس سامان کو اٹھوا کر انہیں اپنی چھت کے نیچے پناہ تو دے دی تھی لیکن خیر دین کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بھی کسی کالج میں اردلی تھا اور ڈی سی کے حکم پر بند کیے جانے والے خیر دین کے لیے وہ کیا کرتا۔ ایف آئی آر میں خیر دین پر ڈی سی کے گھر میں چوری کے الزام کے ساتھ چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے پر ڈی سی پر قاتلانہ حملہ کرنے کا بھی الزام تھا اور ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کے جان اور مال پر ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا تھا۔ شہر کا کوئی بھی وکیل فیس لیے بغیر خیر دین کے لیے ضمانت کی کوششوں کا حصہ بننے کو تیار نہیں تھا اور بے بسی اور کسمپرسی کی اس انتہا کا ایک ایک لمحہ اس نو سالہ بچی کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ کر گیا تھا۔

دو دن کے بعد ڈی سی ہاؤس کے عملے نے ڈی سی کی طرف سے مصالحتی کوششوں کا آغاز کیا تھا اور خیر دین نے بنا چون و چرا اس مصالحت نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیل کے اندر چلے جانے کے بعد پیچھے کچھ باقی نہیں بچنا تھا جو حلیمہ اور چڑیا کو سہارا دیتا۔ اس کے لیے تھانے سے باہر آنا اشد ضروری تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ چڑیا اور اپنی زندگی کے ملبے کے ڈھیر سے کیا کیا بچا سکتا تھا۔

ڈی سی خیر دین کے ساتھ مقدمہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مقدمے میں خیر دین چڑیا کے حوالے سے کچھ الزامات لگا دیتا تو کچھ ثابت نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ الزامات اتنے خطرناک ضرور تھے کہ ایک لائق فائق ڈی ایم جی آفیسر کی ساکھ، نام اور تابناک کیریئر ڈبونے کے لیے کافی تھے اور ڈی سی اس بات سے اچھی طرح واقف تھا۔ مالی بدعنوانی کے الزامات کا دفاع کیا جا سکتا تھا اور وہ ایسے الزامات ہوتے تھے جن کو اگر غلط ثابت کر دیا جاتا تو ہر معاملے میں باعزت طور پر نکل آنا ممکن تھا لیکن اخلاقی جرائم سے متعلقہ الزامات اگر کورٹ تک چلے جائیں تو پھر بے قصور ثابت ہونے کے باوجود الزامات اور شکوک و شبہات کی گرد بہت عرصے تک نہیں بیٹھتی۔ وہ دھول فریقین کو گرد آلود رکھتی ہے۔

ڈی سی بے وقوف نہیں تھا، چڑیا کے حوالے سے کسی الزام کی گونج اس کے کیریئر سے پہلے اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ کرنے کا باعث بنتی۔ اپنی فیملی میں اسے بے حد شرمندگی اور خفت کا سامنا کرنا پڑتا.....اس کے لیے خیر دین سے خاموش مصالحت اس سے کہیں زیادہ ضروری تھی جتنی خیر دین کے لیے اس کے ساتھ.....خیر دین اس کے جیسی ذہانت رکھتا تو اپنے کارڈز زیادہ سمجھداری سے کھیلتا، مصالحت نامہ اپنی شرائط پر کرتا لیکن وہ ڈی سی اور اس کے پیچھے تمام انتظامی مشینری کے دباؤ اور دھمکیوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکا۔ ڈی سی نے اس کے خلاف ایف آئی آر واپس لی تھی لیکن اسے ملازمت سے برخاست کر دیا تھا اور اس کے خلاف دی جانے والی رپورٹ میں لگائے گئے الزامات واپس نہیں لیے تھے۔ خیر دین کی صرف نوکری نہیں گئی تھی پنشن اور ریٹائرمنٹ پر ملنے والے تمام فنڈز بھی چلے گئے تھے لیکن بس یہ ہوا تھا کہ وہ تیسرے دن صبح سویرے اپنے جسم پر چوٹوں کے کئی چھوٹے بڑے نشان لیے حلیمہ اور چڑیا کے پاس پہنچ گیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار چڑیا ہمیشہ کی طرح ہنستی کھلکھلاتی بھاگتی خیر دین کے پاس نہیں جا پائی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود وہ نو سالہ بچی شدید احساسِ جرم کا شکار تھی۔ وہ جن کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں وہ جیسے سرکس کا ایک جانور تھی جس کی کہانی دن میں کئی بار اس کے سامنے حلیمہ یا اس گھر کی عورتیں وہاں آنے والی آس پڑوس کی عورتوں کو سناتیں.....وہ وہاں موجود ہوتی تو سر جھکائے کسی بت کی طرح سب کچھ سنتی جاتی۔ وہ رات پھر اسی تکلیف کے ساتھ اس پر گزرتی، اسی خوف، اذیت اور بے بسی کے احساس سے وہ دوبارہ گزرتی.....اور دو دن کے درجنوں بار دہرائے جانے والے اس مینٹل ٹارچر کے بعد ایک لمحہ وہ آ گیا تھا جب 9 سال کی اس بچی نے اپنے لیے شدید نفرت محسوس کی تھی۔ وہ دو دن میں ہی احساسِ جرم کی دوسری سیڑھی پر آ گئی تھی۔ ہمدردی کے جملے، ترس بھری نظریں اور کریدنے والے سوالات، ان میں سے کسی چیز نے اس traumatized بچی پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ اچھی بچی نہیں تھی۔ ان دو دنوں میں اپنے حواس کو بحال کرنے کی پہلی کوشش کے دوران یہ پہلا نتیجہ تھا جو چڑیا نے نکالا تھا۔

جو اچھے بچے ہوتے ہیں ان کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوتا اور ان کی وجہ سے ان کے نانا کو تکلیف بھی نہیں پہنچتی۔ خیر دین کو پہلی بار تکلیف اور زخموں کی وجہ سے لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر خوشی کے احساس کے باوجود آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ چڑیا نے دوسرا نتیجہ نکالا تھا۔

وہ چھوٹا سا گھر تھا، وہ وہاں چھپ نہیں سکتی تھی لیکن وہ چھپنا چاہتی تھی۔ وہ خیر دین کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی، اگر نانا نے کچھ پوچھا تو......؟ اگر نانا نے ڈانٹا تو؟ نانا اب مجھے بہت برا سمجھتے ہوں گے......خدشات

اور رواجوں سے زندگی میں اس کا پہلا تعارف بھی اسی عمر میں ہوا۔ چڑیا چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی تھی۔ دو کمروں کی وہ چھوٹی سی چھت کاٹھ کباڑ سے اٹی ہوئی تھی اور اس کاٹھ کباڑ میں کوشش کے باوجود چڑیا کوئی ایسی جگہ تلاش نہیں کر سکی جہاں وہ چھپ جاتی اور چھت پر آنے والا کوئی بھی شخص اسے پہلی ہی نظر میں نہ ڈھونڈھ لیتا۔ بس چھت پر کھڑکی کا ایک ٹوٹا ہوا پٹ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا جس کے پیچھے پھٹی پرانی بوریوں میں کوئی سامان بھرا پڑا تھا۔ چڑیا اپنے پتلے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو سکیڑ کر انہی بوریوں میں سے ایک پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور اس دن وہاں بیٹھے اس نے اس سامان میں چند چھوٹی بڑی چھپکلیاں، ایک چوہا، بڑی بڑی دو مکڑیاں اور ایک لال بیگ کے ساتھ چند دوسرے کیڑے مکوڑے بھی دیکھے...... اور زندگی میں پہلی بار وہ گم صم کسی خوف کے بغیر ان تمام چیزوں کو اپنے آس پاس اور اردگرد حرکت کرتے دیکھتی رہی۔ صرف چند دن پہلے وہ ساری چیزیں اس کے خوف کا منبع تھیں۔ خوف نام کی کیفیت کو وہ ان غیر انسانی چیزوں کے ساتھ منسوب کر کے محسوس کرتی تھی۔ صرف چند دن میں خوف نے اپنا منبع بدل لیا تھا۔ خوف نے اب اپنے آپ کو انسانی شکل میں ڈھال لیا تھا۔ اب اس کی دم، پر، چار پاؤں، آٹھ ٹانگیں، سرخ، گرے، سیاہ چمکیلا کراہیت آمیز ننگا وجود نہیں ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ رینگ کر اڑ کر دیواروں درختوں سے چپکتا دوڑتا پھرتا تھا۔ اب اس کا خوف دو آنکھوں، دو ہاتھوں، ایک ناک، ایک منہ والا اور خوب صورت صاف رنگت والا ہو گیا تھا جو خوب صورت لباس پہنتا تھا اور دو ٹانگوں پر چلتا تھا۔ وہاں بیٹھے ان سارے کیڑے مکوڑوں کو دیکھتے ہوئے چڑیا نے اپنے آپ کو ان کے قبیل کا حصہ محسوس کیا۔ ان سب کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اس چھت پر سامان میں چھپے بیٹھے ہیں۔ چڑیا نے باری باری ان سب کو دیکھتے ہوئے بے حد ہمدردی سے سوچا۔

نیچے گھر کے اندر بیٹھے پانی پیتے ہوئے خیر دین نے چند ہی منٹوں میں چڑیا کی عدم موجودگی محسوس کر لی تھی۔ چڑیا کی ڈھنڈیا مچی تھی اور وہ نہیں ملی تھی۔ کسی نے اسے چھت پر جاتے دیکھا اور وہاں جا کر ڈھونڈا!! اور وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ خیر دین پانی کا گلاس چھوڑتا ہوا بے حد حواس باختگی کے عالم میں خود اسے چھت پر ڈھونڈنے پہنچا تھا۔ چھت خالی تھی۔ وہ چڑیا کا نانا نہ ہوتا تو اسے بھی چھت خالی ہی نظر آتی، پر اس نے چڑیا کو اس خالی چھت پر بھی تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند منٹ لگے تھے اس کھڑکی کے اس ٹوٹے پٹ کے پیچھے سانس روکے بے حس و حرکت بیٹھی چڑیا تک پہنچتے جو چھت پر خیر دین کے بار بار پکارنے پر بھی برستی آنکھوں کے ساتھ اسی طرح چھپی بیٹھی رہی تھی پھر اس نے ایک سائے کو سورج کی روشنی کو روکتے دیکھ کر سر اٹھایا تھا۔ خیر دین کبھی چڑیا کو اتنا بوڑھا نہیں لگا تھا جتنا اسے اس دن لگا تھا۔ بڑھی ڈاڑھی، وحشت زدہ آنکھیں اور سلگے کپڑے، وہ اپنے نانا کو پہچان نہیں سکی۔ وہ اس حلیے کے کسی شخص سے کبھی واقف نہیں رہی تھی لیکن وہ پھر بھی خیر دین کو سر اٹھا کر دیکھتی رہی، آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ۔ اس کا اور خیر دین کا آخری سامنا اس رات تب ہوا تھا جب اس نے اپنی چادر کے ساتھ اس کے برہنہ جسم کو لپیٹا تھا لیکن اس رات روتی بلکتی چڑیا سے اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔ خیر دین کے دل کو کسی چیز نے آری لے کر کاٹا تھا۔ یہ چڑیا کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں اور ڈرا سہما کانپتا وجود نہیں تھا، یہ ان آنکھوں میں جھلکنے والی ندامت تھی جس نے خیر دین کو مارا تھا۔ کس چیز کا احساس جرم...... کیسی ندامت؟ کچھ بھی کہے بغیر اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر چڑیا کو بوری سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا پھر اس نے فرش پر بیٹھتے ہوئے چڑیا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا، نہ وہ رویا تھا نہ اس نے چڑیا سے کچھ کہا تھا، نہ اس نے چڑیا سے

کچھ پوچھا تھا۔ وہ اسے بہت دیر تک اپنے سینے سے لپٹائے رہا تھا یوں جیسے اس کی تکلیف کو اسفنج کی طرح اس کے وجود سے نچوڑ کر خود جذب کر لینا چاہتا ہو، یوں جیسے کسی کی اکھڑتی سانس کو بحال کرنے کے لیے اسے آکسیجن کی سپلائی دینے کی کوشش کی جا رہی ہو اور اس کی اس گرم جوش آغوش نے دونوں کام کیے تھے۔ وہ ٹھٹھرتا، کانپتا، سکڑتا، سہا، ننھا وجود جان بلبی کی اس کیفیت سے نکلنے لگا تھا۔ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں خود بخود خشک ہونے لگی تھیں۔ چڑیا کو اس کا نانا دوبارہ مل گیا تھا۔

خود سے الگ کر کے خیر دین نے سب سے پہلے اس کے بکھرے الجھے بال سلجھائے تھے۔ ان ہیئر پنز کو اس کے بالوں سے نکالا تھا جو ان تین دنوں میں اس کے بالوں کو سلجھانے سے زیادہ الجھانے کا کام کر رہی تھیں۔ پونی میں پڑا ربر بینڈ اب پونی کے آخری سرے پر آ چکا تھا اور چڑیا کے آدھے سے زیادہ بال اس کی گرفت سے آزاد بے ترتیب لٹوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس چھت پر بیٹھے خیر دین نے سب سے پہلے اس کے بکھرے بالوں کو سلجھایا۔ اس کی چھوٹی سی پونی نما چٹیا گوندھ کر اس کی باقی لٹوں کو ہیئر پنز کے ساتھ دوبارہ جمایا...... وہ جیسے چڑیا کو اپنی زندگی کا ایک اور بڑا گر دے رہا تھا، منہ پر چوٹ کھانے کے بعد اوندھے منہ گرنے کے بعد ہتھیار ڈالنے کے بجائے اٹھ کر دوبارہ کھڑے ہونے کا۔ اپنے پیروں پر اپنی ہمت اور اپنی مرضی سے بالکل وہیں کھڑے ہونے کا جہاں گرائے گئے ہو۔

☆☆☆

”تو یہ تھی عکس مراد علی...... بڑی curiosity تھی اس سے ملنے کی مجھے۔ آج بالآخر موقع مل ہی گیا......“ رات کو ڈنر ختم ہونے کے بعد سونے کے لیے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد شہر بانو نے واپس بیڈ روم میں آتے ہوئے شیر دل سے کہا۔ وہ بھی کپڑے تبدیل کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی آ کر بستر پر لیٹا تھا اور اس وقت اپنے سیل فون پر بڑی برق رفتاری کے عالم میں اپنے ٹیکسٹ میسجز دیکھنے اور ان کے جواب بھیجنے میں مصروف رہا۔ اس نے شہر بانو کا تبصرہ سنا تھا لیکن اس تبصرے کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ شہر بانو اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹنے کے بجائے کروٹ لے کر شیر دل کے پاس آ گئی۔ اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔

”اچھی ہے۔“ شیر دل نے جواب دیے بغیر اس کے گرد اپنا بازو حمائل کر لیا لیکن وہ اب بھی اپنے سیل فون کے ساتھ ہی مصروف تھا۔ شہر بانو کو لگا اس نے شاید عکس کے بارے میں اس کا تبصرہ نہیں سنا۔ شیر دل کے سیل فون والی کلائی اور نیچے بازو کی کہنی تک پھیلے ہوئے سیاہ بالوں کے گھنے روئیں کو اپنے ہاتھ کی نرم پوروں سے سلجھاتے ہوئے شہر بانو نے ایک بار پھر اپنا تبصرہ دہرایا۔ اس بار جواب آ گیا تھا۔

”ہونہہ......“ شہر بانو نے ذرا سا سر اٹھا کر شیر دل سے کہا۔

”شیری اب تم مجھ سے بات کرو گے یا ابھی بھی کمشنر کو text کرتے رہو گے؟“ اس کے انداز میں خفگی تھی۔

”میں سن رہا ہوں یار۔“ شیر دل نے مسکرا کر بہلانے والے انداز میں سیل فون سے اس کی ناک کی نوک تھپتھپائی۔ وہ ایک بار پھر فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے تمہارے چیف نے نیا نیا text کرنا سیکھا ہے۔ پچھلے دو دن سے اس نئی مصیبت نے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔" شہر بانو واقعی شیر دل اور کمشنر کے درمیان رابطے کے اس ایک اور ذریعے سے تنگ آ گئی تھی جو دو دن پہلے شروع ہوا تھا۔ شیر دل اس کی بات پر مسکرا دیا۔

"چیف نے بلیک بیری لیا ہے نیا نیا اور ابھی اس کے فنکشنز نہیں سمجھ پا رہے۔ آج ڈنر پر بھی وہی سمجھاتا رہا ہوں انہیں اور اب بھی وہی سمجھا رہا ہوں۔" شہر بانو اس کے اس سوشل ورک کے بارے میں جان کر زیادہ خوش نہیں ہوئی تھی۔

دو دن سے بھابی کو کیے جانے والے سارے میسجز بھی مجھ تک آ رہے ہیں۔ پتا نہیں بھابی تک کس کے جا رہے ہوں گے۔ میں نے ابھی منع کیا ہے انہیں کہ جب تک ہاتھ صاف نہ ہو جائے کم سے کم بھابی کو کوئی پرائیوٹ میسج نہ کریں۔" شہر بانو کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وہ کمشنر کی ٹیکنالوجی کے حوالے سے Incompetence کے بارے میں آگاہ تھی۔

"تم نے یہ کہہ دیا ان سے؟" اس نے ہنستے ہوئے شیر دل سے پوچھا۔

"ہاں کہا لیکن اس طرح نہیں کہا۔" شیر دل بھی جواباً مسکرایا۔

"اب تک پہنچ نہیں گئے ہوں گے؟" اس نے کمشنر کے اپنے شہر میں پہنچنے کے حوالے سے پوچھا۔

"نہیں لیکن پہنچنے والے ہیں۔" شیر دل اب بھی text کر رہا تھا۔

"اب بس کرو نا۔" شہر بانو جھلائی۔

"One last text" شیر دل نے بے ساختہ کہا اور پھر چند لمحوں کے بعد سیل فون بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟" شہر بانو کے گرد اپنے دونوں بازو حمائل کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"عکس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔"

"ہونہہ۔" شہر بانو نے بے اختیار سر اٹھا کر شیر دل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"یہ ہونہہ کیا ہوتا ہے؟"

"اور کیا کہوں؟ تعریف تو تم پہلے ہی کر رہی ہو۔" شیر دل مسکرایا تھا۔

"وہ جتنی اٹریکٹو ہے میں حیران ہوں اب تک سنگل کیسے ہے..... شادی کیوں نہیں کی اس نے ابھی تک۔" وہ شیر دل سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آیا یہ سوال کیسے اس کی زبان پر آیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جیسے اس کا لاشعور بولنے لگا تھا۔ شیر دل کے چہرے سے چند انچ دور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے شیر دل کو جیسے کسی دام میں لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس سوال کا جواب اس کی زبان سے نہیں جیسے اس کی آنکھوں میں پڑھنا چاہتی تھی۔ شیر دل اس سے آنکھیں نہیں چرا سکا۔ وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ آنکھیں چرا کر بھی اسے دوبارہ اس سے آنکھیں ملانی پڑتیں۔

"اس کا ذاتی مسئلہ ہے..... میں نے کبھی پوچھا نہیں۔" بے تاثر لہجے میں شیر دل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے لاشعور کو بولنے نہیں دیا۔ اس کے اور عکس کے درمیان ہونے والا ہر سوال جواب صرف دو

سامعین اور دو لوگوں کے لیے تھا..... عکس..... اور..... شیر دل کے لیے۔ وہ اپنی اور عکس کی کوئی ذاتی گفتگو کہیں نہیں دہراتا تھا، کسی تیسرے چوتھے شخص کے سامنے نہیں۔ یہ ان کے رشتے اور تعلق کا ایک unsaid rule تھا۔ ایک دوسرے کا کوئی راز کسی سے شیئر کرنا تو خیر ناممکنات میں سے تھا۔

"تم اور وہ تو آپس میں کافی کلوز ہو شاید..... تم نے بھی کبھی نہیں پوچھا؟" لاشعور نے پھر ایک اور سوال کیا جو شعور چھپائے ہوئے تھا۔

"نہیں۔" وہ پلکیں جھپکائے بغیر شیر دل کو دیکھتی رہی، وہ بھی اسے اسی طرح دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی وہ جواب نہیں تھا جس کی اسے توقع تھی، نہ اس جواب کی..... نہ اس کے اتنے مختصر ہونے کی۔ لاشعور اگلا سوال کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا جب اس نے شیر دل کو کہتے سنا۔

"I love you shabi" وہ اب اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ عکس مراد علی سیکنڈز میں کہیں غائب ہو گئی تھی۔

"سو بار کہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے شیر دل کی ٹھوڑی کو اپنے ہونٹوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"صرف سو بار.....؟" شیر دل ہنسا۔

"تم زیادہ بار کہنا چاہتے ہو؟" اس نے شیر دل کے سینے پر عجیب سرشاری کے عالم میں اپنا ماتھا ٹکاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"نہیں تو....." شیر دل مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہوا۔

"نہیں؟" وہ ایک دم اس سے الگ ہوئی۔

"ہاں....." وہ پھر ہنسی۔

"تو پھر کہو۔"

"After you ma'am." وہ پھر ہنسی۔

"I love you sherdil." شیر دل مسکرایا۔ "میں نے تمہارے علاوہ کسی دوسرے مرد سے محبت نہیں کی۔ کر ہی نہیں سکتی۔" اس کے گال چھوتے ہوئے وہ اسی سرشاری کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

"اور تم.....؟" وہ جیسے اب وہی سب کچھ اس کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی اس نے اپنے سوال سے شیر دل کو کیسی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ نادانستگی میں اپنے اور اس کے بیچ عکس مراد علی کو لے آئی تھی۔

"I love you shabi" شیر دل ایسے نازک مرحلوں سے بہت بار گزر رہا تھا۔ عکس مراد علی سے بہت بار بچ کر گزرنے کی کوشش کی تھی اس نے۔ لیکن عکس کو اپنے دل میں اس جگہ سے ہٹائے بغیر اور ہلائے بغیر جہاں وہ تھی۔

"تم میری زندگی کی دو خوب صورت اور قیمتی ترین چیزوں میں سے ایک ہو..... I am incomplete without you" شہر بانو مسکرا دی۔ وہ ہمیشہ اس سے یہی کہا کرتا تھا اور وہ جانتی تھی وہ دوسری قیمتی اور خوب صورت چیز کون تھی..... مثال شیر دل۔

دنیا کا کوئی مرد شیر دل جیسا نہیں تھا...... ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے سینے پر سر رکھے آنکھیں موندتے ہوئے شہر بانو نے سوچا۔ وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔ دنیا کا کوئی مرد شیر دل جیسا نہیں تھا...... ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے 250 کلومیٹر دور اپنے گھر کے بیڈ روم میں اپنے پرس سے شیر دل کا دیا ہوا ٹشو پیپر نکالتے ہوئے عکس مراد علی نے بھی یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

"تیری ہے زمیں، تیرا آسماں
تو بڑا مہرباں تو بخشش کر
سبھی کا ہے تو سبھی تیرے ہیں
خدا میرے تو بخشش کر"

باربی ڈول کا دل خوشی سے بلّیوں اچھل رہا تھا۔ وہ اگر اس وقت اسمبلی ایریا میں کھڑی نہ ہوتی تو چھلانگیں لگاتی جا کر چڑیا سے لپٹ جاتی۔ کئی ہفتوں کے بعد اس دن اس نے کمبائنڈ اسمبلی کے دوران پہلی بار دوبارہ چڑیا کو دیکھا تھا اور اسے وہ سب گاتے سنا تھا جسے گاتا سنتے ہوئے وہ پہلی بار چڑیا کے عشق میں گرفتار ہوئی تھی۔ وہ آواز ویسی ہی میٹھی تھی، میٹھی، مدھر، پُرسوز، ملائم اور پُراثر...... اور اسمبلی ایریا آج بھی اسی ٹرانس میں تھا جس ٹرانس میں چڑیا کی آواز انہیں لے جاتی تھی۔

اس دن بریک کے دوران باربی ڈول بہت دیر چڑیا کی منتظر رہی۔ بریک گزر گئی چڑیا نہیں آئی اور جب وہ نہیں آئی تو وہ جیسے کچھ بے قراری کے عالم میں باتھ روم جانے کا بہانہ کر کے خود اس کی کلاس میں چلی آئی تھی۔

باربی ڈول کو اس کی کلاس کے دروازے میں نمودار ہوتے سب سے پہلے چڑیا کی دوست نے دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دروازے کے سامنے سے ایک بار گزری تھی، دو بار گزری تھی۔ اس نے اپنی آمد اور موجودگی کا احساس چڑیا کو دلانے کی کوشش کی تھی۔ ہمیشہ وہ یہی کیا کرتی تھی اور چڑیا اسے بار بار اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کلاس ٹیچر سے کوئی بہانہ کر کے باہر آ جاتی تھی لیکن آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ باربی ڈول بار بار دروازے کے سامنے سے گزرتی رہی اور اپنی دوست کے احساس دلانے کے باوجود بھی چڑیا نے ایک بار بھی گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کلاس سے باہر جانے کا تردد۔ کسی بت کی طرح بیٹھی وہ سامنے بلیک بورڈ کو دیکھتی رہی اور اپنی نوٹ بک میں کلاس ورک اتارتی رہی۔ ٹیچر کے بورڈ صاف کرنے کے بعد بھی وہ گردن سیدھی کیے بلیک بورڈ کو بے مقصد دیکھتی رہی اور تب تک دیکھتی رہی جب باربی ڈول نے اس کی بے اعتنائی محسوس کر کے بڑی مایوسی کے عالم میں دروازے کے سامنے سے بار بار گزرنا چھوڑ دیا اور جب اس نے دروازے کے سامنے سے گزرنا چھوڑ دیا تو چڑیا نے گردن موڑ کر پہلی بار دروازے کو رنجیدگی کے عالم میں دیکھا۔ وہ کتنی بار دروازے کے سامنے سے گزری تھی، دروازے کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود چڑیا بتا سکتی تھی اور اب جب وہ باہر نہیں تھی تو کلاس کے اندر بیٹھے بیٹھے چڑیا یہ بھی جانتی

تھی وہ اور باربی ڈول کبھی فرینڈز نہیں بن سکتی تھیں۔ نہ وہ اور باربی ڈول۔ نہ وہ اور ایبک۔

باربی ڈول کی صبح جتنی خوشی اور سرشاری کے عالم میں گزری تھی باقی کا دن اتنی ہی اداسی میں گزرا تھا۔ چڑیا نے اس سے بات نہیں کی تھی اور اس بات نہ کرنے کی وجہ باربی ڈول کی سمجھ سے باہر تھی۔

اس نے اس دن گھر جا کر اپنی ممی کو سب سے پہلے چڑیا کے بارے میں ہی بتایا تھا۔ اس کی ممی چڑیا کی واپسی کے بارے میں جان کر چونکی تھی پھر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ موضوع نہیں بدل سکی تھی۔ چڑیا نے اس سے بات کیوں نہیں کی باربی ڈول کی زندگی کا اہم ترین ایشو تھا۔ لنچ، ڈنر، ہوم ورک کہیں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اپنے باپ کے گھر آنے پر بھی باربی ڈول نے اسے سب سے پہلے چڑیا کے بارے میں ہی بتایا تھا اور اس کے باپ کا رنگ جیسے فق ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ کا چپ بیٹھا رہ گیا تھا پھر اس نے باربی ڈول سے بے حد تحکمانہ انداز میں کہا۔ "تم آئندہ کبھی چڑیا سے نہیں ملو گی، نہ ہی اس سے بات کرو گی، نہ ہی اس کی کلاس میں جاؤ گی۔" باربی ڈول باپ کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے باپ سے یہ سننے کی توقع نہیں تھی۔

"لیکن کیوں۔" باربی ڈول نے حیران نظروں سے اپنے مخصوص انداز میں باپ سے پوچھا۔ وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر کچھ جھنجلاہٹ کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ چڑیا کی واپسی کب ہوئی تھی؟ اور کیوں ہوئی تھی......؟ یہ اس کے لیے ایک نیا دردِ سر تھا۔ خیر دین کے ساتھ مصالحت کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ اب دوبارہ شہر نہیں آئے گا اور چڑیا کے واپس آنے کا مطلب تھا کہ خیر دین ان شرائط کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ لیکن بہت چالاکی اور عقلمندی دکھاتے دکھاتے بھی وہ ایک بے وقوفی کر گیا تھا کہ اس نے خیر دین کو بلیک میل کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی نوکری ختم ہو چکی تھی، پنشن روک لی گئی تھی، اسے کسی بھی قسم کی سرکاری نوکری کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا تھا...... اور اب اگر وہ خیر دین کو ایک بار پھر سے شہر چھوڑ دینے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا تو کس چیز کی دھمکی دے کر کرتا۔ مقدمے کا نئے سرے سے آغاز۔ اسے یقین تھا اس دباؤ میں خیر دین نہیں آ سکتا تھا۔ لے دے کے باقی یہی بچا تھا کہ وہ ناجائز طور پر اسے پولیس کی تحویل میں رکھتا...... اور اس بار وہ یہ کام کرنے سے جھجک رہا تھا۔ خوف اسے اس طبقے سے صرف یہ تھا کہ اگر وہ کوئی درخواست لے کر شہر کے کسی دوسرے انتظامی آفیسر یا کسی MAN یا MPA کے پاس چلا جاتا تو اس کا دھڑن تختہ ہو سکتا تھا۔ وہ جن جس کو اس نے بڑی صفائی لیکن بے حد مشکل سے بوتل میں بند کیا تھا وہ دوبارہ آزاد ہو جاتا اور اس سے زیادہ خوفناک ثابت ہوتا جتنا وہ بوتل میں بند کرتے ہوئے تھا۔ اس رات کے واقعات کی بازگشت وہ کان بند کیے ہوئے بھی بہت جگہوں پر سن رہا تھا اور اس کی وجہ ڈی سی ہاؤس کا عملہ تھا۔ وہ ڈی سی کو سرو کرتے تھے لیکن ان کی ہمدردیاں خیر دین کے ساتھ تھیں اور ڈی سی اس حقیقت سے واقف بھی تھا اور خائف بھی۔ طاقت سے وہ ان سب کو رسیاں توڑا لے ہوئے تھا لیکن وہ لوئر مڈل کلاس سے آنے والے اس ماتحت عملے کی نفسیات سے واقف تھا۔ مالیوں، ڈرائیوروں، چوکیداروں، خانساماؤں، ویٹرز اور دوسرے ملازموں پر مشتمل یہ طبقہ کسی بھی آفیسر کے لیے آستین کا سانپ ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس

کسی بھی آفیسر کی ساکھ کو خراب کرنے کے لیے زبان جیسا خطرناک ہتھیار تھا جس کا وار کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ خیر دین کے معاملے کی بازگشت کو ڈی سی صرف ڈی سی ہاؤس تک رکھنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اندرونِ خانہ شہر کے دوسرے بہت سارے انتظامی آفیسرز کو اپنے ماتحت عملے کے توسط سے خیر دین اور اس کے درمیان جھگڑے کی اصل نوعیت کا پتا تھا......اور اس تمام صورتِ حال میں خیر دین کا دوبارہ نمودار ہو جانا اس کے لیے گلے کی ہڈی کے برابر تھا جسے وہ اگل سکتا تھا نہ نگل سکتا تھا۔

اپنی desperation میں اس نے خیر دین پر ایک اور وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا وہ وار اس کے لیے کتنا تباہ کن ثابت ہونے والا تھا۔ اس سارے مسئلے سے اتنی ہوشیاری سے جان چھڑا لینے کے بعد اس نے نادانستگی میں اپنے ہاتھوں سے دوبارہ اپنے لیے وہ جال بچھایا تھا جو اس کو لے ڈوبنے والا تھا۔

☆☆☆

"میں بہت خوش ہوں۔" اس نے فون پر چہکتے ہوئے عکس کو بتایا۔ "and actually Im happy for you" "تم آنا چاہتی تھیں نا اس سیٹ پر۔"

"تم زہر لگتے ہو اس طرح کی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر دل۔ صاف صاف کہو تمہاری دلی مراد بر آئی ہے بلکہ کیا کہوں...... لاٹری نکل آئی ہے تمہاری۔" وہ عکس کی بات پر برا منائے بغیر ڈھٹائی سے ہنسا تھا، جانتا تھا وہ جھنجلائی ہوئی ہوگی۔ صوبے میں غیر متوقع انتظامی اکھاڑ پچھاڑ کا طوفان آیا تھا اور وہ دونوں بھی اس کی زد میں آئے تھے۔ عکس کی پوسٹنگ شیر دل سے زیادہ بڑے شہر میں تھی جو ڈویژن کا درجہ بھی رکھتا تھا اور اس کی وہاں سے شیر دل کی سیٹ پر تبدیلی کم از کم پروفیشنلی عکس کو اچھی نہیں لگ سکتی تھی یہ شیر دل جانتا تھا اور وہ اس صورتِ حال سے محظوظ ہوا تھا۔ وہ ڈی ایم جی کے قابل ترین آفیسرز میں سے تھے اور آپس کے تعلق کے باوجود پروفیشنلی ان دونوں کے درمیان کانٹے کا مقابلہ رہتا تھا ہمیشہ۔ شیر دل کا خیال تھا کہ عکس بہت مواقع پر بہت جگہوں پر خوش قسمت رہی تھی اور قسمت کا یہ غیر متوقع ساتھ عکس کے کیریئر گراف کے مسلسل اوپر کی طرف سفر میں ایک اسٹرونگ فیکٹر تھا اور عکس کے بارے میں یہ رائے رکھنے والا وہ اس کے بیچ میٹس میں سے واحد نہیں تھا......اور اب خوش قسمتی کی دیوی کا چند لمحوں کے لیے شیر دل پر مہربان ہونا اس کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہی تھا۔

"دیکھو تم کو بھی خوش ہونا چاہیے...... اپنے شہر میں پوسٹنگ کا موقع مل رہا ہے تمہیں، کم اعزاز کی بات ہے کیا۔" وہ اسی طرح ہنستے ہوئے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"شیر دل تم کبھی مجھے اپنے سے کسی بہتر پوسٹ پر دیکھ ہی نہیں سکتے۔" اس نے شیر دل کے بہلاوے سے بہلنے کے بجائے کہا۔

"تم دیکھ سکتی ہو؟" شیر دل نے جواباً کہا۔

"ہاں......"

"Really"

"Shut up"

"عکس! تمہیں شرم نہیں آئی اس طرح کی بات کرتے ہوئے؟"

"تم نے کہا پہلے یہ۔ چلو ٹھیک ہے میں فون رکھ رہی ہوں۔" وہ بے حد اور خلافِ معمول سنجیدہ تھی۔

"تم کیا واقعی میری سیٹ پر آنا نہیں چاہتی تھیں؟" شیر دل کو اس کے لہجے سے پہلی بار تشویش ہوئی۔

"نہیں......" اس کا جواب دوٹوک تھا۔

"کیوں؟" وہ بھی سنجیدہ ہوا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے عکس کو کسی ٹاسک یا پوسٹ کے حوالے سے اتنا reluctant دیکھا تھا۔

"بہت ساری وجوہات ہیں۔"

"کوئی ایک دو بتا دو۔" وہ واقعی حیران تھا۔

"چلو خیر اب کیا ہو سکتا ہے...... پوسٹنگ ہو گئی ہے تو سیٹ تو سنبھالنی ہی پڑے گی۔" شیر دل کو محسوس ہوا اس نے بات بدلی تھی۔

"trust me اس پوسٹنگ اور ٹرانسفر میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ تم کو پتا ہے میں کبھی tenure پوری کیے بغیر ان ایمرجنسی ٹرانسفرز کے حق میں نہیں رہا۔ میں نے تو پتا نہیں کیا کیا شروع کروایا ہے یہاں اس بجٹ کے بعد، ہر چیز کا کریڈٹ تم لے جاؤ گی۔" شیر دل ایک ہی جملے میں سنجیدہ ہوا اور پھر فکرمند۔ عکس کو ہنسی آئی وہ جانتی تھی یہ فکرمندی مصنوعی نہیں تھی۔ شیر دل کو ٹرانسفر آرڈرز آتے ہی سب سے پہلے یہی پچھتاوا لگا ہوگا کہ اس کی محنت کا پھل کوئی اور کھانے والا تھا۔

"ایک سال میں ایسے بھی کیا تیر مار لیے ہوں گے تم نے، حوصلہ رکھا کرو اور دل بڑا کروا اپنا" اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے شیر دل نے اس سے اچانک خیال آنے پر پوچھا۔

"عکس تم conventarian ہو؟" وہ اس کے سوال پر چند لمحوں کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے کہا۔

"ہاں، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مثال کے اسکول گیا تھا۔ وہاں پرنسپل آفس میں رول آف آنر پر تمہارا نام دیکھا۔ پہلے تو کبھی میں نے غور نہیں کیا تھا، اس بار اتفاقاً اسے دیکھتے ہوئے تمہارے نام پر نظر پڑ گئی میری۔" شیر دل نے اسے بتایا۔ "ویسے تمہیں اپ ڈیٹ رکھنے کے لیے بتا رہا ہوں کہ تمہارا ریکارڈ ابھی تک ٹوٹا نہیں ہے۔" عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔

"اچھا......نہیں ٹوٹا......؟ ٹوٹ جائے گا، ہر کسی نہ کسی نشانے کی زد میں ہوتا ہے، کون پرنسپل ہے آج کل وہاں؟" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"مسز ایلکس ہیں۔"

"Great...... تو مثال کو بھی تم نے وہیں ایڈمٹ کروایا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، شہر بانو کانونٹ کے علاوہ کہیں اور بھیجنے پر تیار نہیں ہوئی ورنہ میں کچھ اور try کرنا چاہتا تھا اس کے لیے۔" عکس دلچسپی لیتے ہوئے اس کی بات سنتی رہی۔ وہ مثال کے ساتھ شیر دل کی گہری جذباتی وابستگی سے واقف تھی۔ مثال شیر دل کی کمزوریوں میں سے ایک تھی اور وہ ان موضوعات میں سے ایک تھی جس پر بات کرتے ہوئے شیر دل کسی کو بھی بور کر سکتا تھا...... عکس کے علاوہ۔ وہ دلچسپی سے شیر دل کی باتیں سنتی رہتی تھی اور اس کی باتیں سنتے ہوئے اسے اکثر احساس ہوتا کہ وہ قابلِ رشک حد تک اچھا باپ تھا اور وہ کئی بار شیر دل کو یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ہر بار جواباً مسکرا دیتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے سب سے بڑا فائدہ تمہیں میری سیٹ پر آکر کیا ہونے والا ہے؟" شیر دل بات کرتے کرتے اچانک بولا۔ عکس کو موضوعِ گفتگو کی اس abrupt تبدیلی سے حیران نہیں ہوئی۔ وہ جب سے شیر دل کو جانتی تھی وہ ایسا ہی تھا۔ ایک ایشو پر بات کرتے کرتے اس کی ذہنی رو پتا نہیں کہاں پلٹا کھا جاتی۔ بے حد سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے وہ اچانک درمیان میں ایک انتہائی احمقانہ بات بڑی سنجیدگی سے کر دیتا اور کبھی انتہائی احمقانہ باتیں کرتے ہوئے سنہری حروف میں لکھی جانے والی کوئی بات کہہ دیتا۔ عکس اس کے چہرے اور ذہن کو کسی psychic کی طرح پڑھتی تھی۔

"کیا......؟"

"تمہیں ایک شاندار گھر ملنے والا ہے well decorated.well maintained شہر بانو اور میں نے جان لگا دی ہے اس بھوت بنگلے کو اس حالت میں پہنچانے میں...... جس میں تم نے اسے دیکھا ہوگا۔"

"اچھا......" مختصر جواب آیا۔

"اور بڑی مزے کی بات بھی ہے اس گھر کے بارے میں۔" شیر دل کو اچانک اس پر ایک اور انکشاف کرنے کا خیال آیا۔

"کیا......؟" عکس نے اسی انداز میں ایکسائٹڈ ہوئے بغیر کہا۔

"اس گھر کے بارے میں بہت ساری myths ہیں۔ پہلی یہ کہ یہاں بھوت ہیں اور دوسری یہ کہ یہاں رہنے والا کوئی کپل اکٹھا نہیں رہ سکتا۔ وہ ضرور الگ یا کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ چیف نے یہ کام کروانے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن کچھ ہوا نہیں ورنہ کچھ ہو جاتا تو میری پوری خواہش ہوتی کہ تم اور جواد ملہی بھی شادی کے بعد اسی گھر میں رہتے۔" وہ اس کی انتہائی سنجیدگی سے کہی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"تم کتنے mean ہو شیر دل۔"

"ہمیشہ سے تھا۔" اس نے برجستہ کہا۔ "ویسے یہ پہلی myth کوئی myth نہیں ہے۔ یہاں واقعی کچھ نہ کچھ ہے۔ لیکن وہ کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔" شیر دل کو اس سے بات کرنے کے بعد اچانک خیال آیا تھا کہ شاید اس نے کسی مافوق الفطرت چیز کا ذکر کر کے کچھ غلطی کی تھی کیونکہ عکس کو اس گھر میں اکیلا رہنا تھا لیکن پھر اسے خیال آیا تھا کہ وہ غلطی کوئی اتنی سنگین نہیں تھی۔ وہ جس عورت سے بات

کر رہا تھا اسے اس نے کم از کم اپنے سامنے اکیڈمی کے تمام عرصہ کے دوران کسی چیز سے خائف نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نرم و نازک سراپا آہنی اعصاب رکھتا تھا۔ وہ اس سے اکیڈمی میں پہلی بار متاثر بھی ایسی ہی کسی چیز سے ہوا تھا۔

اکیڈمی کے دنوں میں کسی اسٹڈی ٹور کے سلسلے میں وہ لوگ قلعہ روہتاس گئے تھے وہاں سے واپسی پر انہوں نے ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں لنچ کیا تھا۔ لنچ ابھی ارینج نہیں ہوا تھا اور اس کے انتظامات دیکھنے کے لیے ہی کچن میں دوسرے کامنرز کے ساتھ انہوں نے کچن کا وزٹ کیا تھا اور کچن سے ملحقہ ڈائننگ ہال میں گھومتے ہوئے انہیں پتا چلا کہ وہاں یہ آزادی صرف سول سروس اکیڈمی میں زیرِ تربیت ان کے کامنرز کو نہیں تھی بلکہ ہر رنگ، سائز اور شکل کے بے خوف چوہوں کو بھی تھی جن میں اور شیر دل سمیت دوسرے کامنرز کی اس ریسٹ ہاؤس میں گھومنے پھرنے کی آزادی اور بے تکلفی میں صرف یہ فرق تھا کہ وہ ان کی طرح پشت کے پیچھے ہاتھ باندھ کر اِدھر سے اُدھر نہیں جا رہے تھے...... ورنہ انہیں کم از کم اس ریسٹ ہاؤس میں انسان نامی شے سے تو کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جس اطمینان و سکون سے وہ تمام چوہے ان سب کی موجودگی کے باوجود اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں مشغول تھے ان پر کامنرز کو رشک آ رہا تھا اور رشک کی اس کیفیت کے دوران ہی مرد کامنرز میں سے کسی نے ان چوہوں میں سے کسی ایک کو پکڑ کر لڑکیوں کو خوفزدہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

شیر دل ویسے تو اس طرح کے پریکٹیکل جوکس میں شامل نہیں ہوتا تھا لیکن اس دن یہ عکس کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ڈرتا ہوا بھاگتے ہوئے دیکھنے کی خواہش تھی جس نے اسے بھی اس پریکٹیکل جوک کا حصہ بنا دیا۔

چند چوہوں پر ریسٹ ہاؤس کے ملازمین کی مدد سے بڑی آسانی سے کپڑا ڈال کر قابو پایا گیا اس کے بعد انہیں ایک تھیلے نما بیگ میں منتقل کر دیا گیا اور لنچ کے بعد جب سب لوگ سویٹ ڈش سے محظوظ ہو رہے تھے تو ایک کامنرز نے بڑے اطمینان کے عالم میں ٹیبل کے ایک کونے پر بڑی احتیاط سے باری باری وہ دو تین چوہے چھوڑ دیے تھے۔ ڈائننگ ہال میں دو تین ڈائننگ ٹیبلز کو جوڑ کر بہت لمبی چوڑی کھانے کی ٹیبل سجائی گئی تھی جس کے ایک سرے سے چوہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ شروع کے چند قدموں کے بعد انہوں نے ٹیبل کے اطراف سے نکلنے کی کوشش کی لیکن دونوں اطراف میں لوگوں کی قطاروں کو دیکھ کر وہ کسی رکاوٹوں والی ریس میں شریک کھلاڑیوں کی طرح بالکل سیدھا بھاگنے لگے تھے۔ ڈونگوں، چمچوں، پلیٹوں، ڈشز کی رکاوٹوں کو برق رفتاری اور ہوشیاری سے پھلانگتے ہوئے ان چوہوں کے اچانک کہیں سے نمودار ہو جانے پر وہاں بیٹھے پاکستان کی مستقبل کی اسٹیبلشمنٹ کو پہلے سکتہ ہوا، پھر ان میں سراسیمگی پھیلی اور پھر ہڑبونگ اور چیخ پکار کا آغاز ہوا...... اور بھاگنے والوں میں پہلی صف میں وہ مرد کامنرز تھے جنہیں اس منصوبے سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ خواتین سے تو خیر چوہا نظر آنے پر اس کے علاوہ کسی اور ردِعمل کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ کرسیاں الٹاتی، چمچ پلیٹیں اور گلاس گراتی...... بیگز اور سینڈلز کو پھینکتی...... دوپٹوں سے الجھتی چیخ پکار کے کورس کے ساتھ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں تمام خواتین

کامنرز کمرے سے باہر تھیں۔ مرد کامنرز ان سے پہلے ہی باہر بھاگ چکے تھے۔ ہال میں اب ہنسی سے دوہرے ہوتے ہوئے ٹیبل کے ایک سرے پر کھڑے وہ چند کامنرز تھے جو اس پریکٹیکل جوک کے خالق تھے یا ٹیبل کے بالکل درمیان ایک کرسی پر کسٹرڈ پڈنگ کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھی عکس مراد علی تھی جس کے سامنے سے اب وہ چوہے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔

وہ اس وقت کسٹرڈ پڈنگ کے چند آخری چمچ لے رہی تھی جب اس نے ٹیبل کے دائیں طرف چیخ پکار کے ساتھ افراتفری دیکھی اور اس افراتفری کی نوعیت جاننے کے لیے ٹیبل پر کچھ آگے کو جھک کر گردن موڑ کر اس نے دائیں طرف کی میز کے حصے کو دیکھا اور تب اس نے پہلی بار ٹیبل پر بے حد تیزی سے حرکت کرتی ان ننھی سی چیزوں اور ان چیزوں کے بیک گراؤنڈ میں کھڑے ہنسی سے بے حال شیر دل اور چند دوسرے کامنرز کو دیکھا۔ صورتِ حال کو سمجھے بغیر جو پہلا کام اس نے کیا تھا وہ نہایت سرعت اور سکون کے ساتھ سویٹ ڈش کا اپنا پیالہ اٹھانا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس حرکت نے کسی کو حیرانی کا پہلا جھٹکا دیا تھا۔ جہاں چمچ، پلیٹیں اور گلاس گرائے اور چھوڑ کر بھاگا جا رہا تھا وہاں وہ بڑے اطمینان کے ساتھ میز پر بھاگتے چوہوں کو کسٹرڈ پڈنگ کھاتے ہوئے دیکھنے لگی تھی یوں جیسے وہ ویملڈن کے سینٹر کورٹ میں رائل گیلری میں بیٹھی گرینڈ سلام کا فائنل دیکھ رہی تھی۔ شیر دل اس کے انداز کے لیے اس سے اچھی analogy نہیں لاسکتا تھا۔ عکس نے اس کی امیدوں پر گھڑوں پانی ڈالا تھا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر پڑے کسٹرڈ پڈنگ کے ایک باؤل کو خود کو اسپائڈر مین سمجھنے والے ایک چوہے نے پھلانگنے کی کوشش کی اور اس کوشش کے دوران وہ اس پلیٹ سے غڑاپ سے باؤل کے اندر گرا جس پر سے وہ ہوا میں چھلانگ لگا کر بلند ہوا تھا۔ پڈنگ کے چند چھینٹے باہر آکر گرے اور وہ بدحواسی کے عالم میں اس پڈنگ سے نکلنے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا جو اس وقت اس کے لیے دلدل ثابت ہو رہی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی ”شہد کی دلدل“ نے بے حد ہمدردی سے اسے دیکھا تھا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے پیالے میں موجود پڈنگ کا آخری چمچ بڑے پُرسکون انداز میں منہ میں ڈالتے ہوئے شیر دل نے عکس کو پڈنگ کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے دیکھا پھر اسی سکون کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا کر سرونگ اسپون...... کے ساتھ نجلجی پڈنگ سے نبرد آزما چوہے کو باؤل سے نکالا اور بے حد احتیاط کے ساتھ ٹیبل پر چھوڑ دیا۔ چوہا سیکنڈز میں وہاں سے غائب ہوا تھا۔ اپنی گود میں رکھا ٹیبل نیپکن بے حد نفاست سے تہ کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ کرسی کے پائے کے قریب رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے بڑے اطمینان کے عالم میں کرسی دھکیل کر ہال سے چہل قدمی کے انداز میں باہر گئی تھی۔ وہ اپنے جس Composure کے لیے گروپ ٹاسکس کے دوران مشہور تھی وہ Composure آج بھی حواس باختگی میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ شیر دل کو اگر عکس مراد علی کو ایک چوہا دیکھ کر بھاگتا نظر آنے کی تمنا تھی تو وہ تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔ اپنے حواس اور اعصاب پر قابو رکھنے کا اس سے بہترین ڈسپلے شیر دل نے کسی عورت میں نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

اگر کوئی ایک چیز تھی جس کو چڑیا ڈی سی ہاؤس سے نکالے جانے کے بعد مس کرتی تھی تو وہ اس کے وہ سات ساتھی بونے تھے...... ٹوکو، کٹو شنٹو، ٹوٹو، کنفا، منفا، ڈیڈو...... جو اس رات اس گھر میں ہی رہ گئے تھے۔ کئی دن تو چڑیا کو ان کا خیال ہی نہیں آیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے ان کا خیال آنے لگا تھا۔ وہ ایلس تھی جسے اس کے ونڈر لینڈ سے نکال دیا گیا تھا اور لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس ونڈر لینڈ میں دوبارہ نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہ اس ونڈر لینڈ کا رستہ بھول چکی تھی اور اس کے سات ساتھی اس ونڈر لینڈ سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی چڑیا اب کسی طرح بھی اس ونڈر لینڈ اور اس میں بسنے والے اپنے سات ساتھیوں کا کوئی تصوراتی رابطہ اور تعلق بھی نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ چڑیا وہ پاس ورڈ بھول گئی تھی جسے استعمال کر کے وہ اپنے تصورات کی اس خوب صورت دنیا میں دوبارہ رسائی حاصل کر سکتی۔

وہ سات بونے کام پر گئے تھے اور ان کی عدم موجودگی میں سنو وائٹ زہر والا سیب کھا کر سو گئی تھی۔ چڑیا نے اپنی فیری ٹیل کا خاتمہ بھی نہیں کیا تھا۔ اپنے سات ساتھی بونوں سے بے پناہ شکایتیں رکھنے کے باوجود...... وہ کیوں اس کی مدد کو نہیں آئے تھے؟ انہوں نے کیوں اس کو اکیلا چھوڑ دیا تھا؟ انہوں نے کیوں اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہونے دیا جو ہوا تھا؟ گلے شکوؤں کی ایک لمبی فہرست تھی جنہیں دل میں لیے چڑیا بہت دیر تک ان ساتوں سے خفا رہی تھی لیکن پھر وہ گلے شکوے آہستہ آہستہ خود ہی ختم ہو گئے تھے۔ وہ اب صرف بے حد رنجیدگی سے انہیں مس کرتی تھی۔ اس کی تصوراتی دنیا میں اب کوئی جیتا جاگتا ساتھی نہیں تھا اور اس تنہائی نے چڑیا کو اکیلا ہی نہیں خاموش بھی کر دیا تھا۔ اکیلے بیٹھ کر اپنے آپ اور کنفا، منفا سے باتیں کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ کھیل کود اور ان کو اپنے پورے دن کی سرگرمیوں کا بتا کر ان کے قصے سننے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

خیر دین حلیمہ، چڑیا اور وہ بچا کھچا سامان لیے تھانے سے رہائی کے اگلے ہی دن اپنے گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ جہاں اس کی اور چڑیا کی رسوائی کی داستان اس کی آمد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی۔ شہر میں اب اردلیوں، نائب قاصدوں، مالیوں اور چوکیداروں کے طور پر سرکاری اداروں میں گاؤں کے بہت

سارے لوگ کام کر رہے تھے اور خیر دین کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ان تمام واقعات کو گاؤں اور وہاں موجود اپنے خاندان تک پہنچنے سے روک پاتا، چھپا سکتا...... اور ایسا ممکن ہوتا تب بھی خیر دین اپنے خاندان سے یہ کبھی نہیں چھپانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے خونی رشتوں کے کندھوں پر سر رکھ کر رونا چاہتا تھا، اس اذیت اور تکلیف کو ان کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا جو وہ کسی کے ساتھ نہیں بانٹ پایا تھا۔

گاؤں پہنچنے کے بعد خیر دین کا پہلا کام اپنے گھر کے دروازے پر لگی وہ تختی اتارنے کا تھا جو پچھلی کئی دہائیوں سے اس کے گھر کے دروازے پر سجی گاؤں میں اس کے خاندان کی عزت اور پہچان کا باعث تھی اور اس تختی کے اترتے ہی گاؤں میں خیر دین کے نام اور خاندان کا دبدبہ بھی ختم ہو گیا تھا، وہ اب پھر سے کمی کمین ہو گئے تھے۔ وہ کمی کمین جو شاہ کے کتے تھے اور شاہ کی وجہ سے اپنی اوقات بھول بیٹھے تھے۔

سرکاری نوکری اور اس نوکری کے ساتھ ملنے والی تمام مراعات گنوا کر خیر دین زندگی میں پہلی بار خالی جیب اپنے گاؤں اور گھر پہنچا تھا۔ ساری عمر وہ جب بھی چھٹی پر گھر آتا رہا اس کے گھر ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا...... گاؤں کے لوگ اور قریب اور دور کے رشتے دار اس کے پاس چھوٹے موٹے کاموں کے لیے یوں رقعے اور چٹھیاں لے کر آتے جیسے وہ ڈی سی کا خانساماں نہیں خود ڈی سی تھا اور خیر دین وہ ساری چٹھیاں اور رقعے اکٹھے کرتا اگلی چھٹی تک واقعی ایک ایک کر کے ان تمام درخواستوں پر عمل درآمد کے لیے اپنے صاحب اور صاحب کے جاننے والے دوسرے صاحبوں سے سفارش کرواتا پھرتا...... اور خیر دین کے کہنے پر کام ہوتا تھا تو گاؤں میں خیر دین کے خاندان کے سر پر ایک اور قلغی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔

اب وہی خیر دین لٹے پٹے حال میں واپس آیا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا اب بھی اسی طرح بندھا ہوا تھا لیکن اب وہ سب لوگ تماشائیوں کا روپ دھار کر وہاں آئے تھے...... یہ دیکھنے اور سننے کے لیے کہ خیر دین آسمان سے زمین پر کس طرح آیا تھا...... اور زمین پر آنے کے بعد اس کی حالت کیا تھی۔ خیر دین جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہاں سانپ سیڑھی کا کھیل دیکھ کر خوش ہونے والوں کی بڑی تعداد تھی جن کے لیے دوڑ میں سب سے آگے بھاگنے والے کو فنشنگ لائن کے قریب پہنچنے سے پہلے منہ کے بل گرتے دیکھ کر تالی بجا کر اٹھنے والوں کی تعداد اس کی شاندار رفتار اور کارکردگی کو دیکھ کر داد و تحسین دینے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ خیر دین اب ان جیسا ہو گیا تھا۔ ان سب کی طرح اور یہ امر باعثِ اطمینان تھا۔ چار جملے اس سے ہمدردی اور ڈی سی اور حکومت پر ملامت کے بعد وہ سب جس ایک احساس کے ساتھ خیر دین سے مل کر رخصت ہوتے وہ یہی اطمینان تھا۔ ان کے اس یقین میں اضافہ ہوتا کہ لاکھ پڑھ لکھ لو، کچھ نہیں ہوگا۔ ان کے طبقے کے حالات نہیں بدلتے اور نہیں بدلیں گے۔ وہ خدمت اور ذلت کے لیے پیدا ہوئے تھے اور یہی دو کام کرتے مر جائیں گے۔ اب خیر دین کو ہی لے لو ساری عمر سرکار کی خدمت کر کے اتنا پڑھ کر لکھ کے بھی کیا مل گیا اسے، خود بھی خوار ہوا اور بچی کی زندگی بھی برباد کر دی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ گاؤں میں اپنی بھٹی پر بیٹھتا یا زمیندار کا مزارعہ بن جاتا یا پھر اپنی ہی

خاندانی زمین پر کاشت کاری کر لیتا...... دال روٹی تو اس سے بھی چل ہی جاتی۔ خیر دین ان سب کے لیے اپنی زندگی کو بہتر کرنے کے لیے جدوجہد نہ کرنے کے حق میں دی جانے والی ایک سنہری مثال بن گیا تھا۔

آہستہ آہستہ خیر دین کے گھر آنے والے لوگوں کی تعداد میں کمی ہونا شروع ہو گئی تھی اور اس کمی کے ساتھ ساتھ خیر دین کے خاندان والوں میں بھی اس کے اور حلیمہ اور چڑیا کے لیے دکھائی جانے والی ابتدائی ہمدردی اور گرم جوشی بھی ختم ہوتی گئی تھی۔ خیر دین اس سے پہلے ساری عمر انہیں دینے والا تھا اب ان سے لینے والا بن کر پلٹا تھا۔ ایک کمرے اور دو وقت کی روٹی کے علاوہ خاندان والوں کے پاس خیر دین کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا اور خود خیر دین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گاؤں میں کیا کرے یا کیا کر سکتا تھا۔ بھٹی پر وہ نہیں بیٹھ سکتا تھا، نہ تو اسے اس کام کا تجربہ تھا اور نہ ہی ساری زندگی سرکاری نوکری کرنے کے بعد وہ اس مشقت والے کام کے قابل رہا تھا۔ واحد کام جو وہاں وہ کر سکتا تھا وہ کاشت کاری تھی اور اس کے لیے زمین چاہیے تھی۔ اس کے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں ملنے والی زمین کا رقبہ اس کے تمام بھائی مشترکہ طور پر کاشت کرتے تھے۔ زمین کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا اس مشترکہ خاندانی کاشت کاری کے نتیجے میں صرف اس قابل ہو سکا تھا کہ پورے خاندان کو سال بھر کا اناج دے دیتا یا پھر اتنی سبزی پیدا کر دیتا جو اس کے بھائی، ہر روز قریبی شہر کی منڈی میں ریڑھے پر لاد کر بیچ آتے اور اس سے ملنے والی رقم سے ان کے اور زمین کے اخراجات پورے ہوتے رہتے۔ سبزی کی فروخت سے ملنے والی وہ رقم پہلے ہی بہت سارے حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد کبھی بھی ہر روز کسی کے حصے میں آنے والے چند سو سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی اور ان چند سو میں سے بھی کچھ اور کمی کرنے کے لیے خیر دین کو حصہ دار بنانے کا فیصلہ خاندان کے ہر شخص کے لیے مشکل تھا۔ وہ اس حصہ داری کے بجائے صرف اس بات پر آمادہ تھے کہ خیر دین کی تین وقت کی روٹی مختلف بھائیوں کے چولہوں پر تقسیم کر دی جاتی۔ خیر دین نے سرکاری نوکری کے دوران گاؤں میں ہی تھوڑی اور زمین خریدی تھی لیکن اپنے ماں باپ کی محبت میں اس

نے زمین کے اس ٹکڑے کو بھی اپنے بھائیوں کو کاشت کاری کے لیے سونپ دیا تھا۔ زمین کا وہ ٹکڑا اس کے بھائیوں کے زیرِ استعمال ہونے کے باوجود اس کے اپنے نام تھا۔ گاؤں میں واپس آ جانے کے چند ہفتوں میں ہی خیر دین کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ خاندانی زمین میں سے فوری طور پر کسی قسم کا کوئی مالی فائدہ ملنا مشکل تھا لیکن وہ اپنی ملکیتی زمین کو اپنے زیرِ استعمال لے آتا تو فوری طور پر اس کے بہت سارے مالی مسائل حل ہو سکتے تھے۔ اپنے بھائیوں سے اس نے ایک شام اس زمین کو واپس لینے کی خواہش کا اظہار کیا اور اگلے دن وہ جس گھر میں رہ رہا تھا وہ اس کے خونی رشتوں کا نہیں رہا تھا۔ ایک ہی رات میں ان سب کی نظریں بدل گئی تھیں۔ خیر دین نے ایسی بے گانگی اور بے رخی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ خیر دین کو اس گھر میں رکھنے پر تیار تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی خیر دین کو اس کی زمین واپس کرنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اس کا جائز حق ہوتا نہ ہوتا...... خیر دین جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں اس کے لیے یہ مزید ایک صدمہ اور دھچکا تھا۔ اپنوں سے ملنے والے زخم تھور کے زہر کی طرح ہوتے ہیں۔ شہر سے خیر دین مر کے آیا تھا اور خاندان والوں نے اسے دفن کر دیا تھا۔ ایسا بوجھ اس نے کبھی زندگی میں نہیں اٹھایا تھا۔ ایسا محتاج اور کمزور خیر دین کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں سے زمین کا مطالبہ کر سکتا تھا لیکن ان سے لے نہیں سکتا تھا کیونکہ ان کے ساتھ ان کے بیٹے کھڑے تھے اور بھتیجوں کی اس لمبی فوج سے خیر دین ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین کو ایک بیٹا نہ ہونے کا دکھ ہوا تھا...... بیٹے شاید ایسے موقعوں کے لیے ہی مانگے جاتے ہیں۔

خیر دین روز زمین پر جاتا...... بھائیوں اور بھتیجوں کے منہ نہ لگانے کے باوجود ڈھیٹوں کی طرح ان کے ساتھ کام کرتا پھر شہر جا کر سبزی بیچتا...... اور اس ساری مشقت کے عوض کوئی اسے پچاس سو پکڑا دیتا۔ وہ چند نوٹ ہاتھ میں لے کر خیر دین خون کے آنسو روتا۔ اس پر چڑیا اور حلیمہ کی ذمے داری نہ ہوتی تو وہ مر جاتا لیکن کبھی اس طرح حق کے بجائے بھیک نہ لیتا لیکن اس کی زندگی میں موجود دو عورتوں نے اسے بہت کمزور کر دیا تھا...... مجبور، کمزور اور بے بس۔

چڑیا اپنے نانا کی اس بے بسی کی داستان کی عینی شاہد تھی۔ ایک بچہ انسانوں کے عروج اور زوال کی سائیکل کو نہیں سمجھتا۔ اپنے اردگرد سب کچھ اچھا دیکھ کر وہ یہی سمجھتا ہے کہ دنیا بس ایسی ہی اچھی ہوتی ہے اور ایسی ہی رہے گی اور اپنے آپ کو برے حالات میں بھی دیکھ کر اس کی سوچ یہی ہوتی ہے۔ چڑیا نے اس گاؤں میں خیر دین کا عروج و زوال، عروج و زوال سے واقف ہوئے بغیر دیکھا تھا اور خیر دین کے ساتھ اس نے اپنا عروج و زوال بھی دیکھا تھا، وہ خیر دین کے ساتھ چھٹی پر گاؤں آتی تو وہاں اس کا بھی شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وہ جتنے دن وہاں رہتی شاہانہ انداز میں رہتی کیونکہ وہ خیر دین کی نواسی تھی۔ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی تھی اور خیر دین کی طرح انگریزی بول سکتی تھی اور ہمیشہ فرسٹ آتی تھی۔ وہ فراک پہنتی تھی اور اپنے خاندان کے تمام بچوں سے زیادہ اچھی اور مہنگی چیزیں تھیں اس کے پاس۔ ربڑ تھے، گھڑی تھی، بالیاں تھیں، بوٹ بھی تھے۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح مسواک اور دنداسے سے دانت صاف نہیں کرتی تھی ٹوتھ پیسٹ کرتی تھی اور وہ اپنے بالوں کو دیسی صابن سے رگڑ رگڑ کر نہیں دھوتی تھی

بلکہ شیمپو کرتی تھی۔ وہ اپنے بالوں میں برش کرتی تھی اور پاؤڈر اور کریم لگاتی تھی۔ وہ چاول ہاتھ سے نہیں کھاتی چمچ سے کھاتی تھی، شیشے کے گلاس میں پانی پیتی تھی اور اس کے پاس ایسے کھلونے تھے جو گاؤں میں کبھی کسی نے دیکھے تک نہیں تھے۔ خیر دین نے چڑیا کو میم صاحب کی طرح پالا تھا اور چڑیا اور چڑیا کا رہن سہن پورے خاندان کے بچوں کو اس پر رشک کرنے پر مجبور کر دینے کے لیے کافی تھا۔

اور اب وہ میم صاحب ایک تماشے کی صورت میں ان کے بیچ واپس آئی تھی۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں دنوں میں ہر جگہ پھیل گئی تھیں اور انہیں پھیلانے میں خیر دین کے اپنے خاندان کا زیادہ حصہ تھا۔ چڑیا کے سامنے بچے چڑیا کے بارے میں اس کو دیکھتے ہوئے سرگوشیاں کرتے یا اسے عجیب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے...... اسے اپنے جیسا بلکہ اپنے سے زیادہ بری حالت میں دیکھنا خاندان کے بچوں سے زیادہ ان کے ان بڑوں کو خوشی اور تسکین پہنچا رہا تھا جو اس سے پہلے اسے دیکھ کر اپنے بچوں کے حوالے سے مزید حسرتوں کا شکار ہو جاتے تھے۔

وہاں آنے کے چند دن کے بعد ہی خیر دین نے اسے گاؤں کے اسی اسکول میں دوبارہ داخل کروا دیا جہاں سے اس نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ چڑیا اس دن پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اسے اس کانونٹ سے بہت پیار تھا جہاں وہ پڑھ رہی تھی وہاں اس کی فرینڈز تھیں فیورٹ ٹیچرز تھیں اور باربی ڈول بھی تھی۔ اس کی تصوراتی دنیا پہلے ہی جیتے جاگتے کرداروں سے محروم ہو چکی تھی اب اس کی حقیقی دنیا بھی ان تمام لوگوں سے محروم ہو گئی تھی جن سے وہ پیار کرتی تھی۔

گاؤں کے اسکول میں گزارے ہوئے چند ہفتے چڑیا کی زندگی کا ایک اور بے حد تکلیف دہ تجربہ تھا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں چڑیا کے ساتھ ہونے والے واقعہ سے آگاہ تھا اور اسکول میں آنے والا ہر بچہ بھی چڑیا کو جیسے اسی حوالے سے پہچاننے اور اس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ پہلے ہی دن اس کی ایک ٹیچر نے اسے اسٹاف روم میں بلوا کر وہاں تمام ٹیچرز کے درمیان ڈی سی ہاؤس میں ہونے والے واقعے کے بارے میں اسے کریدنا شروع کر دیا۔ وہ خوف سے اسی طرح گنگ ہو گئی تھی جس طرح اس واقعے کے بارے میں کسی کے بھی سوالوں سے ہو جاتی تھی اور اس کی خاموشی نے جیسے ان ٹیچرز کو Irritate کیا تھا۔ چڑیا پہلے دن ہی اپنی ٹیچرز پر ایک برا تاثر چھوڑ کر آئی تھی جو اس کے اس اسکول میں آخری دن تک قائم رہا تھا۔

اس کی ٹیچر کا وہ تجسس صرف ایک ابتدا تھی اس کے بعد کے ہفتوں میں چڑیا نے اپنی ہم عمر بچیوں اور ٹیچرز کی طرف سے بدترین جنسی سوالات اور darassment کا سامنا کیا تھا۔ اس کی اپنی کلاس کی بچیوں سے لے کر بڑی کلاسز کی بچیوں تک ہر ایک کو چڑیا سے اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لیے ایک عجیب سا تجسس اور بے چینی رہتی تھی۔ وہ کسی فری پیریڈ یا لنچ بریک کے دوران اسکول کے میدان میں بڑی کلاسز کی بچیوں سے چھپتی پھرتی جو اسے گروپ کی شکل میں گھیر لیتیں اور پھر ان سے انتہائی بے ہودہ سوالات کرنا شروع کر دیتیں...... ایسے سوالات جن پر چڑیا کبھی خوفزدہ ہوتی تو کبھی شرم سے سرخ اور کبھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ اس اسکول میں اس کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب وہ دن میں کم

از کم ایک بار کسی بچی یا ٹیچر کی وجہ سے روتہ پڑتی ہو۔

اور اسکول میں اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ خیر دین نہیں جانتا تھا۔ چڑیا جو ہمیشہ اپنے اسکول میں ہونے والی ایک ایک بات خیر دین کو بتایا کرتی تھی اب اس واقعے کے حوالے سے کچھ بھی خیر دین کو بتانے سے ڈرتی اور جھجکتی تھی۔ اسکول سے اب اسے خیر دین کے بجائے حلیمہ لینے آتی تھی اور وہ حلیمہ کے سامنے اترے چہرے کے ساتھ اسکول سے برآمد ہوتی اور خاموشی سے اس کے ساتھ گھر کے رستے پر چل پڑتی۔ پورے دن میں وہ پہلا موقع ہوتا تھا جب وہ خوف و ہراس کی اس کیفیت سے باہر آتی تھی اور جب وہ سر اٹھا کر رستے میں آنے والے کسی شخص کو دیکھ سکتی تھی، سر اور نظریں جھکائے نہیں چلتی پھرتی تھی۔ حلیمہ نے بیٹی کے اترے چہرے کو دیکھ کر پریشان ہونا یا سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ زندگی میں اب اتنے مسئلے ہوگئے تھے کہ چڑیا کی اداسی اور ناخوشی جیسا مسئلہ بہت پیچھے چلا گیا تھا۔

چڑیا اسکول والے عقوبت خانے سے گھر والے چھوٹے سے عقوبت خانے میں آجاتی جہاں باقی کا سارا دن وہ اس کمرے میں ہی بیٹھے بیٹھے گزار دیتی جس میں حلیمہ اور خیر دین کی رہائش تھی۔ وہ وہیں ہوم ورک کرتی وہیں کھانا کھاتی اور پھر وہیں اپنے کھلونے یا کہانیوں کی کوئی کتاب نکال کر بیٹھ جاتی اور اس طرح ایک اور دن گزر جاتا۔ خیر دین شام کو گھر آتا تھا اور اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ اس کے لیے چڑیا یا حلیمہ سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ اسکول کی پڑھائی اتنی آسان تھی کہ خیر دین کو پہلے کی طرح اسے پڑھانے کی جدوجہد میں خود کو ہلکان نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ اب بھی چڑیا کی ہر چیز کا خیال کرتا تھا اس کے کھانے پینے کا لباس کا...... اب بھی وہی اس کی پونی یا چٹیا کر کے اسے صبح اسکول چھوڑ کر آتا تھا لیکن بس اس میں فرق یہ آیا تھا کہ اب اس نے اپنی پروا کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ بالوں کو نہیں رنگتا تھا اب، نہ ہی کپڑے استری کر کے پہنتا تھا...... نہ اپنی ڈاڑھی باقاعدگی سے منڈواتا تھا اور چڑیا کو خیر دین پر ترس آتا تھا اسے لگتا تھا خیر دین کے اس حلیے کی ذمے دار بھی وہی ہے اس نے اپنے نانا کو اتنا بوڑھا کر دیا تھا۔

سب کچھ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر چڑیا زندگی میں پہلی بار امتحان میں فیل نہ ہو جاتی اور اس کی ناکامی خیر دین کے لیے جیسے ہارٹ اٹیک سے کم نہیں تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم میں رزلٹ کارڈ میں تقریباً ہر مضمون کے نیچے لگی سرخ لکیر کو دیکھتا رہا۔ سہ ماہی امتحان کا نتیجہ لینے وہی اسکول گیا تھا اور رزلٹ کارڈ کو دیکھ کر ہونے والی بے یقینی اس کے پیپرز کو دیکھ لینے کے باوجود بھی قائم رہی تھی۔ اس کے برابر کھڑی چڑیا سر جھکائے نظر پاؤں پر جمائے ہوئے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی اور اس کی کلاس ٹیچر خیر دین کو چڑیا کی شکایت پر شکایت لگا رہی تھی۔ خیر دین گم صم اس کو لیے اسکول سے آگیا تھا۔ اس نے رستے میں چڑیا سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

گھر آکر اس نے گاؤں آنے کے بعد پہلی بار چڑیا سے اسکول کے حوالے سے بات کی۔ ''تم پڑھنا نہیں چاہتیں چڑیا؟'' چڑیا نے نفی میں سر ہلا دیا خیر دین کو یقین نہیں آیا۔

''تم پڑھو گی نہیں تو کیا کرو گی؟'' چڑیا بے تاثر چہرے کے ساتھ خیر دین کو دیکھتی رہی۔

''میں نے تم پر کتنی محنت کی ہے چڑیا۔'' اس نے جیسے بے بس سے انداز میں چڑیا سے زیادہ خود سے

کہا تھا۔

''یہ اسکول مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' بہت دیر کے سوال جواب کے بعد چڑیا کے منہ سے بالآخر نکلا۔

''کیوں؟'' خیر دین حیران ہوا۔

''یہاں سب مجھ سے غلط سوال کرتے ہیں۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ خیر دین دھک سے رہ گیا تھا اسے تو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ چڑیا کو اسکول میں ایسا کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ اس نے چڑیا سے غلط سوالوں کی نوعیت دریافت نہیں کی تھی، اسے اندازہ تھا وہ سوال کیسے ہوں گے۔

اس رات خیر دین نے بیٹھ کر ایک بار پھر سوچا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے...... وہ وہیں گاؤں میں رہے یا پھر شہر کو پلٹ جائے اور شہر کو پلٹ جانے کا مطلب اس معاہدے کی خلاف ورزی تھی جو وہ ڈی سی کے ساتھ کر کے آیا تھا۔ چڑیا اس کی زندگی کا فوکس تھا اس نے آج تک جو کچھ کیا تھا چڑیا کے لیے کیا تھا۔ اس کو آگے بھی جو کچھ کرنا تھا چڑیا کے لیے ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

باربی ڈول نے چند ایک بار ہوم ورک کرتے ہوئے اپنی ممی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کی ممی فون پر اس کی دادی سے بات کر رہی تھی اور بات کرتے ہوئے مکمل طور پر مگن تھی۔

''جی ممی بس ایک ہفتے تک شفٹ ہو جائیں گے۔'' باربی ڈول کی ممی نے مسکراتے ہوئے اپنی ساس سے کہا تھا۔

''چلو اچھا ہے...... حبیب نے سیکریٹری کے پیچھے پڑ کر پوسٹنگ کروائی ہے اس بار اور وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے ورنہ حبیب کہاں اس چیز پر believe کرتے ہیں کہ ایک جگہ پر مدت مکمل کیے بغیر کسی دوسری جگہ ٹرانسفر کروائی جائے۔'' اس نے ساس کی باقی بات پر دھیان نہیں دیا۔

''میری وجہ سے؟ میری وجہ سے کیوں ممی؟'' اس نے ساس سے کہا۔

''تم نے ہی تو کہا تھا ٹرانسفر کے لیے...... تم کمفرٹیبل نہیں تھیں گھر میں...... انہی بونوں وغیرہ کی وجہ سے...... کہہ رہا تھا کہ گھر میں پھر کچھ عجیب و غریب واقعات ہونے لگے ہیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی ساس کو کیا جواب دے۔ وہ اس وقت حیرت کے ایک شدید جھٹکے کا شکار تھی۔ اس کے شوہر نے یہ امپریشن دے کر اس کے سسر سے اپنی ٹرانسفر کے لیے سفارش کروائی تھی کہ اسے اس گھر میں مسائل ہو رہے تھے۔ حالانکہ وہ پرسائل اب پرانی بات ہو چکی تھی، وہ ان سب چیزوں کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر چکی تھی، یہ اب اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں رہی تھی...... اور ابھی حال ہی میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا جس کی شکایت اس نے اپنے میاں سے کی ہو، پھر اس کے شوہر کو اچانک اس طرح بیٹھے بٹھائے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کا نام استعمال کیا۔ اس نے ساس سے کوئی تردید نہیں کی تھی اور موضوع بدل کر بات کرنے لگی لیکن وہ بری طرح الجھ گئی تھی اور جب

دس منٹ بعد فون رکھ کر وہ باربی ڈول کی طرف متوجہ ہوئی تو باربی ڈول بھی بے حد بیزار بیٹھی تھی۔
"Mummy I need to tell you something"
اس نے فون سے فری ہوتی ہوئی ماں کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر کہا۔
"ہاں بتاؤ۔" اس کی کلاس ورک کی نوٹ بک اٹھاتے ہوئے اس کی ممی نے اس سے کہا۔
"پاپا آج اسکول آئے تھے۔" وہ نوٹ بک پر نظر دوڑاتے ہوئے چونک گئیں۔
"پاپا آئے تھے؟" اس نے حیرانی سے باربی ڈول سے پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔
"لیکن وہ مجھ سے نہیں ملے...... ان کو ملنا چاہیے تھا نا ممی۔" باربی ڈول نے اسے بتایا پھر ساتھ ہی شکایت کی۔
"تم سے نہیں ملے تو پھر تمہیں کس نے بتایا؟" اس نے سنجیدگی سے باربی ڈول سے پوچھا۔
"مجھے ٹیچر نے بتایا۔" "He had a fight with sister" وہ باربی ڈول کی بات پر کچھ لمحے ہل نہیں سکی پھر اس نے بے یقینی سے کہا۔
"Your Papa had a fight with sister"
"yes" باربی ڈول نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"which sister?"
"Sister Agnus" وہ اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔
"اور ممی پاپا نے سسٹر سے کہا تھا کہ چڑیا کو اسکول سے نکال دیں۔" باربی ڈول نے روانی سے لیکن کچھ بے چینی سے کہا۔

☆☆☆

فاطمہ نے ایبک کو اپنی ڈیبیٹ کا آغاز کرنے کے لیے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کا نام اناؤنس ہونے سے لے کر اب تک وہ اس سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پائی تھی۔ اپنی ڈیبیٹ کا کاغذ ہاتھ میں لیے وہ ایک بت کی طرح بیٹھی اس کی تین منٹ کی تقریر سنتی رہی تھی جس کے دوران ہال کئی بار تالیوں سے گونجا تھا اور کئی دفعہ حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹیں آئی تھیں۔ صرف وہ تھی جس نے نہ تالی بجائی تھی نہ وہ مسکرائی تھی۔ وہ گم صم اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ اسٹیج سے تالیوں کی گونج میں نیچے اترا تھا اور اپنی ٹیم کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ فاطمہ کو اب اپنے ادارے کی ٹیم کو لیڈ کرنا تھا اور اب ان کی ٹیم کی باری تھی اور میزبان ٹیم ہونے کی حیثیت سے وہ تالیوں سے گونجتے ہال میں اپنا نام لیے جانے پر اپنی کرسی سے اٹھی تھی۔ اس کے ادارے کے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز کے تالیاں بجاتے ہاتھوں میں پہلے سے بھی زیادہ جوش آ گیا تھا۔ وہ اپنے ادارے کی سب سے بہترین ڈیبیٹر تھی اور جہاں وہ ہوتی وہاں پہلی پوزیشن کہیں اور نہیں جا سکتی تھی...... تو آج بھی وہ سارے اس ہال میں اسی اندھے اعتماد اور یقین کے ساتھ بیٹھے تھے...... صرف سیڑھیاں چڑھتی فاطمہ تھی جو اس اعتماد اور یقین سے محروم تھی۔

اپنے تنے ہوئے جسم کو حتی الامکان ریلیکس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے پہلی بار اس آئینے کو دیکھا، وہ اب بھی ویسے ہی وہاں کھڑا تھا۔ اپنے اسی استقبالی، خیر مقدمی انداز میں...... اسی غرور اور طنطنے کے ساتھ...... اسی پُراسراریت میں لپٹے جس نے پہلی بار اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ برآمدے میں قدم بڑھاتے ہوئے اس نے آئینے پر ایک نظر اور دوڑائی تھی۔

اس گھر میں اس کی آمد 26 سال بعد ہوئی تھی اور ان 26 سالوں کو اس نے جیسے ایک مو تو سیکنڈ میں calculate کر لیا تھا۔ گھر کے اندرونی دروازے کو اس کے انتظار میں کھڑے ملازم نے کھولتے ہوئے اسے سلام کیا تھا۔ اس نے سانس روک کر اس دروازے سے اندر قدم رکھا تھا۔ اس کا ماتحت عملہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا پی اے اس گھر کی تفصیلات سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا وہ اسے روک دے۔ اسے اس گھر کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھر اس کی یادداشت کا انمٹ حصہ تھا جسے کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔

ہال میں پہنچ کر چند لمحوں کے لیے اس کے قدم فریز ہو گئے تھے۔ وہ سیڑھیاں اب اس کے سامنے تھیں۔ سیڑھیاں، چیخیں اور......

''وہ وہاں کچن کا دروازہ ہے۔'' پی اے کا جملہ اسے جیسے کرنٹ کی طرح لگا تھا جو اسے حال میں واپس لے آیا تھا۔ اس نے چونک کر ان سیڑھیوں سے نظریں ہٹائیں اور پی اے کو دیکھا۔

''پانی مل سکتا ہے؟'' اپنے اعصاب اور حواس پر بیک وقت قابو رکھنے کی کوشش میں اس نے لگاتار بولتے پی اے کو ٹوکا۔ پی اے فوری طور پر اس کی پیاس بجھانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ اسے اپنے گرد جو خاموشی چاہیے تھی وہ چند منٹوں کے لیے ہی سہی لیکن مل گئی تھی۔ جسم میں سے گزرتی خوف کی ایک لہر کو اس نے جیسے خود کو ساکت رکھتے ہوئے earth کیا۔ غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اسی غیر محسوس انداز میں ہاتھ جھٹکتے اور نظریں چراتے ہوئے اس نے پانی کا وہ گلاس تھاما جو اس کے سامنے ایک ٹرے میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے ایک سانس میں وہ گلاس خالی کیا تھا۔ وہ گھر اسے کس طرح ہیبت زدہ کرنے والا تھا یہ اس کے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس نے وہاں پوسٹ نہ ہونے کی مقدور بھر کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آسیب زدہ گھر 26 سالوں کے بعد جیسے اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

''مجھے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے دیں۔'' پی اے نے اس کے پانی کا گلاس رکھتے ہی دوبارہ بولنا شروع کیا ہی تھا...... کہ اس نے اسے ٹوک دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ماتحت عملے نے کچھ حیران نظروں کا تبادلہ کیا لیکن پھر کچھ کہے بغیر اس کے ہمراہ ہو لیے۔

گھر بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہاں موجود پرانی چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جسے اس نے ایک ہی نظر میں نہ پہچان لیا ہو۔ اسے رہائشی عمارت کا جائزہ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس گھر نے اس کی زندگی میں ideal اور idealism نام کی چیز کو چھین لیا تھا اور بہت سارے سوال دے دیے تھے جنہیں

اس کا دماغ بہت سالوں تک کھوجتا رہا...... الجھتا رہا...... ناکام ہوتا رہا...... اور پھر جب بالآخر اسے جواب ملا تھا تو بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت نے اگلے کئی سال اسے اپنے حصار میں رکھا اور بے یقینی وہ واحد شے نہیں تھی جو بہت عرصے اس کے ہمراہ رہی تھی...... ایک ناقابلِ بیان اذیت بھی، شرم اور دکھ کا ایک عجیب احساس بھی اور ان تمام احساسات کے درمیان وہ ایک چہرہ بھی جو اپنی آنکھوں میں خوف اور دہشت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ صرف چند سیکنڈز کے لیے ملنے والی وہ نگاہ جس کا تصور بھی اسے ٹھنڈے پسینے دلانے کے لیے کافی تھا۔

اوپر والے فلور کے تقریباً تمام کمرے لاکڈ تھے۔ اس نے کسی کمرے کو نہیں کھلوایا۔ وہاں اب ایسا کچھ نہیں تھا جسے دیکھنے کی اسے خواہش تھی۔ اس گھر کا ماسٹر بیڈ روم بھی لاکڈ تھا اور صرف وہ واحد کمرا تھا جس کے دروازے کے باہر اس کے قدم چند لمحوں کے لیے فریز ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کمرے میں جانے کی شدید خواہش نے اسے آن گھیرا تھا پھر اس نے اسی رفتار سے اس خواہش کو جھٹک دیا تھا۔

''باہر چلتے ہیں۔'' اس نے جیسے منٹوں میں عمارت کے اندرونی جائزے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ وہاں اندر کھڑے بہت سی چیزوں اور یادوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو غرق ہونے سے بچانے کی جیسے ایک اور کوشش کی تھی۔

عمارت کے اردگرد موجود لان پہلی نظر میں اسے ویسا ہی لگا تھا...... اور دوسری نظر نے اسے وہ خاردار جھاڑیاں، کھوکھلے ہوتے تنے اور سوکھے ہوئے پیڑ پودے دکھانے شروع کر دیے تھے جو بظاہر اس تراش خراش کے دم پر کھڑے تھے جو یقیناً اس کی آمد سے ایک دن پہلے کی گئی تھی۔ 26 سال پہلے وہ لان اس حالت میں نہیں تھا...... نہ وہ لان نہ وہاں کے درخت اور پودے اور نہ ٹینس کا وہ کورٹ جس پر آخری میچ یقیناً سالوں پہلے کھیلا گیا تھا۔ سب کچھ بوسیدہ اور خستہ حال تھا ان تکلیف دہ یادوں کی طرح جو اس کے اندر سرکنڈوں کی طرح سر نکالے ہمہ وقت موجود رہنے کے باوجود ایک لمبے عرصے سے وہ کاٹ اور چبھن کھو چکی تھیں جس نے اس کے بچپن کے ایک بڑے حصے کو بے حد بے رحمی سے لہولہان اور مسخ کیا تھا۔

''اس طرف سرونٹ کوارٹرز ہیں۔'' پی اے نے اسے کسی رہنمائی کا انتظار کیے بغیر لان کے عقبی حصے میں کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ حیرانی کے ساتھ کہا۔ اس کو ڈی سی کے انداز میں اس عمارت کے لیے ایک عجیب سی familiarity (مانوسیت، واقفیت) نظر آ رہی تھی۔

''پتا ہے۔'' اس کے انداز میں واقعی ہی ایک عجیب سی مانوسیت تھی اس گھر کے لیے۔ کوئی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا تب بھی اس کے لیے عمارت کے عقبی حصے میں اس جگہ جانا دشوار نہ ہوتا۔ اس کے قدم اب جس رستے پر تھے وہاں اس کی زندگی کی بہترین اور بدترین یادیں بکھری تھیں۔ کچن کے عقبی دروازے سے کئی فرلانگ دور، عمارت کے بالکل عقب میں، وہاں اب وہ کوارٹر نہیں تھا۔ چند لمحوں کے

لیے اس نے اپنے آپ کو اسی شاک اور بے بسی کی حالت میں پایا جو اس نے 26 سال پہلے اس رات محسوس کی تھی۔

وہ closure اب بھی نہیں ہوا تھا جس کی خواہش اسے وہاں تک لے آئی تھی۔ وہ آسیب اب بھی اس کے وجود کے اندر ہی رہنے والا تھا۔

☆☆☆

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ایک فرنٹ رو میں اس مباحثے کے دوسرے مقررین کے ساتھ بیٹھا اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتی فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلی بار ایچی سن کی ٹیم میں شامل ہو کر کسی انٹر کالجیٹ مقابلے میں شریک ہونے آیا تھا۔ کنیئرڈ کی ٹیم ہمیشہ سے ہی ایک سخت حریف رہی تھی ان کے لیے...... اور ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراؤڈ کے اضافی advantage کے ساتھ وہ اس بار کچھ اور بھی deadly ہو سکتی تھی۔ اس کے برابر بیٹھے اس کے ٹیم میٹ اکبر علی نے اسے اسٹیج پر چڑھتی ہوئی فاطمہ کے بارے میں انفارم کرنا شروع کیا۔ وہ کنیئرڈ کالج کا Ace تھی۔ کم سے کم اکبر کی باتوں سے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ وہ بہت سے مقابلوں میں اس لڑکی کے ہاتھوں ٹرافی گنوا چکا تھا۔ فلک شگاف تالیوں کی گونج میں اس سے آٹھ دس گز دور اس کے تقریباً بالمقابل اس لڑکی نے روسٹرم سنبھال لیا تھا۔

ہال میں اب پن ڈراپ سائلنس ہو گئی تھی۔ اس لڑکی پر نظریں جمائے ایک کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ رینگی۔ یہ وہ پروٹوکول تھا جو آڈینس صرف ایک چیمپئن ڈیبیٹر کو دیتا تھا۔ اس لڑکی کی تقریر میں اس کی دلچسپی اور تجسس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ اب روسٹرم پر لگا مائیک ٹھیک کر رہی تھی اور اس وقت پہلی بار ایک نے اسے نروس محسوس کیا...... اور اگر ایسا تھا تو ایک حریف کے طور پر یہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے کی سب سے اچھی خبر تھی۔ وہ اتنا ہی mean تھا جتنا کسی بھی مقابلے کے حریف ایک دوسرے کے لیے ہو سکتے تھے خاص طور پر اس صورت میں جب مدمقابل صنف نازک ہو اور اس کی کامیابی کے قوی امکانات ہوں۔ ایک کو وہاں نیچے بیٹھے اگر کسی بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا تو وہ یہ تھا کہ اس لڑکی کی نروس نیس کی وجہ وہ خود تھا۔ وہ اگر اسٹیج سے نیچے بیٹھا اس پر نظریں جمائے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا تو وہ روسٹرم کے سامنے کھڑی اس کو نہ دیکھنے کے باوجود اس کے وجود سے کسی پہاڑ میں دبے آتش فشاں کی طرح باخبر تھی۔

ایک نے مباحثے کے آغاز میں چند ہی جملوں کے بعد اسے پہلی بار یک دم خاموش ہوتے دیکھا۔ وہ واضح طور پر تقریر بھولی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ غلطی نوٹس ہوتی کنیئرڈ کی ٹیم اور ہال میں بیٹھی آڈینس نے تالیاں پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ کسی مقرر کی غلطی کو کور اپ کرنے کا سب سے بہترین طریقہ...... ایک اور وہاں بیٹھے دوسرے کالجز کے مقررین میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑی تھی۔ تقریر بھولنا اور شروع کے چند سیکنڈز میں ہی بھولنا کسی مقرر کے لیے کتنا demoralising تھا وہ سب جانتے تھے۔ فاطمہ کی تقریر میں سب کا انہماک پہلے ہی تھا۔ اب اشتیاق بھی بڑھ گیا تھا۔

تالیوں کی تھمتی گونج میں ایک نے فاطمہ کو تقریر کا دوبارہ آغاز کرتے سنا۔ وہ پھر شروع سے تقریر کر

رہی تھی بجائے اسی جملے سے شروع کرنے کے جہاں سے وہ بھولی تھی۔ جس کا مطلب تھا اس کی تین منٹ کی تقریر اب چند سیکنڈز کے ضائع ہونے سے تین منٹ سے اوپر ہی جانے والی تھی، اگر وہ درمیان میں کہیں بے حد شاندار پرفارم کرتے ہوئے تیز رفتاری سے ان چند سیکنڈز کو کور نہ کر لیتی تو...... کنیئرڈ کی ٹیم یک دم ٹینس نظر آنے لگی تھی۔ ان کی ٹیم پرفارمنس کا آغاز کیپٹن کی غیر متوقع بری پرفارمنس سے ہوا تھا۔ 30 سیکنڈ کے بعد ان کی کیپٹن ایک بار پھر پہلے اٹکی تھی، پھر دوبارہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ ایبک نے بے حد ریلیکس انداز میں اپنی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگالی...... ویسا ہی اطمینان وہاں بیٹھے تمام شرکا کی باڈی لینگویج میں جھلکنے لگا تھا۔ اس لیول کے مقابلے میں تقریر کے دوران دوبار بھولنا، ایک بار اٹکنا آپ کو ٹاپ تھری پوزیشنز سے باہر کرنے کے لیے بہت کافی تھا...... اور فاطمہ اب پوزیشنز کی دوڑ سے باہر تھی۔

تقریر کے اختتام تک وہ دو اور غلطیاں بھی کر چکی تھی اور ہر غلطی کے بعد اس کی نروس نیس بڑھتی گئی تھی۔ ایبک نے اس کی باقی کی تقریر زیادہ دلچسپی کے بغیر سنی تھی۔ اسے اب کنیئرڈ کی دوسری ڈیبیٹر کا انتظار تھا۔ فاطمہ جس شاندار استقبال کے ساتھ اسٹیج پر آئی تھی اتنی ہی خاموشی کے ساتھ وہ اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد اسٹیج سے ہٹی تھی۔ وہ پن ڈراپ سائلنس جو ایک چیمپئن ڈیبیٹر کو پروٹوکول کے طور پر دی گئی تھی وہ اب اس کی غیر متوقع خراب پرفارمنس پر بے یقینی کی کیفیت اختیار کر گئی تھی۔ فاطمہ جھکے کندھوں اور سر کے ساتھ بے حد خاموشی کے ساتھ اسٹیج سے اتر رہی تھی۔ اس وقت دوسری بار ایبک کو لگا وہ اس چہرے کو پہلے کہیں دیکھ چکا تھا...... کہاں؟ ایک لمحے کے لیے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے وہ الجھا۔ اسے یاد نہیں آیا...... شاید کہیں...... ایسی ہی کسی debate یا declamation (مقابلہ خطابت) میں کہیں۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو جواب دینے کی کوشش کی۔ کسی مقابلے کے علاوہ وہ کنیئرڈ کی کسی لڑکی سے کہاں مل سکتا تھا، لیکن مسئلہ صرف یہ تھا کہ ایبک نے بہت کم تقریری مقابلوں میں کسی تماشائی کے طور پر شرکت کی تھی اگر اس نے فاطمہ کو کسی جگہ ایک مقرر کے طور پر دیکھا ہوتا تو وہ اسے کسی نہ کسی حد تک یاد ہوتی...... اور اس سب کے باوجود اس لڑکی کا چہرہ اسے بہت شنا سا لگا تھا۔

"کیا ہو گیا تم کو آج؟" اپنی سیٹ سنبھالتے ہی اس نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی نوین کو کہتے سنا۔ فاطمہ جواب نہیں دے سکی۔ اسٹیج پر اب نوین کا نام لیا جا رہا تھا۔ وہ اس کا کندھا تھپک کر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ فاطمہ گم صم اس کو اسٹیج پر چڑھتا دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا؟" مسز انیلا غفران اس کے پاس آکر چند لمحوں کے لیے بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے لہجے میں مایوسی کے ساتھ ساتھ تشویش بھی تھی۔ انہوں نے بھی فاطمہ کو اس سے پہلے اسٹیج پر آج جیسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ فاطمہ کے پاس اپنی اس خراب کارکردگی کے لیے کوئی ایکسکیوز نہیں تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

وہ نوین صلاح الدین کا دن تھا۔ اس نے اسٹیج پر وہ کسر پوری کر دی تھی جو فاطمہ نے چھوڑی تھی۔ کنیئرڈ ٹرافی ایبک اور اکبر کی ٹیم کے ہاتھوں ہارا تھا لیکن پہلی پوزیشن نوین نے لی تھی۔

فاطمہ نے ایبک کو دوسری پوزیشن لیے اکبر کے ساتھ شیلڈ اور ٹرافی لینے کے لیے دوبارا اسٹیج پر آتے دیکھا تھا۔ ہر بار اسے دیکھتے ہوئے وہ درد کے ایک سمندر سے گزر رہی تھی۔ وہ مقابلہ، وہ ٹرافی، وہ تقریر...... کچھ معنی نہیں رکھتی تھی اس کے لیے۔ اس کے نزدیک اہم صرف ایک شے تھی اسے پہچانا نہ جائے...... وہ اسے شناخت نہ کرے۔ اس نے تین منٹ کی وہ تقریر جیسے ایک شناخت پریڈ کے دوران ایک خواہش کے ساتھ ایڑیاں رگڑتے گزارے تھے۔ وہ فاطمہ کی زندگی کی آخری انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ تھی۔

☆☆☆

"تم کیوں چاہتے ہو کہ چڑیا اسکول چھوڑ دے؟" سوال اتنا اچانک اور ڈائریکٹ تھا کہ کچھ دیر کے لیے وہ جواب ہی نہیں دے سکا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈنر کے بعد اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے آئے تھے۔ جب اس نے اپنی بیوی کے منہ سے یہ بات سنی۔ کوئی تردید یا جھوٹ فی الحال خطرناک ثابت ہوتا خاص طور پر جب اسے یہ پتا نہیں تھا کہ اس کی بیوی کو یہ بات کس سے پتا چلی ہے اور وہ کس حد تک "کیا" جانتی تھی۔ پہلا شک اسے باربی ڈول پر ہوا تھا اور اگر وہ اس کی بیوی کی source of information تھی تو پھر معاملہ خطرناک نہیں ہوا تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ وہ اس اسکول میں پڑھے جہاں میری بیٹی پڑھتی ہے۔" اس نے کسی سوال جواب کے بغیر اپنی بیوی سے کہا تھا۔ اس کی بیوی کے لیے اس کا جہاں اتنی آسانی سے اسے سوال کا سیدھا جواب دے دینا غیر متوقع تھا وہاں جواب اس سے زیادہ شاکنگ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بے یقینی سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ چند مہینے پہلے تک یہی شخص خیر دین کو ڈیوٹی آورز کے دوران اپنی نواسی کو اسکول سے لانے، لے جانے کی اجازت دیے ہوئے تھا اور اب یک دم یہ......

"کیوں؟" اس نے اس شاک سے جیسے باہر نکلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"میں نہیں چاہتا وہ میری بیٹی سے ملے۔" جواب اب بھی اتنا ہی احمقانہ تھا۔

"تم اگر یہ چاہتے ہو کہ ہماری بیٹی اس سے نہ ملے تو تمہیں یہ بات اپنی بیٹی کو سمجھانی چاہیے چڑیا کو اس کے لیے اسکول سے نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اس پر غور کروں گا۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اپنے شوہر سے کیا کہے۔ وہ آج زندگی میں دوسری بار اسے بے تکی اور احمقانہ باتیں کرتا نظر آیا تھا۔ پہلے بھی یہ خیر دین کا معاملہ تھا جس پر اس نے اپنے شوہر کو بدحواس پایا تھا اور آج پھر یہ اس کی نواسی کا مسئلہ تھا جس پر اسے اپنا شوہر کچھ عجیب بوکھلایا نظر آیا تھا۔

"تم مجھ سے اپنا پرابلم شیئر کیوں نہیں کر رہے؟" وہ بالآخر جیسے اس بلی چوہے کے کھیل سے تنگ آگئی تھی یا پھر اس معمے کو خود حل کرتے کرتے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"کیا شیئر کروں تم سے؟" وہ اس کے سوال نما اعتراض پر عجیب سے انداز میں ٹھٹکا تھا۔

"وہ صرف تم جانتے ہو کہ تم کیا شیئر نہیں کر رہے مجھ سے...... لیکن معاملہ صرف خیر دین کا چور ہونا اور چڑیا کا اس کی نواسی ہونا نہیں ہے۔" وہ چند لمحے جیسے ہونقوں کی طرح اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ یوں جیسے اسے اپنی

بیوی کی بات سمجھ ہی نہ آپائی ہو...... یا سمجھ میں آنے کے بعد بھی وہ یہ تسلیم نہ کر پا رہا ہو کہ اس کی بیوی اتنے واضح الفاظ میں اس پر اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کرے گی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟'' ایک typical مرد کی طرح اس نے جواب نہ دے پانے پر بلند آواز میں اس پر چلا کر اسے خائف کرنے اور موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی۔ چند لمحوں کے لیے اس کی بیوی کی آواز ہی نہیں نکل سکی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس پر چلایا تھا اور کس بات پر چلایا تھا۔ اس نے شدید بے عزتی محسوس کی تھی۔

''میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے سچ بولو۔'' وہ اس بار اور ڈائریکٹ ہوگئی تھی۔ اس کے شوہر کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''سچ؟...... کیا جھوٹ بول رہا ہوں میں تم سے؟'' اس نے اب بھی چلاتے ہوئے ہی کہا تھا۔

''یہ میں تم سے جاننا چاہ رہی ہوں کہ تم کیا جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے؟'' اس نے بھی اسی انداز میں چلاتے ہوئے شوہر کو جواب دیا۔ شادی کے اتنے سالوں میں آج پہلی بار وہ ایک دوسرے پر یوں چلا رہے تھے۔

''مجھے پورا حق ہے کہ میں ایسے کسی شخص کی اولاد کو اپنی بیٹی سے دور رکھوں جس سے مجھے نقصان پہنچا ہو۔'' اس کے شوہر نے ایک بار پھر اپنی اسی بات کو ترمیم شدہ الفاظ میں دہراتے ہوئے کہا۔

''تم نے ممی کو کہا ہے کہ وہ پاپا سے کہہ کر تمہاری ٹرانسفر یہاں سے کروا دیں کیونکہ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔'' وہ بول نہیں سکا۔ یہ ایک غیر متوقع وار تھا اس کی بیوی کی طرف سے۔

''میں نے تم سے کب کہا کہ پاپا کو کہہ کر یہاں سے اپنی ٹرانسفر کرواؤ؟'' وہ اب بھی اسی انداز میں بول رہی تھی اور اپنے شوہر کے بدلتے تیور اسے بری طرح خفا کر رہے تھے۔

''تم سے کس نے کہا؟'' اس کے شوہر کی آواز یک دم کمزور ہوئی۔ جواب معلوم ہونے کے باوجود اس نے پتا نہیں کیا سوچ کر اپنی بیوی سے پوچھا تھا۔ چیزیں اگر کھلنے پر آتی ہیں تو کھلتی ہی کیوں چلی جاتی ہیں؟ اس نے ایک جھنجلاہٹ کے ساتھ سوچا تھا۔

''ممی نے بتایا ہے مجھے اور کون بتائے گا۔''

''میں نے پاپا سے بہت پہلے بات کی تھی ٹرانسفر کی...... اب نہیں کی۔'' اس کے شوہر نے کہا وہ اب اپنے بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں کچھ ڈھونڈنے بیٹھ گیا تھا۔ جھوٹ کا سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ جاتا ہے۔ بڑے جھوٹ چھوٹے جھوٹ...... پھر ان سے چھوٹے۔ اس خاندان کا کوئی ایک فرد بھی مس ہو جائے تو پورا خاندان جھوٹ جھوٹ پکارنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی آج یہی ہو رہا تھا ایک جھوٹ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بعد اب اسے اس کے پورے خاندان کی ضرورت پڑ گئی تھی...... جھوٹ جھوٹ کی اس پکار کو دبانے کے لیے۔

''میں نے تم سے کبھی نہیں کہا کہ تم یہاں سے ٹرانسفر کرواؤ۔ اس کی بیوی نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''اس گھر میں اثرات ہیں...... تمہیں ہی ایشو تھا...... تم ہی ہر وقت مجھے قصے سناتی رہتی تھیں کہ آج یوں ہوا اور آج یوں ہوا۔'' اس کا شوہر ایک بار پھر اس پر الٹ پڑا۔ اسے اب اس قضیے کو لپیٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

''میں نے تمہیں ہزار اسٹوریز سنائی ہوں گی لیکن کبھی بھی تمہیں ٹرانسفر کے لیے نہیں کہا۔'' اس کی خفگی کو شوہر کی تیز آواز نے ایک بار پھر بڑھایا۔

''میں اپنی بیٹی کی وجہ سے یہاں سے جانا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا اس گھر میں اس کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے۔'' اس کے شوہر نے ایک بار پھر اپنا بیان بدلا۔ وہ ایک بار پھر اپنے شوہر کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔

''ایک سال ہو رہا ہے اس گھر میں ہمیں...... تمہیں آج خیال آیا ہے کہ یہاں تمہاری بیٹی کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے؟'' اس نے بے حد تلخی سے اپنے شوہر سے کہا۔ وہ اسے سچ نہیں بتا رہا تھا کم از کم اس کے لیے اسے مزید کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ چھپا کیا رہا تھا اس کا سر پیر بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''کافی بحث کر چکا میں تمہارے ساتھ...... اب مزید نہیں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو اور مجھے یہ مت بتاؤ کہ مجھے کس معاملے میں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ تمہاری ساری زندگی پاکستان سے باہر گزری ہے۔ تمہیں کیا پتا پاکستان میں کیسے رہا جاتا ہے اور کسی مسئلے کو کیسے حل کیا جاتا ہے۔'' اس کے شوہر نے بالآخر زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''ایک چیز انسانیت ہوتی ہے اور اسے سمجھنے اور پریکٹس کرنے کے لیے مجھے کسی خاص جگہ رہنا ضروری نہیں ہے۔'' اس نے اسی تلخ انداز میں اپنے شوہر سے کہا تھا۔ وہ بھی اب اتنی ہی زچ ہونے لگی تھی اس جگسا پزل سے جو حل ہونے پر ہی نہیں آرہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس کا شوہر پھر ٹھٹکا۔

''تم ایک آٹھ نو سال کی بچی کو ایک بڑے کی کسی غلطی پر سزا نہیں دے سکتے۔'' اس نے دوٹوک انداز میں اپنے شوہر سے کہا۔

''وہ بھی چور ہے...... وہ بھی اچھی لڑکی نہیں ہے۔'' وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔

''تب بھی...... تو بھی۔'' اس کی خاموشی زیادہ دیر قائم نہیں رہی تھی۔ اس کے لہجے کی قطعیت نے اس کے شوہر کو عجیب طرح سے سلگایا۔

''تم چڑیا کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہی ہو؟ تم کو نوکروں کے بچوں اور ان کی سائیکی سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اس کے شوہر نے اپنی بیوی کی طرف داری کو بدلنے کی کوشش کی۔

''مجھے دلچسپی ہے بھی نہیں کسی کی سائیکی سمجھنے یا جاننے میں...... مجھے اگر دلچسپی ہے تو صرف ایک چیز میں...... اور وہ یہ کہ تم چڑیا کو اس اسکول سے نکالنے کی کوشش کرنا بند کر دو۔ خیر دین نے چوری کی ہے یا جو بھی کیا ہے اب اس chapter کو بند ہو جانا چاہیے کیونکہ یہ میری بیٹی کو affect کر رہا ہے۔ تم اپنی بیٹی کو اپ

سیٹ کر رہے ہو ان تمام چیزوں سے۔"

"میں اپنی بیٹی کو اپ سیٹ کر رہا ہوں؟" وہ جیسے بے یقینی میں بولا تھا۔ "میری اکلوتی اولاد ہے وہ...... میں اسے اپ سیٹ کروں گا؟ میں جو بھی کر رہا ہوں اس کے تحفظ کے لیے کر رہا ہوں۔"

"مجھے تمہاری کسی بات کی سمجھ نہیں آ رہی۔ میں یہ جانتی ہوں کہ تم کچھ چھپا رہے ہو...... کیوں چھپا رہے ہو صرف یہ نہیں پتا مجھے...... نہ ہی مجھے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ خیر دین کا حوالہ چڑیا کو میری بیٹی کے لیے اتنا خطرناک کیوں بنا رہا ہے کہ تم اسے اس اسکول میں بھی دیکھنا نہیں چاہتے جہاں تمہاری بیٹی ہے۔"

"میں اب اس ایشو پر تم سے کوئی بات نہیں کروں گا۔" اس کا شوہر یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہیں سونا ہے سو جاؤ...... بیٹھنا ہے بیٹھ جاؤ...... لیکن میرا دماغ چاٹنا بند کر دو۔" وہ بے حد درشتگی سے کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے پتا تھا وہ اب اوپر اپنی اسٹڈی میں جا کر ڈرنک کرے گا اور ایک دو گھنٹے کے بعد آ کر چپ چاپ سو جائے گا۔ غصے اور ڈپریشن میں وہ شاید آج زیادہ پیے گا...... لیکن وہ اس موڈ میں نہیں تھی کہ اسے منانے کی کوشش کرتی یا اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی...... شادی کے اتنے سالوں میں یہ ضرورت اسے کبھی پڑی بھی نہیں تھی۔ وہ کبھی خفا بھی ہوتا تو بہت دیر تک اپنی خفگی برقرار نہیں رکھ پاتا تھا۔ وہ اس کی کمزوری تھی...... وہ اس سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

شادی کے اتنے سالوں میں اس نے کبھی بے مقصد اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑے کیے بھی نہیں تھے۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی اپنے شوہر کے regular drink کرنے کو بھی کبھی قابلِ اعتراض نہیں سمجھا تھا۔ وہ ساری عمر امریکا میں رہی تھی اور اس کی فیملی جتنی آزاد خیال تھی اس میں شراب کو ایک سوشل ڈرنک کے طور پر acceptance تھی۔ اس کا شوہر ویسے بھی شراب پی کر کبھی اتنا آؤٹ نہیں ہوا تھا کہ اسے اور اس کی ازدواجی زندگی کو کسی قسم کا خطرہ ہو جاتا۔

اب یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے رویے سے ناخوش ہو رہی تھی اور وہ بھی اس حد تک کہ اسے اپنے شوہر کے ساتھ جھگڑنا پڑ رہا تھا اور ایشو بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسے نہیں پتا اس کا شوہر دوبارہ اس کی بیٹی کے اسکول گیا یا نہیں لیکن دو دن بعد اس نے ناشتے کی ٹیبل پر اسے اپنے ٹرانسفر کی خوش خبری سنا دی تھی۔ اس نے بے حد خاموشی سے کچھ بھی کہے بغیر ناشتا کرتے ہوئے یہ خبر سنی اور کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے شوہر نے چند منٹ چائے کے سپ لیتے ہوئے جیسے اس کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ میرا پی اے لے آئے گا۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اگلا جملہ بولا۔ اس بار وہ ناشتا کرتے ہوئے ٹھٹکی۔ اس ہدایت کا مفہوم تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ باربی ڈول کے اسکول جاتی۔

"میں اسکول جا کر یہ کام خود کروں گی۔ یہ اس کا پہلا اسکول ہے، ٹھیک ہے وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رہی لیکن ہمیں جانے سے پہلے good will gesture کے طور پر اس کے ٹیچرز سے مل کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

"تم چاہتی ہو میں بھی ساتھ جاؤں؟" اس کے شوہر نے جواباً کہا۔

"تمہاری مرضی ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی لیکن میں ضرور جاؤں گی۔" اس نے اپنے شوہر کو کسی قسم کا مشورہ دینے کے بجائے کہا۔

"میں بھی جاؤں گا۔" وہ حیران ہوئی۔ اسے اپنے شوہر سے کم از کم اس جواب کی توقع نہیں تھی لیکن اس نے ساتھ ہی اطمینان کا سانس بھی لیا تھا۔

وہ ایک ہفتے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ اپنی بیٹی کا اسکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ لینے گئی تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک پرنسپل آفس کے وزیٹرز روم میں بیٹھے رہے تھے لیکن سسٹر ایگنس نے انہیں ملاقات کے لیے اندر نہیں بلوایا تھا۔ اس کے شوہر کا پارا ایک بار پھر آسمان کو چھونے لگا تھا۔ وہ ساتھ نہ ہوتی تو اس دن اس کے شوہر اور سسٹر ایگنس کے درمیان ایک اور جھگڑا ہوتا۔ سسٹر ایگنس نے ان سے ملاقات نہیں کی تھی لیکن اس کی ہدایات پر اس کے ماتحت عملے نے اس کی بیٹی کا سرٹیفکیٹ فوری طور پر بنا دیا تھا۔

وہ دونوں سسٹر ایگنس سے ملاقات کا انتظار کر کر کے اٹھ کے وہاں سے آ گئے تھے اور باہر نکلتے ہی اس کے شوہر نے بے حد خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیکھ لیا نا کیسا attitude ہے اس سسٹر کا...... اور تمہیں شوق تھا good will gesture دکھانے کا...... میری اگر یہاں سے ٹرانسفر نہ ہو گئی ہوتی تو میں اس سسٹر کا دماغ درست کر دیتا۔" اس کا شوہر واپسی پر تمام راستے بکتا جھکتا گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے اسکول میں ایڈمیشن کے دوران اور بعد میں کئی بار سسٹر ایگنس سے مل چکی تھی اور وہ اسے ہر بار بہت اچھی لگی تھی۔ وہ ویسی ہی ایک نن تھی جیسی نن سے وہ خود کچھ عرصے پڑھی تھی۔ مشفق، دوستانہ، صاف گو اور اصول پرست۔ اب اگر وہ اپنا اسکول چھوڑ کر جانے والی ایک بچی کے والدین سے ان کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی ملنے پر تیار نہیں ہوئی تھی تو وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ ان کا اور اس کے شوہر کا جھگڑا کس حد تک گیا ہوگا۔ وہ خاموش بیٹھی بوجھل دل کے ساتھ اپنے شوہر کی باتیں سنتے ہوئے سسٹر ایگنس کی خفگی دور کرنے کے لیے ایک آخری کوشش کرنے کا سوچتی رہی۔ اس شہر سے جانے سے پہلے اس نے فون پر سسٹر ایگنس سے رابطہ کرنے کی ایک آخری کوشش کی تھی۔ یہ کوشش بھی ثمر آور ثابت نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

اسکول چھوڑ کر جانے سے پہلے باربی ڈول نے بھی چڑیا سے ملنے، بات کرنے اور اسے یہ بتانے کی بار بار کوشش کی تھی کہ وہ لوگ وہاں سے جا رہے تھے۔ اپنے باپ کی تمام تاکیدوں اور تنبیہوں کے باوجود

بھی..... لیکن وہ اس میں ناکام رہی تھی۔ چڑیا اب پہلے جیسی چڑیا نہیں رہی تھی۔ وہ باربی ڈول کو میلوں دور سے بھی دیکھ کر رستہ بدل جاتی تھی اور اگر وہ کسی بات پر جھنجلاتی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ باربی اس کی طرف کیوں آتی تھی۔ اپنا وقت اس کے کلاس روم کے باہر بار بار چکر لگانے میں کیوں ضائع کرتی تھی۔ باربی ڈول اس کی کلاس کے چکر لگانا شروع کرتی اور چڑیا کلاس کے اندر بیٹھی ٹینس ہونا شروع ہو جاتی۔ رائٹنگ بورڈ پر لکھی جانے والی چیزیں سمجھنا یک دم اس کے لیے مشکل ہونے لگتا۔ ٹیچر کی آواز سن کر بات سمجھنا ایک اور دشوار کام ہوتا۔ اور کلاس میں بیٹھی اپنی دوست کے جملوں کو نظر انداز کرنا اس سے بھی بڑا جو باربی ڈول کو کہیں نمودار ہوتے دیکھتے ہی اسے بڑے اشتیاق سے بتاتی۔ ”باربی ڈول آگئی ہے۔“ اور پھر یہ جملہ باربی ڈول کے ہر چکر پر بولا جاتا۔

”تم باربی ڈول سے ناراض ہو گیا؟“ شروع کے چند دنوں کے بعد ہی اس کی دوست نے اس کا بدلا ہوا رویہ نوٹس کر لیا تھا۔

”وہ میری فرینڈ نہیں ہے پھر میں اس سے کیوں ناراض ہوں گی؟“ اس نے جواباً بہت سوچ کر کہا اور اس کے جواب نے اس کی دوست کو مزید حیران کیا۔

”لیکن تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ باربی ڈول تمہیں اچھی لگتی ہے اور تم نے اسے دوست بنا لیا ہے۔“ چڑیا نے اپنی دوست کی بات کا جواب خاموشی سے دیا تھا۔ وہ اپنی دوست کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کے لیے باربی ڈول کے نظر آنے پر اسے نظر انداز کرنا مشکل ترین اور بے حد صبر آزما کام تھا، وہ اپنے نانا کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی جو اب باربی ڈول سے اس کا کسی بھی طرح کا رابطہ نہیں چاہتے تھے..... اور وہ نو سالہ بچی روز اسکول آکر دل اور دماغ کی ایک عجیب سی کشمکش میں الجھی دن گزار لی۔ بچے بڑوں جیسے کبھی نہیں ہو سکتے۔ ان کی زندگی کی تکلیف، اذیت، حادثہ یا trauma کچھ بھی ان کو بڑوں جیسا سخت دل اور unforgiving (معاف نہ کرنے والا) نہیں کرتا تھا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں کسی بھی لاشعوری کوشش کے بغیر، چڑیا بھی شاید یہی کرتی اور نہ چاہنے کے باوجود وہ باربی ڈول سے بات کرنا شروع کر دیتی اگر تب ہی باربی ڈول کا باپ اس کی زندگی میں ایک بار پھر ایک سیاہ کردار کے ساتھ نمودار نہ ہو جاتا۔

☆☆☆

خیر دین کے گاؤں سے واپس شہر چلے جانے کے فیصلے کا اس کے خاندان نے بے حد گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ ان چند مہینوں میں شروع کے چند دنوں کے بعد اب دوسری بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے خاندان والے یک دم خیر دین سے خوش دلی سے بات چیت کر رہے تھے۔ اور یہ خوش دلی خیر دین کے چلے جانے تک قائم رہتی اگر خیر دین اپنی زمین بیچنے کے ارادے کا اظہار نہ کرتا۔ خیر دین زمین کو بیچنے کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی مجبور تھا۔ شہر جا کر دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کے لیے اسے تھوڑے بہت سرمائے کی ضرورت تھی اور وہ رقم اسے وہ زمین ہی دے سکتی تھی جو اس کی ملکیت ہونے کے باوجود عملی طور پر اس کے بھائیوں اور بھتیجوں کے زیر استعمال تھی۔ خیر دین اس زمین کو انہی کے ہاتھوں بیچنا چاہتا

چاہتا تھا چاہے تھوڑی رقم کے عوض ہی سہی لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ مفت میں ملنے والی چیز کو کوئی کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہیں خریدتا۔ خاندان والوں نے شروع میں اسے بالواسطہ طور پر اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے بھائی بار بار اسے اپنی کمزور مالی حالت کا جتا کر یہ بتاتے رہے کہ وہ زمین خریدنے کے قابل نہیں ہیں۔ چاہے وہ انہیں کم رقم کے بدلے ہی وہ زمین ملے تب بھی اور چاہے وہ زمین کا معاوضہ قسطوں کی صورت میں لینے پر تیار ہو جائے تب بھی۔ ان کے رویّے سے مایوس ہو کر خیر دین نے جب گاؤں میں اپنے چند دوستوں کے ذریعے زمین کے اور گاہک ڈھونڈنے شروع کر دیے تو خاندان والوں کی چھریاں پہلی بار بغلوں سے باہر آگئیں۔ انہوں نے خیر دین کو صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اس زمین کو بیچ دینے کا خیال چھوڑ دے کیونکہ وہ مر کر بھی اس زمین کو نہیں چھوڑیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ خیر دین اس زمین کو بیچنے کا سوچ کر بھی بے حد خود غرض ہو رہا تھا۔ غربت کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہوتا ہے کہ بعض گناہ انتخاب نہیں مجبوری بن جاتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان کو دنیا کے دکھتے دوزخ یا آخرت کے چھپے ہوئے دوزخ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جنت یقین اور ایمان کے جس لنگر کے ساتھ منسلک ہوتی ہے وہ آپشنز میں ہوتا ہی نہیں۔

خیر دین کی زمین بک جانے کا مطلب اس کے خاندان کی مالی حالت کو کچھ مزید خراب ہونا تھا اور اس صورتِ حال کا سامنا کرتے ہی خاندان حادثہ یا ایک دم عجیب بدحواسی کا شکار ہو گیا تھا۔ خیر دین ان کا رزق گھٹانے آیا تھا۔ شاید پہلی بار ان میں سے اکثر کو صحیح معنوں میں خیر دین کی نوکری جانے اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا افسوس ہوا تھا۔ نہ یہ سب ہوتا نہ وہ گاؤں واپس آتا اور نہ انہیں زمین کے لالے پڑتے۔ انہیں خیر دین سے ہمدردی تھی یا نہیں تھی بہر حال اس بات پر وہ سب متفق تھے کہ وہ اس زمین کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے چاہے اس کے لیے ایک خونی رشتہ جاتا رہے۔

ایک مہینا خیر دین ہر روز پٹواری کے چکر کاٹتا رہا۔ وہ نہیں ملتا تھا، ملتا تھا تو اس کا کام ٹالتا تھا..... اور پھر جب بالآخر وہ رجسٹر نکال کر اسے دکھانے پر تیار ہوا تو خیر دین دم سادھے رہ گیا تھا۔ وہ زمین اب اس کے نام نہیں تھی۔ وہ پچھلے ہفتوں کی تاریخ میں اس کے بھائیوں کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ وہ جب تک ڈی سی کا خانساماں تھا گاؤں میں موجود نہ ہونے کے باوجود کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس کی زمین کے ساتھ کچھ کرتا اور سرکاری لیبل ہٹتے ہی وہ بے سرو سامان ہی نہیں بے زمین اور لاوارث بھی ہو گیا تھا۔ اس کے اپنے ہی اس کو نوچنے کے لیے گدھوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے تھے۔ پتا نہیں اس کاغذ پر خیر دین کا انگوٹھا لگانے کے لیے اس کے اپنوں میں سے کون خیر دین بنا تھا۔ پٹواری کو کتنی رشوت دی گئی تھی کہ خیر دین کی شکل سے شناسا ہونے کے باوجود اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

خیر دین جتنا لڑ سکتا تھا وہ پٹواری سے لڑا..... لیکن وہ قسمت سے نہیں لڑ سکا جو اس کے ساتھ نہیں تھی۔ جب انسان کے اپنے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے لگیں تو انسان دنیا کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔ خیر دین کس کس کے ساتھ لڑتا..... اپنے حالات کے ساتھ، خالی جیب کے ساتھ، اپنوں کی سرد مہری اور بے حسی کے ساتھ یا آنے والے

دنوں میں چڑیا اور اس کی بیٹی کے حوالے سے جھانکتے آسیبوں کے ساتھ۔

وہ لڑنے جھگڑنے کے بعد زمین کی رجسٹری بغل میں دبائے روتا ہوا واپس گھر آ گیا تھا۔ وہ زمین کا ٹکڑا اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ تمام جمع پونجی جسے اس نے اندھے اعتماد کے سہارے اپنے خونی رشتوں کو سونپ دیا تھا۔ وہ اعتماد واقعی اندھا ثابت ہوا تھا اور اب چاروں شانے چت پڑا تھا۔ پٹواری کے ہاں جو کچھ ہوا تھا وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا جو گھر پر ہوا تھا۔ خیر دین رنج اور صدمے کے ساتھ ساتھ شدید غصے میں بھی تھا اور گھر پہنچنے کے بعد اس نے گاؤں میں اپنے چند جاننے والے لوگوں کی مدد لے کر اپنے بھائیوں کے ساتھ اس معاملے پر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا تھا وہ خیر دین کے دل پر لگنے والا ایک اور چرکا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اپنے بیٹوں کو اکٹھا کر کے خیر دین کو اسی وقت گھر سے چلے جانے کا کہا اور دوسری صورت میں اس کا سامان باہر پھینک دینے کا اعلان کیا۔

چند ماہ کے عرصے میں چڑیا نے خوف سے کانپتے ہوئے دوسری بار اپنے نانا کی ایسی تذلیل اور بے قدری دیکھی تھی۔ اس کی ماں اور نانا نے بہتی آنکھوں کے ساتھ اس ایک کمرے میں پڑا اپنا وہ تمام سامان اٹھا لیا جو ان کا تھا۔ اس گھر سے نکلتے ہوئے خیر دین قسم کھا کر گیا تھا کہ وہ اس گھر میں دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ اس نے چند دنوں کے لیے گاؤں میں ہی اپنے ایک پرانے دوست کے ہاں پناہ لی۔

اس رات چڑیا نہیں سو سکی تھی۔ اس نو سالہ بچی نے بڑے آرام سے اپنے نامہ اعمال میں اپنا ایک اور گناہ تحریر کر لیا تھا، یہ سب بھی اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ امتحان میں پاس ہو جاتی تو نانا واپس شہر جانے کا نہ سوچتے اور پھر اس کے نانا کو وہ گالیاں اور دھکے اور دھمکیاں نہ ملتے جو اس نے دیکھے تھے۔

اس رات خیر دین کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ اس کے بالوں میں کچھ اور سفیدی اتر آئی تھی۔ اپنوں کا غم انسان کو باہر سے نہیں اندر سے مارتا ہے۔ خیر دین کو بھی اس نے مار دیا تھا۔ وہ اپنے اسی دوست سے کچھ رقم قرضہ لے کر واپس اسی شہر آ گیا تھا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ شہر میں آتے ہی کسی واقف کار کے ذریعے ایک کمرے کا گھر کرائے پر لیتے ہی اس نے سب سے پہلا کام چڑیا کو اسکول لے جانے کا کیا تھا۔

چڑیا کا نام اسکول سے کٹ چکا تھا لیکن سسٹر ایگنس چڑیا کے لیے ہمیشہ سے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے کانونٹ کے قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس بچی کو دوبارہ اسکول میں ایڈمیشن دلا دیا تھا۔ خیر دین کی نوکری ختم ہو جانے کا سن کر انہوں نے کہے بغیر چڑیا کی فیس کو ایک چوتھائی کر دیا تھا۔

خیر دین نے انہیں چڑیا کے ساتھ ہونے والے حادثے سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود سسٹر ایگنس نے چڑیا میں آنے والی تبدیلیوں کو نوٹس کیا تھا۔ چڑیا وہ پُراعتماد بچی نہیں تھی جسے وہ جانتی تھیں۔ وہ ایک خوف زدہ آنکھوں، زرد رنگت، کمزور جسم اور بے مقصد انگلیاں چٹخانے والی ایک بچی تھی جو خیر دین اور سسٹر ایگنس کی اس پوری ملاقات کے دوران گم صم کسی مسکراہٹ کے بغیر سسٹر ایگنس کو دیکھتی رہی تھی۔ اسے جیسے یہ خوف تھا کہ سسٹر ایگنس اسے دوبارہ اسکول میں داخل نہیں کریں گی اور اسے اس ہیبت ناک اسکول میں دوبارہ جانا پڑے گا اور اسے یہ خوف تھا کہ ابھی کسی بھی لمحے خیر دین بلک بلک کر رونے لگے گا اور پھر سسٹر ایگنس کو وہی سب کچھ بتائے

گا اور پھر..... اس پھر کے آگے چڑیا کو تاریکی کے سوا کچھ نہیں دکھتا تھا۔ وہ اس اسکول میں ستارہ تھی گرہن نہیں بننا چاہتی تھی۔ خیر دین نے سمجھداری کی تھی اس نے سسٹر ایگنس کو چڑیا کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا، نہ چڑیا کے حوالے سے نہ ڈی سی کے ساتھ ہونے والے اپنے جھگڑے کے حوالے سے جس کے نتیجے میں اسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

سسٹر ایگنس صرف یہی جان سکی تھی کہ ڈی سی نے کچھ لوگوں کو ملازمت سے مختلف وجوہات کی بنا پر فارغ کر دیا تھا اور ان میں خیر دین بھی تھا۔ وہ چڑیا کے حوالے سے اس ڈی سی کا ایک بار سامنا کر چکی تھی اور وہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اسے ناپسند کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی اپنی بیٹی کے ایڈمیشن اور اسکولنگ کے لیے اسکول آتا رہا تھا لیکن انہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ بھی اس طرح رُوڈ ہو کر بدتمیزی پر اتر سکتا ہے جس طرح وہ چڑیا کے نام اسکول کا ایک وارننگ لیٹر اس کی بیٹی کے ہاتھ گھر بھجوائے جانے پر ہوا تھا اور ایسا شخص کسی ملازم کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ سسٹر ایگنس نے بڑے آرام سے یہ نتیجہ نکال لیا تھا۔

ایک مسئلے کا حل نکالنے کے بعد خیر دین کو ڈاکٹر فرح اور ان کے شوہر سے رابطے کا خیال آیا۔ اتنے مہینوں میں اس نے ان دونوں میاں بیوی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے ان کا خیال چند بار آیا بھی تو اس نے سر سے جھٹک دیا۔ ایک شخص کی برائی نے خیر دین کو جیسے اس سارے نظام اور اسے چلانے والوں سے برگشتہ کر دیا تھا لیکن اب اپنی اور چڑیا کی بقا کے لیے کی جانے والی کوششوں میں اسے پھر وہ میاں بیوی یاد آ گئے تھے۔

اس نے ڈاکٹر فرح کے شوہر عابد کو فون کیا اور تب اسے یہ افسوسناک خبر ملی کہ دو ماہ پہلے کینسر کی وجہ سے فرح کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ خیر دین کو شدید صدمہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر فرح ایک بہت نفیس اور مہربان عورت تھیں۔ چڑیا کی زندگی کے شروع کے سالوں پر ان کی بلاواسطہ اور بالواسطہ بہت گہری چھاپ تھی۔ اگر ان کی کوشش نہ ہوتی تو چڑیا کبھی اس اسکول میں نہیں پڑھ سکتی تھی جہاں وہ پڑھ رہی تھی۔ عابد کے منہ سے ڈاکٹر فرح کی ڈیتھ کا سن کر خیر دین کو اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ کچھ دیر تک تو وہ بول ہی نہیں سکا تھا۔ اس کی خاموشی محسوس کر کے گفتگو کا دوبارہ آغاز بھی عابد نے ہی کیا تھا۔

”میں نے سنا ہے تم نے جاب چھوڑ دی اور واپس گاؤں چلے گئے۔ تمہارے صاحب نے فرح کا بھیجا ہوا منی آرڈر واپس کرتے ہوئے مجھے فون پر بتایا تھا۔ فرح کو تو یہ جان کر بھی بڑا افسوس ہوا تھا کہ تم نے اس کی اتنے سال کی محنت ضائع کرتے ہوئے چڑیا کو اسکول سے اٹھا لیا تھا۔“ عابد نے مزید بات کرتے ہوئے کہا۔ بیوی کا یوں اچانک آنے والا ذکر اسے اداس کر رہا تھا۔

”بس سر کچھ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ میں گاؤں جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔“ خیر دین نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر فرح کے بارے میں یہ ہولناک خبر سن کر وہ چند لمحوں کے لیے اپنی زندگی بھول گیا تھا۔

عابد نے چڑیا کے دوبارہ اسکول میں داخلے پر جیسے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور ساتھ دوبارہ اسکول کی فیس

بھجوانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ جیسے اپنی بیوی کی ایک خواہش کا احترام کرنا چاہتا تھا۔ خیر دین نے اس بار انکار کر دیا تھا۔ فوری طور پر شدید مالی بحران کا شکار ہونے کے باوجود بھی اسے یہ گوارا نہیں ہوا تھا کہ وہ سسٹر ایگنس کے چڑیا کے تعلیمی اخراجات کو تقریباً معاف کر دینے کے بعد اس مد میں کسی سے مزید رقم وصول کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے عابد سے چند ہفتوں میں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور عابد نے اس کی یہ درخواست قبول کرتے ہوئے اسے کبھی بھی آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔

ڈاکٹر فرح کا سن کر صرف خیر دین کو صدمہ نہیں ہوا تھا، حلیمہ اور چڑیا کو بھی اتنی ہی تکلیف پہنچی تھی۔ خیر دین چند دنوں بعد عابد سے تعزیت کے لیے اپنی بیٹی اور چڑیا کے ساتھ اس شہر میں گیا تھا جہاں وہ پوسٹڈ تھا۔ عابد اور اس کے بچے ڈاکٹر فرح کی موت سے پیدا ہونے والے خلا کو بھرنے کے لیے نبرد آزما تھے۔ چڑیا کو اس نے اپنے بچوں سے ملوایا تھا لیکن وہ بچے بھی ماں کو کھونے کے بعد ابھی شکست و ریخت کے عمل سے گزر رہے تھے۔ زندگی پہلے جیسی نہ چڑیا کے لیے رہی تھی نہ ان کے لیے۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے چڑیا کے ساتھ بیٹھ کر چند رسمی باتیں کر کے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ چڑیا کی زندگی کی اداسی میں ڈاکٹر فرح کی موت نے اضافہ کر دیا تھا۔ ایک اور جیتا جاگتا کردار اس کی زندگی میں صرف ماضی کی ایک یاد بن کر رہ گیا تھا۔

''نانا میں ڈاکٹر ہی بنوں گی بس...... اور میں بہت زیادہ پڑھوں گی...... محنت سے...... دل لگا کر۔'' چڑیا نے واپس اپنے شہر آتے ہوئے بس میں خیر دین سے کہا تھا۔ خیر دین نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی تھی۔ اتنے مہینوں میں یہ پہلا موقع تھا جب چڑیا کی چپ خود بخود ٹوٹی تھی اور اس نے اپنی زندگی اپنی تعلیم کے حوالے سے کوئی بات کی تھی پہلے کی طرح۔ خیر دین کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ چڑیا کا سر تھپکتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس سے کہا۔

''تم صرف ڈاکٹر مت بننا بیٹا...... ایک اچھی انسان بھی بننا...... بالکل ڈاکٹر فرح کی طرح۔'' چڑیا نے سر ہلایا تھا۔ زندگی میں برے انسانوں کے ایک ہجوم سے ملنے کے بعد اسے ایک اچھا انسان بننے کی ضرورت کا زیادہ احساس ہو گیا تھا۔ ایک بچے کے طور پر بھی وہ اچھے اور برے انسانوں کا ادراک کرنے لگی تھی۔ اس سے پہلے اس نے زندگی میں صرف اچھے انسان دیکھے تھے لیکن زندگی اور دنیا صرف اچھے انسانوں سے نہیں بنتی اور نہ ہی ان کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا احساس اسے برے انسانوں سے مل کر ہوا تھا۔ باربی ڈول کا پاپا اور اس کے نانا کے بہن بھائی...... اور گاؤں کے اسکول کے ٹیچرز اور کلاس فیلوز۔ چڑیا نے زندگی میں کبھی اچھے انسانوں کی فہرست نہیں بنائی تھی لیکن اس نے برے انسانوں کی فہرست بنانا سیکھ لی تھی۔ یہ اس نے زندگی میں بعد میں سیکھا تھا کہ اچھے انسانوں کی تو فہرست بنائی جا سکتی ہے برے انسانوں کی نہیں۔ وہ بے شمار ملتے ہیں اور ہر جگہ ہوتے ہیں۔

☆☆☆

''کتنے ویکس کا کورس ہے؟''

''ٹو ویکس کا۔''

''میں سوچ رہی ہوں ان ٹو ویکس میں، میں ممی کے پاس States ہو آؤں...... انہوں نے بھی کتنی بار کہا ہے پچھلے سال وزٹ کے لیے۔'' شہر بانو نے شیر دل سے کہا۔ وہ کسی پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا اور شہر بانو اور مثال کو وہ اکیلا وہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ انہیں لاہور اپنے پیرنٹس کے پاس چھوڑ کر جاتا لیکن شہر بانو نے لاہور جانے کے بجائے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ اپنے لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے شیر دل نے شہر بانو کی بات سنی جو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے چہرے پر مساج کرتے ہوئے اس سے باتیں کر رہی تھی۔

''تم ٹو ویکس کے لیے جاؤ گی؟'' شیر دل نے کام کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں تھری ویکس کے لیے، پھر اب جا رہی ہوں تو کچھ دن رہ لوں...... ویسے تو تمہاری بیٹی نے جان کھانا شروع کر دینا ہے دوسرے ہی دن سے تمہارے لیے۔ وہ کہاں رہ سکتی ہے تمہارے بغیر زیادہ۔'' شیر دل نے مسکراتے ہوئے اس کی بات سنی اور کہا۔

''صرف میری بیٹی ہی نہیں رہ سکتی میرے بغیر یا میری بیٹی کی ماں بھی؟'' وہ شہر بانو کو چھیڑ رہا تھا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سے مسکراتے ہوئے شیر دل کو گھورا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اپنے laptop پر ہاتھ چلا رہا تھا۔

''تم کو پتا ہے۔'' اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں مجھ کو نہیں پتا...... تم بتاؤ۔'' وہ اسی طرح کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولا۔ شہر بانو کے اظہار محبت کو وہ ہمیشہ انجوائے کرتا تھا۔ ایک عجیب مردانہ تسکین ملتی تھی اسے۔

''میں بار بار نہیں بتا سکتی تمہیں پتا ہے......'' شہر بانو نے بظاہر بے پروائی سے کہا اور کن انکھیوں سے اس کو پھر آئینے میں دیکھا۔ شیر دل بستر پر بیٹھا اسی طرح laptop پر کام کرتا رہا پھر اس نے بظاہر بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

''تم رہ سکتی ہو میرے بغیر...... I know it for a fact now۔'' شہر بانو جانتی تھی وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر کریم کا مساج کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ غیر محسوس انداز میں ہاتھوں پر لگی کچھ زائد کریم کو اس نے شیر دل کے چہرے پر لگا کر رگڑنا شروع کر دیا۔

''مت کرو۔'' شیر دل نے کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے گردن ایک طرف کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''کیوں؟'' شہر بانو نے جیسے اسے کچھ حیران ہو کر دیکھا تھا۔

''جب تم میرے بغیر رہ سکتی ہو اور مجھے مس بھی نہیں کرتیں تو پھر مت کرو نا۔'' اس نے شہر بانو کو جتاتے ہوئے کہا لیکن اس بار اس نے laptop کی اسکرین پر نظریں جمائے رکھیں اور شہر بانو کو کریم چہرے پر رگڑنے دی، وہ اس کی اس ناز برداری کا عادی تھا۔

''ٹھیک ہے میں نہیں جاتی پھر۔'' شہر بانو نے اب اس کی ٹھوڑی اور گردن پر ہاتھ رگڑنا شروع کیا۔

''اس کام کے لیے ویسے ٹشو پیپر استعمال کیا جاتا ہے۔'' شیر دل نے یک دم خفگی سے کہا۔ وہ بے اختیار اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کریم ضائع ہوتی یار۔'' وہ بھی اب شیر دل کو چھیڑ رہی تھی۔

''ظاہر ہے میں تو important ہوں نہیں تمہارے لیے...... تو تم جو چاہے کرو میرے ساتھ۔'' شیر دل نے کام کرتے ہوئے اسکرین پر اسی طرح نظریں جمائے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ شہربانو نے ہنستے ہوئے اسے ایک لمحہ کے لیے hug کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم بالکل بھی important نہیں ہو میرے لیے...... تم بس میرے بوائے فرینڈ ہو۔'' وہ اب بیڈ کے کراؤن سے اسی کی طرح ٹیک لگائے اس کے کندھے پر سر رکھے laptop کی اسکرین پر excel شیٹس کو اوپر نیچے ہوتے دیکھنے لگی۔

''obviously۔'' شیر دل نے کہا۔

''obviously۔'' شہربانو نے بھی اسی انداز میں کہا۔

''چلو ٹھیک ہے پھر تم اپنی ممی کے پاس ہی رہنا۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔

''تم مر جاؤ گے میرے بغیر۔'' شہربانو نے اس کے بازو پر ایک ہلکا سا مکا مارا۔ شیر دل ہنس پڑا۔

''اور تم؟'' اس نے جواباً شہربانو سے پوچھا۔

''میں بھی۔'' وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

''Good۔'' شیر دل جیسے اس کے جواب سے محظوظ ہوا۔

''کوئی song ہی لگا دو۔'' اس کے کندھے سے سر ٹکائے اس نے شیر دل سے فرمائش کی۔ شیر دل کے laptop میں ان دونوں کے پسندیدہ میوزک کی ایک لمبی چوڑی playlist تھی۔ وہ جب بھی رات کو بیڈ روم میں بیٹھا کام کر رہا ہوتا تو ہینڈز فری کے ساتھ میوزک بھی سنتا۔ اگر شہربانو جاگ رہی ہوتی تو وہ دونوں کام اور باتوں کے ساتھ song سنتے رہتے...... بعض دفعہ وہ گھنٹوں اسی طرح اس کے کندھے سے سر ٹکائے اس کو laptop پر کام کرتا دیکھتی رہتی اور میوزک سنتی رہتی۔ اس کے لیے جیسے شیر دل کے ساتھ اس طرح خاموشی سے بیٹھ کر وقت گزارنا بھی کافی تھا۔ شیر دل نے اس کی فرمائش پر کام کرتے کرتے رک کر میڈیا پلیئر پر کوئی نمبر ڈھونڈا تھا اور اسے لگا دیا۔ بیڈ روم میں جگجیت کی غزل...... تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا...... گونجنے لگی تھی۔ اس کے کندھے سے ٹکے ٹکے وہ ہلکی آواز میں گنگنانے لگی۔ شیر دل مسکراتے ہوئے کام کرتے اسے گنگناتے سنتا رہا۔

''تم بھی گاؤ۔'' شہربانو نے یک دم اس سے فرمائش کی۔ وہ مسکرا دیا لیکن اس نے شہربانو سے کچھ کہا نہیں۔

''گاؤ بھی۔'' شہربانو نے پھر اصرار کیا۔ شیر دل بہت اچھا گا لیتا تھا۔

''یار بزی ہوں آج۔'' اس نے شہربانو کے اصرار پر عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''بس مجھے نہیں پتا...... دولائنز ہی گاؤ...... لیکن میرے لیے گاؤ۔'' شہربانو نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔

''اوکے لیکن کوئی اور گاتا ہوں...... یہ نہیں۔'' شیر دل نے یک دم playlist کو چیک کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں یہ کیوں نہیں؟'' شہربانو نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''مت change کرو یار...... یہ اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے playlist میں اسکرولنگ کو روکنے کے لیے شیر دل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔ شیر دل رک گیا۔

تم کو دیکھا تو یہ خیال آیا
زندگی دھوپ تم گھنا سایہ

''گاؤ بھی شیری۔'' شہربانو نے اصرار کیا۔ وہ اسے عجیب مشکل میں پھنسا رہی تھی اور ہمیشہ یہی کرتی تھی سوچے سمجھے جانے بوجھے بغیر...... پتا نہیں اس کو بعض چیزیں وہی کیوں اچھی لگتی تھیں جو عکس کو پسند تھیں اور جن کو شیر دل صرف عکس کے حوالے سے یاد رکھتا تھا۔ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر اس نے شہربانو کی فرمائش پوری کرنا شروع کی۔ وہ اب مسکراتے ہوئے اس کے بازو کے گرد اپنا بازو لپیٹے بڑی طمانیت کے عالم میں اس کے کندھے پر گال ٹکائے جگجیت کے بجائے اس کی آواز سن رہی تھی اور شیر دل جگجیت کی وہ غزل گنگناتے ہوئے عکس کی آواز کی بازگشت کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ اس نے پہلی بار اس غزل کو عکس ہی سے سنا تھا...... جگجیت کی غزل تو اس نے بہت بعد میں سنی تھی، کہیں اور جگجیت کی غزل سنتے ہوئے بھی اس کو عکس ہی یاد آتی رہی تھی۔

وہ دونوں اکیڈمی میں میوزک کلب کے ممبر تھے اور کسی سوشل ایوننگ میں اس نے پہلی بار عکس کو کسی سازو سازندے کے بغیر یہ غزل گاتے سنا تھا۔ اکیڈمی میں بہت کم لوگ گا سکتے تھے یا گانے کا شوق رکھتے تھے۔ اس سوشل ایوننگ کے پروگرام میں ایک غزل کے لیے عکس کا نام دیکھ کر جیسے سب کو کرنٹ لگ گیا تھا...... اس کی آواز خوب صورت تھی جس طرح اکیڈمی کی بہت سی لڑکیوں کی تھی۔ اس میں نرمی اور ملائمیت بھی تھی لیکن کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کامن کی topper یہ شوق بھی رکھتی تھی۔

اس کے اسٹیج پر آ کر مائیک کے ہاتھ میں لینے تک وہاں بیٹھے تمام کامنرز کو بے حد دلچسپی تھی ایس کی اس قابلیت اور ٹیلنٹ کو جانچنے میں لیکن ہال میں مائیک پر اس کی آواز بلند ہوتے ہی وہاں دلچسپی، اشتیاق، تجسس نام کی ہر چیز غائب ہو گئی تھی...... وہاں صرف عکس مراد علی کی آواز کا جادو تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سانس لینا، نظریں ہٹانا، حرکت کرنا یک دم ہر ایک کے لیے بے حد اضافی اور غیر ضروری سے کام ہو گئے تھے...... اور شیر دل اس ساکت اور ٹرانس میں آئے ہوئے کراوڈ کا حصہ تھا۔

آج پھر دل نے اک تمنا کی
آج پھر دل کو ہم نے سمجھایا

وہ اپنی آواز کی ملائمیت سے وہاں بیٹھے ہر شخص کے دل کو کاٹ رہی تھی...... کسی اضافی نشتر کے بغیر...... ایک پلین ڈارک بلیو کرتے اور سینے پر پھیلے ہوئے شیفون کے سفید دوپٹے اور سفید چوڑی دار پاجامے کے نیچے ایک بلیو کولہاپوری چپل پہنے، ماتھے پر بار بار پھسل کر آ جانے والے بالوں کو ہلکے سے جھٹکتے کانوں میں ہلکورے لیتے بڑے بڑے سلور بالوں کے ساتھ مائیک ہاتھ میں لیے ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی پکچر پرفیکٹ تھی۔

تم چلے جاؤ گے تو سوچیں گے
ہم نے کیا کھویا ہم نے کیا پایا

''اس عورت کو سنگر ہونا چاہیے تھا۔ یہ اکیڈمی میں کیوں وقت برباد کر رہی ہے۔'' شیر دل نے وہاں بیٹھے دوسرے مردوں کی طرح ایک بے حد chauvanistic ذہن کے ساتھ سوچا۔

غزل کب ختم ہوئی تھی اس کا احساس کسی کو نہیں ہو پایا تھا۔ جگجیت کی اس غزل میں کتنے شعر تھے۔ ہر ایک یک دم گنتی بھول گیا تھا۔ عکس کے خاموش ہونے پر بھی ہر ایک جیسے اگلے مصرعے کے انتظار میں تھا۔ وہاں کسی نے تالی تک نہیں بجائی تھی۔ پر اس کے مائیک کو واپس اسٹینڈ پر سیٹ کرنا تھا جس نے یک دم پورے ہال کو زندہ کر دیا تھا۔ ایک Thunderous aplause (والہانہ داد/ستائش) تھی جو اسے ملی تھی۔ کچھ مرد کامنرز نے کھڑے ہو کر اس کے لیے تالیاں پیٹی تھیں۔ وہ بڑے اطمینان سے میلا لوٹ کر اسٹیج سے غائب ہو گئی تھی۔

دوسری فرنٹ رو میں بیٹھا شیر دل شاید اس ہال میں بیٹھا واحد کامنر تھا جس نے عکس کے لیے تالی نہیں بجائی تھی۔ وہ مرعوب تھا۔ متاثر تھا، ٹرانس میں تھا...... سب کچھ تھا لیکن وہ الو کا پٹھا نہیں تھا اس لیے وقتی طور پر اس نے گدھا نظر آنا زیادہ بہتر محسوس کیا ایک ساتھی کے ٹیلنٹ کو داد دیتے ہوئے ساتھیوں کے درمیان قدرے بے تاثر چہرے کے ساتھ۔ اس نے پہلے گھڑی پر وقت دیکھا تھا پھر ہاتھ میں پکڑا پروگرام چارٹ...... وہاں ایک اور گانے کے بعد اس کی پیانو پرفارمنس تھی۔ اس نے پورے پروگرام کو پڑھا...... اپنے نام کے spelling تک کر کے پڑھ لیے۔ تالیاں تب بھی بجتی رہی تھیں۔ اور جب بالآخر تالیاں تھم گئیں اور اسٹیج سیکریٹری اگلی پرفارمنس کو اناؤنس کرنے لگا تو اس نے پہلی بار اپنی سیٹ سے ذرا سا آگے ہو کر دائیں کان کی لو کھجاتے ہوئے بائیں طرف گردن موڑ کر اس دوسری فرنٹ رو کے آخر میں بیٹھی ہوئی عکس مراد علی کو پہلی ستائشی نظر سے دیکھا۔

وہ اسٹیج پر آنے والے اگلے کامنر کے لیے مسکراتے ہوئے تالیاں بجانے میں مصروف تھی۔ اس کی طرح نہ گھڑی دیکھ رہی تھی نہ پروگرام چارٹ اور نہ اپنے دائیں بائیں۔

وہ اکیڈمی کے ہر کامنر کو اس کی کسی اچھی پرفارمنس پر بلا جھجک داد دیتا تھا۔ یہ صرف عکس مراد علی تھی جس کو شیر دل نے ہمیشہ نظر انداز کیا اس معاملے میں...... اس کے نزدیک عکس کے لیے ستائشی کلمات کہنا، احساسات رکھنا اور داد دینا کیوں اتنا مشکل ہو گیا تھا وہ خود بھی نہیں سمجھ سکا۔ وہ یہ تسلیم کرنے پر بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اس لڑکی سے خائف تھا...... اس کے رعب میں تھا...... اور بری طرح اس کی طرف اٹریکٹ ہو رہا تھا اس سے بچنے کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی...... اور یہ سب اسی طرح چلتا رہتا اگر ان دونوں کے درمیان عنی حمید نہ آ جاتا۔

''شیری کیا سوچ رہے ہو تم؟'' وہ یک دم شہر بانو کی آواز پر چونکا تھا۔

''کچھ نہیں...... کیا ہوا؟''

''تم مجھے گانا سنا رہے تھے۔'' شہر بانو نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں تو سنا دیا نا یار...... تم نے کہا تھا بس چند لائنز سنا دو میں نے سنا دیں۔'' وہ ایک بار پھر اپنا کام کھول کر بیٹھ گیا...... ضروری تھا کہ وہ اب یہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتا...... فائدہ نہیں تھا اب یہ سب کچھ یاد رکھنے کا...... لیکن وہ کئی بار کوشش کے باوجود بھی یہ سب بھولنے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔

''میں نے سوچا ہے امریکا سے واپس آنے کے بعد ہی اس گھر کو renovate کروں گی۔'' شہر بانو ایک بار پھر اسے ماضی سے حال میں لے آئی۔ وہ ابھی دو دن پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ پر آیا تھا۔ شہر بانو نے شیر دل سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن اسے اس جگہ میں بے حد دلچسپی تھی جہاں چند مہینے وہ عورت رہی تھی جو اس کے شوہر کا کوئی ڈارک سیکرٹ تھی۔ اس گھر میں پہلا قدم رکھتے ہی اسے یہ فرق نظر آیا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... یا کم سے کم اس حد تک نہیں دیکھا تھا جس حد تک وہ وہاں نظر آیا تھا۔ گھر بلا کا صاف ستھرا رکھا گیا تھا اور صفائی ستھرائی کا یہی عالم اس نے ملازموں میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے کسی ملازم کے گندے بڑھے ہوئے بے ترتیب بال، ناخن، دانت اور بے ہنگم شیو نہیں دیکھی تھی۔ نہ ہی کسی کو میلے، سلوٹ زدہ بوسیدہ لباس میں دیکھا تھا نہ کسی کے پاؤں میں خراب جوتے دیکھے تھے۔ شہر بانو نے اس سے زیادہ مستعد عملہ بھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ گھر کے بیرونی گیٹ پر موجود گارڈز سے لے کر اندرونی حصے میں کام کرنے والے ملازمین تک وہ کہیں کم سے کم حلیے اور مستعدی میں کوئی خامی نہیں دیکھ پائی تھی۔ گھر کے عملے پر گھر سے زیادہ توجہ دی گئی تھی اگر یہ عکس نے کیا تھا تو...... اور فوری طور پر وہ اس کا کریڈٹ عکس کو دینے سے جھجک رہی تھی۔ کوئی بھی صرف چند مہینوں میں صفائی اور مستعدی کا یہ معیار حاصل نہیں کر سکتا تھا اور عکس کو وہاں صرف چند مہینے ہوئے تھے۔

وہ پہلا سرکاری گھر تھا جس میں داخل ہوتے ہی اس کا دل خوش ہو گیا تھا۔ اس نے بہت کم سرکاری رہائش گاہوں کے لانز کو اس طرح maintained دیکھا تھا۔ اس کے اپنے گھر کا لان بھی ایک exception تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے لیے اس نے کتنی جان ماری تھی...... گھر کے کسی فرد کی ذاتی دلچسپی کے بغیر صرف مستعد عملے کے سر پر بھی وہ سب نہیں ہو سکتا تھا جو وہ وہاں دیکھ رہی تھی۔ وہ بہار کا موسم نہیں تھا لیکن کم سے کم اس لان کے سبزے اور رنگینی کو دیکھتے ہوئے اسے یونہی لگا تھا جیسے وہ بہار کے موسم میں ہی

اس گھر میں آئی تھی۔ شہر بانو کو حسرت ہی رہی تھی کہ وہ اس لان میں کہیں مٹی اور جالوں سے اٹے پودے اور اداس درخت دیکھ پاتی۔ کہیں اسے خراب اور بے ڈھنگی تراش خراش میں کچھ پودے نظر آجاتے۔ کہیں سوکھی اور پیلی گھاس، خشک اور گلے سڑے پتوں کا کوئی ڈھیر، ٹوٹے گملوں والے پودے یا کیڑا لگی ہوئی بیلیں ہی مل جاتیں...... وہاں کمال کا نظم و نسق تھا...... جو بھی کچھ تھا عدم توجہی یا بے نظمی کا شکار نہیں تھا...... اس نے یہ کریڈٹ بھی عکس کو دینے سے گریز کیا...... نئے پودوں کی پنیریوں کی قطاریں اور کیاریوں میں ننھے ننھے پودوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے بھی۔

گھر کے اندرونی حصے میں کوئی نئی تعمیر اور مہنگی تزئین و آرائش نظر نہیں آئی تھی...... آرائشی اشیا کا کوئی بے ہنگم ڈھیر نظر نہیں آیا تھا۔ وہاں زیادہ تر چیزیں وہی تھیں جو یقیناً ہمیشہ سے اس ڈی سی ہاؤس میں زیرِ استعمال تھیں...... لیکن اس پرانے فرنیچر اور آرائشی اشیا کو خستہ اور بوسیدہ حالت میں نہیں رکھا گیا تھا۔ پردے بھی پرانے تھے لیکن وہ تمام چیزیں بے حد صاف ستھری اور چمک رہی تھیں...... پرانے قالین یقیناً بہت اچھی طرح سے دھلوائے اور صاف کروائے جاتے تھے ان پر اگر کہیں پہلے کے کوئی نہ مٹنے والے داغ تھے تو بھی وہ بہت ہلکے تھے اور بعض چھوٹے چھوٹے داغوں پر چھوٹے چھوٹے rugs ڈال کر جیسے ان قالینوں کے ایسے نشانوں کو کور کر دیا گیا تھا۔ شہر بانو بھی یہ کبھی نہ جان پاتی اگر وہ وہاں آنے کے دوسرے ہی دن اتفاقی طور پر کسی ملازم کو ایک rug اٹھا کر صفائی کرتے ہوئے نہ دیکھ لیتی۔ rug کے نیچے قالین پر شاید کسی paint کا ایک داغ تھا۔ ملازم سے پوچھنے پر اسے پتا چلا تھا کہ ان چھوٹے اور سستے rugs کو عکس کی ہدایات پر خرید کر وہاں مختلف جگہوں پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ وہ نئی تزئین و آرائش کے نام پر بے مقصد اخراجات سے بچنے کی ایک بے حد عمدہ ترکیب تھی۔ اس گھر میں مختلف جگہوں پر ایسے بہت سے "رفو" کیے گئے تھے۔ شہر بانو ہر بار ایسے کسی نئے ٹوٹکے کو دیکھ کر اور سن کر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتی تھی۔ وہ کبھی کسی گھر کو ان طریقوں سے maintain نہیں کر سکتی تھی یہ اس کا طریقہ ہی نہیں تھا۔

کچن اس گھر کے لان کے بعد حیران کن طور پر سب سے زیادہ صاف حصہ تھا اور اس گھر میں آنے کے بعد ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ شہر بانو awe (رعب) میں آئی تھی۔ اس کے لیے گرد سے پاک چمکتا فرش، صاف ستھرے کاؤنٹر اور چکنائی اور میل کچیل سے پاک دھلے ہوئے چمکتے سنک۔ صاف ستھری منظّم کچن کیبنٹس اور آٹے اور چکنائی کی رطوبتوں سے پاک کوکنگ رینج دیکھنا جیسے خواب دیکھنے کے برابر تھا۔ پینٹری بھی اتنی ہی صاف ستھری اور منظم تھی جتنا کچن کا باقی حصہ۔ فریج اور فریزر کو کھول کھول کر دیکھنے پر بھی شہر بانو کو گندگی نظر نہیں آئی تھی اور ایسا کیوں تھا؟ کیونکہ عکس ناشتا اور رات کا کھانا باقاعدگی سے اسی کچن میں رکھی دو کرسیوں والی ایک چھوٹی میز پر کھاتی تھی۔ اکثر رات کو وہ اسی فریج میں سے دودھ خود نکال کر چائے بناتی تھی اور اسی کوکنگ رینج پر کبھی کبھار نائٹ اسنیکس تیار کیا کرتی تھی۔

"اچھا یہ صاف نہیں ہو سکتا؟" اس گھر کے خانساماں نے عکس کے حوالے سے شہر بانو کو ایک کے بعد ایک قصہ سناتے ہوئے اسے ایک واقعہ quote کیا جب اس گھر میں آنے کے بعد اس کوکنگ رینج پر جمی چکنائی پر عکس نے اعتراض کیا تھا اور خانساماں برکت نے اسے کہا تھا کہ وہ بس اتنا ہی صاف ہو سکتا تھا اور چمک اس لیے نہیں رہا تھا کہ وہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے ساتھ ہی عکس سے نئے کوکنگ رینج کا مطالبہ بھی کر دیا تھا۔ اس نے شہر بانو کو عکس کا جواب بتایا تھا۔

"اچھا یہ صاف نہیں ہو سکتا...... یہ چمک نہیں سکتا؟ کیونکہ یہ پرانا ہے؟" عکس نے اس سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"پکی بات ہے؟" برکت نے بڑے اعتماد سے اس کے سوال پر سر ہلاتے ہوئے ہاں کہا۔ اسے اپنی پھیلائی ہوئی گندگی کے durable (ہمیشہ رہنے) اور پکا ہونے پر جیسے اندھا اعتماد تھا۔ عکس نے جو اگلی بات کی تھی اس نے برکت اور دوسرے ملازمین کو بھونچکا کر دیا تھا۔ اس نے اسٹین لیس اسٹیل وول، گرم پانی، سرکہ اور ڈیٹرجنٹ مانگا تھا۔ برکت اور ملازمین نے کچھ خفت اور شرمندگی کے عالم میں گھبرائے بوکھلائے انداز میں اسے روکتے ہوئے خود اس کوکنگ رینج کو دوبارہ صاف کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن عکس نے انہیں ڈانٹ دیا تھا۔ وہ سب گنگ اس گھر میں آنے والی پہلی خاتون ڈی سی کو اسٹیل وول اور ڈیٹرجنٹ کے ساتھ رگڑ رگڑ کر وہ کوکنگ رینج صاف کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ کچن میں برکت کے دو مددگار دوسرے ملازمین بھی ڈی سی کو کوکنگ رینج صاف کرتے دیکھ کر اس کے دوسرے حصوں پر سے وہ گندگی اور غلاظت صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے جو اس سے پہلے اترتی ہی نہیں تھی یا کم از کم اس عزم اور نیت سے کبھی نہیں اتر پائی تھی جو کام کے حوالے سے ان کا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ پرانا کوکنگ رینج اس طرح چمک رہا تھا کہ برکت اس میں اپنا، ڈی سی اور کچن کا عکس دیکھ سکتا تھا۔

"ایک گھنٹا اسے صاف کرنے میں اس لیے لگا کیونکہ یہ شاید سالوں سے اچھی طرح صاف نہیں کیا گیا...... اگر ہمیشہ سے صاف ہوتا تو یہ ہر روز صرف دس منٹ لیتا صفائی کے لیے اور اس چمک کے لیے۔" ڈی سی نے سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے اس تولیے سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کہا جو ایک ملازم نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"اگر کسی چیز کو بدل دینے کا معیار یہ ہے کہ وہ پرانی اور گندی ہو گئی ہے تو میں اس معیار پر یقین نہیں

رکھتی۔ پرانی چیز زیادہ کارآمد ہوتی ہے..... گندی چیز صاف کی جاسکتی ہے..... میں کسی چیز کو صرف تب بدلوں گی جب وہ بے کار ہو جائے اور وہ رزلٹ نہ دے جو ہم چاہتے ہوں اور ان میں چیزوں کے ساتھ ساتھ انسان بھی شامل ہو سکتے ہیں۔'' شستہ انداز اور تمیز سے دی گئی وارننگ بجلی کے 440 وولٹ کے کرنٹ کی طرح ان سب کو لگی تھی۔ ان میں سے کوئی مر کر بھی اس ڈی سی ہاؤس کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس شہر میں کوئی دوسرا ڈی سی ہاؤس نہیں تھا۔ کمشنر ہاؤس تھا جہاں پہلے سے موجود عملہ ان کو آنے دینے والا نہیں تھا یا پھر چھوٹے موٹے دوسرے سرکاری اداروں کے سربراہان کے گھر تھے جہاں جانا ان کے لیے سولی پر لٹکنے کے برابر تھا..... ڈی سی ہاؤس میں کام کرنا جیسے خود ڈی سی ہونے کے برابر تھا۔

شہر بانو کو برکت نے باقی جذبات اور خیالات نہیں بتائے تھے۔ شہر بانو خود جان سکتی تھی کہ اس دھمکی کے بعد اس گھر میں کیا ہوا ہوگا..... عملے کی وہ مستعدی، جانفشانی اور صفائی ستھرائی اب جیسے اس کے لیے ایک راز نہیں رہی تھی۔

''میڈم نے کبھی ہمیں ڈانٹا نہیں۔'' برکت اب بھی میڈم کے لیے رطب اللسان تھا۔ شہر بانو ایک گہری سانس لے کر اس کچن سے باہر آئی تھی۔ اسے شیر دل کی وہ بات اب سمجھ میں آئی تھی جو اس نے عکس کے حوالے سے اپنے کسی بیچ میٹ کو کہی تھی۔

''She is a lethal administrator'' وہ lethal administrator اب شہر بانو کے سامنے ہوم ایڈمنسٹریشن کے نئے اسٹینڈرڈ سیٹ کر رہی تھی۔

اس گھر میں اخراجات کے نام پر کہیں سرکاری پیسے کا زیاں نہیں کیا گیا تھا۔ نہ وہ یہ کام خود کرتی تھی نہ اپنے عملے کو کرنے دیتی تھی۔ ملازمین کو اس حوالے سے بہت صاف اور سخت ہدایات تھیں۔ وہ اپنے کام کے حوالے سے ملازمین پر بہت زیادہ ڈیپنڈنٹ نہیں تھی۔ بہت کم ہی کبھی اس نے رات کے وقت گھر میں کام کرنے والے عملے کو اپنے کسی ذاتی کام سے بلایا تھا۔ وہ بہت سادہ کھانا کھاتی تھی۔ عام دنوں میں ون ڈش مینو اور ویک اینڈ پر ذرا زیادہ اہتمام اور ایک آدھ اور لوازمات..... گھر پر ہونے والی دعوتوں اور فیملی کے آنے پر بھی گھر کا مینو ہمیشہ budgeted ہوتا تھا۔ ایک گوشت کی ڈش، ایک سبزی، ایک دال اور سویٹ ڈش..... اور یہ کھانا صرف اس مقدار میں پکتا تھا جو مہمانوں کی تعداد اور کچن کے عملے کے لیے مناسب ہوتا۔

دو دن میں ہی اس گھر میں رہتے ہوئے شہر بانو کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ملازمین عکس کے بارے میں بات کرنا پسند کرتے تھے۔ اسے quote کرنا جیسے ان کی پسندیدہ سرگرمی تھی اور اس کے حوالے سے کچھ بتاتے ہوئے ان کے لہجے میں ایک عجیب سی ایکسائٹمنٹ جھلکتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی یہ شہر بانو نہیں جان سکی۔ اس پوسٹ پر پہلی خاتون آفیسر کے طور پر اس گھر میں آنا..... نوکروں کو دی جانے والی خاص مراعات خاص طور پر ان کے بچوں کے حوالے سے..... یا پھر عکس کا دوستانہ مزاج..... وجہ جو بھی تھی اس گھر میں دو دن اس نے صرف ''عکس نامہ'' سنا اور دیکھا تھا اور یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والی وہ اکیلی نہیں تھی۔ شیر دل دوسرا victim تھا لیکن اس کے لیے یہ سب پہلا تجربہ نہیں تھا..... عکس اپنے ساتھیوں کے لیے بلاوجہ خائف کرنے والی شے

نہیں بنی تھی۔

''تمہیں نیند آرہی ہے شبی؟'' وہ اس کے کندھے سے لگی اونگھنا شروع ہوگئی تھی جب شیر دل نے کام کرتے ہوئے اچانک اس کو دیکھ کر کہا۔ شہر بانو نے چونک کر آنکھیں کھول کر اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں تو۔''

''آرہی ہے یار..... سو جاؤ۔'' شیر دل نے اس کا سر تھپکتے ہوئے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں آرہی۔'' شہر بانو نے ایک بار پھر اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ''میں song سن رہی ہوں۔'' اس نے شیر دل کو جیسے جتانے والے انداز میں کہا۔

''سنو پھر۔'' شیر دل نے جیسے اسے اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ یہ بھی روٹین کی بات تھی۔ وہ کام کرتا رہتا وہ اسی طرح میوزک سنتی ہوئی اس کے کندھے سے لگے لگے سو جاتی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ جب تک کام سے فارغ ہوا وہ گہری نیند میں تھی۔ اپنا laptop بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے شیر دل نے سب سے پہلے اسے بڑی احتیاط سے خود سے الگ کرتے ہوئے بستر پر لٹایا، وہ چند لمحوں کے لیے کسمسائی اور اس نے نیند میں کچھ کہا پھر وہ جیسے نیند میں ہی کسی چیز سے ڈری۔ شیر دل نے کسی ننھے بچے کی طرح اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے چند لمحوں کے لیے اسے تھپکا۔ لاشعوری طور پر وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ بے حد جاذب نظر تیکھے نقوش اور ملائم جلد والا ایک معصوم چہرہ..... وہ سوتے ہوئے ہمیشہ بچوں جیسی معصومیت اور بے خبری سے سوتی تھی۔ اس بات سے بے پروا کہ وہ کہاں تھی اور کہاں نہیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس کے چہرے پر آئے بالوں کو نرمی سے ہٹا کر سمیٹتے ہوئے اسے دیکھتا گیا۔ اس نے زندگی میں شہر بانو سے زیادہ بے ضرر اور سادہ طبیعت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اپنے حال میں مگن مزے سے اپنی زندگی اپنے طریقے سے جینے والی..... اس نے شادی سے پہلے اور بعد اتنے عرصے میں کبھی شہر بانو سے کسی دوسرے کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی تھی۔ وہ اس سے بہت باتیں کیا کرتی تھی مگر دوسرے آفیسرز کی بیویوں جیسی باتیں کرتے اس نے شہر بانو کو بہت کم ہی دیکھا تھا۔ وہ بے حد حساس تھی اور شیر دل کو اس بات کا اندازہ شادی سے بہت پہلے ہوگیا تھا۔ اس نے شہر بانو کا ہمیشہ اس سے زیادہ خیال رکھا تھا جتنا وہ رکھ سکتا تھا۔ وہ جذباتی طور پر اس سے کس قدر اٹیچڈ تھی اور کس حد تک اس پر ڈیپنڈنٹ تھی شیر دل اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ شیر دل ساری زندگی بے حد اسٹائلش، اسمارٹ، خوب صورت اور تیز طرار لڑکیوں کی طرف اٹریکٹ ہوتا رہا تھا انہی کی کمپنی پسند بھی کرتا تھا۔ شہر بانو اور اس کے درمیان کیا کنکشن بنا تھا..... کیا common پوائنٹس نکل آئے تھے۔ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آیا..... شہر بانو بے حد حسین اور اسٹائلش تھی لیکن وہ easy- going آرام طلب نہیں تھی نہ ہی تیز طرار۔ وہ لیے دیے رہنے والی ایک لڑکی تھی اور اس کے باوجود شیر دل اس کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اس حد تک کہ وہ اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنا بیٹھا تھا اور ان تمام سالوں میں وہ جب بھی اس فیصلے کے بارے میں سوچتا وہ اسے اپنی زندگی کے سب سے اچھے فیصلوں میں سے ایک سمجھتا تھا۔

نیند میں ہی شہر بانو نے اپنا ہاتھ بڑھا کر لاشعوری طور پر اس کی شرٹ کو اپنی مٹھی میں لیا تھا۔ شیر دل ایک

لمحے کے لیے چونکا پھر وہ ایک بار پھر اس کے گہری نیند میں جانے کا انتظار کرنے لگا تا کہ اس کا ہاتھ اپنی شرٹ سے ہٹا کر بستر سے اٹھ سکے۔ وہ ہمیشہ سوتے ہوئے اسے اسی طرح پکڑ کر سوتی تھی۔

''میں جب تمہارے پاس ہوتی ہوں نا تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔'' وہ اکثر اس سے کہتی تھی۔

''کس چیز کا ڈر؟'' وہ شروع، شروع میں اس سے پوچھا کرتا تھا۔

''کسی بھی چیز کا ڈر۔'' وہ جواباً کہتی۔

''مثلاً؟'' شیر دل کو curiosity (تجسس ہوتی۔)

''تمہارے کہیں چلے جانے کا ڈر۔'' اس نے پہلی بار اس کے پوچھنے پر چند لمحے خاموش رہ کر کہا تھا۔ شیر دل اس جواب پر حیران رہ گیا تھا۔ اسے کم از کم اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

''میں کہاں جاؤں گا یار......؟'' اس نے اسی حیرانی میں پوچھا تھا۔

''مجھے چھوڑ کر۔'' شہر بانو کے اگلے جملے نے اسے اور حیران کیا۔ وہ چند لمحے اس کی شکل دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔

''تمہیں چھوڑ کر......؟'' کیا بے وقوفی کی بات ہے شبی، میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو یہ؟'' اس نے تب بھی شہر بانو کو اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔ شہر بانو نے اس کو جواب دینے کے بجائے اس کے سینے میں منہ کو چھپا لیا تھا۔ شیر دل کو لگا تھا وہ اس کا یہ اندیشہ دور کرنے میں کامیاب رہا تھا لیکن بہت آہستہ آہستہ اسے احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ شہر بانو شدید قسم کے عدم تحفظ کا شکار تھی اور اس وقت سے تھی جب اس کا باپ اس کی زندگی سے پہلے parents کی divorce (طلاق) کی صورت میں نکل گیا...... بعد میں خودکشی کی صورت میں ہمیشہ کے لیے...... وہ باپ کی زندگی تک اس کے پاس ایک اکلوتی اولاد کی شکل میں خوش و خرم رہی تھی۔ ایک خوش باش، پُراعتماد بچی...... فیملی کے ٹوٹنے نے اس بچی کی شخصیت کو بہت مسخ کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس کے باپ کی خودکشی نے...... زندگی شہر بانو کے لیے دوبارہ ویسی نہیں ہو سکتی تھی جیسے اس کے باپ کے ساتھ تھی...... وہ خلا وہ ساری عمر ساتھ لے کر چلی تھی اور اس خلا نے اس کے اندر بہت سارے خلا پیدا کر دیے تھے۔ شیر دل اس کی زندگی میں مرہم کے ایک پھاہے کی طرح آیا تھا۔ سمیٹنے اور سہارا دینے والے ہاتھوں کی طرح اور بہت صحیح وقت پر آیا تھا...... شیر دل نے واقعی اسے سمیٹ لیا تھا...... وہ شہر بانو کے بارے میں overprotective (حد سے زیادہ نگہبان) تھا۔ محبت اور شادی کے رشتے میں بندھ جانے کے بعد بھی بہت وقت لگا تھا اسے شہر بانو کو یہ یقین دلانے میں کہ وہ صرف اس کا تھا اور کوئی بھی چیز اسے اس سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ شہر بانو کو چھوڑ جانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

عکس شیر دل کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی، شہر بانو دوسری، شیر دل کے لیے ہمیشہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ ان میں سے کس سے زیادہ محبت کرتا تھا کس کو اپنی زندگی سے الگ رکھ کر خوش رہ سکتا تھا۔ عکس اس کی زندگی کا حصہ نہیں تھی۔ اس سے مہینوں رابطہ نہ ہونے کے باوجود کوئی دن شیر دل کی زندگی میں ایسا نہیں گزرا تھا جب شیر دل کو اس کا خیال نہ آیا ہو۔ وہ لاشعوری طور پر اس کو سوچتا تھا اسے مس کرتا تھا۔ اپنی زندگی میں ہونے والی ہر نئی development کو سب سے پہلے اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ کسی بھی مسئلے میں پھنس جانے کے بعد سب سے پہلے اس کے ساتھ ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے نہ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ چلتی تھی، ساتھ رہتی تھی، ساتھ جیتی تھی۔ ایک عکس کی طرح جو زندگی کی ہر منعکس کرنے والی شے پر ابھرتا تھا۔

شہر بانو اس کی زندگی کا کلمہ تھا جو ہر وقت اس کی زبان پر رہتا تھا۔ وہ اس سے جو کہتی تھی جو کر رہی ہوتی تھی وہ شیر دل کی زبان پر آ جاتا تھا۔ اس کی خوشی، خفگی شیر دل کے دن بناتے بگاڑتے تھے۔ وہ عکس سے اظہارِ محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شہر بانو سے اظہارِ محبت سنے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

سسٹر ایگنس کو لگا ڈی سی پاگل تھا یا اس کا ذہنی توازن خراب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ چند مہینے پہلے اس بات پر وہاں ہنگامہ کر کے گیا تھا کہ ایک نوکری کی نو اسی کو بھیجا جانے والا وارننگ لیٹر اس کی بچی کے ہاتھ کیوں بھیجا گیا تھا اور وہ آج پھر وہاں اس مطالبے کے ساتھ آیا تھا کہ اس بچی کو اسکول سے نکال دیا جائے۔ اس کا نانا چور تھا اور اسے ڈی سی ہاؤس سے اسی وجہ سے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ خیر دین کے حوالے سے یہ انکشاف سسٹر ایگنس کے لیے شاکنگ تھے لیکن اس سے زیادہ شاکنگ اس ڈی سی کا رویہ تھا جس نے پہلے یہ مطالبہ اپنے آفس میں بیٹھے اپنے پی اے کے ذریعے اس تک پہنچایا تھا پھر خود فون پر یہ مطالبہ دہرایا تھا اور اب اسے اطلاع دیے بغیر اس کے آفس میں آن دھمکا تھا۔

سسٹر ایگنس کے لیے اپنا غصہ کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس سے پہلے اسکول میں ایڈمیشن کے لیے انتظامی مشینری کا دباؤ برداشت کرتی رہی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا جب کسی بچی کو اسکول سے نکلوا دینے کے لیے انتظامی مشینری سرگرم نظر آ رہی تھی۔ اس نے ڈی سی کے ساتھ جتنی نرمی اور تہذیب کا مظاہرہ کرنا ممکن تھا کیا لیکن ایک پوائنٹ پر آ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"I cant takeit any more - Please leave my office right away" (میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ اسی وقت میرے آفس سے چلے جائیں) بار بی ڈول کا باپ بری طرح بھڑکا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ دوسری بار ہوا تھا جب کسی نے اس سے اس طرح بدتمیزی سے بات کی تھی اور دونوں دفعہ یہ کارنامہ اسی عورت نے سرانجام دیا تھا جو اس کے سامنے ایک اسکول کی پرنسپل والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

"you dare not talk to me like that if you want to continue this job. You have no idea what I can do to remove you from this post" (اگر تم اپنی نوکری جاری رکھنا چاہتی ہو تو تم مجھ سے اس طرح بات کرنے کی جرات بھی مت کرنا، میں تمہیں اس پوسٹ سے ہٹانے کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہوں تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے) وہ بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔

Mr DC if this is a challenge then. I take it .Please leave my office immediately. I have to meet some other visitors as

well."

(ڈی سی صاحب، اگر یہ ایک چیلنج ہے تو میں اسے قبول کرتی ہوں۔ برائے مہربانی آپ فوراً میرے آفس سے نکل جائیں۔ مجھے کچھ اور لوگوں سے بھی ملاقات کرنی ہے)

وہ اب کچھ بھی کہے بغیر سرخ چہرے کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ اب بھی وہ کھڑا نہ ہوتا تو سسٹر ایگنس وہاں سے اٹھ جاتی۔ اس نے مزید سسٹر سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس تقریباً دروازہ توڑنے والے انداز میں کھول کر وہ وہاں سے نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سسٹر ایگنس بہت دیر پریشانی کے عالم میں وہاں بیٹھی رہی۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈی سی کے اختیارات اور پاورز کیا تھیں وہ کیا نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے اسکول اور اس کو مشکل میں ڈالنے کے لیے۔ اسے یقین تھا آج نہیں تو کل اسے کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن سے فون آنے ہی والا تھا۔ وہ اسے اتنی دھمکیاں دے کر گیا تھا، کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی...... لیکن اسے یقین تھا کہ کیتھولک بورڈ کا اسٹینڈ بھی اس ایشو پر وہی ہوگا جو اس کا تھا لیکن اس معاملے کے مزید بگڑنے سے پہلے اس کا خیر دین کے معاملے کو Interrogate (چھان بین) کرنا ضروری تھا۔ اس نے خیر دین کو دوسرے دن ہی اسکول بلوا لیا تھا اور جب اس نے ڈی سی کا مطالبہ اور الزامات خیر دین کے سامنے دہرائے تو اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

بعض دفعہ انسان لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنا پردہ نہیں رکھ پاتا، وہ جیسے بیچ چوراہے میں جا کر پھوٹتا ہے اور خیر دین کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ اس نے سسٹر ایگنس کو اپنی صفائی دینے کی کوشش کی اور پھر جیسے خود پر قابو نہ پاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

اس دن جو کچھ سسٹر ایگنس نے خیر دین سے سنا تھا اس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چڑیا ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹس میں سے تھی اور انہیں وہ سب کچھ سنتے ہوئے جیسے دلی رنج ہوا تھا۔ وہ اب چڑیا کی اس حالت کو سمجھ سکتی تھیں جسے وہ پہلے سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ خیر دین ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے روتے ہوئے سر جھکائے انہیں سب کچھ بتاتا رہا اور وہ تاسف سے سر ہلاتی رہیں۔ ان کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے جن میں وہ خیر دین سے ہمدردی کا اظہار کرتیں یا اپنے رنج کو بیان کر پاتیں۔

☆☆☆

ایک آدمی نے ریڑھی پر پڑا پھل بڑے بڑے لفافوں میں بھر کر گاڑی کے اندر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے نے دال کا دیگچہ اٹھا کر وہیں فٹ پاتھ پر الٹا دیا تھا۔ خیر دین نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی۔ ان کو روکا لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا...... وہ تعداد میں زیادہ تھے اور سرکار کے آدمی تھے...... اور چڑیا اس سب کے دوران بے حد خوف زدہ روتے ہوئے خیر دین اور اپنے اوپر ٹوٹنے والی ایک اور قیامت دیکھتی رہی۔ وہ ان کا رزق تھا جو وہ چھین کر لے گئے تھے۔ ریڑھی پر اب کچھ بھی نہیں تھا جو تھا وہ زمین پر بکھرا ہوا تھا صرف لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہاں آن کھڑا ہوا تھا۔

اس نے آخری بار جب اس آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا تو اس کا لباس اور اس کا چہرہ...... اس کا جسم...... اور ان تینوں چیزوں سے بھی بڑھ کر اس کی روح، اس کی زندگی اور اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اب 26 سالوں بعد وہاں اس آئینے کے سامنے کھڑے اپنے آپ کو دیکھنا کیسا صبر آزما کام تھا کوئی اس سے پوچھتا...... لیکن اگر کسی کو یہ پتا ہوتا کہ وہاں اس پر اور اس کے خاندان پر کیا گزری تھی تو کوئی بھی اس سے کچھ بھی نہ پوچھتا۔

وہ ایک نظر جو اس آئینے کے سامنے سے چیختے چلاتے اس نے اپنے چہرے پر ڈالی تھی، وہ چند سیکنڈ اس کے اندر سمندر کی کسی شوریدہ سر لہر کی طرح پلٹ کر آئے تھے...... سب کچھ اتھل پتھل کرتے۔ ایک طوفان تھا جو اس کے اندر آیا تھا اور جو اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ پانی نہیں تھا وہ جو اس کی آنکھوں سے برس رہا تھا۔ پانی ہوتا تو بہہ جاتا ہاتھ سے پونچھ لیا جاتا، وہ تو آبلے تھے جو اس گھر میں داخل ہو کر اس آئینے تک آتے آتے یوں پھوٹے تھے کہ پھوٹتے ہی چلے گئے تھے اور کیا کیا تھا جو ان آبلوں سے نہیں بہہ نکلا تھا...... درد کا ایسا سمندر اس کے اندر اتنے سالوں سے یوں قید تھا اس کو خود بھی کبھی پتا نہیں چلا۔ تکلیف تو تھی...... اذیت تو تھی...... جس کو اپنے وجود کے اندر مقید کرتے کرتے اس پر خاموشی کے تالے لگاتے لگاتے اس نے بہت سا وقت گزار دیا تھا اور وہ تکلیف وہ اذیت یوں پلی بڑھی تھی اس کے اندر کہ ایک قطرے سے سمندر ہو گئی تھی۔

اس گھر کے دروازے پر اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر رونا اس کی زندگی کی خواہشات میں کبھی شامل نہیں تھا۔ اس گھر کو دوبارہ دیکھنا وہاں دوبارہ آنا بھی اس کی زندگی کی خواہشات میں نہیں تھا لیکن وقت اسے وہاں لے آیا تھا اور کیسے لے کر آیا تھا...... آبلوں سے رستے والی اذیت، ذلت اب تشکر بننے لگی تھی...... عاجزی، احسان مندی، تشکر، اس کائنات کا حاکم...... اس ذات کے لیے تشکر اور احسان مندی...... جو دن پلٹا سکتا تھا اور جس نے دن پلٹا دیے تھے۔

زمین پر گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس نے اس گھر کے حاکم کے طور پر پہلا سجدہ کیا تھا اور وہ سجدہ کبھی ختم نہ ہوتا اگر وہ مہربان نرم مضبوط ہاتھ اس کی پشت کو مشفقانہ انداز میں نہ تھپکنے لگتا...... اس نے اس کی تمام ہدایات اور نصیحتوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔

اس ہاتھ نے سہارا دے کر اسے اوپر کھینچ لیا تھا...... ساری زندگی اس ہاتھ نے یہی کیا تھا اس کے لیے...... اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے ساتھ اسے کسی ننھے بچے کی طرح چپکائے...... وہ دونوں اس گھر کے اندر جا رہے تھے۔ وہ صرف ایک چیز باہر بھول گئے تھے۔

☆☆☆

اس نے زندگی بھر ریڑھی لگا کر رزق نہیں کمایا تھا۔ اس نے ساری زندگی ایک ڈی سی ہاؤس میں بڑی عزت کے ساتھ رزق کمایا تھا...... ذلت اور زوال کا سفر صرف چند ماہ پہلے شروع ہوا تھا اس کے لیے۔ وہ ہمیشہ سے ایک ریڑھی والا ہوتا تو میونسپلٹی کے ان لوگوں کو چار گالیاں دیتا، تھوکتا یا ان کی منتیں کرتا، ان کو رشوت دینے کی کوشش کرتا...... مگر شرم سے ڈوب مرنے کی جگہ نہ تلاش کر رہا ہوتا...... نہ ہی اس کا چہرہ سرخ ہوتا نہ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوتے...... لیکن خیر دین اپنی نواسی کے ساتھ اس ہجوم کے بیچ میں سرکس کے اس جانور کی طرح کھڑا تھا جس کو سدھائے بغیر رنگ میں اتار دیا گیا تھا۔ وہ مجمع اب آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تھا، تماشا ختم ہو گیا تھا۔ چند ہزار روپے سے اس ریڑھی پر کیا جانے والا وہ بزنس چند منٹوں میں ختم ہو گیا تھا۔ قرض کی وہ رقم جو خیر دین نے اپنے دوست سے لی تھی شہر میں آنے سے پہلے اور جس سے اس نے یہ روزگار شروع کیا تھا وہ جیسے پلک جھپکتے میں ڈوب گئی تھی۔

میونسپلٹی کے لوگ جاتے جاتے اس ریڑھی کو وہاں موجود کھمبے کے ساتھ ایک تالے والی زنجیر کے ساتھ سیل کر گئے تھے...... اور اس کا قصور کیا تھا یہ اس فٹ پاتھ پر موجود لوگوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف خیر دین تھا جو سمجھ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا کیوں ہوا تھا۔ اس فٹ پاتھ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دال چاول کی بھی ریڑھیاں تھیں

اور پھلوں کی بھی...... وہ ایک مصروف فٹ پاتھ تھا وہاں ایسی ریڑھیوں کا موجود ہونا کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن میونسپلٹی کے اہلکاروں کا وہاں آکر صرف خیر دین کی ریڑھی کو ان تمام ریڑھیوں میں سے شناخت کرکے اس کا نام پوچھنے کے بعد اس کا سامان یہ بتا کر ضبط کرلینا کہ اسے وہاں کام کرنے کا حق نہیں ہے کسی وجہ کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا اور وہ وجہ میونسپلٹی کے ایک اہلکار نے بے حد درشت لہجے میں اسے جاتے جاتے بتادی تھی۔

''تم اس شہر میں کہیں بھی ریڑھی نہیں لگا سکتے اگر یہ کام کرنا ہے تو اس شہر سے چلے جاؤ۔'' وہ دھمکی تھی تنبیہ تھی، اعلان تھا یا چیلنج...... خیر دین جانتا تھا وہ صرف ایک ہی شخص کی طرف سے آیا تھا جو اس شہر کا بادشاہ تھا اور جس کے بغیر اس شہر میں واقعی ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ خیر دین کے اردگرد اکٹھا ہونے والا سارا مجمع آہستہ آہستہ چھٹتا گیا تھا۔ آس پاس کی ریڑھیوں اور دکانوں والے اس پُراسرار صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے واپس اپنی اپنی جگہوں پر جارہے تھے، صورتِ حال ان کو پُراسرار نہ لگتی تو کیا لگتی۔ وہ ایک آدمی جس نے چند ہفتے پہلے وہاں ریڑھی لگانا شروع کی تھی آج بغیر کسی وجہ کے اس کی ریڑھی اور اس کے سامان کو بحقِ سرکار کیوں ضبط کرلیا گیا تھا اور وہ آدمی وجہ کیوں نہیں بتا رہا تھا...... گم صم کیوں تھا۔

زارو قطار روتی ہوئی چڑیا نے فٹ پاتھ اور سڑک پر ریڑھی کے آس پاس بکھرے ہوئے ان پھلوں کو اٹھانا شروع کردیا تھا جو میونسپلٹی کے اہلکاروں سے پھل اٹھاتے ہوئے زمین پر گر گئے تھے۔ اپنی قمیص کے دامن میں سسکیوں اور ہچکیوں سے روتے ہوئے اور بازو سے ناک اور آنکھیں رگڑتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ اور سڑک پر گرا ہوا اپنا ایک ایک پھل چن لیا تھا۔

ایک بچے کے طور پر وہ اپنا سرمایہ اکٹھا کررہی تھی جو ڈوبنے سے بچ گیا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ان بچے کھچے پھلوں سے وہ ریڑھی نہیں بھر سکتی تھی۔ وہ بزنس دوبارہ نہیں چل سکتا تھا۔ وہ پھر بھی ایک بچے کی لاشعوری معصومیت اور ڈیفنس میکنزم کے تحت وہ سب کچھ بچانے کی کوشش کررہی تھی جو اسے بچتا نظر آرہا تھا اور خیر دین نے اسے اس کوشش میں مصروف پاکر ایک عجیب سا حوصلہ پایا تھا۔ یہ سبق اسی کا تو دیا ہوا تھا چڑیا کو...... وہاں بت بن کر کھڑا رہ کر اس دھواں اڑاتی بہت دور موڑ مڑتی میونسپلٹی کی گاڑی کو حسرت و یاس کی نظروں سے دیکھتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... ان دس پندرہ پھلوں کو اٹھا لینے اور بچا لینے کا تھا...... وہ بیک کرنوٹوں میں نہ بدلتے لیکن کم سے کم تین وقت کے لیے ان کا پیٹ بھر سکتے تھے۔

خیر دین نے جب تک حوصلہ پکڑا تھا چڑیا زمین پر گرے سارے پھل ریڑھی پر ڈال چکی تھی...... وہ ریڑھی جو صرف آدھے گھنٹے پہلے پھلوں سے بھری ہوئی تھی اس میں اب کچھ گرد آلود سیب اور آم پڑے جیسے خیر دین اور چڑیا کا منہ چڑا رہے تھے۔ خیر دین بوجھل قدموں کے ساتھ چلتا ریڑھی کے پاس کھڑی چڑیا کے پاس آگیا جو اب ریڑھی پر پڑے ایک کپڑے کے ساتھ ان گرد آلود پھلوں کو صاف کررہی تھی، وہ خیر دین کے لیے بس یہی کرسکتی تھی، نو سال کی عمر کی ایک بچی کے پاس خیر دین کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا لیکن آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ ہچکیوں سے روتے ہوئے ان پھلوں کو صاف کرتے چڑیا نے سوچا تھا وہ زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے نانا کو ایک پھلوں سے بھری ہوئی خوب صورت ریڑھی ضرور لے کردے گی۔ جس میں ہر رنگ اور ہر موسم کا بہترین پھل ہوگا، اس سے کہیں زیادہ تعداد میں اور کہیں زیادہ اچھا جتنے میونسپلٹی کے وہ اہلکار اٹھا کر لے گئے تھے۔

خیر دین نے سڑک پر پڑی ایک اینٹ اٹھا کر اس زنجیر کو توڑ ڈالا تھا جو میونسپلٹی کے اہلکار اس کی ریڑھی کے پہیے کو کھمبے کے ساتھ باندھنے کے لیے ڈال گئے تھے۔ نانا اور نواسی ریڑھی کو دھکیلتے ہوئے خاموشی کے عالم میں وہاں سے لے گئے تھے، روز وہ باتیں کرتے گھر جاتے تھے آج پہلی بار وہ سفر گونگوں کی طرح طے ہوا تھا۔

وہ ان تینوں کے لیے ایک اور برا دن تھا۔ اس دن بھی خیر دین، حلیمہ اور چڑیا نے کچھ نہیں کھایا۔ اس رات بھی چڑیا

نے اپنے نانا اور حلیمہ کو باتیں کرتے اور روتے ساری رات جاگتے دیکھا تھا اور اس دن بھی چڑیا نے اپنے پاس موجود ایک چھوٹی سی ڈائری میں ان تمام چیزوں کی فہرست میں جو وہ اپنے نانا کو دینا چاہتی تھی ایک پھلوں والی ریڑھی کا اضافہ بھی کیا تھا۔

خیر دین اگلا ایک ہفتہ شہر میں کہیں بھی ریڑھی نہیں لگا سکا۔ وہ خائف تھا...... نقصان سے، ذلت سے اور قسمت سے جواب اس پراوچھے سے اوچھا وار کررہی تھی۔ اس کے پاس اتنی جمع پونجی تھی کہ وہ ایک بار پھر ریڑھی کو پھلوں سے اور دال کے دیگچے کو دال سے بھر کر بازار لے جاتا...... لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنا بڑا رسک لے یا پھر اپنا کام کرنے کے بجائے کسی کے پاس محنت مزدوری کرلے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ ایک اور ہفتہ جگہ جگہ مزدوری کی تلاش میں پھرتا رہا...... جس عمر میں وہ کام تلاش کررہا تھا اس عمر کے لوگوں کو مالک کام سے فارغ کررہے ہوتے تھے۔ ایک ہفتے تک دھکے کھاتے رہنے کے بعد اور گھر میں پڑی ہوئی جمع پونجی کو ہر روز گھٹتا دیکھتے رہنے کے بعد خیر دین نے ایک بار پھر خطرہ مول لے ہی لیا تھا۔ وہ دال کا دیگچہ اور ریڑھی کو پھلوں سے بھر کر ایک بار پھر رزق تلاش کرنے نکل پڑا تھا لیکن اس بار اس نے پہلے والے فٹ پاتھ پر ریڑھی نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک گنجان بازار میں جیسے چھپنے والے انداز میں ریڑھی لگا کر کھڑا ہوگیا تھا...... اور سارے دھڑکوں اور خدشات کے باوجود وہ دن خیر خیریت سے گزر گیا تھا اور شام کو جب وہ دال کے دیگچے اور پھلوں کی ریڑھی سے کمائے جانے والے کچھ نوٹ اپنی جیب میں لیے لوٹا تھا تو اسے چڑیا کی زبان سے وہ خوش خبری مل گئی تھی جس کی اسے کم سے کم اس وقت توقع نہیں تھی۔

☆☆☆

باربی ڈول کا آج اسکول میں آخری دن تھا کیونکہ اس کے پاپا کی وہاں سے ٹرانسفر ہوگئی تھی۔ وہ ایک بار پھر چڑیا سے ملنے آئی تھی اور اس بار اس کی ممی اس کے ساتھ تھیں۔ باربی ڈول اپنی ممی کا ہاتھ پکڑے انہیں جیسے ضد کرتے کھینچتے ہوئے چڑیا کی کلاس میں لے آئی تھی۔ وہ وہاں نہیں آنا چاہتی تھی کیونکہ اسے بالکل سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ ایک ایسی بچی کا سامنا کیسے کرے گی جسے اس کا شوہر اس کے نانا کی وجہ سے شدید ناپسند کرتا تھا اور جس پر اس کی چار سالہ بیٹی فریفتہ تھی۔

چڑیا کی کلاس میں آکر اس نے ٹیچر سے چند منٹوں کے لیے چڑیا کو باربی ڈول سے ملنے کے لیے کلاس سے باہر بھیجنے کے لیے درخواست کی تھی۔ چڑیا کا دل باربی ڈول اور ڈی سی کی بیوی کو دیکھ کر بری طرح ڈوبا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر کچھ خوف زدہ بھی ہوگئی تھی کیونکہ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آیا تھا کہ باربی ڈول کی ممی اسے کس لیے باہر بلا رہی تھیں۔

وہ فق چہرے اور لرزتے کانپتے جسم کے ساتھ باہر کاریڈور میں آئی تھی جہاں باربی ڈول اور اس کی ممی کھڑی تھیں۔ اور یہی وہ پہلا موقع تھا جب باربی ڈول کی ممی نے اس بچی کا بغور جائزہ لیا تھا جو اس کے نزدیک اس سرکاری گھر کا سب سے عجیب و غریب اور پُراسرار کردار ثابت ہوا تھا جہاں رہنے کے بعد وہ جا رہی تھی۔

''بیٹا ہم لوگ یہاں سے جارہے ہیں کیونکہ باربی ڈول کے پاپا کی یہاں سے ٹرانسفر ہوگئی ہے۔'' باربی ڈول کی ممی نے اس سے ہاتھ ملانے کے بعد اسے بتانا شروع کیا تھا اور کئی مہینوں کے بعد وہ پہلا موقع تھا جب چڑیا نے باربی ڈول سے ہاتھ ملایا، اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کی ہمت کی، اس کی آنکھوں میں دیکھا...... جہاں اسے اپنا عکس نظر آیا تھا...... ہمیشہ ہی آتا تھا۔

☆☆☆

عکس کی نظروں میں شیر دل کو اپنے لیے ملامت نظر آئی تھی لیکن شیر دل نے اسے ڈھٹائی سے نظر انداز کیا۔ وہ ان

ملامتی نظروں کا عادی تھا بالکل اسی طرح جس طرح عکس اس کی ڈھٹائی کی عادی تھی۔ وہ دونوں چیف سیکریٹری کی ہنگامی طور پر بلائی جانے والی کسی میٹنگ کے لیے لاہور میں موجود تھے اور میٹنگ سے فراغت پانے کے بعد شیر دل ہمیشہ کی طرح جم خانہ کے ٹینس کورٹس پر ٹینس کی پریکٹس کے لیے جا پہنچا تھا۔ وہ رات لاہور میں ہی رکنے والا تھا کیونکہ شہر بانو اور مثال بھی اس کے ساتھ ہی لاہور آ گئی تھیں۔ وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔

عکس نے اتفاقی طور پر لاہور میں قیام کیا تھا۔ وہ اپنے شہر کے کچھ انتظامی معاملات کے حوالے سے ہونے والے ایک اجلاس میں اگلے دن بھی لاہور میں کسی وفاقی وزیر سے ملنے والی تھی جو اس کے شہر سے تھا اور اگلے دن لاہور آنے والا تھا۔ وہ اس شام فری تھی اور اسے جم خانہ شیر دل نے ہی انوائٹ کیا تھا۔

''مجھے تمہاری ٹینس skill سے متاثر ہونے کا کوئی شوق نہیں ہے اس لیے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کہاں ملو گے؟'' سیکریٹریٹ سے میٹنگ کے اختتام پر وہاں سے جاتے ہوئے شیر دل کی دعوت پر عکس نے اس سے پوچھا تھا۔

''میرا اب تمہیں اپنی کسی بھی چیز سے متاثر کرنے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔'' شیر دل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وقت کے ساتھ ساتھ تم میں بہتری آتی جا رہی ہے۔ لگتا ہے شہر بانو کی محنت رنگ لا رہی ہے۔'' عکس نے اطمینان سے تبصرہ کیا تھا۔

''نہیں، میں نے ویسے ہی تمہیں متاثر کرنے کا ارادہ ختم کر دیا ہے۔'' شیر دل نے اس کی بات کے جواب میں گہری سانس لی تھی۔

''بڑی جلدی ہمت ہار دی..... ابھی تو چند ماہ ہیں میری شادی میں۔'' عکس نے جیسے اس کے جواب سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم شادی کر رہی ہو اور میں بہت خوش ہوں۔'' شیر دل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

''اور اس خوشی کی کیا وجہ ہے؟'' عکس نے جیسے مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو میں اس لیے خوش ہوں کہ تم شادی کرو گی تو میرے بیٹے کو تمہاری بیٹی کے ساتھ رومانس کا موقع مل سکے گا..... تم جس طرح شادی کو ٹالتی آ رہی تھیں وہ میرے بیٹے کے ساتھ بھی زیادتی تھی..... میں واقعی یہ چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد شادی کر لو ورنہ اس طرح delay کرتی رہیں تو یہ نہ ہو کہ میرے بیٹے کے بجائے میرے پوتے کو تمہاری بیٹی سے رومانس کرنا پڑے۔'' عکس کو ہنسی آئی تھی اور وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ وہ غصہ دلانے کی ایک واضح کوشش تھی شیر دل کی طرف سے جو ضائع گئی تھی۔

''تو تمہاری اور جواد کی شادی میں، میں صرف اس حد تک انٹرسٹڈ ہوں۔'' شیر دل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس نے عکس کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے لیے عکس کو دیکھنا بھی ایک آزمائش کا کام تھا اور اس طرح ہنستے دیکھنا ایک بڑی آزمائش..... وہ بہت کم اس طرح ہنستی تھی جس طرح اس وقت ہنس رہی تھی۔ بار بار اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے اور اس میں ناکام ہوتے ہوئے..... پتا نہیں وہ اس کی بات سے محظوظ ہوئی تھی یا آج ویسے ہی اچھے موڈ میں تھی۔

''شیر دل تم ایک انتہائی.....'' وہ بات کرتے کرتے پھر ہنس دی تھی۔ وہ شیر دل کے اس طرح کے سینس آف ہیومر سے اکیڈمی کے دنوں سے واقف تھی۔ وہ عکس مراد علی سے جھلاہٹ میں اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا۔

''لگتا ہے صدمے سے تم پر اس طرح کے اثرات ہو رہے ہیں۔'' عکس نے بالآخر خود پر قابو پا لیا تھا۔

''شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ لگتا ہے صدمے سے تمہارا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے۔'' شیر دل نے تبصرہ کیا۔

''ذہنی توازن تو خیر تمہارا ہمیشہ سے خراب تھا۔''

''نہیں، تم سے ملنے کے بعد ہوا۔''

''ویسے تمہارا بیٹا میری بیٹی سے صرف رومانس کرے گا؟'' عکس نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بات بدلی تھی۔

''ہاں صرف رومانس۔'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی کے ساتھ دوٹوک انداز میں کہا۔ عکس کو ایک بار پھر ہنسی آئی۔

''تم اس طرح ہنس کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟'' شیر دل اس بار بالآخر جھلایا تھا۔

''یہی کہ تمہارا بیٹا باپ سے زیادہ سمجھدار ہے..... ویسے تمہارا یہ بیٹا ہے کہاں؟'' وہ اب اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

''شہر بانو expect کر رہی ہے کیا؟''

''نہیں ہے لیکن ہو جائے گا..... او نہیں یار وہ expect نہیں کر رہی فی الحال تو وہ امریکا جا رہی ہے کل۔'' شیر دل نے اسے بتایا۔ وہ دونوں اب پارکنگ کی طرف جانے کے بجائے رستے میں ہی ایک طرف کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ بھی ان کی پرانی عادت تھی وہ جہاں کبھی ملتے اسی طرح مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آتے..... اور ہر ملاقات میں وہ ایک دوسرے کو جیسے اس دن اور اس وقت تک کے اپنے تمام حالات زندگی گوش گزار کر کے ہی جاتے..... شہر بانو کو زندگی میں شامل کرنے کے بعد اور عکس کے ساتھ کچھ اختلافات کے بعد شیر دل نے اپنی اس عادت اس روٹین کو بدلنے کی بہت کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا صرف تب تک جب تک وہ دوبارہ عکس سے نہیں ملا تھا..... اور یہی کوشش عکس نے بھی کی تھی لیکن وہ دونوں آمنا سامنا ہونے پر ''صرف کام کی باتیں'' کرنے کے ٹاسک کو بھی پورا نہیں کر سکے تھے۔ عکس اپنے گرد ہر دفعہ تحفظات اور احتیاطوں کی نئی دیواریں چن کر آتی تھی اور ہر بار شیر دل سے ملاقات کے بعد اسے ملبے کے ایک نئے ڈھیر کا سامنا کرنا پڑتا۔

وہ عورتوں سے لچھے دار باتیں کرنے کا کبھی عادی نہیں رہا تھا۔ اسے کسی عورت کو اپنی انگلیوں کے گرد گھمانے کے لیے اس طرح کے حربوں یا طریقوں کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ وہ کسی بھی عورت کو flatter کیے بغیر بھی چارم کر سکتا تھا..... اپنی طرف بڑی آسانی سے اٹریکٹ کر سکتا تھا اور اس آسانی نے بعض حوالوں سے صنف نازک کے لیے شیر دل کی رغبت کو کم کر دیا تھا۔ لڑکیوں سے دوستی، پھرنا پھرانا، گپ شپ اور اچھا وقت گزارنا ایک چیز تھی لیکن شیر دل نے کبھی لڑکیوں کے بارے میں سوچنے میں وقت اور انرجی صرف نہیں کی تھی..... اپنی گرل فرینڈز کے بارے میں بھی، ان چند لڑکیوں کے بارے میں بھی جن میں وقتاً فوقتاً اس کی دلچسپی دوستی سے کچھ زیادہ بڑھی تھی۔ عکس مراد علی وہ پہلی لڑکی تھی جس نے شیر دل کو زچ کیا تھا، خوار کیا تھا، متاثر کیا تھا اور جس کے بارے میں سوچنے میں اس نے گھنٹوں برباد کیے تھے، راتیں جاگ کر گزاری تھیں اور یہ سب اس وقت سے تھا جب وہ اپنے اور عکس کے تعلق کی نوعیت کو کوئی نام بھی نہیں دے سکا تھا۔

اس کے لیے کبھی بھی عکس مراد علی کو نظر انداز کرنا، اس سے بات چیت کو صرف ہیلو ہائے تک رکھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ کوشش کرنا ایک بات تھی کوشش میں کامیاب ہونا ایک دوسری بات وہ لڑکیوں سے وہ سب بھی نہیں کہا کرتا تھا جو وہ عکس سے کہا کرتا تھا۔ وہ اس کے سامنے جھلانا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح شیر دل، عکس مراد علی کے سامنے بس جھلا کر رہ جاتا تھا۔ اس عورت پر اس کا بس نہیں چلتا تھا..... اور اس عورت پر اس کا بس کیوں نہیں چلتا تھا شیر دل نے اس پر سوچنے میں بھی گھنٹوں لگائے تھے..... عکس مراد علی کو کیسے مرد اچھے لگتے تھے؟ مردوں میں کیا اچھا لگتا تھا؟ اسے یاد ہے اس نے ایک بار اکیڈمی میں دو دن ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے بعد زچ ہو کر بالآخر سیدھا جا کر عکس مراد علی سے ہی یہ سوال کر لیے تھے۔

''بیٹا تمہارا ہے نہیں..... اور تم یہ فیوچر پلان کر رہے ہو اس کے لیے۔'' عکس نے اس سے کہا تھا۔

''ہے نہیں تو ہو جائے گا۔'' شیر دل کا اطمینان لاجواب تھا۔

''One never knows'' عکس نے اسے tease کیا۔

''مجھے دوسروں کا نہیں پتا لیکن ہماری فیملی میں بیٹے ضرور ہوتے ہیں..... سیکنڈ چائلڈ بیٹا ہی ہے میرا۔'' شیر دل نے بلا کی خود اعتمادی سے کہا تھا۔

''تمہیں کسی نجومی نے لکھ کر دیا ہے؟'' عکس نے مذاق اڑایا۔

''تم دیکھ لینا۔'' شیر دل نے اطمینان سے کہا۔

''ہوسکتا ہے اس سے پہلے میرا بیٹا ہو جائے..... اور ہوسکتا ہے کہ میرا بیٹا رومانس کرنا پسند کرے تمہاری بیٹی کے ساتھ۔'' عکس نے جتانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں، تمہارا بیٹا میرے بیٹے کی طرح cheap تھوڑی ہوسکتا ہے۔ وہ رومانس وغیرہ تھوڑی کرے گا وہ اپنی ماں کی طرح صرف شادی کرے گا۔'' شیر دل نے اس کو تپایا وہ ایک بار پھر قہقہہ مار کر ہنس دی۔ آج شیر دل اسے واقعی لاجواب کرنے پر اترا ہوا تھا۔

''یہ رومانس وغیرہ صرف شیر دل clan کا کام ہے، عکس مراد علی تمہارا بیٹا اپنی ماں کی طرح صرف best conduct کی ٹرافی لے گا۔'' ہنستے ہوئے عکس کا چہرہ اب سرخ ہو گیا تھا۔

''اس کی ماں نے صرف best conducIt کی ٹرافی نہیں لی تھی شیر دل.... لگتا ہے تمہارے زخم ابھی تک بھرے نہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے ہی شیر دل کو چھیڑا تھا۔

''میں ماضی بھول چکا ہوں خاص طور پر اکیڈمی سے پاسنگ آؤٹ ceremony'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''یہ بہت اچھا کیا تم نے..... ورنہ اب تک دل کی بیماری ہو چکی ہوتی تمہیں۔'' وہ اب اس پر طنز کر رہی تھی۔ اس بار شیر دل ہنس دیا۔

''دل کی بیماری تو خیر اب بھی ہے مجھے۔''

''شیر دل clan کی اپنی legacy ہے..... میرے clan کی اپنی ہوگی۔'' عکس نے اس کے معنی خیز انداز میں کہے ہوئے جملے کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''تم آج کل بہت اچھے موڈ میں ہو؟'' شیر دل نے بالآخر اس سے کہا۔

''تمہیں کیسے پتا؟'' وہ چونکی۔

''تمہارے ہنسنے سے۔''

''میں ہمیشہ ہنستی ہوں۔'' عکس نے اس کا مذاق اڑایا۔

''ہاں مجھ پر تو تم ہمیشہ ہنستی ہو لیکن میں بے مقصد ہنسنے کی بات کر رہا ہوں۔''

''میں بھی بے مقصد نہیں ہنستی شیر دل۔'' عکس نے اسے جتایا۔

''جواد کیسا ہے؟'' شیر دل نے جواباً اس سے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''وہ اچھا ہے۔'' جواد کا ذکر آنے پر عکس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''اسے بھی لے آؤ شام کو۔'' شیر دل نے بڑی فیاضانہ آفر کی۔

''اسے لے آؤں، تم سے ملوانے کے لیے.....؟ شیر دل میں واقعی شادی کرنے کے موڈ میں ہوں۔'' وہ ایک بار پھر ہنسی تھی۔

''تم کیا سمجھتی ہو میں کیا کہوں گا اس سے؟'' شیر دل نے اس کی بات کا برا منایا تھا۔ ''تم سمجھتی ہو میں نہیں چاہتا کہ تم شادی کر لو۔'' شیر دل اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا شیر دل، تم خوامخواہ کے نتیجے مت نکالو۔'' عکس بھی ایک دم محتاط ہوگئی تھی۔

''میں تم سے منسلک کسی بھی شخص کو عزت دینا چاہتا ہوں۔'' وہ اب اسے جتا رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔'' عکس نے بے ساختہ کہا۔

''پھر تم نے ایسی بات کیوں کی؟'' شیر دل اب بھی سنجیدہ تھا۔ عکس نے بہت نرمی سے دوستانہ انداز میں شیر دل کا بازو تھپتھپایا تھا۔

''ہیلو کیا ہوا ہے تمہیں؟ کس بات کا غصہ آ رہا ہے؟'' عکس نے مسکراتے ہوئے مصالحانہ انداز میں کہا۔ شیر دل جھاگ کی طرح بیٹھا تھا۔

''شام کو مل رہے ہیں ہم۔'' اپنی شرمندگی کا اظہار کرنے کے بجائے شیر دل نے ایک دم بات بدل دی تھی۔ عکس سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔

وہ شام کو مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی جم خانہ کے ٹینس کورٹس پر شیر دل کو ڈھونڈتے ہوئے آ گئی تھی۔ شیر دل کسی دوست کے ساتھ میچ میں مصروف تھا اور اس نے فوری طور پر عکس کو نہیں دیکھا تھا۔ عکس نے بھی اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموشی سے پانی کی ایک بوتل لیے کورٹ کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ بڑی دلچسپی سے شیر دل کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وقت نے شیر دل کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ عمر میں شامل ہونے والے کچھ اور سالوں نے شیر دل کو پہلے سے زیادہ اٹریکٹو بنا دیا تھا۔ سفید شارٹس اور بلو شرٹ میں ریکٹ ہاتھ میں لیے کورٹ پر گیند کے آگے پیچھے بھاگتے شیر دل کو آج بھی کورٹ پر ٹینس کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اکیڈمی میں بھی شام کو اسی جنونی انداز میں ٹینس کی پریکٹس کرتا نظر آتا تھا اور بہت سی خواتین تماشائی اس پریکٹس سیشن کو اٹینڈ کرنے میں بے حد شغف رکھتی تھیں۔ عکس ان میں سے نہیں تھی لیکن وہ شیر دل کو اسپورٹس میں یوں مرکزِ نگاہ بنے دیکھ کر بہت محظوظ ہوتی تھی۔ کیوں ہوتی تھی یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا لیکن بہرحال شیر دل پر لڑکیوں کی نظریں جمی دیکھنا عکس مراد علی کے لیے ایک بے حد دلچسپ منظر تھا۔

ایک گیند کو واپس ہٹ کرتے ہوئے شیر دل نے عکس مراد علی کو سامنے والے کورٹ کے دائیں طرف رکھی کرسیوں پر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے چونکا تھا اور بالکل اس لمحے اس کے سامنے والے کورٹ سے گیند ریٹرن ہوتی ہوئی اس کے سر کے اوپر سے اس کے عقب میں جا گری تھی۔ اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے فرید ہمایوں کو ایسا طلوہ شاٹ کھیلنے کا موقع پورے میچ میں نہیں ملا تھا۔ شیر دل کی صرف نظر گیند سے نہیں ہٹی تھی اسے چند لمحوں کے لیے یہ طے کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا کہ وہ گیند کو ڈھونڈے یا عکس مراد علی پر نظریں جمانے کی کوشش کرے۔ میچ سے اس کا انہماک سیکنڈز کے اندر غائب ہوا تھا۔ اس نے دور سے ہی عکس کو ہاتھ ہلایا تھا اور پھر فرید ہمایوں کے پاس جا کر اس سے میچ کو ادھورا چھوڑنے کے بارے میں بتایا۔ فرید کو عکس سے متعارف کروانے کے بعد چند منٹوں تک وہ تینوں گپ شپ کرتے رہے پھر فرید نے کھیلنے کے لیے جم خانہ کے کسی ملازم کو بلوا لیا تھا۔

شیر دل اپنی سانس بحال کرنے کے لیے عکس کے پاس ہی اپنی کٹ اٹھا کر آ گیا تھا۔

''تم ہمیشہ میرے دشمن کے کورٹ میں ہی جا کر بیٹھنا۔'' تولیے سے اپنے بازو، چہرہ، سر اور گردن خشک کرتے ہوئے شیر دل نے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔

''تمہیں کچھ بھولتا کیوں نہیں شیر دل؟'' عکس کو اس بار بھی اس کے تبصرے پر ہنسی آئی تھی لیکن اس نے اپنی ہنسی پر قابو پا لیا تھا۔ اس کا ریفرنس کدھر تھا وہ ایک سیکنڈ میں جان گئی تھی۔

''کیا کیا بھولوں میں؟'' شیر دل نے جواباً کہا۔ عکس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی پانی کی آدھی استعمال شدہ بوتل اسے تھما دی۔ اس نے شیر دل کی پانی کی بوتل کو خالی دیکھ لیا تھا۔ شیر دل نے بڑے معمول کے سے انداز میں پانی کی بوتل اس سے لیتے ہوئے اپنا تولیا گھٹنوں پر پھیلا لیا تھا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے عکس کی دی ہوئی بوتل سے

سپ لیتے ہوئے اس نے کہا۔
''تم آئی کب ہو؟''
''دس پندرہ منٹ ہوگئے۔'' عکس نے بتایا۔
''جلدی آگئیں؟'' شیر دل نے گہری سانس لیتے ہوئے ایک اور سپ لیا۔
''ہاں فارغ تھی سوچا تمہارے ساتھ ہی وقت ضائع کیا جائے۔'' عکس نے اب اپنے بیگ سے ایک چیونگم ڈھونڈھ کر نکالتے ہوئے شیر دل کو اس کا آدھا ٹکڑا دیا اور باقی آدھا ٹکڑا اپنے منہ میں ڈال لیا۔
''اچھا کیا...... میں بھی ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔'' شیر دل نے پانی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بوتل خالی کی اور پھر چیونگم اسٹک کا ریپر اتارتے ہوئے کہا۔
''جھوٹ کی حد ہوتی ہے ویسے۔'' وہ ہنسی تھی اس کی بات پر وہ چونکا۔
''کیوں؟''
''شیر دل تم ٹینس کھیلتے ہوئے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچ سکتے...... میں یہ مان ہی نہیں سکتی۔ تم ٹینس کھلتے ہوئے صرف ٹینس کے بارے میں سوچتے ہو۔'' عکس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ شیر دل نے چیونگم چباتے ہوئے مسکراتے ہوئے سر کھجایا۔
''جیسے ایک لمحے کے لیے سوچا۔'' شیر دل نے بڑے آرام سے اس بار عکس کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اپنی بات کی تصیح کی تھی۔
''ہاں یہ کہو کہ ایک بار خیال آگیا۔'' عکس مسکرا رہی تھی۔
''ہاں چلو یہی سہی کہ مجھے تمہارا خیال آیا اور بالکل اسی وقت مجھے یہاں کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھی تم نظر آگئیں...... اور مجھے یقین نہیں آیا...... مجھے لگا مجھے کوئی وہم ہوا ہے۔''
''حالانکہ وہم والی کیا بات تھی......؟ آنا تو تھا میں نے۔'' عکس نے بے پروائی سے کہا اور اس وقت ہی اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا تھا کہ وہ اور شیر دل تقریباً ایک ہی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ وہ رائل بلو اسپورٹس شرٹ اور وائٹ شارٹس میں تھا اور وہ رائل بلو اور وائٹ چیکرڈ کالر والی شرٹ اور سفید شلوار اور دوپٹے میں۔ شیر دل کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا اپنا مذاق اڑانے کے برابر تھا۔ اس کا اور شیر دل کا مزاج نہیں ملتا تھا لیکن اس کے اور شیر دل کے درمیان بہت سی باتیں اور عادتیں کامن تھیں...... یہی حال لباس اور اس کے رنگ کے حوالے سے ان کی چوائس کا بھی تھا۔

جم خانہ کے اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھے باربی کیو ڈنر کا آرڈر دینے کے بعد وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے اپنی پوسٹ کے حوالے سے بات کرنے لگے تھے۔ بات کرنے کے دوران ہی شیر دل نے اس سے گھر کے بارے میں جیسے بڑے فخریہ انداز میں پوچھا تھا۔
''گھر تو اچھا نہ ہوگا تمہیں...... کچھ نہیں کرنا پڑا ہوگا تمہیں وہاں...... شہر بانو اور میں نے بڑی جان لگائی ہے وہاں۔'' عکس اس کی بات پر مسکرا دی تھی۔
''مجھے تم لوگوں کی جان تو وہاں کہیں نظر نہیں آئی لیکن سرکاری پیسے کا بے دریغ استعمال ضرور نظر آیا۔'' اس کے جواب نے شیر دل کو جیسے کچھ نادم کیا تھا لیکن وہ ٹالنے والے انداز میں بات گول کر گیا۔
''خیر اتنا بھی بے دریغ استعمال نہیں ہوا پیسے کا...... اس گھر کی حالت بہت خراب تھی جب ہم وہاں شفٹ ہوئے تھے۔ ہم نے تو مرمتیں کروائیں بہت زیادہ...... اتنے بڑے گھر کی maintenance پیسے کے بغیر نہیں ہوسکتی اور کیا ہوا میں نے تھوڑا بہت سرکاری پیسہ اس کام میں استعمال کرلیا، سرکار کے پاس بہت پیسہ ہے۔'' شیر دل نے اطمینان سے کہا۔ عکس مسکرا دی۔
''تھوڑا بہت...... شیر دل تمہارا بس نہیں چلا ورنہ تم اس گھر میں بارہ دریاں بھی بنوا دیتے۔'' عکس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ شیر دل اس کی بات پر ایک بار پھر ہنس دیا۔
''یار کیا کروں میں...... میں ''دو'' عورتوں کو refuse نہیں کرسکتا۔'' عکس نے اس کے جملے پر کسی کاؤنٹر کوئسچن سے بچتے ہوئے اس سے کہا۔
''تم اگر مغلوں کے زمانے میں ہوتے تو کیا ہوتے شاہ جہاں یا جہانگیر؟'' عکس کے سنجیدگی سے پوچھے ہوئے سوال پر شیر دل کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔ وہ جوتے لپیٹ کر مارنے کی عادی تھی لیکن مارضرور دیتی تھی۔ اب وہ اس کے شاہانہ اخراجات کے ساتھ ساتھ اس کے کسی عورت کے کنٹرول میں ہونے کا طعنہ دے رہی تھی۔
''تمہارا کیا خیال ہے؟'' شیر دل نے جواب دینے کے بجائے اس سے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔
''جہانگیر۔'' جواب کھٹ سے آیا تھا۔
''مجھے بھی جہانگیر ہی پسند تھا۔'' جواب ڈھٹائی سے ملا تھا۔
''تم نے پورے سال کا بجٹ اڑا دیا ہے گھر میں...... ہر چیز کے بجٹ میں سے گھر کی maintenance پر پیسہ لگا دیا ہے اب میں کیا کروں......؟ رپورٹ لکھوں ایک تمہارے خلاف مالی بے ضابطگی کی۔'' عکس بڑی سنجیدگی سے اس سے کہہ رہی تھی۔ شیر دل کے سر پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔
''لکھ دو...... تم ویسے بھی میری بیوی سے جیلس ہو۔'' باربی کیو کے ساتھ سرو ہونے والی چٹنیوں میں سے ایک میں کانٹے کے ساتھ سلاد کے چند ٹکڑوں کو ڈبو کر کھاتے ہوئے شیر دل نے اطمینان سے اسے کہا تھا۔ عکس نے ملامتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
''ہاں بس اب یہی تو ایک کام رہ گیا ہے میرے پاس کہ میں تمہاری بیوی سے جیلس ہوتی پھروں جس کے پاس ایک ایسا شوہر ہے جو بیوی کو خوش کرنے کے لیے عوام کے خون پسینے سے اکٹھا ہونے والے ٹیکسز سے لان میں ٹینس کورٹ بنوا سکتا ہے۔'' وہ جھلائی تھی۔
''یار ٹینس کورٹ تو میرا شوق تھا اس میں تو میری بیوی بے چاری نے کچھ کہا تک نہیں۔'' شیر دل نے احتجاج کیا تھا۔
''وہ جو لان میں عجیب و غریب قسم کی decorative لائٹس وغیرہ ہیں......'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔
''ہاں وہ میری بیوی کا شوق تھا۔ وہ فاؤنٹین وغیرہ بھی۔ لیکن یار عجیب و غریب تو کچھ بھی نہیں تھا...... aesthetically کیا گیا تھا جو بھی کیا گیا تھا۔'' شیر دل نے شہر بانو کو اس کی عدم موجودگی میں defend کیا۔
''جیسے بھی کیا گیا تھا اس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ تم لوگوں کا ذاتی گھر نہیں تھا وہ۔'' عکس نے بھی اسی انداز میں کہا۔
''ہم ویسے شروع کرنے والے ہیں اس سال لاہور میں اپنا گھر۔'' شیر دل نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ عکس جانتی تھی اس کی مذمت اور لعنت ملامت شیر دل پر کوئی اثر نہیں کرنے والی تھی۔ وہ بیوروکریسی کے جس اوپر والے حصے سے تعلق رکھتا تھا وہاں پبلک فنڈز کا اس طرح کا استعمال کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وہ technically کرپشن نہیں تھی کیونکہ وہ روپیہ کسی کی جیب میں نہیں جا رہا تھا جو کچھ بھی لگ رہا تھا وہ ایک سرکاری عمارت پر ہی لگتا تھا اور وہاں کی کوئی چیز وہ اپنے ذاتی گھروں میں نہیں لے جاتے تھے لیکن اس کے باوجود فنڈز

mis-use ہوتے تھے۔ شیر دل elite کلاس سے تعلق رکھتا تھا اور اسی طرح کا لائف اسٹائل رکھتا تھا۔ اس کے یا شہر بانو کے لیے سادگی اپنانا بہت مشکل کام تھا، یہ بات عکس بخوبی جانتی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس طرح کا لائف اسٹائل رکھنے والا پہلا یا واحد بیورو کریٹ نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی مختلف پوسٹنگز کے دوران جن سینئر آفیسرز سے ملتی رہی تھی اس نے ان کے گھروں میں سرکاری خرچ پر اسی طرح کی تزئین و آرائش اور سہولیات دیکھی تھیں۔

''اوہ اچھا! great...... کہاں ...... یہاں لاہور میں؟'' عکس نے اس کی اطلاع پر دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اب کھانا کھانے لگی تھی۔ شیر دل اسے گھر کے حوالے سے اپنی اور شہر بانو کی مجوزہ پلاننگ بتانے لگا تھا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی اور وقتاً فوقتاً اس پر تبصرہ کرتی رہی۔ وہ دونوں گھر کو ڈسکس کرنے کے بعد سنگاپور میں ہونے والے اس کورس کو ڈسکس کرنے لگے جہاں جانے والے سات آفیسرز میں عکس بھی شامل تھی۔ وہ بیرونِ ملک ہونے والا ان کا پہلا کورس تھا۔

ڈنر کے بالکل آخر میں شیر دل کا فون بجنے لگا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ شہر بانو کی کال تھی۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے عکس کو بھی انفارم کیا۔

''تم کہاں ہو شیر دل؟'' کال ریسیو کرتے ہی شہر بانو نے اس سے پوچھا تھا۔

''میں date پر ہوں۔'' شیر دل نے مسکراتے ہوئے سامنے بیٹھی عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ سوفٹ ڈرنک کا آخری سپ لیتی عکس کے چہرے پر مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ شیر دل نے اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو نوٹس نہیں کیا۔ وہ شہر بانو کی طرف متوجہ تھا جو اس کی بات پر ہنس دی تھی۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس نے کمال کی خود اعتمادی کے ساتھ کہا تھا۔ شیر دل نے عکس کو اپنا بیگ سنبھال کر اٹھتے دیکھا۔ اس نے نوٹس نہیں لیا تھا وہ سمجھا وہ ریسٹ روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔

''You are underestimating me'' وہ مسکراتے ہوئے شہر بانو کے ساتھ بات کرتا رہا۔ اس نے ساتھ ہی ویٹر کو سائن کرنے کے لیے بل لانے کا اشارہ کیا تھا۔

''date خوب صورت ہے؟'' شہر بانو نے اب اس مذاق میں عملی طور پر حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''بہت زیادہ۔'' شیر دل نے اطمینان سے کہا۔

''مجھ سے بھی زیادہ؟'' شہر بانو نے پوچھا۔

''مجھ کو لگتی ہے۔'' شیر دل نے مسکرا کر کہا۔

''کوئی تمہیں مجھ سے زیادہ خوب صورت لگ سکتا ہے شیر دل؟'' شہر بانو نے کہا۔

''خوب صورت کب کہا ہے۔ اچھی کہا ہے۔'' شیر دل اس بار ہنسا تھا۔

''تم ویسے ہو کہاں؟'' شہر بانو نے بالآخر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''جم خانہ میں ایک دوست کے ساتھ ڈنر کر رہا ہوں۔ تمہیں بتایا تو تھا میں نے آنے سے پہلے۔''

''ہاں لیکن میرے ذہن سے نکل گیا...... میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ ٹینس کھیلنے گئے تھے اور ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔'' اس کی بات سنتے ہوئے بالکل اسی وقت ویٹر نے اس کے قریب آ کر مودبانہ انداز میں جھکتے ہوئے اس سے کہا۔

''آپ کا بل کاؤنٹر پر pay کر دیا گیا ہے۔'' شہر بانو سے بات کرتے کرتے شیر دل بری طرح چونکا تھا۔ اس نے شہر بانو سے بات کرتے ہوئے خود ویٹر کو مخاطب کر کے بل کے بارے میں دوبارہ استفسار کیا تھا ورنہ ویٹر اس کی کال کے ختم ہونے کا انتظار کرتا۔

''کس نے pay کر دیا؟'' شیر دل بے حد حیران ہوا تھا۔ دوسری طرف لائن پر موجود شہر بانو یہ ساری گفتگو سن رہی تھی۔

''میڈم نے۔'' شیر دل کو اب جیسے کرنٹ لگا تھا اور ایسا ہی کرنٹ دوسری طرف لائن پر موجود شہر بانو کو بھی لگا تھا۔ وہ کیا واقعی کسی لڑکی کے ساتھ وہاں ڈنر کر رہا تھا؟

''میں تم سے تھوڑی دیر میں بات کرتا ہوں شبی۔'' اس سے پہلے کہ شہر بانو اس سے کوئی سوال کرتی شیر دل نے یک دم اس سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

''اور میڈم کہاں ہیں؟'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے ویٹر سے پوچھا۔

''وہ تو چلی گئی ہیں۔'' شیر دل کو ایک لمحے کے لیے یقین نہیں آیا کہ اس نے ویٹر سے یہ جملہ سنا تھا۔ اسے لگا تھا ویٹر کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ ویٹر سے کوئی سوال جواب کیے بغیر اس نے سیل فون اٹھاتے ہوئے عکس کو کال کی سیل فون آف تھا اور یہ شیر دل کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔ وہ بے حد اضطراب کے عالم میں اپنی کرسی کھینچتے ہوئے کھڑا ہوا تھا اور بے حد تیز قدموں سے وہ ریسٹورنٹ سے باہر پارکنگ تک آیا تھا لیکن پارکنگ تک آتے ہوئے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عکس کو یا اس کی گاڑی کو رات کے اس وقت وہاں موجود سیکڑوں گاڑیوں میں سے ڈھونڈ لینا ناممکن تھا۔ سمجھ اسے یہ نہیں آئی تھی کہ عکس نے ایسا کیا کیوں تھا۔ عکس جہاں ٹھہری ہوئی تھی وہ اس جگہ سے واقف تھا اور پارکنگ میں پہنچ کر اس نے ڈرائیور کو سیدھا وہاں چلنے کے لیے کہا۔ دس منٹ میں وہ اس کلب میں تھا جس کے ایک رہائشی کمرے میں وہ رکی ہوئی تھی۔ ریسپشن سے اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ بھی ابھی چند منٹ پہلے ہی وہاں پہنچی تھی۔ اس نے receptionist کو اس کے کمرے کا نمبر ملانے کے لیے کہا اور عکس کے ریسیور اٹھاتے ہی receptionist کے ہاتھ سے انٹرکام لے لیا۔

''میڈم آپ ذرا باہر تشریف لائیں گی یا میں اندر آ جاؤں؟'' چند سیکنڈز کے لیے عکس بالکل بول نہیں سکی۔ شیر دل کی آواز اس کے لیے اتنی ہی غیر متوقع تھی۔ اسے پتا تھا وہ اس کے اس طرح اٹھ آنے پر اپ سیٹ ہوگا، خفا بھی ہوگا لیکن وہ اس کے پیچھے آ جائے گا اسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس وقت خود شیر دل سے اس قدر خفا تھی کہ وہ اس سے ملنا یا بات کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اگر اس کے پیچھے وہاں آ سکتا تھا تو اس کے لیے اس کے کمرے میں آ جانا کیا مشکل تھا۔ وہ وہاں کوئی شرمندہ کر دینے والی صورتِ حال نہیں چاہتی تھی۔

''میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔'' اس نے بالآخر شیر دل سے کہا۔

''تھینک یو۔'' شیر دل نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

وہ پانچ منٹ کے بجائے دو منٹ بعد ہی ویٹنگ ایریا میں آ گئی تھی۔

''باہر لان میں چلتے ہیں۔'' شیر دل اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عکس کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چل پڑی۔ کلب کے دروازے سے باہر نکلتے ہی شیر دل نے بے حد خفگی کے عالم میں اس سے کہا۔

''میں نے کسی عورت کو اس سے زیادہ بچگانہ حرکت کرتے نہیں دیکھا...... تم یہ کیسے کر سکتی ہو عکس؟''

''ہم نے ڈنر کر لیا تھا اور بل دینا کوئی گناہ نہیں ہے۔'' عکس نے اسی ٹھنڈے انداز میں کہا۔ وہ دونوں اب لان میں نکل آئے تھے اور لان میں آتے ہی شیر دل نے رکتے ہوئے اس سے کہا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ اتنا بے وقوف بہرحال نہیں تھا کہ اب بھی سمجھ نہ سکتا کہ عکس کو کچھ برا لگا تھا جس پر وہ خفا تھی۔

''شیر دل میں تمہاری date نہیں ہوں۔'' عکس نے اس کے سوال پر کسی توقف کے بغیر بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔

''تم اس بات پر ناراض ہوئی ہو......؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' اس کا سر واقعی گھوم کر رہ گیا تھا۔ وہ اتنی بڑی

بات نہیں تھی جس پر عکس یوں ری ایکٹ کرتی۔

"میں تمہیں دوست سمجھ کر تمہارے ساتھ وہاں ڈنر کے لیے گئی تھی..... تمہیں اگر dating کا شوق ہے تو اس کے لیے لاہور بھرا پڑا ہے لڑکیوں سے۔ بلکہ وہ تمہیں وہاں جم خانے میں بھی مل جاتیں۔" عکس نے اس کی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں مذاق کر رہا تھا عکس۔ تم جانتی ہو۔" شیر دل اس کے انداز پر ایک بار پھر حیران رہ گیا تھا۔

"مذاق میں بھی مجھے تمہاری بات بہت insulting لگی۔" عکس نے اسی انداز میں کہا۔

"I am sorry" میں نے کہا نا میں مذاق کر رہا تھا..... تم جانتی ہو میری عادت کو..... اور تم سوچ سکتی ہو کہ میں تمہیں date سمجھ رہا تھا۔" شیر دل نے بے حد تحمل سے کہا تھا لیکن وہ عکس کے ردعمل پر بے حد حیران تھا۔ وہ مذاق میں اس سے بھی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا تھا اور وہ اگنور کر دیا کرتی تھی پھر اب اتنی چھوٹی سی بات پر اتنی خفگی......

"ہر بات مذاق میں کہنے والی نہیں ہوتی۔" عکس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تم میرے دوست ہو تو اس کا یہ بالکل بھی مطلب نہیں کہ تم اپنی اور میری دوستی کو ہمیشہ مرد بن کر دیکھو۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ، تم سوچ سکتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ dating کر رہا تھا وہاں؟" شیر دل نے اس کی بات کاٹ کر اپنا سوال دہرایا۔

"میں نیتوں کا حال نہیں جانتی شیر دل۔" اس کی بات پر شیر دل بری طرح ہتھے سے اکھڑا۔

"تم میری نیت نہیں جانتیں..... تو تم مجھے بدنیت کیسے سمجھ سکتی ہو؟" وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اب اس بات کو یہیں ختم کرتے ہیں۔" شیر دل کو اس کے اس انداز نے اور تپا دیا۔

"نہیں اب یہ بات ختم نہیں ہوگی..... تم کو میری بات بری لگی ہے تو مجھے بھی تمہاری بات بری لگی ہے۔ اتنے سالوں کے بعد بھی تمہیں میری نیت پر شبہ ہے اور تم سمجھتی ہو کہ میں اپنی اور تمہاری دوستی کو ایک مرد کے طور پر biased ہو کر دیکھتا ہوں..... حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے تمہیں کبھی بھی دوست نہیں سمجھا۔"

"شیر دل اب ہم فضول باتیں کر رہے ہیں۔" عکس نے اسے ٹوکا تھا۔ "تم بھی جاؤ اور مجھے بھی جانا ہے کل کی میٹنگ کی تیاری کرنی ہے میں نے۔" عکس نے بات کہہ کر وہاں سے جانے کے لیے قدم بڑھایا اور شیر دل نے بہت خفگی سے اس کو بازو سے پکڑ کر روکا تھا۔

"ہم میں سے کوئی یہاں سے نہیں جا رہا..... میں تم سے بات کر رہا ہوں اور تمہیں اگر جانا بھی ہے تو تم میری پوری بات سن کر جاؤ گی۔" ایک لمحے کے لیے وہ اس طرح روکے جانے پر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ "میں تمہارے لیے کس طرح کے جذبات رکھتا ہوں اور تمہیں کیا سمجھتا ہوں وہ تم اچھی طرح جانتی ہو اگر دوبارہ سننا چاہتی ہو تو میں دہرا دیتا ہوں..... میں تم سے محبت کرتا تھا..... کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا اور میرے لیے یہ بات بے حد insulting ہے کہ تم یہ سوچو کہ میں تمہارے حوالے سے کسی بدنیتی کا شکار ہوں یا تمہیں date سمجھ کر تمہارے ساتھ گھومتا پھرتا ہوں۔"

"شیر دل میرا بازو چھوڑو۔" اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے عکس نے بے حد خفگی سے اس سے کہا۔ شیر دل نے بے اختیار اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اسے شاید یہ اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اب تک عکس کا بازو پکڑے ہوا تھا۔

"مجھے تم دوبارہ اپنی شکل بھی مت دکھانا۔" اس نے اپنا بازو رگڑتے ہوئے شیر دل سے کہا۔

"تم اگر یہاں سے میری بات سنے بغیر جاؤ گی تو میں تمہیں دوبارہ اسی طرح روکوں گا۔" شیر دل نے اسی طرح کہا۔ وہ جانے کے لیے قدم بڑھا چکی تھی لیکن شیر دل کی بات پر اس نے یک دم واپس پلٹتے ہوئے چیلنج والے انداز میں شیر دل سے کہا۔

"تم اب مجھے ہاتھ لگا کر دکھاؤ۔" وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑے رہے۔ شیر دل کے چہرے کا رنگ سرخ سے مزید سرخ پھر دوبارہ نارمل ہوتا گیا۔

"مجھے زندگی میں بہت کم عورتوں پر غصہ آیا ہے اور مجھے تم پر بہت غصہ آتا ہے۔" عکس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بالآخر اسے بولتے دیکھا۔

"مجھ سے زیادہ غصہ تو نہیں آ سکتا تمہیں..... تم مذاق میں بھی مجھے اپنی date کیسے کہہ سکتے ہو؟" دونوں طرف اب پارا نیچے آ رہا تھا۔

"جو تمہیں کہنا چاہتا تھا میں اس کا موقع تم نے نہیں دیا..... میں تمہیں date کہوں تو برا ہوں، تم سے اظہار محبت کروں تو برا ہوں..... اور دوست تمہیں میں نے مر کے بھی نہیں کہنا......" شیر دل نے اس کے ماتھے کے بل دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے اس صورت میں آج کی اس ملاقات کو تم آخری ملاقات سمجھو..... مجھے شادی شدہ مردوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" عکس نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہیں تو خیر مجھ میں تب بھی دلچسپی نہیں تھی جب میں شادی شدہ نہیں تھا۔ تمہیں اس وقت بھی میرے علاوہ دنیا کے ہر مرد میں دلچسپی تھی..... غنی حمید، عثمان علی، لقمان آفاق......"

"shut up" عکس نے اس بار سرخ چہرے کے ساتھ اس کی بات کاٹی تھی۔ "تم اب آؤٹ ہو رہے ہو...... تم یہاں سے جاؤ۔"

"میں دوبارہ تم سے کبھی نہیں ملوں گا۔" شیر دل کا چہرہ بھی سرخ ہوا۔

"good for both of us" اس نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"اب تم دوبارہ کبھی میری شکل بھی نہیں دیکھو گی۔"

"ok" عکس نے جواباً کہا۔

"عکس تمہیں انسانوں کی پہچان نہیں ہے۔" شیر دل نے اس بار بے حد تلخی سے کہا۔ وہ اس کی بات پر چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر اس نے ٹھنڈے لیکن کچھ عجیب سے انداز میں شیر دل سے کہا۔

"مجھے انسانوں کی پہچان نہیں ہے؟ good joke"

"مذاق نہیں ہے یہ۔"

"انسان واحد چیز ہے جس کی پرکھ ہے مجھے۔"

"نہیں ہے۔" شیر دل مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چل پڑا تھا اس نے پیچھے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کی بات پر عکس کا ردعمل کیا تھا۔

☆☆☆

گھر پہنچنے کے بعد بھی اس کا موڈ اسی طرح آف تھا اور شہر بانو کو اس کا اندازہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ ویٹر اور اس کی گفتگو شہر بانو نے فون پر سن لی تھی۔ کسی میڈم کے ساتھ بھی ڈنر کرنے پر شہر بانو کو کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں تھی..... واحد تجسس جو اسے تھا وہ یہ کہ وہ میڈم کون تھی۔ عکس مراد علی کی طرف کم از کم اس وقت اس کا ذہن نہیں گیا تھا لیکن شیر دل کا موڈ آف دیکھ کر وہ فوری طور پر اس سے اس میڈم کے کوائف کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکی۔ وہ لوگ شیر دل کے پیرنٹس کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے اور فیملی کے کچھ لوگ بھی اس وقت وہاں تھے جن کی وجہ سے شہر بانو کو فوری طور پر شیر دل سے کوئی بات کرنے کا موقع نہیں ملا مگر وہ وقتاً فوقتاً لاؤنج میں فیملی ممبرز میں بیٹھے شیر دل کو دیکھتی رہی۔ وہ بہت کم بات کر رہا تھا اور بار بار کچھ سوچتا نظر آ رہا تھا۔

رات کو ایک بجے کے قریب انہیں واپس اپنے بیڈروم میں جانے کا موقع ملا اور اس وقت پہلی بار شہر بانو نے اس سے اس کی پریشانی کی نوعیت جاننے کی کوشش کی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا...... بس تھکن ہے...... آج بہت دنوں کے بعد ٹینس کی اتنی لمبی چوڑی پریکٹس کی ہے اس لیے۔''

شیر دل نے بڑے آرام سے اسے موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ٹی وی پر کوئی فلم لگائے بیٹھا تھا اور شہر بانو سے نظریں تک نہیں ملا رہا تھا۔ شہر بانو چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

''کس کے ساتھ ٹینس کھیلتے رہے آج؟''

''بہت سوں کے ساتھ...... تم نے پیکنگ کرلی کیا؟'' شیر دل نے شہر بانو کے اگلے سوال سے بچنے کے لیے اس سے سوال کر ڈالا۔

''شیر دل میں پیکنگ کر کے ہی لاہور آئی ہوں...... اب یہاں تھوڑی پیکنگ کروں گی میں۔'' شہر بانو نے اسے جتایا تھا۔

''میں ان گفٹس وغیرہ کی بات کر رہا ہوں جو تم نے آج لاہور سے اپنی فیملی کے لیے خریدے ہیں...... شاپنگ کرلی تھی نا؟'' شیر دل نے پھر کہا۔

''اتنی لمبی چوڑی شاپنگ نہیں تھی وہ...... بس چھوٹی موٹی چیزیں تھیں...... دو، تین گھنٹوں میں خرید لی تھیں...... اور وہ بھی ساری ایک ہی بیگ میں پیک کی ہیں میں نے۔''

''گڈ!'' شہر بانو کو سمجھ نہیں آیا شیر دل نے اسے کس بات پر سراہا تھا۔ شیر دل اب بیڈ پر سوئی ہوئی مثال کو کہنی کے بل نیم دراز ہوتے ہوئے پیار کرنے لگا تھا۔ فلم سے اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ وہ اب مثال کے بالوں کو سہلا رہا تھا...... اس کے ہاتھوں، گالوں اور ماتھے کو بار بار چوم رہا تھا۔ شہر بانو بیڈ پر دوسری طرف بیٹھی بالکل مسمرائزڈ سی اسے اور مثال کو دیکھتی رہی۔ اسے اپنا باپ یاد آیا تھا...... اسے یاد تھا وہ بھی اسے بالکل اسی طرح پیار کرتا تھا جیسے شیر دل مثال کو...... اسی طرح باری باری اس کے ہاتھ، گال، ماتھا، سر چومتا رہتا تھا...... وہ شہر بانو کے بارے میں obcessed تھا اور پروٹیکٹو تھا...... اس کی ماں کے لاکھ اصرار کے باوجود وہ کبھی شہر بانو کو دوسرے بیڈروم میں سلانے پر تیار نہیں ہوا تھا...... وہ اپنے باپ کی گود میں دنیا میں سب سے زیادہ محفوظ محسوس کرتی تھی اور ویسا تحفظ اس نے اس کے بعد کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے بجائے ہمیشہ اپنے باپ کے پاس سوئی تھی...... اس سے لپٹ کر...... اس کے سینے پر...... اس کے بازوؤں کے گھیرے میں...... اس سے کہانیاں سنتے ہوئے...... اور شرمین اور اس کے باپ کی طلاق کے بعد امریکا چلے جانے پر بہت عرصے وہ بستر پر اکیلے سو نہیں پائی تھی...... اسے یہ سمجھ نہیں آپاتی تھی کہ وہ بستر میں کہاں سوئے گی تو نیند میں کروٹ لینے پر بھی وہ بستر سے نہیں گرے گی...... اپنے باپ کے ہوتے ہوئے اسے یہ calculations کبھی نہیں کرنی پڑیں۔ وہ جانتی تھی وہ کہیں بھی سوئے گی اس کا باپ اسے کبھی بستر سے گرنے نہیں دے گا کیونکہ بستر کے سرے پر ہمیشہ وہ ہوتا تھا اور بستر کے دوسرے سرے پر اس کی ماں...... وہ جیسے ایک حصار میں محفوظ تھی...... شہباز کے زندگی سے نکل جانے کے بعد شرمین کے ساتھ سوتے ہوئے بھی وہ ایک عجیب سے خوف کا شکار رہتی تھی کہ وہ بستر سے ضرور گر جائے گی اور اس کا یہ خوف کبھی بھی غلط ثابت نہیں ہوا تھا...... اس نے نیند میں گر کے بہت بار چوٹیں کھائی تھیں۔ بہت سالوں بعد یہ شیر دل تھا جس نے اسے شہباز کی طرح تحفظ دینے کی کوشش کی تھی۔

''یار تم اسے چھوڑ جاؤ میرے پاس۔'' مثال کو چومتے ہوئے اس نے یک دم شیر دل کو کہتے سنا۔ شہر بانو مسکرا دی۔

''اور میں چلی جاؤں؟ اس نے شکایتاً شیر دل سے کہا۔ شیر دل نے مثال کے اوپر سے ہاتھ بڑھا کر شہر بانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پیار سے کہا۔

''No sweet heart تم بھی مت جاؤ۔''

''نہیں، تم صرف مثال کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میرے بغیر تو رہ سکتے ہو۔'' شہر بانو نے مصنوعی خفگی سے اس سے کہا۔

''You really think so'' شیر دل نے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔

''Yes I do'' شہر بانو نے اسی انداز میں اس سے کہا۔

''You are so wrong'' شیر دل نے اس بار بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

''تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے؟'' شہر بانو نے یک دم اس سے کہا۔

''نہیں یار...... اگر کورس نہ ہوتا تو کوشش کرتا ساتھ جانے کی۔'' شیر دل نے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ اب دوبارہ مثال کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کے بال سہلا رہا تھا۔

''پہلی بار تمہارے بغیر کوئی اتنا لمبا سفر کرنے والی ہوں میں شادی کے بعد۔'' شہر بانو نے سنجیدگی سے کہنا شروع کر دیا۔

''تو مت جاؤ نا۔'' شیر دل نے اطمینان سے کہا۔ وہ ہنس دی۔

''اب سیٹس بک نہ کروائی ہوتیں تو میں نہ جاتی۔''

''سیٹس کینسل کروائی جاسکتی ہیں۔'' وہ اسی اطمینان سے کہہ رہا تھا یوں جیسے دانستہ طور پر اسے مشکل میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم کورس پر مت جاؤ۔'' شہر بانو نے جواباً اسے مشکل میں ڈالا۔ شیر دل بے ساختہ ہنس دیا۔

''میری مجبوری ہے وہاں جانا...... تمہاری تو نہیں ہے۔''

''تم اپنے ساتھ لے جاؤ سنگاپور تو میں امریکا نہیں جاتی۔'' شہر بانو نے کہا۔

''یار پہلے کہنا تھا نا...... اب بتا رہی ہو...... اب نہیں کرسکتا میں یہ اتنے short notice پر۔'' شیر دل نے کہا۔ ''اب تم امریکا ہی جاؤ۔'' وہ اب دوبارہ ریموٹ اٹھا کر TV کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ شہر بانو یک دم اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے اس کے پاس آگئی۔ بچوں کی طرح شیر دل کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

''شی اب تم رونا مت۔'' شیر دل نے جیسے پلک جھپکتے میں اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے اسے وارن کیا۔

''لیکن میں اتنے بہت سارے دن تمہارے بغیر کیسے رہوں گی؟'' شہر بانو واقعی ہی اب روہانسی ہو رہی تھی۔

''دیکھو تم واپس آجاؤ گی تین ہفتے کے بعد اور آنٹی کتنا خوش ہوں گی تمہیں دیکھ کر...... تم کتنی مدت کے بعد ان سے ملوگی۔'' شیر دل اب بالکل اسی طرح اس کے بال سہلا رہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے مثال کے سہلا رہا تھا۔ شہر بانو بعض دفعہ اس کے لیے ایک دوسرا بچہ ہوتی تھی۔

''لیکن میں پھر بھی تمہیں miss کروں گی۔''

''I know honey۔''

''تم miss کرو گے مجھے؟'' شہر بانو نے یک دم اپنا سر اٹھا کر شیر دل کا چہرہ دیکھا۔

''میں کوشش کروں گا۔'' شیر دل نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

''یعنی نہیں۔'' وہ خفا ہوئی۔

''یار کیسے miss نہیں کروں گا میں...... آف کورس کروں گا۔'' اس نے شہر بانو کو ایک بار پھر بچوں کی طرح اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ وہ مطمئن سی ہو گئی۔

''تم دونوں کے پاسپورٹس اور ٹکٹس میرے بریف کیس میں ہیں...... کچھ کرنسی بھی exchange کروائی ہے آج۔ وہ تم اپنے پاس رکھ لینا۔ پاسپورٹس اور ٹکٹس میں کل ائرپورٹ پر ہی دوں گا تمہیں۔'' وہ اب اسے ہدایات دے رہا تھا سفر کے حوالے سے...... ساتھ بالکل اسی طرح اس کا سر وقفے وقفے سے چوم رہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے مثال کا

چوم رہا تھا۔ وہ جانتا تھا شہر بانو کو اس طرح کی pampering کی ضرورت پڑتی تھی وقفے وقفے سے...... وہ یقیناً اداس ہو رہی تھی اس سے الگ ہونے کے خیال سے اور اسے اس وقت تسلی کی ضرورت تھی۔

''تم سنگاپور سے مجھے روز فون کرو گے؟'' شہر بانو نے اسے یاد دہانی کرائی۔

''روز فون کروں گا۔''

''اور روز ای میل کرو گے؟''

''او کے۔'' شیر دل بڑے آرام سے اس کے سارے مطالبات مانتا گیا تھا۔ ''تمہیں کچھ چاہیے سنگاپور سے؟'' شیر دل کو خیال آیا۔

''کچھ بھی نہیں۔''

''یار کچھ تو۔''

''بس اپنا شوہر۔'' شیر دل ہنسا۔

''وہ تو ہر بار ہی مل جاتا ہے واپس صحیح سلامت۔'' اور بالکل اسی لمحے شہر بانو کو دوبارہ اس میڈم کا خیال آیا تھا۔

''شیر دل! تم نے آج کس کے ساتھ کھانا کھایا؟'' شہر بانو نے اس کے سینے میں منہ چھپائے آنکھیں بند کیے ہوئے پوچھا اور اسے لگا اس کے سوال پر یک دم اس کے گرد شیر دل کے بازوؤں کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تھی۔ کچھ دیر شیر دل خاموش رہا تھا پھر اس نے کہا۔

''ایک دوست تھا پرانا۔''

''دوست تھا یا تھی؟'' شہر بانو نے اسی طرح پوچھا۔ ایک بار پھر اس نے شیر دل کو خاموش ہوتے ہوئے پایا پھر چند لمحوں کے بعد شیر دل نے دوبارہ اس سے کہا۔

''دوست تھے...... اور تھیں...... ایک سے زیادہ لوگوں کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ ارادہ ایک کے ساتھ تھا لیکن پھر کچھ اور لوگ بھی اتفاقاً آ گئے وہاں۔''

''اوہ او کے۔'' شہر بانو نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔ ''عکس بھی تھی؟'' اسے پتا نہیں یک دم کیوں یہ خیال آیا تھا پوچھنے کا...... شیر دل کو چند لمحے سمجھ نہیں آیا کہ وہ سچ بولے یا جھوٹ۔ اور شہر بانو سے عکس کے بارے میں جھوٹ بولنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں پہلی بار ہی آیا تھا ورنہ اس سے پہلے ایسی کوئی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ شہر بانو سے کچھ چھپانا چاہتا۔

''ہاں۔'' ایک لمحہ چپ رہ کر بالآخر اس نے سچ ہی بولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے سینے پر سر رکھے ہوئے شہر بانو نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں، پتا نہیں اسے کیوں یہ توقع تھی کہ شیر دل کا جواب نہیں میں ہوگا۔

''اور ڈنر کا بل اس نے دیا؟'' چند سیکنڈز میں وہ اس ''میڈم'' کو شناخت کر گئی تھی جس کے بارے میں اس نے فون پر سنا تھا۔ شیر دل اس بار حیران ہوا تھا۔

''تمہیں کیسے پتا؟''

''میں نے فون پر سنا تھا ڈیئر کہہ رہا تھا۔'' شیر دل نے جواب نہیں دیا۔ عکس مراد علی ایک بار پھر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ مرد تھا۔ ہتک محسوس کرنا چاہتا تھا رنج نہیں...... لیکن وہ رنج محسوس کر رہا تھا...... اس کی زندگی کی کچھ بے خواب اور پریشان راتیں عکس مراد علی کی وجہ سے بھی تھیں۔

چند گھنٹے پہلے ہونے والی تکرار ایک بار پھر اس کے ذہن میں آنے لگی تھی۔ شہر بانو کو اندازہ نہیں ہوا اس کے چند سوالوں نے رات کے اس پچھلے پہر اس کے شوہر کو اس کا نہیں رہنے دیا تھا...... وہ شہر بانو کے بارے میں سوچتے سوچتے عکس مراد علی کے بارے میں پریشان ہونے لگا تھا۔

عکس مراد علی سے یہ اس کا پہلا جھگڑا نہیں تھا۔ ان کے بہت سے جھگڑے پہلے بھی ہو چکے تھے اور شیر دل کو یہ ماننے میں عار نہیں تھی کہ ان میں سے 70 فیصد جھگڑے شروع کرنے میں اس کا ہاتھ تھا لیکن تقریباً سو فیصد جھگڑے ختم کرنے میں پہل اس نے کی تھی۔ وہ عکس سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا...... عکس رہ سکتی تھی، یہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی La Belle Dame Sans Mercy تھی...... بے رحم حسینہ...... یا کم از کم شیر دل اس کو یہی نام دیتا تھا۔ شہد کی دلدل اسے کامن کے دوسرے لوگ کہتے تھے۔ شیر دل اسے La Belle Dame Sans Mercy کہتا تھا۔ پہلے وہ اس کا یہ نام اس کے منہ پر نہیں لیتا تھا لیکن بعد میں وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا اور عکس نے کبھی اس پر کسی قسم کا کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا۔ وہ شیر دل کی ''بکواس'' پر کبھی دھیان نہیں دیتی تھی اور وہ اسے یہ openly بتا بھی دیتی تھی۔

عکس مراد علی سے اکیڈمی میں اس کا پہلا جھگڑا اس حسد کی وجہ سے ہوا تھا جو شیر دل نے تب محسوس کیا تھا جب عکس مراد علی نے غنی حمید کے ساتھ مکسڈ ڈبلز کے لیے پارٹنر شپ کی تھی۔ اکیڈمی میں اگر شیر دل کو کسی سے نفرت تھی تو وہ غنی حمید تھا۔ وہ ایچی سن میں اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا اور ایچی سن کے ہر نصابی غیر نصابی مقابلے میں وہ شیر دل کا سب سے بڑا حریف تھا۔ وہ بھی شیر دل ہی کی طرح ایک سول سرونٹ کا بیٹا تھا اور اس کی پوری فیملی کئی نسلوں سے اسی پیشے سے منسلک تھی۔ پنجاب کے دو دو بڑے بیوروکریٹس کے خاندان آپس میں شدید خار رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک پاکستان کی دو بڑی پولیٹیکل پارٹیز میں سے ایک کی good books میں تھا اور دوسرا دوسری پارٹی کی......

دونوں خاندانوں کی یہ رقابت اگلی نسل تک شاید نہ جاتی اگر غنی حمید اور شیر دل اتنے قریبی حریف نہ بن جاتے اور یہ رقابت اس لیے زیادہ بڑھ گئی کیونکہ ایچی سن میں بہت سی جگہوں پر شیر دل کا سکہ چلتا تھا اور یہ وہ کرسی تھی جو غنی حمید بدلنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ ایچی سن میں گزارے ہوئے تمام سالوں میں غنی حمید یہ نہیں کر سکا لیکن اس نے شیر دل کی سبقت اور برتری کبھی تسلیم نہیں کی۔ وہ ان تمام سالوں میں ایک چیلنجر تھا اور چیلنجر ہی رہا اور شیر دل کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں تھی کہ اس نے ایچی سن میں غنی حمید سے زیادہ مشکل حریف اور کوئی نہیں دیکھا۔ وہ بے انتہا قابل، محنتی اور حد درجہ گھٹیا اور کمینہ تھا...... اور شیر دل کو ایسا combination زندگی میں دوبارہ کبھی دیکھنے کو نہیں ملا۔

یہ شیر دل کی بدقسمتی تھی کہ ایچی سن کے وہ دونوں rivals سول سروسز اکیڈمی میں بھی ایک ہی سال میں ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ اور اس سے بھی زیادہ تکلیف وہ بات شیر دل کے لیے یہ تھی کہ عکس مراد علی نے یہ جاننے کے باوجود کہ پورے کامن میں شیر دل سے زیادہ اچھی ٹینس کھیلنے والا کوئی نہیں تھا غنی حمید کے ساتھ پارٹنر شپ کو ترجیح دی تھی۔ اس نے خود مکسڈ ڈبلز کے بجائے سنگلز اور ڈبلز کو ہی اپنے لیے کافی سمجھا تھا۔ لیکن اسے یہ حیرت ضرور تھی کہ غنی حمید مکسڈ پر کیسے تیار ہو گیا تھا جبکہ وہ سنگلز اور ڈبلز میں پہلے ہی تھا اور تیسرے میچ کا مطلب کیا تھا اسے حیرانی تھی غنی حمید کو کیوں سمجھ نہیں آیا تھا۔ عکس مراد علی کے علاوہ اس pairing کی کوئی اور وجہ شیر دل کو سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ اس سے بھی آ کر ٹیم بنانے کا کہتی تو انکار وہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

عکس مراد علی نے ایسی ہی ایک جوڑی بیڈمنٹن میں عثمان علی کے ساتھ بنائی تھی۔ وہ اس کامن میں بیڈمنٹن کا سب سے اچھا پلیئر تھا اور اس پورے کامن میں یک دم وہ دونوں مرد ہر ایک کی نظروں کا مرکز بن گئے تھے۔ وہ دو مرد عکس مراد علی کا انتخاب تھے اور اس کے ساتھ ہر روز ٹینس اور بیڈمنٹن کھیلنے کا اعزاز حاصل کرتے تھے۔ اس سے بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔ ان کی قسمت پر ہر مرد کا منہ کو رشک آتا تھا۔ صرف شیر دل تھا جس کو فی الحال یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ عکس مراد علی نے بیٹھے بیٹھے سنگلز اور ڈبلز مقابلوں میں کھیلنے کے بجائے سیدھا مکسڈ ڈبلز میں کھیلنے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا۔ اکیڈمی میں بہت کم فیمیلز کا منہ مکسڈ ڈبلز کے مقابلوں میں حصہ لیتی تھیں۔ زیادہ تر سنگلز اور ڈبلز کے مقابلوں میں ہی حصہ لیتی تھیں۔

شیر دل نے اکثر شام کو پریکٹس سیشن کے دوران عکس کو کھیلتے دیکھا تھا۔ وہ ایک average پلیئر تھی، یہ کوئی اس کی بیڈمنٹن اور ٹینس skill کو پانچ منٹ دیکھ کر بھی judge کر سکتا تھا۔

لیکن شیر دل کے طوطے کبوتر اس وقت اڑ گئے تھے جب اس نے مکسڈ ڈبلز میں عکس مراد علی اور غنی حمید کو جیتتے دیکھا تھا۔ غنی حمید ایچی سن کی ٹینس ٹیم کا شیر دل کے بعد سب سے اچھا پلیئر تھا اور عکس مراد علی کے ساتھ مل کر اس نے اورنگ زیب اسحاق اور صوفیہ بدر الدین کی ٹیم کو عکس کی برائے نام participation کے بھی جیت لیا تھا۔ عکس مراد علی نے خود کم کھیلا تھا غنی حمید کو زیادہ کھلایا تھا اور ونگ شاٹ سے بہت پہلے شیر دل کو یہ پچھتاوا ہونا شروع ہو گیا تھا کہ اس نے غنی حمید کو واقعی ہی ایچی سن میں Shoot کیوں نہیں کر دیا تھا یا کم از کم لنگڑا کر دیتا۔ اس الو کے پٹھے نے اکیڈمی کی اس ہیلن آف ٹرائے کو مکسڈ ڈبلز کی ٹرافی پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دی تھی۔ اس ہیلن آف ٹرائے کو جو اکیڈمی میں ٹینس پریکٹس کے سیشنز کے دوران اپنا سارا وقت صرف اپنی سروس ٹھیک رکھنے پر صرف کرتی رہی تھی اور اس نے میچ میں صرف کچھ aces لیے تھے یا پھر وہ کورٹ کے ایک کونے میں کھڑی اپنا ریکٹ گھماتی رہی تھی اور غنی حمید نے اپنے کورٹ کے چاروں کونوں میں کسی spider کی طرح بھاگ بھاگ کر اپنا حشر تو کر لیا تھا لیکن اس نے مکسڈ ڈبلز کی ٹرافی تقریباً تن تنہا اسے جتوا دی تھی۔ شیر دل نے سنگلز اور ڈبلز کے مقابلوں میں غنی حمید کا مار مار کر بھرکس نکال دیا تھا اور دونوں مقابلے جیتنے کے باوجود اس کا صدمہ اور غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔

دو دن بعد بیڈمنٹن کے مکسڈ ڈبلز میں اگرچہ ٹینس والی تاریخ نہیں دہرائی گئی لیکن وہ میچ جیتنے میں بھی عثمان علی کا رول ستر فیصد تھا۔

شیر دل نے اس میچ کے بعد جو تالیاں بجائی تھیں وہ اس ہیلن آف ٹرائے کی ذہانت پر بجائی تھیں جسے اکیڈمی میں دو الو کے پٹھے مل گئے تھے جنہوں نے اسے اسپورٹس میں وہ پوائنٹس دلوا دیے تھے جو CTP کی ٹریننگ ختم ہونے کے بعد best probationer کی ٹرافی جیتنے کے لیے ضروری تھے۔

عکس مراد علی ٹینس اور بیڈمنٹن دونوں میں ایک average player تھی۔ وہ اکیڈمی میں لڑکیوں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہاں بہت سی ایسی لڑکیاں موجود تھیں جو ایسے اداروں سے تعلیم حاصل کر کے وہاں پہنچی تھیں جہاں نہ صرف مختلف کھیلوں کی سہولیات تھیں بلکہ وہ کھیلتی رہی تھیں...... وہ لڑکیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے کسی مقابلے کے فائنل تک بھی نہیں پہنچی لیکن اس نے بے حد ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مکسڈ ڈبلز مقابلوں کے لیے ان دو کھیلوں کے سب سے اچھے کھلاڑیوں کے ساتھ pairing کر لی تھی۔ وہ دو ٹرافیز نہ بھی جیتتے پھر بھی فائنلز تک ضرور پہنچا دیتے اس کو...... وہ شیر دل کے ساتھ pairing بھی کر لیتی اگر best probationer کے لیے وہ اس کا سب سے قریبی حریف نہ ہوتا...... یہ شیر دل کا اندازہ تھا۔

وہ چیس مووی تھی...... سوچ سمجھ کر ایک کی جانے والی knight (گھوڑے) کی ٹیڑھی چال...... بظاہر سادہ لیکن بے حد دور اندیشی اور سمجھداری سے چلی جانے والی...... جو کم از کم شیر دل کے لیے کاری ثابت ہوئی تھی۔ شیر دل ذہانت کے اس مظاہرے پر دانت پیسنے کے بعد عش عش کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

غنی حمید نے میکاولی کی اس فلاسفی پر عمل کیا تھا کہ دشمن کا دشمن آپ کا دوست ہوتا ہے۔ وہ اس کامن میں خود ٹاپ نہیں کر سکتا تھا اور شیر دل کو ٹاپ کرتے دیکھ نہیں سکتا تھا...... عکس مراد علی وہ واحد لڑکی تھی جو شیر دل کو ہرا سکتی تھی اور غنی حمید نے ہیلن آف ٹرائے کا گھوڑا بننے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی تھی۔

عکس مراد علی اور غنی حمید کی دوستی اور شیر دل اور عکس مراد علی کی دشمنی کا وہ باقاعدہ آغاز تھا۔ عکس مراد علی نے اس کامن کی best probationer کا اعزاز بے حد آرام سے جیتا تھا۔ best conduct کی ٹرافی بھی اسی کے حصے میں آئی تھی۔ شیر دل صرف best sportsman کی ٹرافی حاصل کر سکا تھا۔ وہ پہلا سال تھا جب شیر دل کے خاندان کے کسی فرد کے کسی کامن کا حصہ ہوتے ہوئے بھی best probationer کا ایوارڈ کہیں اور گیا تھا۔

☆☆☆

”زندگی میں ایوارڈز اور ٹرافیز سب کچھ نہیں ہوتے لیکن ان کو حاصل کرنے کی قابلیت رکھتے ہوئے بھی حاصل نہ کر پانا بدقسمتی ہے۔“ چڑیا کو ٹھیک سے یاد نہیں تھا خیر دین نے اس سے یہ بات کب کہی تھی لیکن اسے یہ ضرور یاد تھا کہ اسے یہ بات خیر دین نے ہی کہی تھی۔ خیر دین کی باتیں اس کے لیے باتیں نہیں تھیں وہ اس کے لیے quotations تھیں۔ زندگی گزارنے کے گر...... وہ اس کی زندگی کا پہلا ”بڑا آدمی“ تھا جسے اس نے کبھی ”چھوٹا“ بنتے نہیں دیکھا۔

”بڑا آدمی بننا بہت بڑا کمال ہے لیکن بڑا آدمی بننے کے بعد چھوٹا آدمی نہ بننا اس سے زیادہ بڑا کمال ہے۔“

”نانا آپ مشکل باتیں کرتے ہیں۔“ چڑیا نے اس کی بات سننے کے بعد خیر دین سے کہا۔ وہ مسکرا دیا۔ ”مشکل باتیں زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کر دیتی ہیں۔“ خیر دین نے اس سے کہا تھا۔

وہ چھ سیاہ مہینے اب آہستہ آہستہ ان کی زندگی اور رشتے سے اپنی تاریکی اور نحوست کے سائے سمیٹنے لگے تھے...... وہ ڈی سی وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد خیر دین کا وہ خوف بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر بالکل اسی جگہ پر اپنی ریڑھی دوبارہ لگانی شروع کر دی تھی جہاں وہ پہلے لگاتا تھا۔ اور کچھ عجیب سی برکت تھی جو ان کے رزق میں آنا شروع ہوئی تھی۔ اس ریڑھی سے اتنا کچھ بچنے لگا تھا کہ حلیمہ کو گھر میں سلائی کڑھائی کا وہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا جو اس نے شہر میں آنے کے بعد شروع کیا تھا۔

دو سال میں خیر دین نے ریڑھی کے بجائے اسی علاقے میں ایک چھوٹی سی دکان لے لی تھی۔ چڑیا اب مڈل میں آ گئی تھی اور وہ اب خیر دین کے ساتھ اس ریڑھی پر بیٹھنا چھوڑ چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی خیر دین نے پھلوں کا کاروبار بھی ختم کر دیا تھا۔ اس کی دال اب اتنی بکنے لگی تھی کہ اس کے پاس پھلوں کا کاروبار کرنے کا نہ تو وقت تھا نہ ضرورت۔

ایک کمرے کے کرائے کے مکان سے وہ اب دو کمروں کے ایک بہت بہتر مکان میں کرائے پر رہنے لگے تھے اور انہی دو سالوں میں خیر دین کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنا پڑا تھا...... حلیمہ کی دوبارہ شادی کا...... وہ اسی محلے میں رہنے والا ایک خاندان تھا جس کا ایک بیٹا کوئٹہ میں کئی سالوں سے مقیم تھا...... ایک کار ایکسیڈنٹ میں اس

آدمی کی بیوی تین چھوٹے بچے چھوڑ کر مرگئی تھی اور وہ تین بچے اب مختلف مسائل کا شکار تھے۔ وہ آدمی نہ تو انہیں اکیلا اپنے پاس رکھ پا رہا تھا نہ ہی پاکستان میں ان کی دیکھ بھال سے مطمئن تھا اور تبھی محلے کے ایک شخص کے توسط سے خیردین سے حلیمہ کا ہاتھ مانگا گیا۔ جس نے کچھ عرصہ اس آدمی کے گھر کی عورتوں کے لیے سلائی کڑھائی کا کام کیا تھا۔

خیردین کے لیے یہ ایک عجیب آزمائش کا موقع تھا۔ اس نے کبھی حلیمہ کی تیسری شادی کا نہیں سوچا تھا۔ اس کے دوسرے شوہر کی وفات کے بعد حلیمہ خود بھی ایک بار پھر ایسے رشتے میں بندھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تینوں ایک فیملی کے طور پر اپنی زندگی سے مطمئن تھے لیکن چڑیا کے بعد آنے والے کرائسس میں خیردین کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کو کچھ ہو جانے کی صورت میں حلیمہ اور چڑیا کتنے مسائل کا شکار ہو سکتی تھیں۔ فکرمندی کا یہی احساس تھا کہ اس آدمی کے رشتے کی بات کرنے پر خیردین نے فوری انکار کرنے کے بجائے غور کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا تھا لیکن خیردین نے حلیمہ سے بھی پہلے اس مسئلے پر چڑیا سے بات کی تھی۔

وہ اسے ایک دن اسکول کے بعد گھمانے کے لیے ایک پارک لے گیا تھا اور وہاں اسے آئس کریم کھلاتے ہوئے خیردین نے اس سے پوچھا تھا۔

''بیٹا اگر تمہاری امی کی شادی ہو جائے اور وہ پاکستان سے چلی جائیں تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' چڑیا خیردین کے اس بے ربطگی سے کیے ہوئے مبہم سوال پر آئس کریم کا کپ ہاتھ میں پکڑے کچھ ہکابکا رہ گئی تھی۔

''مجھے؟''

''ہاں تمہیں۔'' خیردین نے متانت سے کہا۔

''آپ امی کی شادی کر رہے ہیں؟'' چڑیا کی زندگی میں خوف کا ایک اور لمحہ آیا تھا۔

''تمہیں برا لگے گا اگر میں ان کی شادی کر دوں تو؟'' خیردین نے اس کے سوال پر چڑیا سے ایک اور سوال کیا۔

''لیکن وہ کیوں شادی کریں گی......؟ ہم سب خوش ہیں۔'' چڑیا نے خیردین کی طرف دیکھا۔

''تمہارا نانا بہت بوڑھا ہے چڑیا اور تمہاری امی نے زندگی میں کبھی اپنا گھر، خوشی نہیں دیکھی۔ ہماری زندگی کی واحد خوشی صرف تم رہی ہو...... لیکن میں بعض دفعہ سوچتا ہوں کہ اگر آج مجھے کچھ ہو گیا تو تمہارا اور حلیمہ کا کیا ہوگا؟ میرے بعد تم دونوں دال کی وہ دکان تو نہیں چلا سکتیں...... رشتے دار جیسے ہیں میرے وہ تم پہلے ہی دیکھ چکی ہو...... میں تم دونوں کے لیے بہت ڈرتا ہوں۔''

خیردین اب اس کے ساتھ اپنے وہ خدشات شیئر کر رہا تھا جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیے تھے اور اس کی باتیں چڑیا کو رنجیدہ کرنے لگی تھیں۔ اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کا بہادر نانا اس کے اور اس کی ماں کے حوالے سے کچھ خدشات بھی رکھ سکتا تھا۔ خیردین اسی رسانیت سے اس سے کہہ رہا تھا۔

''اب ایک موقع مل رہا ہے کہ میں تمہاری امی کی شادی کر کے ان کا ایک گھر بنا سکوں تو میں اسے ضائع نہیں کروں گا۔ اس لیے ضائع نہیں کروں گا تاکہ اگر کل کو مجھے کچھ ہو جائے تو تمہاری اور تمہاری امی کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ہو۔'' چڑیا نے یک دم خیردین کا بازو پکڑ لیا۔

''نانا آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔'' چڑیا نے جیسے بہت خوفزدہ ہو کر خیردین سے کہا۔

''ہاں بیٹا مجھے کچھ نہیں ہوگا...... لیکن اگر کچھ ہو گیا تو......؟'' خیردین نے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔

''آپ امی کی شادی کر دیں گے تو پھر وہ تو چلی جائیں گی ہمارے گھر تو نہیں رہیں گی۔'' چڑیا اب رنجیدگی سے خیردین کو جیسے وہ تصویر دکھانے کی کوشش کر رہی تھی جو اسے خوفزدہ کر رہی تھی۔

''ہاں وہ ہمارے گھر ہمارے ساتھ نہیں رہیں گی لیکن ان کا اپنا ایک بہت اچھا سا گھر ہوگا جیسے سب عورتوں کا ہوتا ہے۔''

''لیکن نانا ہمارا بھی تو گھر ہے نا وہ امی کا ہی تو گھر ہے۔'' چڑیا نے خیردین کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''ہاں یہ بھی تمہاری امی کا گھر ہے لیکن یہ کرائے کا گھر ہے...... شادی کے بعد ان کا اپنا گھر ہوگا، ان کا شوہر ان کا خیال رکھے گا۔ ان کی ذمے داریاں اٹھائے گا پھر تمہاری امی اور تمہارے نئے ابو تمہاری ذمے داری بھی اٹھا سکتے ہیں۔'' چڑیا کو خیردین کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں لیکن وہ سنتی رہی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ ناخوش تھی خیردین کو یہ جاننے میں نہ تو زیادہ وقت ہوئی تھی نہ ہی تعجب...... اس کی جگہ کوئی بھی بچہ ہوتا جس نے ساری عمر اپنی زندگی صرف دو لوگوں کے ساتھ گزاری ہوتی تو وہ اس صورت حال میں ناخوش ہی ہوتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ ناخوش جتنا چڑیا ہوئی تھی۔ آئس کریم کا پورا کپ اس دن چڑیا کے ہاتھ میں ہی پگھل کر گرم اور پھر بے مزہ ہو گیا تھا۔

وہ اس دن واپس گھر جاتے ہوئے بے حد اداس تھی اور اس اداسی کے ساتھ بھی اس نے حلیمہ کو گھر جا کر بڑے غور سے دیکھا تھا...... کیا اس کی امی واقعی شادی کرنا چاہتی تھیں......؟ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ چلی جانا چاہتی تھیں؟ اسے حلیمہ کو دیکھتے ہوئے یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی اس گھر سے جانا چاہتی تھیں لیکن بہت آہستہ آہستہ ابتدائی شاک سے ابھرنے کے بعد چڑیا نے جیسے اپنی ماں کے لیے اس سے بہتر گھر اور بہتر زندگی کا خواب دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ لاشعوری طور پر اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی ماں کے لیے ویسا ہی گھر تصور کر رہی تھی جس گھر میں وہ ساری زندگی رہتی رہی تھی...... تو اس کی امی بھی ایک ڈی سی ہاؤس جیسے گھر میں رہیں گی اور ان کے ساتھ رہنے والا ان کا شوہر ان کا ویسے خیال رکھے گا جیسے...... اور اس جیسے کے بعد چڑیا کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام آفیسرز اور ان کی بیویاں گھومنے لگی تھیں جن کے ساتھ وہ رہ چکی تھی...... اس کا دل عجیب طرح سے ماں کے حق میں موم ہوا تھا...... اس کی ماں کے لیے بھی نوکر ہوں گے جو اس کے لیے سارے کام کیا کریں گے اور وہ صرف آرام کرے گی یا پھر حکم دے گی...... اور اس کی ماں کے پاس بہت سارے اور اچھے اچھے کپڑے اور زیور ہوں گے اور وہ بھی ایک گاڑی میں گھوما کرے گی۔

خیردین کو یہ نہیں پتا تھا کہ چڑیا ساری رات کیا سوچتی رہی تھی لیکن چڑیا نے اگلے دن صبح سویرے اسکول جانے سے پہلے خیردین سے کہا تھا۔

''نانا آپ امی کی شادی کر دیں...... مجھے بہت اچھا لگے گا جب امی کے پاس بہت ساری چیزیں، ایک بڑا سا گھر اور گاڑی ہوگی تو......'' اس کی آواز بات کرتے کرتے غیر محسوس انداز میں بھرائی تھی، خیردین کا دل بھی بھر آیا

تھا۔ وہ ایک بچے کے طور پر ایثار کے مفہوم سے آشنا نہ ہونے کے باوجود اپنی ماں کے لیے ایثار کرنے پر تیار تھی۔ اپنی ماں کی اچھی اور بہتر زندگی کے لیے...... خیر دین جانتا تھا کہ چڑیا عام بچوں جیسی نہیں تھی اس کے لیے پھر بھی یہ ماننا مشکل تھا کہ وہ اتنے آرام سے اپنی ماں کی زندگی میں سے خود کو نکالنے پر تیار ہو گئی تھی لیکن حلیمہ اتنی آسانی سے ان لوگوں کی زندگی میں سے نکلنے پر تیار نہیں ہوئی تھی۔ اسے منانے پر خیر دین کو ہفتوں لگ گئے تھے اور شاید مہینوں لگنے کے بعد بھی حلیمہ کبھی ایک اور شادی پر تیار نہیں ہوتی اگر اس نے خیر دین کے گاؤں میں چند مہینے نہ گزارے ہوتے اور اپنے رشتے داروں کے ہاتھوں اپنے مستقبل کی ایک بھیانک تصویر نہ دیکھ لی ہوتی۔ کہیں نہ کہیں اس کے لاشعور میں بھی یہ خوف تھا کہ خیر دین اگر ان کی زندگی سے چلا گیا تو کیا ہوگا اور خاص طور پر چڑیا کا کیا ہوگا۔ وہ اکیلی تنہا عورت کے طور پر اسے کیسے پالے گی۔ وہ روتے دھوتے اور با دل ناخواستہ ہی سہی پر اس شادی پر تیار ہو گئی تھی جس کے بعد اسے کم از کم اپنے لیے زندگی اچھی نظر آرہی تھی لیکن وہ جانے سے پہلے چڑیا سے بہت سارے وعدے کر کے گئی تھی...... اسے بہت ساری یقین دہانیاں کروا کر گئی تھی۔

''چڑیا تم میری واحد اور پیاری اولاد ہو...... میرے دل کا ٹکڑا ہو...... میں ایک اور گھر میں جارہی ہوں لیکن مجھے جتنی محبت تم سے ہے دنیا میں کسی سے نہیں...... کبھی کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔'' وہ شادی سے ایک رات پہلے بلک بلک کر روتے ہوئے چڑیا سے کہہ رہی تھی۔ چڑیا ماں کی باتوں سے زیادہ اس کے رونے کی وجہ سے رو رہی تھی...... جانے کیوں اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ حلیمہ شادی کی بات پر خوش ہو جائے گی۔ ایک اچھا سا گھر ملنے کی امید پر وہ پھولے نہیں سمائے گی پر وہ جس طرح ان چند ہفتوں میں اس گھر میں روتی اور بولائی پھرتی تھی اس نے چڑیا کو عجیب انداز میں پریشان کیا تھا...... کہیں نہ کہیں اس نے اپنے ذہن میں ایک بڑے سے گھر کے تصور پر بھی غور کرنا شروع کر دیا تھا...... کہیں نہ کہیں گھر کی اس تعریف میں کچھ خامی تھی جو چڑیا کے ذہن میں تھا اور چڑیا یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا خامی تھی لیکن اس کی عمر میں وہ خامی نظر اور سمجھ نہیں آسکتی تھی۔ گھر اور خاندان کا فرق سمجھنا آسان نہیں ہوتا...... بڑوں کے لیے بھی اور وہ تو محض ایک بچی تھی۔

''میں تم سے روز بات کروں گی فون پر، روز ملنے آیا کروں گی تم سے اور جب میں نہیں آؤں گی تب تمہیں اپنے پاس بلا لوں گی...... یہاں پاس ہی تو گھر ہوگا میرا۔'' حلیمہ اس سے کہتی جارہی تھی وہ جیسے چڑیا سے زیادہ خود کو فریب دے رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی کے شاید کچھ ہی ہفتوں کے بعد اسے مستقل طور پر اپنے شوہر کے ساتھ کویت چلے جانا تھا اپنے شوہر کے تین بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اور پاکستان سے چلے جانے کے بعد زندگی کے اس بہاؤ میں وہ چڑیا کے لیے کہاں سے اور کیسے وقت نکال سکتی تھی۔ کہیں نہ کہیں یہ تلخ حقیقت ہی بھوت بن کر اسے ڈرا اور رُلا رہی تھی لیکن وہ اسے سچ ماننے پر تیار نہیں تھی وہ بھوت کو وہم ہی رکھنا چاہتی تھی وہم ہی ماننا چاہتی تھی۔

چڑیا نے حلیمہ کے ہر وعدے پر سر ہلا دیا تھا۔ اس وقت اسے بھی یقین تھا کہ حلیمہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ یقیناً کر پائے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسے احساس ہو گیا تھا کہ فاصلہ زندگی میں بہت سی چیزوں کا مفہوم بدل دیتا ہے، بہت سی چیزوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ رشتوں پر، ان کی گہرائی پر، ان کی ضرورت پر، ہر چیز پر۔

حلیمہ جب تک پاکستان میں رہی تھی وہ واقعی چڑیا پر بہت توجہ دیتی رہی تھی شادی کے بعد بھی۔ اس کا شوہر بھی ایک کم پڑھا لکھا لیکن اچھا آدمی تھا۔ وہ کویت میں ایک ائر کنڈیشنگ پلانٹ میں بہت عرصے سے کام کر رہا تھا اور بہت اچھا کماتا تھا۔ شادی کے دو مہینے کے بعد حلیمہ اس کے اور اس کے تین بچوں کے ساتھ پاکستان سے چلی گئی تھی۔

چڑیا کی زندگی میں اداسی اور تنہائی نئے سرے سے آئی تھی۔ حلیمہ اسے کویت سے باقاعدگی سے فون کیا کرتی تھی وہ اپنی نئی زندگی سے بہت خوش تھی اور اس کی خوشی نہ چاہنے کے باوجود بھی چڑیا کو اداس کرتی تھی۔ خیر دین نے حلیمہ کے چلے جانے کے بعد چڑیا پر پہلے سے بھی زیادہ توجہ دی تھی۔ اب ان دونوں کی زندگی میں صرف وہی تھے ایک

دوسرے کے لیے۔ کوئی تیسرا نہیں تھا اور جوں جوں چڑیا بڑی ہو رہی تھی خیر دین پہلے کی نسبت کچھ مطمئن ہو رہا تھا۔ وہ اب گھر خود سنبھال لیتی تھی خیر دین کو اس کے اور گھر کے ہر کام کے بارے میں پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا۔ اس کا کاروبار آہستہ آہستہ بہت مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ خیر دین کی دال اس شہر میں اپنی پہچان بنا چکی تھی اور جب تک چڑیا نے میٹرک کیا خیر دین پانچ مرلے کا ایک گھر خرید چکا تھا۔ ان کے سر پر بالآخر اپنی چھت آ گئی تھی۔

چڑیا کو کنیئرڈ میں تعلیم کے لیے بھیجنا خیر دین کا ایک اور خواب تھا اور چڑیا نے خیر دین کا یہ خواب کسی مشکل کے بغیر پورا کر دیا۔ وہ میٹرک بورڈ میں پوزیشن لینے کے بعد کسی بھی ادارے میں آرام سے اسکالرشپ پر پڑھ سکتی تھی لیکن وہ خیر دین کو چھوڑ کر ہاسٹل جانے سے ہچکچا رہی تھی۔

''کتنی لڑکیوں کو اس کالج میں اسکالرشپ پر جا کر پڑھنے کا موقع ملتا ہے چڑیا...... تم نے کبھی سوچا ہے اور اب تمہیں موقع مل رہا ہے تو تم اسے میرے لیے ضائع کرنا چاہتی ہو۔'' خیر دین نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نانا میں آپ کو یہاں اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟'' چڑیا نے خیر دین سے کہا۔

''کل کو جب تم میڈیکل کالج میں جاؤ گی تب بھی تو میں اکیلا ہی رہوں گا اور میں اکیلا نہیں ہوں چڑیا...... تم ہر وقت میرے ساتھ میرے پاس ہوتی ہو۔'' خیر دین اسے پیار سے سمجھا رہا تھا...... ''میں چاہتا ہوں تم بہت پڑھو، پاکستان کی ایک بڑی ڈاکٹر بنو۔ پاکستان سے باہر تک اسپشلائزیشن کرنے جاؤ۔ تم اپنے نانا کے لیے کب تک اس شہر میں رکی رہو گی۔'' چڑیا نے ایک بار پھر خیر دین کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس نے زندگی میں خیر دین سے بھی اگر ضد کی بھی تھی تو نو سال کی عمر میں ہونے والے اس حادثے کے بعد کبھی نہیں...... اس نے جیسے اپنا یہ حق ان تکلیفوں کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا جو خیر دین کو اس نے اپنی وجہ سے اٹھاتے دیکھا تھا۔ اس حادثے کے بعد کے چھ سالوں نے چڑیا کو بہت خاموش کر دیا تھا۔ وہ traumatized نہیں تھی نہ ہی نفسیاتی طور پر بہت زیادہ مسائل کا شکار ہوئی تھی اور اس کا سارا کریڈٹ خیر دین کے بعد سسٹر ایگنس کو جاتا تھا جنہوں نے میٹرک تک اس اسکول میں چڑیا پر ہمیشہ ذاتی توجہ دی تھی۔ خیر دین میں کبھی اتنی ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ چڑیا سے اس حادثے کے حوالے سے بات کر پاتا۔ چڑیا سے بہت قریب ہونے کے باوجود خیر دین کبھی اس سے اس ایشو پر کھل کر بات نہیں کر سکا تھا۔ سسٹر ایگنس نے یہ کام ایک بار نہیں بہت بار کیا تھا۔

''جو کچھ ہوا وہ تمہاری کسی mistake کی وجہ سے نہیں ہوا اور جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ تھا، بہت برا اور تکلیف دہ لیکن it was just an accident حادثوں کو بھول جانا چاہیے۔'' انہوں نے پہلی بار ایک لرزتی کانپتی زرد چہرے والی چڑیا سے کہا تھا۔

''یہ جو کچھ ہوا یہ بس اتنا ہی تکلیف دہ ہے جس طرح کوئی ہمیں کوئی اور چوٹ لگا دے...... کوئی انجری ہو جائے ہمیں...... اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں ہے اس کی...... کوئی عزت کم زیادہ نہیں ہوتی اس سے اور تم بہت بہادر لڑکی ہو تمہیں بس ہمیشہ یہی یاد رکھنا ہے۔'' سسٹر ایگنس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ پتا نہیں چڑیا کو ان باتوں کی سمجھ آئی یا نہیں آئی لیکن حوصلہ اسے صرف ایک بات سے ملا تھا اور وہ یہ کہ وہ اب بھی چھوت کی بیماری نہیں بنی تھی۔ سسٹر ایگنس کے لیے۔ اور انہیں اس کے زخم کریدنے میں دلچسپی نہیں تھی صرف مرہم رکھنے میں تھی۔ خیر دین کا وہ راز سسٹر ایگنس، خیر دین اور چڑیا کے درمیان ہی رہا تھا...... کانونٹ کی کوئی اور ٹیچر یا سسٹر کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ چڑیا کو کبھی کانونٹ میں کسی سے نظریں چرا کر یا سر جھکا کر نہیں رہنا پڑا۔

سسٹر ایگنس نے چڑیا کو کانونٹ کے ہر نصابی غیر نصابی مقابلے میں ہمیشہ شیر کی طرح اتارا تھا اور چڑیا ہمیشہ شیر ہی کی طرح مقابلہ کرتی رہی تھی۔ کانونٹ کے کسی اسٹوڈنٹ نے اس سے پہلے کانونٹ میں انٹر اسکولز مقابلوں کی شیلڈز

اور ٹرافیز کا وہ ڈھیر نہیں لگایا تھا جو چڑیا نے لگا دیا تھا۔ بہت کم ہی ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی مقابلے میں جاتی اور پہلی پوزیشن کے علاوہ کسی اور پوزیشن کی حقدار ٹھہرتی۔

چڑیا کی زندگی میں اس کانونٹ کا اور سسٹر ایگنس کا جو رول تھا وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے مسیحا کی حیثیت رکھتے تھے۔ کچھ ایسا ہی فخر سسٹر ایگنس بھی اپنی اس اسٹوڈنٹ پر رکھتی تھیں۔ انہوں نے چڑیا پر جتنی توجہ دی تھی چڑیا نے انہیں اس سے بڑھ کر رزلٹ دیے تھے۔

تین سال بعد سسٹر ایگنس کا وہاں سے ٹرانسفر ہو گیا تھا لیکن جانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر چڑیا کے ساتھ بہت ساری باتیں کی تھیں۔

''زندگی میں ہونے والے یہ حادثے شرم سے مر جانے والے ان کے لیے ہونے چاہئیں جو ان کے ذمے دار ہیں، ان کے لیے نہیں جو نشانہ بنتے ہوں۔ کبھی بھی اس تکلیف دہ واقعے کو اپنی زندگی کا وہ کنواں مت بننے دینا جس کی گہرائی اور تاریکی تمہاری پرسنالٹی تمہاری positivity تمہارے سارے ٹیلنٹ کو کھا جائے گا۔ کبھی اپنے آپ پر اس ایک واقعے کی وجہ سے ترس مت کھانا، کبھی نہیں۔ تم اس کانونٹ کی سب سے برائٹ اسٹوڈنٹس میں سے ایک ہو۔ one day you will make us proud of you'' وہ ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ اس نے سسٹر ایگنس کی باتوں کو ہمیشہ اسی طرح سنا تھا...... لیکن یہ پہلا موقع تھا جب اسے سسٹر ایگنس کی باتوں کی پہلے سے زیادہ سمجھ آئی تھی۔ سسٹر ایگنس نے اس کے ساتھ گزارے ہوئے سالوں میں چڑیا کے زخموں پر ایسے بہت سے مرہم وقتاً فوقتاً رکھے تھے لیکن اس کے باوجود بہت ساری چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ چڑیا کے اندر سے ختم نہیں کر سکی تھیں۔ وہ بہت ریزرو ڈ بہت خاموش طبع تھی...... کسی کو بہت قریبی دوست بنانا اس کی زندگی کا جیسے مشکل ترین کام تھا۔ اس کے لیے لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنا اور خاموشی سے ان کی بات چیت سن لینا آسان تھا لیکن اس کے لیے کسی کے ساتھ بھی ایک خاص حد سے زیادہ بے تکلفی پیدا کرنا بہت مشکل تھا اور ایسا کیوں تھا یہ چڑیا خود بھی کبھی نہیں سمجھ سکی اور یہ وقت اسے کنیئرڈ میں بھی رہی تھی۔

کہیں نہ کہیں فاطمہ کو لوگوں پر اعتبار کرنے میں مشکل کا سامنا تھا اور یہ مشکل کیوں تھی...... اس کے پاس وجوہات کی لمبی فہرست تھی۔ حالانکہ کنیئرڈ تک پہنچتے پہنچتے زندگی اس کے بہت سے مسئلے حل کر چکی تھی۔

خیر دین شہر کے بارونق ترین علاقے میں ایک دکان چلا رہا تھا جس کی دال کھانے کے لیے لوگ بہت دور دور سے آتے تھے اور جس کا پکا ہوا کھانا شام ہونے سے پہلے ختم ہو جاتا تھا۔ اب اس دکان پر خیر دین کے پاس پانچ کام کرنے والے ملازم تھے۔ اس کے باوجود رش اتنا رہتا تھا کہ خیر دین بے انتہا کوشش کے باوجود بھی ایک خاص تعداد سے زیادہ گاہک نہیں بھگتا سکتا تھا۔

خیر دین کا پانچ مرلے کا خریدا ہوا گھر اب ڈبل اسٹوری ہو چکا تھا۔ اس کی اوپر والی منزل اب کسی کرائے دار کے پاس تھی۔ خیر دین کے لیے چڑیا کے چلے جانے کے بعد نیچے والا حصہ بھی ضرورت سے بہت زیادہ تھا اور اس گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔

زندگی کا وہ مشکل دور بہت جدوجہد سے ہی سہی لیکن آہستہ آہستہ گزر گیا تھا لیکن اس کے نقوش اور اثرات ان تمام لوگوں کی زندگیوں پر تھے جو اس میں سے گزرے تھے اور ان تمام سالوں کے بعد اپنے زندگی کے پرسکون ترین دنوں میں فاطمہ کو اپنی زندگی کے بدترین دنوں کا خیال نہ آتا اگر اس نے کالج کے اس تقریری مباحثے میں ایبک کو نہ دیکھ لیا ہوتا...... فاطمہ نے ایبک کو اس کے نام سے پہچانا تھا۔ وہ نام اس کی یادداشت کے ہر خانے پر جیسے نقش تھا۔ اس نے ایبک کو اس کے چہرے سے پہچانا تھا۔ وہ آج بھی اس کے چہرے کو بھول نہیں پائی تھی اور اس نے ایبک کو اچی سن کے حوالے سے پہچانا تھا...... صرف سات سال ہی تو گزرے تھے گرمیوں کے اس ایک مہینے کو جو ایبک نے اس ڈی سی

ہاؤس میں اسے ٹینس سکھاتے اور اس کے ساتھ چیس کھیلتے ہوئے گزارے تھے۔ سات سال اتنا لمبا عرصہ تو نہیں ہوتا کہ وہ اسے پہچان نہ سکتی...... اور اگر وہ اسے پہچان سکتی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایبک اسے نہ پہچان پاتا۔

وہ فاطمہ کی زندگی کا پہلا مقابلہ تھا جس میں فاطمہ نے کوئی انعام حاصل نہیں کیا تھا...... وہ صرف تالیاں بجانے والوں میں شامل تھی یا اس کی نظریں بار بار ایبک پر بھٹکتی رہی تھیں لیکن اس نے ایبک کو ایک بار بھی اپنی طرف متوجہ نہیں پایا تھا۔ اسے اطمینان ہوا تھا وہ اسے نہیں پہچانا تھا...... اور اگر پہچان گیا تھا تو......

اس دن ہاسٹل میں واپس آ کر فاطمہ نے اپنے سامان میں سے کئی سال پہلے ایبک کی دی ہوئی ایک ٹینس بال نکال کر دیکھی تھی جس پر ایبک نے اپنے سگنیچر کر کے دیے تھے اور ان سگنیچر کے ساتھ ایک جملہ اور بھی تھا۔

''I win coz I can'' وہ اس گیند کو پکڑے بہت دیر اس پر لکھی وہ تحریر دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں نمی آنے لگی تھی۔

''اس ٹینس بال کو بہت carefully رکھنا اپنے پاس...... کیونکہ ایک دن میں بہت بڑا ٹینس اسٹار بن جاؤں گا پھر تو میں کسی کو بھی اس طرح اپنے آٹوگراف نہیں دوں گا۔ but I like you...and you are a friend تو اس لیے میں تم کو دے رہا ہوں۔'' ایبک نے یہ گیند اس کے لیے سائن کرتے ہوئے بلا کی خود اعتمادی کے ساتھ کہا تھا۔ چڑیا نے تب اس سے یوں عقیدت کے ساتھ بے حد مرعوب ہوتے ہوئے وہ گیند لی تھی جیسے وہ واقعی کسی مستقبل کے سپر اسٹار سے وہ گیند لے رہی تھی۔

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ وہ گیند واپس اسی بیگ میں ڈال دی جس میں ایبک کی دی ہوئی اور بہت ساری چیزیں تھیں۔ ایبک کی چٹنی، دو بال پوائنٹ، ایک جیپ کی شکل کا شارپنر، ایبک کی بنائی ہوئی چند ڈرائنگز اور چڑیا کا پینسل سے بنایا ہوا ایک اسکیچ...... چند تتلیاں جو ایک ڈائری کے اندر رکھی ہوئی تھیں اور شیشے کے ایک جار میں پڑے چند کیڑے مکوڑے جن کی حالت اب اتنے سالوں بعد کچھ کی کچھ ہو گئی تھی۔ فاطمہ کو ہمیشہ چیزیں بہت احتیاط سے رکھنے کی عادت تھی چاہے وہ کسی کی بھی دی ہوئی ہوتیں اور یہ تو ایبک کی دی ہوئی چیزیں تھیں۔ اس ڈی سی ہاؤس سے باہر پھینکے جانے والے سامان میں چڑیا کا واحد اثاثہ یہی ایک بیگ تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا دوست تھا اور آخری بھی۔ چڑیا کو زندگی میں دوبارہ کبھی کوئی ایبک نہیں ملا تھا جس سے وہ باتیں کر پاتی جو وہ ایبک سے کرتی تھی۔

☆☆☆

''سر وہ ڈی سی او آپ سے فوری طور پر بات کرنا چاہتی ہیں۔'' آپریٹر کی آواز شیر دل کو جیسے کسی خواب میں آنے والی آواز لگی تھی۔ وہ چند سیکنڈز پہلے انٹرکام کی آواز سے ہی ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ پچھلی رات شہر بانو اور مثال کو ائر پورٹ پر سی آف کر کے لاہور سے سیدھا اپنے گھر آ گیا تھا۔ لاہور میں دو دن کے stay کے دوران اس کی نیند نہ ہونے کے برابر رہی تھی اور واپس آتے ہی وہ گہری نیند سو گیا تھا۔

نیم تاریکی میں ہی کسی میکانکی انداز میں اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ہاتھ سے لیٹے لیٹے فون اٹھایا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی رسٹ واچ اٹھا کر وقت دیکھا تھا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ کسی ایمرجنسی کے علاوہ آپریٹر اسے کال نہیں کر سکتا تھا۔

''سر ڈی سی او آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ Its emergency'' اس کے ریسیور اٹھاتے ہی آپریٹر نے عکس مراد علی کی designation اور شہر کا نام لیتے ہوئے اسے ایک بار پھر کہا تھا۔

''عکس مراد علی؟'' شیر دل کو لگا اس نے نیند میں کچھ غلط سنا تھا۔

''yes sir'' آپریٹر نے تصدیق کی۔ شیر دل بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''کال ملاؤ۔'' اس نے آپریٹر کو ہدایت کرنے کے بعد فوری طور پر سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ اس کی آنکھیں نیند

سے بوجھل تھیں لیکن اس کا دماغ یک دم الرٹ ہو گیا تھا۔ ایسی کیا ایمرجنسی ہو سکتی تھی کہ وہ اسے رات کے اس پہر کال کر رہی تھی۔ ابھی پچھلی ہی رات وہ کچھ اور نہیں سوچ سکا۔ اس نے عکس کی آواز فون پر سنی تھی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔ تمہارے بیڈروم میں TV ہے؟'' عکس نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بری طرح الجھا۔

''ہاں ہے۔''

''تو پھر TV لگاؤ۔'' وہ اسے ایک نیوز چینل کا نام بتاتے ہوئے ٹی وی لگانے کا کہہ رہی تھی۔ شیر دل نے کچھ پریشانی کے عالم میں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ریموٹ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

''خیریت ہے؟'' اس نے اس تلاش کے دوران عکس سے پوچھا اسے اس کی آواز بے حد بجھی ہوئی لگی تھی۔

''نہیں ہے خیریت۔ I'm in a big mess۔'' وہ اسے بتا رہی تھی اور بالکل اسی وقت شیر دل نے ریموٹ ڈھونڈ کر سامنے لگی LCD آن کی۔ ایک نیوز چینل پر کسی پولیس اسٹیشن پر ایک بے حد قیمتی گاڑی اور اس میں سے نکل کر پولیس کی حراست میں اندر جانے والے ایک مرد کی فوٹیج بار بار چل رہی تھی۔ جسے شراب نوشی کرتے ہوئے کچھ دیر پہلے کسی سگنل پر پولیس کی کسی موبائل نے اپنی حراست میں لے لیا تھا۔ وہ ایک معروف سیاست دان کا بیٹا تھا اور اس کا نام جواد ملہی تھا...... لیکن شیر دل کا ذہن جو چیز دیکھ کر بھک سے اڑا تھا وہ TV اسکرین پر چلتی پٹی پر آنے والی اس واقعے کے حوالے سے ایک خبر تھی جس میں ملزم کی منگیتر کے طور پر عکس مراد علی کا نام اس کے عہدے کے ساتھ چل رہا تھا۔

''میں تمہیں کچھ دیر بعد فون کرتا ہوں۔'' شیر دل نے TV اسکرین پر اس فوٹیج اور پٹی پر چلنے والی خبر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد عکس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

خیر دین نو سال بعد اپنے گاؤں پہلی بار تب گیا تھا جب فاطمہ کو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ملا تھا۔ وہ اپنا یہ فخر جیسے اپنے پورے گاؤں میں بانٹنے اور بتانے گیا تھا...... اس کی نواسی اس علاقے اور اس گاؤں کی پہلی ڈاکٹر بننے والی لڑکی تھی جو ایف ایس سی میں بورڈ کو ٹاپ کرتے ہوئے وہاں پہنچی تھی۔ وہ نو سال پہلے اس گاؤں سے دھکے کھاتے ہوئے سر جھکائے روتا ہوا اپنے دل میں یہ حسرت لیے وہاں سے گیا تھا کہ اس کی نسل میں کوئی مرد ہوتا تو شاید...... اور اس شاید کے آگے کا جواب خود خیر دین کو کبھی نہیں آیا تھا۔ اس کی نسل میں ایک مرد ہوتا تو خیر دین کے لیے کیا کرتا؟ اس طرح لڑتا جس طرح اس کے اجڈ اور جاہل بھتیجے اس سے لڑ رہے تھے؟ اس کے ساتھ مار کھانے کے لیے ہر اس جگہ جاتا جہاں خیر دین گیا تھا اور ذلیل ہو کر آیا تھا یا اس کا نام روشن کرتا اور نام روشن کرنے کے لیے خیر دین کو کسی مرد کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ کام تو چڑیا نے بھی کر لیا تھا...... خیر دین نے ساری عمر بس ایک خواب دیکھا تھا...... چڑیا کو ایک بہت بڑی ڈاکٹر بنانے کا خواب اور پھر اس گاؤں میں ایک اسپتال بنانے کا خواب......

گاؤں میں اس بار بھی اس کا استقبال مختلف طریقے سے ہوا تھا۔

☆☆☆

''شہر بانو اگر میں کبھی دوسری شادی کرنا چاہوں تو تم کیا کرو گی؟'' Emirates ائر لائنز میں بیٹھے ایک فلم دیکھتے ہوئے شہر بانو کو پتا نہیں کیوں شیر دل کا سوال یاد آیا تھا۔ وہ پچھلی رات کی بات تھی جب وہ اس سے عکس کے حوالے سے پوچھ رہی تھی اور بہت دیر خاموش رہنے کے بعد شیر دل نے یک دم اس سے پوچھا تھا۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کچھ بھوت مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہربانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین، شہربانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہربانو ماضی کی خوبصورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کلرک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے۔ عکس سے پہلا تعارف شیر دل کا پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیر دل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایبک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایبک کی ماں کو غصہ آتا ہے اور وہ ایبک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرنے پر تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شہربانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور ثمرین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور ثمرین کی ایک بیٹی ہوتی ہے جو مر جاتی ہے۔ ثمرین کو شہربانو جب شیر دل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایبک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میجک چیزیں دکھائے لیکن ایبک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلدل کا ٹائٹل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔ عکس، شیر دل کے گھر ڈنر پر آتی ہے تو اس کی ملاقات شہربانو سے ہوتی ہے۔ ڈی سی خیر دین کو نوکری سے نکال دیتا ہے اور اس کا ذمے دار چڑیا اپنے آپ کو سمجھتی ہے۔ خیر دین کی تھانے سے رہائی کے بعد خیر دین، چڑیا اور حلیمہ کو لے کر گاؤں چلا جاتا ہے۔ گاؤں میں جب سب کو خیر دین کی نوکری ختم ہونے کا پتا چلتا ہے تو ان کے رویے بدل جاتے ہیں۔ چڑیا کے اسکول کا نتیجہ جب خیر دین دیکھتا ہے تو سوچ میں پڑ جاتا ہے، باربی ڈول اپنی ممی کو بتاتی ہے کہ پاپا نے اسکول آکر سسٹر ایگنس سے چڑیا کو اسکول سے نکالنے کا کہا ہے۔ فاطمہ ایبک کو ڈیبیٹ کے لیے اسٹیج پر جاتا دیکھ کر نروس ہو جاتی ہے۔ فاطمہ کو دیکھ کر ایبک یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اسے پہلے کہاں دیکھ چکا ہے فاطمہ کے نروس ہونے سے نورین نے پہلی پوزیشن لی لیکن ٹرافی ایبک اور اکبر نے لی۔ ڈی سی کی بیوی اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کیوں چاہتا ہے کہ چڑیا اسکول چھوڑ دے، ڈی سی اپنا ٹرانسفر کرا لیتا ہے اور باربی ڈول کے اسکول اپنی بیوی کے ساتھ سرٹیفکیٹ لینے جاتا ہے۔ باربی ڈول اسکول سے جانے سے پہلے ایک بار چڑیا سے ملنا اور اس کو اپنے جانے کے بارے میں بتانا چاہتی ہے لیکن مل نہیں پاتی، خیر دین گاؤں سے جانے کا اور زمین بیچنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بھائی زمین اپنے نام کرا لیتے ہیں۔ خیر دین شہر واپس آتا ہے تو چڑیا کو واپس اسکول میں داخل کراتا ہے خیر دین نے ڈاکٹر فرخ کے شوہر کو فون کیا تو پتا چلا کہ فرخ کی ڈیتھ ہو گئی ہے لیکن عابد چڑیا کی فیس دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ شیر دل پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہربانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیر دل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ وہ پہلا سرکاری گھر تھا جو شہربانو کو خوش کر گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر میونسپلٹی کے اہلکار خیر دین کی ریڑھی کا سامان پھینک دیتے ہیں اور اسے اس علاقے میں ریڑھی لگانے سے منع کر دیتے ہیں۔ باربی ڈول اسکول کے آخری دن چڑیا سے ملنے اپنی ممی کے ساتھ جاتی ہے۔ شیر دل اور عکس لاہور میٹنگ اٹینڈ کرنے جاتے ہیں، مثال اور شہربانو بھی شیر دل کے ساتھ تھیں وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔ خیر دین حلیمہ کی دوبارہ شادی کر دیتا ہے اور وہ کویت چلی جاتی ہے۔ خیر دین مسز ایگنس کو سچائی بتا کر چڑیا کا ایڈمیشن دوبارہ کرا دیتا ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

اس آئینے نے کئی سال پہلے کی طرح آج بھی اس کی نظر کو خود سے ہٹنے نہیں دیا...... گزر جانے نہیں دیا۔ وہ آئینے کے سامنے رک گئی۔ وقت نے اس آئینے پر اپنے نشانات بڑھا دیے تھے۔ ہلکی سی بوسیدگی، چند داغ، کئی نئی لکیریں، آب و تاب کھوتی چمک، بجھی ہوئی رنگت۔ وقت نے ایسے ہی بہت سارے نشان اس کے اپنے وجود اور اس کے چہرے پر چھوڑے تھے جس کا عکس آئینے میں دیکھنے پر شناخت کرتے ہوئے اسے چند لمحے لگے تھے۔

وہ آئینے میں خود کو دن میں کئی بار دیکھتی تھی...... لیکن اس آئینے میں نظر آنے والا عکس اس نے کئی سال بعد دیکھا تھا۔

ایک نظر اس نے خود کو دیکھا پھر اپنے عقب میں نمودار ہونے والے مرد کو۔ آئینے میں دونوں کی نظریں لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے سے ملی تھیں پھر دونوں ہی نے ایک دوسرے سے آنکھیں چرا لی تھیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے سے اسی طرح آنکھیں چراتے ہوئے ہی پھر رہے تھے۔ آئینے میں ایک لمحے کے لیے جیسے ان کی زندگی جھلکی تھی۔ وہ زندگی جو

وہ ایک دوسرے کے ساتھ گزار رہے تھے...... کئی سال سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ...... اور ایک دوسرے سے کئی صدیوں کے فاصلے پر...... ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار...... اور اس محبت کو کائی کی طرح اپنے وجود سے نوچتے ہوئے۔

وہ اس کے پاس سے گزر کر کھلے ہوئے اندرونی دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر اس آئینے کو اور اس گھر کو دیکھا...... زندگی میں اس گھر سے زیادہ نفرت اسے کبھی کسی دوسری جگہ سے نہیں ہوئی تھی۔ نفرت شاید ایک بہت معمولی لفظ تھا اپنے ان احساسات کو بیان کرنے کے لیے جو وہ اس گھر کے لیے رکھتی تھی، وہاں کی ایک ایک چیز کے لیے رکھتی تھی، اگر کوئی اسے کبھی کہتا کہ دنیا میں وہ کون سی ایک جگہ ہے جسے وہ آگ لگا کر بھسم کر دینا چاہتی تھی تو وہ اس گھر کا نام دیتی...... اور اس تمام نفرت کے باوجود وہ وہاں آنے اور وہاں رہنے پر مجبور تھی کیونکہ وہ اس گھر کی ''ملکہ'' تھی۔

☆☆☆
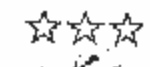
''ایک گھر میں صرف ایک ملکہ ہوتی ہے۔ بادشاہ کے محل میں ایک سے زیادہ ہوتی ہوں گی اور تم بادشاہ نہیں ہو۔'' شہربانو نے اطمینان سے شیر دل سے کہا۔

''تم imagine کرو۔'' شیر دل اس کی بات پر مسکرایا لیکن اس نے پھر بھی اپنے سوال کے جواب کے لیے اصرار کیا تھا۔

''تم اپنے گھر میں میری جگہ ایک اور عورت لے آؤ گے؟ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال کر کسی دوسری عورت کو شامل کر لو گے؟ یہ impossible ہے۔'' شہربانو نے اسی انداز میں کہا۔ شیر دل اسی انداز میں مسکرا دیا تھا۔ شہربانو اب بھی اس کے سینے پر بچوں کی طرح سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ شیر دل نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کے حصار کو توڑتے ہوئے ایک ہاتھ سے بہت نرمی سے اس کے بالوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

''ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔'' شہربانو نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد یک دم اس سے کہا۔ شیر دل ٹھٹکا۔

''کس بات کی؟'' اس نے شہربانو کے بالوں کو سمیٹنا جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مردوں کو بیویوں سے آخر یہ سوال کرنے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟'' شیر دل بے اختیار ہنسا تھا۔

''اپنے آپشنز چیک کرتے رہتا کوئی غلط بات تو نہیں۔'' اس نے برجستگی سے کہا۔

''مذاق نہیں کر رہی میں۔'' شہربانو سنجیدہ تھی۔ ''ویسے اگر تم شادی کرتے دوسری...... تو کس سے کرتے؟'' شہربانو کو پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

''Hmm......'' شیر دل نے بے اختیار گہری سانس لی۔

''interesting question'' وہ ایک لمحے کے لیے سوچنے لگا تھا یا کم از کم شہربانو کو لگا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ شیر دل کو اس سوال کا جواب سوچنے کی ضرورت تک نہیں تھی۔

''عکس سے؟'' شیر دل کے ذہن کی اسکرین پر اس کا چہرہ آیا اور شہربانو کی زبان پر اس کا نام۔

شیر دل اس عجیب اور بے وقت کی غیر متوقع ٹیلی پیتھی پر جیسے دم بخود ہوا تھا اور اس کی خاموشی نے شہربانو کو عجیب انداز میں مضطرب کیا تھا۔ شیر دل کے سینے پر سر ٹکائے اس نے یک دم چہرہ سیدھا کر لیا تھا۔ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز شیر دل جانتا تھا وہ کیا کرنے والی تھی۔

''That's quite a silly statement'' اس نے شہربانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''statement نہیں ہے it's just a wild guess۔'' شہربانو نے شیر دل کی آنکھوں اور چہرے کو پھر کسی مائیکرو اسکوپ کی طرح پڑھنے کی کوشش کی۔

''تم کو سونا نہیں ہے؟'' شیر دل نے اسی طرح اس کو موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی تھی جس طرح وہ ہمیشہ کرتا تھا

لیکن آج وہ ہمیشہ کی طرح کامیاب نہیں ہوا تھا۔
”تم بتاؤ نا۔“ شہر بانو نے اصرار کیا۔ وہ اب شیر دل کے سینے پر اپنی کہنیاں ٹکائے ہوئے تھی۔
”دنیا کے سمجھدار مرد ایک شادی کرتے ہیں...... بے وقوف دو کرتے ہیں...... اور خوش قسمت ایک بھی نہیں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔
”تم سمجھدار ہو لیکن خوش قسمت نہیں لیکن......“ شیر دل نے اس کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔
”یار میں نے بہت غلط سوال کر لیا تم سے...... چھوڑو اب اسے...... ہر مرد کو بڑی fantasy ہوتی ہے دوسری شادی کی...... اور کوئی بات نہیں۔“ شیر دل ایک بار پھر اسے الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
”تم ویسے عکس کو بہت پسند کرتے ہو؟“ شہر بانو نے اس کی کوشش پر پانی ڈالا۔
”کوئی بھی کر سکتا ہے۔“ شیر دل نے نظر ملائے بغیر وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
”کوئی بھی مرد۔“ شہر بانو نے جیسے اسے کچھ جتایا۔
”ہاں کوئی بھی مرد۔“ شیر دل نے اس کے اندازے اور مشاہدے کو جھٹلایا نہیں تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ شیر دل نے جیسے اس کی سوچوں کو پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب نہیں ہوا۔ وہ ایک عورت کی سوچ تھی۔ شہر بانو نے مزید بحث کیے بغیر اس کے سینے پر دوبارہ سر ٹکا دیا۔ شیر دل نے اس مائیکروسکوپ کے سامنے سے ہٹ جانے پر جیسے شکر ادا کیا تھا۔

جہاز کی سیٹ پر بیٹھے ایک فلم دیکھتے ہوئے پتا نہیں شہر بانو کو شیر دل اور اپنی یہ گفتگو کیوں یاد آئی تھی۔ کوئی خدشہ...... کوئی خوف...... کوئی سائرن نہیں بجا تھا۔ شیر دل پر اسے ایسا ہی اندھا اعتماد تھا۔ ان دونوں کو دور ہوئے صرف چند گھنٹے گزرے تھے۔ اور وہ ان تمام گھنٹوں میں شیر دل کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ کچھ کھا رہا ہوگا۔ شیر دل کی روٹین اس کی فنگر ٹپس پر تھی اور سیکڑوں میل دور اور ہزاروں فٹ کی بلندی پر بھی شیر دل جیسے اس کے سامنے چل پھر رہا تھا۔ وہ شادی کے اتنے سالوں بعد بھی شیر دل کے بارے میں جیسے جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادی تھی بالکل اسی طرح جیسے وہ شیر دل سے شادی سے پہلے اس کے بارے میں سوچتی تھی۔
”ممی، پاپا کہاں ہیں؟“ اس کی سوچوں کا تسلسل مثال کے سوال پر ٹوٹا تھا۔ اس کے برابر کی سیٹ پر وہ ابھی ابھی نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تھی اور اس نے آنکھیں کھولتے ہی شیر دل کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ شہر بانو نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہ مثال کی پرانی عادت تھی، وہ نیند سے جاگتے ہی سب سے پہلے شیر دل کو ڈھونڈتی تھی۔ یہ اس کی بھی عادت تھی، وہ بھی اپنے باپ کی زندگی میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلا سوال اپنے باپ کے بارے میں ہی کرتی تھی۔ مثال کو تھپکتے ہوئے اس نے پچھلے کئی گھنٹوں میں بلاشبہ کوئی دسویں بار مثال کو شیر دل کا مخل وقوع بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی اور یہ بھی کہ وہ ان کے ساتھ کیوں نہیں آ سکا۔
”Can you tell him that Misal is missing him?“ مثال نے اس کی بات سننے کے بعد یک دم اس سے کہا۔
”I would defnitely do that“ شہر بانو نے اسے مزید تھپکا۔
”Mummy is also missing him“ شہر بانو نے بھی اس کے ساتھ شیئرنگ کی۔
”لیکن آپ میرے جتنا تو miss نہیں کرتیں انہیں۔“ مثال نے فوراً اعتراض کیا۔ شہر بانو مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی مثال باپ کے بارے میں اسی طرح پوزیسو تھی جس طرح باپ اس کے بارے میں تھا۔
”ہاں تمہارے جتنا تو miss نہیں کرتی میں تمہارے پاپا کو۔“ شہر بانو نے جیسے اسے یقین دلایا۔ مثال بے اختیار کچھ مطمئن ہوگئی۔
”سو جاؤ۔“ شہر بانو نے اسے دوبارہ سلانے کے لیے سیٹ کی پشت سے ٹکایا۔ مثال نے مطمئن انداز میں اس کا

ہاتھ پکڑے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ شہر بانو اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ اب تک اس کی اور شیر دل کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا...... واحد اثاثہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوتا۔ چار سال سے وہ ان دونوں کی زندگی کو بانٹنے والا واحد ساتھی تھا...... لیکن اس سال وہ اپنی فیملی میں مزید اضافہ کرنے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ مثال کے بہن یا بھائی کے دنیا میں آنے کا اس سے زیادہ موزوں وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

عکس مراد علی کے لیے ٹی وی اسکرین پر بار بار گزرنے والے اس ticker کے چلنے کا اس سے زیادہ غیر موزوں، تکلیف دہ اور خطرناک وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ شیر دل کو بیڈ روم میں صوفے پر بیٹھے برق رفتاری سے ایک کے بعد ایک کال ملاتے اور متعلقہ افراد سے بات کرتے ہوئے بھی اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اور احساس تھا۔ رات کے پچھلے پہر بھی ٹی وی پر آنے والی ایک ایسی خبر کا حصہ ہونا ذاتی حیثیت میں جتنا تکلیف دہ تھا پروفیشنلی عکس کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹی وی اسکرین کے نیچے چلنے والے tickers میں سے صرف عکس مراد علی کے حوالے سے چلنے والی خبر غائب ہو گئی تھی...... لیکن شیر دل کو اندازہ تھا کہ تب تک بھی عکس کے لیے خفت اور رسوائی کا کافی سامان اکٹھا ہو چکا تھا۔
”Thank you“ شیر دل کی کال ریسیو کرتے ہی اس نے ہیلو کے بجائے اسے کہا۔
”جواد سے بات ہوئی ہے تمہاری؟“ شیر دل نے اس کے Thank you کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں...... فون بند ہے اس کا۔“ شیر دل کو اس کی آواز تھکی ہوئی اور بھاری محسوس ہوئی۔ وہ اگلا سوال کرتے کرتے ٹھٹک گیا۔ پتا نہیں اسے کیوں یہ احساس ہوا کہ وہ شاید روئی تھی...... یا پھر رو رہی تھی۔
”تم تو ٹھیک ہو؟“ شیر دل بے اختیار ٹینس ہوا تھا۔
”ہاں۔“ وہ کوئی سوال کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا۔
”تم اب سو جاؤ۔“ اس نے بے اختیار عکس سے کہا۔
”اوکے۔“ وہ جیسے خود بھی اس وقت بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دینے کے بعد دوبارہ سونے کے لیے بستر پر لیٹ جانے کے بعد بھی شیر دل دوبارہ نہیں سو سکا۔ اسے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ فجر کے قریب وہ بالآخر نہیں رہ سکا۔ اس نے سیل فون پر اسے میسج کیا۔ ”awake?“ چند سیکنڈ کے بعد اس کے سیل پر ایک blank message آیا۔ ایک گہری سانس لے کر شیر دل نے اسے کال کی۔
”پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہونے والا اور نہ ہی ساری رات اس طرح بیٹھے رہنے سے یہ پریشانی ختم ہوگی۔“ عکس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کی اور شیر دل نے بغیر کسی ہیلو ہائے کے اس سے کہا۔
”جواد کے والد سے کچھ دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔“ عکس نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔
”پھر؟“ شیر دل ٹھٹکا۔
”وہ کہہ رہے ہیں ان کے political career کو نقصان پہنچانے کے لیے سازش کی گئی ہے۔ جواد نہ تو شراب پیے ہوئے تھا نہ ہی اس کی گاڑی میں شراب تھی۔ وہ کسی دوست سے ملنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپسی پر دیر ہو گئی اور کسی نے میڈیا اور پولیس کے ذریعے اسے trap کرنے کے لیے انتظام کیا ہوا تھا اور......“ شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔
”تم نے ان سے کیا کہا؟“ وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر شیر دل نے اس کی تھکی ہوئی آواز سنی۔
”کچھ نہیں، میں انہیں کیا کہتی؟ لیکن ہو سکتا ہے یہ سب سچ ہو...... آج کل یہی سب کچھ تو ہو رہا ہے۔“ شیر دل نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔
”تم بے وقوف ہو یا بننا چاہ رہی ہو؟“ بہت دیر تک دوسری طرف خاموشی رہی پھر شیر دل نے اسے کہتے سنا۔

"بتانا چاہ رہی ہوں۔" اس بار شیر دل کچھ بول نہیں سکا تھا۔

"سلیپنگ پلز ہیں؟" کچھ دیر بعد شیر دل نے بالآخر کہا۔

"ہاں۔" دوسری طرف سے عکس نے کہا۔

"کھا کر سو جاؤ۔" اپنے وال کلاک پر ایک نظر ڈالتے ہوئے شیر دل نے اس سے کہا۔

"اوکے۔" عکس نے ایک بار پھر ہتھیار ڈالے۔

"ایک کھانا پوری بوتل مت کھا لینا۔" شیر دل اس صورتِ حال میں بھی کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ہنس پڑی تھی۔ شیر دل نے اس کی ایسی شکست خوردہ ہنسی پہلے نہیں سنی تھی۔ وہ ایک بار پھر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"عکس تم اب صرف سوؤ گی...... تم نے سنا۔" اس نے بالآخر بڑے تحکمانہ انداز میں اس سے کہا۔ "میں کل آ کر ملتا ہوں تم سے۔" عکس کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ ایک بار پھر سونے کے لیے لیٹ گیا تھا لیکن نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اتنے سالوں سے عکس کو اتنے قریب سے جاننے کے باوجود اس نے کبھی اسے اس طرح اداس اور اپ سیٹ نہیں دیکھا تھا جس طرح اس نے فون پر کچھ دیر پہلے بات کرتے ہوئے اسے محسوس کیا تھا اور شیر دل کو اس چیز نے پریشان کیا تھا۔ عکس اور اس ساری صورتِ حال کے بارے میں سوچتے سوچتے اسے بالآخر نیند آ گئی تھی۔

اگلی صبح وہ بہت دیر سے جاگا تھا اور بڑی ہڑبڑاہٹ اور عجلت کے عالم میں آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس نے اپنے فون پر عکس کا میسج دیکھا۔

"I am alright" اسکرین پر چمکتے ہوئے اس چھوٹے سے ٹیکسٹ میسج کو شیر دل بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ ایک چھوٹے سے جملے نے اسے پتا نہیں کیا کیا یاد کروا دیا تھا۔ اس کے اور عکس کے درمیان دوستی کا آغاز اسی ایک جملے سے ہوا تھا۔

"No matter how hard you have been hit, you are always alright." اس نے عکس کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ جواب بہت دیر تک نہیں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ ریفرنس بوجھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ریفرنس واقعی بوجھ گئی تھی۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا ان دونوں کے درمیان کہ وہ ایک دوسرے کا ریفرنس نہ سمجھ پائے ہوں۔ اشارے کنایوں میں کی جانے والی بات کو بھی سیکنڈز میں ڈی کوڈ کرتے تھے اور یہ تب بھی تھا جب وہ دونوں اکیڈمی میں ایک دوسرے سے رسمی علیک سلیک ہی رکھتے تھے۔

عکس نے ہاتھ میں پکڑا اسیل فون واپس ٹیبل پر رکھ کر پرائیویٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے وفد کے اس نمائندے کی بات پر توجہ دینے کی کوشش کی جو اس کے سامنے اس کے آفس میں بیٹھا ایک کے بعد ایک مطالبہ اس فہرست میں سے پڑھ کر پیش کر رہا تھا جس کی ایک کاپی اس کے سامنے میز پر بھی پڑی ہوئی تھی اور جس پر موجود 25 کے 25 مطالبات اسے زبانی یاد تھے۔ اس کے باوجود وہ میکانکی انداز میں بظاہر بے حد دلچسپی کے ساتھ لیکن سنجیدہ ان مطالبات کو سن رہی تھی۔ پچھلی ساری رات جاگتے رہنے کے بعد وہ صبح صرف دو گھنٹے کی نیند لینے کے بعد اپنے مقررہ وقت پر آفس میں تھی اور صبح سے ایک کے بعد ایک اپائنٹمنٹ بھگتاتے ہوئے...... وہ ذہنی طور پر اب بھی پچھلی رات میں پھنسی ہوئی تھی...... اور اس ذہنی حالت کے ساتھ شیر دل کی طرف سے ملنے والا وہ ٹیکسٹ...... دائیں ہاتھ سے وقفے وقفے سے سامنے پڑے ایک کاغذ پر نوٹس لیتے ہوئے وہ اس نمائندے کی بات سن رہی تھی۔ کاغذ پر وہ پوائنٹس نوٹ کر رہی تھی جن پر اسے اس نمائندے کے خاموش ہونے کے بعد بات کرنی تھی اور سوچ وہ شیر دل کے بارے میں رہی تھی۔ شیر دل، جواد غنی حمید اور بہت سے دوسرے چہرے...... سارے چہرے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے...... سوائے ایک چہرے کے۔

☆☆☆

"میرا نام ایبک ہے۔" فاطمہ چند لمحوں کے لیے فریز ہو گئی تھی۔ کنگ ایڈورڈ میں یہ اس کا پانچواں دن تھا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ اس دن پہلی بار کالج آیا تھا...... یا پھر...... وہ اپنے آپ میں اتنی مگن تھی کہ اس نے ایبک کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا اور نوٹس تب کیا تھا جب وہ کاریڈور میں آ کر اس کے بالمقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ فاطمہ اگر ہل نہیں سکی تھی تو غیر معمولی نہیں تھا۔ یہ ایک نام ایسا تھا اس کی زندگی میں جو کبھی بھی کہیں بھی اسے اسی طرح نروس...... اسی طرح فریز کر سکتا تھا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ فاطمہ نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس نے مسکرانے کی بھی کوشش کی۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں اس کے بالمقابل کھڑا تھا۔

"میں نے آپ کو پریشان کر دیا شاید؟" وہ اب معذرت کر رہا تھا۔ فاطمہ کو جیسے ذرا سی شرمندگی ہوئی۔ اس کی ذہنی کیفیت اس کے چہرے پر کیوں آ گئی تھی۔

"نہیں تو۔" اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

وہ اب اپنا تفصیلی تعارف دے رہا تھا۔ فاطمہ کو حیرت ہوئی وہ اس کی طرف متوجہ کیوں ہوا تھا۔ پوری کلاس میں اسے تعارف کے لیے ایک ہی لڑکی ملی تھی یا وہ ہر لڑکی سے اسی بے تکلفی کے ساتھ بات کر لیتا تھا...... وہ فی الحال اندازہ نہیں کر سکتی تھی لیکن اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اس کا تفصیلی تعارف سنا۔

وہ ایبک سلطان کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات تھی اور کالج سے ہاسٹل تک ایبک اس کے سر پر سوار رہا تھا...... اور اس کی وجہ اسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی۔

ایبک سلطان فاطمہ کی پہلی محبت تھی۔ پہلی محبت...... پہلی غلطی...... پہلا تجربہ...... پہلا زخم...... بہت سارے سبق تھے جو اس پہلے تجربے نے اسے دیے تھے جو اس نے محبت کے نام پر کیا تھا...... یا شاید اسے ہوا تھا۔

لاہور آنے کے بعد وہ کسی لڑکے کے ساتھ پہلی بار انوالو ہوئی تھی...... لیکن اس انوالومنٹ کا آغاز اس کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ یہ ایبک تھا جو خود اس کی طرف بڑھا تھا۔ کلاس کی تمام لڑکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے...... اسے خوشی سے پھولنا چاہیے تھا...... کچھ غرور آنا چاہیے تھا...... ساتویں آسمان پر پہنچ جانا چاہیے تھا...... زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکا اس میں اس طرح کی دلچسپی دکھا رہا تھا لیکن اس کے برعکس وہ بہت عجیب سی فیلنگز کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے اتنے سال اکیلے محتاط اور ہر ایک سے دور رہ کر اپنے خول میں زندگی گزاری تھی کہ کنیرڈ کے دو سالوں نے بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ صرف جسمانی طور پر ہاسٹل اور کالج کی لڑکیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگی تھی لیکن ذہنی طور پر وہ اب بھی ان سے بہت دور تھی۔

وہ خول جو بچپن کے اس حادثے نے اس کے گرد بنا دیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط اور سخت ہوتا گیا تھا اور فاطمہ نے ہمیشہ خود کو اس خول کے اندر بے حد محفوظ تصور کیا تھا تنہا نہیں۔

ایبک سلطان کی آمد نے پہلی بار اس خول پر ضرب لگا کر دراڑیں ڈالی تھیں۔ وہ کالج میں اس کی طرف کیوں متوجہ ہوا تھا؟ اس کی اس غیر معمولی توجہ کا مقصد کیا تھا...... ان دو سوالوں سے زیادہ پریشان کن سوال فاطمہ کے لیے یہ تھا کہ وہ ایبک کی توجہ کو resist کیوں نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ ایک لاابالی، کھلنڈرا، ہنس مکھ، بے پروا لڑکا تھا اور فاطمہ ہر چیز میں اس کے برعکس تھی۔ اس کے باوجود ایبک کا اسی کی طرف متوجہ ہونا اور فاطمہ کا چاہنے کے باوجود اس احتیاط کا مظاہرہ نہ کر پانا جو اس کی زندگی کا حصہ تھی...... فاطمہ کے لیے عجیب سہی لیکن اس کی زندگی میں آنے والی ایک بے حد خوشگوار تبدیلی تھی۔ ایبک کی امی اسی میڈیکل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ وہ ایک انتہائی دوستانہ مزاج رکھنے والی بے حد نفیس سی خاتون تھیں۔ ایبک سے بھی ملنے سے پہلے فاطمہ ان سے مل چکی تھی۔ وہ ان لوگوں کی ایک کلاس لیتی تھیں اور ان چند ٹیچرز میں سے ایک تھیں جنہیں اسٹوڈنٹس بہت پسند کرتے تھے۔ ایبک اور اس کی دوستی چند ہفتوں میں ہی ان کے نوٹس میں آ گئی تھی۔ فاطمہ کو کچھ تحفظات تھے ان کے ردعمل کے حوالے سے...... لیکن اس کی توقعات کے برعکس مسز سلطان کا رویہ اس کے ساتھ بہت دوستانہ اور حوصلہ افزا تھا۔ وہ ایبک کے ساتھ اکثر اوقات ان کے آفس چلی جایا کرتی تھی اور

اس آمد و رفت نے جیسے ایک روٹین کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ایبک کے والد کی چند سال پہلے ڈیتھ ہوچکی تھی۔ ایک چھوٹا بھائی اور بہن تھی۔ فاطمہ کو اپنی اور ایبک کی زندگی میں عجیب مماثلت نظر آرہی تھی۔ اس کی فیملی کے ساتھ اسے ایک عجیب سی اپنائیت اور مانوسیت کا احساس ہوا تھا اسے۔ وہ خیر دین سے ایبک اور اس کی فیملی کا ذکر کرنا چاہتی تھی لیکن ایک عجیب سی جھجک ہر بار مانع آجاتی تھی۔ خیر دین سے اس قدر قربت اور بے تکلفی ہونے کے باوجود اسے یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ خیر دین کے سامنے ایبک کا ذکر کیسے کرے...... کیا حوالہ دے...... دوست کہے؟ تو دوستی کی کیا توجیہہ پیش کرے۔ وہ اگر گھر پر رہ رہی ہوتی تو خیر دین سے ایبک کو چھپانا بہت مشکل ہوجاتا...... کیونکہ وہ اس کی گفتگو میں آتا تھا...... لیکن خوش قسمتی سے وہ ہاسٹل میں رہتی تھی اور ہاسٹل میں رہتے ہوئے ایبک کو خیر دین سے چھپالینا آسان تھا...... اور یہ فاطمہ کی خوش فہمی تھی۔

خیر دین زمانہ شناس انسان تھا۔ فاطمہ کو اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح جانتا تھا۔ اس میں آنے والی کوئی بھی تبدیلی نوٹس کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ جب بھی ہاسٹل سے واپس گھر آتی تو واپس جانے کے لیے بے حد بے قرار رہتی اور بے چین رہتی تھی۔ خیر دین نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کیا...... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ وہم نہیں تھا اور اب اسے بار بار وہم ہو رہے تھے۔ فاطمہ ہمیشہ سے خوش لباس تھی یہ عادت اس نے خیر دین سے لی تھی۔ اچھا، صاف ستھرا اور زمانے کے رواج کے مطابق لباس لیکن اب یک دم فاطمہ ضرورت سے زیادہ اور خلاف عادت اپنے آپ پر توجہ دیتی نظر آتی تھی۔ اسے یک دم کاسمیٹکس اور جیولری میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی...... اور وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ خیر دین بار بار خود کو بھی یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ چڑیا جوان ہوچکی تھی ڈاکٹر بن رہی تھی، بڑے شہر میں تھی...... ہر طرح کے لوگوں سے میل ملاپ تھا اس کا، اس کو خود پر توجہ دینی ہی چاہیے تھی...... لیکن بار بار کچھ نہ کچھ کھٹکتا تھا اسے چڑیا سے اپنے ان واہموں کے حوالے سے کوئی سوال خیر دین کے لیے بہت مشکل تھا لیکن ان چیزوں کو بھی ہضم کرنا آسان نہیں تھا جو وہ دیکھ رہا تھا اگر اطمینان اسے تھا تو صرف یہ تھا کہ چڑیا بھٹک نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ خیر دین کا سر جھکا دینے والا کوئی کام نہیں کرسکتی تھی اور اس یقین اور اعتماد نے خیر دین کی نیندیں کبھی اڑنے نہیں دیں۔

ایبک سلطان خیر دین سے بہت دیر چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ ایک بار چھٹیوں میں گھر آنے پر کسی بات پر غیر محسوس طور پر فاطمہ نے خیر دین کے سامنے اس کا نام لیا۔ خیر دین نے اس کی زبان سے کسی لڑکے کا نام پہلی بار نہیں سنا تھا۔ وہ کو ایجوکیشن میں پڑھتی تھی اور اب پھر کو ایجوکیشن میں ہی پڑھ رہی تھی۔ کسی لڑکے کا ذکر آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن جس طرح چڑیا ایبک کا نام لیتی تھی وہ غیر معمولی تھا...... اور خیر دین اسے جتائے بغیر بغور یہ نوٹس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ ایبک کا ذکر کتنے تواتر سے اس کی گفتگو کا حصہ بن رہا تھا اور جب خیر دین کو یقین ہوگیا کہ اب ایبک کے بارے میں اس کا کوئی سوال چڑیا کو بوکھلائے گا نہیں تو اس نے چڑیا سے ایبک کے بارے میں پوچھ ہی لیا تھا۔ فاطمہ خیر دین کے سوال پر چند لمحوں کے لیے کنفیوزڈ انداز میں نانا کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین خود اس کے کسی کلاس فیلو کے بارے میں سوال کر رہا تھا اور وہ بھی ایبک کے بارے میں...... ورنہ اس سے پہلے وہ خود ہی خیر دین کو کسی کلاس فیلو کے بارے میں بتاتی تو بتاتی خیر دین خود کبھی کسی کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔

"کلاس فیلو ہے میرا۔" فاطمہ نے بظاہر لہجہ نارمل رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے خیر دین سے کہا تھا لیکن غیر ارادی طور پر اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ خیر دین کی نظر سے وہ رنگت کی تبدیلی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ اپنا لہجہ نارمل رکھتے ہوئے ایبک کے بارے میں تمام معلومات لیتا گیا تھا اور جب وہ سوال جواب ختم ہوئے تو خیر دین بھی چڑیا کی طرح بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ اس نے چڑیا سے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ اب وہ ان کے مستقبل اور اس کی شادی کے حوالے سے سوچتا اور فکر مند ہوتا رہتا تھا۔ حلیمہ سے اس سلسلے میں اس کی اکثر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اوپر تلے دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد اس کا پاکستان آنا جانا کچھ کم ہوگیا تھا لیکن فون پر وہ اب بھی بہت باقاعدگی سے خیر دین اور چڑیا کے ساتھ رابطے میں تھی۔

حلیمہ اور اس کے شوہر نے وقتاً فوقتاً خیر دین کو فاطمہ کے لیے کویت میں ہی اپنے کچھ جاننے والوں میں کچھ رشتے بتائے تھے لیکن خیر دین کا دل کسی بھی رشتے پر نہیں جما تھا۔ وہ سب مناسب رشتے تھے۔ اس کے فیملی بیک گراؤنڈ اور سوشل اسٹیٹس کے اعتبار سے بہت مناسب رشتے...... کویت یا پاکستان میں بزنس یا دوسرے کسی پروفیشن میں سیٹلڈ مرد...... حلیمہ اور اختر کے توسط سے آنے والے رشتے شریف خاندان کے بھی تھے۔ خیر دین کو ان کی بہت زیادہ چھان پھٹک کی بھی ضرورت نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں خیر دین کو کبھی بھی کوئی رشتہ فاطمہ کے جوڑ کا نہیں لگتا تھا۔ چڑیا، خیر دین کے لیے اس قدر قیمتی تھی کہ اس کے لیے کسی کو بھی چڑیا کے برابر کا سمجھنا بھی مشکل تھا اور اب چڑیا خود کسی کو پسند کررہی تھی اور غیر محسوس طور پر خیر دین بے حد مطمئن تھا۔ وہ چڑیا کی پسند تھی اور خیر دین کو یقین تھا کہ ایبک سلطان کوئی عام اور معمولی مرد نہیں ہوسکتا تھا۔

"اگلی بار میں تم سے ملنے لاہور آؤں گا تو ایبک سے ملوں گا۔" خیر دین نے فاطمہ سے کہا۔ وہ خیر دین کی بات پر کچھ مطمئن سے انداز میں مسکرائی تھی کہ جو چیز وہ چاہتی تھی لیکن خیر دین سے کہہ نہیں پائی تھی وہ خیر دین نے خود کہہ دی تھی۔

خیر دین چند ہفتوں کے بعد اس کے میڈیکل کے دوسرے سال میں پہلی بار ایبک سے ملا اور چڑیا کی طرح اسے بھی ایبک پہلی نظر میں ہی پسند آگیا تھا۔ وہ چڑیا کے لیے خود لڑکا ڈھونڈنے نکلتا تو ایبک جیسے خاندان کا کوئی لڑکا نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس دن لاہور سے واپسی پر خیر دین بے انتہا مسرور تھا اور ایسی ہی سرشار فاطمہ بھی تھی۔ خیر دین کی ایبک کے بارے میں رائے اس کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی اور خیر دین کی پسندیدگی کا مطلب تھا کہ وہ ایبک کے حوالے سے جو خواب دیکھ رہی تھی ان میں کم از کم خیر دین کی طرف سے کوئی رکاوٹ ڈالے جانے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔

ایبک اور فاطمہ کی دوستی چار سالوں میں دوستی سے محبت میں تبدیل نہیں ہوئی تھی بلکہ ان دونوں کے تعارف کے بعد چند مہینوں میں ہی دوستی نام کی چیز نہیں رہی تھی۔ ایک دوسرے سے فارمل طریقے سے محبت کے اقرار اور شادی کے وعدے نہ ہونے کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے سے کمیٹڈ تھے...... ایک دوسرے کے دلی جذبات سے مکمل واقفیت رکھتے تھے اور مستقبل کو اکثر پلان کرتے رہتے تھے۔ ایبک بہت لائق ہونے کے باوجود بہت بے پروا تھا اور یہ وہ خامی تھی جو فاطمہ میں بالکل نہیں تھی۔ میڈیکل کے چار سالوں میں فاطمہ ہر prof ٹاپ کرتی رہی تھی لیکن اپنی اسٹڈیز سے زیادہ اس کا دھیان ایبک پر رہتا تھا۔ وہ اس کے نوٹس اور اسائمنٹس پورے کرنے اور رکھنے کی تگ و دو میں ہلکان ہوتی رہتی۔ اسے ٹیسٹ اور ایگزامز کے لیے اسٹڈی کرنے کے لیے focussed ہونے کی تلقین کر کر کے جان مارتی اور جب اس کا اثر نہ ہوتا تو خود اس کے ساتھ پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتی۔ ایبک اس بات کا برملا اظہار کرتا تھا کہ اگر اس کی دوستی فاطمہ سے نہ ہوتی تو وہ ٹاپ ٹین اسٹوڈنٹس کی لسٹ میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میڈیکل کالج میں اس کی اچھی پرفارمنس کا سہرا بلاشبہ فاطمہ کے سر تھا۔

وہ چار سال فاطمہ کی زندگی کے بہترین سالوں میں سے تھے۔ زندگی یک دم ہی بہت خوب صورت ہوگئی تھی اس کے لیے...... وہ سارے رنگ جو اس نے بہت پہلے چیزوں میں بھرنے ختم کردیے تھے۔ وہ ان رنگوں کو جیسے نئے سرے سے تلاش کرنے لگی تھی۔ وہ دونوں اپنے پروفیشن کے حوالے سے اپنے goals کو ڈسکس کرتے...... اسپیشلائزیشن کے حوالے سے اپنے پلانز ایک دوسرے کو بتاتے رہتے...... مل کر ایک اسپتال بنانے کے منصوبے بناتے رہتے اور اس اسپتال میں جدید ترین مشینری نصب کرنے کے لیے فنڈز generate کرنے کے لیے ذرائع ڈھونڈتے پھرتے۔ ایبک مالی حیثیت سے بھی بہت مستحکم بیک گراؤنڈ رکھتا تھا۔ باپ کی وفات ہونے کے باوجود اس کی ماں کو اس کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایسے کسی مسئلے کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ ایبک کے لیے کسی اسپتال کا قیام کوئی مشکل بات نہیں تھی جبکہ فاطمہ کے لیے اکیلا ایسا کوئی خواب دیکھنا ناممکنات میں سے تھا۔

میڈیکل کے پانچویں سال حلیمہ کے پاکستان آنے پر پہلی بار حلیمہ اور خیر دین نے بہت سنجیدگی سے ایبک اور فاطمہ کے رشتے کے بارے میں سوچنا شروع کیا تھا اور یہی پہلا موقع تھا جب فاطمہ نے باقاعدہ طور پر ایبک سے اپنے گھر رشتے کے لیے کسی کو بھیجنے کی بات کی تھی اور ایبک کے جواب نے اسے جھونچکا کردیا تھا۔

☆☆☆

"تمہیں پتا نہیں تھا کہ جواد ڈرنک کرتا ہے؟" شیر دل نے عکس سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے شہر پہنچا تھا اور اب وہ دونوں عکس کے آفس میں بیٹھے تھے۔

"دو سال سے جان پہچان تھی تم دونوں کی..... پتا ہونا چاہیے تھا تمہیں۔" شیر دل نے چمچ کے گرد ٹی بیگ کے دھاگے کو لپیٹتے ہوئے اس کو نچوڑ کر کپ سے نکالتے ہوئے کہا۔ عکس کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ سوال شرمندہ کرنے کے لیے نہیں تھا لیکن اسے شرمندہ کر گیا تھا۔ شیر دل اب چائے کا سپ لیتے ہوئے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اس سے پوچھا تھا ایک آدھ بار..... اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ ڈرنک وغیرہ نہیں کرتا..... سگریٹ تک نہیں پیتا..... اکثر وہ شراب کے خلاف بات بھی کرتا تھا..... میرے لیے یہ یقین کرنا ناممکن تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ یہ تو اب بھی نہیں مان رہا کہ وہ شراب پیتا ہوا پکڑا گیا ہے..... اپنے فادر کی طرح اس نے بھی مجھے یہی کہا ہے کہ میڈیا ٹرائل کیا گیا ہے اس کا کیونکہ اگلے الیکشنز میں اس کی فیملی اسے صوبائی اسمبلی کے امیدوار کے طور پر سامنے لانا چاہتی تھی۔" عکس نے بالآخر گہری سانس لیتے ہوئے چائے میں سے ٹی بیگ نکال کر رکھ دیا۔

"جواد سے کب بات ہوئی ہے تمہاری؟" شیر دل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آج صبح..... اس کی bail ہو گئی تھی کل رات ہی لیکن مجھ سے بات نہیں ہو سکی اس کی..... کہہ رہا تھا طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے مجھ سے خود بات نہیں کر سکا۔" عکس اب کچھ سوچتے ہوئے چائے کے سپ لے رہی تھی۔ "میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے اپنی منگیتر کے طور پر میرا نام کیوں لیا؟ اس نے کہا اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میڈیا نے خود ہی یہ خبر ڈھونڈ نکالی اور چلا دی ورنہ اس کی فیملی کہاں اپنی عورتوں کا نام اس طرح ٹی وی اسکرین پر دیکھتی اور خوش ہوتی ہے۔" شیر دل نے چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔

"تم کو اس کی باتوں پر یقین آ گیا؟" عکس نے نظریں اٹھا کر شیر دل کو دیکھا۔

"میرے پاس یقین کرنے کا آپشن نہیں ہے..... کم از کم اس اسٹیج پر۔" اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"عکس اس نے پولیس اسٹیشن میں خود تمہارا نام لیا تھا..... ایک بار نہیں بار بار..... وہ پولیس کو پہلے اپنے باپ کا نام لے کر دھمکا رہا تھا بعد میں تمہارا نام لے کر..... ایف آئی آر میں پولیس نے یہ بھی لکھا ہے..... مجھے اگر جواد کی کسی چیز پر اعتراض ہے تو وہ یہی ہے..... کچھ بھی ہوتا اسے اس سارے معاملے میں تمہارا نام نہیں لانا چاہیے تھا..... اس میں اتنی بہادری اور غیرت ضرور ہونی چاہیے تھی کہ وہ تمہارے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے تمہاری عزت کا خیال کر لیتا..... That's the only point that bothered me. ورنہ مجھے اس کے ڈرنک کرنے یا کسی عورت کے ساتھ بھی پکڑے جانے پر کوئی اعتراض نہیں..... اور وہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ ڈرنک نہیں کرتا..... وہ نشے میں بالکل آؤٹ تھا جس وقت پولیس نے اس کی گاڑی کو روکا تھا۔ پولیس والوں نے تو انسانی ہمدردی اور اس کی جان کی تحفظ کے لیے اسے روکا تھا کہ کہیں گاڑی مار نہ دے..... ورنہ اس سے ابتدائی بات چیت میں اس کا فیملی بیک گراؤنڈ جاننے کے بعد انہیں کوئی شوق نہیں تھا اس پر کوئی ایف آئی آر وغیرہ رجسٹر کرنے کی کوشش کر کے اپنا منہ کالا کرنے کا..... وہ بے چارے تو اس کے گھر والوں کو اطلاع دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کو آ کر لے جائیں لیکن ان موصوف نے نشے کی حالت میں وہاں سڑک پر ہی اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ آس پاس سے گزرنے والوں میں سے کسی نے کسی چینل کو اطلاع کر دی اور میڈیا کے وہاں پہنچنے کے بعد پولیس کو مجبوراً اس کے خلاف ایف آئی آر رجسٹر کرنی پڑی۔" شیر دل اسے بے حد سنجیدگی سے واقعے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

"اور تم سے کل رات کو بات نہ کرنے کی وجہ طبیعت کی خرابی سے زیادہ نشے کی وجہ سے بات کرنے کے قابل نہ ہونا ہو گا..... لیکن خیر مسئلہ تو حل ہو گیا ہے اب..... اور ہو ہی جانا تھا اتنی پہنچ تو تمہارے سسرال والوں کی ہے ہی کہ اتنی چھوٹی سی بات پر پکڑے جانے پر اپنے بیٹے کو رات بھی پولیس اسٹیشن میں گزارنے دیتے۔" شیر دل نے چائے کا کپ دوبارہ اٹھا لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ عکس کچھ کہتی شیر دل کے سیل فون پر کوئی کال آنے لگی تھی۔ چائے کا کپ واپس رکھتے ہوئے شیر دل

نے بے حد برق رفتاری سے فون اٹھایا تھا اور فون پر ایک نظر ڈالتے ہی عکس نے اس کے چہرے پر اطمینان بھری ایک مسکراہٹ پھیلتے دیکھی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا اس مسکراہٹ میں کہ عکس شیر دل کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔ وہ اب فون پر شہر بانو سے بات کر رہا تھا۔

"تم نیویارک پہنچ گئیں؟"

"ہاں ابھی سامان وغیرہ لینا ہے ہم لوگوں کو....." شہر بانو کی آواز تھکی ہوئی تھی۔

"اگلی فلائٹ کا پتا کیا؟" شیر دل نے اس سے پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں سامان وغیرہ لینے کے لیے کھڑے ہیں فی الحال تو..... ویسے بھی اگلی فلائٹ میں چار پانچ گھنٹے ہیں ابھی اور میں اتنی تھک چکی ہوں کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی..... تمہیں ساتھ آنا چاہیے تھا شیر دل۔" شہر بانو نے شکایت کی۔ شیر دل نے مسکراتے ہوئے اس کو بہلانے والے انداز میں کہا۔

"I know yaar..... میں پہلے ہی بہت مس کر رہا ہوں کل رات سے تم دونوں کو....."

"مس تو تمہاری بیٹی کر رہی ہے تمہیں..... میری جان کھا لی ہے اس نے پورے راستے میں بار بار تمہارا پوچھ کر..... اب تم بات کرو اس سے۔" شہر بانو نے مثال کو دیکھتے ہوئے فون کو بالآخر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ جو شیر دل کا نام لیے جانے پر بے حد impatient ہو رہی تھی۔ اس کی آواز فون پر سنائی دیتے ہی شیر دل کو جیسے کچھ دیر کے لیے واقعی یہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ عکس مدھم مسکراہٹ کے ساتھ فون پر مثال کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو سنتی رہی۔ ایک عجیب سا رشک آیا تھا اسے شہر بانو اور مثال پر اور شیر دل پر..... وہ ایک پرفیکٹ تکون تھی..... ایک مکمل خوب صورت فیملی..... جس پر کسی کو بھی رشک آ سکتا تھا۔

"بیٹا ممی کو بالکل تنگ نہیں کرنا اب تم نے..... ممی کا خیال رکھنا ہے۔" شیر دل اب الوداعی کلمات کہہ رہا تھا مثال سے اور اس سے ایک کے بعد ایک وعدہ لے رہا تھا۔

"ممی کو فون دو۔" اس نے مثال کو آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"شیر دل تم بیٹی سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ مجھے بھول جاتے ہو۔" شہر بانو نے فون پکڑتے ہی کچھ خفگی سے اس سے کہا اور اس کا یہ شکوہ غلط نہیں تھا۔ شیر دل ہنس پڑا تھا۔

"میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں سویٹ ہارٹ؟" عکس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے چند لمحوں کے لیے شیر دل سے نظر ہٹائی تھی اور بالکل اس لمحے شیر دل کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کہاں تھا۔ شہر بانو کو اگلی فلائٹ کے حوالے سے کچھ ہدایات دیتے ہوئے اس نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے فون بند کیا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں عکس سے کہا۔

"سوری یار..... بس وہ دونوں نیویارک پہنچ گئی ہیں۔ شہر بانو پہلی بار مثال کے ساتھ اکیلے اتنا لمبا سفر کر رہی ہے اس لیے میں تھوڑا بے چین ہوں۔" عکس نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"میں نے کچھ کہا؟"

"نہیں تم نے کہا تو نہیں..... لیکن میں پھر بھی سوچ رہا تھا کہ کچھ زیادہ ہی لمبی بات ہو گئی ان لوگوں کے ساتھ میری۔" وہ سیل فون واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم کیا سوچ رہی ہو.....؟" شیر دل کو اچانک خیال آیا جیسے وہ کسی سوچ میں گم تھی۔

"شہر بانو اور مثال پر رشک آ رہا تھا مجھے۔" عکس نے اپنی فیلنگز کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے شیر دل حیران ہوا۔ عکس سے ایسا جملہ آنا بے حد غیر متوقع تھا۔

"اچھا؟ اور کس لیے؟" وہ پہلے استعجابی انداز میں ذرا سا ہنسا پھر اس نے کہا۔

"تم بہت اچھے شوہر اور باپ ہو شیر دل۔" عکس نے مسکراتے ہوئے اسے compliment دیا۔ شیر دل ہنس

پڑا تھا۔ اسے واقعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس تعریف کے جواب میں وہ کیا کہے۔
”پتا نہیں...... کوشش کرتا ہوں...... شہربانو بہت اچھی ہے۔“ اس نے کچھ بے ربط سے انداز میں کہا۔
”جانتی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔
”ہاں تم سے زیادہ تو کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ تمہارا ہی تو انتخاب تھی وہ۔“ شیر دل نے مسکرا کر جیسے اسے کچھ یاد دلایا تھا۔ عکس مسکرا دی۔
”انتخاب غلط تھا کیا؟“
”میں نے کب کہا؟ ہم کیا بات کر رہے تھے؟“ شیر دل نے اس کی بات پر تبصرہ کیا اور پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کہ عکس کچھ کہتی آفس کا دروازہ کھول کر ایک دراز قد آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ شیر دل اور عکس دونوں بے اختیار چونکے تھے۔ شیر دل نے ماتھے پر کچھ بل لیے اس آدمی کو دیکھا...... اس کا اس طرح بغیر اطلاع کیے اندر آنا اسے بے حد کھلا تھا۔ اس آدمی نے اندر آتے ہی بے حد خوش دلی سے سلام کرنے کے بعد شیر دل کو بغور دیکھا۔
”اوہ تم...... مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آ رہے ہو؟“ شیر دل نے عکس کو پہلے حیران ہوتے اور پھر خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ اس آدمی سے کہتے سنا تھا۔
”بس ایک دم سے پروگرام بنالیا تم سے ملنے کا۔“ اس آدمی نے مسکراتے ہوئے عکس سے کہا۔
”شیر دل یہ جواد ہے اور جواد یہ میرے بیچ میٹ...... “ عکس اب جواد کا تعارف کروانے کے بعد جواد سے شیر دل کا تعارف کروا رہی تھی۔ شیر دل جواد کا نام سنتے ہی یک دم اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ عکس کے تعارف کروانے سے بھی پہلے اس نے بے حد گرم جوشی کے ساتھ جواد سے ہاتھ ملایا تھا جس نے خود بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ اس سے علیک سلیک کرتے ہوئے کہا۔
”آپ جہاں پوسٹڈ ہیں وہاں تو اکثر کام پڑتا رہتا ہے ہم لوگوں کو...... میرا خیال ہے آپ سے تو ملاقات رہے گی اب میری۔“ جواد نے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں اس کی پوسٹنگ کا سنتے ہی بڑی گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
”اینی ٹائم۔“ شیر دل نے بھی جواباً اسی گرم جوشی کے ساتھ اس سے کہا۔ دوبارہ اپنی نشست سنبھالنے کے بعد شیر دل نے ایک بار پھر جواد کا بغور جائزہ لیا تھا۔ اس کا پہلا امپریشن جو اس پر پڑا تھا دوسرا بھی وہی رہا تھا...... وہ جواد ملہی کو پسند نہیں کر سکا تھا۔ چند منٹ وہ مزید وہاں بیٹھا رہا تھا اور ان چند منٹوں میں بھی اس نے عکس اور جواد کے درمیان تناؤ کی ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی۔ چائے کا ایک اور کپ جواد اور عکس کے ساتھ مختصر ترین وقت میں پینے کے بعد شیر دل اٹھ کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ واپسی کا پورا راستہ وہ صرف جواد اور عکس کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ عکس کے ساتھ جواد کی بے تکلفی اسے بہت ہی عجیب انداز میں چبھی تھی اور یہ نہیں تھا کہ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ عکس کے ساتھ کسی کی بھی بے تکلفی اسے ایسے ہی چبھتی تھی اور یہ تب بھی تھا جب وہ اکیڈمی میں غنی حمید کے بہت قریب تھی یا کم از کم شیر دل کو لگتی تھی۔ عکس اکیڈمی میں جس دن بھی جس بھی مرد کے ساتھ شیر دل کو بیٹھی نظر آجاتی شیر دل کو کم از کم ایک دن کے لیے اس مرد سے نفرت ہو جاتی تھی اور وہ وجوہات سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خود اس کو بھی ناپسند کرتا تھا لیکن وہ ان لوگوں کو بھی قبول کرنے پر تیار نہیں تھا جو اس کے آس پاس نظر آتے تھے اور ان لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر غنی حمید کا نام تھا۔
سرکاری گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھے جی ٹی روڈ پر شام کے دھندلکے میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عکس کے بارے میں سوچ رہا تھا...... اور جواد کے بارے میں...... جو اس وقت عکس کے پاس تھا...... اکیلا...... اس کی زندگی میں وہ جگہ لینے والا تھا جو شیر دل چاہنے کے باوجود نہیں لے سکا تھا۔ اسے جواد ملہی سے حسد نہ ہوتا تو کیسے نہ ہوتا...... اسے کبھی عکس کی زندگی میں آنے والے کسی مرد پر رشک نہیں آیا تھا۔ اسے صرف حسد ہوتا تھا۔

☆☆☆

”مجھے تو حسد ہوتا اگر میں وہاں انوائیٹڈ ہوتی اور میں تمہارے بجائے کسی اور کو best probationer کا

ایوارڈ لے کر جاتا دیکھتی...... ہماری فیملی کے لیے اس سے زیادہ embarrasing بات کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔“ شیر دل کی ممی نے اس کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب کی رات اس کے گھر واپس آنے پر اس سے کہا تھا۔ CTP کے اختتام پر ہونے والی اس پاسنگ آؤٹ پر کچھ وجوہات کی وجہ سے پیرنٹس انوائیٹڈ نہیں تھے۔ اور شیر دل فیملی کے لیے یہ بھی جیسے ایک face saving تھی۔ اپنے لاؤنج میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے شیر دل ماں کی باتیں سنتا ہوا کن انکھیوں سے اپنے باپ کو دیکھتا رہا جو بے تاثر چہرے کے ساتھ چائے کے سپ لیتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی طرح شیر دل کی اس ”ناقص“ کارکردگی پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔
”STP ابھی باقی ہے ممی۔“ شیر دل نے جیسے اپنے ماں باپ کو assurance دینے کی کوشش کی۔
”وہاں عکس مراد علی تمہیں ہوگی کیا؟“ شیر دل کے باپ نے پہلی بار بڑے تحمل اور رسانیت سے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ شیر دل بے اختیار کچھ کھسیانا ہوا تھا۔ یہ اس کے باپ کے جوتے مارنے کا پرانا انداز تھا۔ وہ جانتا تھا وہ سوال نہیں پھبتی تھی۔
”ویسے کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟...... کس فیملی کی ہے یہ لڑکی؟“ شیر دل کی ماں کو یک دم عکس مراد علی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ شیر دل نے ڈیلیو شیئر کیں جو ہر کامنر کی طرح اسے بھی عکس کے بارے میں معلوم تھیں۔
”اوہ۔“ اس کی ممی کو جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا وہ شاید کسی بیوروکریٹ کی اولاد تھی۔ پشت در پشت بیوروکریسی کا حصہ رہنے والے کسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور انہیں اپنے اس اندازے کے غلط ہونے پر جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ کسی کاروباری گھرانے کو تو شیر دل کی فیملی بہت نچلا درجہ ہی دے سکتی تھی۔
”میں سوچ رہی تھی ہماری جان پہچان کی کسی فیملی سے تعلق ہے تو کچھ اور بھی پلان کیا جا سکتا ہے۔“ شیر دل کی ممی نے مسکراتے ہوئے پہلے بیٹے اور پھر شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ملازم اب ان کی چائے کے کپ میں کچھ اور چائے ڈال رہا تھا۔
”مثلاً کیا؟“ شیر دل نے کچھ حیران ہو کر ماں سے پوچھا۔
”تمہاری شادی وغیرہ کا کوئی سلسلہ شروع کیا جا سکتا تھا...... لڑکی دیکھنے میں کیسی ہے؟“ شیر دل کو ماں کی بات پر یقین نہیں آیا۔
”ممی آپ مذاق کر رہی ہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔ اس کی ماں کا سینس آف ہیومر بہت اچھا تھا اور شیر دل ہمیشہ اس سے محظوظ ہوتا تھا...... اب بھی ہوا تھا۔
”ہاں، ہو سکتا تھا۔“ اس بار شیر دل نے اپنے باپ کو بے حد سنجیدگی سے اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے دیکھا۔ شیر دل کی ہنسی کو بے اختیار بریک لگا۔
”You can't be serious“ (آپ یقیناً سنجیدہ نہیں ہیں۔) اس نے بے یقینی سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”اتنی بری ہے وہ کیا؟“ اس کی ماں نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔
”وہ اچھی کہاں سے ہے ممی......؟ سی ایس ایس میں ٹاپ کر لینے یا best Probationer ایوارڈ لے لینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے چل پڑوں۔“ شیر دل کو ماں کی بات اب بری لگی جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ مذاق نہیں تھا۔
”ایسے ہی سوچا ہے ہم کون سا تمہاری شادی واقعی اس کے ساتھ طے کرتے جا رہے ہیں۔“ اس کی ماں نے اسے خفا ہوتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔
”ممی آپ بھی بعض دفعہ حد کرتی ہیں ویسے...... میری شادی کروا رہی ہیں اس سے...... کہاں میں...... کہاں عکس مراد علی...... کوئی میچ ہی نہیں ہے ہم دونوں کا۔“ شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے اپنی چائے ختم کرتے ہوئے کپ رکھا۔

"وہ اتنی بری ہے؟" اس کی ماں کو ایک عجیب سی کرید ہوئی عکس کے بارے میں۔

"she is just average (وہ بس ٹھیک ہی ہے)" شیر دل نے بے حد خفگی سے کہا۔

"I mean below average عام معیار سے بھی کم ہے۔" شیر دل کو جیسے اپنی ہی وضاحت سے تسلی نہیں ہوئی اور اس نے اضافہ کیا۔ "very ordinary" دوسرے اضافے پر ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑا۔ عکس اس کے تصور میں آئی تھی اور اسے لگا اس کی وضاحت کچھ مناسب نہیں تھی۔

"I mean she is not that bad but she is not my kind of a girl" (میرا مطلب ہے کہ وہ اتنی بری لڑکی نہیں ہے لیکن وہ میرے مزاج کی لڑکی نہیں ہے۔") چند لمحوں میں ہی اس نے گڑبڑا کر اپنے ہی جملے کی کچھ تصحیح کی۔

"ویسے تم کو کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟" شیر دل کی ماں کو یک دم جیسے اس موضوع پر اس سے تفصیل سے بات کرنے میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔

"عکس مراد علی کے علاوہ مجھے ہر لڑکی پسند ہے۔" اس بار شیر دل نے کندھے اچکا کر جیسے مذاق میں ایک بات کہی۔

"عکس کی تو ہم بات ہی نہیں کر رہے...... تم اس کا ریفرنس کیوں دے رہے ہو؟" اس کی ماں نے کہا۔

"ایسے ہی کہہ دیا میں نے...... اور پلیز آپ پھر کوئی سچویشن create کرنے کی کوشش نہ کریں فی الحال...... مجھے ابھی STP پوری کرنی ہے...... پھر اپنی پہلی پوسٹنگ کے دوران تو کم از کم اس طرح کے کسی سلسلے میں دلچسپی نہیں ہے۔" شیر دل ماں کے ارادے بھانپتے ہوئے بولا۔

"میں صرف انگیجمنٹ کا سوچ رہی تھی۔"

"آپ اس کا بھی مت سوچیں best Probatiner کا ایوارڈ نہ لینے کی اتنی بڑی سزا تو نہیں ملنی چاہیے مجھے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ مسکرا دیے تھے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بھی شیر دل کو اپنے باپ کی خاموشی بری طرح چبھی تھی۔ انہوں نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا اور وہ مسلسل سنجیدہ رہے تھے جو ایک جملہ انہوں نے بولا تھا وہ شیر دل کو کانٹے کی طرح چبھ گیا تھا۔ STP کے best Probationer کا ایوارڈ اب اس کے لیے عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

"وہ زمین کا ٹکڑا میرے لیے عزت کا مسئلہ نہیں ہے چڑیا...... وہ 20 سال کی حق حلال کی کمائی ہے میری...... خون پسینے سے کمائی جانے والی ایک ایک پائی اکٹھی کر کے خریدی گئی تھی وہ زمین...... میں اسے اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔" چڑیا نے عجیب تکلیف کے احساس کے ساتھ اپنے نانا کو دیکھا۔

وہ ابھی کچھ دیر پہلے حوالات سے نکلا تھا اور اب وہ اور چڑیا بس پر بیٹھے واپس شہر جا رہے تھے۔ خیر دین کے کندھے ایک بار پھر عجیب سی شکست خوردگی کے عالم میں جھکے ہوئے تھے۔ چڑیا نے ہمدردی سے اپنے نانا کو دیکھا۔ وہ خیر دین کے لیے آج بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی...... لیکن اب کم از کم سمجھا سکتی تھی اور وہ اس وقت وہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہمیں اب اس زمین کی ضرورت نہیں ہے نانا...... اس کو بیچ کر بھی ہمیں اتنے پیسے نہیں ملیں گے جن سے ہماری زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی آ جائے۔ ہمارے پاس گھر ہے...... آپ نے اپنی دکان بھی خرید لی ہے...... میں میڈیکل کالج جا رہی ہوں...... ہمیں اس زمین کے لیے اب ذلیل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" چڑیا نے خیر دین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بس کے شور میں قدرے بلند آواز میں کہا۔

"ہر چیز کو پیسے سے تھوڑی ناپا جاتا ہے۔ بعض چیزوں کی قدر پیسے کی وجہ سے نہیں ہوتی چڑیا...... وہ میری حق حلال کی کمائی ہے...... میں کسی کا حصہ چھیننے تو نہیں گیا تھا...... اپنی چیز لینے گیا تھا...... اتنا بھی حق نہیں مجھے کہ اپنی چیز لینے کے لیے میں قانون کا سہارا مانگ سکوں۔" خیر دین بات کرتے کرتے رو پڑا، چڑیا نے بے حد تکلیف سے اپنے نانا کو دیکھا۔ اسے

نو سال پہلے کی تکلیف اور بے بسی یاد آئی تھی...... اور پچھلے دو دنوں سے بار بار یاد آ رہی تھی۔

"مت روئیں نانا۔" اس نے گلوگیر آواز میں خیر دین سے کہا۔ خیر دین نے یک دم خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ چڑیا کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی کا کوئی اظہار نہیں چاہتا تھا۔

نو سال کے بعد خیر دین چڑیا کے ساتھ بڑے فخر سے گاؤں آیا تھا۔ اب اس کی جیب میں پیسے بھی تھے اور اس کے سر پر نو سال پہلے کی طرح ایک جوان بیٹی اور ایک چھوٹی بچی کا بوجھ نہیں تھا۔ وہ گاؤں آ کر اپنے اسی دوست کے پاس ٹھہرا تھا جس نے کئی سال پہلے گاؤں سے شہر جاتے ہوئے اس کی مالی مدد کی تھی۔ خیر دین نے اپنے رشتے داروں سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی اس کے رشتے داروں نے اسے منہ لگایا تھا۔ گاؤں میں اب خیر دین کی عزت تھی کیونکہ خیر دین وہاں اسی طرح بس چند دن رہنے آیا تھا جس طرح سرکاری نوکری کے دوران آیا کرتا تھا۔ اس کے میل جول اور گاؤں والے اس کی جتنی عزت کر سکتے تھے انہوں نے کی۔ وہ اس گاؤں کی پہلی ڈاکٹر لڑکی کی جو کلغی لگا کر آیا تھا وہ کسی کو زیادہ نظر نہیں آئی۔ شاید اس لیے کیونکہ چڑیا ابھی میڈیکل کالج میں گئی تھی ڈاکٹر بنی نہیں تھی اور اس لیے بھی کیونکہ وہ ایک لڑکی تھی...... وہ بھی ایسی لڑکی جس کا داغدار بچپن گاؤں کے ہر بڑے بوڑھے کو ازبر تھا۔

خیر دین کو شہر میں ساری زندگی گزارنے کے بعد اگر تعلیم پر کوئی فخر یا ناز تھا تو گاؤں والوں نے اسے چکنا چور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لوگوں کو اس سے یہ جاننے میں تو دلچسپی تھی کہ اس نے حال ہی میں جو ریڑھی سے دال کی دکان بنالی تھی وہ کیسی چل رہی تھی وہ روز کے کتنے کما اور کتنے بچا لیتا تھا...... اور کیا گاؤں میں سے کسی اور کے شہر جا کر دال کی کوئی ریڑھی لگانے میں ویسا اسکوپ تھا جیسا خیر دین کے لیے بنا تھا...... لیکن کسی نے خیر دین کی ڈاکٹری پڑھنے والی نواسی کے بارے میں زیادہ نہیں پوچھا تھا کیونکہ وہاں کسی کو اپنی بیٹیوں یا اگلی نسل کی لڑکیوں کو ڈاکٹر تو کیا ابتدائی تعلیم سے زیادہ پڑھانے کی بھی خواہش نہیں تھی۔ وہ عورت کے اسی رول اور حیثیت سے خوش تھے جو صدیوں سے ان کے علاقے میں عورت کی تھی۔ چڑیا ڈاکٹر بن کے وہاں آئی ہوتی تو شاید پھر بھی وہاں اس کی قدر ہوتی۔ مفت دوا اور علاج کی غرض بہت سے لوگوں کو غرض مند بنا کر ان کا احسان مند کر دیتی لیکن فی الحال خیر دین کا وہ فخر گاؤں والوں کے نزدیک کسی کام کا نہیں تھا...... ان کے نزدیک شہر میں خیر دین کے کام میں ہونے والی ترقی زیادہ بڑی چیز تھی۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی کو کویت اچھی جگہ دوبارہ بسا دینا بھی قابلِ تحسین تھا...... لیکن چڑیا کی وہ ایک ڈگری نہیں جس کے لیے خیر دین نے بچپن سے خواب دیکھے تھے۔ جس کے لیے خیر دین نے راتیں محنت کرتے کاٹی تھیں۔

خیر دین نے گاؤں آتے ہی جو حرکت کی تھی اس نے یک دم اس کی فیملی کی سالوں پرانی کدورت اور دشمنی کو جیسے جگا دیا تھا۔ خیر دین نے گاؤں آتے ہی چڑیا کے منع کرنے کے باوجود اپنے خاندان پر جعلسازی کے ذریعے اپنی زمین ہتھیا لینے کی ایف آئی آر کٹوا دی تھی اور تھانے دار نے اس کے حلیے اور بول چال سے متاثر ہوتے ہوئے کچھ لیے دیے بغیر ہی ایف آئی آر نہ صرف رجسٹر کر لی تھی بلکہ اس پر فوراً کارروائی کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور یہ کوشش جیسے ایک پنڈورا باکس کھولنے کے برابر تھا۔

☆☆☆

"فی الحال تو شادی کی بات کرنا اور سوچنا بھی پنڈورا باکس کھولنے کے برابر ہے۔" ایبک نے فاطمہ کے اس مطالبے پر کہ وہ اپنی امی اور فیملی کو اس کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے لائے جواب دیتے ہوئے کہا۔ فاطمہ اس کی بات پر کچھ دیر کے لیے جیسے کچھ بول نہیں سکی۔

"پنڈورا باکس کس اعتبار سے کہہ رہے ہو؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ایبک چند لمحے بڑی سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"میری پچھلے سال اپنی کزن سے انگیجمنٹ ہوئی ہے۔" فاطمہ کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔

"تم نے کیا کہا؟ میں نے سنا نہیں۔"

"میری انگیجمنٹ ہو چکی ہے لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ ختم ہو جائے...... مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔ ایک ڈیڑھ سال میں، میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔" فاطمہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کے لیے یہ ناقابلِ یقین تھا کہ ان کے اس طرح کے تعلق کے باوجود ایبک نے چپ چپاتے منگنی کر لی تھی اور فاطمہ کو اس بارے میں بتایا تک نہیں تھا۔

"تم نے مجھ سے ذکر نہیں کیا؟" اس نے بالآخر ایبک سے شکایت کی۔

"تم سے کیا ذکر کرتا یار...... تم خواہ مخواہ میں اپ سیٹ ہوتیں اور اگر تم اپ سیٹ ہوتیں تو میں بھی کہاں خوش رہ سکتا تھا۔" ایبک نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔

"لیکن ایبک یہ بہت بڑی بات تھی۔ ایک سال ہو گیا تمہاری منگنی کو۔ اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"میں نے کہا نا یار، میں اس رشتے سے خوش ہوں ہی نہیں اور نہ ہی مجھے وہاں شادی کرنی ہے...... پھر منگنی کا ہونا نہ ہونا اور اس کے بارے میں بتانا یا نہ بتانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔" ایبک نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"میرے لیے رکھتا ہے ایبک۔ مجھے بے خبری میں رکھنا اور کبوتر بنے رہنا کبھی اچھا نہیں لگتا۔" فاطمہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"میں منگنی ختم کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔" ایبک نے کچھ کمزور آواز میں اسے وضاحت دی۔

"پھر بھی بتانا چاہیے تھا۔" فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے خدشہ تھا کہ تم خفا ہو کر مجھ سے الگ ہو جاؤ گی۔" اس کی وضاحت نے کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو جیسے لاجواب کر دیا تھا۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنی کتابیں سمیٹنا شروع کر دیں۔

"تم اس طرح مجھ سے خفا ہو کر جاؤ گی تو میں بہت اپ سیٹ رہوں گا۔" ایبک نے اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں خفا نہیں ہوں...... ہرٹ ہوئی ہوں اور میرا خیال ہے مجھے اس کا حق ہے......" وہ کہتے ہوئے کرسی دھکیل کر لائبریری کی میز پر پڑی اپنی کتابیں اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ایبک بھی کھڑا ہو گیا۔

"I am sorry" اس نے مدھم آواز میں جیسے فاطمہ کو ایک بار پھر منانے کی کوشش کی۔ فاطمہ کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ دل ٹوٹنے جیسے جملے اس نے پہلے کئی بار سنے تھے اور وہ سن کر ہنستی رہتی تھی۔ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہوتے ہوئے یہ یقین کرنا کہ پیار میں ناکامی پر دل ٹوٹ سکتا ہے بالکل ناممکن تھا لیکن لائبریری سے ہاسٹل تک کا سفر کرتے ہوئے فاطمہ کو پہلی بار اس تکلیف دہ احساس سے گزرنا پڑا۔ کالج اور ہاسٹل میں وہ لڑکیوں کی منگنیاں ہوتے اور ٹوٹتے دیکھتی رہتی تھی۔ افیئر چلتے اور پھر اسی طرح بریک اپ ہو جاتے اور زندگی چلتی رہی لیکن کچھ نہیں بدلتا تھا۔ لڑکیاں کچھ دیر روتی دھوتی تھیں پھر ٹھیک ہو جاتی تھیں...... بہل جاتی تھیں...... ان کی گفتگو میں آنے والے مرد کا نام بھی بہت جلدی اور کبھی بہت دیر سے لیکن تبدیل ہو جاتا تھا...... اور ایسی چیزوں کو بہت بار دیکھتے رہنے کے بعد بھی وہ اپنے اندر ایسا حوصلہ نہیں پا رہی تھی کہ اپنی زندگی میں سے مائنس کر کے دیکھ سکتی یا اپنی زندگی میں ایبک کے بجائے کسی دوسرے مرد کا تصور کر پاتی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کے ساتھ کی خواہش کی تھی۔ کسی کے ساتھ کی خواہش کے لیے اپنے گرد کھڑی دیواریں گرائی تھیں اور اب اس کے یوں قدم پیچھے ہٹا لینے پر کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھیڑ کے بیچوں بیچ اکیلی کھڑی رہ گئی۔

ہاسٹل آنے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک سن دماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عام لڑکیوں کی طرح کمزور سمجھنا نہیں چاہتی تھی کہ ہاسٹل کے کسی کمرے میں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر روتی اور لڑکیوں کا ایک مجمع اکٹھا کر کے ان کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کو شیئر کرتی لیکن عجیب بات تھی اب اس تکلیف سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا...... بستر پر

اوندھا لیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو...... اور کسی کے کندھے پر سر رکھ کر ایبک سے ہونے والی تمام شکایتیں دہرانے کو۔ وہ ایک امید جو ایبک نے اسے تھمانے کی کوشش کی تھی اس کا دل اسے کبھی تھامنے پر تیار نہیں ہو پا رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس کی چھٹی حس اسے وارن کر رہی تھی کہ ایبک اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ نہ تو اپنی منگنی کو اس کے لیے توڑنے گا نہ ہی اس سے شادی کرے گا اور یہ وارننگ اس کی اذیت کو بڑھا رہی تھی۔ پیار میں کھایا جانے والا پہلا دھوکا ایسا ہی ہوتا ہے۔ دھوکے کے علاوہ سب کچھ لگتا ہے...... دل یہ نہیں مانتا کہ ہم اتنے معمولی ہو گئے کہ کسی کا دل مٹھی میں نہیں کر سکے...... اور دماغ یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ کسی کی دنیا ہمارے علاوہ بھی کسی کی دوسرے وجود سے مکمل ہو سکتی ہے حقیقت بہت دیر تک حقیقت نہیں آزمائش، پریشانی، غلط فہمی، بددعا لگتی ہے...... بس حقیقت بن کر نظر نہیں آتی۔ فاطمہ کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو ایبک کے اس رویے کی کوئی توجیہہ دے کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ اس میں بری طرح ناکام ہو رہی تھی۔ چار سال اس نے جو خواب دیکھتے ہوئے گزارے تھے وہ منٹوں میں ختم ہو گئے تھے۔ ایک بہت کم عمر، ناتجربہ کار، نوجوان لڑکی کے طور پر دیکھے جانے والے خواب...... ایک من پسند جیون ساتھی...... ایک اچھا سا گھر اور ایک پُرسکون زندگی جس میں وہ سب کچھ ہوتا جو فاطمہ کی اپنی ساری زندگی میں نہیں رہا تھا۔

زندگی کا ہر امتحان انسان ذہانت اور محنت سے پاس نہیں کر سکتا بعض امتحانوں کے لیے قسمت کے علاوہ اور کوئی چیز درکار نہیں ہوتی...... یہ فاطمہ کی زندگی کا ایک اور تکلیف دہ سبق اور نتیجہ تھا جو اس رات اس نے بیٹھ کر اخذ کیا تھا...... وہ خود کو ذہین، سمجھدار، محنتی، قابل مانتی تھی لیکن اس نے کبھی خود کو خوش قسمت نہیں مانا تھا، یہ ایک چیز تھی جس پر اس کا یقین خیر دین کی تربیت کے باوجود بھی متزلزل ہی رہا تھا...... اور اس کی زندگی میں وقتاً فوقتاً ایسا کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا تھا جو اس کے اس یقین کو پختہ نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ اچھی قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی۔

زندگی میں ہونے والے اس پہلے ہارٹ بریک کا اگلا دن ایک مشکل دن تھا...... ہر اعتبار سے ایک مشکل دن۔ اسے ایبک کا سامنا کرنا تھا...... اسے اسٹڈیز اور کلاسز میں اپنا فوکس رکھنا تھا...... اور اسے خیر دین کو فون پر اپنی اور ایبک کی گفتگو سے آگاہ کرنا تھا...... اور...... سب کے ساتھ اسے ایک معمول کا دن نارمل انداز میں گزارنا تھا۔

"ہم اب دوبارہ نہیں ملیں گے۔" فاطمہ نے اگلے دن ایبک سے سامنا ہوتے ہی کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" ایبک ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"میں نے تم سے کہا ہے میں وہ منگنی ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ بہت بے چین تھا۔

"نہیں ایبک میں اس سب کا حصہ نہیں بنوں گی۔ میں تم سے ملتی رہوں گی تو میری تکلیف بڑھتی رہے گی کیونکہ میں نے تمہیں ایک دوست کبھی نہیں سمجھا اور میں اس احساسِ جرم کے ساتھ بھی نہیں رہنا چاہتی کہ میں کسی اور لڑکی کے ساتھ تمہاری منگنی تڑوانے کی کوشش میں تمہاری حصے دار بنی رہی۔" فاطمہ نے بہت سنجیدگی سے اسے کہا۔

"میں اس سے محبت کرتا ہی نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ایبک نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اگر ایسا ہے تو تم اس منگنی کو تڑوا کر اپنی فیملی کو لے کر میرے گھر آ جانا میں ضرور تم سے شادی کر لوں گی۔" فاطمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"میں یہی تو کر رہا ہوں...... تھوڑا وقت دے دو مجھے۔" فاطمہ نے تحمل سے اس کی بات کاٹی۔

"تم جتنا وقت لینا چاہتے ہو لو...... بس میں اس عرصے کے دوران تم سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"لیکن کیوں؟ ہم دوستوں کی طرح مل سکتے ہیں۔ اکٹھے اسٹڈی کر سکتے ہیں...... میں تم پر اتنا ڈیپینڈنٹ ہوں کہ میں تو خود اپنے نوٹس تک نہیں بنا سکتا۔" ایبک بہت پریشان تھا۔ فاطمہ جانتی تھی وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ چار سال کے دوران اگر فاطمہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو ایبک کلاس کی پہلی دس پوزیشنز میں کبھی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ اس کے کہے بغیر اس کے ہر کام کو اپنی ذمے داری سمجھتے ہوئے کیا کرتی تھی۔ اس کے فولڈر میں ہر کام کے دو شیڈول بنتے تھے ایک اس کا اپنا اور دوسرا ایبک

کے لیے اور ایبک کی آنکھوں کے سامنے فاطمہ کے ساتھ ہونے والے بریک اپ کے نتیجے میں اندھیرا چھاتا نظر آرہا تھا تو وہ اپنی فیلنگز میں بالکل ٹھیک تھا۔

"تم بہت ذہین اور لائق اسٹوڈنٹ ہو۔ میرے بغیر بھی سب کچھ کرسکتے ہو ایبک...... پھر تمہاری ممی بھی ہیں تمہاری مدد کے لیے۔" فاطمہ نے کہہ کر وہاں سے جانے کی کوشش کی۔ ایک بہت دور تک اسے مناتے کی کوشش کرتا ہوا اس کے ساتھ چلتا رہا لیکن فاطمہ نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا تھا اس دن واپس ہاسٹل آکر وہ پہلی رات سے بھی زیادہ اپ سیٹ اور اداس تھی۔ پچھلی رات ایبک کا وہ رویہ تھا جس نے اسے پریشان کیا تھا لیکن اسے امید بھی دلائی تھی اور آج یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا اور ایبک سے تمام تعلقات ختم کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ آسان نہیں تھا وہ بری طرح کمزور پڑ رہی تھی...... قطع تعلق کرلینا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ اس رات اس نے بلآخر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ایک عام لڑکی کی طرح وہ ساری رات بیٹھ کر روتی رہی تھی اور اگلے دن اس نے کالج سے بغیر کسی وجہ کے پہلی چھٹی کی۔

"کیا ہوا چڑیا؟" خیر دین نے ہاسٹل سے کی جانے والی کال پر اس کی آواز سنتے ہی بے حد تشویش سے کہا۔ وہ جھوٹ بولنا چاہتی تھی کہنا چاہتی تھی...... نانا کچھ نہیں...... لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکی۔ وہ رو پڑی تھی اور پھر روتی ہی گئی تھی۔ خیر دین بہت دیر چپ چاپ اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

"ایبک کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

"نانا اس نے پچھلے سال منگنی کرلی اور مجھے اس نے بتایا تک نہیں۔" فاطمہ نے سسکیوں کے ساتھ خیر دین کو بتایا۔ بہت دیر خیر دین صدمے سے گنگ رہا۔ سارے سوال جواب یک دم جیسے دم توڑ گئے تھے اس کے لیے۔ چڑیا کی تکلیف کو کوئی اس سے زیادہ کیسے سمجھ سکتا تھا۔ چڑیا بہت زیادہ دیر تک اس سے بات نہیں کرسکی۔ کال ختم ہوگئی تھی لیکن اس رات وہ سو نہیں پائی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے بھی وہ اپنی روم میٹس کے کمرے میں ہوتے کے باوجود بھی بستر میں گھس کر منہ چھپا کر روتی رہی تھی۔

اگلی صبح وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کالج جانے کے لیے تیار ہوکر ہاسٹل سے نکلی تھی اور تب اس نے ہاسٹل کے دروازے پر صبح سویرے چادر کی بکل مارے اونگھتے ہوئے خیر دین کو بیٹھے دیکھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف آئی تھی۔

"نانا آپ اس وقت یہاں......؟" خیر دین اس کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر چڑیا کو دیکھ کر وہ جیسے یک دم مطمئن ہوا۔

"بس کل رات تم سے بات کرنے کے بعد مجھے چین نہیں آیا۔ میں رات کو ہی نکل آیا تھا تم سے ملنے کے لیے لیکن اجازت نہیں ملی تم سے ملنے کی...... کیونکہ بہت رات ہوگئی تھی۔" خیر دین نے اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ فاطمہ کا دل بے اختیار بھر آیا۔ وہ اس عمر میں اس کے لیے سردیوں کی وہ رات ہاسٹل کے اس گیٹ کے پاس کھلے آسمان کے نیچے گزار رہا تھا۔ پتا نہیں زندگی میں اس کو کتنی بار خیر دین کے لیے تکلیف کا باعث بننا تھا۔ فاطمہ کو اپنے آپ پر جیسے شرم آئی تھی۔

وہ اس دن کالج جانے کے بجائے خیر دین کے ساتھ ریس کورس میں چلی گئی تھی۔ وہ سارا دن اس نے ریس کورس کی ایک بینچ پر خیر دین کے ساتھ بیٹھے ہوئے گزار دیا۔ انہوں نے بہت ساری باتیں کیں لیکن ان میں سے کسی بات میں ایبک کا ذکر نہیں تھا۔

"تمہیں بہت اچھا جیون ساتھی ملے گا چڑیا۔" جانے سے کچھ دیر پہلے خیر دین نے یک دم بنا کسی تمہید کے اس سے کہا۔ فاطمہ نے چونک کر خیر دین کو دیکھا پھر ایک رنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے خیر دین سے کہا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"کیونکہ تم بہت اچھی ہو۔" خیر دین نے اس سے محبت سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "اور تم بہت بہادر ہو۔ سمجھدار ہو...... تم زندگی بنانا جانتی ہو بیٹا۔"

"نانا زندگی میں ایک چیز قسمت بھی ہوتی ہے۔" فاطمہ نے بڑی رنجیدگی سے خیر دین کی بات کاٹ دی تھی۔ "آپ ہی کہتے تھے نا قسمت بڑی چیز ہوتی ہے۔" اس نے نم آنکھوں کے ساتھ خیر دین کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔ خیر دین ایک لمحے کے لیے بول نہیں سکا پھر اس نے چڑیا سے کہا۔

"اور تم کہتی تھیں نانا جب میں بڑی ہوجاؤں گی تو میں ایک کھیل بناؤں گی چیس کی طرح کا جس میں کوئین ہی بادشاہ ہوگی۔" چڑیا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"زندگی اور کھیل میں بہت فرق ہوتا ہے نانا...... کھیل کو ہم کھیلتے ہیں لیکن زندگی ہمیں کھیلتی ہے۔ ہم زندگی کے مہرے ہوتے ہیں زندگی کو مہرہ نہیں بنا سکتے۔" خیر دین بہت دیر اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے یک دم مسکرا دیا۔

"ایک زمانہ ہوتا تھا چڑیا جب تم میری ہر بات مان لیتی تھیں۔" خیر دین نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں اب بھی آپ کی ہر بات مان لیتی ہوں۔" چڑیا نے کہا۔

"ہاں لیکن اب تم بعض دفعہ ایسی باتیں کرتی ہو جس کا جواب میرے پاس نہیں ہوتا...... لیکن ایسی باتیں تو تم تب بھی کرتی تھیں جب بہت چھوٹی ہوا کرتی تھیں۔" خیر دین کو بات کرتے ہوئے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ ہنس دیا۔ فاطمہ نہیں ہنس سکی تھی۔ وہ جانتی تھی خیر دین اس کا ذہن اور دھیان بٹانے کی کوشش کررہا تھا۔

"تم نے یہ دھوپ چھاؤں دیکھی ہے؟" خیر دین نے یک دم چڑیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے پارک میں ڈھلتی دھوپ کی سرخی کو دیکھا جو اب پارک کے ایک کونے میں سمٹ رہی تھی۔

"یاد ہے جب ہم صبح یہاں اس بینچ پر آکر بیٹھے تھے تو یہاں دھوپ تھی پھر آہستہ آہستہ وہ دھوپ یہاں سے وہاں چلی گئی اور یہاں چھاؤں آگئی...... کبھی تم نے سارا دن دھوپ اور چھاؤں کو ایک جگہ ٹھہرے دیکھا ہے؟" اس نے نرم آواز میں چڑیا سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے اس میں بھی دھوپ چھاؤں ایک جگہ نہیں رہتی...... کبھی برے دن ہوتے ہیں پھر اچھے آجاتے ہیں پھر اچھے گزر جاتے ہیں اور برے آجاتے ہیں...... پر اچھا برا کوئی وقت بھی کسی انسان کے لیے مستقل نہیں رہتا۔" فاطمہ نے بے اختیار گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

"باقی سب ٹھیک ہے نانا لیکن میں نے اب کبھی کسی سے محبت نہیں کرنی...... یہ جو تکلیف آج سہی ہے نا میں نے...... یہ دوبارہ سہنا نہیں چاہتی میں۔" فاطمہ نے اٹھتے ہوئے دوٹوک انداز میں خیر دین سے کہا۔ وہ اب کھانے پینے کی وہ چند بچی کھچی چیزیں سمیٹ رہی تھی جو وہ سارا دن استعمال کرتے رہے تھے۔

"کل میری دکان پر ایک لڑکا آیا وہ مجھے بڑا اچھا لگا۔" خیر دین نے اچانک اٹھتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر فاطمہ سے کہا۔ فاطمہ نے عدم دلچسپی سے اس کی بات سنی۔

"اونچا لمبا گورا چٹا تھا، کسی بڑے اچھے خاندان کا تھا...... سرکاری گاڑی میں آیا تھا اپنے کسی دوست کے ساتھ...... شاید باپ وغیرہ سرکاری افسر ہے...... مجھے پہلی نظر میں ہی اتنا اچھا لگا کہ میرا دل چاہا تمہاری شادی اس کے ساتھ ہو۔" فاطمہ نے ٹھٹک کر خیر دین کو دیکھا۔ خیر دین کے لہجے میں ایک عجیب سی معصوم سی خواہش تھی...... اپنی چڑیا کو ہمیشہ کی طرح سب سے اچھی نظر آنے والی چیز دینے کی خواہش...... وہ چڑیا کا نصیب کس قلم سے لکھنا چاہتا تھا چڑیا کو کبھی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ خیر دین نے دکان پر دال کھانے کے لیے آنے والے کسی مرد کو دیکھ کر اسے چڑیا کا نصیب بنتے دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ چند لمحے وہ خیر دین کو دیکھتی رہی پھر وہ اپنے نانا کی معصومیت پر ہنس پڑی تھی۔

"آپ بعض دفعہ عجیب باتیں بھی کرنے لگے ہیں نانا۔" چڑیا نے اس سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے اس کا نام کیا تھا؟" خیر دین نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے جیسے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ چڑیا سے کہا۔ چڑیا کو اور ہنسی آئی۔

"نانا آپ اس سے نام بھی پوچھنے بیٹھ گئے؟" اسے جیسے خیر دین کی جذباتیت پر یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں...... تم سے کہہ رہا ہوں نا وہ مجھے بڑا اچھا لگا تھا...... چھ فٹ لمبا تھا...... بڑا تمیز والا لگ رہا تھا، مجھے کہہ رہا تھا کہ اسے میری شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ خیر دین مسکراتے ہوئے چڑیا کے ساتھ چلتے ہوئے اسے بتانے لگا۔

"کیا نام تھا اس کا؟" چڑیا نے اچانک پوچھا۔

☆☆☆

شیر دل نے اسے گھوڑے سے گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے وہ غیر ارادی طور پر گھوڑے کی باگ کھینچتے کھینچتے رک گیا تھا۔ اس کا گھوڑا چند لمحوں کے لیے ہلکا ہوا پھر اسی طرح دوڑتا ہوا رنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا جہاں شیر دل نے بالآخر اسے روک لیا تھا۔ چہل قدمی والے انداز میں گھوڑے کو چلاتے ہوئے وہ اسے وہاں لے کر آیا جہاں عکس مراد علی اپنے ساتھی مرد کامنرز، رائیڈنگ انسٹرکٹر اور پیرا میڈیک اسٹاف کے گھیرے میں زمین پر بالکل بے حس و حرکت چت لیٹی ہوئی نظر آ رہی تھی اور اس کے بالکل قریب غنی حمید ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ عکس کے گھوڑے سے گرتے ہی وہ کامنرز میں سے پہلا آدمی تھا جو اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کے پاس پہنچا تھا اور اس کے عکس کے پاس پہنچنے پر شیر دل کا اضطراب عجیب سی خفگی میں بدلا تھا۔ رنگ کے باہر کھڑی ایمبولینس سے بھاگ کر عکس کے پاس پہنچنے والے پیرا میڈیکل اسٹاف کے ساتھ ہی دوسرے مرد کامنرز اور رائیڈنگ انسٹرکٹر بھی اپنے گھوڑوں سے اتر کر اب عکس کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تھے صرف شیر دل تھا جو گھوڑے پر کچھ فاصلے پر بیٹھا اس صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ لوگ صبح کے وقت ہارس رائیڈنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے جب یہ حادثہ ہوا تھا۔ وہ DMG گروپ کی STP کے آغاز کا چوتھا دن تھا اور صبح سویرے کلاسز کے آغاز سے پہلے رائیڈنگ کا یہ سیشن سردیوں کے اس کہر آلود موسم میں ان سب کے لیے عذاب جان تھا۔ شیر دل اور غنی حمید سمیت DMG کے چند دوسرے آفیسرز ایچی سن اور ان جیسے دوسرے اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والوں کے لیے گھڑ سواری جیسے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ رنگ میں اپنا اپنا گھوڑا لیتے ہی وہ تین چار لوگ گھوڑے کو بڑے اطمینان سے اِدھر اُدھر ٹہلانے میں مصروف ہو گئے تھے اور باقی کا سارا گروپ ہر روز کی طرح آج بھی گھوڑے پر درست طریقے سے چڑھنے اور بیٹھنے کی ڈرل کرنے میں مصروف تھا۔ چند منٹوں پہلے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے روز کی PT ڈرل کرنے کے بعد وہ سب اپنے گھوڑوں کو trotting (آہستہ آہستہ دوڑانا) کے لیے انسٹرکٹر کے ساتھ ایک دائرے میں دوڑا رہے تھے۔ عکس اور غنی کے گھوڑے شیر دل کے گھوڑے سے چار پانچ گز کے فاصلے پر تھے۔ ان کے درمیان عباس شیرازی اور عرفان محمود کے گھوڑے تھے۔ اس گروپ میں عکس واحد لڑکی تھی اور رائیڈنگ انسٹرکٹر ہر روز اس کے گھوڑے کو سب سے پہلے ایڑ دینے کے لیے کہتا تھا۔ دائرے میں گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے ایک مرحلے پر تمام گھوڑے یوں ایک مکمل دائرہ بنا لیتے تھے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ دائرے کا سرا کون تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ عکس trot کرتی ہوئی پہلے نکلی تھی۔ چھٹے نمبر پر گھوڑا دوڑاتے ہوئے شیر دل کی نظریں ہمیشہ کی طرح اس پر بھٹک رہی تھیں۔ وہ خود ایک ماہر گھڑ سوار تھا اور trot جیسی چیز اس کے اور غنی کے لیے ایک جلوہ تھی۔ اس لیے اس کی توجہ رائیڈنگ سے زیادہ عکس پر مرکوز رہتی تھی جو گھوڑے پر قابو پانے کی کوشش میں بے حال نظر آتی تھی۔ چوتھے دن تک وہ گھوڑا بہتر انداز میں کنٹرول کر رہی تھی اور شیر دل اس وقت بھی اسے دیکھتے ہوئے اسی ایک چیز پر غور کر رہا تھا جب اس نے عکس کے پاؤں کو رکاب سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ ذرا سا بائیں طرف پھسل کر جھکی پھر اس نے گھوڑے کی گردن سے لپٹ کر جیسے اپنا توازن ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔ غنی حمید تب تک اپنا گھوڑا تیزی سے بھگاتے ہوئے اس کے برابر لے آیا تھا۔ اس نے عکس کے گھوڑے کے برابر گھوڑا بھگاتے ہوئے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی جو تب تک اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے جھول رہی تھی۔ عکس کا گھوڑا غنی کے گھوڑے کے بالکل قریب آنے پر یک دم بدکا تھا اور اس نے بھاگتے ہوئے دائرہ توڑنے کی کوشش کی اور بالکل اس وقت شیر دل نے عکس کو توازن مکمل طور پر کھو کر گھوڑے کے

بائیں جانب گرتے دیکھا۔ وہ گھوڑے کے ذرا سا لڑکھڑا جانے کی وجہ سے بالکل سیدھا پشت کے بل زمین پر گری تھی۔ خوش قسمتی سے اس کا گھوڑا لڑکھڑاتے ہوئے بھی سنبھل گیا ورنہ وہ یا تو اس کے اوپر گرتا یا وہ اس کے پیروں سے زخمی ہو جاتی۔ وہ جس انداز میں گری تھی شیر دل کو یقین تھا وہ اٹھ کر رنگ سے چلتے ہوئے نہیں جا سکتی تھی۔ رائیڈنگ رنگ میں زمین پر ریت تھی اس کے باوجود جتنی اونچائی سے وہ گری تھی ایسا ممکن نہیں تھا کہ وہ گرتے ہی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ چند لمحوں کے لیے شیر دل کو بھی واقعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ گھوڑے سے اتر کر اس کے پاس دوسروں کی طرح جانا چاہیے یا اسی طرح گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس دائرے کے گرد گھومنا چاہیے جو عکس مراد علی کے گرد بنا ہوا تھا اور جس میں سے اب اسے عکس نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، چار منٹ...... پانچویں منٹ پر شیر دل نے اس دائرے کو ٹوٹتے دیکھا۔ مرد کامنرز آہستہ آہستہ اپنے گھوڑوں کی طرف جانے لگے تھے اور اس نے اس چھٹتے ہوئے ہجوم کے درمیان عکس مراد علی کو زمین پر بیٹھا دیکھا تو وہ ٹھیک تھی۔ اطمینان کی ایک سانس اسے بھی آئی تھی۔ وہ اب سر پر پہنا ہوا ہیلمٹ دوبارہ پہنتے ہوئے اس کی بیلٹ کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے کس رہی تھی۔ شیر دل کچھ فاصلے پر اپنا گھوڑا روکے اسے دیکھتا رہا۔ دوسرے کامنرز اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ پیرا میڈیک اسٹاف فرسٹ ایڈ باکس زمین پر رکھے عکس کے پاس کھڑے تھے۔ دونوں رائیڈنگ انسٹرکٹر اور غنی حمید بھی وہیں تھے۔ وہ اب ہاتھوں میں پہنے پروٹیکٹو گلوز ٹھیک کر رہی تھی۔ شیر دل نے اسے اپنے بازو سے چہرے پر لگی ریت صاف کرتے دیکھا پھر اس نے رائیڈنگ بوٹس کے اندر اپنے پیروں کی پوزیشن ٹھیک کرتے ہوئے ان کی زپ نیچے کر کے دوبارہ بند کی۔

ساتویں منٹ میں شیر دل نے اسے غنی حمید کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوتے دیکھا۔ وہ اب اپنے دونوں پیروں پر کھڑی اپنی گرے رائیڈنگ ٹراؤزرز سے ریت جھاڑنے کے بعد اپنے گلے اور بلیو کورٹ کے گرد لپٹے اسکارف کو ٹھیک کرتے ہوئے کوٹ کے بٹن بند کر رہی تھی جب اس نے اپنے بالمقابل پانچ گز کے فاصلے پر گھوڑے پر بیٹھے شیر دل کو دیکھا۔ صرف چند لمحوں کے لیے دونوں کی نظریں ملی تھیں، صرف چند لمحوں کے لیے وہ ٹھٹکی تھی پھر اسی سرعت سے اس نے نظریں چرائیں۔ ایک پیرا میڈیک اسٹاف کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے کر دو گھونٹ پی کر بوتل واپس کی اور پھر شیر دل نے اسے دائرے کے وسط میں کھڑے اپنے گھوڑے کی طرف جاتے دیکھا جس کی باگ ایک سائیس پکڑے کھڑا تھا۔ شیر دل کو اگر اس کے قدموں میں کوئی لڑکھڑاہٹ اور چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار دیکھنے کی خواہش تھی تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔

دسویں منٹ میں شیر دل سمیت 16 پروفیشنرز نے عکس مراد علی کو ایک عجیب سی خاموشی اور تعظیم و تحسین کے عالم میں بے حد پُراعتماد انداز اور مہارت سے اپنے گھوڑے پر دوبارہ سوار ہوتے دیکھا۔ اس نے رائیڈنگ انسٹرکٹر کو رکاب میں پاؤں پھنسانے کے لیے رکاب کو ہاتھ لگانے دیا تھا نہ ہی باگ پکڑنے میں اس کی مدد لی تھی۔ وہ باگ پکڑ کر پہلی ہی

کوشش میں بے حد ہموار انداز میں گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ اپنے گھوڑے کو چند قدم چلاتے ہوئے وہ
دائرے کے وسط سے دائرے کے اس سرے پر لے آئی تھی جہاں سے وہ لوگ ہمیشہ trotting کا آغاز
کرتے تھے اور شیر دل نے اسے ایک بار پھر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے دیکھا۔ اس عورت کی برداشت اور بے جگری نے
شیر دل کو پانی کیا تھا، وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود درجنوں بار گھوڑے سے گر چکا تھا
اور اچھی طرح ان انجریز اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تکلیف سے واقف تھا۔ عکس مراد علی سے زیادہ ہمت اور حوصلہ کسی
میں نہیں تھا۔ یہ اعتراف صرف شیر دل نے نہیں کیا تھا ان سترہ کے سترہ DMG پروفیشنرز نے کیا تھا جن کو لیڈ کرتے
ہوئے وہ وہاں پہنچی تھی۔

اور شیر دل کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ عکس مراد علی نے ایسی تکلیف اور اذیت برداشت کرتے ہوئے اپنے پیروں پر
کھڑے ہونے کا مظاہرہ پہلی بار کیا تھا۔ اس کی کمر کا نچلا حصہ ایک پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور اس میں سے کرنٹ کی
طرح نکلنے والی ٹیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ نہ صرف باقی کا پورا وقت رائیڈنگ کرتی رہی تھی بلکہ اس نے اس دن
معمول کی طرح ہر کلاس لی۔ وہ اس گروپ میں واحد عورت تھی اور ان 17 مردوں کے سامنے اسے ایک مرد کی طرح
کھڑے رہنا تھا۔ وہ اس سال پاکستان کے 17 ذہین ترین ذہنوں کے ساتھ اس DMG کیمپس میں تھی جن میں سے
ہر ایک دوسرے کے لیے مگرمچھ تھا اور وہ ان سب کے لیے شارک مچھلی بننا چاہتی تھی۔ اس رائیڈنگ رنگ میں چوتھے دن
گر کر زمین پر گرے رہنے کا آپشن قابل قبول نہیں تھا۔ وہ اگلے ساتھ آٹھ مہینے DMG کیمپس کے کامن روم میں
سنائے جانے والے جوکس کا موضوع نہیں بننا چاہتی تھی۔

رات کو ڈائننگ ہال میں ڈنر کے بعد شیر دل اس کے پاس گیا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں وہ رہ نہیں
سکا۔ وہ اس وقت ویٹر سے کچھ کہہ رہی تھی جب شیر دل اس کے پاس آ گیا۔

”I hope you are alright now“ اس نے عکس کے متوجہ ہونے پر اس سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے
لیے ٹھٹکی پھر شیر دل نے اسے مسکراتے دیکھا۔

”I am absolutely alright“

شیر دل اور وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے کہ شیر دل کو اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک عجیب سا
احساس ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں نمی امنڈی تھی جسے اس نے نظریں چرا کر اور سر جھکا کر چھپایا تھا۔ وہ اب ہاتھ
میں پکڑے سونف کے کچھ دانوں کو ہتھیلی پر ہلکا سا رگڑتے ہوئے مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیر دل کو لگا
اسے وہم ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں نمی...... اور کس لیے؟...... عکس نے پاؤں بیرونی دروازے کی طرف
بڑھا دیے۔ شیر دل بھی پیچھے نہیں رکا۔ بہت خاموشی سے وہ ڈائننگ ہال سے برابر چلتے ہوئے نکلے تھے۔ ہاسٹل کی
طرف جاتے ہوئے شیر دل نے اس سے کہا۔

”گھوڑے سے دو چار دفعہ گرنا ضروری ہوتا ہے۔“ عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیوں؟ اس سے انسان کا کانفیڈنس بڑھتا ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

”کانفیڈنس میں اضافے کے لیے اس سے زیادہ مناسب اور کم خطرناک طریقے بھی ہوتے ہیں۔“

”زندگی اور گھوڑا دونوں گراتے ہیں اور گرے بغیر دونوں کی سمجھ نہیں آتی۔“ عکس یک دم ہنس پڑی۔ شیر دل نے
یک دم پھر اسے دیکھا تھا۔ اس کی ہنسی کی کھنک نے عجیب سے انداز میں اس کے دل کو چھوا تھا۔

”آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی؟“ شیر دل نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”میں نے انجوائے کیا ہے آپ کی بات
کو۔“ عکس نے جواباً کہا۔

”آپ دوسرے آدمی ہیں جو ایسی فلاسفی بول رہا ہے۔“

”اور پہلا آدمی کون ہے؟“ شیر دل نے عجیب سے تجسس کے ساتھ اس سے پوچھا۔

☆☆☆

”مجھے کیوں نہیں پوچھنا چاہیے یہ؟“ وہ اس دن جواد کے ساتھ اپنی دو سالہ کورٹ شپ اور منگنی کے بعد کا
پہلا آرگیومنٹ کر رہی تھی اور اس آرگیومنٹ کا آغاز اس نے نہیں کیا تھا۔ یہ کام جواد نے کیا تھا۔
”تمہیں میری ہر بات پر اعتبار کرنا چاہیے۔“ جواد کی گفتگو کی ٹیگ لائن تھی اور عکس زندگی میں پہلی بار اس سے گفتگو
کر کے اس قدر مایوس ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کے آفس میں یوں اچانک آ جانے کا مقصد صرف اس معاملے پر
اسے وضاحت دے کر صورت حال کو سنبھالنا تھا لیکن جواد کی گفتگو سے ہونے والا احساس اس کے برعکس تھا۔ اسے لگا وہ
جیسے بلاواسطہ اسے ذہنی طور پر آئندہ بھی ایسی ہی کسی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے آیا تھا کیونکہ وہ
سیاست میں آنے کی تیاری کر رہا تھا اور میڈیا اور مخالف پارٹی اسے اور اس کے خاندان کو بدنام کرنے کے لیے اب کچھ بھی
کر سکتے ہیں۔ وہ بار بار اسی ایک بات کو دہرا رہا تھا اور یہ بات اس نے اتنی بار دہرائی تھی کہ بے حد ٹھنڈے مزاج کی
ہونے کے باوجود عکس کو غصہ آ گیا تھا۔

”میڈیا کسی ٹھوس وجہ کے بغیر کیوں تمہیں بدنام کرنا چاہے گا؟ تم پاکستان کے کوئی بہت بڑے سیاست دان نہیں ہو
جواد...... اور میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں سیاست میں آنے کا شوق کیسے ہو گیا۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے
یہی کہا کہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور......“ جواد نے کچھ خفگی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

”اب مجھے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تم سے پوچھ کے تو نہیں کرنا اور پھر میں نے کل رات تمہارا attitude (رویّہ) اور
اپنے ساتھ تمہاری loyalty (وفاداری) دیکھ لی ہے۔“ جواد نے بے حد طنزیہ انداز میں اس سے کہا۔

”میری loyalty اور میرا attitude“ عکس جیسے کچھ ہکا بکا ہوئی۔

”میں وہاں پولیس اسٹیشن میں تھا تو تم نے میرے لیے کیا کیا؟...... تم ابو کو فون کر کے صرف یہ پوچھتی رہیں کہ
کیا میں واقعی شراب پیتے پکڑا گیا ہوں...... اور یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ تم نے ایک دفعہ بھی انہیں کسی قسم کی مدد کی
آفر نہیں کی۔“

”میں جانتی تھی اگر تم بے گناہ ہو گے تو تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔“ چند لمحے کے لیے جواد کو کوئی جواب نہیں سوجھا پھر جیسے
وہ بہت خفا ہو کر بولا۔

”میری پوری فیملی تمہاری وجہ سے مجھے ذلیل کر رہی ہے میرا مذاق اڑا رہی ہے۔“ عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”جواد تم میری وجہ سے پولیس اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔“

”بار بار پولیس اسٹیشن کا ذکر اس طرح کرنا بند کر دو کہ جیسے میں کوئی مرڈر کر کے وہاں پہنچا تھا۔“ اسے جواد کی بات پر
اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا اس کی بلند آواز سے۔ وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ اس کا آفس تھا اور وہاں باہر اس کا اسٹاف

موجود تھا جو اندر سے آنے والی ہر آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا...... بلند آواز میں بول رہا تھا۔
''ہمیں اگر اس طرح چلا کر ایک دوسرے سے بات کرنی ہے تو بہتر ہے ہم فی الحال بات نہ کریں جب تم
ہوش میں آجاؤ گے اور تمہیں لگے گا کہ ہم دو پڑھے لکھے مہذب لوگوں کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں تو پھر ہم بیٹھ کر اس ایشو پر
بات کرلیں گے جس کے لیے تم اتنی دور سے آئے ہو۔'' عکس نے یک دم اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی فائلز
سمیٹتے ہوئے بڑے تحمل سے اس سے کہا۔ جواد کا ردعمل اس کے لیے اس سے بھی شاکنگ ثابت ہوا تھا۔ وہ یک دم کرسی
سے کھڑا ہوا تھا اور اس نے غصے سے تقریباً دہاڑتے ہوئے اپنی پوری آواز سے اس سے کہا۔
''میں تمہارا اسٹاف نہیں ہوں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں...... تم مجھ سے ڈپٹی کمشنر بن کر بات کرنے کی جرات بھی
مت کرنا۔'' وہ چند لمحے کے لیے جیسے گنگ سی رہ گئی تھی۔ ذلت اور توہین کے احساس سے زیادہ وہ جواد کا وہ نیا روپ دیکھ کر
شاکڈ ہوئی تھی۔ وہ اس جواد سے آج پہلی بار متعارف ہوئی تھی۔ اتنے عرصے سے وہ ایک سوفٹ اسپوکن، بے حد تہذیب
اور شائستگی سے بات کرنے والے ایک بہت خوش مزاج اور نفیس آدمی سے آشنا تھی جس کے ساتھ زندگی کا سفر کرنا اسے
بہت آسان لگ رہا تھا۔
''تم ''ہونے والے'' شوہر ہو...... شوہر ہو نہیں اس لیے رعب جھاڑنے کی کوشش مت کرو۔ کم از کم اس طرح گلا پھاڑ
کر نہیں۔ یہ رشتہ صرف ایک انگوٹھی تک کا ہے جسے میں اگر ہاتھ سے اتار کر تمہارے منہ پر ماردوں تو تمہیں اس آفس سے
اٹھوا کر باہر پھنکوا سکتی ہوں اور کبھی بھی یہ مت سوچنا کہ میں یہ نہیں کر سکتی...... چاہے میں منگیتر ہوں یا تمہاری بیوی۔'' اس
نے بڑے تحمل سے ٹھنڈے لہجے میں جواد سے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر گاڑی لگوانے کی ہدایت دی۔ جواد کا پارا سیکنڈز
میں نیچے آیا تھا۔
''میرا خیال ہے ہمیں کہیں اور چل کر بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔'' اس نے اپنا اگلا جملہ مدھم آواز کے ساتھ بدلے
ہوئے لہجے میں کہا تھا۔
''نہیں...... کم از کم آج کے اس مظاہرے کے بعد میں آج کہیں بھی تم سے بیٹھ کر بات نہیں کروں گی۔ مرد کی
مردانگی طاقت رکھنے کے باوجود اپنی آواز کو مدھم رکھنے میں ہے، ایک عورت کے سامنے گلا پھاڑنے میں نہیں...... وہ عورت
کو بھی آتا ہے...... تم چائے پیو، میں جارہی ہوں۔''
''I am sorry'' وہ لمحوں میں اپنے اسی روپ میں آیا تھا جس سے وہ واقف تھی۔
''اچھی بات ہے لیکن ہم پھر بھی آج کوئی بات نہیں کریں گے۔'' وہ کہہ کر آفس سے نکل آئی تھی۔ اس وقت اس کا
ذہن سنسنا رہا تھا۔ ایک شادی شدہ زندگی کے کیا چیلنجز تھے اور کیا ہو سکتے تھے اس کا ایک مظاہرہ عکس نے دیکھ لیا تھا۔
''طاقتور ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر کے لیے وہ عجیب بے بسی اور مخمصے کا شکار ہو کر بیٹھی رہ گئی تھی اور جواد ایک روایتی
مرد کی طرح اسے اسی احساس سے دوچار کرنے آیا تھا۔ ایک طاقتور عورت کے کام کی جگہ پر اس کی تذلیل کی کوشش......
اسے نفسیاتی طور پر ہلانے اور خوفزدہ کرنے کا سب سے مؤثر اور کارآمد طریقہ یا شاید جواد کے لیے ایک رات پہلے ہونے
والے واقعے کے بعد اپنی عزت نفس کو اپنے اور اس کی نظروں میں بحال کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں تھا یا پھر شاید
یہ غصے کا وہ احساس تھا جو جواد کو پچھلی رات کے قصے میں عکس مراد علی کے بالکل نیوٹرل رہنے سے ہوا تھا...... ایک ڈیفنس
میکنزم کے تحت وہ اپنے آپ کو مزید وضاحتوں اور صفائیوں سے بچانے کے لیے عکس پر الٹ پڑا تھا...... وہ وقتی اشتعال تھا
یا سوچا سمجھا پلان...... وہ جو کچھ بھی تھا اس کے نتائج وہ نہیں نکلے تھے جو جواد چاہتا تھا لیکن اس واقعہ نے عکس کو بہت اپ
سیٹ کیا تھا...... پچھلی رات سے بھی زیادہ۔
''مردوں کے بارے میں میرے اندازے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔'' شیر دل نے رات کو عکس کو دوبارہ کال کی
تھی اور وہ چاہنے کے باوجود اس سے جواد کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی اور اپنی مایوسی چھپا نہیں سکی تھی۔
''یہ تو تم نے ٹھیک کہا، تم واقعی بڑے غلط اندازے لگاتی ہو مردوں کے بارے میں۔'' شیر دل نے اس کی بات کی

معنی خیز انداز میں تائید کی۔ عکس نے اس کے انداز اور رجے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔
''ہر بار میری judgement بہت flawed (ناقص) نکلتی ہے۔'' وہ واقعی کافی دل شکستہ تھی، شادی سے چند ہفتے پہلے ایسی کوئی صورتِ حال کسی بھی لڑکی کو اسی طرح دل شکستہ کرتی اور وہ بہر حال ایک لڑکی تھی۔
''میری سمجھ میں صرف یہ نہیں آیا کہ تمہیں جواد ملہی میں نظر کیا آیا تھا...... مجھے ایک نظر دیکھنے پر ہی وہ اچھا نہیں لگا تھا۔ تم دو سال اس سے ملتے جلتے رہنے کے بعد بھی یہ نہیں جان سکیں کہ وہ ایک short tempered (غصے والا) آدمی تھا جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عورت کے ساتھ ہر طرح کی جہالت کا مظاہرہ کر سکتا تھا...... میں یہ تو نہیں مان سکتا کہ تم محبت میں اندھی ہو گئی تھیں کیونکہ عکس مراد علی تم کو کوئی محبت میں اندھا کر سکتا تو ٹیکنیکلی اسپیکنگ یہ اعزاز صرف مجھے حاصل ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ کام میں بھی نہیں کر سکا تو کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں ہو سکتا...... تو واقعی سوچنے والی بات ہے یہ کہ تم نے اس آدمی کو اتنا misread کیوں کیا' اس کے مزاج کے حوالے سے۔'' عکس نے اس کے ابتدائی جملوں کو ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے اس کے آخری جملے پر کہا۔
''مجھے تو یہ تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ ڈرنک کرتا ہے۔''
''خیر وہ میرے لیے کوئی اتنا قابلِ اعتراض کام نہیں ہے۔'' شیر دل نے اسے ٹوکا۔
''کیا مطلب؟''
''مطلب یہ کہ یہ ایسی بات نہیں ہے جس پر تم کسی کو شادی کے لیے ریجیکٹ کر دو۔ عادی ڈرنک ہونا اور بات ہے اور سوشل ڈرنک کرنا ایک بالکل الگ...... بہت سارے مرد سوشل ڈرنک کرتے ہیں لیکن وہ بہت اچھے شوہر بھی ثابت ہوتے ہیں۔'' شیر دل نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔ عکس نے ایک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا۔
''تم ڈرنک کرتے ہو شیر دل؟'' شیر دل اس سوال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ حیرانی سے ہنسا تھا۔
''یہ کیا سوال ہوا؟''
''تم ڈرنک کرتے ہو شیر دل؟'' عکس نے اپنا سوال دہرایا۔
''یہاں میری بات نہیں ہو رہی۔'' شیر دل نے ایک بار پھر جواب سے بچنا چاہا۔
''تم ڈرنک کرتے ہو؟'' عکس اب بھی ڈائریکٹ تھی۔
''اگر کرتا ہوں تو تم کیا کرو گی؟'' شیر دل نے جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھا۔
''تم ڈرنک کرتے ہو؟'' اپنی اتنی طویل دوستی کے دوران آج پہلا موقع تھا جب شیر دل نے عکس کو کسی بات کو اس قدر اصرار سے پوچھتے دیکھا تھا۔
''نہیں۔'' شیر دل نے بالآخر کہا۔
''میں جانتی تھی۔'' اس نے دوسری طرف عکس کے انداز میں ایک عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔
''لیکن میں اسے برا نہیں سمجھتا۔'' شیر دل نے ساتھ ہی کہا۔
''میں سمجھتی ہوں۔''
''کون سی چیز زیادہ قابلِ اعتراض ہے تمہارے نزدیک، بدتمیز اور شارٹ ٹیمپرڈ ہونا یا شراب پینا؟'' شیر دل نے جیسے ایک عجیب احساس کے تحت اس سے پوچھا تھا۔
''شراب پینا۔'' عکس نے جواب دینے میں ایک لمحہ نہیں لیا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔
''مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ تم شراب پینے والوں سے اتنی نفرت کرتی ہو...... کیوں؟'' عکس اس بار چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔
''بہت سی چیزیں ہمیں پسند ہوتی ہیں اور کچھ پسند نہیں ہوتیں...... ہر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے لیے وجہ کا ہونا ضروری ہے کیا؟''

"لیکن وجہ ہوتی ہے ہر چیز کی۔" شیر دل نے اصرار کیا۔
"جواد کی کال آرہی ہے۔" عکس نے یک دم کہا۔
"تم اس سے بات کرنا چاہتی ہو؟"
"نہیں...... کم از کم آج نہیں...... اسے میرے آفس آکر اس طرح کی بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے میری عزت کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔"
"میں تمہیں یہی ایک فرق سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جب تم جواد کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر رہی تھیں جو تم میں اور جواد میں ہے۔ وہ جیسی فیملی سے تعلق رکھتا ہے وہاں اس طرح کے رویے کوئی بہت بڑی بات نہیں ہوتی۔ تمہیں پتا اور اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اگر اتنی بڑی پولیٹیکل فیملی سے تعلق رکھنے کے باوجود تم سے شادی کر رہا تھا تو اس کا تھوڑا ایچ تو تمہارے سر پر آنا ہی تھا۔"
"تمہیں لگتا ہے میں نے سوچے سمجھے بغیر جواد کا پرپوزل قبول کر لیا تھا؟" وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔
"سوچے سمجھے بغیر اگر کوئی پرپوزل تمہیں قبول کرنا چاہیے تھا تو میرا کرنا چاہیے تھا۔" شیر دل اس بار بھی سنجیدہ تھا۔
"میں بہت کنفیوزڈ ہوں شیر دل...... میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے...... جواد کو ایک موقع اور دینا چاہیے یا وہ سننا چاہیے جو میری چھٹی حس مجھ سے کہہ رہی ہے۔" اس نے ایک بار پھر شیر دل کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس سے جیسے اپنی الجھن شیئر کی تھی۔
"میں تمہیں اس بارے میں کوئی مشورہ دینے سے پہلے تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"
"کیا؟"
"تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیوں کیا تھا؟"
"اس وقت ہم کوئی اور مسئلہ ڈسکس کر رہے تھے۔" ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے عکس مراد علی کو کہتے سنا۔
"تم نے اس وقت مجھے کہا تھا تم کبھی نہ کبھی انکار کی وجہ مجھے بتاؤ گی؟" شیر دل نے اسے یاد دلایا۔
"وہ وقت ابھی نہیں آیا۔" عکس نے مدھم آواز میں کہا۔
"اور کب آئے گا؟"
"بہت جلد...... اس کے بعد تم شاید میری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرو گے۔" عکس نے بے حد عجیب سے انداز میں اس سے کہا۔
"یہ کام تو میں مر کر بھی نہیں کر سکتا۔ la belle dame sans merci...میں تمہیں اگنور نہیں کر سکتا۔" شیر دل نے جیسے احتجاج کیا تھا۔
"ہاں اگنور تم مجھے نہیں کر سکو گے لیکن......" وہ بات کہتے کہتے رک گئی تھی۔ شیر دل کو وہم ہوا اس کی آواز کو آنسوؤں کا پھندا لگا تھا۔
"عکس......" اس نے اسے پکارا۔
"زندگی میں بہت سارے فیصلے اپنی عزت کے لیے کرنے پڑتے ہیں۔" وہ چند لمحوں کے بعد بولی تھی۔ اس کی آواز صاف تھی۔ شیر دل کو لگا اس کا وہم وہم ہی تھا لیکن اس کا جملہ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔
"ہاں لیکن صرف عزت کی خاطر ہم کسی کنوئیں میں نہیں کود سکتے۔" اسے لگا تھا شاید عکس کا ریفرنس جواد کی طرف تھا۔
"میں کود سکتی ہوں۔" اس کے جواب نے کچھ دیر کے لیے شیر دل کو لاجواب کر دیا۔
"میں پھر تمہیں عقل مند نہیں کہوں گا۔"
"ذہانت میٹر نہیں کرتے پرائڈ میٹر کرتی ہے۔"
"یہ کون سی پرائڈ ہے جو تمہیں احمقانہ فیصلے کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہے؟" وہ اس کے جواب سے مزید

ناخوش ہوا تھا۔
"زندگی میں وہ فیصلے کرنے چاہئیں جو زندگی کو پرسکون کر دیں۔"
"میں بھی یہی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں...... بہت دیر بعد ہمت کر پا رہی ہوں اس فیصلے کی...... لیکن مجھے لگتا ہے یہ میری زندگی میں سے ایک بہت بڑی خلش نکال کر مجھے پرسکون کر دے گا......"
"ایک اور error of judgement" شیر دل نے تنقیدی انداز میں اسے وارن کیا۔
"دیکھتے ہیں۔" اس نے مختصراً کہا۔
"میں زندگی میں تمہیں اگر کبھی بزدلی کا مظاہرہ کرتے دیکھوں گا تو مجھے تم پر بہت غصہ آئے گا۔ عکس مراد علی میں کم از کم تمہیں ایک روایتی، کمزور، دبو، مصلحت پرست، exploited عورت کے روپ میں دیکھنا نہیں چاہتا۔" شیر دل نے بہت خفگی سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ بہت دیر کچھ نہیں بولی پھر اس نے شیر دل سے کہا۔
"اور میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔" شیر دل بے اختیار مسکرایا۔
"میں چاہتا ہوں تم زندگی ایسے مرد کے ساتھ گزارو جو تمہیں ویلیو کرے...... شادی کے نام پر ایک لیبل اور پھندا اپنے گلے میں مت لٹکاؤ۔" اسے سمجھاتے ہوئے شیر دل کو احساس نہیں ہوا تھا کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کے سارے ریفرنسز غلط سمجھا تھا...... وہ جواد ملہی کے بارے میں اس سے مشورہ نہیں کر رہی تھی وہ کس چیز کے بارے میں اس سے مشورہ کر رہی تھی وہ اسے دو دن بعد پتا چلا تھا...... عکس مراد علی نے اسے ہلا ڈالا تھا۔

☆☆☆

اپنے نانا کو حوالات کے پیچھے دیکھ کر چڑیا بل کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کی تکلیف دہ یادوں میں ایک اور یاد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ تھانے دار نے زمین کی جعلی رجسٹری کے کاغذ پھاڑتے ہوئے بڑے تنفر سے چڑیا سے کہا تھا۔ "اس بڈھے کو سمجھا دینا کہ وہ دوبارہ اس گاؤں میں مت آئے، زمین تو اسے ملنی نہیں ہے اگلی بار اپنی "عزت" سے بھی ہاتھ گنوا کر جائے گا۔" وہ کس "عزت" کی طرف اشارہ کر رہا تھا چڑیا کو وہ اشارہ سمجھنے کے لیے کسی ڈکشنری کی ضرورت نہیں تھی۔ تھانے میں ایس ایچ او کے کمرے میں تھانے کے آدھ درجن مرد عملے کی اوپر سے نیچے تک ایکسرے کی طرح چادر کے اندر لپٹے اس کے وجود کو کھنگالتی ہوئی غلیظ نظریں اور مکروہ مسکراہٹیں فاطمہ کو ہر مفہوم سمجھانے کے لیے کافی تھیں۔ تھانے دار کی میز کے بالمقابل کسی سائل کی طرح کھڑے لرزتے کانپتے خیر دین کے لیے گندی گالیاں سنتے ہوئے فاطمہ نے ویسا ہی خوف، ویسی ہی ذلت محسوس کی تھی اس دن بھی جیسے اس روز ڈی سی ہاؤس میں کپڑے اتار کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ آج بھی ویسی ہی دہشت زدہ اور گنگ تھی۔ ویسے ہی لرزتی کانپتی سسکیاں، ہچکیاں لیتی ہوئی...... وہ وہاں خیر دین کو چھڑانے آئی تھی بالکل اسی طرح جیسے کئی سال پہلے اس رات خیر دین اسے بچانے آیا تھا۔
دو دن پہلے گاؤں میں آتے ہی خیر دین نے اپنی زمین پر ناجائز قبضے کے لیے اپنے خاندان کے خلاف ایف آئی آر رجسٹر کروائی تھی اور اس وقت اس ایس ایچ او نے بڑی عزت اور احترام کے ساتھ رشوت کے کچھ پیسے لینے کے بعد اس کے خاندان کے خلاف ایک بڑی مضبوط ایف آئی آر رجسٹر کی تھی اور خیر دین کو بھرپور کارروائی کا یقین دلایا تھا۔ خیر دین ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری کے عالم میں واپس گھر آیا تھا اور تقریباً ساری رات بے حد خوشی کے عالم میں چڑیا کے ساتھ وہ سارے منصوبے شیئر کرتا رہا جو وہ اس زمین کی واپسی کے بعد اس زمین کے حوالے سے بنا رہا تھا۔ فاطمہ نے اپنے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے بعد اسی دن پہلی بار خیر دین کو ایسا خوش اور پرجوش دیکھا تھا۔
اگلی صبح فجر کے فوراً بعد چند پولیس والے آکر خیر دین کو گاؤں کے اس کے دوست کے گھر سے اس کے دوست کے ہمراہ ہتھکڑیاں پہنا کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے۔ فاطمہ جب تک گھر کی خواتین کے ہنگامے پر بیدار ہوئی خیر دین وہاں سے لے جایا جا چکا تھا۔ ایک عجیب سی سراسیمگی اور خوف کے عالم میں وہ جیسے بے اختیار ہو کر اس خاندان کی عورتوں کے ساتھ تھانے گئی تھی جہاں اسی تھانے دار نے اسے ان تمام عورتوں سے الگ کر لیا تھا۔ اس نے چڑیا کو خیر دین سے ملنے نہیں

دیا لیکن تھانے میں اپنے رہائشی کمرے میں کمرا بند کرتے ہوئے دھمکاتے ہوئے زمین کی رجسٹری لانے کا حکم دیا تھا اور اسے نہ لانے کی صورت میں جن نتائج کی دھمکی دی تھی وہ فاطمہ اس کمرے سے باہر آنے کے بعد کسی کے سامنے دہرانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ عجیب دہشت کے عالم میں وہ واپس گھر گئی تھی اور رجسٹری لے کر واپس تھانے آ گئی تھی۔ وہ پاکستان کے بہترین اسکول، کالج سے پڑھتے ہوئے پاکستان کے ایک بہترین میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھی۔ غیر معمولی ذہانت کی حامل ایک روشن مستقبل رکھنے والی لڑکی تھی۔ لیکن وہ پاکستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں ایک لوہار کی کمین کی نواسی تھی۔ جو کمزور اور نوجوان تھی اور بھیڑیوں کے چنگل میں تھی۔ گوشت خور تو شکار کرتے ہوئے صرف بھوک سے مجبور ہو کر گوشت کھانے کی ترغیب پاتا ہے۔ انسان وہ واحد جانور ہے جو بھوک نہ ہونے کے باوجود بھی کسی دوسرے انسان کی ہڈیاں بھنبھوڑ سکتا ہے۔ اگر وہ اسے کمزور، اکیلا اور تنہا نظر آتا ہو...... انسان صرف اسی وجہ سے زیادہ خطرناک اور کم ظرف جانور ہے۔

بہت سال پہلے ایسا ہی ایک سمجھوتا خیر دین نے کیا تھا جو حوالات سے باہر آنے کے لیے...... اپنی زندگی کے ملبے میں سے وہ سامان نکالنے کے لیے جس سے وہ دوبارہ اپنی زندگی بنا پاتا...... نو سال بعد وہ رجسٹری اس ایس ایچ او کو تھماتے ہوئے ویسا ہی ایک سمجھوتا فاطمہ نے کیا تھا...... اپنی اور خیر دین کی زندگی کو ایک بار پھر ملبے کا ڈھیر بن جانے سے بچانے کے لیے...... وہ جانتی تھی اس رجسٹری کے ضائع ہو جانے کے بعد زمین کا وہ ٹکڑا خیر دین کبھی نہیں لے سکتا تھا لیکن زمین کے ٹکڑے زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا باعث نہیں بننے چاہئیں۔

حوالات میں خیر دین اور چڑیا کا آمنا سامنا اس رجسٹری کو دے دینے کے بعد ہوا تھا اور حوالات کے دروازے کے سامنے چڑیا کے نمودار ہوتے ہی خیر دین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا حوالات کے اس کھلنے والے دروازے کی قیمت کیا تھی۔

خسارے کا ایک اور سودا اور دل پر ایک اور داغ لے کر وہ دونوں اپنی عزت کو جیسے ایک گٹھڑی میں باندھے ہمیشہ کے لیے اس گاؤں سے نکل آئے تھے اب پیچھے واقعی کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کے خاندان نے خیر دین کی ایف آئی آر کے جواب میں اس مقامی ایم پی اے کی مدد لی تھی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے اور جس کے لیے ایک ایف آئی آر کا صفحہ تھانے دار کی لاگ بک سے غائب کرنا جیسے ایک چھو منتر کی طرح تھا۔

خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے تھے۔ ایک بس میں آٹھ گھنٹے کا سفر کرتے ہوئے وہ واپس آ گئے تھے لیکن آٹھ گھنٹے کا وہ سفر فاطمہ کے لیے انگاروں کا ایک سفر تھا۔ خیر دین بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتا چادر میں منہ چھپائے روتا رہا تھا اور فاطمہ اس تجربے سے کچھ نئے سبق لیتی اور اندازے لگاتی رہی تھی...... اور اس سفر میں جو پہلا سبق اس نے لیا تھا وہ یہ تھا کہ نانا کی ہر بات ہمیشہ ٹھیک نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی بہت ساری باتیں صرف کتابی ہو سکتی تھیں۔ زندگی میں اچھائی برائے اچھائی ہو تو سکتی ہے لیکن یہ ہر وقت نہیں ہو سکتا۔ تھوڑا سا مزید زہر تھا جو اس نے پیا تھا اور وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین کی محبت کا منکا اس کے اندر سے وہ چوسنے میں ناکام رہا تھا۔

وہ ان پیپرز میں لکھی تحریر کا سر پیر سمجھنے میں ناکام ہو رہا تھا...... سرد ہاتھوں اور زرد چہرے کے ساتھ ان کو تین بار پڑھنے کے بعد بھی...... وہ ابھی ایک گھنٹے پہلے اپنی ماں کی ایمرجنسی کال پر بھاگم بھاگ لاہور آیا تھا لیکن جو کچھ وہ دیکھ اور سن رہا تھا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا...... پتا نہیں آتش فشاں پھٹ چکا تھا یا پھٹنے والا تھا...... مگر شیر دل اپنے پیروں کے نیچے زمین کی گڑگڑاہٹ سن رہا تھا...... کسی زلزلے کے آثار تھے یا پھر روز جزا اور مکافات عمل کا آغاز......

”یہ تمہارا mess ہے اسے تمہیں ہی ٹھیک کرنا ہے۔“ اس کی ماں نے اسے کہا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے وہ mess نہیں تھا وہ دلدل تھی جس میں ان کی فیملی پھنسنے والی تھی...... دلدل شہد کی ہو یا کیچڑ کی...... وہ اپنے اندر سے نکلنے نہیں دیتی جب تک انسان غرق نہ ہو جائے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

آئینے میں اُبھرنے والے عکس نے چڑیا کو روک لیا تھا۔ کسی پرانے، مہربان، واقفِ حال، غمگسار دوست کی طرح اس کے دل اور قدموں دونوں پر بیک وقت کمند ڈالی تھی...... ایسا دوست جس نے اس گھر میں اس کی زندگی کے بہترین دن اور بدترین رات دیکھی تھی۔
چڑیا بہت دیر تک نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں عکس کو دیکھتی رہی۔ آخری بار اس نے یہاں کھڑے ہو کر اس آئینے میں ایک پنک فراک والی ایک ریشمی سیاہ بالوں والی سانولی چمکدار آنکھوں والی ایک پری کو دیکھا تھا' وہ اس حادثے سے ایک شام پہلے کی بات تھی۔ اس دن اس نے اپنا دودھ کا تیسرا دانت گنوایا تھا اور اس آئینے میں وہ اور ایبک ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے تھے۔ وہ جانتی تھی ایبک اس کے دانت کا خلا دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا لیکن وہ ایبک کو اس طرح ہنستا دیکھ کر اپنے دانتوں کی مضحکہ خیز حالت بھول گئی تھی۔
اس آئینے میں وہ بونوں کو ڈھونڈا کرتی تھی۔ آج اس نے اس آئینے میں اپنے بچپن کو کھوجنے کی کوشش کی تھی۔ آئینہ اب اسے ایک سفید کوٹ کالر ڈاے لائن لانگ شرٹ، سیاہ چوڑی دار پاجامہ اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس بے حد اسمارٹ اور ویل ڈریسڈ لڑکی دکھا رہا تھا جس کے کانوں کے ڈائمنڈ اسٹڈز اور سفید شرٹ کے کھلے کالرز سے بہت نمایاں طور پر ابھری ہوئی کالر بون کے درمیان سنہری زنجیر میں چمکتا ایک ڈائمنڈ پینڈنٹ کسی بھی پرائس ٹیگ کے بغیر بھی اس کے متمول ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس عکس میں اس سستے پنک فراک اور کسی ریڑھی سے دو روپے میں ملنے والے ایک اتنے ہی سستے تتلیوں والے پنک ہیئر بینڈ والی اس آٹھ سالہ بچی کو ڈھونڈنا مشکل تھا۔ صرف وہ تھی جو اس "عکس" میں "چڑیا" کو کھوج رہی تھی اور کھوج پا رہی تھی۔ صرف وہ تھی جو اس آئینے میں وہ دیکھ رہی تھی' جو دوسرا کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔
اس آئینے میں اس نے وہ بونا دیکھا تھا جسے دیکھنے کی تمنا میں وہ گھنٹوں اس میں جھانکتی رہتی تھی اور پہلی بار وہ بونا نظر آجانے پر وہ خوف سے فریز ہو گئی تھی۔ وہ اس کی بدصورتی سے ڈر گئی تھی۔ زندگی نے اسے سکھایا تھا کہ ظاہری بدصورتی خوف کھانے والی شے نہیں ہوتی۔ یہ انسان کے اندر کی بدصورتی ہوتی ہے جس سے ڈرنا چاہیے۔ اس آئینے میں اسی دن اس نے انسان نام کا ایک بے حد خوب صورت بونا بھی دیکھا تھا جس سے خوف اور گھن نام کی کوئی شے اسے محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس بونے نے اس کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ زندگی میں بعض ولن ہیرو کی شکل میں اور بعض ہیرو ولن کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں لیکن ہم ان کی شناخت بہت دیر سے کر پاتے ہیں۔
چڑیا نے اس آئینے میں نظر آنے والے اس بدصورت بونے کو اس گھر میں دوبار دیکھا تھا۔ ایک راس آئینے میں جب وہ اسے دیکھ کر خوف کے عالم میں ہل بھی نہیں سکی تھی اور دوسری بار اس بونے نےلسی اور کو فریز کر کے......
چڑیا نے یک دم آئینے سے نظر ہٹائی تھی۔ وہ ساتھ بونے یک دم اتنے سالوں کے بعد اسے اپنے ابا اپنے گھر میں دیکھ کر خوشی سے جیسے پاگل ہو گئے تھے کنگا اس ہیل والے بند جوتے پر چھلانگ مار کر چڑھا تھا اور اس کی پنڈلی سے لپٹ گیا تھا۔ وہ اپنی خوشی کا اظہار ہمیشہ ایسے ہی کرتا تھا۔ منگا اچھل کر اس

کی جیکٹ کی آستین سے لٹک گیا تھا۔ اسے ہمیشہ اس طرح جھولنے میں مزہ آتا تھا۔ سب سے موٹا بونا ٹو کو اپنے تھرتھراتے ہوئے پیٹ کے ساتھ اور پھولے سانس کے ساتھ اس کے اردگرد ناچتا پھر رہا تھا۔ آنکھیں گھمانے والا کٹو خوشی سے بے حال اپنی ہی جگہ دروازے کی دہلیز پر پھرکی کی طرح ایک ہی جگہ گھومتا جا رہا تھا۔ ٹٹو نے اس کے دوسرے جوتے پر چڑھنے کی کوشش میں چھینک چھینک کر خود کو بے حال کر لیا تھا۔ ٹوفو بھاگتے ہوئے اپنی عینک کہیں گرا بیٹھا تھا اور اپنے بازو پھیلائے چڑیا کو ڈھونڈنے کی کوشش میں اِدھر اُدھر چیزوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا...... اور چڑیا کا فیورٹ ڈیڈ ڈوہ بس اس کے پیروں میں کھڑا بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا ہی جا رہا تھا...... سب کچھ وہیں تھا جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی یا اسے جانا پڑا تھا...... ایلس اپنے ونڈر لینڈ میں لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایبک کی بات پر اس کے قریب سے گزرتے گزرتے جیسے واپس لوٹ آئی تھی۔ اس کی اطلاع نے فاطمہ کو جیسے اسی طرح حیران کیا تھا۔

''آنٹی مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟'' اس نے کالج کے کاریڈور کی دیوار سے ٹکے ایبک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خلافِ توقع بہت سنجیدہ تھا۔

''یہ تو تمہیں ممی ہی بتا سکتی ہیں، مجھے تو انہوں نے صرف تمہیں یہ میسج دینے کے لیے کہا تھا۔'' فاطمہ کچھ دیر الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے اور ایبک کے درمیان اتنی سی بات بھی کئی دنوں کے بعد ہو رہی تھی۔ وہ کالج میں ایبک کو مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھی اور اس کی اس کوشش نے ایبک کو جیسے بری طرح زچ کر دیا تھا اور اب یک دم وہ اس کے سامنے یہ مطالبہ لے کر آ گیا تھا کہ مسز سلطان اس سے ملنا چاہتی تھیں۔

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ اگلے دن مسز سلطان کے آفس میں آئی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس سے انتہائی گرم جوشی اور شفقت کے ساتھ ملی تھیں۔

''کتنے دن ہو گئے تم سے ملاقات ہوئے...... میں نے کئی بار ایبک سے تمہارے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کہا تم اس سے کچھ خفا ہو۔'' وہ اپنے آفس میں اپنی ٹیبل سے.... فائلز سمیٹتے ہوئے بولیں۔ چند لمحوں کے لیے فاطمہ کو عجیب سی شرمندگی ہوئی۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ ایبک اپنی ماں سے اس کی خفگی کو اتنے کھلے طریقے سے شیئر کرے گا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ گڑبڑا کر صفائی دینے والے انداز میں بولی۔

''تو پھر تم دونوں نے کمبائنڈ اسٹڈی کیوں بند کر دی...... آپس میں ملنا جلنا کیوں چھوڑ دیا؟ ایبک تمہارے اس رویے کی وجہ سے بے حد اَپ سیٹ ہے اور اسی وجہ سے میں نے سوچا کہ میں تم سے خود بات کروں۔'' فاطمہ کو بڑی مشکل ہوئی مسز سلطان کے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے میں۔ وہ کبھی مسز سلطان سے اپنے اور ایبک کے تعلق کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔ خاص طور پر اب جبکہ ایبک کی زندگی میں اس کی فیملی کی منتخب کردہ ایک اور لڑکی آ چکی تھی لیکن اس کی مشکل کو مسز سلطان نے خود ہی حل کر دیا تھا۔

''ایبک تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور یہ پسندیدگی ایک کلاس فیلو اور دوست کی حیثیت سے نہیں ہے۔'' فاطمہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ جو آخری شے وہ مسز سلطان سے توقع کر سکتی تھی وہ بات تھی جو انہوں نے ابھی کی تھی۔

''ایبک نے مجھ سے اس پسندیدگی کو کبھی نہیں چھپایا لیکن کچھ فیملی پرابلمز ایسی ہو گئیں کہ ایبک کی بات طے کرنی پڑی مجھے...... لیکن بیٹا ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ خوش اسلوبی کے ساتھ یہ معاملہ ختم ہو جائے۔ ایبک اور میری بھتیجی میں کسی قسم کی کوئی compatability نہیں ہے اگر فیملی کا معاملہ نہیں ہوتا تو یہ رشتہ بہت پہلے ختم کر دیتی میں کیونکہ مجھے اپنے بچوں کی خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہے لیکن بس فیملی کی کچھ مجبوریاں ہیں جن کی وجہ سے یہ رشتہ لٹک ہی گیا ہے۔'' فاطمہ بے یقینی کے عالم میں مسز سلطان کی باتیں سن رہی تھی۔ آسمان اس کے سر پر گر جاتا تو اسے اس قدر شاک نہیں پہنچتا جتنا ابھی پہنچ رہا تھا۔ مسز سلطان اس کے اور ایبک کے بارے میں پہلے ہی سارے اندازے اور قیاس لگائے بیٹھی تھیں جو سو فی صد ٹھیک تھے اور اب وہ اسے اس پچھتاوے سے آگاہ کر رہی تھیں جو اس رشتے کی صورت میں انہیں ہوا تھا۔

''بیٹا میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اور ایبک اپنی دوستی پہلے کی طرح رکھو، اکٹھے پڑھو...... ساتھ گھومو پھرو جیسے پہلے تھے۔ میں تمہیں یقین دلا رہی ہوں کہ ہاؤس جاب ختم ہونے تک یہ معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میں ایبک کی شادی وہیں کروں گی جہاں وہ چاہتا ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ کہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے آخری جملہ بے حد معنی خیز انداز میں کہا۔ ایک عجیب اچنبھے کے عالم میں فاطمہ اس دن ان کے آفس سے اٹھ کر آئی تھی۔ مسز سلطان نے اسے صرف یہی نہیں کہا تھا۔ انہوں نے اس سے اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں۔ بہت ساری یقین دہانیاں، خوش گمانیاں، بہت ساری تسلیاں اور آخر میں بار بار ایک ہی ریکویسٹ کہ وہ ایبک کے ساتھ کمبائنڈ اسٹڈیز جاری رکھے۔ وہ اس کی عدم توجہی کی وجہ سے اپنی اسٹڈیز پر فوکس نہیں کر پا رہا تھا اور مسز سلطان کے لیے یہ بہت تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت بات تھی خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ایبک کو آگے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر بھجوانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

فاطمہ بہت الجھے ذہن کے ساتھ مسز سلطان کے آفس سے واپس آئی تھی۔ اسے ایک عجیب سی صورتِ حال میں ڈال دیا تھا انہوں نے۔ ایک طرف جہاں اسے مسز سلطان کی بات پر بے حد خوشی ہوئی تھی دوسری طرف وہ ایک عجیب ذہنی کشمکش کا شکار بھی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں یہ سب ٹھیک تھا یا نہیں۔ پتا نہیں یہ سب اسے کرنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ وہ خیر دین سے یہ مسئلہ ڈسکس کرنا چاہتی تھی لیکن وہ متامل تھی۔ اسے خیر دین کے جواب کا اندازہ تھا اور کہیں نہ کہیں چڑیا خیر دین سے وہ جواب نہیں چاہتی تھی لیکن خیر دین سے مسئلہ ڈسکس کیے بغیر اس مسئلے کا کوئی حل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''تمہیں میری بات پر یقین کیوں نہیں آ رہا...... خاص طور پر اب جب ممی کے منہ سے تم نے سن لیا کہ وہ بھی یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔'' اگلے دن ایبک بڑے معمول کے انداز میں بے تکلفی سے اس سے ملا تھا اور اس نے ہمیشہ کی طرح اس سے بڑے گرم جوش انداز میں بات چیت کا آغاز کیا تھا

نہ چاہنے کے باوجود چڑیا اس سے بات کرنے لگی تھی لیکن اس کے انداز میں ایسا کچھ ضرور تھا جس نے کچھ دیر کے بعد ایبک کو زچ کر دیا تھا۔

"ایبک مجھے یوں لگ رہا ہے میں کسی کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔" فاطمہ نے بے حد سنجیدگی سے ایبک سے بالآخر اپنی ذہنی کیفیت شیئر کی تھی۔ وہ جیسے حیران رہ گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کس کی زندگی کے ساتھ کھیل رہی ہو تم؟"

"تمہاری منگیتر کی...... اور جانتے بوجھتے۔" ایبک اس کے احساسِ جرم پر قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔

"تم بھی بہت عجیب ہو، اس ساری صورتِ حال میں تم کہاں سے قصوروار ہو گئی ہو۔"

"میں درمیان میں نہ آتی تو تمہیں اس منگنی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔" فاطمہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"تم میری زندگی میں ناجیہ سے پہلے آئی تھیں۔ ناجیہ سے پہلے سے ہو پھر تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو؟" ایبک نے جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ فاطمہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ وہ بچی نہیں تھی کہ اس معاملے کی نزاکت کو نہ سمجھ پاتی اور کہیں نہ کہیں ایبک سے محبت کرنے کے باوجود اسے اندازہ تھا کہ ایبک اس معاملے میں بے حد خود غرضی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پہلے اس نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا جب اس نے اپنی فیملی کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے فاطمہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مکمل طور پر فراموش کرتے ہوئے ناجیہ سے منگنی کر لی تھی اور نہ صرف اس نے منگنی کر لی تھی بلکہ اس نے اس منگنی سے اس کو مکمل طور پر بے خبر بھی رکھا تھا اور اب وہ اس کے ساتھ اسی طرح کے تعلقات استوار رکھے ہوئے اس لڑکی کی زندگی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"ناجیہ جانتی ہے کہ تم یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہو اور کہیں اور انٹرسٹڈ ہو؟" فاطمہ نے یک دم بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔ ایبک ایک بار پھر جواب دینے میں متامل ہوا پھر بالآخر اس نے کہا۔

"ہاں وہ جانتی ہے، میں نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے اور وہ تمہارے بارے میں جاننے کے بعد خود بھی اس رشتے میں زیادہ انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ یہ اب صرف دو فیملیز کی انا کا زیادہ مسئلہ ہے اور کچھ نہیں...... اسی لیے تو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ بس تم تھوڑا وقت دے دو مجھے۔ یہ رشتہ ختم ہو جائے گا کیونکہ میں اور ناجیہ دونوں خود بھی اس رشتے کو قائم رکھنے میں انٹرسٹڈ نہیں ہیں۔" ایبک نے اسے بے حد تفصیل سے بتایا۔

"فاطمہ بے اختیار پُرسکون ہوئی۔ ایک عجیب سا بوجھ تھا جو اس کے دل اور کندھوں سے ہٹا تھا۔ ناجیہ اس ساری صورتِ حال سے واقف تھی...... مطلب فاطمہ کسی ایسے کھیل کا حصہ نہیں تھی جس میں ناجیہ کی زندگی خراب ہوتی۔ وہ ایبک کا انتظار کر سکتی تھی۔ اسے موقع دے سکتی تھی کہ وہ اس تمام مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کر لے۔ اس دن کالج گراؤنڈ میں ایبک کے ساتھ بیٹھے اس نے یہی فیصلہ کیا تھا۔

زندگی ایک بار پھر اسی پرانی ڈگر پر آ گئی تھی...... وہی خواب...... وعدے...... خواہشات، یقین دہانیاں، خوش گمانیاں...... فاطمہ ایک بار پھر اپنے مستقبل کو انہی سارے دھاگوں سے بُننے لگی تھی۔ خیر دین کو اگلے کئی ہفتوں تک ایبک کے ساتھ اس کے patch up کے بارے میں پتا نہیں چلا لیکن پھر آہستہ

آہستہ فاطمہ نے ایک بار پھر خیر دین کو باور کروانا شروع کر دیا تھا کہ وہ اور ایبک ایک بار پھر سے اکٹھے ہو گئے تھے۔ خیر دین شروع میں اس سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ وہ صرف دوستی تھی یا...... اسے توقع تھی کہ یہ صرف دوستی ہی ہو سکتی تھی۔ چڑیا ایبک کی منگنی ہو جانے کے بعد کیسے اس کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق بحال کر سکتی تھی۔ خیر دین بہت دیر سے ہی فاطمہ سے یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور فاطمہ کے جواب نے اسے بھی اسی طرح الجھا ہوا چھوڑا تھا جس طرح فاطمہ خود شروع میں الجھی تھی۔ فاطمہ سے اس نے بہت سارے سوال جواب کیے تھے اور فاطمہ نے بہت مدافعانہ انداز میں ایبک کا دفاع کرتے ہوئے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔ خیر دین، فاطمہ کے جوابوں میں دکھنے والے پیوندوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی باتیں سنتا اور سر ہلاتا رہا تھا۔ وہ کچی عمر کی پہلی محبت تھی اور وہ اپنی نواسی کو بے رحمی اور بے حسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ دنیا بہت ظالم، خود غرض اور جھوٹی ہوتی ہے...... فریب در فریب کے جال بُنتی اور پھینکتی رہتی ہے...... اور یہ کہ لوگوں کی زبانوں کے کٹھن میں بہت ساز ہر ہوتا ہے جو سنکھیا نہیں ہوتا کہ فوری اثر کرے لیکن مارنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ دنیا کی ایک بھیانک تصویر اس کی نواسی بچپن میں دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی دنیا کو ایک بار پھر کالے اور گہرے رنگوں سے خراب کرے۔ خیر دین چڑیا کا اعتبار رشتوں، دوستوں، انسانوں سے نہیں اٹھانا چاہتا تھا...... پر اب اس کے لیے پریشانی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی عزیز نواسی کو کسی آنے والی تکلیف کی طرف بڑھتے دیکھ کر کیسے بچائے۔

"ایک بات بتاؤ چڑیا...... اگر ایبک کی منگنی ختم نہیں ہوئی تو؟" فاطمہ خیر دین کی بات پر حیران رہ گئی تھی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا نانا...... میں نے آپ کو بتایا ہے وہ اور اس کی منگیتر دونوں یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے بے حد یقین سے کہا۔

"ایک سال سے وہ یہ کوشش کر رہے ہیں ابھی تک تو ختم نہیں کر سکے۔" وہ کچھ دیر خیر دین کی بات کا جواب نہیں دے سکی۔

"لیکن وہ کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے مدافعانہ انداز میں کچھ دیر کے بعد کہا۔

"ہاں لیکن وہ کوشش ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی۔ بعض کوششیں کبھی کبھار کامیاب نہیں بھی ہوتیں۔" اس نے دھیمے لہجے میں اسے آگے آنے والے گڑھے سے خبردار کیا۔ "تم نے یہ سوچا ہے اگر یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی تو تم کیا کرو گی؟" فاطمہ الجھے انداز میں خیر دین کو دیکھتی رہی۔

"میں کیا کروں گی؟" اس نے جیسے حیرانی سے خیر دین کے سوال کو دہرایا تھا۔

"زندگی میں ہمارے پاس ہمیشہ ایک پلان بی ہونا چاہیے۔ ہر بڑی ناکامی کے بعد زندگی میں آگے بڑھتے رہنے کے لیے ایک متبادل راستہ...... اگر ہم زندگی میں وہ نہ پا سکیں یا وہ نہ کر سکیں جو ہمارا ٹارگٹ ہے تو پھر ہمارے پاس ایک دوسرا آپشن ہونا چاہیے اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے۔" فاطمہ نے خیر دین کی بات بڑی دلچسپی سے سنی تھی۔ وہ دنیا کا پہلا نانا تھا جو اپنی نواسی کو محبت میں ناکامی کے بعد ایک متبادل آپشن ڈھونڈ کر رکھنے کی ہدایت دے رہا تھا۔ فاطمہ ہنس پڑی تھی ایک typical ...ہ وہ لڑکی کی طرح جسے یقین تھا کہ کم سے کم زندگی میں اسے کسی متبادل آپشن کی ضرورت نہیں

پڑے گی۔ خیر دین اس کے ہنسنے پر مسکرا دیا تھا اسے اس سے اس عمر میں اس مسئلے پر اسی غیر سنجیدگی کی توقع تھی۔

''زندگی میں ہم نقصان کسی بھی کام میں ناکام ہونے کی وجہ سے نہیں اٹھاتے...... ایک اچھا پلان بی نہ ہونے کی وجہ سے اٹھاتے ہیں۔'' خیر دین اسے سمجھانے لگا تھا۔ وہ خیر دین کی بات بغور سنتی رہی تھی۔ ایبک کے معاملے پر وہ فارمولا اپلائی کرتی نہ کرتی زندگی کی اور بہت سی چیزوں پر وہ فارمولا لگ سکتا تھا۔ فاطمہ بڑی روانی سے وہی گھسا پٹا جملہ خیر دین سے بولنا چاہتی تھی...... نانا ایبک ایسا نہیں ہے لیکن پھر وہ رک گئی تھی۔ ایبک ایسا نہیں تھا اس کے باوجود ایک سال پہلے اس نے چپ چپاتے اپنی کزن سے منگنی کرلی تھی۔ ایک سال میں ایک بار بھی فاطمہ کو اس بات کا علم ہونے نہیں دیا تھا...... نہ ایبک نے نہ ہی مسز سلطان نے...... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واہموں کی ڈور سے الجھ گئی تھی۔

''آپ کیا چاہتے ہیں نانا؟'' اس نے مبہم انداز میں خیر دین سے پوچھا۔

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی دوسرے کی ناکامی اور کوتاہی کے لیے خود کو کبھی مجرم مت ٹھہرانا۔ زندگی اَن ہونیوں اور معجزات کا دوسرا نام ہے۔'' فاطمہ خیر دین کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اس کے الفاظ اس رات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے تھے۔

صبح ہونے تک اس نے خیر دین کی تنبیہ کم نصیحت کو بھلا دینے کی کوشش کی تھی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ایبک کا چہرہ دیکھتے ہی خیر دین کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے تھے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اسے اس شخص کے لیے خیر دین کی ہدایات کی ضرورت تھی۔ وہ خیر دین کو اس شام کہنا چاہتی تھی کہ اندھی محبت واحد چیز ہوتی ہے جس میں ناکام ہونے کے بعد کوئی پلان بی کام نہیں آتا...... اور دراصل محبت کرتے وقت بھی انسان کوئی پلان بی نہیں رکھتا...... اندھی محبت زندگی میں انسان کو صرف ایک بار ہوتی ہے...... بعد میں گزارہ ہوتا ہے بعض دفعہ عادت اور زیادہ تر ضرورت...... لیکن پھر اندھی محبت نام کی شے انسان کو عقل سے پیدل نہیں کرتی۔

ایبک سلطان کو میڈیکل کے آخری تمام سال کے دوران وہ صرف اسی ترازو میں تولتی رہی تھی۔ کیا اسے اس سے اندھی محبت تھی......؟ کیا وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکے گی اس طرح جس طرح رہتی آئی تھی؟ کیا وہ اس کے بعد کسی دوسرے مرد کو اپنی زندگی میں قبول کر سکے گی؟ کسی ایک سوال کا جواب اسے واضح نہیں مل پاتا تھا۔ کوئی ایک کانٹا تھا جو خیر دین کے لفظوں نے اس کے اندر گاڑ دیا تھا اور اس سے اٹھنے والی ٹیسیں اسے حواس سے باہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔

وہ دونوں ہاؤس جاب کر رہے تھے جب تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد بالآخر فاطمہ نے ایک بار پھر ایبک سے اپنے اور اس کے رشتے کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے لیے کہا تھا اور اس کے جواب نے فاطمہ کو سُن کر دیا تھا۔ اس کے اور ناجیہ کے نکاح کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور ایبک نے بے حد معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ فاطمہ کو اس بار پہلے سے زیادہ بے یقینی ہوئی تھی کیونکہ اس بار ایبک کے لہجے میں کوئی پریشانی کوئی اضطراب نہیں تھا۔ وہ بے حد مطمئن اور پُرسکون تھا یوں جیسے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ ایک عجیب سی ہتک محسوس کی تھی فاطمہ نے اس

انداز سے۔ اس نے ایبک سلطان سے کوئی اگلا سوال جواب نہیں کیا تھا۔ کوئی بحث و مباحثہ نہیں۔ نہ وہ اس پر چلائی تھی نہ اس نے ایبک سلطان کو برا بھلا کہا تھا۔ وہ شل ہوتے اعصاب کے ساتھ ہاسٹل واپس آگئی تھی۔

اسے زندگی میں کبھی شادی کی خواہش تھی نہ ہی کوئی جلدی...... ایبک سلطان نے ہی اس کے اندر شادی کی خواہش پیدا کی تھی اور خیر دین اور اس کی ماں کے بار بار کے تقاضوں اور دباؤ سے شادی کی جلدی کا مطالبہ...... اور اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا صرف تکلیف کا ایک عجیب سا احساس تھا جو باقی رہ گیا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے کی طرح وہ دنوں نہیں روئی تھی نہ ہی اس نے پہلے کی طرح خیر دین کو پریشان کیا تھا۔ اس نے ایبک سلطان اور اس کے ساتھ تمام یادوں سے اپنے آپ کو cut off کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہی مینٹل بلاک جو اس نے بچپن کے اس حادثے کو بھلانے کے لیے اپنے آپ پر لگایا تھا وہ اب بھی کام آیا تھا...... لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ہر روز ایبک سلطان سے ملتی تھی۔ اس سے بات بھی کرتی تھی اور اس نے بڑے تحمل کے ساتھ اس سے اس کے نکاح کی تقریب کا دعوت نامہ بھی لے لیا تھا۔

''میں تو سمجھ رہی تھی تم دونوں committed ہو اور وہ تم سے شادی کرے گا۔'' اس کی روم میٹ فائزہ نے ایبک سلطان کے نکاح کی خبر سننے پر جیسے بے حد شاک کے عالم میں فاطمہ سے کہا تھا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں تھی...... ہم صرف دوست تھے۔'' اس نے بڑے تحمل کے ساتھ بات کو گول مول کیا تھا۔ وہاں کسی کے ساتھ بیٹھ کر اپنی تکلیف اور تذلیل شیئر کرنے کا مطلب ہاسٹل کی دیواروں پر اپنا اشتہار لگانا تھا اور فاطمہ کو اس ''ناموری'' کی خواہش نہیں تھی۔

''تم نے اس کے لیے بہت کچھ کیا ہے...... اگر ایبک کی کوئی پوزیشن آتی ہے تو یہ صرف تمہاری وجہ سے ہو گی۔'' اس نے فائزہ کو ٹوک دیا۔

''نہیں، میں نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا...... وہ خود بہت لائق ہے۔''

''ہو گا لیکن ایبک سلطان پیراسائٹ ہے اس نے ساری زندگی یہی کیا ہے، اسکول میں تھا تو سب سے لائق لڑکی کے ساتھ فرینڈشپ کروائی ہوئی تھی اس کی ماں نے...... کالج کے دو سال ایک اور لڑکی کے ساتھ چپک کر گزارے اس نے...... اور پھر میڈیکل کے پانچ سالوں کے لیے تو تمہاری شکل میں اس کی لاٹری نکل آئی۔'' وہ بے حس و حرکت فائزہ کی شکل دیکھتی رہی۔ اسے کچھ دیر کے لیے اس کی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔

''اس کا بھائی میری بہن کا کلاس فیلو تھا اور اس کا بھی یہی طریقہ تھا۔ مسز سلطان نے اپنی اولاد کو پیراسائٹس کی طرح پالا تھا...... جونکیں نہیں ہوتیں جو دوسروں کا خون چوس چوس کر پلتی ہیں بالکل ویسے دوسروں کی قابلیت کا خون چوس چوس کر اپنی اولاد کو قابل بنایا ہے انہوں نے۔'' اس نے آج پہلی بار فائزہ کو بولتے سنا تھا۔

''اب اِسے فیملی کی امریکن نیشنل لڑکی مل گئی ہے۔ اس کے سر پر امریکا میں ریزیڈنسی اور اسپیشلائزیشن ہو گی۔'' فاطمہ، فائزہ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔

''تم ایبک کی فیملی کو کیسے جانتی ہو؟'' اس نے بہ مشکل اس کو ٹوکتے ہوئے کہا تھا۔

''اس کی فیملی کو...... میں تو ان کی سات پشتوں کو جانتی ہوں اور خاص طور پر مسز سلطان کو...... ان کی شفقت محبت اور نرم مزاجی کے سارے ڈھکوسلوں سے واقف ہوں میں۔ میری کزن کے ساتھ تین سال ایبک کے چھوٹے بھائی کا افیئر رہا تھا...... topper تھی وہ بھی اور اس نے اپنا بیڑا غرق کرلیا تھا ایزد سلطان کے چکر میں...... دونوں بیکن میں تھے...... اب ایزد صاحب تو اطمینان سے علامہ اقبال میڈیکل کالج میں پہنچ گئے ہیں اور میری کزن کو بہ مشکل فیصل آباد میں ایڈمیشن ملا ہے اور اب ایزد صاحب کا ایک اور topper لڑکی کے ساتھ افیئر زوروں پر ہے اور میری کزن نے بریک اپ کے بعد خودکشی کی بھی کوشش کی اور ایزد صاحب اب اس سے چھپتے پھرتے ہیں۔'' فائزہ بڑی تلخی سے کہہ رہی تھی۔

''مسز سلطان اے لیولز تک میرے خالو کی فیملی کو یہی جھانسا دیتی رہیں کہ انہوں نے ایزد کی شادی تگین سے ہی کرنی ہے بس ذرا ایزد میڈیکل میں چلا جائے پھر دونوں کی منگنی یا نکاح کردیں گے اور میڈیکل میں ایزد کے پہنچتے ہی انہوں نے میری کزن پر ہر طرح کے الزام لگانے شروع کردیے۔ یوں جیسے میری کزن کوئی بڑی بدکردار لڑکی تھی جس نے ان کے پانچ وقت کے نمازی بیٹے کا کردار اور ایمان خراب کردیا...... انتہائی گھٹیا خاندان ہے مسز سلطان کا۔'' فاطمہ ہونقوں کی طرح فائزہ کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''تم نے پہلے کبھی مجھ سے یہ سب ڈسکس نہیں کیا۔'' ایک لمبی خاموشی کے بعد فاطمہ نے بالآخر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ اس کے گلے کو عجیب گرہ لگ گئی تھی۔

''میں نے چند بار تم سے ذکر کیا تھا لیکن تم نے ایبک کے بارے میں یا مسز سلطان کے بارے میں کسی قسم کی بات چیت میں دلچسپی نہیں لی تو پھر میں نے بھی سوچا کہ میں کیوں خوامخواہ تمہارے سامنے یہ قصے لے کر بیٹھوں...... ویسے بھی اگر تمہاری کوئی ایموشنل انوالومنٹ نہیں تھی اس کے ساتھ تو پھر تمہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا...... لیکن میں پھر بھی سمجھتی ہوں کہ تم نے ایبک کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔''

زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب فاطمہ کو اپنے آئی کیو لیول پر شبہ ہوا۔ اپنی ذہانت صرف ایک وہم لگی اور اپنا آپ چغد اور احمق۔ فائزہ غلط نہیں کہہ رہی تھی اس نے ایبک کے لیے واقعی ضرورت سے بڑھ کر کیا تھا۔ ایک دوست کی طرح نہیں...... وہ اسے اپنا مستقبل سمجھ کر اپنا ہونے والا جیون ساتھی سمجھتے ہوئے اسے مدد دینے کی کوشش کرتی تھی۔ ایبک سلطان نے پانچ سال اسٹڈیز کے معاملے میں اپنا سارا بوجھ فاطمہ پر ڈالے رکھا تھا۔ فاطمہ کو اب یاد آرہا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس کا بیسٹ فرینڈ ہمیشہ ایک ٹاپر ہی رہا ہے۔ فائزہ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ اسکول میں عائشہ نامی ایک لڑکی کے بہت قریب رہا تھا اور کالج میں ربیعہ نامی ایک اور لڑکی کے ساتھ...... فاطمہ نے اکثر اس کے منہ سے ان کا ذکر سنا تھا۔ وہ اس کے لیے جو جو کیا کرتی تھیں اس نے ان کے قصے بھی سنے تھے لیکن وہ دونوں لڑکیاں میڈیکل کے پانچ سالوں میں ایبک کی زندگی میں کبھی بھی نمودار نہیں ہوئیں۔ وہ اس کی بیسٹ فرینڈز تھیں۔ اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی کنگ ایڈورڈ تک نہیں پہنچ سکی تھی اور ایبک کے لیے ان کی یوٹیلٹی ختم ہوگئی

تھی۔ میڈیکل کے پانچ سال اس نے فاطمہ کو ٹشو پیپر کے طور پر استعمال کیا تھا اور اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا وہ اسے محبت سمجھتی رہی۔ پتا نہیں یہ خوش فہمی کی حد تھی یا بے وقوفی کی۔ ایبک سلطان کا معما اس نے بہت دیر سے حل کیا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی گتھی سلجھاتے میں پانچ سال نہیں لیے تھے۔ ایک ہوتی ہے محبت میں ناکامی...... ایک ہوتا ہے محبت کے نام پر الو بننا...... وہ محبت میں ناکام نہیں ہوئی تھی الو بنی تھی۔ اس نے ایک بار کسی سے سنا تھا دنیا میں سب سے کارگر اور بدترین exploitation محبت کے نام پر ہوتی ہے اور اسے پہلی بار اپنی زندگی کے ایک تلخ تجربے نے سمجھایا تھا کہ یہ کیسے ہوتا تھا۔

خیر دین کا تجربہ ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ چڑیا کے یقین کو ایک بار پھر مات ہوئی تھی اور اس مات نے ایک بار پھر چڑیا کو خیر دین کی نصیحت پر غور کرنے پر مجبور کردیا تھا...... ''پلان بی'' اسے اب ایک پلان بی کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

اپنے تنے ہوئے جسم کو حتی الامکان ریلیکس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایبک نے پہلی بار اس آئینے کو دیکھا...... وہ اب بھی ویسے ہی وہاں کھڑا تھا...... اپنے اسی استقبالی، خیر مقدمی انداز میں...... اسی غرور اور طنطنے کے ساتھ...... اسی پُراسراریت میں لپٹے جس نے پہلی بار ایبک کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ برآمدے میں قدم بڑھاتے ہوئے اس نے آئینے پر ایک نظر اور دوڑائی تھی۔

اس گھر میں اس کی آمد 26 سال بعد ہوئی تھی اور ان 26 سالوں کو اس نے جیسے ایک مونوسیکنڈ میں کیلکولیٹ کرلیا تھا۔ گھر کے اندرونی دروازے کو اس کے انتظار میں کھڑے ملازم نے کھولتے ہوئے اسے سلام کیا تھا۔ اس نے سانس روک کر اس دروازے سے اندر قدم رکھا تھا۔ اس کا ماتحت عملہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کا پی اے اس گھر کی تفصیلات سے اسے آگاہ کررہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ایبک کا دل چاہا وہ اسے روک دے...... اسے اس گھر کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھر اس کی یادداشت کا وہ انمٹ حصہ تھا۔ جسے کھرچ کھرچ کر مٹا دینے کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔

ہال میں پہنچ کر چند لمحوں کے لیے اس کے قدم فریز ہوگئے تھے۔ وہ سیڑھیاں اب اس کے سامنے تھیں۔ سیڑھیاں چیخیں اور......

''وہ وہاں کچن کا دروازہ ہے۔'' پی اے کا جملہ اسے جیسے کرنٹ کی طرح لگا تھا جو اسے حال میں واپس لے آیا تھا۔ اس نے چونک کر ان سیڑھیوں سے نظریں ہٹائیں اور پی اے کو دیکھا۔

''پانی مل سکتا ہے؟ اپنے اعصاب اور حواس پر بیک وقت قابو رکھنے کی کوشش میں اس نے لگاتار بولتے ہوئے پی اے کو ٹوکا۔ پی اے فوری طور پر اس کی پیاس بجھانے کے انتظامات میں مصروف ہوگیا۔ اسے اپنے گرد جو خاموشی چاہیے تھی وہ چند منٹوں کے لیے ہی سہی لیکن مل گئی تھی۔ جسم میں سے سر[illegible] رتی خوف کی ایک لہر کو اس نے جیسے خود کو ساکت رکھتے ہوئے earth کیا۔ غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنی کلائی پر ڈالی...... اس کے رونگٹے کھڑے ہو[illegible] تھے۔ اسی غیر محسوس انداز میں ہاتھ جھٹکتے اور نظریں چراتے ہوئے اس نے پانی کا وہ گلاس تھاما

جواس کے سامنے ایک ٹرے میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے ایک سانس میں وہ گلاس خالی کیا تھا۔ وہ گھر ایبک کو کس طرح ہیبت زدہ کرنے والا تھا یہ اس کے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی...... اس نے وہاں پوسٹ نہ ہونے کی مقدور بھر کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آسیب زدہ گھر 26 سالوں کے بعد جیسے اسے ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

''مجھے اس گھر کو ایک نظر دیکھنے دیں۔'' اختر نے اس کے پانی کا گلاس رکھتے ہی دوبارہ بولنا شروع کیا ہی تھا جب اس نے اسے ٹوک دیا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ ماتحت عملے نے کچھ حیران نظروں کا تبادلہ کیا لیکن پھر کچھ کہے بغیر اس کے ہمراہ ہولیے۔

گھر بہت تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہاں موجود پرانی چیزوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جسے ایبک نے ایک ہی نظر میں نہ پہچان لیا ہو۔ اسے رہائشی عمارت کا جائزہ لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس گھر نے اس کی زندگی میں ideal اور idealism نام کی چیز کو چھین لیا تھا اور بہت سارے سوال دے دیے تھے جنہیں اس کا دماغ بہت سالوں تک کھوجتا رہا...... الجھتا رہا...... ناکام ہوتا رہا...... اور پھر جب بالآخر اسے جواب ملا تھا تو بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت نے اگلے کئی سال اسے اپنے حصار میں رکھا اور بے یقینی وہ واحد شے نہیں تھی جو بہت عرصے اس کے ہمراہ رہی تھی...... ایک ناقابلِ بیان اذیت بھی...... شرم اور دکھ کا ایک عجیب احساس بھی اور ان تمام احساسات کے درمیان چڑیا کا چہرہ بھی جو اپنی آنکھوں میں خوف اور دہشت لیے اسے دیکھ رہا تھا...... صرف چند سیکنڈز کے لیے ملنے والی وہ نگاہ جس کا تصور بھی اسے ٹھنڈے پسینے دلانے کے لیے کافی تھا۔

اوپر والے فلور کے تقریباً تمام کمرے لاکڈ تھے۔ اس نے کسی کمرے کو نہیں کھلوایا...... وہاں اب ایسا کچھ نہیں تھا جسے دیکھنے کی اسے خواہش تھی۔ اس گھر کا ماسٹر بیڈروم بھی لاکڈ تھا اور صرف وہ واحد کمرا تھا جس کے دروازے کے باہر اس کے قدم چند لمحوں کے لیے فریز ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کمرے میں جانے کی شدید خواہش نے اسے آن گھیرا تھا پھر اس نے اسی رفتار سے اس خواہش کو جھٹک دیا تھا۔

''باہر چلتے ہیں۔'' اس نے جیسے منٹوں میں عمارت کے اندرونی جائزے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ وہاں اندر کھڑے بہت سی چیزوں اور یادوں کا ایک سیلاب تھا جو اسے بہائے لیے جارہا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو غرق ہونے سے بچانے کی جیسے ایک اور کوشش کی تھی۔

عمارت کے اردگرد موجود لان پہلی نظر میں اسے ویسا ہی لگا تھا...... اور دوسری نظر نے اسے وہ خار دار جھاڑیاں، کھوکھلے ہوتے تنے اور سوکھے ہوئے پیڑ پودے دکھانے شروع کردیے تھے جو بظاہر اس تراش خراش کے دم پر کھڑے تھے جو یقیناً اس کی آمد سے ایک دن پہلے کی گئی تھی۔ 26 سال پہلے وہ لان اس حالت میں نہیں تھا...... نہ وہ لان نہ وہاں کے درخت اور پودے اور نہ ٹینس کا وہ کورٹ جس پر آخری میچ یقیناً سالوں پہلے کھیلا گیا تھا...... سب کچھ بوسیدہ اور خستہ حال تھا اُن تکلیف دہ یادوں کی طرح جو اس کے اندر سرکنڈوں کی طرح سر نکالے ہمہ وقت موجود رہنے کے باوجود ایک لمبے عرصے سے وہ کاٹ اور چبھن کھو چکی تھیں جس نے اس کے بچپن کے ایک بڑے حصے کو بے حد بے رحمی سے لہولہان اور

مسخ کیا تھا۔

''اس طرف سرونٹ کوارٹرز ہیں۔'' پی اے نے اسے کسی رہنمائی کا انتظار کیے بغیر لان کے عقبی حصے میں کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ حیرانی کے ساتھ کہا۔ اس کو ایبک کے انداز میں اس عمارت کے لیے ایک عجیب سی familiarity مانوسیت، واقفیت نظر آرہی تھی۔

''پتا ہے۔'' اس کے انداز میں واقعی ایک عجیب سی مانوسیت تھی اس گھر کے لیے...... کوئی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا تب بھی اس کے لیے عمارت کے عقبی حصے میں اس جگہ جانا دشوار نہ ہوتا...... اس کے قدم اب جس رستے پر تھے وہاں اس کی زندگی کی بہترین اور بدترین یادیں بکھری تھیں۔

کچن کے عقبی دروازے سے کئی فرلانگ دور...... عمارت کے بالکل عقب میں...... وہاں اب وہ کوارٹر نہیں تھا...... چند لمحوں کے لیے اس نے اپنے آپ کو اسی شاک اور بے بسی کی حالت میں پایا جو اس نے 26 سال پہلے اس رات محسوس کی تھی۔ وہ closure اب بھی نہیں ہوا تھا جس کی خواہش اسے وہاں تک لے آئی تھی...... وہ آسیب اب بھی اس کے وجود کے اندر ہی رہنے والا تھا۔

☆☆☆

شیر دل پورا راستہ ایک پلان بی ڈھونڈتا آیا تھا اس آسیب سے لڑنے کے لیے جو اتنے سال ایک واہمہ نما خوف کی صورت میں اس کے وجود کے اندر پلتے رہنے کے بعد اب یک دم اس کے مدمقابل آگیا تھا...... ایک بھیانک خواب کی صورت میں...... وہ شاکڈ تھا...... اسے شاکڈ ہی ہونا چاہیے تھا۔ بے یقینی کے عالم میں تھا...... وہ بھی فطری بات تھی لیکن اس صدمے اور اذیت کی کیفیت کو وہ سمجھ نہیں پارہا تھا جس نے یک دم اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کی فیملی ایک بہت بڑے کرائسس کا سامنا کرنے والی تھی اور اس کرائسس کی تمام جڑیں اس کی اپنی طرف جاتی تھیں۔

واپسی کا پورا رستہ وہ ماضی کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں دنیا گول ہے اور دنیا اس کے لیے واقعی گول ثابت ہوئی تھی۔

عکس مراد علی...... اس ایک نام سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں پاتا۔ اس کے ساتھ سالوں گزارنے کے بعد وہ اتنا بے وقوف کیسے ثابت ہوا تھا کہ اسے بھی پہچان نہیں سکا۔ اس کے ایجنڈے کو کبھی نہیں جان سکا۔ ایجنڈا؟ وہ شاید اس کے لیے ایک بہت سخت لفظ استعمال کررہا تھا لیکن اس کے پاس جیسے اسے اپنا دشمن سمجھنے کے علاوہ وقتی طور پر کوئی آپشن ہی نہیں تھا...... اس عورت کو اپنا دشمن سمجھنا جسے وہ بے انتہا چاہتا تھا۔ اس کا دل کچھ اور بوجھل ہوگیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے سیل فون پر شہر بانو کا ٹیکسٹ آیا تھا۔ وہ اسے skype پر آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ جسمانی طور سے زیادہ یہ ذہنی تھکن تھی جو اسے بے حال کیے ہوئے تھی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شہر بانو سے بات کرنے سے نہیں روک سکا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد وہ اپنا لیپ ٹاپ لے کر اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اسکرین پر شہر بانو کا چہرہ دیکھتے ہی دل کو ایک عجیب سی تکلیف ہوئی تھی۔ وہ کافی کا ایک مگ پکڑے لاؤنج کے ایک وسیع و عریض صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی پھر اس نے لیپ ٹاپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ شیر دل اس کے عقب میں کھڑکی کے

شیشوں پر بارش کی بوندیں دیکھ رہا تھا۔ کیلی فورنیا میں اس وقت بارش ہو رہی تھی شہر بانو کو بارش پسند تھی۔ شیر دل جانتا تھا کہ وہ اب گھنٹوں کھڑکی کے سامنے اسی طرح کافی کا ایک مگ تھامے بیٹھی رہ سکتی تھی۔ شہر بانو اب مثال کو پاس لے آئی تھی۔ شیر دل کا دل اپنی اولاد کو دیکھ کر جیسے کسی پرندے کی طرح خوشی سے پھڑپھڑایا تھا۔ مثال بڑے ایکسائٹڈ انداز میں اسے امریکا میں اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ سارا دن کیا کرتی تھی، وہ اور اس کی ممی کہاں کہاں گئیں، کون کون اُن سے ملنے آیا، کس کس نے اسے کیا کیا تحفہ دیا...... اور یہ کہ ان سب کے باوجود وہ شیر دل کو مس کر رہی تھی اور چاہتی تھی کہ باپ فوراً اس کے پاس آ جائے۔ اپنی چار سالہ بے حد خوب صورت اور معصوم بیٹی کی باتیں سنتے ہوئے شیر دل کو کوئی اور یاد آیا تھا...... ایک اور ایسا ہی خوب صورت چمکتا، کھلکھلاتا وجود...... اس کے دل پر کسی نے منوں برف ڈالی تھی۔ ملال کسی بارش کی پھوار کی طرح اس کے وجود کو بھگو گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی کھلکھلاہٹ میں چڑیا کی چہچہاہٹ سن رہا تھا۔ اس کی بیٹی کی عمر میں اور چڑیا کی عمر میں چار سال کا فرق تھا۔ شاید پانچ سال کا فرق۔ وہ کسی میکانکی انداز میں نہ چاہتے ہوئے بھی چڑیا کے بارے میں سوچتا جا رہا تھا۔ مثال سے اس کا موازنہ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، کوئی اس کی بیٹی کو نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرتا تو شیر دل اس کو شوٹ کر دیتا۔ یہ ایک چیز تھی جس پر شیر دل کی ڈکشنری میں کسی کے لیے کوئی معافی نہیں تھی اور یہی ایک چیز تھی جس کا خوف عجیب طرح سے اسے اپنے حصار میں لیے رہتا تھا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ شہر بانو کے سوال پر بری طرح چونکا تھا۔

''ہاں کیوں؟ کیا ہوا؟'' وہ اسکرین پر مثال کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ شہر بانو کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ مثال اب لاؤنج میں اِدھر سے اُدھر کچھ toys پکڑے وقتاً فوقتاً آتی جاتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور ہر بار اس کی جھلک نظر آنے پر شیر دل کی نظر عجیب طرح سے اس کے تعاقب میں جاتی تھی۔

''تم بہت تھکے ہوئے اور پریشان لگ رہے ہو۔'' شہر بانو نے بے ساختہ کہا۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک کیمرے کی آنکھ سے شیر دل کو Scan کر لیا تھا۔ شیر دل نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''ہاں یار تھکن ہے کافی...... ابھی ابھی لاہور سے آیا ہوں...... سارا دن بڑی مصروفیت رہی۔'' شیر دل نے اسے ٹالنے کے بجائے جھوٹ بولنا زیادہ بہتر سمجھا تھا۔

''اچھا تو سو جاتے پھر بلکہ ابھی سو جاؤ۔'' شہر بانو نے فوری طور پر جیسے اپنے شوہر کی فکر کی۔

''ہاں سو جاؤں گا ابھی۔'' شیر دل نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ نیند تو آج اسے مر کر بھی نہیں آنے والی تھی۔ خالی گھر میں ماضی کی بازگشتوں کے گرداب میں چکرانے سے شہر بانو اور مثال سے باتیں کرتے رہنا بہتر تھا کم از کم عارضی طور پر ہی سہی لیکن وہ خود کو کچھ پُرسکون رکھ پا رہا تھا۔

''سو جاؤ۔'' شہر بانو نے ایک بار پھر اسے ہدایت کی۔

''سو جاؤں گا۔'' شیر دل نے پھر ٹالا اور تبھی اس نے شرمین کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

''ممی سے بات کرو گے؟'' شہر بانو کو ایک دم پتا نہیں کیا خیال آیا۔ شیر دل فوری طور پر ''نہیں'' کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا۔

''ہاں کروا دو۔'' اس نے اپنے لہجے میں کچھ گرم جوشی پیدا کرنے کی کوشش کی جو اس کے اور شرمین کے درمیان کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ شرمین کے لیے اس کی ممی کی ناپسندیدگی تھی۔ ان کی شادی کے اتنے سال بعد بھی شرمین اور اس کی فیملی میں عجیب سی غیریت اور اجنبیت کی دیواریں تھیں اور یہ دونوں طرف سے تھیں اور دونوں طرف سے ہی اسے گرانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ شیر دل کی فیملی خاص طور پر اس کی ماں، شرمین کو اپنے اکلوتے بھائی کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی...... شیر دل کی رائے اس بارے میں بالکل محفوظ تھی۔ وہ نیوٹرل تھا یا نہیں لیکن اس نے شہباز کی موت کے حوالے سے ہونے والی کسی گفتگو میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ کبھی کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ شادی سے پہلے اس کی خاموشی کی وجوہات اور تھیں۔ شادی کے بعد ان وجوہات میں شہر بانو کی اپنے باپ سے attachment اور کسی تبصرے سے اس کی ممکنہ طور پر ہرٹ ہو جانے کی وجہ بھی شامل ہو گئی تھی۔ شہر بانو اور شیر دل کے درمیان اتنے سالوں میں شہباز کا ذکر بہت کم آیا تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر آیا تھا۔ شیر دل جانتا تھا شہباز اپنی اکلوتی بیٹی کے بارے میں جنون کی حد تک پوزیسو تھے اور شہر بانو بھی شہباز کی شیر دل سے خاص attachment کے حوالے سے تھوڑی بہت یادیں رکھتی تھی اس کے باوجود ان دونوں نے کبھی شہباز کو ڈسکس نہیں کیا تھا۔

''کیسے ہو بیٹا؟'' شرمین نے علیک سلیک کے بعد شیر دل سے وہی رسمی سوال کیا۔ شیر دل نے ہمیشہ والی تمیز اور احترام کے ساتھ جواب دیتے ہوئے اُن سے اُن کا حال پوچھا۔ چند منٹ دونوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی پھر شہر بانو کو ایک بار پھر شیر دل کے آرام کا خیال آ گیا تھا۔ اس بار شیر دل نے اسے ٹالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے خدا حافظ کہہ کر آف لائن ہو گیا تھا۔

شرمین، شیر دل سے بات کرنے کے بعد بھی وہیں بیٹھی رہی تھی۔ ایک عجیب سی تکلیف اور اذیت تھی جو ہر بار اسے شیر دل کو دیکھتے ہی ہوتی تھی۔ وہ شکل صورت اور قد کاٹھ میں شہباز سے بہت مماثلت رکھتا تھا اور ہر بار اسے دیکھتے ہوئے اسے شہباز یاد آتا تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی...... ایک دوسرے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود بھی...... اور شہباز کے گھناؤنے روپ کے بارے میں جاننے کے بعد بھی وہ شہباز سے نفرت نہیں کر سکی تھی۔ بس اس نے اسے زندگی سے نکال دیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ رہنا شرمین کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اس سے بیک وقت محبت اور نفرت کر رہی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو دیتی وہ اس کی زندگی سے نکل آئی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہیں ممی؟'' وہ شہر بانو کی آواز پر یک دم چونکی تھی۔

''کچھ نہیں...... شیر دل پہلے سے زیادہ اسمارٹ ہو گیا ہے۔'' شہر بانو نے مسکرا کر اپنے ہینڈسم میاں کے بارے میں ماں کا تبصرہ فخریہ انداز میں سنا۔ وہ جانتی تھی شیر دل سے شادی کی شدید مخالفت کرنے کے باوجود شرمین، شیر دل کو پسند کرتی تھی اور شادی کے اتنے سال گزرنے کے بعد یہ پسندیدگی بہت بڑھ گئی تھی۔ شیر دل نے شہر بانو کو بہت خوش رکھا ہوا تھا اور شرمین کے لیے اس سے زیادہ مطمئن کرنے

والی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

"تم اس کے ساتھ بہت خوش ہو نا؟" وہ شرمین کے سوال پر مسکرا دی تھی۔

"بہت ایک ایسا لفظ ہے جو میری خوشی کے لیے بہت چھوٹا ہے ممی۔ میں جانتی ہوں آپ کہیں گی آئیڈیل کچھ نہیں ہوتا لیکن میں اس کے ساتھ ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی ہوں۔ ویسی زندگی جیسی کبھی میں پاپا کے ساتھ گزارتی تھی۔" وہ یہ مثال نہیں دینا چاہتی تھی لیکن شہر بانو کو احساس بھی نہیں ہوا کب اس کے لاشعور نے اسے دھوکا دے دیا تھا۔ شرمین کے چہرے پر مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی تھی۔ لاؤنج میں کچھ دیر کے لیے ایک عجیب مجرمانہ سی خاموشی چھائی رہی پھر شرمین نے کہا۔

"اللہ نہ کرے تم کبھی اس کے ساتھ ویسی زندگی گزارو جیسی میں نے تمہارے پاپا کے ساتھ گزاری تھی۔ اللہ نہ کرے شیر دل کبھی تمہارے پاپا جیسا نکلے۔"

"داؤد آج آرہا ہے؟" شہر بانو نے یک دم ماں کی بات کاٹ دی تھی۔ شرمین جانتی تھی وہ اس کا احتجاج تھا وہ شہباز کے بارے میں اگر کوئی اچھی بات نہیں سنتی تھی تو پھر کوئی بری بات بھی نہیں سن سکتی تھی۔ شہباز حسین اُن کے درمیان خاموشی کی ایک بڑی اونچی دیوار کھڑی کر دیتا ہے جس کے پار ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پا رہی تھیں۔

"ہاں آج رات کو ڈنر پر انوائٹڈ ہے یہاں، پرسوں کی فلائٹ سے ڈلاس جا رہا ہے۔" شرمین نے موضوع بدل کر جیسے اس کے احتجاج کے سامنے گھٹنے ٹیکے تھے۔

"divorce ہو گئی ہے اس کی؟" شہر بانو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"دو ہفتوں تک ہو جائے گی۔" شرمین نے بتایا۔ داؤد شرمین کے دوسرے شوہر فاروق کا بھانجا تھا۔ شہر بانو اور وہ ہائی اسکول تک کلاس فیلو رہے تھے اور شیر دل سے شادی کے تنازعے پر اس کے لیے جس most eligible bachelor کا نام آیا تھا وہ اسی کا تھا۔ وہ شرمین کا چہیتا تھا۔ شہر بانو کو یہ ماننے میں عار نہیں تھا کہ داؤد کسی کا بھی چہیتا ہو سکتا تھا۔ شیر دل اگر اس کی زندگی میں نہ آیا ہوتا تو وہ داؤد جیسے لڑکے کے ساتھ خوشی خوشی شادی کر لیتی۔ ان دونوں کی آپس میں اتنی واضح ذہنی مطابقت تھی لیکن شیر دل اس کی زندگی میں بڑے صحیح وقت پر آیا تھا۔ وہ شادی ہو جانے کے بعد بھی کبھی داؤد سے نوک جھوک میں یہ بات کہہ دیتی تھی اور داؤد جواباً اسے کہا کرتا تھا۔ "صحیح وقت پر یا غلط وقت پر؟" اس بار بڑے لمبے عرصے کے بعد داؤد سے اس کی ملاقات ہونے والی تھی۔

"مجھے کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ داؤد جیسے شخص کی شادی بھی ناکام ہو سکتی ہے۔" شہر بانو نے کہا۔

"قصور کس کا تھا؟" اسے جیسے عجیب سی کرید ہوئی تھی۔

"شادی کبھی بھی صرف ایک شخص کی وجہ سے ناکام نہیں ہوتی، زارا اور اس کی اچھی نبھ رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا اچانک سے ہم لوگوں نے جھگڑوں کے بارے میں سننا شروع کر دیا اور پھر یک دم پتا چلا کہ زارا نے divorce کے لیے کیس فائل کر دیا۔" شرمین نے اسے تفصیلات بتانی شروع کیں۔

"داؤد پچھلے کئی سالوں میں کچھ زیادہ ہی کیریئر اورینٹڈ ہو گیا تھا اس کا اثر اس کی شادی پر پڑنا ہی تھا خاص طور پر اگر بیوی بھی اسی طرح کی ہائی پروفائل جاب پر ہو تو......" شہر بانو اس کی بات سنتے

ئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شرمین کچھ عرصے پہلے ہی کیلی فورنیا کے اس علاقے میں شفٹ ہوئی تھی اور شہر بانو، فاروق اور شرمین کے اس نئے اور بے حد وسیع و عریض گھر میں پہلی بار آئی تھی۔ قدِ آدم کھڑکیوں سے باہر برسنے والی اس بارش سے وہ بے حد عجیب انداز میں محظوظ ہو رہی تھی۔

شرمین اب مثال کی طرف متوجہ ہو گئی جو ایک گیم پکڑے اس کے پاس کچھ دکھانے آئی تھی۔ شرمین نے اس کا چہرہ چومتے ہوئے اسے گود میں بٹھا لیا۔

"اس کی شکل بالکل تم سے ملتی ہے جب تم چار سال کی تھیں تو تم بھی بالکل مثال کی طرح لگتی تھیں۔" شرمین نے مثال کے اصرار پر TV آن کرتے ہوئے شہر بانو سے کہا۔ شہر بانو مسکرا دی۔

"شیر دل بھی یہی کہتا ہے...... وہ تو کہتا ہے مثال اور میں اب بھی بالکل ایک جیسی لگتی ہیں اسے...... بلکہ اسے لگتا ہے مثال مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے۔" شرمین شہر بانو کے پیار بھرے شکوے پر ہنس دی۔ ٹی وی پر بچوں کے چینلز پر مثال کے لیے کوئی موزوں کارٹون پروگرام ڈھونڈتے ہوئے وہ ایک چینل پر چلنے والی سنو وائٹ اور سات بونوں کی animated فلم پر رک گئی تھی۔ مثال گیم چھوڑ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کھڑکیوں سے باہر جھانکتی ہوئی شہر بانو نے بھی سنو وائٹ کے کسی جملے پر گردن موڑ کر ٹی وی دیکھا اور پھر اسے جیسے یک دم کچھ یاد آیا تھا۔

"ممی آپ کو پتا ہے ہماری پچھلی پوسٹنگ جہاں تھی اس گھر میں بونے تھے...... real life dwarfs" شرمین کا چہرہ منٹوں میں زرد پڑ گیا تھا۔

"کس گھر کی بات کر رہی ہو تم؟" شہر بانو نے بے حد حیرت سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ اس نے ماں کے چہرے پر جو تاثرات دیکھے تھے وہ انہیں کبھی بھول نہیں سکتی تھی۔

"آپ کو بتایا تو تھا میں نے شیر دل کی پچھلی پوسٹنگ کے بارے میں۔"

"تم نے کہا تھا تم لوگ ریسٹ ہاؤس میں رہو گے جب تک متبادل انتظام نہیں ہو جاتا۔" شرمین فق رنگت کے ساتھ اس سے کہہ رہی تھی۔

"ہاں لیکن پھر ہم اسی سرکاری گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ شیر دل نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ سے جھوٹ بول دوں کہ ہمیں کوئی اور گھر مل گیا ہے رہنے کے لیے۔" شہر بانو کو بات کرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ شرمین عجیب گم صم حالت میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی بات سن رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔

"کچھ نہیں...... میں اس گھر کے بارے میں سب جانتی ہوں۔" شہر بانو نے یک دم شرمین کو ہڑبڑاتے ہوئے سنا۔ اسے ماں کی بات پر جھٹکا لگا تھا۔

"آپ کیسے جانتی ہیں؟" اس نے بے ساختہ ماں سے پوچھا اور پھر ماں کے کچھ کہنے سے بھی پہلے اسے جواب مل گیا تھا۔

"پاپا وہاں پوسٹڈ رہے تھے کیا؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

شرمین نے جواب نہیں دیا تھا لیکن شہر بانو نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب دیکھا تھا۔

☆☆☆

آئینے پر ایک اور نظر ڈالتے ہوئے اندر جانے سے پہلے چڑیا نے پلٹ کر ایک نظر برآمدے کے سامنے پھیلے ہوئے لان کو دیکھا۔ وہ اب اس کا گھر تھا۔ کم از کم تب تک جب تک "سرکار" اسے وہاں رکھتی اور اس گھر میں موجود ہر چیز بھی اس کی سرکاری تحویل اور تصرف میں تھی۔

چڑیا نے سامنے لان میں لگے فلیگ پول پر لہراتا جھنڈا دیکھا جو اس گھر کے مالک کی اپنی رہائش میں موجود ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ اس لان میں اس نے سارا بچپن کھیلتے ہوئے گزارہ تھا۔ اس فلیگ پول کی اہمیت یا ضرورت سے واقف ہوئے بغیر اس کے گرد گھومتے چکر کاٹتے ہوئے...... یادیں اس گھر کے چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں...... وہ ساری یادیں اچھی تھیں...... اس ایک رات کے علاوہ جو اس کی پوری زندگی پر پھیل گئی تھی۔ اس گھر میں اس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ اس نے، حلیمہ نے اور خیر دین نے۔

چند منٹ پہلے اسی پورچ میں اسٹاف کار سے اترتے ہوئے اس کے عملے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ اس شہر میں تعینات ہونے والی پہلی ڈپٹی کمشنر تھی اور اس کی ذات میں اس کے عملے کا تجسس اور دلچسپی ایک لازم سی بات تھی۔ وہیں پورچ میں اس گھر میں کام کرنے والے عملے سے چڑیا کی پہلی ملاقات اور تعارف ہوا تھا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اُن میں سے کوئی بھی ایسا چہرہ یا نام نہیں تھا جو چڑیا کے ماضی سے وابستہ تھا۔ وہ سب زیادہ سے زیادہ دس پندرہ سال سے وہاں کام کر رہے تھے۔ گھر کا سب سے پرانا ملازم 18 سال سے وہاں تھا۔ کوئی پرانا چہرہ پہچاننے کی کوئی خواہش لے کر وہ وہاں آئی بھی نہیں تھی۔

اس کا ماتحت عملہ اس گھر کی پہلی خاتون آفیسر کو بے حد مرعوبیت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کوئی اس کی ذہنی کیفیت اور اضطراب سے واقف نہیں تھا۔ واقف ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ چڑیا کو اپنے چہرے کے تاثرات اور اعصاب پر قابو رکھنا آتا تھا۔ اپنے ماتحت عملے کی رہنمائی میں گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ بالآخر اس ہال کمرے میں آگئی تھی۔ زندگی میں اس سے زیادہ تذلیل اور بے بسی کے احساس سے وہ کہیں دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اس جگہ نے اس کی رسوائی کا تماشا دیکھا تھا...... وہ سیڑھیاں...... جن سے بھاگتے ہوئے اس نے اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کی تھی اور وہ گیلری جہاں کھڑے ایبک کے حلق سے نکلنے والی ہذیانی چیخوں نے اس کی زندگی بچائی تھی۔ اسے اپنے حلق پر کسی کے ہاتھوں کی جان لیوا گرفت محسوس ہوئی اور پھر اس نے پل بھر میں اس گرفت کو ڈھیلا پڑتے دیکھا۔ اس پر جھکے اس کا گلا دباتے شہباز حسین نے کرنٹ کھا کر اوپر گیلری میں کھڑے لکڑی کی ریلنگ پکڑے پاگلوں کی طرح روتے اور چلاتے ہوئے ایبک کو خوف اور بے بسی سے دیکھا تھا۔ وہ اس سے اتنی دور تھا کہ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا نہ اس کو روک سکتا تھا اور بالکل اس لمحے چڑیا نے بھی ایبک کو دیکھا تھا۔ زمین پر پڑی چند لمحے پہلے سانس لینے کی جدوجہد کرتی بے دم چڑیا نے...... اور پھر وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شہباز حسین اسے دوبارہ پکڑ اور گرا نہیں سکا تھا۔ کچن کے دروازے سے تب تک ہڑبڑایا ہوا خیر دین اس ہال کمرے میں آگیا تھا۔

"میڈم اوپر چلیں؟" ایڈمن آفیسر نے اس کو بالکل ٹھیک وقت پر ٹوکا تھا۔ سر ہلاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں آئے پانی کو پلکیں جھپکاتے ہوئے روکا تھا۔

ڈاکٹر عکس فاطمہ اس گھر میں آنے سے پہلے یہاں آکر نہ رونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ یہاں چڑیا بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہاں "عکس مراد علی" بن کر آنا اور رہنا چاہتی تھی۔ اس شہر کی طاقتور ترین عورت۔

☆☆☆

"تم طاقت حاصل کرنا چاہتی ہو؟" خیر دین نے عجیب افسردگی کے عالم میں چڑیا کو دیکھا اور اس کا جملہ دُہراتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے کچھ کہے بغیر سر ہلا دیا۔ اس نے کچھ دیر پہلے خیر دین کو یہ بتایا تھا کہ وہ میڈیسن پریکٹس نہیں کرے گی وہ سول سروس جوائن کرنا چاہتی تھی۔ اس کا فیصلہ خیر دین کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ اگلے کئی منٹ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔ وہ جس کیفیت کا شکار تھا چڑیا اس کا اندازہ کرسکتی تھی۔ اس گھر سے نکل آنے کے بعد سے اب تک اس نے خیر دین کو کبھی بھولے سے بھی کسی سے یہ ذکر کرتے نہیں سنا تھا کہ وہ کبھی کسی ڈی سی ہاؤس میں سرکاری ملازم کے طور پر کئی دہائیاں کام کرتا رہا تھا۔ خیر دین نے گاؤں میں اپنے گھر کے باہر سے اپنی نیم پلیٹ کے ساتھ ہی اپنی زندگی میں سے اپنے ماضی کے اس حصے کو بھی اتار پھینکا تھا۔

چڑیا نے نو سال کی عمر تک خیر دین کو ہر جگہ اور ہر شخص کو بے حد فخریہ طور پر اپنی اس سرکاری ملازمت کے بارے میں بتاتے سنا تھا۔ خیر دین کو اپنی ذات اور زندگی کے اس حوالے پر عجیب فخر تھا، عجیب مان تھا اور ایک نو سال کی بچی کے طور پر بھی چڑیا اس اثاثے کی قدر و قیمت سے واقف تھی جو خیر دین نے اس کی وجہ سے گنوا دیا تھا۔ لیکن زندگی میں اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ خیر دین کا یہ اثاثہ لوٹانے کے لیے کبھی کچھ کر پائے گی۔

کئی سالوں سے خیر دین اپنی دال کی وجہ سے اس سارے علاقے میں مشہور تھا۔ اس کے نام کا حوالہ اس علاقے کی بہترین دال کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی زبان پر تھا۔ ایسی شہرت اس نے ڈی سی ہاؤس میں کام کر کے حاصل نہیں کی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس...... ڈی سی ہاؤس سے نکل آنے کے بعد خیر دین نے زندگی میں بڑی ترقی کی تھی۔ چند سو روپے سے ایک ریڑھی پر شروع ہونے والا بزنس بارہ سالوں میں شہر کے ایک گنجان آباد اور بے حد مہنگے کاروباری علاقے میں ایک دکان میں تبدیل ہو چکا تھا جس کی مالیت تقریباً 50 لاکھ روپے تھی۔ اس کے پاس اپنا ڈبل اسٹوری گھر تھا، گاڑی تھی۔ اس کی دکان پر آنے والے بڑے بڑے لوگوں سے اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ ایک دال والا ہونے کے باوجود اس کا اٹھنا بیٹھنا بہت اچھے لوگوں میں تھا لیکن اس کے باوجود چڑیا جانتی تھی کہ خیر دین کی زندگی کا سب سے بڑا رنج اس گھر سے اس بے عزتی کے ساتھ بے دخلی اور اس غیر منصفانہ انداز میں نوکری سے برخاستگی کا تھا جو یک طرفہ شنوائی کے نتیجے کے طور پر کی گئی تھی۔ اسے یقین تھا اس کی طرح اس کے نانا نے بھی اپنی زندگی کی ان تمام یادوں پر مینٹل بلاک لگا دیا تھا۔ کوئی اپنی بے بسی اور ذلت لہذا اس کو بار بار relive نہیں کرنا چاہتا۔

اور اب اتنے سالوں بعد چڑیا کے فیصلے نے اسے جس طرح ہلایا ہوگا وہ چڑیا کے لیے سمجھنا مشکل

نہیں تھا۔

''میری زندگی کا خواب تھا کہ تم ایک ڈاکٹر بنو۔'' خیر دین نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا تھا۔ وہ چڑیا کی آنکھوں میں کون سی شے دیکھنے سے گریزاں تھا وہ یہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

''میں نے آپ کا خواب پورا کر دیا۔ ڈاکٹر تو بن چکی ہوں میں۔'' چڑیا نے سنجیدگی اور اطمینان سے کہا۔

''میری خواہش تھی کہ تم انسانیت کی خدمت کرو۔'' خیر دین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اسے اندازہ بھی نہیں تھا وہ چڑیا کے سامنے کتنا گھسا پٹا جملہ دُہرا رہا تھا، وہ جو صدیوں سے اخباروں میں پڑھتا اور لوگوں کی زبان سے سنتا آ رہا تھا۔

''انسانیت کی خدمت صرف ڈاکٹر بن کے ہی تو نہیں ہوتی مجھے لگتا ہے میں سول سروس کے طور پر انسانیت کی زیادہ خدمت کروں گی خاص طور پر اس معاشرے میں۔'' خیر دین جانتا تھا وہ چڑیا کو لاجواب نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چڑیا کو logic کی گھٹی دے کر پالا تھا اور اب وہ اس کے منہ سے logic ہی سن رہا تھا۔

''انسانیت کی خدمت سرکار اور اس کے عہدے داروں کی خدمت سے بہتر ہوتی ہے۔'' پتا نہیں خیر دین کے اندر درد کا کون سا آبلہ پھوٹ کر بہا تھا جس کی ٹیس چڑیا تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ اس چھوٹے سے جملے میں خیر دین کی زندگی کا نچوڑ نہیں تھا اس کی درد بھری کتھا تھی۔ اس کا رنج، تکلیف، اس طبقاتی اور غیر مساوانی نظام کے سامنے اس کی بے بسی اور مایوسی جہاں نچلے طبقے کا کوئی شخص انصاف کے لیے پکار سکتا تھا لیکن حق نہیں لے سکتا تھا۔ اس جملے میں بے بسی اور تذلیل کی جو تاریخ چھپی تھی چڑیا بھی اس کا ایک باب تھی وہ اسے پہچانتی تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں نانا۔'' خیر دین نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنی نواسی کو کہتے سنا۔ لیکن سرکار اور حکومتی مشینری میں ہماری نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ وہاں بھی ''انسان'' نظر آئیں ''خدا'' نہیں۔''

''ایک فرد پورے نظام کو نہیں بدل سکتا۔''

''پھر ایک مچھلی پورے جل کو گندہ کرنے کی طاقت کیسے رکھتی ہے؟''

''چیزیں تبدیل کرتے کرتے زندگی گزر جاتی ہے انسان کی۔''

''تبدیلی کا حصہ بن کر زندگی گزارنا اور بہتری کی جدوجہد کرنا ایک معاشرے کی برائیاں گنتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے بیٹھے زندگی گزارنے سے بہتر ہے۔'' ایک عمر میں انسان اپنی ہی سکھائی ہوئی logic سے مار کھاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک نامی گرامی پہلوان اپنے اکھاڑے میں اپنے ہی کسی پٹھے سے وہ داؤ کھا کر چت ہو جو اسی کا سکھایا ہوا تھا۔

''میں پاور حاصل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ اس کے بغیر میں اپنی بقا کی جنگ عزت سے نہیں لڑ سکتی میں نے آپ کے ساتھ رہ کر دیکھا ہے زندگی میں...... اچھا اور شریف انسان ہونا بہت اچھی بات ہے نانا لیکن اچھا اور شریف ہونا ایک اچھی زندگی کی گارنٹی نہیں ہوتا اس معاشرے میں...... یہ خطرات کو

بڑھا دیتا ہے، کمزوری کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔'' خیر دین اپنی 23 سالہ نواسی کے منہ سے وہ باتیں سن رہا تھا جو اس نے اسے نہیں سکھائی تھیں جو زندگی اور تجربے جیسے دو ظالم استادوں کی دین تھیں۔

''میں دھکے کھا رہی ہوں ہاؤس جاب کے دوران topper ہونے کے باوجود...... جن کے پاس اثر، رسوخ ہے ان کو ابھی سے جاب سیکیورٹی ہے، مجھے نہیں پتا مجھے جاب ملے گی یا نہیں...... جن کے پاس پیسہ ہے وہ ہاؤس جاب کے بغیر ہی ریذیڈنسی کے لیے امریکا چلے گئے ہیں یا جا رہے ہیں...... وہاں سے اسپیشلائزیشن کریں گے...... پانچ دس سالوں میں واپس آ کر اپنی پرائیوٹ پریکٹس کریں گے اور million (لاکھوں) بنائیں گے۔ میں پاکستان میں رو دھو کر بغیر سہولتوں والی ایک نوکری کروں گی...... دھکے کھا کھا کر مزید پڑھوں گی...... اور پانچ دس سال کے بعد بھی اسی طرح دھکے کھا رہی ہوں گی۔ میرے پاس باہر کی ڈگری نہیں ہوگی اس لیے مریضوں کو میری اہلیت اور خلوصِ نیت پر شبہ رہے گا۔ ایمانداری سے زیادہ قابلِ بھروسا چیز ان کے لیے امریکا یا برطانیہ سے اسپیشلائزیشن ہے۔'' وہ بہت کڑوا سچ بہت مٹھاس کے ساتھ بول رہی تھی۔ تلخی نہیں تھی بس حقیقت پسندی تھی اس کی زبان میں۔ وہ اپنے عوام کی نفسیات اور ترجیحات کو خیر دین سے زیادہ اچھی طرح جانتی تھی۔

''میں تمہیں آگے پڑھنے کے لیے باہر بھیجوں گا۔'' خیر دین نے یک دم اسے ٹوک کر کہا۔ وہ ہنس پڑی۔

''آپ کو پتا ہے باہر بھیجنے کے لیے آپ کو مجھ پر کتنا پیسہ لگانا پڑے گا...... لاکھوں میں۔''

''میرے پاس اب لاکھوں ہیں۔'' خیر دین نے بے ساختہ کہا۔

''گھر دکان اور گاڑی کی صورت میں...... بینک بیلنس کی صورت میں نہیں۔'' چڑیا نے کہا۔

''میں سب کچھ بیچ دوں گا تمہارے لیے چڑیا۔'' خیر دین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بے حد جذباتی انداز میں کہا۔ چڑیا کو عجیب تکلیف ہوئی تھی محبت کے اس بے لوث اظہار پر۔

''بس یہی میں اب نہیں چاہتی نانا...... میں اب اس عمر میں آپ کو در بدر نہیں کروں گی...... آپ نے جتنا بوجھ اٹھانا تھا اٹھا لیا۔ اب مجھے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اپنا بوجھ اٹھانے کی عادت ڈالنے دیں۔'' چڑیا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

''آپ نے ہی ایک بار کہا تھا، زندگی میں کپ اور ایوارڈ کچھ نہیں ہوتے لیکن قابلیت رکھتے ہوئے بھی اُن کو حاصل نہ کرنا بدقسمتی ہے۔ مجھے بھی اب اپنی قسمت آزمانے دیں...... آپ نے مجھے ایک بہت اچھا اور مثبت سوچ والا انسان بنایا ہے۔ میں اس کے لیے آپ کی بہت شکر گزار ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ اب آپ مجھے وہ کام کرنے دیں جو زندگی میں مجھے اور آپ کو بے بس اور مجبور نہیں رہنے دے گا۔'' چڑیا خیر دین سے مشورہ نہیں کر رہی تھی نہ ہی وہ اس سے رائے لے رہی تھی۔ خیر دین چڑیا کو اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اس کے عزم کو پہچان جاتا جو اس کے لہجے میں تھا۔ وہ خیر دین سے بات کرنے سے پہلے اپنے اس فیصلے کے بارے میں بہت غور و خوض کر چکی تھی۔

''اور اگر تمہاری یہ ساری باتیں سننے کے بعد بھی میں یہ نہ چاہوں کہ تم مقابلے کا امتحان دو تو؟'' خیر دین نے یک دم اس سے پوچھا۔

''تو میں نہیں دوں گی۔'' جواب ایک لمحے کے تامل کے بغیر آیا تھا۔ خیر دین دم بخود ہو گیا تھا۔ وہ چڑیا سے اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ چڑیا کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے یقین تھا وہ ویسا ہی کرتی جو وہ اسے کہتا۔ ننھا بگلا پہلی پرواز اس سے سیکھنے کے بعد اب اس سے لمبے سفر پر جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ خیر دین کا دل بھر آیا۔ یہ کیسے ممکن تھا وہ چڑیا کی خواہش پوری نہ کرتا وہ اس کی زندگی کا فوکل پوائنٹ تھا۔ خیر دین کی پوری زندگی چڑیا کی خوشی، ناخوشی، پسند، ناپسند سے جڑی ہوئی تھی۔ انہی چیزوں کے گرد گھومتی تھی۔

چڑیا کے طفیل خیر دین کی زندگی میں فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے۔ ہر بورڈ کے امتحان میں اخبار میں پوزیشن ہولڈرز کی تصویر خیر دین عجیب فخر اور غرور کے ساتھ اپنی دکان پر آنے والے ہر شخص کو کئی کئی دن دکھاتا رہتا۔ CSS کے امتحان میں ڈاکٹر عکس مراد علی کی پہلی پوزیشن کی خبر والا اخبار خیر دین کی زندگی کا وہ پہلا اخبار تھا جسے پکڑے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر اور بلک بلک کر رویا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی اپنی ننھی چڑیا کا ایسا عروج اور ایسا نصیب نہیں دیکھا تھا۔ اس نے یہ کہاں سوچا تھا کہ اس کی چڑیا ایک دن اس کے نام کا اس قدر معتبر حوالہ بنے گی۔ وہ افسروں کا خدمت گار رہا تھا۔ ساری زندگی افسروں کے لیے کھانے پکاتے، کپڑے استری کرتے، جوتے پالش کرتے گزار دی تھی اس نے اور اس کا خیال تھا اس کا عروج بس وہی تھا...... اس سے زیادہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک لوہاروں کے خاندان سے تعلق رکھنے والا دس جماعت پاس آدمی کیا سوچ سکتا تھا...... اپنی اگلی نسل میں وہ افسر دیکھنا جس کے جوتے سیدھے کرتے ہوئے خیر دین نے عمر گزار دی تھی۔ معجزے سے کم نہیں تھا...... اور معجزے قدرت کی طرف سے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ان میں کبھی کبھی انسانی محنت اور عقل کا نمایاں دخل ہوتا ہے۔

کئی ہفتے خیر دین کی دکان پر مبارک باد دینے کے لیے لوگ آتے رہے تھے۔ چند گھنٹوں میں اس بازار میں خیر دین کا اسٹیٹس بدل گیا تھا جہاں اس کی دکان تھی۔ پہلے خیر دین کی ایک لائق نواسی تھی اب خیر دین ایک افسر نواسی کا نانا تھا...... تعارف کا حوالہ بدل گیا تھا۔ خیر دین کو پھر بھی خوشی تھی اور اس کا یہ تعارف گاؤں میں اس کے خاندان تک پہنچ گیا تھا۔

کئی سالوں کے بعد اس کے بھائی اور بھتیجے مبارک باد دینے کے لیے اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کی دکان پر پہنچے تھے۔ خیر دین صدمے سے دم بخود رہ گیا تھا۔ وقت کیسی ظالم شے ہے۔ دنوں کو پلٹتا ہے تو انسانوں کا اصل دیکھ کر اُن سے گھن کھانے کو جی چاہتا ہے۔ خیر دین کو بھی بہت دیر سمجھ نہیں آئی تھی وہ ان خونی رشتے داروں کے ساتھ کیسے پیش آئے جو سورج مکھی کی طرح اس کے اچھے دن دیکھتے ہی اس کی طرف لوٹ کر آنے لگے تھے۔ اس نے انہیں دکان پر بٹھا کر کھانا کھلایا ان کی مبارک باد وصول کی لیکن انہیں چڑیا سے ملوانے گھر نہیں لے کر گیا۔ گھروں تک لے جانے والی اب کوئی بات رہ ہی نہیں گئی تھی۔

اس رات چڑیا اور خیر دین پھر جاگتے رہے تھے۔ گاؤں میں گزارہ ہوا وہ سارا وقت نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دُہراتے رہے تھے۔ خیر دین نے چڑیا کو اپنے خاندان والوں سے ملنے والی اور بہت سی تکلیفوں اور باتوں کو پہلی بار چڑیا کے ساتھ بانٹا تھا اور ان کانٹوں جیسی باتوں کو دُہراتے ہوئے بار بار رویا تھا۔ چڑیا اسے تھپکتی بہلاتی رہی تھی۔ اس کا نانا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ جلد ہنس پڑتا تھا اور اس سے بھی جلد رو پڑتا تھا۔

''دیکھو چڑیا زندگی میں نام اور رتبہ بہت کم لوگوں کو ملتا ہے لیکن اس سے بھی کم لوگ اس نام اور رتبے کو سنبھال پاتے ہیں۔ رتبہ ملنا اعزاز کی بات ہے لیکن یہی سب سے بڑا امتحان بھی ہے۔'' چڑیا کو سول سروسز اکیڈمی ٹریننگ کے لیے چھوڑنے جانے سے ایک رات پہلے خیر دین نے اسے بہت ساری نصیحتیں کی تھیں۔ چڑیا ہمیشہ کی طرح خیر دین کی باتیں سنتی رہی تھی۔

''یہ جو طاقت اور افسری ہوتی ہے یہ انسان کو اندھا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل والے اچھے انسانوں کو بھی...... تم عاجز رہنا، اپنے ماضی کو کبھی مت بھولنا اور اس ملک کی خدمت کرنا۔'' خیر دین بات کرتے کرتے رکا۔ ''تم مردوں کے ساتھ اور ان کی طرح کام کرو گی لیکن چڑیا تم مرد مت بن جانا۔ مردوں کی طرح دلیری اور بہادری دکھانا لیکن اپنی فطرت کی نرمی اور نسوانیت کھوئے بغیر عزت اور وقار سے کام کرنا۔ یہ نام و نسب سے زیادہ بڑی چیزیں ہیں۔'' چڑیا سر جھکائے خیر دین کی ایک ایک بات پر سر ہلاتی گئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے جاب ملنے کے بعد میں پہلا کام کیا کروں گی؟" اس کی باتیں سنتے ہوئے چڑیا نے یک دم خیر دین سے پوچھا تھا۔

"کیا؟" وہ اس سے بات کرتے کرتے چونک گیا۔ وہ بے حد پُراسرار انداز میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

"دو کام کرنے ہیں نانا میں نے۔" خیر دین حیران ہوا تھا۔

"کون سے دو کام؟"

"وقت آنے پر بتاؤں گی نانا۔" اس نے بہت عجیب انداز میں خیر دین سے کہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین نے ان تمام ممکنہ کاموں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی تھی جو چڑیا کر سکتی تھی۔ اس کا ذہن کسی ایسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ سکا تھا جس کے بارے میں چڑیا نے کبھی اس سے ذکر کیا تھا۔

چڑیا وہ کام سات سال بعد کر سکی تھی...... پہلا کام بھی اور دوسرا کام بھی۔ پہلے کام کے لیے اس نے خیر دین سے اجازت لی تھی دوسرے کام کے لیے نہیں۔ وہ چڑیا کی زندگی کی پہلی نافرمانی تھی۔ خیر دین اگر وقت پر اس کے بارے میں جان جاتا تو وہ مر کر بھی چڑیا کو یہ قدم نہ اٹھانے دیتا۔ چڑیا اس سے زیادہ گہری تھی جتنا وہ اسے سمجھتا تھا...... چڑیا اس سے زیادہ ذہین تھی جتنا وہ خیر دین کو ساری زندگی ثابت کرتی رہی تھی...... اور چڑیا اس سے زیادہ شاطر تھی جتنا خیر دین اسے شطرنج کے بورڈ پر مانتا تھا۔

☆☆☆

"میں جب بڑی ہو جاؤں گی نانا تو میں ایک کھیل بناؤں گی چیس کی طرح کا...... جس میں سب کوئین کے لیے لڑیں گے اور کوئین ہی بادشاہ ہو گی۔" سیاہ اسٹاف کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے خیر دین نے اس کوئین کو ڈی سی ہاؤس کے وسیع و عریض داخلی گیٹ سے چند قدم آگے دونوں گارڈ پوسٹ کے درمیان کھڑا دیکھا تھا۔ ڈی سی ہاؤس کا گیٹ پورا کھلا ہوا تھا۔ گاڑی ڈی سی ہاؤس سے پہلے آنے والا آخری اسپیڈ بریکر کراس کر کے ابھی اس گیٹ کے سامنے آئی تھی۔

عکس مراد علی گھر میں آنے والے اس مہمان کا استقبال وہاں نہیں کر رہی تھی جہاں ڈی سی سب کا کیا کرتا تھا۔ وہ خیر دین کا استقبال وہاں اس دروازے پر کر رہی تھی۔ جس دروازے سے 26 سال پہلے ایک رات ان تینوں کو اٹھا کر باہر پھینکا گیا تھا۔ خیر دین کو یاد تھا اس ڈی سی ہاؤس کے گارڈز اسے گریبان سے پکڑے گھسیٹتے اور دھکے دیتے ہوئے اسی گیٹ کو کھول کر باہر لائے تھے اور باہر کھڑی ایک پولیس موبائل میں ڈال کر لے گئے تھے۔ خیر دین کو یہ بھی یاد تھا اس نے اپنے پیچھے روتے ہوئے بھاگتی چڑیا سے واپس حلیمہ کے پاس جانے کے لیے کہا تھا۔ وہ نو سال کی بچی اس خوف اور سراسیمگی کی حالت میں بھی نانا کے حکم پر رک گئی تھی لیکن خیر دین اس کی پکار کو ساتھ لے کر جیل گیا تھا۔

"میرے نانا کو مت ماریں، میرے نانا کو مت ماریں۔" کیا ذلت سی ذلت تھی اس جملے میں...... بے بسی کا ایک سمندر تھا...... وہ اس سمندر کے پار آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

خیر دین نے واسکٹ کی جیب سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں اور سر اٹھا کر فخر سے اسے دیکھا۔

اں کی چڑیا اس کھلے گیٹ کے بیچوں بیچ کھڑی تھی...... ویسے ہی مستعد اور مووب گارڈز کے بیچ میں جو گیٹ کے دونوں اطراف میں اب اپنی گارڈ پوسٹ سے باہر تھے۔ ڈرائیور کو جیسے سمجھ نہیں آیا وہ گاڑی آگے بڑھائے یا وہیں روک دے۔ خیر دین جانتا تھا وہ کھلا دروازہ کس بات کا اظہار تھا کس بات کا اعلان کر رہا تھا وہ قلعہ تسخیر کر لیا گیا تھا۔

ڈرائیور کی گاڑی کے رکتے ہی ایک گارڈ نے بڑی مستعدی سے آگے بڑھ کر خیر دین کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔

''آپ جب وہاں آئیں گے تو روئیں گے نہیں......'' اس نے فون پر خیر دین سے کچھ دیر پہلے کہا تھا۔

''لیکن کہاں بلا رہی ہو تم مجھے؟'' خیر دین حیران ہوا تھا۔

''ایک جگہ۔'' چڑیا نے اس سے کہا۔

''کھانا کھلانے۔'' خیر دین کو اس کی ٹرانسفر کے بارے میں پتا نہیں تھا نہ ہی یہ پتا تھا کہ وہ آج وہاں آکر چارج لے چکی ہے۔ وہ قریبی شہر میں بھی اکثر اسے گاڑی بھیج کر بلوا لیا کرتی تھی۔ خیر دین آج بھی یہی سمجھ کر آیا تھا۔ گاڑی اور ڈرائیور دونوں وہ نہیں تھے جو اسے پہلے لینے آیا کرتے تھے۔ وہ پھر بھی نہیں چونکا تھا۔ وہ ڈی سی روڈ پر لیا جانے والا موڑ تھا جس نے خیر دین کو چونکا دیا تھا۔ اس شہر میں اتنے سالوں سے رہنے کے باوجود یہ وہ واحد سڑک تھی جس پر وہ کبھی مجبوری کی حالت میں بھی نہیں آیا تھا۔ اس سڑک پر موجود ایک گھر کے ساتھ اس کی ایسی یادیں وابستہ تھیں کہ وہ اس سڑک پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے ڈرائیور سے پوچھا تھا۔

''ڈی سی ہاؤس۔'' ڈرائیور نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔ چند لمحوں کے لیے خیر دین گنگ رہ گیا تھا۔ اسے تب بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ وہاں اس گھر کے مالک کے طور پر اسے بلا رہی تھی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ وہ وہاں کسی لنچ پر آئی تھی۔ وہ خفا ہوا تھا یہ سوچ کر کہ اس نے اس طرح بے خبری میں اسے وہاں بلایا تھا۔

سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ کئی گز دور کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے چمکدار سیاہ اسٹیپس میں کٹے ہوئے بال مسلسل چلتی ہوئی نرم ہوا کے جھونکوں سے اس کے ماتھے اور گالوں پر آ رہے تھے جنہیں وہ گردن کی ہلکی سی حرکت سے بار بار جھٹک رہی تھی۔ خیر دین کو وہ ایک چھوٹی بچی لگی تھی جو بڑے فخریہ انداز میں اپنے اس پسندیدہ کھلونے کے ساتھ کھڑی تھی جس کو اس نے بڑی محنت اور ضد سے لیا ہو۔

وہ گیٹ سے باہر کھڑا تھا اور کئی گز اندر وہ اس کے بالمقابل کھڑی تھی۔ اسے خیر دین کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ وہ وہاں کس حیثیت سے کھڑی تھی۔

پانی کے ایک ریلے نے عکس مراد علی کا چہرہ دھندلا دیا تھا۔ خیر دین نے سر جھکا کر اپنے رومال کے ساتھ اس دھندلاہٹ کو صاف کر کے دوبارہ گردن اوپر اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا وہ چند گز کے اس فاصلے کو

سمیٹتے ہوئے اس کے بالکل قریب اس کے سامنے کھڑی تھی یوں کہ خیر دین اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا پھر اس نے خیر دین کی آنکھوں کی نمی کو بیک وقت اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کی پوروں سے صاف کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کئی سال پہلے اس گھر کی چھت کاٹھ کباڑ کے ڈھیر میں سے اسے نکال کر اس کی آنکھیں پونچھیں تھیں، اس کو سمیٹ لیا تھا۔ 26 سال بعد چڑیا نے بالکل اسی طرح اپنے نانا کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا تھا۔ تب خیر دین نہیں رویا تھا نہ ہی اس نے چڑیا کو رونے دیا تھا۔ آج چڑیا نہیں روئی تھی نہ ہی وہ خیر دین کو رونے دے رہی تھی۔ وہ دنیا کا واحد شخص تھا جو اس کے سامنے ٹوٹتا تو وہ بھی ٹوٹتی اور عکس مراد علی اس گھر اور شہر میں آنے والی پہلی خاتون آفیسر تھی۔ وہ اس گھر کے ماتحت مرد عملے کے سامنے وہ کمزور لمحے نہیں دکھانا چاہتی تھی جو اس کی عدم موجودگی میں اس کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال ہوتے۔

خیر دین کی پشت کو تھوڑا سا رگڑتے تھوڑا سا تھپکتے ہوئے وہ اس سے الگ ہوگئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ ڈی سی ہاؤس کے اندر جانے والے اس راستے پر چلنے لگی جو رہائشی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔

''یہ تمہارا دوسرا کام تھا جو تم میرے لیے کرنا چاہتی تھیں۔'' خیر دین نے یک دم اس دوسرے کام کو بوجھنے کی غیر متوقع کوشش کی۔ چڑیا نے گردن موڑ کر ساتھ چلتے ہوئے خیر دین کو مسکرا کر دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ خیر دین فخریہ انداز میں مسکرایا وہ چڑیا کا پہلا کام نہیں بوجھ سکا تھا لیکن دوسرا بوجھ گیا تھا...... چڑیا ایک بار پھر بہت آرام سے خیر دین کو خوش فہمی کا شکار کر گئی تھی۔

''تمہیں یاد ہے یہاں اس راستے پر میں تمہیں سائیکل پر بٹھا کر اسکول لے کر جایا کرتا تھا۔'' اس ڈرائیو وے پر چلتے ہوئے خیر دین کو کیا کیا یاد آنے لگا۔ چڑیا نے اسے بولنے دیا۔ اس شخص نے اپنی جوانی کے پندرہ بہترین سال اس گھر میں گزارے تھے۔ اس کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اندرونی دروازے کے باہر برآمدے میں لگے اس آئینے کے سامنے آکر رک گئے۔ خیر دین نے آخری بار جب اس آئینے میں اپنا عکس دیکھا تھا تو اس کا لباس...... اس کا چہرہ...... اور اس کا جسم...... اور ان تینوں چیزوں سے بھی بڑھ کر اس کی روح، اس کی زندگی اور اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے تھے...... اب 26 سالوں بعد وہاں اس آئینے کے سامنے کھڑے اپنے آپ کو دیکھنا کیسا صبر آزما کام تھا کوئی اس سے پوچھتا...... لیکن اگر کسی کو یہ پتا ہوتا کہ وہاں اس پر اور اس کے خاندان پر کیا گزری تھی تو کوئی کبھی اس سے کچھ بھی نہیں پوچھتا۔

وہ ایک نظر جو اس آئینے کے سامنے سے چیختے چلاتے اس نے اپنے چہرے پر ڈالی تھی...... وہ چند سیکنڈز اس کے اندر سمندر کی کسی شوریدہ سر لہر کی طرح پلٹ کر آئے تھے...... سب کچھ اتھل پتھل کرتے...... ایک طوفان تھا جو اس کے اندر آیا تھا اور ایک طوفان تھا جو اس کی آنکھوں میں آیا تھا۔ پانی نہیں تھا وہ جو اس کی آنکھوں سے برس رہا تھا...... پانی ہوتا تو بہہ جاتا...... ہاتھ سے پونچھ لیا جاتا...... وہ تو آبلے تھے جو اس گھر میں داخل ہو کر اس آئینے تک آتے آتے یوں پھوٹے تھے کہ پھوٹتے ہی چلے گئے تھے...... اور کیا کیا تھا جو ان آبلوں سے نہیں بہہ نکلا تھا...... درد کا ایسا سمندر اس کے اندر

سالوں سے یوں قید تھا...... اس کو خود بھی کبھی پتا نہیں چلا۔ تکلیف تو تھی...... اذیت تو تھی...... جس کو اپنے وجود کے اندر مقید کرتے کرتے اس پر خاموشی کے تالے لگاتے لگاتے اس نے بہت سا وقت گزار پاتا تھا...... اور وہ تکلیف وہ اذیت یوں پلی بڑھی تھی اس کے اندر کہ ایک قطرے سے سمندر ہوگئی تھی۔

وہاں اس گھر کے دروازے پر اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر رونا خیر دین کی زندگی کی خواہشات میں کبھی شامل نہیں تھا۔ اس گھر کو دوبارہ دیکھنا وہاں دوبارہ آنا بھی اس کی زندگی کی خواہشات میں نہیں تھا...... لیکن وقت اسے وہاں لے آیا تھا اور کیسے لے کر آیا تھا...... آبلوں سے رسنے والی اذیت، ذلت، اب تشکر بننے لگا تھا...... عاجزی، احسان مندی، تشکر...... اس کائنات کے حاکم اس ذات کے لیے تشکر اور احسان مندی...... جو دن پلٹا سکتا تھا اور جس نے دن پلٹا دیے تھے۔

زمین پر گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے خیر دین نے اس گھر کے حاکم کے طور پر پہلا سجدہ کیا تھا...... اور وہ سجدہ کبھی ختم نہیں ہوتا اگر چڑیا کا وہ مہربان نرم مضبوط ہاتھ اس کی پشت کو مشفقانہ انداز میں نہ تھپکنے لگتا...... اس نے چڑیا کی تمام ہدایات اور نصیحتوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا...... چڑیا نے سہارا دے کر اسے اوپر کھینچ لیا تھا۔ ساری زندگی اس ہاتھ نے یہی کیا تھا اس کے لیے...... اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے ساتھ اسے کسی ننھے بچے کی طرح چپکائے وہ دونوں اس گھر کے اندر جا رہے تھے۔ وہ صرف ایک چیز باہر بھول گئے تھے...... بدقسمتی۔

☆☆☆

بدقسمتی...... حماقت...... خوش فہمی...... پتا نہیں کیا چیز تھی جس نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی تھی۔

ایک شیر دل نے لاہور ائرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں داخل ہونے سے بھی پہلے بہت دور سے اسے دوسرے ساتھی آفیسرز کے ساتھ خوش گپیاں لگاتے دیکھ کر سوچا تھا۔ وہ سنگاپور روانہ ہونے کے لیے لاہور ائرپورٹ پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انہیں لاہور سے کراچی پہنچ کر سنگاپور کے لیے روانہ ہونا تھا۔

اپنا ٹرالی بیگ کھینچتے ہوئے ایک شیر دل لاؤنج میں داخل ہوگیا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالنے والی وہی تھی۔ ایک سی گرین سوٹ کے اوپر بیج کلر کا کوٹ پہنے اور گردن کے گرد ایک بائل گرین اور بیج کلر کا پرنٹڈ سلک کا اسکارف لپیٹے وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اسٹائلش تھی۔ اسٹائلش اور اٹریکٹو...... اور شیر دل ہمیشہ کی طرح اس سے نظریں نہیں ہٹا پایا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہی گرم جوش، خوب صورت نرم مسکراہٹ جس کے لیے وہ اکیڈمی میں مشہور تھی۔ شیر دل کوشش کے باوجود اس مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دے سکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ عکس مراد علی سے نظریں چرا گیا تھا۔ لاؤنج میں آگے بڑھتے ہوئے اس نے وہاں بیٹھے دوسرے لوگوں سے ہاتھ ملایا پھر وہ عکس کے پاس آیا تھا۔

''ہمیشہ کی طرح سب سے آخر میں آئے ہو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے شیر دل کو جیسے یاد دلایا۔ وہ اکیڈمی میں ٹریننگ کے دوران ہر فیلڈ ٹرپ میں سب سے آخر میں پہنچنے والوں میں سے ہوتا تھا۔

وہ کچھ کہے بغیر اس کے قریب خالی صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔ عکس نے اسے بغور دیکھا اور پھر کہا۔

''خیریت؟'' شیر دل نے گردن موڑ کر اس کو دیکھا۔ اس عورت کو جسے وہ زندگی میں سب سے

زیادہ چاہتا تھا جس سے وہ متاثر تھا، مرعوب تھا، fascinated تھا۔ جس سے زیادہ اس نے زندگی میں کسی عورت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ صوفے پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بے حد قریب سے..... ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے..... اور اس دن وہاں بیٹھے ایبک شیر دل نے پہلی بار اس چہرے کے نقوش میں چڑیا کو کھوجنا شروع کیا..... ذہانت سے بھرپور وہ چمکدار کالی گہری آنکھیں..... وہ آنکھوں سے آگے کہیں نہیں جا سکا۔ کسی اور مشابہت کی ضرورت ہی نہیں تھی اُسے..... وہ چڑیا کی آنکھیں تھیں۔ عکس مراد علی آنکھوں کے علاوہ کچھ تھی ہی نہیں..... وہ اندھا تھا..... شیر دل نے اس کے چہرے سے بے اختیار نظریں ہٹائیں اور گردن موڑ کر جیسے اپنے چہرے کو عکس کی نظروں سے بچانے کی کوشش کی۔ وہ چہرہ اسے بار بار کسی سے مشابہت کا احساس دلاتا تھا لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ مشابہت اس کی زندگی کے بھیانک ترین خواب کے مرکزی کردار سے تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" اس بار اس نے دوبارہ شیر دل سے پوچھا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے میں ایک سگریٹ پی کر آتا ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر یک دم اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ عکس نے اسے اسموکنگ ایریا کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ ایک بلو casual جینز اور سفید شرٹ میں تھا..... اپنی جینز کی پاکٹس ٹٹولتا سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرتے ہوئے..... عکس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی تھی۔ اس نے زندگی میں کسی کو اس مرد سے زیادہ نہیں چاہا تھا..... خیر دین کے بعد۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ کبھی اس کو حاصل نہیں کر سکتی تھی..... وہ اس کے لیے نہیں تھا۔

اس کائناتِ محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اِک رابطہ مسلسل ہے ایک فاصلہ مسلسل ہے
ہم خود کو بیچ دیں پھر بھی ہم تجھ کو پا نہیں سکتے
میں عام سا ہمیشہ ہوں، تو خاص سا مسلسل ہے

لیکن بہت سی چیزوں پر دل کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ ایبک شیر دل سے 26 سال پہلے ملی تھی اور وہ 26 سال اس سے نہ ملنے کی خواہش رکھنے کے باوجود غیر ارادی طور پر ہر جگہ ہر شخص میں اسے ہی ڈھونڈتی رہی تھی۔ ہر ایبک کے لیے لاشعوری طور پر وہ نرم گوشہ رکھتی تھی..... ایبک سلطان سے ہونے والی طوفانی محبت بھی اس کے نام کی وجہ سے تھی..... وہ شعوری طور پر یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی لیکن اس کا لاشعور جانتا تھا وہ ایبک کے نام کی طرف کسی مقناطیس کی طرح جاتی تھی۔

ایبک شیر دل اس کا پہلا بیسٹ فرینڈ تھا..... بیرونی دنیا میں جھانکنے میں مدد دینے والی وہ کھڑکی جس میں سے دیکھی جانے والی دنیا کو وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ ایک خوف ناک واقعہ رونما نہ ہوا ہوتا تو 26 سال پہلے وہ گرمیوں کی چھٹی کے چند ہفتے اس کی زندگی کی سب سے بہترین چھٹیاں ہوتیں۔ اس نے ایبک شیر دل کے ساتھ دنیا اور زندگی کے بہت سے حصوں اور چیزوں کو explore کیا تھا..... دوستی، ساتھ، وفاداری، بے وفائی، تجدید تعلقات..... ایک بچے کے طور پر وہ

ایبک کے ساتھ اپنے اس مختصر relationship میں ہر اسٹیج سے گزری تھی۔

وہ اسے ایک بار پھر نظر آنے لگا تھا۔ اسی casual انداز میں...... تیز قدم اٹھاتا ہوا...... ا
دھیان میں گم...... وہ آج بھی وہاں بیٹھی بہت سی خواتین کی نظروں کو بھٹکانے کا باعث بن رہا تھا
وہ اس سے بے خبر تھا۔ عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اسے کبھی شیر دل کو عورتوں
مرکزِ نگاہ بنتے دیکھ کر حسد نہیں ہوا تھا۔ ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوتا تھا۔

وہ دوبارہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا...... دونوں کے درمیان خاموشی تھی...... اور وہ دونوں ا
خاموشی کے عادی نہیں تھے۔

"تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟" عکس نے بالآخر اس خاموشی کو توڑا۔ شیر دل نے کوئی تاو
سوچی لیکن پھر جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"کہو۔" ایبک شیر دل نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ
رہے پھر شیر دل نے یک دم بے حد غیر محسوس انداز میں اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا تھا۔

"یہ مت کرو چڑیا۔" اس نے بے حد گہری آواز میں اس سے کہا۔

عکس نے گاڑی سے اُترتے ہوئے سر اٹھا کر اس آئینے کو دیکھا جو اس گھر کے برآمدے میں دروازے کے پاس رکھا تھا اور جس میں اس وقت شیر دل اور شہر بانو کی پشت نظر آرہی تھی ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ کمشنر اور اس کی بیوی کا استقبال کر رہے تھے جن کی گاڑی اس وقت پورچ میں داخلی برآمدے کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ خود اس کی گاڑی پورچ کی چھت سے باہر تھی۔ وہ وہاں سے اس آئینے کو دیکھ سکتی تھی اور وہ وہاں سے بھی شیر دل اور شہر بانو کو بھی دیکھ سکتی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے دل کی دھڑکن پر قابو پایا تھا۔ دوسری گہری سانس میں اس نے اپنے دماغ سے وہ سب غائب کرنے کی کوشش کی تھی جس کی کرچیاں اس گھر کے سامنے بیرونی سڑک پر سامان کے ایک ڈھیر پر اپنی ماں کے ساتھ گزاری ہوئی ایک رات سے یہاں اندر تک چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں۔

سب کچھ غائب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ایک عام سرکاری رہائش گاہ تھی اب اس کے لیے۔ ایسی درجنوں عمارتوں میں وہ جا چکی تھی، رہ چکی تھی۔ اس گھر میں بھی اس کے لیے کچھ غیر معمولی نہیں تھا...... ایک عام پرانی لیکن شاندار عمارت۔۔ ویسی ہی ایک تقریب جو وہ کئی دفعہ اٹینڈ کرتی آئی تھی۔ ایک پرانی طرز کا پورچ اور داخلی دروازے کے پاس ایک پرانا آئینہ...... ایک سرسری نگاہ میں اس مینٹل بلاک کے ساتھ اس نے صرف یہ دیکھا تھا...... کسی بھی چیز پر نظر جمائے بغیر ہر چیز سے نظریں چراتے ہوئے۔ لوگ...... جگہیں...... باتیں...... چیزیں نہیں...... میں کوئی تکلیف دہ یاد ذہن میں نہیں لاؤں گی۔ میں ماضی کی کسی چیز کے بارے میں سوچ ہی نہیں رہی۔ میرا کل کا ورک شیڈول کیا ہے؟ یہاں سے ڈنر کے بعد کیا کیا کام کرنے ہیں مجھے۔۔۔؟ وہ اپنے ذہن کو مسلسل پھٹکار رہی تھی، بڑی کامیابی کے ساتھ۔ ایک کے بعد ایک رکاوٹ کو عبور کر رہی تھی، جب تک اس نے شہر بانو اور شیر دل کو اکٹھا نہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ شہر بانو کو تصویروں میں دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے چند فنکشنز میں شیر دل کے ساتھ دور سے دیکھ چکی تھی لیکن وہ آج پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھنے والی تھی، اس سے ملنے والی تھی...... اس بار بی ڈول سے جو اس کے بچپن کی چند facinations میں سے ایک تھی اور جو اس کی زندگی میں سیاہ ترین باب کا اضافہ کرنے والے شخص سے منسلک تھی...... اور جو اس شخص کی زندگی کا حصہ تھی جس سے اس نے شدید محبت کی تھی۔

آئینے میں نظر آتے اس عکس سے نظریں ہٹاتے ہوئے عکس مراد علی نے جیسے خود کو سنبھالنے کی ایک اور

کوشش کرتے ہوئے لمحے بھر کے لیے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں سے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی...... وہ برسات جو اس کی آنکھوں سے نہیں برس پا رہی تھی' وہ کہیں اور سے برسنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ بات کرنے کی کوشش کی تھی جو اس کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے باہر آیا تھا۔ خود کو سنبھالنے کے لیے وہ ہر چیز کا سہارا لے رہی تھی۔

پانی کی ہلکی سی پھوار نے اس کے چہرے، بالوں اور لباس کو ذرا سا نم کیا اور برآمدے میں کمشنر اور اس کی بیوی کا استقبال کرتے ہوئے شیر دل نے بالکل اس لمحے گردن موڑ کر اس کو دیکھا تھا۔ وہ سیاہ موتیوں سے ایمبرائیڈڈ...ایک فٹنگ والا سیاہ شیفون کا لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے متناسب جسم کو کچھ اور بھی متناسب کر رہا تھا۔ عام طور پر کھلے رہنے والے گھنے سیاہ بال اس وقت ایک سیاہ نیٹ میں ڈھیلے جوڑے کی شکل میں اس کی گردن کے پیچھے سمٹے اس کی پتلی اور لمبی گردن کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ دائیں کندھے پر اسٹول کی شکل میں تہ شدہ دوپٹا ڈالے وہ بائیں ہاتھ میں ایک بہت چھوٹا اور خوب صورت سیاہ پرس پکڑے ہوئے تھی۔ شیر دل نے اس سے نظریں ہٹائیں۔ مشکل کام تھا یہ اور اس نے مشکل سے ہی کیا تھا۔ وہ کمشنر اور ان کی فیملی کے ساتھ آئی تھی۔ کمشنر اور ان کی بیوی گاڑی سے اتر کر اندر جانے کے بجائے چند لمحوں کے لیے وہیں برآمدے میں رک گئے تھے۔ کمشنر کا استقبال کرنے کے بعد شیر دل برآمدے سے نکل کر اس کی گاڑی کی طرف بڑھ آیا تھا۔ عکس کی طرف جاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس نے اپنی جیب میں پڑا ٹشو پیپر ٹٹولا تھا۔ اس کی یہ بے اختیاری شہر بانو نے نوٹس کی تھی جس کے برابر سے وہ یک دم ہٹا تھا۔ اس نے کمشنر کی گاڑی کے پورچ سے ہٹ جانے اور عکس کی گاڑی کے آگے آنے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ وہ یہ نہیں دیکھ پائی تھی کہ عکس کے گاڑی سے نکل آنے پر وہ اس کا استقبال کرتے چلا گیا تھا۔ وہ دور جاتے شیر دل سے نظریں ہٹانا چاہتی تھی لیکن وہ ہٹا نہیں پائی تھی۔ کمشنر کی بیوی سے بات کرتے ہوئے بھی وہ عجیب بے چین انداز میں شیر دل کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھتی رہی تھی جہاں اس کی طرف پشت کیے ڈرائیور سے بات کرتے ہوئے عکس مراد علی کو اس نے ایک عجیب سے اضطراب کے ساتھ دیکھا تھا۔

ڈرائیور سے بات کرتے ہوئے عکس جب تک پلٹی' شیر دل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دونوں بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ عکس نے اس سے نظر چرائی...... خود کو سنبھالا...... پھر اسے دیکھا...... وہ بہت بار ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب آ کر کھڑے ہو چکے تھے...... بہت بار ایک دوسرے کے بالمقابل اتنے ہی فاصلے پر کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں یونہی جھانکتے بھی رہے تھے...... اور عکس مراد علی نے کبھی ان آنکھوں میں پہچان کی کوئی جھلک نہیں دیکھی تھی...... نہ چڑیا کے لیے...... نہ اس سترہ سالہ عکس مراد علی کے لیے جو ایک انٹر کالجیٹ کے مقابلے میں ایک شیر دل کا نام ہی سن کر بدک گئی تھی۔ جس نے اپنے کیریئر کے بدترین تقریری مقابلے میں اسٹیج پر روسٹرم کے پیچھے کھڑے ایک ایک لمحہ اس خوف میں گزارا تھا کہ وہ ابھی...... ابھی چڑیا کو پہچان لے گا...... اور وہ یہ کیوں نہ سوچتی کہ وہ اسے پہچان لے گا۔ چڑیا کی زندگی کے آٹھ سال ایک شیر دل کے بارے میں سوچتے گزرے تھے۔ آٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی اگر کوئی اس سے ایک کا حلیہ پوچھتا تو وہ سیکنڈز میں اس کے حلیے کی ڈیٹیل بتا دیتی۔ اس کے نین نقش سے لے کر اس کے زیرِ استعمال اسنیکرز اور اسپورٹس وئیر کے

لیبلز اور برانڈز تک اسے یاد تھے۔ وہ ایک کے ساتھ گزارے ہوئے ان چند ہفتوں کو اپنے ذہن کی ڈائری کی انٹریز کی طرح پڑھ سکتی تھی...... ایک کا ایک ایک جملہ...... ایک ایک بات...... پھر اگر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ بھی ایک کو اسی طرح یاد ہو گی تو یہ زیادہ بڑی خوش فہمی نہیں تھی۔ آٹھ سال اتنا طویل عرصہ نہیں ہوتا کہ ایک اس کے چہرے کے نقوش میں کوئی یاد کھوج نہیں پاتا...... لیکن ایک شیر دل اسے نہیں پہچانتا تھا۔ وہ نام سے اسے نہیں پہچان سکتا تھا کیونکہ خیر دین اسے چڑیا کہتا تھا یا پھر فاطمہ...... اس کے نام کا دوسرا حصہ جس سے وہ چڑیا کے بعد جانی اور پہچانی جاتی تھی...... عکس کے نام سے وہ اسکول کے علاوہ اور کہیں نہیں پکاری جاتی تھی۔ نہ گھر میں نہ خاندان میں...... فاطمہ اس کے نام کا وہ حصہ تھا جس کا اضافہ اس کی پیدائش کے بعد اس کے خاندان کے افراد نے عکس نام سے اسے پکارنے میں دقت کے بعد کیا گیا تھا۔ خیر دین نے اس کا نام بڑے شوق سے رکھا تھا لیکن چند ہفتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نام کو اس کے خاندان اور گاؤں والے کبھی بھی صحیح تلفظ سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ خیر دین نے چڑیا کا نام نہیں بدلا صرف اس میں فاطمہ کا اضافہ کر دیا لیکن وہ اسکول، کالج میں عکس مراد علی کے طور پر ہی جانی جاتی رہی۔ ایک بھی خیر دین کی طرح اسے عکس یا فاطمہ کے بجائے چڑیا ہی کہتا رہا تھا۔ چڑیا کو پھر بھی خوش فہمی تھی وہ عکس کا لفظ سنتے ہی چڑیا تک پہنچ جائے گا، وہ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے پہچاننے لگے گا۔ یہ پہچان چڑیا کو کبھی خوف زدہ نہ کرتی اگر اس رات اس نے ایک کو وہاں ریلنگ کے پاس کھڑے چلاتے نہ دیکھ لیا ہوتا۔ خوف اور دہشت کے عالم میں بھی ایک کے سامنے بے لباسی کا احساس چڑیا کو گاڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ اس کی چیخوں نے چڑیا کی جان بچائی تھی مگر ان آٹھ سالوں میں بہت بار چڑیا اس ایک نظر سے نادم رہی جو اس نے ایک کو خود پر ڈالتے دیکھی تھی...... وہ جس حالت میں ایک کے سامنے آئی تھی' وہ اس حالت میں کبھی بھی اس کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی۔ اور اسے جیسے خوف بھی یہی تھا کہ وہ اسے پہچانے گا تو اس بے لباسی کے حوالے سے اس ایک رات کے حوالے سے پہچانے گا...... ان چند شاندار ہفتوں میں اکٹھے گزارے ہوئے یادگار وقت کے حوالے سے نہیں۔

اس تقریری مقابلے کے بعد بھی اسے یقین تھا ایک کو اگر فوری طور پر وہ یاد نہیں آئی ہو گی تو گھر جا کر یاد آ جاتی...... چند دنوں کے بعد یاد آ جاتی...... اور کچھ نہیں تو کم از کم چڑیا کا چہرہ اس کی نظروں میں کبھی اٹک جاتا۔ اس کی یہ خوش فہمی اکیڈمی میں دور ہو گئی تھی۔ عکس مراد علی کے حوالے سے ایک شیر دل کی کسی قسم کی کوئی یادداشت نہیں تھی...... اسے شروع میں یقین نہیں آیا کہ وہ واقعی اسے یاد نہیں تھی۔ کئی ہفتے وہ اسے اگنور کرتی رہی صرف اسی ایک خدشے کے تحت کہ وہ اب اسے ضرور پہچان لے گا...... اگر چڑیا کا چہرہ نہ پہچان سکا تو کم از کم سات آٹھ سال پہلے ہونے والے اس تقریری مقابلے کی تو کوئی میموری ہو گی اس کے پاس......
اور جب عکس مراد علی کو بالآخر یہ یقین آیا کہ ایک شیر دل کو اس کے حوالے سے "کچھ بھی" یاد نہیں تھا تو وہ ہل کر رہ گئی تھی...... شاک کی ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے وہ دوچار ہوئی تھی۔ ایک شیر دل کمزور یادداشت کا مالک نہیں تھا کم از کم عکس کو اس حوالے سے کوئی ابہام نہیں تھا اس کے باوجود اس کا یاد نہ رہنا صرف ایک چیز کا اظہار تھا...... چڑیا ایک کے لیے ٹائم پاس تھی...... وہ اس کے لیے وہ اہمیت نہیں رکھتی تھی جو ایک اس کے لیے رکھتا تھا...... اور کیوں اہمیت رکھتی آخر وہ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھنے والے ایک کم عمر بچے کے لیے جس کے

پاس کزنز اور دوستوں کا ایک جمِ غفیر تھا جو اسی کی طرح کے سوشل سیٹ اپ سے تعلق رکھتے تھے۔ چڑیا ایک چھوٹے شہر میں آکر بوریت سے بچنے کے لیے ڈھونڈی جانے والی ایک ساتھی ہو سکتی تھی لیکن وہ اس کی وہ دوست نہیں ہو سکتی تھی جسے اس نے واپس ایچی سن اپنے جیسے دوستوں میں جا کر مس کیا ہو......وہ چڑیا کے بچپن کی بہترین چیزوں میں سے ایک تھا لیکن چڑیا ایبک کے لیے ایک بہترین یاد کیسے ہو سکتی تھی۔ بڑے سالوں بعد عکس مرادعلی نے بیٹھ کر جذباتیت کی گرد جھاڑ کر اپنے اور ایبک کے تعلق کو دیکھا تھا اور عجیب سی ندامت اور رنجیدگی ہوئی تھی اسے۔

ایک شیر دل، عکس مرادعلی کو اس تقریری مقابلے کے حوالے سے بھی یاد نہیں رکھ پایا تھا......اسے اپنی شکل و صورت کے حوالے سے کوئی خوش فہمی کبھی نہیں رہی تھی لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ مرد اسے اگنور نہیں کر سکتے......وہ کم از کم اتنے معمولی خدوخال کی مالک نہیں تھی کہ ایک اسے یاد بھی نہ رکھتا......اور یہاں اسے اہم سمجھنے کا سوال بھی نہیں تھا یہاں بات صرف یاد رکھنے کی تھی......صرف اور صرف یادداشت کا حصہ رکھنے کی......عکس مرادعلی وہ بھی نہیں تھی۔

"زندگی میں ہارنے والوں کو بہت کم لوگ یاد رکھتے ہیں......ہار انسان کے غیر معمولی چہرے کو بھی معمولی بنا دیتی ہے اور جیت معمولی شکل کو غیر معمولی۔" عکس مرادعلی نے اس گتھی کو خیردین سے حل کروانے کی کوشش کی تھی۔

"میرے ساتھ اکیڈمی میں ایک لڑکا ہے نانا......سات آٹھ سال پہلے ایک انٹر کالجیٹ مقابلے میں اس نے مجھے ہرا کر وہ مقابلہ جیتا تھا لیکن میں حیران ہوں کہ اسے میں یاد تک نہیں حالانکہ وہ مجھے یاد ہے۔" اس نے خیردین کو ایک شیر دل کا نام لیے بغیر اپنا مسئلہ بتایا۔ "مجھے لگتا ہے وہ دکھاوا کر رہا ہے مجھے نہ پہچاننے کا ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے میں یاد ہی نہ ہوں۔" عکس نے اپنا اندازہ بھی اس کے ساتھ شیئر کیا۔

"لوگ ہارنے والوں کے چہروں اور ناموں پر غور نہیں کرتے چڑیا۔ تم نے تو دوسری، تیسری پوزیشن بھی نہیں لی اس مقابلے میں......پھر تمہیں وہ کس حوالے سے یاد رکھتا......ہارنے والے تو بہت سے ہوتے ہیں۔" کیا تلخ حقیقت تھی جو خیردین نے مصری کی ڈلی کی طرح توڑ کر چڑیا کے سامنے رکھ دی تھی۔ ایک شیر دل عام شخص تھا اس کی نفسیات بھی عام شخص جیسی ہی تھی...... جیت اور جیتنے والوں کو یاد رکھنے کی کوشش اور ہارنے والوں کو بھول جانے کی......وہ اوپر دیکھنے کا عادی تھا نیچے نہیں۔

زندگی میں ایک اور سبق عکس مرادعلی نے اس دن حاصل کیا تھا۔ وہ زندگی میں ان تمام لوگوں کے چہروں اور ناموں پر بھی غور کرے گی جنہیں وہ زندگی میں ہرائے گی۔ وہ زندگی میں خود کبھی عکس مرادعلی جیسے حریف کا سامنا نہیں چاہتی تھی جو یک دم کسی dark horse کی طرح ایک دن اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے اور اسے اس کے بارے میں کچھ بھی پتا نہ ہوتا۔

بلیک ڈنر سوٹ کے ساتھ ایک سرخ striped ٹائی لگائے، سلور کف لنکس اور ٹائی پر ایک کرسٹل کی ٹائی پن لگائے وہ اپنے اس حلیے میں اس کے سامنے کھڑا تھا جو اس کی ایک وجہ شہرت تھی۔ اکیڈمی میں کوئی اور کامنر اپنی ڈریسنگ سینس میں شیر دل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ عکس مرادعلی نے اتنے سالوں کی سروس میں بھی ...

شیر دل سے زیادہ خوش لباس مرد نہیں دیکھا۔

عکس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ ستائشی نظروں سے شیر دل کو دیکھا۔ ہوا کے ایک جھونکے نے شیر دل کی ٹائی کو اڑایا۔ عکس کی نظر بھٹکی، اس کی ٹائی کو اڑنے سے روک دینے کی خواہش کو اس نے اتنی ہی بے اختیاری کے ساتھ دبایا جس طرح وہ اُبھری تھی۔

دونوں کے درمیان اب خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہی رسمی جملے......اور وہی ان کہے مفہوم......وہ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بات کر رہا تھا اور وہ کبھی بھی اس کے چہرے سے اس کے دل تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ وہ اسے راستے میں ہی بھٹکا دیتی تھی...... ہمیشہ بڑی کامیابی کے ساتھ......عکس نے سوچا اس کے چہرے پر نظریں جمائے شیر دل کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے پر موجود کون سی شے کس کو ماند کر رہی تھی۔ اس کے کانوں کی لوؤں میں دمکتے سفید موتیوں کے studs اس کی شفاف چمکدار سیاہ آئی لائنر سے سجی آنکھوں کو یا سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں سے جھلکتی دودھیا دانتوں کی قطار کو جو اس کی مسکراہٹ کو اور بھی دلکش کر رہی تھی۔ بارش کی پھوار کے ننھے ننھے قطرے اوس کے قطروں کی طرح اس کے بالوں اور چہرے پر چمک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے شیر دل کا دل چاہا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کر دے......صرف ایک لمحے کے لیے......پھر اس نے نظر چرائی تھی...... جیب سے ایک ٹشو نکال کر غیر محسوس انداز میں عکس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"تم نے بڑا رسک لیا۔" عکس نے وہ ٹشو تھام کر اسی غیر محسوس انداز میں اپنا چہرہ اور سر تھپتھپاتے ہوئے کچھ حیرانی سے اس سے پوچھا۔

"کیا؟" وہ دونوں اب ساتھ چل رہے تھے۔

"بارش میں گاڑی سے نکل آئیں۔" قدم بڑھاتے ہوئے شیر دل نے اس سے کچھ سنجیدگی سے کہا۔

"تو؟" وہ الجھی۔

"اگر میک اپ بہہ جاتا تو؟" اس بار شیر دل کے ہونٹوں اور آنکھوں میں شرارت لہرائی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ایک سیاہ آئی لائنر اور لپ اسٹک کے علاوہ شاید ہی کچھ اور لگائے ہوئے تھی۔

"ہاں رسک تو تھا۔ میک اپ صاف ہو جاتا تو تم اس سے زیادہ گھورتے مجھے...... جتنا ابھی گھور رہے تھے۔" عکس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو کو بڑی نفاست سے لپیٹ کر پرس میں بے نیازی سے رکھتے ہوئے کہا۔ جواب بھی ویسا ہی آیا تھا جیسا سوال کیا گیا تھا۔ اسے دیکھے بغیر شیر دل نے بے اختیار سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ وہ اس کی اس حسِ مزاح کی عادی تھی۔ اسے دیکھ کر شیر دل کے لیے خاموش رہنا اور کسی نہ کسی بات پر کوئی نہ کوئی پھڑکتا ہوا تبصرہ نہ کرنا ناممکن تھا۔ وہ بچپن سے اس کی عادی تھی۔ ایک شیر دل کے پاس بچپن میں بھی احمقانہ باتوں کا ڈھیر ہوتا تھا اور ڈھیر کا مطلب ڈھیر ہی ہوتا تھا اور وہ ہر احمقانہ بات بے حد سنجیدگی سے کرتا تھا۔ چڑیا اس کے ان چند قریبی ساتھیوں میں سے ایک ثابت ہوئی تھی جو بہت جلد ہی یہ سمجھ گئی تھی کہ وہ ساری باتیں کم از کم ایبک کے لیے احمقانہ نہیں تھیں۔ وہ انہیں بڑی سنجیدگی سے کرتا تھا......اور چڑیا دوسرے بچوں کے برعکس بڑی سنجیدگی سے انہیں سن لیا کرتی تھی......اس کی یہ عادت اب بھی قائم

تھی۔

وہ اب باقی لوگوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ شیر دل اسے جواباً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کمشنر کی بیوی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے شہر بانو عکس کے استقبال کے لیے کچھ آگے بڑھ آئی تھی۔ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

''شہر بانو...... عکس مراد علی۔'' چند لفظوں میں شیر دل نے باری باری دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ دونوں ناموں کے ساتھ کوئی سیاق و سباق نہیں تھا پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو اس سے کہیں زیادہ جانتی تھیں جتنا شیر دل نے ان کا تعارف کروایا تھا۔ سفید شیفون کے کلیوں والے کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں شہر بانو ایک باربی ڈول لگ رہی تھی۔ عکس اس کے لیے کوئی اور تشبیہ نہیں ڈھونڈ سکی تھی۔ وہ آج بھی اس کی باربی ڈول تھی۔ ڈاکٹر فرح کی بیٹی کے پاس موجود وہ گڑیا جو اسے ہمیشہ للچایا کرتی تھی اور اس جیسی گڑیا خریدنے کے لیے اس نے خیر دین سے بہت اصرار کیا تھا۔

خیر دین اسے لے کر بازاروں میں کھلونوں کی دکانوں پر باربی ڈول کی تلاش میں پھرتا رہا تھا۔ جو سستی نقل دکانوں پر مل رہی تھی وہ چڑیا کو پسند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اصل اور نقل کا فرق بتا نہیں سکتی تھی لیکن سمجھتی ضرور تھی اور جو اصلی باربی ڈول اسے چند دکانوں میں نظر آئی تھی اس کی قیمت اتنی تھی کہ خیر دین اسے چڑیا کو دکھا سکتا تھا دلوا نہیں سکتا تھا۔ کئی دن بازاروں کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر چڑیا کو پتا چل گیا تھا کہ باربی ڈول اس کی استطاعت اور اوقات سے باہر کی چیز تھی اور اس کے لیے ضد یا اصرار کرنا خیر دین کو تکلیف اور شرمندگی کے سوا کچھ نہ دیتا۔ اس نے باربی ڈول کی فرمائش ختم کر دی تھی مگر وہ اس کے حواس پر سوار رہی تھی۔ تین سالہ شہر بانو پر پہلی نظر میں بھی اسے خوب صورت ایوننگ گاؤن والی وہ باربی ڈول ہی یاد آئی تھی۔ اس کے صرف بال سنہری نہیں تھے مگر اس کی خوب صورتی، ناز نخرہ، لباس سب اسی باربی ڈول جیسا تھا جو اس کے لیے untouchable تھی۔

اتنے سالوں بعد شہر بانو کو دیکھتے ہوئے عکس مراد علی کو آج بھی باربی ڈول ہی یاد آئی تھی۔ دودھیا رنگت، سیاہ لمبی خمدار آنکھیں، ننھی سی نوک والی تیکھی ناک اور بے حد باریک مسکراتے ہونٹ...... عکس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی تھی اسے دیکھ کر...... اسے آج بھی اس پر ویسا ہی پیار آیا تھا جیسا اس کو پہلی بار دیکھ کر آیا تھا۔ اس کا دل آج بھی اس کی طرف...... اسی طرح ہمکا تھا جس طرح پہلی بار اسے دیکھ کر ہمک کر اس کی طرف گیا تھا۔ شیر دل کو اس سے زیادہ پرفیکٹ لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ واقعی صرف شیر دل کے ساتھ سجتی تھی۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے عکس نے سوچا تھا۔ شیر دل کے ذہن میں سب سے پہلے شہر بانو کے حوالے سے اس طرح کا خیال ڈالنے والی بھی وہی تھی۔

''میرا خیال ہے وہ تم سے محبت کرتی ہے۔'' اس نے فون پر شیر دل سے شہر بانو کے حوالے سے کوئی قصہ سننے کے بعد کہا تھا۔ وہ جواباً ہنسا تھا۔

''یہ کون سی نئی بات ہے جو تم مجھے بتا رہی ہو۔ میں جانتا ہوں وہ مجھ سے محبت کرتی ہے...... مجھ پر مرتی ہے۔'' اس نے آخری جملہ بڑے اعتماد سے بڑے جتانے والے انداز میں کہا تھا۔ ''کوئی پہلی لڑکی تو نہیں ہے وہ جسے مجھ سے محبت ہوگئی ہو......''

مسٹر شیخ چلی اگر تم شیخیاں بگھارنا بند کرو تو میں کچھ کہوں۔'' عکس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے ٹوکا۔ ''تم سے زندگی میں پہلی بار کوئی اچھی لڑکی محبت کر رہی ہے۔''

''Now that,s not fair'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ کر احتجاج کیا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو...... تمہیں کیا پتا مجھ پر کون کون مرتا......'' عکس نے اس کی بات کاٹی۔

''تم تقریر کرنے کے بجائے ان لڑکیوں کے ناموں کی ایک لسٹ بنا لو جو تم پر مرنے کا شرف حاصل کر چکی ہیں...... ہو سکے تو تصویریں بھی لگا لینا ساتھ...... تصویریں تو ہوں گی نا ہر لڑکی کی تمہارے پاس؟'' عکس نے اسے بظاہر بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا یوں جیسے وہ دونوں اکیڈمی میں کوئی سینڈیکیٹ رپورٹ تیار کرنے کے بارے میں suggestion پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

''ہر لڑکی کی تصویر ہے میرے پاس سوائے تمہارے......'' شیر دل نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''میں تو اس کیٹگری میں ویسے ہی نہیں آتی کیونکہ نہ میں تم پر مرتی ہوں، نہ تمہارے ساتھ جی سکتی ہوں۔'' عکس نے بھی اسی انداز میں کہا۔ ''تو اس لیے میں تو تمہاری سوینئرز کلیکشن کا حصہ بن ہی نہیں سکتی...... ویسے ہم شہر بانو کی طرح بات کر رہے تھے۔'' عکس نے بات کے اختتام پر اسے پھر شہر بانو یاد دلائی۔

''میں تو مرتا ہوں نا تم پر۔'' شیر دل ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

''تم کس لڑکی پر نہیں مرتے شیر دل۔'' عکس نے ہنس کر کہا۔ وہ بھی ہنس دیا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''شہر بانو پر غور کرو...... پرفیکٹ میچ ہے وہ تمہارا۔'' عکس گھوم پھر کر ایک بار پھر اسی موضوع پر آ گئی۔

''تمہیں میری اور شہر بانو کی match making میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟'' شیر دل نے یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''جب تمہیں مجھ میں دلچسپی نہیں ہے تو leave it...... میں جس سے چاہے شادی کروں تمہیں کیا۔'' شیر دل نے اسی انداز میں کہا۔

''میں چاہتی ہوں تمہیں کوئی تمہارے جیسی نہ مل جائے۔'' عکس نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''تم دوست ہو...... اتنی پروا تو ہے مجھے تمہاری کہ میں تمہیں کسی کنویں میں نہ کودنے دوں۔''

''نہیں نہیں تم مجھے کودنے دو کنویں میں...... تم ٹینشن مت لو۔'' اس نے اطمینان سے کہا عکس کو ہنسی آ گئی۔

''میں تم سے کیا کہہ رہا تھا؟'' شیر دل نے موضوع یاد کرنے کی کوشش کی۔

''تم مجھ سے شہر بانو کی بات کر رہے تھے۔'' عکس بات کو پھر وہیں لے آئی...... شہر بانو کی طرف بڑھتے ہوئے عکس کو پتا نہیں کیا کیا یاد آ رہا تھا لیکن ان تمام یادوں میں کوئی تلخ یاد نہیں تھی وہ سب کچھ جیسے فلٹر کرتی جا رہی تھی۔

شہر بانو نے اس سے پہلے عکس مراد علی کا نام سنا تھا یا اس کو شیر دل کے گروپ فوٹو گراف میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ لاکھ غور کرنے کے باوجود بھی اس کی شکل و صورت اور حلیے میں وہ خاص چیز کھوجنے میں ناکام رہی تھی جو اس کے ذہن میں کسی اندیشے یا خدشے کو جنم دیتی لیکن آج اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ عکس مراد علی سے بُری طرح خائف ہوئی تھی...... کیوں ہوئی؟ یہ اسے کئی دن سمجھ نہیں آیا...... نہ اسے شیر دل سے کوئی خدشہ تھا نہ عکس مراد علی اس حسن و جمال کی مالک تھی جس سے اسے کوئی احساسِ کمتری ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود

اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ عکس مراد علی کو نظر انداز کرنا بے حد مشکل تھا اور اس کو پسند نہ کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔

برآمدے کی انٹرنس پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ دونوں شہر بانو کو کسی فوٹو فریم کا حصہ لگے تھے۔ ایک پرفیکٹ پکچر...... دراز قد، اٹریکٹو، پُر اعتماد، اسمارٹ...... سیاہ لباس میں ملبوس وہ ایک ایسا کپل لگ رہے تھے جو گھر سے نکلتے ہوئے top سے toe تک پرفیکٹ میچنگ کر کے آئے تھے۔ کوئی بھی ایک نظر میں دیکھ لیتا کہ عکس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک کا رنگ شیر دل کی ٹائی کے رنگ کا ایک حصہ لگ رہا تھا...... شہر بانو نے بھی نوٹس کیا تھا...... ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے کسی رشتے اور تعلق کے بغیر بھی ان دونوں کی باڈی لینگویج میں ایک عجیب کیمسٹری تھی...... ایک عجیب سا ربط اور تعلق تھا۔ جس کو نہ چھپانے کی کوشش کی تھی، نہ دکھانے کی...... لیکن وہ پھر بھی چھپ چھپ کے دکھ رہا تھا۔

شہر بانو الجھی ٹھٹکی...... اور پھر چاہنے کے باوجود وہ عکس سے ویسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کر سکی جو وہ کرنا چاہتی تھی جو وہ دوسرے مہمانوں کے ساتھ کر رہی تھی اور عکس نے یہ محسوس کر لیا تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں اس کی طرف بڑھی اور عکس نے بھی اس کا ہاتھ اسی احتیاط سے پکڑا تھا جس سے وہ بڑھایا گیا تھا۔ اسے اسکول میں اپنا اور باربی ڈول کا پہلا آمنا سامنا یاد آیا تھا...... وہ تب بھی اسی طرح ملی تھی اس سے...... ڈرتی، جھجکتی، ٹھٹھکتی......

شہر بانو نے عکس مراد علی کے ہاتھ کی نرمی اور حدت کو بیک وقت محسوس کیا۔ دونوں کی نظریں ملیں عکس کو اس سے نظریں ملانے میں کوئی عار نہیں ہوئی۔ چار سال کی وہ بچی اسے کبھی نہیں پہچان سکتی تھی۔

”آپ کیسی ہیں؟“ شہر بانو نے اسے کہتے سنا۔ اس کی آواز کی ملائمت نے شہر بانو کے وجود کی سرد مہری کو عجیب انداز میں پگھلایا۔

”I 'm fine ,how are you“ اس نے جواباً اپنی مسکراہٹ کو کچھ گرم جوش کرنے کی کوشش کی۔

”I ‘m good too“ عکس نے جواباً ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ دونوں کا ذہن بیک وقت blank ہوا تھا۔ اگلا جملہ دونوں کے پاس نہیں تھا۔ شیر دل اب کمشنر کے ساتھ اندر جا رہا تھا۔ شہر بانو کو جیسے ایک عجیب اطمینان ہوا تھا اس فوٹو فریم کے ایک حصے کو وہاں سے ہٹتے دیکھ کر۔

”شیر دل سے بہت سنا ہے میں نے آپ کے بارے میں۔“ گفتگو کا ٹوٹا سلسلہ جوڑنے کی کوشش عکس نے کی تھی۔

”اچھا......؟ میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“ عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی شہر بانو نے اسے کچھ جتانے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ جانتی تھی شہر بانو جھوٹ بھی نہیں بول رہی تھی۔ شیر دل اس کا ذکر شہر بانو سے کبھی نہیں کر سکتا تھا کسی بھی حوالے سے نہیں کر سکتا تھا...... کرتا تو عکس مراد علی کو شاک لگتا...... وہ اس کی گرل فرینڈ نہیں تھی، وہ اس کا افیئر بھی نہیں تھی، وہ اس کی محبوبہ بھی نہیں تھی، وہ اس کی دوست بھی نہیں تھی...... اس کے باوجود وہ شیر دل کا سب کچھ تھی...... اس کا وہ راز جو ایک شیر دل ہمیشہ چھپاتا رہا تھا ہمیشہ چھپا سکتا تھا۔ ایک نو سالہ بچے کے طور پر بھی وہ چڑیا کو guard کر سکتا تھا۔ ایک adult

کے طور پر تو یہ کچھ مشکل بات ہی نہیں تھی۔

ان دونوں کے درمیان چند اور جملوں کا تبادلہ ہوا تھا ساتھ چلتے ہوئے...... موسم کے بارے میں...... مہمانوں کے بارے میں...... ڈنر کے بارے میں اور پھر عکس اس کے ساتھ اس ہال کمرے میں داخل ہو گئی تھی جہاں ڈنر کا انتظام تھا۔

اس ہال کمرے میں بیٹھ کر اس رات اس نے گزرے ہوئے کل کی ساری یادوں، ساری آوازوں سے خود کو shut off کر لیا تھا بالکل اسی طرح جیسے سڑک پر خیر دین کے پھلوں کی ریڑھی پر بیٹھی اسکول سے ملنے والا ہوم ورک کرتے ہوئے وہ سڑک پر سے گزرنے والے ٹریفک کے بے ہنگم شور سے خود کو کاٹ لیا کرتی تھی۔

لوگوں کے ہجوم کے بیچ بیٹھ کر عکس مراد علی نے اپنے آپ پر اپنی زندگی پر اپنی زندگی میں آنے والی تکلیفوں پر کبھی ماتم نہیں کیا تھا...... کبھی خود پر ترس کھاتے ہوئے خود کو دوسروں سے کمتر اور دوسروں کو برتر نہیں سمجھا تھا۔ خیر دین نے اسے زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بھی جینا اور مسکراتے ہوئے جینا سکھایا تھا اور اس ہال میں اتنے سالوں کے بعد بیٹھے ہوئے وہ زندگی کے زہر آلود حصوں کو چھوئے بغیر گزر رہی تھی...... اور وہ گزر گئی تھی۔

☆☆☆

”تم یہ کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ خیر دین نے بے حد حیرانی سے عکس کا چہرہ دیکھا تھا۔ بیرونِ ملک اپنی ڈگری مکمل کرنے کے بعد وہ چند ہفتے پہلے پاکستان آئی تھی اور اس کی پرموشن ہوئی تھی اور پرموشن کے بعد اس نے آج خیر دین سے جو بات کی تھی اس نے خیر دین کو حیران کر دیا تھا۔ وہ خیر دین کی زمین واپس لینے کے لیے کیس کرنا چاہتی تھی۔ وہ زمین جس کو خیر دین کبھی نہیں بھولا تھا لیکن ہمیشہ بھولنے کی کوشش کرتا رہا تھا...... لیکن رزقِ حلال پر ڈالا ہوا ڈاکا کسی انسان کو نہیں بھولتا...... خیر دین نے بھی وہ زمین نہیں اپنی ساری زندگی محنت سے کمایا اور بچایا ہوا رزقِ حلال گنوایا تھا...... وہ بھی تب جب وہ پائی پائی کا محتاج تھا...... اور آج اتنے سالوں بعد وہ عجیب اچنبھے والی بات کر رہی تھی...... اتنے سالوں سے جاب میں آنے کے بعد وہ ایک بار بھی گاؤں نہیں گئی تھی۔ خیر دین اب گاؤں آنے جانے لگا تھا اور گاؤں میں اب وہ اس کا شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں اور ان کی اولادوں کے اصرار کے باوجود کبھی ان کے گھر نہیں ٹھہرتا تھا بلکہ اپنے اسی دوست کے پاس ٹھہرتا تھا جہاں اس نے مشکل وقت میں پناہ لی تھی۔ اپنے خاندانی گھر میں نہ ٹھہرنے کے باوجود اس نے وہاں سے گزرتے ہوئے اس گھر کے دروازے پر وہ نیم پلیٹ دیکھ لی تھی جس پر عکس مراد علی کا پورا نام اس کے عہدے کے ساتھ لکھا ہوا تھا اور وہ تختی بڑے نمایاں انداز میں اس گھر کے دروازے پر لگی ہوئی تھی جہاں کبھی اس کے، حلیمہ اور چڑیا کے لیے رہنے کی جگہ تک نہیں تھی۔ خیر دین نے گاڑی رکوا کے نم آنکھوں اور مسکراہٹ کے ساتھ وہ تختی دیکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے اسے کئی سال پہلے کی وہ تختی یاد آئی تھی جس پر اس نے بھی ایسے ہی فخریہ انداز میں اپنا نام، اپنا عہدہ اور اپنے صاحب کا نام بھی لکھوایا تھا۔ پتا نہیں وقت زیادہ بے شرم ہے یا انسان...... جو رنگت بدلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ فخریہ انداز میں ٹنگی ہوئی وہ تختی دروازے پر نہیں انسان کی بے ضمیری پر لگائی گئی تھی...... خونی رشتے بعض دفعہ طوائف جیسی اور جتنی وفاداری بھی نہیں دکھاتے...... کتابیں لکھ لیں مادہ پرستی پہ یا بیچ بازار میں

مجمع اکٹھا کرکے مذمتی تقریریں کرکے نعرے لگوالیں یہ وہ بیماری ہے جس کا کوئی حل نہیں...... جسم کی بیماریاں ہوں تو کوئی علاج کوئی حل نکلتا جو نفس کو لگ جائے وہ کیسے ختم ہو......

وقت خیر دین کو دنیا سے جانے سے پہلے سارے تماشے دکھا دینا چاہتا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا۔ بعض تختیاں انسان کا دل بوجھل کرتی ہیں۔ عکس مراد علی کے نام کی تختی نے بھی خیر دین کا دل اسی طرح بوجھل کردیا تھا۔ ہر بار گاؤں جانے پر ایک بار پھر اس کے پاس سفارشی رقعے اور درخواستیں لے کر آنے والے لوگوں کا جمگھٹا لگنا شروع ہوگیا تھا۔ خیر دین چپ چاپ ماضی کو یاد کرتے ہوئے ان رقعوں اور درخواستوں کو اکٹھا کرتا جاتا اور پھر واپس آکر عکس کے سامنے رکھ دیتا۔ جو اگلے کئی دن ان درخواستوں کی منظوری اور ان پر عمل درآمد کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف رہتی۔ اس نے کبھی نانا کو یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ جن لوگوں کی مدد کے لیے اس سے کہہ رہا ہے وہ بہت بے رحم اور بے حس لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ جنہوں نے ان لوگوں کی زندگی کے مشکل ترین دنوں میں ان کی رسوائی اور بربادی کا تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا اور کسی نے آگے بڑھ کر ان کے حق کے لیے ان کی مدد کے لیے آواز نہیں اٹھائی تھی اور وہ آج بھی صرف ان کے اچھے دنوں کی چھاؤں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کے پاس آتے تھے...... نہ وہ بدلے تھے نہ ان کا ضمیر نہ ان کا خمیر...... مگر خیر دین کو یہ سب یاد دلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... اور عکس کو اپنا وقت ضائع کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

"تم بڑے نصیب والی ہو چڑیا......" خیر دین نے ایک بار گاؤں سے آنے کے بعد عکس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ان دنوں اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر اسلام آباد میں پوسٹڈ تھی اور خیر دین گاؤں سے سیدھا اسی کے پاس آگیا تھا۔ وہ شام کے وقت اپنا کچھ کام نمٹاتے ہوئے ساتھ خیر دین سے گاؤں کے قصے سن رہی تھی جب اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین نے یک دم اس سے کہا۔ اس نے کام کرتے کرتے مسکرا کر ایک نظر خیر دین کو دیکھا اور پھر اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو میرے خوش قسمت ہونے کا خیال کیسے آگیا؟"

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتنی عزت دی ہے...... اس قابل بنایا ہے کہ تم لوگوں کے لیے کچھ کرسکو، گاؤں والے گھر میں درجنوں بچے، بچیاں ہیں لیکن اس گھر کے دروازے پر کسی مرد کا نام نہیں ہے...... بلکہ تمہارا نام ہے۔ اس پورے گاؤں میں کسی گھر کے دروازے پر کسی عورت کا نام نہیں لکھا ہوا سوائے تمہارے نام کے...... اور ہر کوئی پہلی بار جب بھی اس دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے تو رک کر اس تختی کو ضرور پڑھتا ہے۔ میں تو ہر بار ہی رک کر اس تختی کو پڑھتا ہوں۔" خیر دین بات کرتے کرتے آخری جملے پر ہنس کر شرمایا تھا۔ عکس کو اپنے نانا پر عجیب سا پیار آیا۔ وہ اس سے جیسے کوئی گہرا راز شیئر کررہا تھا۔

"نانا وہ میرا نام نہیں ہے...... میرا عہدہ ہے جس کی وجہ سے اس گھر کے ماتھے پر میرا نام لکھا گیا ہے......" عکس نے اپنے کام میں مصروف مسکراتے ہوئے کسی تاثر کے بغیر اس کو جیسے یاد دلایا۔

"یہ عہدہ بھی تمہاری ہی قابلیت ہے...... گاؤں میں ہے کسی کے پاس یہ عہدہ......؟ کسی عورت کے پاس تو کیا کسی مرد کے پاس بھی نہیں ہے۔" خیر دین اس کی بات کے جواب میں عجیب انداز میں جذباتی ہوگیا تھا۔ عکس مسکراتے ہوئے کام کرتے ہوئے خیر دین کی بات سنتی رہی۔

"گاؤں میں کیا پورے ضلع میں کسی اور عورت کے پاس یہ عہدہ نہیں ہے۔ اللہ ہر ایک کو عہدے کہاں

دیتا ہے...... جب تم کالج گئی تھیں تو تم اس گاؤں سے کالج جانے والی پہلی لڑکی تھیں پھر اس گاؤں سے امتحانات میں ٹاپ کرنے والی واحد لڑکی...... ڈاکٹر بننے والی پہلی لڑکی...... اسسٹنٹ کمشنر بننے والی پہلی لڑکی...... سی ایس ایس کے امتحان میں ٹاپ کرنے والی پہلی لڑکی...... یہ سارے کوئی چھوٹے اعزاز تھوڑی ہیں۔ پاکستان میں کتنی لڑکیاں ہیں جن کے پاس اتنی قابلیت ہوگی اور اس قابلیت کا صلہ بھی۔" خیر دین بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے اس کے اعزاز گنوا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ دن میں کتنی بار چڑیا کی ان کامیابیوں کو گن گن کر چلتا تھا۔ "ایک دن تم اس گاؤں سے ڈپٹی کمشنر بننے والی بھی پہلی لڑکی ہوگی اور کمشنر بننے والی بھی۔" عکس خیر دین کی اس جذباتی پیش گوئی پر ہنس دی تھی۔

"نانا پاکستان میں عورتیں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر نہیں بنتیں۔ ہمیں ڈویژن چلانے کے لیے نہیں دیا جاتا۔" اس نے جیسے خیر دین کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "سندھ میں شاید ایک آدھ خاتون آفیسر کو کچھ عرصہ کے لیے ڈپٹی کمشنر کے طور پر تعینات کیا گیا تھا لیکن وہ بھی بہت کم عرصے کے لیے...... آپ اور خواب نہ دیکھیں میرے بارے میں۔"

"ایک دن آئے گا کہ یہ بھی ہوگا تم دیکھ لینا چڑیا، تم ڈپٹی کمشنر بھی بنوگی اور کمشنر بھی...... لیکن شاید تب تک میں نہ رہوں۔" خیر دین کو بات کرتے کرتے یک دم خیال آیا۔

"آپ اس بات کو چھوڑیں یہ بتائیں دروازے پر لگی اس تختی پر کیا لکھا تھا؟" عکس نے بڑی مہارت کے ساتھ خیر دین کو جیسے اداس ہونے سے روکا۔ وہ اب اکثر اپنی موت کا ذکر کرنے لگا تھا۔

"اس تختی پر لکھا تھا ڈاکٹر عکس مراد علی، نواسی خیر دین۔ اسسٹنٹ کمشنر اسلام آباد۔" خیر دین بچوں کی طرح بہلا اور اسے اس تختی پر لکھی تحریر فر فر سنانے لگا۔ عکس نے کام کرتے کرتے اپنا ہاتھ روک دیا اور وہ خیر دین کا چہرہ دیکھنے لگی...... وہ جانتی تھی اس نے خیر دین کو زندگی میں فخر کے بے شمار لمحے دیے تھے۔ اس نے خیر دین کی جھولی کو بھر دیا تھا لیکن زندگی میں جو کچھ خیر دین نے اس کے لیے کیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو وہ اس کے لیے کرپائی تھی۔ وہ جانتی تھی خیر دین کی زندگی کا اب آخری حصہ اس کے پاس تھا اور وہ اس آخری حصے کے گزر جانے سے پہلے خیر دین کے زندگی کے کھوئے ہوئے اثاثے بھی لوٹا دینا چاہتی تھی اسے...... کم از کم وہ چیزیں جو خیر دین نے اس کی وجہ سے کھوئی تھیں۔

اور کئی سال بعد یہ پہلا کام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ "گڑے مردے اکھاڑنے کا فائدہ۔" اس رات جب اس نے بالآخر خیر دین کو یہ بتایا تھا کہ وہ زمین واپس لینے کی کوشش کرنا چاہتی ہے تو خیر دین نے اس سے کہا تھا۔

"وہ گڑا مردہ نہیں ہے...... ہمارا حق ہے...... اور اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے...... جدوجہد کرنی چاہیے...... ہمیشہ آپ ہی سکھاتے رہے مجھے یہ بات......" عکس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔ وہ عکس کی بات پر کچھ دیر بول نہیں پایا۔

"تمہیں بیٹھے بٹھائے زمین کا خیال کیسے آگیا؟" خیر دین نے جواباً اس سے پوچھا۔

"اب خیال نہیں آیا...... ہمیشہ سے خیال رہا ہے مجھے اس کا۔ آپ کو یاد ہے میں نے آپ سے کہا تھا میں جاب ملنے کے بعد دو کام کروں گی۔" عکس نے مسکراتے ہوئے اسے کئی سال پہلے کی کہی ہوئی اپنی بات یاد

دلائی۔

''یہ پہلا کام تھا تمہارا جو تم کرنا چاہتی تھیں؟'' خیر دین ہنس دیا تھا۔

''ہاں یہی پہلا کام تھا۔'' وہ بھی مسکرائی۔

''اور دوسرا کام؟'' خیر دین نے اس سے پوچھا۔

''ابھی ہم پہلے کام کے بارے میں بات کر رہے ہیں نانا۔'' عکس نے خیر دین کو بات گھمانے نہیں دی۔

''دیکھو چڑیا میں اس عمر میں کورٹ کچہری کے دھکے نہیں کھانا چاہتا۔'' عکس نے خیر دین کی بات کاٹ دی۔

''آپ سے کس نے کہا آپ کو کورٹ کچہری کے دھکے کھانا پڑیں گے؟''

''ہمارے پاس اس زمین کا کوئی کاغذ تک نہیں ہے...... کوئی ثبوت کوئی گواہ نہیں ہم کیسے یہ ثابت کریں گے کہ وہ ہماری زمین ہے جو ہم سے چھینی گئی ہے۔'' خیر دین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کا خیال تھا چڑیا جذبات میں آ کر کچھ حقائق نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ چڑیا کبھی بھی جذباتی نہیں رہی تھی۔ اس پہلے کام کو کرنے سے پہلے وہ بہت سا ہوم ورک کر چکی تھی بہت سی سرنگیں لگا چکی تھی۔ اسے اس معاملے کے پیچیدہ پہلوؤں کا خیر دین سے زیادہ ادراک نہ ہوتا تو وہ جاب پر پوسٹ ہوتے ہی زمین کے اس ٹکڑے کی ملکیت کے لیے تگ و دو شروع کر دیتی لیکن اس نے یہ نہیں کیا تھا اس نے مناسب وقت کا بڑے تحمل کے ساتھ انتظار کیا تھا۔ اپنی پروموشن کا...... اپنے جونیئر سے سینئر آفیسر ہونے کا...... اپنے طاقتور ہونے کا...... اور وہ بالکل صحیح وقت پر صحیح جگہ سے وہ محاذ کھول رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے اندھادھند اس جنگ میں نہیں کود رہی تھی۔

''نانا آپ اس کی پرواہ مت کریں، ان چیزوں کو آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' عکس نے خیر دین کو بڑے اطمینان کے ساتھ تسلی دی تھی۔

''تم اپنا وقت بے مقصد کاموں میں ضائع مت کرو۔'' خیر دین نے اسے ڈانٹا تھا۔ وہ خیر دین کی ڈانٹ پر ہنس دی تھی۔

''نانا یہ بے مقصد کام کیسے ہے؟'' اس نے جواباً خیر دین سے پوچھا۔

''جس کام کا کوئی نتیجہ نکلنے کا امکان نہ ہو اس پر وقت ضائع کرنا بے مقصد ہی ہے چڑیا۔'' خیر دین بہت سنجیدہ ہو گیا...... ''تم اس طرح کا کوئی کام شروع کرو گی تو پورا خاندان ایک بار پھر سے ہمارا دشمن ہو جائے گا۔ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو......'' عکس نے خیر دین کی بات بڑے تحمل سے کاٹ دی۔

''نانا وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ وہ گیدڑ ہیں شیر نہیں۔ صرف اندھیرے میں نکل کر نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہمارا اندھیرا ختم ہو چکا ہے۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے خیر دین سے کہہ رہی تھی۔ ''اور آپ کو اگر یہ لگتا ہے کہ زمین لے لینے کے بعد وہ ہم سے میل جول ختم کر دیں گے تو نانا میں آپ کو یقین دلاتی ہوں وہ یہ بھی نہیں کریں گے۔ وہ آپ سے پہلے ہی کی طرح ملتے رہیں گے، آپ کو اگر زمین کی وجہ سے اپنوں کے ایک بار پھر سے چھوٹ جانے کا ڈر ہے تو مت ڈریں۔ وہ اب آپ کو چھوڑنا افورڈ نہیں کر سکتے۔'' خیر دین ایک بار پھر گنگ رہ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ اس کے لاشعور کی تہوں تک پہنچی ہوئی تھی وہ کچھ بھی پڑھ رہی تھی جو وہ اپنے آپ سے بھی چھپا رہا تھا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے عکس سے کہا۔

''میں اپنے خاندان والوں پر قانون کی آری نہیں چلاؤں گا۔ میں جانتا ہوں وہ کمزور ہیں۔ ہمارے

سامنے اب نہیں ٹھہر سکتے لیکن میں انہیں بھوکا ننگا نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''لیکن کیوں؟'' عکس نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ اپنی زمین جانتے بوجھتے انہیں دے دینا چاہتے ہیں؟''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ مجھے میری زمین مل سکتی ہے۔''

''میں نے آپ سے کہا ہے آپ اس بات کی فکر مت کریں۔ آپ کو آپ کی زمین مل جائے گی اور کسی طویل قانونی لڑائی کے بغیر ملے گی۔'' عکس نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''زمین مل بھی گئی تو بھی اب اس عمر میں، میں نے اس زمین کا کیا کرنا ہے...... نہ میں ہل چلا سکتا ہوں، نہ وہاں گھر بنا سکتا ہوں۔'' خیر دین اس سے آنکھیں ملائے بغیر کہہ رہا تھا۔ ''اور چڑیا اب میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ دکان ہے جس کی قیمت اب ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اپنا ذاتی ڈبل اسٹوری گھر ہے۔ گاڑی ہے، دکان سے ہر ماہ اتنی آمدنی ہوتی ہے کہ ایک مہینے کی آمدنی سے بھی میرا پورا سال گزر سکتا ہے۔ تمہارے پاس اتنی اچھی نوکری ہے، تم بھی اپنا کماتی اپنا کھاتی ہو...... تو ہمیں اس چیز کو کسی دوسرے سے چھیننے کی کیا ضرورت ہے جس سے کسی کے گھر کا چولہا جلتا ہو۔'' خیر دین کچھ رنج کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ ''اس زمین کے ٹکڑے سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بھی اتنی برکت نہیں ہوگی کہ وہ میرے بھائیوں، ان کی اولادوں اور ان کی اولادوں کی اولادوں کو پیٹ بھر کر کھلا سکے۔ وہ آج تک اسی پرانے خستہ حال گھر میں رہ رہے ہیں...... زمین کا وہ ٹکڑا ان کے پاس رہنے سے بھی ان کے پاس وہ برکت نہیں آسکتی جو اللہ نے ہمارے رزق میں دی ہے۔'' خیر دین بڑی سنجیدگی اور دلسوزی سے کہہ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا عکس اسے ٹوکے گی۔ عکس نے اسے نہیں ٹوکا تھا وہ بے حد خاموشی اور تحمل سے خیر دین کی بات سنتی رہی تھی۔ جب خیر دین خاموش ہوا تو اس نے اس سے کہا۔

''آپ بات ختم کر لیں پھر میں بات کروں گی۔''

''زندگی بہت قیمتی شے ہے چڑیا...... زندگی کا مقصد انتقام اور بدلہ بنانا اسے کوڑیوں کے بھاؤ بیچنا ہے۔''

عکس بے اختیار خیر دین کی بات پر مسکرا دی...... خیر دین نے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر اسے جو بات کہی تھی وہ اس کا مطلب اور اشارہ بخوبی جانتی تھی۔

اپنی کرسی پر آگے ہو کر اس نے خیر دین کے ہاتھ کو بڑی نرمی سے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ میں آپ کی تربیت کے بعد اپنی زندگی کو سازشوں اور انتقام لینے میں ضائع کر سکتی ہوں؟ کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنے دن رات ان چیزوں اور ماضی کے اس baggage کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارتی ہوں؟'' خیر دین نے کچھ اچنبھے سے اس کا چہرہ دیکھا پھر کہا۔

''نہیں میں کبھی ڈاکٹر عکس مراد علی سے یہ توقع نہیں کر سکتا۔'' وہ ہنس دی تھی۔ خیر دین اس کا اس طرح نام شاذ و نادر ہی لیتا تھا۔

''نانا انتقام لینے میں اور احسن طریقے سے اپنا حق لینے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ کو آپ کا وہ حق مل جائے جو بد دیانتی اور بد نیتی سے چھینا گیا اور میں جانتی ہوں میں آپ کو آپ کا حق دلوا سکتی ہوں۔

آپ گاؤں کے اتنے لوگوں کے سفارشی رقعے اور درخواستیں لے کر میرے پاس آتے ہیں اور مجھے ہر وقت یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا مجھ پر حق ہے اور میرا فرض ہے ان کی خدمت کرنا...... مجھ پر آپ کا بھی تو حق ہے۔'' خیر دین اس کی بات سنتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''رحم کرنا بہت اچھی بات ہے...... نیکی کرنا، سخاوت کرنا، رشتے داروں کا خیال رکھنا سب اچھا ہے لیکن جس طریقے سے آپ یہ کام کرنا چاہتے ہیں' وہ اچھا نہیں ہے۔'' وہ اب بہت سنجیدہ ہوگئی تھی۔ ''آپ اس گاؤں میں ایک بہت غلط اور خطرناک مثال قائم کر کے چھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس گاؤں میں خاندان والے جس کو کمزور اور نہتا پائیں اس کا حصہ چھین کر کھا جائیں کیونکہ وہ غریب ہیں اور آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس ناانصافی کی کبھی تلافی نہ کی جائے...... آپ غریب کو برائی کا لائسنس دینا چاہتے ہیں' سخاوت اور رحم کا نام دے کر...... اور آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔'' وہ بے حد سنجیدگی سے کہتی جا رہی تھی' خیر دین خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''میں سمجھتی ہوں ہمیں وہ زمین ضرور واپس لینی چاہیے' اس گاؤں کے لوگوں کے لیے یہ بہت بڑا سبق ہوگا۔ آپ اپنے بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کو بھوکا ننگا نہیں دیکھ سکتے ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں' ضرور کریں۔ زمین لینے کے بعد ان کی مالی مدد کر دیں کہ وہ کہیں اور زمین لے لیں یا ماہانہ کچھ رقم انہیں دے دیا کریں۔ ان کی مدد کریں لیکن ان کے ظلم اور زیادتی پر نیکی کی چادر نہ ڈالیں...... ہم خدا نہیں ہیں اور ہم انسانوں کے رازق بھی نہیں ہیں۔ ہم ان سے صرف وہ چیز لے رہے ہیں جو ہماری ہے...... انسانوں کو برائیاں کرتے ہوئے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اس کا بھی ایک اجر ہوتا ہے۔ اس کی بھی فصل کاٹنی پڑتی ہے۔ میں نہیں سمجھتی اس زمین کو واپس نہ لینا ایک اچھا فیصلہ ہے...... لیکن وہ آپ کی زمین ہے اور آپ جو فیصلہ کریں گے بہتر ہوگا۔'' خیر دین کے پاس لمبی خاموشی کے سوا بہت دیر تک کچھ نہیں بچا تھا۔ عکس بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن ایک مشکل کام کرنے کو کہہ رہی تھی۔

وہ بہت دیر ایسے ہی چپ بیٹھا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ بڑھاپا تھا جو اس کے حواس کو کمزور کر رہا تھا یا پھر عکس کی دلیل...... وہ خیر دین کو الجھانا جانتی تھی اور اس نے خیر دین کو الجھا دیا تھا۔ اس نے بالآخر ایک بار پھر عکس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ ایک وقت تھا جب وہ اس کی انگلی پکڑ کر چلتی تھی، خیر دین اسے رستہ دکھایا کرتا تھا اور اب خیر دین اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی رہنمائی میں چلنے لگا تھا۔

وہ دو دن کے بعد عکس کے ساتھ گاؤں گیا تھا اور وہاں جاتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہاں ساری تیاری پہلے ہی پوری تھی۔ عکس کا ایک بیچ میٹ اس ضلع میں ڈپٹی کمشنر کے طور پر فائز تھا اور وہ بہت سے احکامات پہلے ہی دے چکا تھا۔ وہ دونوں اس بار وہاں کے ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔

ان کے وہاں پہنچنے کے چند گھنٹوں میں ہی علاقے کا پٹواری اپنے بیج کھاتوں سمیت وہیں ریسٹ ہاؤس میں آگیا تھا۔ اس کے کھاتوں میں خیر دین کی زمین کا ریکارڈ بھی موجود تھا۔ عکس کے اسٹاف کا ایک شخص پہلے ہی اس شخص کو بھی وہاں لا چکا تھا جس سے خیر دین نے وہ زمین خریدی تھی اور وہ گواہ بھی وہیں موجود تھے جنہوں نے خیر دین کی ملکیتی زمین کے کاغذات پر دستخط کیے تھے۔

چند گھنٹوں کے اندر خیر دین کی زمین واپس اس کے نام منتقل ہو چکی تھی...... کوئی کاغذی ثبوت اپنے پاس نہ ہونے کے باوجود...... خیر دین ہکا بکا تھا۔ وہ ان کاغذات پر انگوٹھا لگاتے ہوئے بھی ایسے ہی بوکھلایا تھا۔

''یہ جعلسازی تو نہیں ہو رہی۔'' وہ بار بار عکس کے کانوں میں سرگوشی کرتا۔ ''اصلی کام ہے؟''

''جی نانا...... بالکل اصلی۔'' وہ ہر بار مسکرا مسکرا کے جواب دیتی۔

چند گھنٹوں بعد پٹواری اور تمام متعلقہ لوگوں کے جانے کے بعد بھی خیر دین عجیب اچنبھے کے عالم میں زمین کے وہ کاغذات دیکھتا رہا جو اسے خواب لگ رہے تھے۔ پتا نہیں اس نے ان کاغذات کو کتنی بار کھول کر پڑھا تھا۔ پھر اس نے عکس سے بڑی معصومیت سے کہا۔

''اب کل میں اس زمین پر جاؤں گا؟''

''نہیں نانا...... کل ہمیں کہیں اور جانا ہے۔'' عکس نے جواباً کہا۔

اور اگلی صبح وہ عکس کے ساتھ جہاں گیا تھا اس جگہ نے بھی اس کے بہت سارے زخم ہرے کر دیے تھے۔

وہ اپنی سرکاری گاڑی میں پولیس اسکورٹ کے ساتھ اسی پولیس اسٹیشن میں گئی تھی جہاں کئی سال پہلے خیر دین ایک صبح حوالات کے پیچھے اٹھوا کر پھنکوایا گیا تھا۔ متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او نے اپنے عملے کے ساتھ تھانے کے گیٹ پر ان کا استقبال کیا تھا۔ انہیں بڑی عزت و احترام سے لا کر ایس ایچ او کے آفس میں بٹھایا گیا تھا۔ ایس ایچ او مصر تھا کہ وہ اس کی کرسی پر تشریف رکھیں اور یہ پیش کش عکس نے شکریے کے ساتھ رد کر دی تھی۔ ایس ایچ او نے تھوڑی دیر بعد خیر دین کے تقریباً تمام بھائیوں اور بھتیجوں کو ہتھکڑیوں کے ساتھ پولیس اسٹیشن میں پیش کیا تھا۔ وہ خیر دین کی زمین پر ناجائز قبضے کے الزام میں دھرے گئے تھے۔ عکس مراد علی کی ایک دن پہلے درج کرائی گئی ایف آئی آر کے تحت جس کے بارے میں خیر دین کو علم نہیں تھا ورنہ وہ کبھی عکس کو ان لوگوں کے خلاف قانونی کارروائی نہ کرنے دیتا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ زمین کاغذات پر کسی کے نام ہو جانے سے اس کی ملکیت نہیں ہوتی۔ زمین اس کی ملکیت ہوتی ہے جس کے قبضے میں ہوتی ہے۔ عکس اس سسٹم کی موشگافیوں کو اپنے بوڑھے نانا سے زیادہ بہتر طریقے سے جانتی تھی لیکن خیر دین اپنے رشتے داروں کو وہاں پولیس اسٹیشن میں دیکھ کر شاکڈ تھا۔ ایس ایچ او اب ان لوگوں سے اسی طرح مخاطب تھا جس طرح کئی سال پہلے اس تھانے میں وہ پرانے ایس ایچ او نے خیر دین اور عکس سے بات کی تھی۔ ایس ایچ او نے خیر دین کے دو بھائیوں اور دو بھتیجوں کو یہ کہا تھا کہ وہ حوالات میں موجود اپنے تمام رشتے داروں سے مشورہ کرنے کے بعد یہ طے کرلیں کہ انہیں جعلسازی اور فراڈ کے مقدمات بھگتنے ہیں یا عزت سے زمین سے دستبردار ہو کر صلح صفائی کرنی ہے۔ وہاں موجود پٹواری نے اپنے کھاتوں میں سے زمین کے اصلی کاغذات ان لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ان کے پاس موجود رجسٹری کو جعلسازی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ انہوں نے ایک بھاری رقم دے کر زمین خیر دین سے خرید لی تھی۔ ایس ایچ او نے ان کے کاغذات پر موجود خیر دین کے انگوٹھے کے نشانات کو جعلی قرار دیا تھا کیونکہ وہ جعلی ہی تھے۔

پٹواری کے پاس زمین کے اس انتقال کا جو ریکارڈ تھا وہ بھی جعلی تھا کیونکہ خیر دین کے بھائیوں میں سے ایک خیر دین بن کر پٹواری کے پاس پیش ہو کر رشوت کے کچھ پیسوں کے عوض اس کی زبان بندی اور کاغذات میں مطلوبہ تبدیلی کروا آیا تھا لیکن اس تمام چکر بازی میں اس قدر جھول تھے کہ عکس جانتی تھی وہ اگر مقدمہ لڑتی تو وہ بھی چند پیشیوں میں جیت جاتی لیکن وہ مقدمے بازی میں نہ اپنے آپ کو الجھانا چاہتی تھی نہ خیر دین کو...... وہ

وہی کام کرنا چاہتی تھی جس کا نشانہ وہ اور خیر دین کئی سال پہلے بنے تھے۔

خیر دین کے ان دو بھائیوں اور بھتیجوں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بات چیت کے بعد بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ مقدمہ لڑیں گے، اس طرح آسانی سے اس زمین کو اپنے ہاتھوں سے جانے نہیں دیں گے جس پر ان کی بقا کا دارو مدار تھا۔ عکس کو ان سے یہی توقع تھی۔ وہ گاؤں دیہات کے ان پڑھ لوگ تھے جن کے لیے عزت کا ہر سرا زمین سے شروع ہو کر زمین پر ہی ختم ہوتا ہے۔ مقدمے، جھگڑے، مار کٹائی ان کے لیے نئی بات نہیں تھی، نہ ہی تھانہ کچہری کوئی نئی چیز...... عکس کے پاس پلان بی پہلے ہی تیار تھا۔ وہ اگر خیر دین کی زمین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے اور بات کو وہ کورٹ کچہری تک لے کر جانا چاہتے تھے تو پھر کورٹ کچہری میں فیصلہ صرف اس زمین کا نہیں ہوگا جو خیر دین کی ملکیت تھی بلکہ خیر دین خاندانی گھر اور اپنے باپ کی ملکیت زمین میں سے بھی اپنے حصے کے لیے مطالبہ کرے گا۔ خیر دین کے بھائیوں کے لیے یہ ایک بڑی پریشانی کی خبر تھی کیونکہ خیر دین نے اس سے پہلے کبھی بھی اپنے خاندانی گھر یا خاندانی زمین میں سے اپنے حصے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ قانونی طور پر وہ ابھی بھی اس جائداد میں حصے دار تھا اور یہ صرف ہمیشہ سے اپنے بھائیوں کے لیے احساسِ ترحم تھا جس نے خیر دین کو اپنے حصے پر دعویٰ سے روکے رکھا تھا۔ اس کے پاس اچھی سرکاری نوکری تھی اور وہ وہاں سے جو کھا کما رہا تھا وہ اس سے بہت زیادہ اور بہتر تھا جتنا اس کے بھائی گاؤں میں اپنی خاندانی زمین پر کاشت کاری کر کے کما رہے تھے۔ خاندانی گھر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس لمبے چوڑے احاطے میں بے ترتیبی سے بنائے گئے کچے پکے کمروں میں بہ مشکل اس کا خاندان سمایا ہوا تھا۔ وہ ان سے حصے کا مطالبہ کرتا تو یہ جیسے کسی کے جسم پر موجود کپڑوں میں سے کوئی کپڑا مانگنا تھا۔ اور خیر دین اپنے خونی رشتوں کو ننگا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ کبھی کبھار گاؤں آنے پر اسے چند دن کے لیے اس گھر میں خوش دلی سے رکھ لیا جاتا تھا اور یہ خوش دلی اس لیے بھی زیادہ تھی کیونکہ اس زمانے میں خیر دین کئی بار اپنے بھائیوں کو زبانی طور پر یقین دہانی کروا چکا تھا کہ اسے اپنے باپ کی جائداد میں سے اپنا حصہ نہیں چاہیے وہ اس سے دستبردار ہو جائے گا لیکن اب اچانک عکس کے منہ سے اس زمین اور گھر کا سن کر ان لوگوں کو جیسے غش پڑ گیا تھا۔ نہ صرف ان لوگوں کو بلکہ خیر دین بھی بے حد بھونچکا ہو کر عکس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

وہ ان کے سامنے ایک اور چال بچھا کر خیر دین کو ساتھ لیے وہاں سے اٹھ کر واپس ریسٹ ہاؤس آ گئی تھی ریسٹ ہاؤس پہنچتے ہی خیر دین نے عکس سے وہی کہا جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔

''کیا ضرورت تھی اس سب کی؟ میں نے منع بھی کیا تھا تمہیں۔'' خیر دین اب بہت خفا تھا۔ ''اتنا پڑھا لکھا کر اب میں تمہیں تھانے کچہریوں کے دھکے کھلواؤں گا۔''

''نانا تھانے کچہری میں آتی جاتی رہتی ہوں میری جاب کا حصہ ہے یہ بھی۔'' عکس نے اطمینان سے اسے کہا۔ وہ جانتی تھی خیر دین کو پریشان کرنے والی یہ بات نہیں تھی وہ اگر پریشان ہو رہا تھا تو اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو حوالات میں اس حال میں دیکھ کر ہو رہا تھا۔

''اتنی عزت کرتے تھے گاؤں میں خاندان میں سب تمہاری اور تم نے بیٹھے بٹھائے سب کچھ ڈبو دیا۔'' وہ بے حد بے چین تھا۔

''نانا مجھے اس تختی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے جو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر گاؤں میں شو آف کے

لیے لگائی ہے۔ میں ایک تختی کی خاطر کسی کو اپنا تختہ کرنے نہیں دوں گی اور آپ بھی اس خوش فہمی سے باہر آ جائیں کہ وہ ہماری بہت عزت کرنے لگے ہیں۔ وہ ہم سے مرعوب ہیں اور ہماری عزت کرنے پر مجبور ہیں ان کے پاس کوئی دوسرا آپشن ہے کیا؟'' عکس اب خیر دین کے ساتھ بہت صاف گوئی کا مظاہرہ کر رہی تھی' اس صاف گوئی کا جو اس کے پروفیشنل کیریئر کا حصہ تھا۔

''ہمارے ساتھ ملنا اچھے تعلقات رکھنا ان کی ضرورت اور مجبوری ہے ہماری نہیں...... ہم نہ اب یہاں رہتے ہیں نہ کل رہیں گے...... نہ ہی ہمارا یہاں کوئی میل جول ہے...... نہ ہم ان پر کسی بھی اعتبار سے ڈیپنڈنٹ...... یہ سارے مسائل اور مجبوریاں ان کی ہیں تو پھر ہم ان کو اپنا استعمال کیوں کرنے دیں۔ وہ اگر دل سے ہماری عزت کرتے تو اس زمین کو خود ہی معذرت کر کے آپ کو واپس کر دیتے...... لیکن وہ معذرت نہیں کریں گے، شرمندہ نہیں ہوں گے، زمین واپس نہیں کریں گے لیکن بڑی ڈھٹائی اور دھڑلے سے میرا نام استعمال کرنے کے لیے اپنے گھر کے دروازے پر لگا لیں گے اور آپ کے پاس شہر میں سیر و تفریح کرنے کے لیے آتے رہیں گے، آپ کو چھوٹے بڑے کاموں کے لیے سفارشیں اور درخواستیں بھی دیتے رہیں گے... نانا اچھائی کرنی چاہیے لیکن دوسروں کے ہاتھوں exploit نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ بہت دوٹوک انداز میں کہہ رہی تھی۔ خیر دین کے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا...... وہ جواب دینا بھی چاہتا تو بھی نہیں دے سکتا تھا...... جواب ڈھونڈنا بھی چاہتا تو نہیں ڈھونڈ سکتا تھا...... چڑیا اسے جو دکھا رہی تھی وہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا...... خونی رشتوں کے لالچ، خود غرضی اور سفاکی سے وہ جان بوجھ کر آنکھیں موند لینا چاہتا تھا لیکن یہ کام چڑیا نہیں کرنے دے رہی تھی۔ وہ تختی جس پر خیر دین ناراض تھا وہ چڑیا کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتی...... سوائے exploitation کے ایک حربے کے۔

خیر دین کو جنریشن گیپ کے لفظ کا مطلب اب سمجھ میں آیا تھا۔ چڑیا بہت سی باتوں پر وہ نہیں سوچتی جو وہ سوچتا تھا' یہ وہ ہمیشہ سے جانتا تھا لیکن چڑیا اس کے بہت سے فیصلوں کو غلط اور احمقانہ سمجھتی تھی' یہ وہ پہلی بار جان رہا تھا...... تکلیف دہ تھا یہ احساس...... ساری عمر عقل کی گتی دینے والے کو اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اس کے علم میں نقص ہے تو اس پر جو گزرے گی وہ خیر دین پر بھی گزر رہی تھی۔ چڑیا نافرمانی نہیں کر رہی تھی نہ ہی کوئی زبردستی کرتے ہوئے اس پر اپنا فیصلہ مسلط کر رہی تھی لیکن وہ خیر دین کو خوش فہمیوں کے خوش نما باغ میں بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ اسے بڑی تمیز اور تہذیب سے وہ حقائق بتا اور دکھا رہی تھی جو خیر دین نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

''میں اس عمر میں کوئی دشمنی نہیں چاہتا۔'' خیر دین نے بالآخر لمبی خاموشی کے بعد بے حد کمزور لہجے میں ایک بہت ہی بودی تاویل پیش کی۔

''نانا دوستوں کے بھیس میں دشمنوں کو پالنے سے کھلے دشمن بہتر ہوتے ہیں۔'' خیر دین اس کی بات پر ہنس دیا تھا۔ وہ بالکل اسی کی طرح نصیحتیں کرنے لگی تھی اسے...... اور اس کی نصیحتیں اس کے دل پر بھی لگتی تھیں۔

''مجھے اچھا نہیں لگا اپنے بھائیوں اور ان کے بیٹوں کو اس طرح ہتھکڑیوں میں حوالات میں دیکھ کر...... جو بھی ہے وہ اپنا خاندان ہے اپنے خاندان کو انسان ذلیل نہیں کر سکتا۔'' خیر دین نے بالآخر چڑیا کے سامنے اپنا dilemma رکھ دیا۔

''میں جانتی ہوں نانا اور مجھے بھی یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن اس کے سوا اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ وہ سب حوالات میں ضرور ہیں لیکن آپ اطمینان رکھیں ان پر کسی قسم کا کوئی تشدد نہیں ہوگا...... اس طرح کا ذہنی اور جسمانی تشدد جو انہوں نے آپ پر کروایا تھا اور نہ ہی ان کے خاندان کی کسی عورت کو تھانے ... بلوایا گیا ہے جیسے مجھے بلوایا گیا تھا۔'' وہ تلخ ہونا نہیں چاہتی تھی کیونکہ تلخی انسان کو جذباتی کر کے منتقم المزاج بناتی ہے، بہت سے غلط فیصلے کرواتی ہے، بہت سی زیادتیاں بھی کروا دیتی ہے لیکن خیر دین کو قائل کرنے کے لیے دی جانے والی ہر مثال اس کے دل کو عجیب سے رنج سے بھر رہی تھی اور خیر دین چڑیا کی مثالوں میں چھپی تلخی اور تکلیف سے واقف تھا۔

''میں صرف ایک چیز چاہتی ہوں نانا اور وہ یہ کہ کم از کم اس گاؤں میں دوبارہ کبھی کوئی کسی کو بے بس دیکھ کر اس کے ساتھ وہ نہ کرے جو ہمارے ساتھ کیا گیا اور میں آپ کو ایک بات بتاؤں...... اس زمین کو واپس لینے کے بعد آپ کا خاندان اور یہ گاؤں آپ کی زیادہ عزت کرے گا کیونکہ آپ نے اپنا حق قانونی طریقے سے لیا اسے بے بس اور مجبور ہو کر چھوڑ نہیں دیا۔'' خیر دین نے ایک بار پھر چڑیا کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ اس کی دلیلیں اب اسے تو اتر سے لاجواب کرنے لگی تھیں۔

رات تک ایس ایچ او دوسری پارٹی کی طرف سے راضی نامہ لے کر آ گیا تھا۔ اس کے خاندان پر مزید کیا دباؤ ڈالا گیا تھا خیر دین نہیں جانتا تھا نہ عکس نے اسے بتایا تھا لیکن اگلے دن اس زمین سے اس کے خاندان کا قبضہ ختم ہو گیا تھا۔ پولیس کی نگرانی میں اس زمین کی حد بندی کروا کر اسے اسی علاقے کے ایک دوسرے زمیندار کو ٹھیکے پر دے دیا گیا تھا۔ اور یہ سب پورے گاؤں والوں کی نظروں اور چہ میگوئیوں کے درمیان دن دہاڑے کیا گیا تھا۔ خیر دین بڑے سالوں بعد اس زمین پر کھڑا ہوا اس کی حد بندی دیکھتا رہا تھا...... اسے فخر ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا تھا...... اس کے دل پہ ایک عجیب سا بوجھ پڑ گیا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس زمین کے اس طرح اچانک ہاتھ سے نکل جانے پر اس کے خاندان کے کیا تاثرات اور احساسات ہوں گے...... کبھی وہ ایسی ہی کیفیات سے گزرا تھا...... اس کی اذیت ان سے اس لیے زیادہ تھی کیونکہ وہ اپنی چیز سے ناحق بے دخل کیا گیا تھا...... لیکن تکلیف اس کے بھائیوں کو بھی بہت زیادہ ہوئی تھی یوں جیسے میلا دیکھنے بھری جیب کے ساتھ کوئی جائے اور میلا دیکھنے سے پہلے ہی جیب کٹ جائے۔

راضی نامہ ایس ایچ او کے پولیس اسٹیشن پر اس کی نگرانی کے بجائے متعلقہ ڈی پی او آفس میں ڈی پی او کی نگرانی میں سائن ہوا تھا اور اس کے بعد خیر دین کے خاندان والوں کو بالآخر رہائی مل گئی تھی۔ عکس بھی خیر دین کو لیے اسی دن وہاں سے واپس لوٹ آئی تھی۔

اگلے کئی دن خیر دین اس زمین کا دوبارہ مالک بن جانے کے باوجود بھی ایک عجیب سے ملال میں رہا۔ گاؤں سے واپس آ جانے کے بعد کئی ہفتے اس کے خاندان میں سے کسی نے اس کے ساتھ پہلے کی طرح گپ شپ لگانے کے لیے فون پر رابطہ نہیں کیا تھا، نہ ہی کسی نے شہر آ کر اس سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ خیر دین عکس سے بار بار اس بات کی شکایت کرتا رہا اور وہ بڑے اطمینان سے ہر شکایت پر اس سے کہتی رہی۔ ''نانا وہ آئیں گے...... آپ دیکھ لیجیے گا۔'' اور اس کی یہ بات بالکل ٹھیک ثابت ہوئی تھی۔ اس واقعے کے پورے ایک مہینے کے بعد گاؤں سے اس کے بھائی نے اسے پہلی کال کی تھی۔ خیر دین کا خیال تھا کہ وہ اس سے لمبے گلے شکوے کریں گے اس واقعے کے حوالے سے لیکن خلافِ توقع ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے پھر انہوں نے اسے اپنی ایک پوتی کی شادی میں دعوت دی تھی اور جب خیر دین نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی تھی تو انہوں نے ساتھ ہی اس بچی کی شادی کی تیاریوں کے لیے کچھ رقم بھی مانگ لی۔ خیر دین کو اس پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا، اس نے بڑی خوشی خوشی اپنے بھائی سے اس کی پوتی کی شادی کے لیے رقم بھیجنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اپنے بھائی سے فون پہ بات ختم کرتے ہی خیر دین نے بڑے جوش و خروش کے عالم میں عکس کو فون کیا تھا۔

''تم بالکل ٹھیک کہتی تھیں چڑیا، وہ واقعی اب ہمیں نہیں چھوڑ سکتے۔'' خیر دین نے ساری تفصیلات چڑیا کو بتانے کے بعد جیسے اس کے Judgement پر اسے داد دی لیکن تمام تفصیلات میں سے اس نے اپنے بھائی کو دیا جانے والا رقم کا وعدہ چھپا لیا تھا۔

''نانا انہوں نے آپ سے شادی کے لیے کتنی رقم کا مطالبہ کیا ہے اور آپ نے کتنی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے؟'' عکس نے خیر دین کی داد پر فخر محسوس کرنے کے بجائے بڑے اطمینان کے عالم میں اپنی اسی میٹھی اور ملائم آواز میں اگلوانے والے انداز میں خیر دین سے پوچھا۔ خیر دین جواباً ہنسنے لگا۔

''چڑیا تم اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہو۔'' خیر دین کی بات پر وہ ہنس دی۔

''چڑیا کے نہیں نانا صرف کوؤں کے۔'' اس نے جواباً خیر دین کو کہا تھا لیکن خیر دین سے یہ جاننے پر اصرار نہیں کیا تھا کہ وہ اس شادی میں کیا Contribute کرنا چاہتا تھا۔ خیر دین کے خاندان سے زمین چھین لینے کے باوجود وہ اس خاندان کے مسائل سے واقف تھی۔ مالی طور پر وہ بہت کمزور سماجی حیثیت رکھتے تھے اور پہلے خیر دین اور اب عکس کا نام وہ واحد سہارا تھا جو ان کی عزتِ نفس اور ساکھ کو سنبھالے ہوئے تھا اور وہ گاؤں کے کمی کمین نہیں کہلاتے تھے۔ عکس کو اندازہ تھا کہ خیر دین کی مالی معاونت کے بغیر وہ عزت سے اپنی کسی بچی کو نہیں بیاہ سکتے تھے اور اسے اس مالی امداد پر اعتراض نہیں تھا۔

خیر دین گاؤں میں شادی میں شرکت کرنے کچھ جھجکتا ہوا پہنچا تھا لیکن اسے وہاں یہ دیکھ کر عجیب حیرت ہوئی تھی کہ گاؤں اور خاندان میں اس کا استقبال پہلے سے بھی زیادہ گرم جوشی اور مرعوبیت سے کیا گیا تھا۔ اسے عکس کی بات یاد آئی، اس نے کہا تھا۔ ''نانا اپنا حق لینے کے قابل ہونے کے بعد گاؤں میں آپ کا زیادہ احترام

ہوگا۔‘‘ اس نے شادی میں شرکت کرنے کے بعد واپس شہر جا کر عکس کو یہ بات بتائی تھی۔

’’تم ٹھیک کہتی تھیں چڑیا......‘‘ خیر دین نے اس جملے سے اپنی بات کا آغاز کیا اور تب اچانک اسے احساس ہوا کہ اب وہ اکثر عکس سے اپنی بات چیت کا آغاز اسی اعترافی جملے سے کرنے لگا تھا...... وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

’’نانا آپ کچھ کہہ رہے تھے؟‘‘ عکس نے اسے بات شروع کر کے پھر خاموش ہوتے دیکھ کر پوچھا۔ خیر دین نے بے پناہ شفقت سے خود پر جمی ان گہری چمکتی آنکھوں کو دیکھا...... اپنی چڑیا کی آنکھوں کو...... پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

’’تم ٹھیک کہتی تھیں چڑیا اپنا حق لینے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور اپنا حق لینا کوئی جرم نہیں ہے۔‘‘ عکس خیر دین کی بات پر مسکرا دی۔

’’یہ میں نہیں کہتی تھی نانا...... یہ ساری عمر آپ کہتے رہے۔‘‘ اس نے جیسے خیر دین کو یاد دلایا۔ وہ ہولے سے ہنسا تھا۔ عکس نے خیر دین کا ہاتھ بڑی نرمی سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ’’نانا میں اپنی authority کا استعمال بے مقصد انتقام لینے کے لیے کبھی نہیں کروں گی لیکن میں جس چیز کو اپنا حق سمجھتی ہوں اسے حاصل کرنے کے لیے میں سب کچھ کروں گی۔‘‘

خیر دین کو اندازہ نہیں ہوا وہ اسے اپنے اگلے کام کے لیے انفارم کر رہی تھی۔ اس نے سر جھکا کر عکس کے اس ہاتھ کو دیکھا جس میں اس نے خیر دین کے ہاتھ کو لیا ہوا تھا۔ مخروطی انگلیوں والا بہت نرم ہاتھ جو کبھی بہت چھوٹا سا تھا اور خیر دین نے اسے قلم تھما کر اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اسے لکھنا سکھایا تھا...... ٹیڑھی میڑھی لکیریں...... آڑے ترچھے حرف...... ٹوٹے پھوٹے لفظ...... اور پھر اپنا نام...... عکس مراد علی...... اور اب جب وہ ہاتھ کاغذ پر اپنا نام لکھا کرتا تھا تو وہ حکومتی فرمان ہوتا تھا...... اس ہاتھ میں بہت طاقت تھی اور اس قلم میں اس سے زیادہ...... جس سے وہ اپنے علم سے دنیا کو متعارف اور متاثر کیا کرتی تھی...... وہ اس ننھی سی بچی کے ہاتھ میں قلم کے بجائے جھاڑو پکڑانے پر اصرار کرتا تو وہ بھی وہی ہوتی اور وہی بنتی جو اس کے گاؤں اور خاندان کی ساری لڑکیاں بنی تھیں...... بے شناخت وجود...... جن کے پاس انگوٹھا ہوتا تھا دستخط نہیں......

بے شک تعلیم نصیب بدل دیتی ہے اور راستے بھی...... زندگی کا بدل جانا تو پھر مقدر ہو جاتا ہے۔ خیر دین نے نم آنکھوں کے ساتھ اس ہاتھ کو چوما جسے ایک ننھی بھنچی ہوئی مٹھی سے آسمان تک پھیلے ہوئے پنجے تک اس نے اپنے خون سے سینچا تھا۔

☆☆☆

ایک شیر دل کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں اس کا ہاتھ برف کا ہو گیا ہوگا...... چند لمحوں کے لیے اسے ایسا ہی لگا تھا...... اگر وہ ہاتھ برف کا نہیں ہوا تھا تو پھر وہ خود ضرور کچھ دیر کے لیے فریز ہوئی تھی...... وہ اس کا سانس...... اس کے دل کی دھڑکن...... کائنات کی گردش اور آس پاس کا شور...... آوازیں...... سب کچھ سب ہی کچھ...... چند سیکنڈز...... چند منٹ...... وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر وہ پگھلی...... پہلی آواز شاید دل کی تھی...... دوسری سانس کی...... پھر سب کچھ ایک جھٹکے سے چلنے لگا تھا...... بالکل پہلے کی طرح...... جاتی ہوئی سانس اور اوسان ایک ہی وقت میں لوٹے تھے......

عکس نے اسی نرمی اور سہولت سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال لیا تھا جس طرح اس نے اس کا ہاتھ

پکڑا تھا پھر اس نے نظریں چرائی تھیں۔ اس نے اور ایک شیر دل نے ایک ساتھ...... پھر وہ دونوں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے اب وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے ایک دوسرے کے بالمقابل نہیں تھے صرف ساتھ بیٹھے ہوئے تھے...... قریب، برابر لیکن اجنبی......

’’تو چڑیا اسے یاد ہے۔‘‘ عکس نے سوچا تھا اور درد کی عجیب سی لہر اٹھی تھی۔ یہ خالی نام تھوڑی تھا جو اس کی یادداشت میں ابھرا ہوگا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی، کچھ بھی نہیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا نوٹس اتنی جلدی شیر دل کی فیملی تک پہنچ گیا ہوگا اس کا خیال تھا ابھی ایک دو دن اور لگیں گے تب تک شیر دل سنگاپور پہنچ چکا ہوگا جو کچھ ہوگا اس کے بعد ہوگا، اندازے کی ایک معمولی سی غلطی ہو گئی تھی۔

اس کے برابر یوں بیٹھے ہوئے اس نے سوچا آخری بار وہ کب اس طرح مجرمانہ سی حالت میں یوں برابر خاموش بیٹھے رہے تھے...... اسے یاد آ گیا۔ جب ایک اپنی ممی کے کہنے پر اس کے ساتھ کھیلنا چھوڑنے پر نادم ہو کر اس کے پاس واپس آیا تھا اور وہ اس کے اصرار پر اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس دن بھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے تھے...... ایک ریکٹ کی string کو نادم انداز میں ٹھیک کرتا رہا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس سے کیا کہے لیکن اس کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ خاموشی اور تحمل سے...... کسی بات کے آغاز کا انتظار کرتے کرتے......

’’تم نے کبھی چیری کھائی ہے؟‘‘ تب بہت دیر بعد ایک نے گفتگو کا آغاز اسی طرح کیا تھا۔

’’ہاں۔‘‘ چڑیا نے تحمل سے جواب دیا تھا۔ ایک بچے کے طور پر بھی اسے احساس تھا وہ بے تکا سوال تھا اور اس کا آم کے سیزن میں کرنے کا کوئی مقصد نہیں تھا جب ایک ہر روز آم کھانے بیٹھا ہوتا تھا۔

’’کبھی اسٹرابری کھائی ہے؟‘‘ اگلا سوال بھی ویسا ہی بے تکا تھا۔

’’ہاں۔‘‘ چڑیا نے ایک بار پھر وہی تحمل دکھایا تھا۔

’’بلیو بیری کھائی ہے؟‘‘ ایک اور سوال۔

’’نہیں، اس بار چڑیا نے کہا تھا۔

’’وہ بہت مزے کی ہوتی ہے۔‘‘ اس بار جواب آیا تھا۔ چڑیا اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ایک کو اس کی نظروں سے جیسے مزید شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ٹینس ریکٹ کی string ٹھیک کرنی شروع کر دی

تھی۔ آج بھی ویسی ہی مشکل آن پڑی تھی' اس خاموشی کو توڑنے میں۔

فلائٹ اناؤنس ہونے لگی تھی۔ ان دونوں نے بیک وقت اپنے باقی ساتھیوں کو دیکھا..... ان میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ان کے درمیان چند منٹ پہلے کیا ہوا تھا شاید کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ کوئی دیکھ بھی لیتا تو شیر دل کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ سب اپنے اپنے بیگز اٹھاتے ہوئے بورڈنگ پاس ہاتھ میں لیے جہاز میں سوار ہونے کے لیے اٹھ رہے تھے...... وہ اور شیر دل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر۔

جہاز میں ان کی سیٹس ساتھ نہیں تھیں اور یہ عجیب طمانیت بخش شے تھی جیسے ان دونوں کے لیے...... وہ ساتھ بیٹھ کر اتنا لمبا سفر خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے ٹوٹ جانے کے بغیر کیسے طے کرتے۔ وہ دونوں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

کراچی ائرپورٹ پر ایک بار پھر وہ جیسے میکانیکی انداز میں ایک دوسرے کے پاس آ کر بیٹھے تھے اور پھر سنگاپور کی فلائٹ پکڑنے تک اسی طرح بیٹھے رہے تھے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے...... ان میں سے کسی کے پاس آ جانے پر اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے...... لیکن آپس میں بالکل خاموش......

سنگاپور کے لی کوان یو انسٹیٹیوٹ آف پبلک پالیسی میں پہلے دو دن بھی انہوں نے اسی خاموشی میں گزارے تھے۔ تیسری شام کو شیر دل اور وہ بالآخر شام کو اس عمارت کے لان میں جا کر بیٹھ گئے تھے جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔

''تم ہمیشہ سے جانتی تھیں' میں کون تھا؟'' شیر دل نے کسی سیاق و سباق کے بغیر اسی طرح ایک بے تکے سوال سے گفتگو کا آغاز کیا تھا جس طرح تب چیری والا سوال کیا تھا۔

''ہاں۔'' عکس نے آج بھی اسی تحمل کے ساتھ وہی ایک لفظی جواب دیا تھا۔ اس کے برابر میں بینچ پر بیٹھے شیر دل نے اسے دیکھنے کی کوشش کیے بغیر اس فوارے کے گرتے ہوئے پانی پر نظریں جمائے رکھتے ہوئے سر ہلایا جس سے کچھ فاصلے پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں جیسے اپنے اندازے کے ٹھیک ہونے کا یقین تھا اسے۔

''میرے نام سے پہچانا تم نے...... یا میرے چہرے سے؟'' اب اسٹرابری والا سوال آیا تھا۔

''دونوں سے۔''

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' اس بار بالآخر بلیو بیری والا سوال آ گیا تھا۔

''کیا بتاتی تمہیں...... کہ میں کون ہوں۔'' اس بار عکس نے اس سے کہا تھا۔ ایک بار پھر ایک عجیب سی خاموشی ان کے درمیان آ گئی۔

شیر دل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے...... تمہید باندھے تو تمہید کے بعد کیا کہے...... بعض دفعہ انسان گونگا نہیں ہوتا لفظ گونگے ہو جاتے ہیں' اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا...... معذرت کرتا تو کیسے اور کس بات کی۔ نہ کرتا تو...... وہ اپنی ممی سے ملنے کے بعد سے جیسے اپنی راتوں کی نیند کھو بیٹھا تھا...... شاک 26 سال پہلے بھی لگا تھا اس رات اسے لیکن عکس کے تعارف نے جو شاک اب دیا تھا اس کی شدت بھی ویسی ہی تھی...... اس رات کے واقعات کئی بار اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے' اس کے ذہن کی اسکرین پر چلتے رہے تھے' وہ عینی شاہد تھا اس واقعے کا لیکن اب عکس کے سامنے بیٹھے ہوئے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ عینی شاہد بن کر بات کرے یا پھر ہر چیز سے لاعلمی اور بے خبری کا ڈھونگ کرے...... دوسرا آپشن زیادہ مناسب تھا۔ زیادہ suit کرتا تھا اسے اور وہ دوسرے آپشن ہی کا انتخاب کرتا اگر وہ عکس مراد علی نہ ہوتی اور اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ اسے ریلنگ کے پاس کھڑا

ہوا چیختا ہوا ایک بھولا نہیں ہوتا۔
''جو کچھ ہوا نہیں ہونا چاہیے تھا......'' بہت دیر کے بعد شیر دل نے بالآخر بات شروع کرنے کے لیے کچھ لولے لنگڑے لفظ ڈھونڈ لیے تھے۔ عکس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے لفظ مبہم تھے۔
''جو کچھ میں نے کیا وہ؟'' اس نے شیر دل کی بات کاٹ کر اس سے پوچھا.... اس بار شیر دل نے اسے دیکھا۔
''نہیں...... جو کچھ اس رات ہوا......'' وہ بات مکمل کرتے کرتے بھی مکمل نہیں کر سکا۔
عکس نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سننا چاہتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس میں شیر دل کا قصور نہیں تھا وہ اسے کسی لحاظ سے جواب دہ نہیں سمجھتی تھی لیکن پھر بھی سننا چاہتی تھی وہ کیا کہنا چاہتا تھا اس فیملی کے فرد ہونے کے حوالے سے۔
''اور تم یہ بھی جانتی تھیں کہ شہر بانو انکل شہباز ہی کی بیٹی ہے؟'' شیر دل نے وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس سے اگلا سوال کیا تھا۔ اس بار وہ اسے دیکھ رہا تھا۔
''ہاں۔'' عکس نے بھی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ شیر دل کے چہرے پر بے حد عجیب سا تاثر آیا تھا۔ عکس کو اس تاثر کی توقع تھی اس نے شیر دل کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور سیدھا دیکھنے لگی۔ شیر دل نے اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ وہ اس عورت کو کبھی سمجھ نہیں پایا تھا تب جب وہ اس سے نو سالہ ایک بچے کے طور پر پہلی بار ملا تھا نہ اتنے سالوں میں جب وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے اور نہ آج...... وہ نہ چڑیا کو سمجھ پایا تھا نہ عکس مراد علی کو...... اس نے ایک بار پھر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔
''تم کچھ کہہ رہے تھے؟'' عکس نے یک دم اسے یاد دلایا۔ شیر دل جان گیا تھا وہ کیا سننا چاہتی تھی اور وہی موضوع سب سے مشکل تھا۔ وہ دونوں ایک closure چاہتے تھے اور closure نہیں ہو پا رہا تھا۔
''تم یہ سب مت کرو۔'' وہ جو اس سے سننے کی توقع رکھتی تھی اس نے وہ نہیں کہا.... اور جو کہا تھا عکس کو اس سے عجیب مایوسی ہوئی تھی۔
''شیر دل تم اس معاملے میں مت آؤ...... یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔'' عکس نے جواباً بڑے مستحکم لہجے میں اس سے کہا....
''عکس یہ میری فیملی کا معاملہ ہے، میں اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ تم جس آدمی کو نشانہ بنا رہی ہو وہ میرا انکل ہے میری بیوی کا باپ ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ میں اس معاملے میں نہ آؤں کیونکہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے...... تم واقعی سمجھتی ہو کہ میں اس معاملے سے خود کو الگ تھلگ رکھ سکتا ہوں؟'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے کہا۔
''تم چاہو تو اپنے آپ کو الگ رکھ سکتے ہو......''
''نہیں رکھ سکتا...... میرے خاندان کی عزت کی بات ہے یہ۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ عکس بے اختیار ہنس دی۔ شیر دل الجھا۔
''میں یہی سننا چاہتی تھی تمہاری زبان سے...... یہ تمہارے خاندان کی عزت کا سوال ہے اسی لیے تم غلطی پر ہوتے ہوئے بھی آخری حد تک جاؤ گے مجھے اس کیس سے روکنے کے لیے۔ تم سمجھتے ہو عزت صرف تمہارے

خاندان کی ہوتی ہے اور اس کی حفاظت کرنا صرف تمہارا حق ہے؟'' وہ بڑی سرد مہری سے کہہ رہی تھی۔ شیر دل نے کچھ الجھ کر اس کی بات کاٹی۔

''میں نے ایسا نہیں کہا عکس......''

''تمہاری بات کا یہی مطلب نکلتا ہے۔''

''غلط مطلب نکال رہی ہو تم۔''

''پھر تو سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ میں بھی جو کچھ کر رہی ہوں اپنے نانا کی عزت کے لیے کر رہی ہوں۔ مجھے بھی ان کی عزت اتنی ہی پیاری ہے جتنی تمہیں اپنے انکل کی۔'' شیر دل چند لمحوں کے لیے اس کی بات پر کچھ بول نہیں پایا پھر اس نے جیسے کچھ خفا ہو کر کہا۔

''تم غلط comparison کر رہی ہو عکس۔''

''ہو سکتا ہے۔''

''انکل شہباز مر چکے ہیں...... تمہیں اندازہ نہیں ہے انہوں نے کتنا suffer کیا ہے...... تم انہیں معاف کیوں نہیں کر رہیں۔'' وہ عجیب اکھڑے انداز میں بولا تھا۔ وہ انکل شہباز کی وکالت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اسے احساس ہوا وہ وکالت ہی کرتا لگا تھا۔ عکس کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔

''شیر دل میں نے تم سے شادی کیوں نہیں کی تم جانتے ہو؟'' اس نے عجیب رنجیدگی سے اس سے کہا۔ وہ یہ نہ بھی کہتی تو بھی شیر دل کو اس سوال کا جواب اسی دن مل گیا تھا جس دن خیر دین کی برطرفی کے خلاف اور اس کی پنشن اور دوسرے واجبات کے لیے فائل کیے گئے کیس میں اس نے عکس مراد علی کا نام دیکھا تھا۔

''ہاں جانتا ہوں۔'' شیر دل نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''شہباز حسین وجہ نہیں ہے اس کی۔'' عکس جیسے اس کا ذہن پڑھ رہی تھی۔ ''یہ کلاس ڈفرنس وجہ ہے اس کی جو بار بار تمہاری باتوں میں جھلکتا رہا ہے۔'' شیر دل نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تمہارے لیے تمہاری تکلیف بڑی ہے دوسروں کی چھوٹی۔'' شیر دل نے اسے بات کرتے کرتے ٹوک دیا۔

''میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔''

''ہاں تم نے کبھی نہیں کہا لیکن تم نے ہمیشہ جتایا...... کبھی شعوری طور پر کبھی لاشعوری طور پر...... جیسے ابھی تم سمجھتے ہو تمہارے انکل نے بہت suffer کیا ہے...... خیر دین نے نہیں جس کو صفائی کا موقع دیے بغیر چوری کے الزام میں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ پنشن اور ہر طرح کے واجبات سے محروم کر دیا گیا...... اس نے کوئی تکلیف نہیں کاٹی ہو گی۔'' وہ بے حد خفگی سے بول رہی تھی۔

''تم نے......'' شیر دل نے کچھ کہنا چاہا۔ عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں شیر دل، تم پہلے میری بات سنو، تم مجھ پر یہ جتانا چاہتے ہو کہ خیر دین کی تکلیف شہباز حسین کی تکلیف سے اس لیے کم ہے کیونکہ شہباز حسین کا گھر ٹوٹ گیا۔ بیوی بچی چھوڑ کر چلی گئیں اور وہ مر گیا تو اس لیے اس نے خیر دین سے زیادہ suffer کیا۔''

''نہیں، میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انکل شہباز نے جو غلط کام کیا انہیں اس کی سزا مل گئی اور اس سے بہت زیادہ ملی جتنی کورٹ انہیں دے سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے ہر اس رشتے کو کھو دیا جس سے وہ پیار کرتے

تھے...... آنٹی شرمین، شہر بانو...... میں...... ممی...... تمہیں اندازہ نہیں ہے انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سال کس طرح گزارے تھے...... اور تم جانتی ہو انہوں نے خودکشی کی تھی۔'' وہ بول رہا تھا وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

''مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔'' شیر دل کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا۔

''میں تمہاری فیلنگز سمجھ سکتا ہوں اس لیے مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی تمہاری اس بات سے۔'' شیر دل نے مدھم آواز میں کہا۔

''شیر دل تم کبھی میری فیلنگز نہیں سمجھ سکتے...... اگر سمجھ سکتے تو شہباز حسین کے دفاع میں اتنا لمبا...... argument نہ کرتے۔'' عکس نے خفگی سے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ ''لیکن میں تمہیں blame نہیں کروں گی...... وہ تمہارے انکل ہیں، تم انہی کی سائڈ لو گے...... اور ٹھیک بھی ہے۔ تمہیں ان کو defend کرنا بھی چاہیے۔'' عکس کا لہجہ مدھم ہو گیا تھا۔

''تم سمجھتی ہو میں اگر تمہارے ساتھ نہیں ہوں تو تمہارے خلاف ہوں۔'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تمہیں بھی نقصان سے بچانا چاہتا ہوں۔''

''کیسا نقصان؟'' عکس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

''تم سمجھتی ہو میری فیملی اتنی آسانی سے تمہیں یہ کیس جیتنے دے گی اور تمہیں واقعی لگتا ہے کہ تم یہ کیس جیت جاؤ گی۔'' وہ اب بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے شیر دل میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کنوئیں میں چھلانگ لگا دی ہے...... میں نے کوئی calculations نہیں کی؟'' عکس نے جواباً اس سے پوچھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''نہیں، میں کم از کم یہ تو نہیں سمجھتا کہ تم نے کوئی calculations نہیں کی ہوں گی۔ تم چیس پلیئر ہو ہر چال بہت سوچ کر چلتی ہو۔'' اس کا لہجہ بات کرتے کرتے عجیب ہو گیا تھا۔ عکس نے اس سے نظر نہیں ملائی۔

''چیس کھیلنا چھوڑ چکی ہوں میں...... زندگی چیس سے بڑھ کر لگی ہے۔'' اس نے دور فوارے کو ایک بار پھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے شیر دل سے یہ نہیں پوچھا تھا اسے یہ کیسے یاد تھا کہ وہ چیس کھیلتی تھی...... اسے اندازہ ہو گیا تھا صرف وہ نہیں تھی جسے چیزیں یاد رکھنی آتی تھیں...... کبھی کبھار کوئی اور بھی ایسا ہی نہ بھولنے والا مل جاتا ہے۔

''وہ تمہارا ٹرانسفر کر دیں گے اس کے بعد تم کیا کرو گی؟'' فوارے کے پانی کو روشنیوں میں اچھلتے دیکھتے ہوئے اسے شیر دل کی آواز آئی۔ اس نے گردن موڑ کر شیر دل کو دیکھا۔

''وہ......؟ یعنی تمہاری فیملی؟'' عکس نے بڑی سنجیدگی سے شیر دل سے پوچھا۔ وہ اس کی فیملی کے اثر و رسوخ سے واقف تھی۔

''پھر کیا کرو گی تم؟'' شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اگلا سوال کیا۔ ''تم نے ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کو ذمے دار ٹھہرایا ہے یہ سوچ کر کہ تم وہاں بیٹھی ہو اور تم اس کیس میں شہباز حسین کے الزامات کو غلط ثابت کر کے خیر دین کو بے قصور قرار دو گی اور اس کے حق میں ثبوت اکٹھے کر کے پیش کر دو گی، تمہیں

یہ اس لیے آسان لگتا ہے کیونکہ ابھی تم پوسٹڈ ہو۔ اتنے پرانے کیس کا کوئی عینی شاہد نہیں ملے گا...... وہ لوگ جنہوں نے انکل شہباز کے ماتحت عملے کے طور پر تمہارے نانا کے خلاف بیانات ریکارڈ کروائے تھے اب اتنے سالوں بعد انہیں بڑی آسانی سے غلط ثابت کردو گی...... یہ سب اتنا سیدھا اور آسان نہیں ہے...... تم ٹرانسفر کے بعد وہاں اپنا اثر و رسوخ استعمال نہیں کرسکتیں...... تمہیں فرض کرو وہ ایس ڈی بنا دیتے ہیں تو کیا کرو گی تم پھر......؟'' شیر دل اسے بڑی سنجیدگی سے مضمرات سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔

''میں اگر یہاں پوسٹڈ نہ بھی ہوتی تو بھی میں کم از کم زندگی میں ایک بار اپنے نانا کو چوری کے اس کیس سے باعزت بری کروا کر ملازمت سے یکطرفہ اور ناجائز برطرفی کا فیصلہ غلط قرار دلوانے کی کوشش ضرور کرتی...... ان کی پنشن اور واجبات بحال کروانے کی کوشش بھی ضرور کرتی۔'' اس نے جواباً بے حد مستحکم آواز میں شیر دل سے کہا تھا۔

''میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں وہاں پوسٹ ہوں گی لیکن میں نے ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ میں اپنے نانا کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کا ازالہ ضرور کروں گی۔ وہ سرکاری ملازمت میرے نانا کے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ انہوں نے بڑی جدوجہد کرکے حاصل کی تھی۔ ان کے سر کا تاج تھا وہ زندگی بھر کا اثاثہ...... اور وہ یہ deserve نہیں کرتے تھے کہ ایک رات......'' وہ بات کرتے کرتے رک گئی تھی۔ شیر دل کو لگا وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی۔ شیر دل کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آکے گرا تھا۔

''میرے نانا بہت بوڑھے ہوچکے ہیں اور ان کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں ان کے ماتھے پر لگی ہوئی یہ واحد تہمت ہٹادوں...... جس کا باعث میں تھی۔ میرے لیے یہ اہم نہیں ہے کہ میں یہ کیس جیتتی ہوں یا نہیں...... اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں...... میرے لیے اہم بات صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ میں نے اس کام کے لیے کوشش تو کی...... میں کم از کم یہ پچھتاوا نہیں رکھنا چاہتی کہ میں نے کوشش بھی نہیں کی اپنے نانا کے لیے کچھ کرنے کی...... میں تمہیں بالکل نہیں روکتی تم اپنے انکل کو defend کرو...... اپنے خاندان کی سپورٹ کرو...... تمہیں بالکل ایسا ہی کرنا چاہیے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے بھی ایسا ہی کرنے دو...... تم میرے دوست ہو...... اس مسئلے کی وجہ سے دوست نہیں رہنا چاہتے تو بھی ٹھیک ہے۔ وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ شیر دل وہیں بیٹھا شام کے اندھیرے میں اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے پاس عکس مراد علی سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے پھر بھی کوشش کی تھی...... ایک واحد اور آخری کوشش۔

وہ بینچ پر بیٹھا تب تک عکس کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آتی رہی......

''تم جانتے ہو شیر دل میں نے تم سے شادی کیوں نہیں کی......؟ شہباز حسین وجہ نہیں ہے اس کی...... وہ کلاس ڈفرنس وجہ ہے جو بار بار تمہاری باتوں میں جھلکتا ہے...... تمہارے لیے تمہاری تکلیف بڑی ہے دوسروں کی چھوٹی...... ہاں تم نے کبھی زبان سے نہیں کہا لیکن ہمیشہ جتایا...... کبھی شعوری طور پر...... کبھی لاشعوری طور پر......''

وہ باتیں نہیں کرکے گئی تھی اس کی انا کے غبارے میں کیل گاڑ کر گئی تھی۔ ایک شیر دل کو کبھی اندازہ نہیں ہوا۔ پیار کی وہ برتیں جو وہ اپنے وجود کے گرد چڑھائے ہوئے تھا اسے اتار کر رکھ گئی تھی۔ طبقاتی فرق اس کے انداز اور لب و لہجے میں اتنا نمایاں تھا کہ دوسروں کو چبھتا تھا یا کم از کم اس عورت کو ضرور چبھتا تھا جس سے اس نے واقعی محبت کی تھی...... اور پتا نہیں وہاں بیٹھے بیٹھے اسے پہلی بار کیوں یہ یقین ہوا تھا کہ وہ بھی بالکل اسی کی طرح اس کی محبت میں پاگل تھی۔ اس پر مرتی تھی اس کے لیے جان دے سکتی تھی...... وہ جس چیز کو صرف اپنا پاگل پن سمجھتا رہا

تھا وہ یک طرفہ نہیں تھی...... لیکن عکس مراد علی اس کی طرح عقل سے پیدل نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہت کچھ چھپا سکتی تھی ایسی صفائی اور مہارت کے ساتھ کہ کوئی دوسرا کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔

''وہاں بیٹھے اسے یاد آیا تھا جب چڑیا فریزلی کی ڈسک شدید تکلیف کے باوجود بار بار پکڑنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ نیلے کرلیے تھے۔ ایک اس پر شدید خفا ہوا تھا وہ اسے اس نو سالہ بچی کی بے وقوفی سمجھ رہا تھا...... وہ قوتِ برداشت تھی...... وہی قوتِ برداشت جو اس نے گھوڑے سے گرنے کے بعد چند منٹوں میں دوبارہ اسی گھوڑے پر بیٹھ کر دکھائی تھی...... وہ ورد تھا اور ورد سہہ جاتا ہے انسان...... لیکن محبت پر بند کیسے باندھے تھے اس نے...... یہ ایک شیر دل کو اس سے سیکھنا تھا۔

☆☆☆

''سر ہم بھی یہاں سیکھنے کے لیے آئے ہیں کھیاں مارنے تو نہیں آئے یا پھر آپ ہمیں اجازت دیں ہم باہر گلی ڈنڈا کھیل لیتے ہیں آپ تب تک میڈم کو پسٹل شوٹنگ کی پریکٹس کراتے رہیں ہوسکتا ہے آپ کی یہ محنت رنگ لائے اور میڈم اگلے اولمپکس میں پسٹل شوٹنگ میں گولڈ میڈل لے کر آپ کا اور پاکستان کا نام روشن کرکے آئیں۔'' عکس کو ہنسی آئی تھی شیر دل کی جھلاہٹ پر لیکن اس نے سر جھکا کر ہاتھ میں پکڑے پسٹل کا بلٹ چیمبر کھولتے ہوئے اپنی ہنسی چھپائی۔ اسے بہت دیر سے وقتاً فوقتاً شیر دل کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہورہا تھا کہ شیر دل اب کسی بھی وقت پھٹنے والا تھا۔ وہ اس کی شکل اور تاثرات دیکھ کر بھی اس کی جھلاہٹ اور بے زاری کو پہچان سکتی تھی۔

وہ لوگ ایلیٹ فورس کے ٹریننگ اسکول میں نشانے بازی کی تربیت کے لیے آئے تھے۔ وہ پہلا ڈی ایم جی گروپ تھا جن کی تربیت کا ایک حصہ نشانے بازی میں مہارت بھی تھا۔ تین روزہ اس تربیت کے پہلے ہی دن شیر دل کا موڈ اس وقت بری طرح آف ہوا تھا جب اس نے اپنے گروپ کے انسٹرکٹر کو مکمل طور پر عکس کی طرف متوجہ بلکہ فریفتہ پایا تھا۔ وہ لوگ چار چار کے گروپس میں تھے اور عکس اسی کے گروپ میں تھی۔ انہیں پاکستانی پولیس کے زیرِ استعمال اسلحے سے متعارف کرواتے ہوئے انسٹرکٹر نے پورا لیکچر عکس کو دیکھتے ہوئے دیا تھا بلکہ اس کا شاید بس چلتا تو وہ اس ٹریننگ سیشن کو صرف ون ٹو ون کردیتا۔ ایلیٹ فورس کا وہ اہلکار پہلی بار ڈی ایم جی کی کسی خاتون آفیسر سے متھے لگا تھا جو اسے سر کہہ رہی تھی اور خاتون آفیسر بھی وہ جن کے لیے اکیڈمی میں موجود بہت سارے حضرات گدھے بننے کے لیے تیار تھے اور وہ اہلکار خوش قسمت تھا کہ 18 کے اس گروپ کی ''ہیروئن'' اس کی قلم میں تھی اور اسے اپنی اس خوش قسمتی اور باقی انسٹرکٹر کی بدبختی کا احساس بھی تھا۔

گروپ میں شیر دل کے علاوہ دوسرے دونوں مرد آفیسر نے اس التفات پر صرف معنی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ کرکے اسے نظر انداز کردیا تھا۔ صرف شیر دل تھا جو نظر انداز نہیں کرسکا تھا۔ پتا نہیں اسے انسٹرکٹر کے ساتھ عکس کی یہ قربت اچھی لگی یا اس انسٹرکٹر کا ایک شیر دل کو ایک لڑکی کی وجہ سے اس بری طرح نظر انداز کرنا۔

اکیڈمی میں سب ایک شیر دل کے خاندان سے واقف تھے۔ ایڈیشنل سیکریٹری کے بیٹے کو بہت واضح انداز میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی حد تک پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ ایک شیر دل اس پروٹوکول کا عادی تھا۔ وہ بہت دیر تک یہی سب دیکھتا رہا...... پریکٹس سیشن کے دوران بھی انسٹرکٹر باقی تینوں ممبرز کو ہلکی پھلکی ہدایات دینے کے بعد بار بار عکس کے پاس پہنچ جاتا تھا اور شیر دل کی توجہ شوٹنگ رینج اور پریکٹس سے زیادہ اسی چیز پر تھی۔ نہ پسٹل اس کے لیے نئی چیز تھی نہ وہ پہلی بار شوٹنگ پریکٹس کررہا تھا اس کے باوجود اس نے جان بوجھ کر انسٹرکٹر کو اپنی طرف بلانا

شروع کر دیا تھا اور پھر جب ایک بار انسٹرکٹر اس کے بلانے پر آنے کے بجائے اسے عکس کی وجہ سے انتظار کرواتا رہا تو ایبک نے کانوں پر چڑھائے ہوئے ear pluge اتار کر بڑی خفگی سے انسٹرکٹر سے کہہ ہی دیا تھا۔

چند لمحوں کے لیے انسٹرکٹر کو اس کی بات کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ بات مزاحیہ لگی تو اسے لیکن یقیناً ہنسانے کے لیے نہیں کی گئی تھی۔

''سر آپ پہلے ان کی بات سن لیں۔'' عکس نے انسٹرکٹر سے کہا۔ وہ انسٹرکٹر کی اس قدر توجہ کو خود بھی ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔ انسٹرکٹر بادلِ ناخواستہ شیر دل کی طرف چلا گیا۔

بریک میں شیر دل اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ اب روٹین میں ہونے لگا تھا۔ وہ بے مقصد اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور پھر بات چیت شروع کر دیتا آج بھی اس نے یہی کیا تھا۔

''اس طرح کے دو چار الو تمہیں پھر مل گئے تو بیسٹ پروبیشنرز کی ٹرافی ایک بار پھر تم لے جاؤ گی۔'' بڑے سرسری انداز میں کہی ہوئی اس بات میں بڑی تضحیک تھی جو عکس نے محسوس کی تھی۔

''ایکسکیوزمی...... میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔'' اس نے بڑی شائستگی سے شیر دل کو ٹوکا۔ پتا نہیں شیر دل کس موڈ میں تھا لیکن اس نے بڑے اطمینان سے اس کی CTP کی بیسٹ پروبیشنرز کی ٹرافی کا کریڈٹ ان دو مردوں کو دیا تھا جن میں سے ایک کا نام لینا وہ سؤر کا نام لینے کے مترادف سمجھتا تھا اور دوسرے کو وہ گدھا نہیں خچر سمجھتا تھا۔ بڑے استہزائیہ انداز میں اس نے عکس کو جتایا تھا کہ وہ اسپورٹس کے ان دو ایونٹس میں مردوں کی پارٹنر شپ کی وجہ سے جیت سکی تھی اور صرف ان فتوحات کی وجہ سے شیر دل اور اس کے پوائنٹس میں فرق آ گیا تھا ورنہ وہ کبھی بیسٹ پروبیشنرز ٹرافی اپنے بل بوتے پر نہیں جیت سکتی تھی۔ پانی کی بوتل سے پانی پیتے ہوئے عکس نے شیر دل کی یہ بکواس بے حد اطمینان سے سنی تھی۔

''تمہارا خیال ہے وہ اسپورٹس پوائنٹس مجھے نہ ملتے تو یہ ٹرافی اب بھی تمہارے خاندان کے پاس جاتی؟'' اس کی بات سننے کے بعد اس نے بے حد شائستگی کے ساتھ شیر دل سے پوچھا تھا یوں جیسے وہ کسی بہت اہم مسئلے پر اس کی رائے لے رہی ہو۔

''fact ہے یہ۔'' شیر دل نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

''شیر دل اس بار تو کوئی مکسڈ گیمز نہیں ہیں نا...... تم اس بار بیسٹ پروبیشنر کی ٹرافی لے لو۔'' شیر دل چند لمحے اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ سنجیدہ تھی لیکن بلا کے اطمینان کے ساتھ اسے بیسٹ پروبیشنر کی ٹرافی جیتنے کا چیلنج یوں دے رہی تھی جیسے کسی بیکری سے کپ کیک لانے کا کہہ رہی ہو۔

''تمہیں لگتا ہے میں نہیں جیت سکتا؟'' ایک ابرو بے حد تیکھے انداز میں اچکاتے ہوئے شیر دل نے اس سے پوچھا۔

''کیوں نہیں جیت سکتے...... تم ہمارے کامن کے بیسٹ رائڈر ہو، بیسٹ سوئمر ہو، بیسٹ ٹینس پلیئر ہو، مجھے یقین ہے بیسٹ شوٹر بھی تم ہی ہو گے...... کیوں نہیں جیت سکتے تم۔'' اس نے اس طرح اطمینان سے کہا تھا جیسے ایک فارم ٹیچر اپنے اسٹوڈنٹ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اسے اس کی قابلیت کا یقین دلاتے ہوئے کسی بڑے مقابلے میں بھیجنے کے لیے تیار کر رہی ہو۔

''لیکن بات یہ ہے ایبک شیر دل کہ یہ اولمپکس ہوتے تو تم ہی جیتتے ہر کھیل میں لیکن خوش قسمتی سے یہ اولمپکس

نہیں ہے۔'' شیر دل جانتا تھا وہ اسی کے استعمال کیے ہوئے لفظ کو لے کر اس پر چوٹ کر رہی تھی۔

''دیکھیں گے۔'' شیر دل کرسی جھلاتے ہوئے مسکرایا تھا۔

''ضرور......'' عکس نے مسکرا کے کہا۔

''تم چیلنج کر رہی ہو کہ تم مجھے یہ ٹرافی نہیں لینے دو گی؟'' شیر دل نے اس کے جواب پر کہا۔ عکس جواب دینے کے بجائے اسے دیکھ کر مسکرا دی...... ایک بے حد گہری...... بے حد معنی خیز...... لیکن چیلنج کرتی ہوئی مسکراہٹ۔

تقریباً آٹھ ماہ کے بعد CTP کی ٹریننگ کے اختتام پہ اس بار کوئی کانٹے دار مقابلہ نہیں ہوا تھا۔ اسپورٹس کا ایونٹ شیر دل کا نام رہا تھا۔ لیکن کورس کے تمام پیپرز میں وہ کسی ایک میں بھی ٹاپ نہیں کر سکا تھا۔ صرف وہی نہیں گروپ کے دوسرے آفیسرز میں سے کوئی بھی اکیڈمکس میں کسی ایک پیپر میں بھی عکس مراد علی کو beat نہیں کر سکا تھا۔ اکیڈمکس میں اتنی واضح اور یکطرفہ پرفارمنس کے بعد بیسٹ پروبیشنر کی ٹرافی جیتنے کے لیے عکس کی باقی چیزوں میں بہت معمولی ایوریج پرفارمنس بھی بہت کافی تھی۔ اس نے شیر دل کو کڑا جواب دیا تھا۔

پاسنگ آؤٹ ceremony اٹینڈ کرتے ہوئے شیر دل نے پہلی بار عکس مراد کے لیے کھلے دل سے تالیاں بجائی تھیں۔ وہ ڈی ایم جی کی بیسٹ پروبیشنر کی ٹرافی حاصل کرنے والی پاکستان کی پہلی خاتون آفیسر تھی اور اس کے ایوارڈ سے پہلے اس کا یہ اعزاز بھی دہرایا گیا تھا۔

دو سال کی ٹریننگ کے دوران شیر دل ایک حریف کے طور پر اسے جتنا سخت مقابلہ دے سکتا تھا اس نے دیا تھا۔ اس نے کبھی کہیں عکس مراد علی کی سبقت اور قابلیت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہی کچھ اس گروپ کے باقی 16 آفیسرز نے کیا تھا۔ عکس مراد علی مرد بھی ہوتی تب بھی وہ اس کے ساتھ ایسا ہی کڑا مقابلہ کرتے لیکن اس کا عورت ہونا ان 17 مرد آفیسرز کے لیے جیسے ایک اور چیلنج تھا۔ ان میں سے ہر ایک وہاں اپنی ذاتی prestige کے لیے تو لڑ ہی رہا تھا لیکن وہ 17 لوگ اپنی صنف کی prestige کے لیے بھی لڑ رہے تھے۔ جتنا اور جیسا لڑ سکتے تھے اور اب اس لڑائی کے اختتام پر وہ 17 لوگ بالآخر ڈاکٹر عکس مراد علی کو تعظیم دے رہے تھے...... کھلے دل سے...... اعلیٰ ظرف حریفوں کی طرح شیر دل نے بھی بالآخر عکس مراد علی کی جیت کو خوش دلی سے تسلیم کر لیا تھا...... اس عورت کے لیے تحسین اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ...... اس کے باوجود کہ وہ اپنے چیلنج میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ہال میں بیسٹ پروبیشنر کے لیے فخریہ انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے خیر دین کو اس شام مسز بختیار شیر دل نے کئی سال بعد پہلی بار دیکھا تھا...... پہلی خاتون بیسٹ پروبیشنر کے نام کے اعلان پر ہال اسٹینڈنگ اوویشن دینے کے لیے کھڑا ہوا تھا اور وہ پہلا لمحہ تھا جب پاکستان کے بااثر اور بارسوخ لوگوں کی اس gathering میں مسز بختیار شیر دل نے فرسٹ رو میں اپنے اور اپنے شوہر سے کچھ فاصلے پر بے حد جوش و خروش سے تالیاں بجاتے ہوئے خیر دین کو دیکھا تھا۔ کئی سال گزرنے اور چہرے پر داڑھی ہونے کے باوجود مسز بختیار شیر دل نے اس cook کو پہچاننے میں چند سیکنڈز لگائے تھے جو ان کے خاندان میں ہونے والی سب سے بڑی ٹریجڈی کا ذمے دار تھا۔ ان کا دھیان عکس مراد علی سے ہٹ گیا تھا...... کچھ دیر کے لیے وہ اس صدمے کو بھی بھول گئی تھیں جو ایک بار پھر اس ٹرافی کے شیر دل کو نہ ملنے پر انہیں ہوا تھا...... کچھ دیر کے لیے ان کا ذہن جیسے بالکل blank ہو گیا تھا۔ مسئلہ صرف خیر دین کو دیکھنے کا نہیں تھا مسئلہ خیر دین کو ایک غلط gathering میں دیکھنے کا تھا۔ وہ کس پروبیشنر کی وجہ سے وہاں موجود تھا۔ یہ بھی بہت دیر تک ان سے چھپا نہیں رہا تھا۔ انہوں نے شاک کے عالم میں

عکس مراد علی کو دیکھا تھا۔ یوں جیسے انہوں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا تھا...... اور یہ غلط بھی نہیں تھا وہ اپنے خاندان کے ماضی کا ایک بھوت ہی دیکھ رہی تھیں اس لڑکی کی شکل میں ...انہیں وہ نو سالہ بچی یاد آئی تھی جس کی باتیں ان کا بیٹا quotations کی طرح دہرایا کرتا تھا ان کے سامنے اور جس کی باتیں انہیں شدید خفا کرتی تھیں کیونکہ انہیں لگتا تھا ان میں بغاوت کی بو تھی...... عمر سے زیادہ کی maturity تھی...... اور چیلنج تھا...... وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس بچی کو ناپسند کرنے لگی تھیں جس کے ساتھ کھیلنے کے لیے ایک شیر دل ان سے سو جھوٹ بولنے پر تیار رہتا تھا...... وہ کبھی بھی چڑیا کی باتوں کو ایک بچے کی ذہانت سمجھ کر اسے داد نہیں دے سکی تھیں اور اب اسی چڑیا کے لیے وہ اسی ہال میں کھڑے تالیاں بجانے پر مجبور تھیں اس کے باوجود کہ اس نے وہ ٹرافی ان کے خاندان سے چھینی تھی جیسے شیر کے منہ سے نوالہ چھین لیا ہو اور اس کے باوجود کہ وہ اس لڑکی کی وجہ سے اپنے عزیز ترین اکلوتے اپنے بھائی سے محروم ہوئی تھیں۔

اسی خالی ذہن اور بے تاثر چہرے کے ساتھ انہوں نے تقریب کے بعد ہونے والے ڈنر کو اٹینڈ کیا تھا۔ شیر دل نے ماں کے اکھڑے ہوئے موڈ کو محسوس کر لیا تھا اور اس کا خیال تھا یہ اس کے ٹرافی نہ جیتنے کی وجہ سے تھا۔ ڈنر کے دوران تمام کامنرز کے والدین ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ شیر دل نے بھی بختیار اور ماں کو عکس اور اس کے نانا سے ملوانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا...... بے حد کورا انکار۔ شیر دل نے ان کے لہجے کی اس رکھائی اور انکار کو بھی عکس مراد علی کو ملنے والی ٹرافی کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ ماں زندگی میں پہلی بار کسی سوشل گیدرنگ میں اس طرح ری ایکٹ کر رہی تھیں کہ شیر دل کو انہیں سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ بختیار شیر دل اپنی بیوی کے انکار کے باوجود شیر دل کے ساتھ بڑی خوش دلی سے عکس اور اس کے نانا سے ملے تھے۔ خیر دین اور ان کا کبھی پہلے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے چند منٹ خیر دین کو عکس مراد علی کی کامیابی کی مبارک باد دی، عکس کے ساتھ گپ شپ کی اور پھر شیر دل کے ساتھ ہی واپس آ گئے۔

''اچھی لڑکی ہے۔'' شیر دل کی ممی نے بختیار شیر دل کو عکس سے مل کر واپس آنے پر اس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے شوہر کے اس تبصرے کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ شیر دل سے عکس مراد علی کے بارے میں بہت کچھ سنتی رہتی تھیں۔ انہیں اندازہ تھا CTP میں ایک شیر دل کی عکس کے علاوہ کسی اور سے دوستی نہیں تھی۔ بعض دفعہ انہیں شیر دل، عکس سے ضرورت سے زیادہ متاثر محسوس ہوتا لیکن انہوں نے کبھی اس چیز پر زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا کیونکہ عکس مراد علی ایک شیر دل کی پہلی دوست نہیں تھی۔

وہ اس رات تقریب سے واپس چلے آنے پر گھر میں بھی بہت اپ سیٹ رہی تھیں اور بختیار نے ان کی اس پریشانی کے بارے میں سب سے پہلے تبصرہ کیا تھا۔

''آپ اب اس ٹرافی کو ذہن سے نکال دیں It went to the better officer
بختیار شیر دل نے انہیں بڑی صاف گوئی سے کہا تھا۔ وہ بھی اپنی بیوی کی اس خاموشی کو اس ٹرافی کے کھو دینے کا رد عمل سمجھے تھے لیکن انہیں حیرت تھی کہ ان کی بیوی اس ایک ٹرافی کو اتنا سیریسلی کیوں لے رہی تھیں۔

''سول سروس میں بھی اب پتا نہیں کیسے کیسے لوگ آنے لگے ہیں۔'' بختیار نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنی بیوی کو عجیب سا تبصرہ کرتے سنا۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے کچھ حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔

''سول سروس میں ہمیشہ سے ہی پتا نہیں کیسے کیسے لوگ آتے رہتے ہیں۔ ویسے تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟'' انہوں نے خوش دلی سے بات کرتے ہوئے اپنی بیوی کے تبصرے کو lightly لیا۔ ان کی بیوی کبھی بھی اس طرح کی باتیں اور تبصرے کرنے کی عادی نہیں تھیں جیسا تبصرہ انہوں نے اس وقت ان سے سنا تھا۔

''generally بات کر رہی ہوں کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہیں ہے میرا۔'' انہوں نے شوہر کی بات پر...... ایک دم کچھ سنبھل کر کہا تھا۔

''ویسے آپ عکس مراد علی کی تعریف کس حوالے سے کر رہے تھے؟'' انہوں نے بات کرتے کرتے ایک دم موضوع بدلا۔

''بہت قابل آفیسر ہے اور بہت گرومڈ...... اچھا لگا مجھے اس سے مل کر۔'' بختیار نے کہا۔

''فیملی بیک گراؤنڈ کوئی اتنا اچھا نہیں ہے اس کا۔'' شیر دل کی ممی نے بے ساختہ ان سے کہا۔ ''ماں نے دوسری شادی کی ہوئی ہے مڈل ایسٹ میں کہیں ہے وہ سوتیلے باپ اور فیملی کے ساتھ...... اور نانا دال کی کوئی دکان چلاتا ہے۔ خیر دین کی دال کا سنا ہوگا آپ نے۔'' بختیار کو بیوی کا انداز آج حیران کر رہا تھا۔ ان کے لہجے میں پہلی بار وہ اس طرح کی تضحیک محسوس کر رہے تھے اور انہیں وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا صرف وہ جیلسی جو ایک ماں اس لیے محسوس کرتی ہے کیونکہ اس کے بیٹے کا حق سمجھی جانے والی چیز کسی اور نے چھین لی تھی...... چاہے قابلیت کے بل پر درست طریقے سے ہی سہی لیکن تھوڑی بہت خفگی اور جیلسی بہت نیچرل بات تھی اس صورت حال میں۔

''ہاں میں نے سنا ہے خیر دین کی دال کے بارے میں۔ پہلے بھی میں نے سنا تھا اس حوالے سے کسی سینئر آفیسر سے...... لیکن مجھے اس آدمی سے ملتے ہوئے بہت اچھا لگا۔ وہ بات چیت سے رکھ رکھاؤ سے بالکل مزدور نہیں لگ رہا تھا بلکہ مجھے کافی پڑھا لکھا لگا...... تمہیں بھی ملنا چاہیے تھا اس سے جب شیر دل کہہ رہا تھا۔'' بختیار نے بات کو تھوڑا سا بدل دیا تھا۔

''مجھے دلچسپی نہیں تھی۔'' انہوں نے کہہ کر بات کا موضوع ایک بار پھر بدل دیا...... لیکن اب ایک عجیب سی بے چینی انہیں ہو رہی تھی۔ شیر دل نے ان سے ذکر نہیں کیا تھا لیکن کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ خیر دین کو اس پوسٹنگ کے حوالے سے اور عکس کو چڑیا کے حوالے سے جانتا تھا اور وہ ان سے چھپا رہا تھا۔ انہیں یاد تھا وہ ماں کی چڑیا کے لیے ناپسندیدگی جاننے کے بعد ماں سے چڑیا کے بارے میں بہت کچھ چھپانے لگا تھا۔ مسز بختیار شیر دل کو ایک عجیب سا اضطراب ہوا تھا۔ ایسا بھی ہو سکتا تھا یہ ناممکن تو نہیں تھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی عکس مراد علی سے اتنی دوستی ہو اور عکس مراد علی اور خیر دین اس کا نام اور خاندان کے بارے میں جاننے کے بعد یہ نہ جان پائیں کہ وہ کون تھا...... اور اگر انہوں نے بالفرض شیر دل کو نہیں پہچانا تھا تو شیر دل تو ان دونوں کو پہچان سکتا تھا...... یا پہچانتا تھا اور ان سے چھپا رہا تھا اور چھپا رہا تھا تو یہ بہت خوفناک بات تھی۔ اس رات وہ اپنے بستر پر کروٹیں لیتی رہیں انہیں نیند نہیں آئی۔ وجوہات بہت ساری تھیں انہیں شہباز حسین یاد آیا تھا...... ان کا جان سے پیارا اکلوتا چھوٹا بھائی...... جس کی موت کے ساتھ ہی اس کا خاندان ختم ہو گیا تھا۔ منزہ کی زندگی کا سب سے بڑا taruma یہی تھا۔ وہ شرمین کو شہباز کی خودکشی کا ذمے دار سمجھتی تھیں اور آج خیر دین اور عکس کو دیکھنے پر یک دم انہیں یوں لگا تھا جیسے شہباز کی موت کی وجہ وہ دونوں تھے...... وہ ایک پھانس تھی جو ان کے دل سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ انہوں نے اگلے ہی دن شیر دل سے عکس مراد علی کے بارے میں بات چیت کی تھی۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود اسے خیر دین کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بتا کر بات شروع کریں لیکن وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ شیر دل ان کے بارے میں کیا جانتا تھا اور کیا نہیں۔

''پتا نہیں میری کبھی اس معاملے پر اس سے تفصیلی بات نہیں ہوئی۔ اس کے نانا کی تو دال کی ایک بڑی مشہور دکان ہے میں نے آپ کو بتایا تھا۔'' شیر دل نے کہنا شروع کیا۔

''اور جو اس کے سوتیلے والد ہیں وہ......'' منزہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اس کے نانا دال کی دکان کھولنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟'' شیر دل ماں کی بات پر ہنس دیا۔

''ممی ان کا بزنس ہے یہ اور بہت established ہے یہ...... یہی کرتے ہوں گے وہ ہمیشہ سے......''

اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔ منزہ اس کا چہرہ بڑے غور سے دیکھتی رہیں یوں جیسے یہ جانچنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ ان سے کچھ چھپانے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا لیکن شیر دل کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے انہیں یہ وہم ہوتا کہ وہ ایسا کچھ کر رہا تھا۔

''زیادہ اچھا فیملی بیک گراؤنڈ نہیں ہے اس کا۔'' منزہ نے بالآخر کہنا شروع کیا۔ ''ویسے تم تو اس کے نانا سے اکثر ملتے رہتے ہو گے؟'' منزہ نے بات شروع کر کے یک دم کہا۔

''نہیں اکثر تو نہیں لیکن ہاں ان سے مل چکا ہوں چند بار پہلے بھی...... کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ آؤٹنگ کے دوران آؤٹ آف سٹی جاتے ہوئے دال کھانے لے جاتے تھے میرے دوست وہاں...... یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ عکس کے نانا ہیں وہ...... اچھے آدمی ہیں ویسے......'' شیر دل نے بے پروائی سے تبصرہ کیا تھا۔

''خاندان بڑا matter کرتا ہے۔'' منزہ نے یہ بات اس ساری گفتگو کے جواب میں کیوں کہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ اس کی سمجھ میں آیا...... نہ شیر دل کی سمجھ میں...... لیکن وہ خیر دین اور عکس کے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے منزہ کی باتیں سنتا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے وہ منزہ کی بہت سی باتوں سے متفق تھا۔

اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہونے کے ایک سال بعد منزہ کے سامنے شادی کے تذکرے پر سرسری انداز میں عکس کا نام لینے پر اس نے ماں سے دوبارہ وہی لیکچر سنا تھا اور اس وقت اسے احساس ہوا اس کی ماں بہت پہلے اس خطرے کو بھانپ چکی تھی، نہ بھانپ چکی ہوتی تو اسے ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے خاندانی ہونے اور خاندانی رہنے کی اہمیت کو جتا نہ چکی ہوتی۔ وہ ماں سے زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا۔ کہیں نہ کہیں لاشعوری طور پر وہ بھی طبقاتی فرق اور اچھے بیک گراؤنڈ کی اہمیت پر یقین رکھتا تھا اور کہیں نہ کہیں وہ بھی عکس مراد علی سے شادی کرنے کی شدید خواہش کے باوجود اس ایک معاملے کی وجہ سے ہچکچاتا تھا۔ وہ ہلکا پھلکا پروپوزل جو اس نے بظاہر غیر سنجیدگی سے عکس کو دیا تھا اس نے تھینک یو ویری مچ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا...... اسے عکس کی طرف سے کسی دلچسپی کا اظہار ملا ہوتا تو وہ ماں کی ان باتوں پر کسی نہ کسی حد تک عکس کا دفاع کرتا...... بالکل اسی طرح جس طرح اس نے عکس کو دوسری بار پروپوزل کرنے کے وقت منزہ سے اس معاملے پر شدید بحث کی تھی...... وہ کم سے کم دوسری بار عکس سے شادی کرنے میں اس کے خاندانی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے متامل نہیں تھا، نہ ہی وہ ماں کو اس بات کے لیے blame کرتا تھا کہ عکس سے اس کی شادی نہ ہونے کی وجہ وہ بنی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اگر عکس راضی ہو جائے تو وہ ماں کو منا لیتا...... شیر دل کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ بختیار شیر دل کو منا سکتا تھا۔ وہ منزہ بختیار کو کبھی راضی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں مسئلہ خاندانی بیک گراؤنڈ نہیں تھا، یہاں مسئلہ شہباز حسین تھا۔

☆☆☆

شرمین شہباز حسین کو کبھی نہیں بھول سکی تھی بالکل اسی طرح جیسے شہباز حسین اس کی زندگی سے نکل جانے کو

کبھی بھول کر نارمل نہیں ہو سکا تھا۔ ان دونوں کی کم عمری میں شادی ہوئی تھی۔ شہباز ان دنوں امریکا میں اپنی ڈگری کر رہا تھا جب وہاں کسی فیملی فرینڈز کے ہاں اس کی شرمین سے پہلی ملاقات ہوئی اور تیسری ملاقات میں اس نے شرمین کو پروپوز کر دیا تھا۔ وہ اس وقت 17 سال کی تھی شہباز 22 سال کا تھا۔ دونوں بہت اچھی فیملیز سے تعلق رکھتے تھے اور شکل و صورت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

''ان کی شادی پرفیکٹ میچ تھا۔ آئیڈیل کپل...... love birds شہباز تھوڑا temperamental تھا لیکن شرمین کے لیے یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ کبھی غصہ کر بھی لیتا تو بھی اسے خود ہی منایا کرتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ڈرنک کرتا تھا لیکن شرمین اس کی اس عادت سے شادی سے پہلے ہی واقف تھی۔ اس کا اپنا فیملی سیٹ اپ بھی اتنا لبرل تھا کہ کبھی کبھار کی شراب نوشی اس میں معیوب بات نہیں تھی۔ شہباز حسین میں اور کوئی خامی نہیں تھی کم از کم تب تک شرمین ایسا کچھ اس میں دیکھ نہیں پائی تھی جس پر اسے کبھی پریشانی یا تشویش ہوتی۔ شادی کے بعد وہ سول سروس میں آیا تھا اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کی طرح اور شرمین پاکستان شفٹ نہ ہونے کی خواہش رکھنے کے باوجود اس کی محبت میں اس کے ساتھ پاکستان چلی آئی تھی۔ اسے وہاں آ کر ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ شہباز کی صرف ایک بہن تھی اور وہ بھی میرڈ تھی لیکن اس کی extended family کافی زیادہ تھی۔ شرمین کو اس کی فیملی میں بڑی گرم جوشی سے لیا گیا تھا۔

شادی کے دس سال بہت آرام سے گزرے تھے۔ شادی کے شروع کے چند سالوں میں اوپر نیچے کے تین چار miscarriages کے بعد شہباز شرمین کے بارے میں ضرورت سے زیادہ پروٹیکٹو ہو گیا تھا۔ شہر بانو کی پیدائش کے بعد اس نے شرمین سے کہہ دیا تھا کہ اسے مزید بچوں کی ضرورت اور خواہش نہیں تھی۔ شرمین خود بھی زیادہ اولاد میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ ان کی زندگی میں آنے والا واحد طوفان خیر دین اور چڑیا کی وجہ سے آیا تھا اور وہ پہلا طوفان ہی ان کے رشتے کی جڑیں اکھاڑ گیا تھا۔

سسٹر ایگنس سے شرمین کی کئی سالوں کے بعد لاہور کانونٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ شہباز کی اگلی پوسٹنگ بہت عرصے کے بعد واپس لاہور میں ہوئی تھی۔ شہر بانو تب آٹھ سال کی تھی۔ سسٹر ایگنس لاہور کانونٹ میں تھیں لیکن اس بار وہ وہاں پرنسپل کے طور پر نہیں تھیں۔ شرمین سے ان کی ملاقات اتفاقی ہوئی تھی۔ شرمین خود بھی لاہور کانونٹ میں بہت بچپن میں چند سال زیر تعلیم رہی تھی۔ سسٹر ایگنس کے ساتھ کچھ سال پہلے ہونے والے تلخ تجربے کے باوجود شرمین ان سے بہت گرم جوشی سے ملی تھی لیکن سسٹر ایگنس اس سے تب بھی کھنچی کھنچی ہی رہی تھیں۔ ان کے رویے نے شرمین کو ایک بار پھر چند سال پہلے ہونے والے اس واقعے کے حوالے سے تجسس کا شکار کر دیا تھا۔ اس نے اس بار شہباز حسین کو سسٹر ایگنس کے بارے میں بتانے کی حماقت نہیں کی تھی۔ وہ ایک بار پھر سے شہر بانو کی اسکولنگ کے حوالے سے شہباز حسین کے رویے میں کوئی افراتفری دیکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس بار اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سسٹر ایگنس سے ان کے اور شہباز حسین کے درمیان ہونے والے تنازعے کی اصل وجہ جاننے کے لیے ضرور کوشش کرے گی اور اگر ممکن ہوا تو وہ اس تنازعے کو حل بھی کرا دے گی۔

وہ سسٹر ایگنس سے اس تنازعے کی وجہ جاننے پر اتنا اصرار نہ کرتیں تو سسٹر ایگنس چڑیا اور خیر دین کے ساتھ ہونے والے واقعات کبھی شرمین کے ساتھ شیئر نہ کرتیں۔ سسٹر ایگنس سے سب کچھ سننے کے بعد شرمین اگلے کئی

منٹ بے یقینی کے عالم میں سسٹر ایگنس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اسے لگا سسٹر ایگنس کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔

”یہ شہباز نے کیا؟“ اس نے شاک میں پوچھا تھا۔ سسٹر ایگنس تائید میں سر ہلاتے ہوئے اسے کچھ اور تفصیلات بتانے لگی تھیں۔

شرمین سرد ہاتھ پیروں کے ساتھ پلکیں جھپکائے بغیر سسٹر ایگنس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کا دماغ گھومنے لگا تھا۔ وہ شہباز حسین پر کیسا گھناؤنا الزام لگا رہی تھیں۔ شہباز ایسا کس طرح ہوسکتا تھا۔ اس نے اتنے سالوں میں اپنے شوہر میں معمولی سی بھی اخلاقی بے راہ روی نہیں دیکھی تھی اور سسٹر ایگنس کہہ رہی تھیں وہ...... شرمین آگے کچھ سوچ نہیں پا رہی تھی۔ اس کا دل کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا دماغ اس واقعے کے بعد شہباز کی طرف سے بولے جانے والے تمام جھوٹوں کو جیسے کسی flashback کی طرح ایک کے بعد ایک اس کے دماغ کی اسکرین پر لاتا جا رہا تھا۔ عجیب جنگ تھی جو اس کے دل و دماغ میں ہو رہی تھی۔ وہ سسٹر ایگنس کے پاس سے ایک لفظ بھی کہے بغیر اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ باہر آ کر گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اسے یاد آیا اسے شہر بانو کو اسکول سے لینا تھا۔ عجیب خالی الذہنی کے عالم میں اس نے شہر بانو کو اسکول سے نکلتے ہوئے بچوں میں ڈھونڈنا شروع کیا تھا اور جو ڈھونڈتی ہی چلی گئی تھی لیکن شہر بانو تو ملنے پر نہیں آ رہی تھی اور تب اس پر یہ خوفناک انکشاف ہوا تھا کہ وہ تو شہر بانو کی شکل ہی بھول گئی تھی۔ ذہن پر بہت زور ڈالنے کے باوجود اسے اپنی اکلوتی بیٹی کی شکل یاد نہیں آ رہی تھی۔

اس نے عجیب خوف کے عالم میں اپنے پرس میں پڑے والٹ میں سے شہر بانو کی تصویر نکال کر جیسے خود کو اپنی بیٹی کا چہرہ یاد دلانے کی کوشش کی تھی اور پھر دوبارہ سر اٹھا کر بچوں کے اس ہجوم میں شہر بانو کا چہرہ تلاش کیا تھا۔ ایک بار پھر شہر بانو کا چہرہ اس کے ذہن کی اسکرین سے صاف ہو گیا تھا۔ وہاں ایک اور چہرہ ابھر آیا تھا...... اس نو سالہ چڑیا کا چہرہ...... وہاں ہر بچے کا چہرہ ایک دم چڑیا کا چہرہ بن گیا تھا۔ اس کے سامنے درجنوں چڑیا ئیں ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ وہ کسی بت کی طرح بے حد خوف کے عالم میں پرس ہاتھ میں پکڑے ان بچوں کے ہجوم میں کھڑی تھی...... ایک لمحے کو لگا تھا اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا ورنہ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اپنی ہی اولاد کو نہ پہچان سکے...... ماں ہو کے وہ اپنی اولاد کو نہ پہچان سکے...... اور تبھی کوئی یک دم اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ شرمین نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ممی......“ اسے شہر بانو کی کھلکھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی پشت پر بیگ لٹکائے ماں کے پاس آ چکی تھی۔

پتا نہیں شرمین کو کیا ہوا تھا وہ بے اختیار وہیں کھڑے کھڑے بچوں کے بل بیٹھ گئی تھی۔ شہر بانو کو ساتھ لپٹاتے ہوئے وہ اسکول گیٹ کے پاس بچوں اور ان کے پیرنٹس کے ہجوم میں دھاڑیں مار مار کر روئی تھی اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہاں سے گزرنے والے بہت سے بچوں کے پیرنٹس اسے شہباز حسین کی بیوی کے طور پر جانتے تھے...... اور وہ اپنی بچی کو emmbarras کر رہی تھی۔ شہر بانو عجیب دہشت زدہ ہو کر ماں کو اس طرح روتا دیکھتی رہی تھی۔ اس کا ذہن کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

شرمین اس دن اسکول سے گھر تک اسی طرح روتے ہوئے آئی تھی۔ وہ جگسا پزل جو وہ کئی سال پہلے صرف ایک پیس نہ ملنے کی وجہ سے حل نہیں ہوا تھا۔ وہ آج حل ہو گیا تھا۔ وہ گمشدہ پیس مل گیا تھا...... لیکن اسے حل نہیں ہونا چاہیے تھا وہ بہت غلط وقت پر حل ہوا تھا۔ وہ کئی سالوں بعد ایک دوسرے بچے کے لیے کوشش کر رہے تھے اور شرمین کو چند دن پہلے اپنی پریگنینسی کا پتا چلا تھا۔ وہ اور شہباز بہت خوش تھے اور اس ساری خوشی کے درمیان آ سے

اپنی زندگی کے سب سے بڑے کرائسس کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اس دن شرمین نے گھر جا کر شہباز سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے طے کیا تھا کہ وہ اس بار خیر دین اور چڑیا سے ملے گی...... کسی بھی طرح کچھ بھی کر کے...... اور وہ خیر دین سے ملنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

زندگی میں بہت دفعہ شرمین کو اس ایک ملاقات کا رنج رہا۔ وہ خیر دین سے نہ ملتی تو اس کا گھر بچا رہ سکتا تھا...... شہباز حسین زندہ رہ سکتا تھا۔ اسے پاکستان چھوڑ کر نہ آنا پڑتا۔

☆☆☆

”تم واپس کب آ رہی ہو؟“ شہر بانو نے مسکراتے ہوئے منزہ کا سوال سنا اور پھر ہنس دی۔

”ممی لگتا ہے آپ اس بار مجھے شیر دل سے بھی زیادہ مس کر رہی ہیں۔“ منزہ جواب میں مسکرا نہیں سکی تھیں۔

”شیر دل تو جب سے سنگاپور کورس کے لیے گیا ہے اسے سب بھول گیا ہے ممی......“ شہر بانو نے منزہ کے موڈ کا اندازہ لگائے بغیر مسکراتے ہوئے اس سے شیر دل کی شکایت کی۔

”شہر بانو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ منزہ نے یک دم اسے ٹوک دیا۔ اس وقت پہلی بار شہر بانو نے اپنی ساس کے لہجے کا اضطراب نوٹس کیا۔

”کیا ہوا ممی؟ خیریت تو ہے؟“ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”خیریت نہیں ہے۔“ منزہ نے بے ساختہ کہا۔

”آپ مجھے پریشان کر رہی ہیں ممی۔“ شہر بانو الجھ گئی تھی۔

”دیکھو بیٹا میں تم سے جو بھی ڈسکس کروں اس کا ذکر تم شرمین سے مت کرنا۔“ منزہ نے بات شروع کرنے سے پہلے اسے ہدایت دی۔

”ایسی کیا بات ہے ممی۔“ وہ کچھ اور الجھی۔

”شرمین بھی اس مسئلے کی سنجیدگی کو نہیں سمجھے گی۔ وہ ایک سمجھدار عورت نہیں ہے۔ بے وقوف ہے، جذباتی ہے۔ اس نے خود ہمیشہ غلط فیصلے کیے ہیں اور میں جانتی ہوں وہ تمہیں کبھی صحیح طریقے سے گائیڈ نہیں کر سکتی۔ وہ تمہیں بھی ہمیشہ غلط فیصلہ کرنے ہی کا مشورہ دے گی۔“ منزہ کی یہ ساری تنقید شہر بانو کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی منزہ اور شرمین ایک دوسرے کو شدید ناپسند کرتی تھیں اور یہ ناپسندیدگی منزہ کی طرف سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے بھائی کی موت کا ذمے دار کھلے لفظوں میں شرمین کو کہتی تھی لیکن بہرحال وہ یہ بات شہر بانو کے سامنے نہیں کہتی تھی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ بات شہر بانو کے سامنے کہہ بھی دے تو بھی شہر بانو کو برا نہیں لگے گا کیونکہ ایک بہت طویل عرصہ وہ بھی منزہ ہی کی طرح شرمین کو اپنے باپ کی موت کا ذمے دار سمجھتی رہی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ منزہ کی شرمین پر کی جانے والی تنقید کا اس نے کبھی برا نہیں منایا تھا۔ منزہ خود اسے بے حد عزیز رکھتی تھی۔ وہ بچپن میں بھی اپنے بھائی کی اکلوتی اولاد سے بہت پیار کرتی تھی اور شرمین کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد بھی اس نے شرمین سے بہت دفعہ رابطہ کر کے شہر بانو سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ شرمین نے ہمیشہ ان کی ان کوششوں کا بہت حوصلہ شکن جواب دیا تھا۔ آہستہ آہستہ منزہ نے بھی یہ کوشش ختم کر دی تھی۔

”ممی آپ بتائیں کیا بات ہے؟“ شہر بانو نے فی الحال شرمین پر ہونے والی تنقید میں دلچسپی لینے کے بجائے پوچھا تھا۔

''شہباز پر اس کے ایک پرانے کک نے کچھ الزامات لگا کر کئی سال پہلے اس کی سرکاری نوکری سے برطرفی کے فیصلے کو کورٹ کے ذریعے چیلنج کیا ہے۔'' منزہ نے بالآخر اسے مختصر لفظوں میں بتایا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا..... پاپا پر اب کوئی کیس کیسے کرسکتا ہے؟'' منزہ کی بات شہر بانو کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔

''تم عکس مراد علی کو جانتی ہو؟'' منزہ کے اگلے سوال نے شہر بانو کو کچھ اور بھی حیران کیا۔

''جی وہ شیر دل کی دوست اور کولیگ ہے۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''وہ اس کک کی نواسی ہے۔'' شہر بانو کو ایک لمحے کے لیے کچھ سمجھ نہیں آیا۔

''ممی مجھے یہ equation سمجھ میں نہیں آئی۔ کون کک، کیسے الزامات؟ اور اس میں پاپا یا عکس کا کیا کنکشن ہے؟'' اس نے کچھ الجھ کر منزہ سے کہا۔

''اس فیملی نے کبھی اس گھر میں شہباز اور تمہاری ممی کو serve کیا تھا۔ پھر خیر دین نے گھر میں چوریاں کرنی شروع کردیں اور شہباز نے اسے گھر سے نکال دیا۔ تمہاری ممی اس پر بہت خفا ہوگئیں کیونکہ خیر دین اس کا بڑا فیورٹ نوکر تھا اور خیر دین نے بھی شرمین کو الٹی سیدھی پٹیاں پڑھائیں..... شہباز پر بہت برے برے الزامات لگائے۔ اسی کے الزامات کی وجہ سے شرمین نے شہباز سے علیحدگی اختیار کی تھی اور اب اتنے سالوں کے بعد وہ پھر معصوم بن کر واپس آگیا ہے اپنی اس نواسی کو لے کر جو پہلے شیر دل سے شادی کے لیے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور جب وہ نہیں ہوا تو اب یہ نیا پینڈورا باکس لے کر آگئے ہیں وہ دونوں۔ میں چاہتی ہوں تم شیر دل سے بات کرو۔ اسے سمجھاؤ کہ وہ اس لڑکی کو اور اس کے نانا کو منع کرے اس کیس سے..... وہ اس کی دوست ہے اس کے لیے مشکل نہیں ہے اسے یہ بات سمجھانا..... میں نے ابھی بھی اس سے بات کی ہے سنگاپور..... لیکن وہ کہہ رہا ہے وہ عکس کو منع نہیں کرے گا۔ اسے اپنے ماموں، اپنے خاندان تمہارے باپ کی پروا نہیں ہے۔ اس لڑکی کی پروا ہے..... شہر بانو تم اس سے بات کرو گی تبھی کچھ ہوگا۔'' منزہ اس سے کہتی جارہی تھی یہ اندازہ لگائے بغیر کہ انہوں نے شہر بانو کے کانوں میں سیسہ انڈیلا تھا تھوڑی دیر پہلے..... وہ گنگ فون کا ریسیور کان سے لگائے بیٹھی رہی تھی۔

شہباز حسین..... شرمین..... الزامات..... علیحدگی..... عکس مراد علی..... شیر دل..... پتا نہیں ان میں سے کون سی بات نے اسے زیادہ کاٹا تھا..... کون سی بات آری تھی اور کون سی چھری..... لیکن شہر بانو کا گھر گرداب میں پھنس گیا تھا اور اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے چکراتے ہوئے سر کے ساتھ رات کے دو بجے شیر دل کے بیڈ روم کے دروازے کو بجانا شروع کیا تھا اور پھر وہ بے اختیار پاگلوں کی طرح بجاتی ہی چلی گئی تھی۔ اس نے اندر سے شیر دل کی خفگی میں کچھ کہنے کو بھی نہیں سنا تھا۔ شیر دل نے نائٹ سوٹ میں بہت بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا اور وہ عکس مراد علی کو دروازے پر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہورہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' شیر دل نے بے اختیار اس کا بازو پکڑا۔ وہ بچوں کی طرح اس سے لپٹ گئی تھی۔

''نانا..... نانا.....'' شیر دل نے ہچکیوں اور سسکیوں میں اس کی آواز سنی۔

(باقی آئندہ)

اس آئینے میں شہربانو نے عکس اور طغرل کی پشت دیکھی تھی...... پھر اپنا چہرہ...... گاڑی کے کھلے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس گھر میں یہ تیسری چیز تھی جس نے شہربانو کے دل پر ضرب لگائی تھی۔ اس آئینے میں اس نے پہلی بار اپنا جو عکس دیکھا تھا وہ جیسے بھنور کی طرح لوٹ کر اس کے پاس آیا تھا...... وہ پہلا عکس جس میں وہ تھی، مثال تھی اور شیر دل تھا...... ایک خاندان تھا۔ خوشی تھی، مستقبل تھا اور اب جو عکس ابھرا تھا اس میں صرف شکست خوردگی تھی اور ماضی ہی ماضی تھا...... مثال اب بھی ساتھ تھی۔ شیر دل ساتھ نہیں تھا۔

''زندگی ہمارے ساتھ یہ سب کیوں کرتی ہے؟'' اس نے عجیب سی تھکن کے ساتھ سوچا تھا۔

گاڑی پورچ میں رکتے ہی اس کے دروازہ کھولنے سے بھی پہلے اس نے عکس اور طغرل کو برآمدے سے نکل کر پورچ میں اپنے استقبال کے لیے بڑھتے دیکھا۔ دروازہ ڈرائیور نے کھولا تھا۔ گاڑی سے نکل کر اس نے پہلی نظر اس عورت پر ڈالی جس عورت سے زیادہ اس نے زندگی میں کسی عورت سے نفرت نہیں کی تھی۔ وہ ان دونوں مردوں کو اس کی زندگی سے نکال دینے کا باعث بنی تھی جن کے گرد شہربانو کی زندگی گھومتی تھی...... اس کی واحد حریف، واحد رقیب...... ایک عجیب سی جھجک اور خاموشی نے چند لمحوں کے لیے ان دونوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا...... لیکن صرف چند لمحوں کے لیے پھر عکس آگے بڑھ آئی تھی۔

شہربانو نے اس کی طرف مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ہمیشہ کی طرح محتاط انداز میں۔ عکس نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر گرم جوشی سے اس کو گلے لگایا تھا...... کیا ہزیمت تھی جو شہربانو نے محسوس کی تھی اور کیا ذلت تھی جو اسے اپنے اس حریف کے پاس لے آئی تھی جس کی وہ شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

''سفر ٹھیک سے گزرا؟'' اس ملائم آواز نے اس سے پوچھا تھا۔ کانٹوں پر کیا جانے والا سفر ٹھیک سے کیسے گزر سکتا تھا؟ شہربانو جواباً اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔

''ہاں۔'' اس نے اپنے جواب کو وہیں چھوڑتے ہوئے نظریں ملائے اور عکس کے چہرے کو دیکھے بغیر کہا۔ وہ اس سے الگ ہوگئی تھی۔ شہربانو نے جیسے عجیب سا سکون محسوس کیا۔ عکس مراد علی اب مثال کی طرف بڑھی تھی۔ شہربانو نے اس کے چہرے پر بھی وہی اضطراب اور الجھن دیکھی جو اس نے چند لمحے پہلے خود محسوس کی تھی۔ اس نے بے اختیار اس سے نظریں ہٹالیں۔ کیا عجیب حسد تھا جو اس نے اس عورت کو اپنی اولاد کی طرف بڑھتے دیکھ کر محسوس کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے وہ چلا کر اسے روک دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کو مت چھوئے...... جو شیر دل کے بعد اس کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔

''السلام علیکم۔'' طغرل کی آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا تھا، وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ شکست خوردگی اور حسد نے شہربانو کو چند لمحوں کے لیے کچھ عجیب سے انداز میں دیمک زدہ کیا تھا...... حسد، رنج، تکلیف، شکست...... بس اگر کچھ نہیں تھا جو شہربانو نے محسوس نہیں کیا تھا تو وہ پچھتاوا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی بیٹی کو مشفقانہ انداز میں لپٹائے چومتی ہوئی اس عورت نے شہربانو سے اس آئینے میں پہلی بار شہربانو کو دکھائی دینے والے خوش و خرم خاندان کے عکس کو اس سے چھین کر اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا...... اور وہ آج اس گھر میں ''اپنے خاندان'' کے ساتھ کھڑی تھی جہاں شہربانو اپنی زندگی کے چیتھڑے اور دھجیاں سمیٹے ''پناہ'' کے لیے آئی تھی...... بدترین دشمن کی چھت کے نیچے پناہ...... زندگی ہمارے ساتھ کیا کرتی ہے!

☆☆☆

زندگی میں پہلی بار شیر دل اسے روتے دیکھ رہا تھا...... بچوں کی طرح روتے ہوئے...... حواس باختہ، خوف زدہ، کسی انہونی سے دہشت زدہ، آنے والے کسی برے لمحے سے آسیب زدہ...... پتھر سے بھربھری مٹی بنتے ہوئے...... اور اتنے سالوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا۔ وہ اس عکس مراد علی سے پہلی بار متعارف ہوا تھا اور اسے خوشی نہیں ہوئی تھی عجیب تکلیف پہنچی تھی۔

خیر دین دل کے دورے کے بعد تشویشناک حالت میں ICU میں تھا۔ رات کے پچھلے پہر جگا کر دی جانے والی یہ

خبر عکس کو چڑیا بنا گئی تھی...... خیر دین اس کی زندگی کا محور تھا اور عکس کے لیے فوری طور پر یہ تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ اس کی زندگی کا وہ محور ختم ہو سکتا تھا۔ ختم ہو جاتا تو وہ کیا کرتی۔ اس کی زندگی میں خیر دین کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ شیر دل سے محبت تھی رشتہ نہیں تھا۔ جواد سے رشتہ تھا محبت نہیں تھی...... صرف خیر دین سے رشتہ اور محبت دونوں تھے۔ صرف وہ تھا جس نے اپنے وجود کو ہمیشہ اس کے لیے چھتری بنائے رکھا تھا اور اس چھتری کے بغیر کھڑے ہونے کا تصور بھی عکس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

''انکل ICU میں ہیں لیکن ٹھیک ہیں۔'' شیر دل نے بہت گول مول انداز میں اسے تسلی دی تھی۔ اس نے ابھی کچھ دیر پہلے پاکستان میں اپنے پی اے کے ذریعے ہاسپٹل کی management سے رابطہ کر کے بات کی تھی۔ خیر دین کی حالت نازک تھی۔ لیکن وہ زندہ تھا اور جب تک وہ زندہ تھا وہ عکس کو دلاسا دے سکتا تھا۔ وہ اس کے بیڈ روم میں پڑی کرسی پر بیٹھی اس کی فون کالز کے دوران بھی اسی طرح ہچکیوں اور سسکیوں سے روتی رہی تھی۔ پتا نہیں اسے یہ خوف کیوں تھا کہ اس سے جھوٹ بولا جا رہا تھا۔ وہ پاکستان جائے گی تو خیر دین اسے زندہ نہیں ملے گا۔ شیر دل کی فون کالز اور ہاسپٹل انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی اس کی بات چیت کے باوجود۔

''سیٹ کروا دوں تمہاری؟'' شیر دل نے اسے خیر دین کی حالت کے بارے میں بتانے کے بعد اس سے بڑی نرم آواز میں پوچھا۔ اس نے کچھ بھی کہنے کے بجائے اسی طرح سر جھکائے ٹشو سے اپنی سرخ ناک رگڑتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ اس کا ماؤف ذہن اب آہستہ آہستہ اس شاک سے باہر آ رہا تھا جو آدھی رات کو وہ فون کال سن کر اسے لگا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود انٹر کام فون کی بیل پر ہی جاگی تھی اور چند لمحوں کے لیے اسے لگا جیسے وہ wake up call کے لیے کیا جانے والا فون تھا جو ہر روز صبح پانچ بجے اسے دی جاتی تھی لیکن پھر کال ریسیو کرتے ہی اس ریذیڈنس کی reception پر نائٹ ڈیوٹی کرنے والے نے اس کو اس کال کے بارے میں انفارم کرتے ہوئے اس کے پی اے سے اس کا رابطہ کروایا تھا جس نے بے حد گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کسی تمہید کے بغیر اسے خیر دین کے بارے میں اطلاع دی تھی اور وہ چکرا گئی تھی۔ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا اس نے پی اے سے کیا پوچھا اور کیا کہا تھا۔ وہ بس شاک کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر شیر دل کے پاس آ گئی تھی جس کا کمرا اس کے کمرے سے تین کمروں کے فاصلے پر تھا۔ اس تکلیف اور سراسیمگی میں بھی اسے شیر دل ہی کا خیال کیوں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے لیے کیا کرے گا؟ کیا کر سکتا تھا؟

ہم زندگی میں ہمیشہ بہادر رہ تو سکتے ہیں دکھ نہیں سکتے...... آزمائشیں ہمیں توڑتی ہیں...... بار بار...... حوصلہ ہمیں جوڑتا ہے...... بار بار...... لیکن شکست و ریخت کا یہ عمل چھپائے رکھنے کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی کسی ''اپنے'' کے سامنے ہمیں موم کا کر دیتا ہے۔ عکس مراد علی کی زندگی میں وہ ''اپنا'' بس ایک ہی شخص تھا...... ایک شیر دل...... اعتراف، اظہار اور اعلان کے بغیر بھی۔

دس گھنٹوں کے بعد ایک غیر ملکی ائر لائن کی indirect flight میں اس کو سیٹ مل گئی تھی۔ اس سیٹ کے لیے شیر دل نے کیا پاپڑ بیلے تھے اسے اندازہ تھا۔ یہ کام اس کے ہاتھ میں ہوتا تو کبھی نہیں ہو سکتا تھا مگر شیر دل کے لیے یہ مشکل تھا ناممکن نہیں۔

''پاکستان میں تمہارے اور کون سے relatives ہیں جن کو انفارم کرنا ضروری ہے تاکہ وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے تمہارے نانا کے پاس ہوں۔'' شیر دل نے اس کی امی کو کال کر کے اطلاع دینے سے پہلے اس سے پوچھا تھا۔

''کوئی بھی نہیں ہے۔'' اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ حیران ہوا۔

''کوئی بھی نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے تمہارے ماموں چچا وغیرہ۔'' اسے شاید یقین نہیں آیا تھا کہ ''کسی'' کا ''کوئی'' بھی نہیں ہو سکتا۔

''میری امی اکلوتی اولاد ہیں میرے نانا کی۔ کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ نانا کے کچھ رشتے دار گاؤں میں ہیں لیکن میں انہیں انفارم کرنا نہیں چاہتی فی الحال...... بس کافی ہے کہ امی کویت سے آجائیں۔'' وہ تھکی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

شیر دل اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اپنے نانا کے بہت قریب تھی اس کا اندازہ اسے اتنے سالوں میں اس کے چڑیا ہونے کی اصلیت نہ پتا ہونے کے باوجود تھا لیکن یہ اندازہ اسے کبھی نہیں تھا کہ وہ اپنے اردگرد خونی رشتوں کے قحط کا بھی شکار تھی اور شاید نانا سے اس کی اتنی closeness کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

''کسی نہ کسی کو تو ہاسپٹل ہونا چاہیے تمہاری فیملی میں سے...... تمہارے پاکستان پہنچتے ہوئے بھی ایک دن گزر جائے گا...... تمہاری امی سے بات نہیں ہوئی ابھی...... ہو سکتا ہے وہ جلدی ٹکٹ کا انتظام کر کے واپس آ سکیں لیکن بہت جلدی بھی ہو تو بھی دس بارہ گھنٹے سے پہلے نہیں ہو سکتا یہ۔'' شیر دل جیسے اس سے بات کرتے ہوئے اپنے ذہن میں ان تمام ممکنہ طریقوں کو بھی consider رہا تھا جن کے ذریعے وہ اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا اور اس کا ذہن جس حل پر آ کے رکا تھا وہ اسے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا لیکن چاہتے ہوئے بھی جھٹک نہیں سکا۔

''جواد کو انفارم کر دو...... وہ وہاں آ جائے تو بہتر ہے۔'' شیر دل نے اپنے فون پر عکس کی والدہ کا نمبر ملاتے ہوئے کہا اور وہ پہلا موقع تھا جب عکس کو جواد یاد آیا۔ وہ کئی دنوں سے رابطے میں نہیں تھے۔ اس واقعے کے بعد ایک عجیب سی خلیج آ گئی تھی ان کے رشتے میں۔

''زندگی میں کبھی بھی جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔'' خیر دین نے جواد کے خلاف بننے والے پولیس کیس کے بارے میں جاننے پر اس سے کہا تھا جب وہ شدید غصے اور رنجیدگی میں اس رشتے کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔

''اس معاملے کو ختم ہونے دو...... جواد کی بات سنو کہ وہ اس معاملے کے بارے میں کیا کہتا ہے اور پھر کوئی فیصلہ کرو۔'' خیر دین نے اپنی مایوسی اور پریشانی کو چھپاتے ہوئے اس کی رنجیدگی اور اضطراب کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کی تکلیف اور مایوسی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ شادی سے چند ہفتے پہلے ہونے والے اس واقعے نے اسے شدید ذہنی اذیت تو پہنچائی ہی تھی لیکن جواد پر اس کے اعتماد کو بری طرح ٹھیس بھی پہنچائی تھی۔

''وہ کیا کہے گا نانا......؟ سچ تو کبھی نہیں بولے گا...... کوئی نہ کوئی بہانہ کوئی نہ کوئی جھوٹ ہی بولے گا اس ساری سچویشن کی وضاحت کے لیے۔''

''پھر بھی موقع دو اسے وضاحت دینے کے لیے۔ جھوٹ بولے تو بھی سنو۔'' وہ عجیب سی تکلیف میں ہنس پڑی تھی۔

''جھوٹ بولے تو بھی سنو...... عجیب logic ہے نانا۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ خیر دین کو عجیب تکلیف ہوئی تھی اس کی بات پر...... وہ ڈھائی سال سے جواد سے مل رہی تھی...... اس کے لیے پسندیدگی رکھتی تھی۔ جواد نے جب اسے پروپوز کیا تھا تو عکس نے امریکا سے فون کر کے اسے بڑی خوشی کے عالم میں بتایا تھا۔ وہ جواد کو اس کے دوست کی حیثیت سے جانتا تھا۔ امریکا جانے کے بعد سے مسلسل اس نے اس کا ذکر سنتا آ رہا تھا لیکن اس نئی حیثیت سے وہ اس سے پہلی بار متعارف ہوا تھا۔ جواد کی فیملی اس کی عدم موجودگی میں ہی خیر دین اور حلیمہ سے اس کے رشتے کے حوالے سے ملنے آئی تھی۔ ان کی سماجی حیثیت خیر دین کے خاندان سے کہیں بہتر تھی اور خیر دین کو خوشی ہوئی تھی کہ وہ ایک اچھے خاندان کا حصہ بنے گی لیکن اس نے عکس کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کی گفتگو میں ان کے اپنے خاندان کے لیے بہت تکبر تھا...... وہ تکبر خیر دین کو ہر بار دکھتا اور چبھتا تھا۔ وہ عکس کے ریفرنس سے نہ آئے ہوتے تو خیر دین پہلی ملاقات کے بعد ہی ان سے معذرت کر لیتا لیکن وہ عکس کے حوالے سے آئے تھے جس کی جواد کے بارے میں رائے بہت اچھی تھی۔

''ابا اب وہ اتنے بڑے خاندان سے ہیں تو تھوڑا بہت تو غرور ہوتا ہی ہے انسان کو اپنے خاندان پر۔ اب اگر ہم ہر رشتے کو اتنی باریک بینی سے دیکھ دیکھ کر چھان پھٹک کرنے لگے تو پھر تو کہاں کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملے گا...... ویسے بھی شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے اس کی...... آپ کو تو فکر ہی نہیں ہے۔'' حلیمہ نے خیر دین کے اعتراضات پر اس سے کہا تھا۔

''اگر ایسی بری فطرت کے لوگ ہوتے تو اپنے بیٹے کے کہنے پر بھی ہمارے جیسے خاندان میں رشتے کی بات کرنے نہ آتے۔'' حلیمہ بالکل مطمئن تھی بلکہ بے حد خوش تھی عکس کے لیے ایسے خاندان سے رشتہ آنے پر۔ اس سے پہلے اس کے لیے جتنے بھی رشتے آتے رہے تھے ان میں سے کوئی بھی اتنے بڑے خاندان سے نہیں تھا۔ حلیمہ ایک عام ماں تھی جس کے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ اس کی بیٹی اتنی لائق تھی لیکن اب اس کے لیے زیادہ مسرت کی بات یہ تھی کہ ایک اتنا بڑا خاندان اس

کی بیٹی کو اپنا حصہ بنانا چاہتا تھا۔

خیر دین نے حلیمہ سے بحث یا سوال جواب نہیں کیے تھے۔ حلیمہ سے اس مسئلے پر بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اس مسئلے کو بھی عکس سے ہی ڈسکس کرنا چاہتا تھا اور اس نے یہی کیا تھا۔ کوئی حتمی فیصلہ اس نے جواد سے ملاقات ہونے تک کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

جواد سے پہلی ملاقات میں وہ خیر دین کو اچھا لگا تھا۔ عکس اس کی جس شائستگی اور تہذیب کی بات کرتی تھی وہ خیر دین کو بھی دکھی تھی۔ وہ کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ کافی تھا کہ عکس کی جواد کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ باقی چیزیں اس کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھیں۔

''شیر دل کیا کہتا ہے جواد کے بارے میں؟'' خیر دین نے جواد سے ہونے والی پہلی ملاقات کے بعد عکس سے پوچھا تھا۔ وہ اس سوال پر حیران نہیں ہوئی تھی۔ خیر دین کو شیر دل کی رائے پر ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا اور اس اعتماد کی وجہ پچھلے سالوں میں ان تمام مردوں کے حوالے سے دیا جانے والا اس کا بے حد درست اور انتہائی خطرناک بیک گراؤنڈ چیک تھا جس نے ہر بار عکس اور خیر دین کو کسی شرمندگی سے دوچار ہونے والی صورت حال سے بچایا تھا۔

''شیر دل ابھی نہیں ملا اس سے؟'' خیر دین نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ خیر دین سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ دونوں پچھلے کچھ عرصے سے رابطے میں نہیں تھے اور اس کی وجہ شیر دل کا غنی حمید کے حوالے سے کیا جانے والا وہ سوشل ورک تھا جس کی وجہ سے وہ غنی حمید کے اپنے آپ میں بے حد انٹرسٹڈ ہونے کے باوجود اس کے ساتھ چاہتے ہوئے بھی دوستی کے علاوہ کوئی اور رشتہ نہیں بنا سکی تھی اور خیر دین ایک بار پھر شیر دل سے اسی سوشل ورک کا خواہش مند تھا۔

''تم غنی حمید کو چھوڑ نہیں سکتیں؟'' اکیڈمی میں STP کی ٹریننگ کے دوران دوستی ہو جانے کے بعد یہ شیر دل کی طرف سے آنے والا پہلا مطالبہ تھا۔

''نہیں۔'' عکس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ جس رفتار سے گیند serve کر کے اس کے کورٹ میں پھینکی گئی تھی۔ اسی رفتار سے اسے return کر کے واپس شیر دل کے کورٹ میں پھینک دی گئی تھی۔

''کیوں؟'' شیر دل نے تڑاک سے پوچھا۔

''کیوں چھوڑوں؟'' کھٹاک سے جواب آیا۔

وہ اس وقت ٹریننگ کے دوران ہونے والی ملٹری attachment کے دوران ویک اینڈ پر اس سے ملنے آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں دو قریبی کنٹونمنٹس میں ہی attached تھے اور شیر دل اس ویک اینڈ پر اسے وہاں سے لاہور لے جانے کے لیے اپنی دو دن پہلے ملنے والی نئی ہونڈا اکارڈ پر پک کرنے آیا تھا اور لاہور جاتے ہوئے شام کے وقت ان کے درمیان غنی حمید کے حوالے سے بحث چھڑ گئی تھی۔

''وہ پکا womanizer ہے۔'' شیر دل نے اس سے کہا۔ GT road پر سیدھا جانے کے بجائے اس نے ہمیشہ کی طرح ایک نئی بائی روڈ پر ٹرن لے لیا۔ عکس نے اس کی بات سنتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنی بائیں کلائی میں پہنی ہوئی اسپورٹس واچ میں سمت چیک کی۔ وہ جہاں سے چلے تھے وہ شمال تھا اور انہیں جہاں جانا تھا وہ مغرب تھا اور ایک شیر دل نے جو حالیہ موڑ مڑا تھا وہ مشرق کی سمت میں تھا تو لاہور جاتے ہوئے وہ سیدھا شمال سے مغرب کی طرف جانے کے بجائے شمال سے مشرق، مشرق سے جنوب اور جنوب سے پھر مغرب تک پہنچتے..... سورج ان سے پہلے مغرب میں پہنچ جایا کرتا تھا کیونکہ وہ عکس مراد علی کو کسی گاڑی میں بٹھا کر اس کی منزل پر پہنچانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوتا تھا۔ وہ اب اس سفر میں ہونے والے ممکنہ اضافی کلومیٹرز کو منٹوں میں calculate کر کے ممکنہ وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش میں مصروف تھی جو انہیں لاہور پہنچنے میں لگنا تھا۔ اس نے شیر دل کے ساتھ ویک اینڈ پر لاہور تک ملنے والی ''لفٹ'' کے دوران roads، routes، directions کے بارے میں جتنا کچھ سیکھا تھا وہ ملٹری attachment کے دوران سارا دن کنٹونمنٹ میں ملٹری maps پڑھ پڑھ کر نہیں سیکھا تھا۔ شیر دل جیسے اس علاقے کے تمام roads اور routes کے بارے میں اسے عملی معلومات دینے کا ذریعہ بنا ہوا تھا..... اور ہمیشہ کی طرح اس بات سے لاعلم تھا کہ وہ اسے اس بار کس طرح serve کر رہا تھا۔

''تو.....؟'' عکس نے اندازہ لگایا کہ وہ اب رات نو بج کر چالیس منٹ کے قریب لاہور کی بیرونی حدود کے قریب ہوں گے..... اگر اس سے پہلے کوئی اور turn نہ لے لیا گیا۔

''تو؟'' شیر دل کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں تو؟''

''تمہیں اپنے دوست کے کرتوتوں کے بارے میں جان کر کوئی فرق نہیں پڑتا؟'' شیر دل نے جیسے بے یقینی سے کہا۔

''نہیں۔'' عکس نے بے حد اطمینان سے کہا۔ ''وہ میری بہت عزت کرتا ہے اور میرے لیے یہ کافی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں کیا کرتا ہے وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔''

''وہ ابھی تمہیں trap کرنے کے لیے جال بچھا رہا ہے۔'' شیر دل نے استہزائیہ انداز میں ہنس کر کہا۔

''جال میں جانور اور مچھلیاں آتے ہیں میں انسان ہوں۔'' عکس نے اتنے ہی اطمینان سے جواب دیا۔ وہ شیر دل کی جھلاہٹ سے مکمل طور پر محظوظ ہو رہی تھی۔

''وہ کسی عورت کی عزت کرنے والا مرد نہیں ہے۔'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''پھر مجھے اور بھی خوش ہونا چاہیے کیونکہ شاید وہ مجھے ''مرد'' سمجھ کر عزت اور پروٹوکول دیتا ہے..... برابر کا درجہ...... Good۔'' شیر دل اس کی حسِ مزاح سے محظوظ نہیں ہوا تھا۔ اس کو چند منٹ چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''تمہیں وہ کیوں پسند ہے؟''

''بہت ساری وجوہات ہیں تم کتنی سننا چاہتے ہو؟'' عکس نے اس بار بھی اسی انداز میں کہا۔ شیر دل تپا تھا۔

''تم ریسرچ کرنا اس پر..... مجھے دلچسپی نہیں ہے کچھ بھی سننے میں۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔'' عکس نے بے حد پُرسکون انداز میں اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ شیر دل کچھ دیر خفگی کے عالم میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک بار پھر بات کا آغاز کیا۔

''وہ میرے بارے میں بہت کچھ کہتا ہوگا تم سے؟''

''نہیں۔''

''I don't believe it۔''

''یقین نہ کرنا یا کرنا تمہاری مرضی ہے لیکن وہ واقعی تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔'' عکس اب سنجیدہ ہو گئی تھی۔ وہ غنی حمید کے لیے شیر دل کی ناپسندیدگی کا بیک گراؤنڈ کسی نہ کسی حد تک جانتی تھی اور وہ غنی حمید کے اس ایشو کے بارے میں بات نہ کرنے کے باوجود یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بھی شیر دل کے بارے میں کم و بیش شیر دل والے ہی جذبات رکھتا تھا۔

''اس نے تمہیں منع نہیں کیا کہ تم مجھ سے دوستی نہ کرو۔''

''نہیں۔''

''میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس کو کوئی اعتراض نہ ہوا ہو۔'' شیر دل نے سر جھٹکا۔

''اس کو اگر کوئی اعتراض ہوتا بھی تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی..... میں اس سے بھی یہی سب کچھ کہہ رہی ہوتی جو تم سے کہہ رہی ہوں۔ لیکن خوش قسمتی سے غنی نے کبھی تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی..... اچھی یا بری کوئی بات بھی۔'' عکس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''اس کے باوجود میں اس کے بارے میں سب کچھ کہتا رہا ہوں گا۔'' شیر دل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ضرور۔'' عکس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''اگر تمہارے پاس نان ایشوز پر بات کرنے کے لیے وقت ہے تو

ضرور کیا کرو اس کے بارے میں بات۔'' شیر دل بے اختیار مسکرایا۔

''تو غنی ایک نان ایشو ہے؟'' اسے ایک عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہوئی تھی جس کو ختم کرنے میں عکس نے دیر نہیں لگائی تھی۔

''میرے اور تمہارے درمیان غنی ایک نان ایشو ہے۔ وہ میرا دوست ہے ہمیشہ دوست ہی رہے گا...... تم اسے دشمن سمجھتے ہو...... That's ok with me۔'' شیر دل نے کچھ خفا سے انداز میں اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''وہ تمہیں بھی اسکینڈلائز کرے گا تم یاد رکھنا۔''

''شیر دل میں اسے ڈیڑھ سال سے جانتی ہوں، مجھے اس سے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ ہم عورت اور مرد بن کے نہیں ملتے، تم پریشان مت ہو میرے بارے میں۔'' اس نے شیر دل کو عجیب تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ اس کا خیال تھا شیر دل دوبارہ غنی حمید کے حوالے سے اس سے بات نہیں کرے گا لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ شیر دل نے غنی حمید کے حوالے سے اس سے بحث کرنا نہیں چھوڑی تھی اور عکس نے اس کے ساتھ اپنی بڑھتی ہوئی دوستی اور قربت کے باوجود غنی حمید کو نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا خیال تھا شیر دل، غنی کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ وہی کر سکتا تھا جو وہ ہمیشہ کرتا رہا تھا...... اس کی برین واشنگ کی کوشش...... یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی غنی اور اس کی دوستی کو کسی رشتے میں بدلنے سے روکنے کے لیے اس سے رابطہ بھی کر سکتا تھا...... شیر دل کے ساتھ وہ اس کا پہلا بڑا جھگڑا تھا جو شیر دل کی غنی کو کی جانے والی اس کال کے بعد ہوا تھا جو اس نے عکس کے یہ بات شیئر کرنے کے بعد کی تھی کہ غنی اس میں انٹرسٹڈ تھا اور اس نے عکس کو پروپوز کیا تھا۔

''شیر دل اس سے مل لیتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔'' خیر دین نے اس کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ عکس نے ایک گہری سانس لے کر خیر دین کو دیکھا۔ وہ شیر دل کے لیے خیر دین کی شدید پسندیدگی سے واقف تھی لیکن وہ اس بات سے بھی واقف نہیں تھی کہ خیر دین بھی شیر دل کے لیے اس کے دلی جذبات سے واقف تھا۔

''نانا اگر شیر دل سے مشورہ ہوتا رہا تو میری شادی کبھی نہیں ہوگی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

''اس نے ہمیشہ صحیح مشورہ دیا ہے تمہیں...... ہمیشہ نقصان سے بچاتا رہا ہے وہ تمہیں...... پھر تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' خیر دین اس کی بات پر حیران ہوا تھا۔ وہ جواباً خاموش ہوگئی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ خیر دین سے وجوہات کو کیا ڈسکس کرتی۔

خیر دین نے اس سے اصرار نہیں کیا تھا۔ جواد کے ساتھ اس کا رشتہ شیر دل کے ''مشورے'' سے بچ گیا تھا لیکن شراب والے واقعے میں پکڑے جانے کے بعد عکس اور خیر دین کے لیے اگلا دن بڑا تکلیف دہ تھا۔ دونوں اپنے تمام خدشات آنکھیں چراتے ہوئے جواد کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس کی بات کو سچ نظر آتے ہوئے بھی نہ ماننے کی کوشش کر رہے تھے۔

عکس کے لیے اگر کچھ مکمل طور پر ناقابلِ قبول تھا تو وہ شراب نوشی تھی۔ امریکا میں دو سال جواد کے ساتھ رہتے ہوئے اسے کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ شراب پیتا ہے...... یا پی سکتا ہے۔ اس نے چند بار اس سے اس حوالے سے بات بھی کی تھی اور ہر بار جواد اتنے صاف لفظوں میں شراب کے لیے اپنی ناپسندیدگی جتاتا رہا کہ عکس کے لیے اب یہ ماننا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ اس بارے میں اس سے جھوٹ بولتا رہا اور وہ ہمیشہ سے شراب پیتا رہا تھا...... یا پھر وہ جواد کو یہ مارجن دیتی کہ وہ عادی شراب نوش نہیں تھا پہلی بار ہی شراب پیتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔

جواد نے عکس کی نظروں میں اپنے آپ کو مزید اس وقت گرا لیا تھا جب اس نے اس کے آفس میں آکر اس سے تلخ کلامی کی تھی۔ عکس کے لیے اس کی شراب نوشی جتنی ناقابلِ یقین تھی اس کا یہ رویّہ اس سے زیادہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے جواد کو کبھی ایک جاہل مرد نہیں سمجھا تھا۔ اس کے لیے یہ ماننا مشکل تھا کہ کوئی ہارورڈ سے پڑھنے والا کسی ذاتی نوعیت کے جھگڑے کو آفس تک لے جا کر وہاں شور مچانے کی کوشش کرے گا۔ جواد کے بارے میں یہ دوسرا خطرے کا الارم تھا جو اس کے لیے بجا تھا۔

اور خیر دین سے یہ معاملہ ڈسکس کرنے میں وہ متامل تھی۔ اس نے صبح خیر دین کی پریشانی رات والے اسکینڈل کی وجہ سے دیکھی تھی اور اب شام کو وہ اس کے سامنے جواد کے خلاف ایک نیا کیس رکھ دیتی۔ جواد کی شخصیت کی یہ تہیں کھلنے پر وہ جہاں رنجیدہ تھی وہاں اسے بے حد ندامت بھی تھی۔ جواد اس کا انتخاب تھا اور اس کا انتخاب انتہائی ناقص نکل رہا تھا۔

خیر دین سے بہت دیر یہ بات چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ کیونکہ عکس کے لیے ہی یہ بہت مشکل ہو گیا تھا کہ وہ اس mess میں ہوتے ہوئے خیر دین سے اس کا ذکر نہ کرے۔

''میں نے تمہیں بڑی محنت سے پالا ہے چڑیا اور میں نے یہ محنت اس لیے نہیں کی کہ کوئی دوسرا آکے اسے ضائع کرے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں ساتھ دینے والا عزت دینے والا جیون ساتھی ملے صرف شوہر نہیں۔'' خیر دین نے ایک بار پھر جیسے اس کے کندھوں سے بوجھ ہٹا لیا تھا۔ اس رشتے سے نکل جانے کا آپشن اس کے سامنے رکھ دیا تھا جس سے نکلنا اسے بہت اعتبار سے مشکل لگ رہا تھا۔

''اللہ پر توکل بڑی شے ہے اور اللہ کے پاس خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ جو ہمیں کامل لگتا ہے اللہ کے پاس اس سے بھی اچھی اور عمدہ شے ہوتی ہے۔'' عکس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے وہ جانتی تھی اس کا نانا اس کے درد اور مشکل سے واقف تھا...... یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا اس کے ساتھ کہ دل پسند شے چھوڑنی پڑ رہی تھی۔ پہلے ایک سلطان پھر غنی حمید اور اب جواد ملہی...... عکس جانتی تھی خیر دین کی گنتی میں ایک شیر دل نہیں تھا...... اس کی گنتی میں وہ سب سے پہلے نمبر پر تھا۔

''مجھے لگتا ہے نانا میرے ہاتھ میں شادی کی لائن نہیں ہے...... نہ شادی کی نہ اچھے ساتھی کی...... میرے نصیب کا یہ ایک خانہ خالی ہے...... میں خوامخواہ وقت ضائع کرتی ہوں relationships بنانے میں۔'' اس کے لہجے میں ایسی مایوسی خیر دین نے سالوں بعد دیکھی تھی اور وہ کٹ گیا تھا۔

''ناامیدی گناہ ہے چڑیا۔''

''ناامیدی کی بات نہیں ہے نانا...... بعض چیزیں حقائق ہوتی ہیں۔ ان سے نظریں چرانا بے وقوفی ہوتی ہے۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا تھا۔

''انسان کو اپنی تقدیر کے بارے میں اندازے نہیں لگانے چاہئیں۔ یہ حساب کا سوال نہیں ہے چڑیا...... ایمان کا حصہ ہے، رب پر ہی چھوڑ دینا چاہیے اسے۔'' خیر دین نے اسے سمجھایا تھا۔ ''تم بہت اچھی لڑکی ہو...... اللہ نے کتنی نعمتوں سے دامن بھرا ہے تمہارا...... اور اللہ کے پاس کوئی کمی نہیں ہوگئی نعمتوں کی۔'' عکس قائل ہوئی یا نہیں اس نے بحث نہیں کی تھی۔ خیر دین کو اپنے دکھتے ہوئے وجود کو سہلانے اور ان پر پھاہے رکھنے دیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں باقی کی زندگی میں تمہیں وہ ساتھی ملے جو تمہاری عزت کو اپنی عزت سمجھے...... تم کو قیمتی اثاثہ سمجھ کر سنبھالتا پھرے...... میں اپنی چڑیا کو کسی کے سر کا تاج دیکھنا چاہتا ہوں پاؤں کی جوتی نہیں۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنس دی۔ خیر دین اسے دن میں خواب دکھا رہا تھا۔ ہمیشہ ہی دکھاتا آیا تھا...... وہ انہیں خیالی پلاؤ سمجھ سکتی تھی زبان سے کہہ نہیں سکتی تھی۔

جواد ملہی سے رشتہ رکھنے نہ رکھنے کا فیصلہ وہ سنگاپور سے واپسی پر کرنا چاہتی تھی۔ وہ جواد اور اپنے آپ دونوں کو وقت دے رہی تھی۔ ایک بڑا فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کے لیے...... جواد کا رویّہ ویسے بھی اس واقعے کے بعد ضرورت سے کچھ زیادہ اچھا اور محتاط ہو گیا تھا۔

''تم جواد کو فون کرلو۔'' شیر دل نے عکس کی حلیمہ سے بات کروانے کے بعد اسے مشورہ دیا تھا۔

''امی کہہ رہی ہیں وہ انکل کی فیملی میں سے کسی کو نانا کے پاس بھجوا دیں گی جب تک ان کی ٹکٹس کا نہیں ہو جاتا۔'' عکس نے فون اسے واپس دیتے ہوئے اپنے سوتیلے والد کے حوالے سے کہا۔

''تم پھر بھی جواد کو انفارم کرو۔'' شیر دل نے فون واپس لیے بغیر اصرار کیا۔ وہ کچھ دیر متامل رہی پھر اس نے کال ملانی شروع کردی۔ شیر دل کال ملتے ہی اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ عکس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے بھی اندازہ نہیں تھا جواد سے اس کی گفتگو کس نوعیت کی ہوسکتی تھی۔

جواد کے لیے عکس کی کال غیر متوقع تھی۔ اگرچہ سنگاپور جانے سے پہلے دونوں کی آپس میں بات ہوئی تھی اور وہ اسے سی آف کرنے کے لیے بھی آنا چاہتا تھا لیکن عکس نے کوئی بہانہ بنا دیا تھا۔ وہ جواد کے حوالے سے جو فیصلہ کرنا چاہتی تھی اس کے بعد وہ جواد کے ساتھ کوئی ایسا وقت نہیں گزارنا چاہتی تھی جو اسے کمزور کر دیتا لیکن خیر دین کی اچانک آنے والی بیماری نے وقتی طور پر اسے عجیب طرح سے کمزور کر دیا تھا۔ جواد سے بات کرتے ہوئے اسے اندازہ ہوا خیر دین کے بعد جواد کے بھی نہ ہونے سے وہ بالکل تن تنہا ہو جانے والی تھی اور کچھ دیر کے لیے اس سوچ نے بھی اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ جواد اسے تسلیاں دیتا رہا اور وہ روتی رہی۔ وہ شیر دل نہیں تھا جس کے لفظوں اور آواز میں اس کے لیے جادو بوٹی جیسی تاثیر اور مسیحائی ہوتی لیکن پھر بھی دو سراہٹ کا ایک عجیب احساس ہو رہا تھا اسے جو اس کی ہمت بندھا رہا تھا۔

شیر دل جب کمرے میں واپس آیا تو وہ فون بند کر چکی تھی اور اب اپنے دوبارہ آنسوؤں سے بھیگ جانے والے چہرے کو خشک کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بات ہو گئی؟'' وہ اس سے بہت فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''ہاں...... وہ نانا کے پاس جا رہا ہے۔'' عکس نے فون سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں نے تمہیں کافی پریشان کیا۔'' اس کو اب پہلی بار رات کے وقت کا اور شیر دل کی خواری کا احساس ہوا...... صبح اب قریب تھی اور وہ اتنے گھنٹوں سے ایک کے بعد ایک فون کرتا اور سنتا رہا تھا۔

شیر دل بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''وہ تو تم کئی سالوں سے کر رہی ہو۔'' اس نے جواباً دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھا کر اس نے عکس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ اپنے پاس رکھو۔ تمہیں ضرورت پڑے گی اس کی پاکستان رابطہ کرنے کے لیے۔''

وہ جھجکی۔ ''تم کیا کرو گے فون کے بغیر؟''

''اتنا لمبا کورس نہیں ہے میرا گزارہ ہو سکتا ہے۔ ضروری ہوا تو لے لوں گا یہاں سے کوئی فون۔'' اس نے عکس سے کہا۔

سہ پہر کو وہ ابھی اپنا سامان سمیٹ کر فارغ ہوئی تھی جب شیر دل آ گیا تھا۔ ''تم کیوں آئے ہو...... ابھی تو کلاس چل رہی ہو گی۔'' عکس نے اس سے کہا۔

''تمہیں سی آف کرنا تھا میں نے۔''

''میں چلی جاتی ٹیکسی لے کر۔''

''تم سوئی نہیں؟'' شیر دل نے بات بدلتے ہوئے اس کی سرخ اور متورم آنکھیں دیکھ کر کہا۔

''نیند نہیں آئی۔'' اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

''کچھ کھایا ہے؟''

''شیر دل تم واپس جاؤ...... اپنا کورس خراب مت کرو میرے لیے...... کوئی نیگیٹو ریمارکس چلے گئے تمہاری رپورٹ میں تو تمہارے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔'' عکس کو اس حالت میں بھی تشویش ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوتا۔'' اس کے بیگز اٹھاتے ہوئے اس نے بے پروائی سے کہا تھا۔

فلائٹ دو گھنٹے لیٹ تھی اور عکس کی فرسٹریشن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ شیر دل نے اسے زبردستی کھانا کھلایا تھا۔ وہ اندر جانے کے بجائے باہر وقت گزارنے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے عکس کو نیند آنے لگی تھی۔ وہ اس کا ذہن بٹانے کے لیے اسے دن میں اٹینڈ کی ہوئی کلاسز میں لیکچرز کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

''تمہیں نیند آ رہی ہے تو تم سو جاؤ۔'' شیر دل نے اس کی بند ہوتی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ عکس نے بینچ کی پشت سے سر ٹکا کر نیم دراز ہوتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''تم ٹائم کا خیال رکھنا اور گھڑی دیکھتے رہنا۔'' آنکھیں بند کرنے سے پہلے وہ اسے ہدایت دینا نہیں بھولی تھی۔ وہ فلائٹ مس کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''Don't worry'' شیر دل نے اسے تسلی دی۔ وہ اب اس کا پہرا دینے لگا تھا۔ وہ اس کے بے حد قریب تھی۔ زندگی میں اگر وہ کبھی کسی رشتے کو صرف محبت کی کیٹیگری میں بھی نہیں رکھ پایا تھا تو وہ اس عورت کے ساتھ رشتہ تھا...... اس کا دل اس کے وجود کے ساتھ تعلق کے کن کن دھاگوں سے بندھا ہوا تھا وہ کبھی بیٹھ کر گن نہیں پایا۔ گنتا تو دھاگے الجھ جاتے اور مشکل اسی کو ہوتی۔

نیند کے جھونکے میں وہ اس کی طرف جھکی۔ شیر دل اس کے قریب ہو گیا اس نے جیسے اس نے سر کو ٹکانے کے لیے سہارا دیا تھا۔ وہ نیند میں ہی کچھ اور اس کی طرف جھک آئی۔ شیر دل کو شہر بانو یاد آئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح سفر کرتے ہوئے اکثر سو جایا کرتی تھی۔ اس کے کندھے پر سر ٹکائے اس کے پیٹ کے گرد بازو حمائل کیے وہ کسی بچے کی طرح اس سے لپٹ کر سوتی تھی...... ملکیت کے احساس کے ساتھ تحفظ کے اعتماد کے ساتھ۔ وہ سارا راستہ اپنے laptop پر کام کرتا رہتا یا کوئی کتاب پڑھتا رہتا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کے جسم کی کسی حرکت سے شہر بانو کی نیند خراب نہ ہو۔ بعض دفعہ ایک ہی حالت میں کئی گھنٹے بیٹھے ہوئے اس کے جسم کا وہ حصہ بھی سن ہو جاتا تھا اور تب وہ بڑی احتیاط کے ساتھ شہر بانو کو خود سے الگ کرتے ہوئے جیسے کچھ دیر کے لیے خود کو آرام دینے کی کوشش کرتا اور شہر بانو تب بھی سوئی رہتی۔ وہ چند منٹ آرام کرنے کے بعد اسے پھر اپنے ساتھ لگا لیتا تھا اور وہ پھر اسی طرح نیند میں اس سے لپٹ کر سو جاتی...... شیر دل، شہر بانو کے ساتھ سفر کے دوران آج تک کبھی نہیں سو سکا تھا وہ سوتی جاگتی کیفیت میں رہتا لیکن کبھی آنکھیں بند نہیں کر پاتا تھا۔ عجیب لاشعوری انداز میں وہ جیسے شہر بانو کی حفاظت کر رہا ہوتا تھا۔ وہ نیند میں بھی بعض دفعہ اپنا سر اور ہاتھ پاؤں کہیں نہ کہیں مار لیتی تھی۔

عجیب بات تھی وہ شہر بانو کو دیکھتا تو اسے عکس یاد آتی اور اب عکس کو دیکھ رہا تھا تو شہر بانو یاد آنے لگی تھی۔ اس کا دل دو عورتوں سے عجیب انداز میں بندھا ہوا تھا۔ عکس نے نیند میں اپنے جسم کو ذرا سا ٹیڑھا کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا۔ شیر دل کچھ دیر کے لیے حرکت کرنا بھول گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے بازو سے سرکتے سرکتے اس کے ہاتھ پر آ کر ٹک گیا تھا اور اس کے ہاتھ کی ایک انگلی میں شیر دل نے وہ انگوٹھی دیکھی جو اسے ایک جھٹکے سے جیسے اس خیالی دنیا سے باہر لے آئی تھی۔

''یار دیکھو تمہاری اور میری شادی صرف ایک سال چلنی ہے...... زیادہ سے زیادہ...... تو تم ایک سال کے لیے مجھ سے شادی کر لو اس کے بعد تم وہاں شادی کر لینا جہاں تمہارے نانا کہیں اور میں اپنی فیملی میں کہیں شادی کر لوں گا۔'' اس نے اپنا پرپوزل چوتھی بار ریجیکٹ کرنے پر جھلا کر عکس سے کہا تھا۔

''یہ funny بات نہیں ہے cheap بات ہے۔'' عکس نے بڑے اطمینان سے اس سے کہا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ یقین کیوں نہیں آ رہا کہ مجھے واقعی تم سے محبت ہے اور میں تمہارے بارے میں سیریس ہوں۔'' شیر دل نے اس کی لعنت ملامت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اصل میں کسی اور سے محبت ہے اس لیے۔'' اس نے شیر دل کے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔

نیند میں عکس نے پبلک اناؤنسمنٹ سسٹم پر کوئی آواز گونجتی سنی اس نے یک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی فلائٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ چیک ان اسٹارٹ ہو چکا تھا اور اس کے برابر بیٹھا شیر دل گہری نیند میں تھا۔ اس نے اپنا ٹکٹ نکال کر ایک بار پھر چیک کیا۔ وہ اسی کی فلائٹ تھی جو دو گھنٹے کے بعد اب روانگی کے لیے تیار تھی۔ اس کی آنکھ اگر خود نہ کھل جاتی تو وہ اور شیر دل یقیناً وہیں سوئے پڑے رہتے۔

''شیر دل، شیر دل...... اٹھ جاؤ۔'' اس نے شیر دل کا بازو تھپتھپایا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

''oh my god...... میں کیا سو گیا تھا؟''

''تم اب جاؤ...... تھکے ہوئے ہو۔'' عکس کو اسے سوتے دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ بھی اس کے جانے کے بعد سو نہیں سکا تھا اور صبح کلاسز ہونے کی وجہ سے دن میں سونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

''تمہارا فون؟'' وہ اب بیگ سے اس کا فون نکال کر اسے دے رہی تھی۔

''اسے پاس رکھو۔connecting flight ہے...... پتا نہیں آگے کہیں مزید delay نہ ہوجائے۔ میں کم ازکم تم سے رابطے میں تو رہوں گا۔'' وہ اس کا سامان اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

انٹرنیشنل ڈیپارچر کے سامنے کھڑے اسے رخصت کرتے ہوئے شیر دل نے اس سے کہا۔ ''مجھے شاید تمہارے ساتھ جانا چاہیے تھا۔'' عکس کا دل بھر آیا تھا۔ وہ فکرمندی بناوٹی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے حوالے سے تشویش میں مبتلا تھا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں، تمہیں کورس مس نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارے لیے ضروری ہے یہ کورس۔ ورنہ تو میں شاید چاہتی کہ تم بھی ساتھ آتے نانا تم سے مل لیتے...... تمہیں بہت پسند کرتے ہیں وہ۔'' بات کرتے ہوئے اس کی آواز پھر بھرائی تھی۔

''میں سنگاپور آتے ہوئے ان سے مل کر آیا تھا۔'' وہ فریز ہو گئی۔ ایک لمحے میں اس نے خیر دین کی اس اچانک بیماری کی وجہ کو جان لیا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو نے آج جانا تھا کہ لاعلمی کو نعمت کیوں کہا جاتا تھا...... منزہ کی فون کال بند ہونے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بت بنی فون گود میں رکھے بیٹھی رہی تھی۔ پتا نہیں زندگی میں ناممکنات کہاں پائے جاتے ہیں اور کس کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے تو وہ یک دم اپنا وجود اور مفہوم ہی کھو بیٹھے تھے۔ شیر دل اور عکس...... شیر دل، عکس سے شادی کرنا چاہتا تھا...... اور وہ شہر بانو اس کی زندگی میں متبادل کے طور پر آئی تھی...... اتنے سالوں میں متبادل ہی رہی تھی شاید...... اور عکس اور اس کے نانا کی وجہ سے اس کی ممی اور پاپا میں علیحدگی ہوئی تھی۔ ان کا گھر ٹوٹا تھا۔ پتا نہیں کس بات کا رنج اور غصہ زیادہ تھا اس کو...... رنج اور غصے کے علاوہ ایک تیسرا احساس دھوکے اور تذلیل کا تھا۔ شیر دل اس کی آنکھوں کے سامنے عکس سے افیئر چلا رہا تھا اور اسے شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے شوہر پر، اس کی محبت پر اس کی وفاداری پر فخر کرتی رہی، قصیدے پڑھتی رہی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اس طرح دھول کیسے جھونک سکتا تھا...... کس طرح سے زیادہ بڑا سوال تھا کہ کیوں جھونک رہا تھا۔

زندگی میں جن چند چیزوں کو ایک عورت کبھی سمجھ نہیں پاتی اس میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرد جو آپ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو، آپ سے چاند ستارے توڑ لانے کے وعدے کرتا ہو، وہ اچانک کسی اور کی محبت میں گرفتار کیسے ہو جاتا ہے...... کیسے ہو سکتا ہے؟ اخلاقیات نام کے ڈھیر میں سے کوئی ایک بھی اس کے لیے رکاوٹ کیوں نہیں بنتی اور یہاں پر معاملہ اس سے بھی زیادہ خراب تھا۔ وہ اسے زندگی میں اس لیے لے کر آیا تھا کیونکہ وہ اس عورت سے شادی نہیں کر سکا تھا جس سے وہ کرنا چاہتا تھا...... منزہ نے اس سے کہا تھا کہ عکس اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ شہر بانو کم ازکم اب اس معاملے کو ون سائیڈڈ سمجھنے پر تیار نہیں تھی۔ شیر دل کی زندگی میں عکس نام کا ڈارک ہول اب کم ازکم شہر بانو کے لیے ڈارک نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے اندر جھانک کر دیکھ سکتی تھی لیکن یہ مسٹری اس کی زندگی میں بہت غلط وقت پر حل ہوئی تھی، وہ عکس مراد علی کے ساتھ سنگاپور میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس کے کہنے پر بے وقوفوں کی طرح آ کر امریکا بیٹھ گئی تھی۔ اسے امریکا کا ٹرپ لمبا کرنے کا مشورہ اسی کا تھا اور وہ اس کی عدم موجودگی میں عکس مراد علی کی جنگ لڑنا چاہتا تھا...... کس کے خلاف؟ اس کے پاپا کے خلاف...... جن کا وہ کبھی فیورٹ ہوا کرتا تھا۔ اس نے اتنے سالوں میں کبھی ایک بار اسے تکلیف نہیں پہنچائی تھی اور اب تکلیف پہنچانے پر آیا تھا تو یک وقت کہاں کہاں سے ہرٹ کر رہا تھا۔

خیر دین اور اس کی نواسی...... عکس مراد علی...... اس کے ماں باپ کے جھگڑے...... اور دو ناموں کی بازگشت...... خیر دین اور چڑیا...... وہ ان ناموں کو بھول چکی تھی...... زندگی اسے بہت آگے لے آئی تھی لیکن آج منزہ کی ایک کال نے اسے علیحدگی سے پہلے شرمین اور شہباز کے درمیان ہونے والے شدید جھگڑوں کی یاد دلائی تھی جس میں شرمین، شہباز کو برا بھلا کہتی تھی ''کسی چیز'' کے حوالے سے...... وہ کیا چیز تھی شہر بانو کو نہ اس وقت سمجھ آیا تھا نہ اب یاد آ رہا تھا...... چڑیا کے حوالے سے بہت ساری باتیں...... بہت سارے الزامات لگتے دیکھتی...... الزامات...... جنہیں وہ سمجھ نہیں پاتی تھی لیکن

چڑیا کا نام اس کے حافظے کا حصہ بن گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے ماں باپ کے جھگڑوں میں اس نام کو بار بار سنا تھا۔ اس وقت اسے چڑیا یاد تھی وہ اس کی محبت میں گرفتار تھی اور وہ حیران تھی کہ اس کے ماں باپ چڑیا کی وجہ سے کیوں جھگڑتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ چڑیا اور اس کا نام اس کے حافظے سے غائب ہوتا گیا۔ اسے یہ بھی بھولتا گیا کہ آٹھ نو سال کی عمر میں اس کے ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں کی نوعیت اور وجہ کیا تھی اور اب آج جیسے منزہ کے عکس کو اس کے ماں باپ کی علیحدگی کی وجہ قرار دینے پر اسے یاد آ گیا تھا...... کہ اس کے ماں باپ کے درمیان کسی ملازم اور اس کی بچی پر جھگڑا ہوتا تھا لیکن شہر بانو کو اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں تھا۔

ساڑھے تین سے ساڑھے چار سال وہ راک اسٹار کے اسٹارڈم والی جس چڑیا کے عشق میں گرفتار رہی تھی اسے اس وقت کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ نہ چڑیا نہ وہ وقت نہ وہ گھر...... صرف اسکول تھا جس کے بارے میں اسے شرمین کے بتانے کی وجہ سے یاد تھا کہ اس نے اپنی اسکولنگ کا آغاز وہاں سے کیا تھا اور یہ بات شیر دل بھی اس کے بتائے بغیر جانتا تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ بھی بچپن میں وہاں رہ چکی تھی۔ تب وہ بہت چھوٹی تھی اور تب وہ بھی وہاں چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ شہر بانو نے بڑی دلچسپی سے شیر دل کی گفتگو سنی تھی۔ شیر دل پاکستان میں گزارے جانے والے سالوں میں جھانکنے والی اس کی واحد کھڑکی تھی۔ شرمین اس کی اور اپنی زندگی کے اس حصے کے بارے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ شیر دل کرتا تھا۔ اسے جو کچھ شہر بانو کے بارے میں، اس کے بچپن کے حوالے سے علم تھا اس نے شہر بانو کو وہ بتا دیا تھا...... جب بھی جو بھی یاد آ جاتا تھا وہ بتا دیا کرتا تھا...... اسی نے اسے اس گھر کے بارے میں بھی بتایا تھا جب وہ وہاں رہنے کے حوالے سے خائف تھی۔ اور شہر بانو کو یہ جان کر ایک عجیب سی طمانیت ہوئی تھی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ اس سے پہلے اس گھر میں رہ چکی تھی...... اور اگر وہ گھر اتنا خوفناک ہوتا تو اس کے پاپا اسے کیسے وہاں رہنے دیتے...... وہ گھر یک دم اس کے لیے آسیب زدہ نہیں رہا تھا۔ وہ اس گھر میں پھرتے ہوئے ہر جگہ پر شہباز حسین کی موجودگی کے احساس سے دوچار رہتی تھی اور اسے جیسے یقین ہو گیا تھا کہ وہاں اسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

گھر میں ہونے والے عجیب و غریب واقعات کے باوجود شہر بانو کا ابتدائی خوف اور بدحواسی ختم ہو گئی تھی اور اب وہ گھر اس کی زندگی کو دوسری بار تباہ کر رہا تھا۔ مثال دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔

''ممی پارک جانا ہے۔'' مثال نے اس کے قریب آ کر اس کا ہاتھ کھینچا۔ وہ ماں کا چہرہ پڑھ سکتی تو کبھی اس وقت اسے کہیں جانے کے لیے نہ کہتی۔ شہر بانو لٹھے کی طرح سفید چہرے کے ساتھ ایک ممی کی طرح وہاں بیٹھی تھی یوں جیسے اس کا سارا خون کسی نے نکال لیا تھا۔ منزہ کی کال ایک ڈریکولا کی طرح لگی تھی اسے۔

''ممی۔'' مثال نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ کھینچا۔ شہر بانو نے مثال کا چہرہ دیکھا اور اس کا دل بھر آیا۔ وہ ایک بت سے گوشت پوست کے انسان میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا سارا بچپن ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑوں، گھر ٹوٹنے کے خوف اور گھر اور باپ کے ختم ہو جانے کے trauma میں گزاری تھی...... لیکن اس کے پاس بچپن کے پھر بھی کچھ اچھے اور یادگار سال تھے...... وہ چند سال جب وہ لاہور میں تھے جب شرمین اور شہباز کے درمیان جھگڑے ہونا شروع نہیں ہوئے تھے...... جب اس کے ماں باپ نے اسے کسی آنے والے بہن یا بھائی کی نوید سنائی تھی اور وہ اس کے بارے میں اپنے ماں باپ سے بھی زیادہ ایکسائیٹڈ تھی جب زندگی مزہ تھی...... سکون...... تحفظ...... انجوائے منٹ سے بھرپور...... جب وہ ایلس تھی لیکن اپنے ماں باپ کے ساتھ تھی ونڈر لینڈ میں نہیں۔

اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا زندگی اسے اور اس کی اولاد کو بھی اسی راؤنڈ اباؤٹ پر لے آئے گی جہاں سے وہ اپنے بچپن اور وجود زخمی کر کے گزر چکی تھی...... وہ مثال اور شیر دل کو ساتھ دیکھ کر اپنی ہی بیٹی پر رشک کیا کرتی تھی...... وہ اس سے بہتر بچپن اور بہتر زندگی گزار رہی تھی اور اسے یقین تھا اس کا سارا بچپن ایسے ہی ہنستے مسکراتے اپنے ماں باپ کی مضبوط پناہ میں گزر جائے گا...... اور اب......

شہر بانو نے مثال کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور رونے لگی۔ پتا نہیں بڑے بچوں کے سامنے روتے ہوئے یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھیں گے کچھ نہیں کھوجیں گے کوئی سوال نہیں کریں گے...... اور انہیں ان آنسوؤں سے تکلیف بھی نہیں ہو

گی...... کیونکہ وہ بچے ہوتے ہیں...... آنسو ہر ایک پر ایک جیسا اثر کرتے ہیں...... درد ہر ایک کو محسوس ہوتا ہے...... غم کو ہر کوئی سمجھ لیتا ہے...... بڑوں اور بچوں کے درمیان فرق صرف لفظوں کی کمی کا ہوتا ہے عمر کے سالوں کا نہیں۔

مثال بھی اپنے وجود سے لپٹی ماں کے بہتے آنسوؤں اور سسکیوں سے شاکڈ اور حواس باختہ تھی۔ یہ اس کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ اس کی ماں کو اپنے آنسوؤں اور تکلیف شیئر کرنے کے لیے اس سے لپٹنا پڑا ہو ورنہ یہ کام وہ کیا کرتی تھی۔

''پاپا کو بتاؤں گی ممی رو رہی ہے۔'' پہلا خیال اسے وہی آیا تھا جو اسے آنا چاہیے تھا۔ اس کی ہر بات پاپا کو بتا کر شروع ہوتی تھی یا اس پر ختم ہوتی تھی۔ شیر دل، شہر بانو کی طرح اس کی بھی زندگی کا محور تھا۔ وہ پارک بھول گئی تھی۔ کینڈیز بھی بھول گئی تھی، جھولے بھی بھول گئی تھی اور باتیں بھی بھول گئی تھی...... وہ بس کھڑی رہی...... گم صم...... پریشان...... الجھی ہوئی...... وہ شہر بانو کو تسلی دینا چاہتی تھی نہیں دے سکی...... اس کے آنسو پونچھنا چاہتی تھی وہ بھی نہیں کر سکی...... وہ دونوں بڑوں کے کام تھے وہ کرنا نہیں جانتی تھی لیکن اس نے وہی کیا جو وہ اپنی باربی ڈول کو سلانے کے لیے کرتی تھی...... نیند میں آنسو رک جاتے ہیں وہ کم از کم یہ تو جانتی ہی تھی۔ اس نے شہر بانو کا سر تھپکنا شروع کر دیا...... اس کی تھپکیوں نے شہر بانو کی سسکیوں میں اضافہ کر دیا تھا۔

''Do you want to talk to papa?'' مثال نے بالآخر اس کی سسکیوں سے پریشان ہو کر کہا۔

''Are you missing papa...?'' اس نے اوپر نیچے شہر بانو سے سوال کیے۔ یوں جیسے اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی جو اس کی ماں کو پریشان کر کے رُلاتی۔

''I would never speak to your papa again'' اس کے جواب نے مثال کو شاکڈ کر دیا تھا۔

☆☆☆

وہ صدمے کی حالت میں باری باری ان تمام کاغذات کو دیکھتا گیا تھا جو اس کی ماں نے کچھ دیر پہلے اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے ان کاغذات میں موجود کیس کی نوعیت بتاتے ہوئے آگ بگولہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''تم اس عورت کی جرأت دیکھو کہ کس دھڑلے سے تمہیں فریق بنا رہی ہے وہ...... انگور کھٹے ہیں والی صورتِ حال ہو گئی ہے یہ تو...... تم نے شادی نہیں کی اس کے ساتھ...... وہ کر لیتے تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا اور اب وہ گڑے مردے اکھاڑنے پر تلی ہوئی ہے...... نانا کے ساتھ ناانصافی ہوئی...... یہ تو شہباز کا بڑا پن تھا کہ اس نے اس بڈھے کو سزا میں جیل نہیں کروائی ورنہ جتنا مالی نقصان وہ پہنچاتا رہا تھا اسے اصولی طور پر جیل کروا دینی چاہیے تھی اسے...... ایسے لوگوں پر ترس کھانے اور چھوٹ دینے کا مطلب اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہوتا ہے...... آستین کے سانپ کو دودھ پلانے والی بات ہے یہ تو...... اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا میں کیوں تمہاری اس کے ساتھ شادی کرنے پر تیار نہیں تھی۔ میں پہلے دن سے اس کی اصلیت جانتی تھی۔ اس لیے بار بار تمہیں منع کرتی تھی کہ اس سے دور رہو لیکن تم پر بھی میری کسی بات کا اثر نہیں ہوا...... اب دیکھ لیا نا کہ خاندان اور خاندانی پن کی کیا اہمیت ہوتی ہے...... خاندان اپنا آپ دکھاتا ہے شیر دل جیسے اس عورت کا دکھا رہا ہے۔'' وہ سر جھکائے ان کاغذات کو ہاتھ میں لیے بت کی طرح اس میں ایک ہی نام کو بار بار مختلف صفحات پر دیکھ رہا تھا...... وہ شہباز حسین کے داماد اور بھانجے کے طور پر فریق بنایا گیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے شہر بانو اور منزہ کو فریق نہیں بنا ڈالا تھا۔ منزہ کا کوئی ایک جملہ کوئی ایک لفظ شیر دل کی سمجھ میں نہیں آیا تھا...... اس کا ذہن اس وقت کچھ ایسا ہی مفلوج ہوا تھا۔

ڈاکٹر عکس مراد علی...... اور وہ برہنہ لرزتی کانپتی روتی اور چلاتی ہوئی چڑیا...... ان دونوں ناموں میں ایک شیر دل کوئی تعلق کیسے نکال پاتا...... وہ طاقت اور بے بسی کو آپس میں کیسے جوڑتا...... آخری image جو اس نے چڑیا کا اس رات کے پچھلے پہر دیکھا تھا اس نے موسم گرما کی ان چھٹیوں میں اس کے ساتھ گزارے ہوئے تمام خوشگوار لمحات اور یادوں کو اپنی ہولناکی اور بدصورتی سے گہنا دیا تھا...... چڑیا اسے جب بھی یاد آئی تھی اسی ایک منظر کے حوالے سے آئی تھی اور وہ اس منظر کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی میں سے اس کا آئیڈیل نکال دیا ہے...... کچھ بھی نہ سمجھ پانے کے باوجود اس نے شہباز حسین کا وہ بت ضرور توڑ دیا تھا جس کی وہ پرستش کرتا تھا...... وہ ہمیشہ انکل شہباز کی طرح ہونا چاہتا تھا لیکن وہ اب کبھی انکل شہباز کی طرح نہیں بننا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر عکس مراد علی...... اور...... چڑیا...... اور خیر دین...... ایک گہری سانس لے کر اس نے ان تمام کاغذات کو واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پانی پیا...... ماؤف اعصاب اور حواس کو بحال کرنے کے لیے وہ اس وقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جو کچھ اس نے چند لمحوں پہلے دیکھا اور پڑھا تھا وہ اس کا بدترین خواب تھا۔

''میں نے تمہارے پاپا کو ابھی کچھ نہیں بتایا انہیں پتا چلے گا تو وہ تو حشر کر دیں گے اس عورت کا...... اور ساتھ تمہارا بھی...... کیونکہ تمہاری دوستی نے ہی اس عورت کو اتنی جرأت دی ہے...... اب جا کر ملو اس سے...... اور شٹ اپ کال دو اسے...... یا پھر تم کو پہلے سے پتا تھا کہ وہ کون تھی اور کیا کرنے والی تھی۔'' منزہ نے تحکمانہ انداز میں اس سے بات کرتے کرتے اچانک کسی وہم میں اس سے پوچھا۔

شیر دل نے گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''نہیں، میں نہیں جانتا تھا۔'' اس نے مختصراً ماں سے کہا اور منزہ کو اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔

وہ وہاں تین گھنٹے بیٹھا منزہ کی باتیں سنتا رہا، وہ غصے میں تھی اور بہت زیادہ ہرٹ بھی...... شہباز اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ اسے حد سے زیادہ عزیز تھا۔ اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اس کی ناگہانی موت کا صدمہ بھول نہیں سکی تھی اور اب اس کے اسی عزیز ترین اکلوتے بھائی کو اس کی موت کے بعد کوئی ایک ''برا'' ثابت کرنے پر تل گیا تھا۔ وہ تڑپ نہ جاتی تو کیسے نہ تڑپ جاتی۔ شیر دل کو اپنی ماں کی تکلیف کا اندازہ تھا...... اس کو اس شاک اور تکلیف کا بھی اندازہ تھا جو شہر بانو کو اس کیس کے بارے میں جاننے سے ہو سکتی تھی۔

''آپ شہر بانو سے کچھ مت کہیے گا۔'' شیر دل نے منزہ کی گفتگو کے اختتام پر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہاں سے واپسی کا سارا سفر بھی اس نے اسی گم صم کیفیت میں کیا تھا۔ وہ عکس کے بارے میں سوچتا رہا اور وہ چڑیا کے بارے میں سوچتا رہا...... ڈاکٹر عکس مراد علی پہلے دن سے اس سے واقف تھی۔ کم از کم وہ اب یہ خوش فہمی نہیں پال سکتا تھا کہ وہ اکیڈمی میں آنے کے بعد اس سے متعارف ہوئی تھی...... اتفاقاً...... وہاں یقیناً بہت کچھ اتفاق نہیں تھا...... وہ اسے کیوں اس بری طرح سے avoid کرتی تھی۔ اس کی وجہ وہ اب سمجھ پا رہا تھا، وہ اس کی arrogance نہیں تھی اس کا ایک شیر دل ہونا تھا جو اس کے لیے مسئلہ تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تھی پہلی بار ان کے درمیان برف کیسے پگھلی تھی۔ رقابت اور انا کی برف...... اسے یاد آیا تھا وہ STP کی ٹریننگ کے دوران کنٹری ٹور پر ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے اور وہاں ریسٹ ہاؤس میں لنچ کے دوران اس کے حلق میں مچھلی کھاتے ہوئے کانٹا پھنس گیا تھا۔ اس نے کھانسنا شروع کیا، چند لمحوں کے لیے اسے سانس لینے میں دقت ہوئی۔ پورا گروپ فوری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور عکس اٹھ کر اس کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس گروپ میں موجود واحد ڈاکٹر تھی اور شیر دل کو فرسٹ ایڈ دینا کہے بغیر بھی اسی کی ذمے داری تھی۔ بالکل ایک پروفیشنل ڈاکٹر کی طرح شیر دل کو دلاسا دیتے ہوئے اس نے اس کی پشت کو تھپکا۔ پھر سامنے پڑی چپاتی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر شیر دل کو نگلنے کے لیے دیا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا لقمہ نگلنے پر بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ شیر دل کو اب سانس لینے میں پہلے جیسی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ عکس نے روٹی کے ٹکڑوں کے کام نہ کرنے پر ایک گلاس میں لیموں کا رس نکلوا کر پلایا تھا۔ اس سے شیر دل کا کانٹا نکل گیا تھا لیکن گلا بیٹھ گیا تھا۔

رات کے وقت وہ ریسٹ ہاؤس کے لان میں سگریٹ پینے کے لیے آ کر بیٹھا تھا۔ ان دنوں اس نے نئی نئی اسموکنگ شروع کی تھی جب اس نے عکس کو بھی لان میں واک کرتے دیکھا۔ وہ سگریٹ سلگاتے سلگاتے رک گیا اور اس کی طرف چلا آیا۔ وہ بھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر رک گئی تھی۔

''گلا کیسا ہے اب تمہارا؟'' اس نے شیر دل سے پوچھا۔

"بہتر ہے۔" شیر دل نے اپنی لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ وہ ہمدردانہ انداز میں مسکرائی۔

"گرم پانی سے غرارے کرنے چاہئیں اب تمہیں نمک ڈال کر...... میرا خیال ہے صبح تک بہتر ہو جائے گا۔" اس نے پھر کسی فزیشن کی طرح اس سے کہا تھا۔ شیر دل نے بات کرتے کرتے اس کی نظروں کو اس کے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ اور لائٹر پر مرکوز دیکھا تھا پھر وہ دوبارہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

"ویسے ایک لحاظ سے تو اچھا ہے۔ اب کچھ وقت تو تم چپ رہو گے۔" شیر دل نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی لیکن جملہ سنجیدہ نہیں تھا۔

"مطلب؟" وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی پوچھنے سے نہیں چوکا تھا۔

"کوئی خاص مطلب نہیں۔" عکس نے اطمینان سے کہا۔

"تم اگر ڈاکٹر ہوتیں تو اچھی ڈاکٹر ہوتیں۔" اس نے وقت کے ساتھ بھی بولنے سے گریز نہیں کیا۔

"میں جانتی ہوں۔" جواب کمال اطمینان سے آیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"میں بھی واک کرنے آیا تھا۔" شیر دل نے کہا۔

"ضرور کریں۔" عکس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے لان کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری طرف چل دی۔ شیر دل کچھ لمحوں کے لیے بالکل ہکا بکا رہ گیا تھا۔ پھر وہ بے اختیار اس کے عقب میں آیا۔ عکس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شیر دل ڈھٹائی سے مسکرایا تھا۔

"ہم ساتھ بھی کر سکتے ہیں واک۔"

"ساتھ صرف باتیں ہو سکتی ہیں واک نہیں۔"

"میرا گلا خراب ہے اس لیے آج میں صرف تمہیں سنوں گا۔" شیر دل نے بڑی فیاضانہ آفر کی۔

"اور میرے پاس سنانے کے لیے کچھ ہے نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"ہو سکتا ہے کچھ یاد آ جائے۔" شیر دل نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے عکس کو ایک گہری سانس لے کر کہتے ہوئے سنا۔

"ہاں یاد تو بہت کچھ آ سکتا ہے لیکن میں کچھ یاد نہیں کرنا چاہتی۔"

"ویسے یہ حیرانی کی بات ہے کہ ہم میں بات چیت کا سلسلہ اتنا محدود ہے۔" شیر دل نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ عکس نے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔

"تمہاری کوئی رائے نہیں ہے؟"

"اگر تم اس طرح بولتے رہے تو اگلے دو دن بھی تمہارا گلا اسی طرح رہے گا۔" عکس نے یک دم اسے ٹوک کر وارن کیا۔ "مجھے اگر یہ غلط فہمی تھی کہ تم اپنے گلے کی اس حالت کے ساتھ بول نہیں سکتے تو وہ دور ہو گئی۔" شیر دل بے اختیار ہنسا۔

"اگر تم بات نہیں کرو گی تو ظاہر ہے مجھے ہی بات کرنی پڑے گی۔" اس نے جیسے ملبہ عکس کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے سوچنے کا موقع دو گے تو میں بات کروں گی نا۔" اس نے ساتھ چلتے ہوئے جواباً کہا۔

"اچھا سوچو۔" شیر دل نے فوراً پسپائی اختیار کی اور خاموش ہو گیا۔ عکس اس کے ساتھ چلتے ہوئے کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے ایک بہت عجیب سوال کیا تھا۔

"تم مجھے ناپسند کرتے ہو؟" شیر دل کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکا...... سوال اتنا ہی غیر متوقع تھا پھر چند لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا۔

"ناپسند...... تو نہیں...... لیکن ہاں تم مجھے کچھ عجیب لگتی تھیں۔"

"لگتی تھی؟" عکس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں پہلے زیادہ لگتی تھیں۔ اب تھوڑا کم لگتی ہو اور آج تھوڑا اس سے بھی کم۔" وہ مسکرا دی۔ "تم بھی تو مجھے ناپسند کرتی ہو؟"

"No way۔" عکس نے بے ساختہ کہا۔

"اچھا؟ مجھے ہمیشہ لگا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم غنی حمید کے ساتھ ہوتی ہو زیادہ تر...... میں نے سوچا شاید اس نے میرے بارے میں ایسا کچھ کہا ہے کہ تم مجھے ناپسند کرنے لگی ہو۔" شیر دل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"غنی حمید نے مجھے تمہارے بارے میں کیا کہنا تھا؟" عکس نے جواباً بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

"کوئی جھوٹ۔"

"میں جھوٹ پرکھ سکتی ہوں۔"

"بعض لوگ بہت اچھا جھوٹ بولتے ہیں، ان کے جھوٹ کو پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔" شیر دل نے سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو تم لیکن غنی بہت اچھا انسان اور دوست ہے۔" بڑے سادہ سے انداز میں بنا سوچے سمجھے کہے گئے اس جملے نے شیر دل کو جلا کر کوئلہ کر دیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا زندگی میں وہ کسی عورت کو اتنی attention دیتا پھر رہا ہو اور وہ پھر بھی اس کے سامنے کسی دوسرے مرد کے گن گائے اور وہ بھی غنی حمید کے جس کی وہ شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتا ہو۔

"اچھے انسان کا تو مجھے یقین نہیں لیکن تمہارا دوست ضرور ہے وہ۔" شیر دل کے لہجے کی گرم جوشی یک دم غائب ہو گئی تھی۔ "اوکے...... میں چلتا ہوں۔"

"Good night۔" عکس نے جواباً اس سے کہا۔ وہ شدید خفا ہوا اور اسے جواباً گڈ نائٹ کہے بغیر وہاں سے آ گیا۔ اس کا خیال تھا وہ جانے کا ارادہ ظاہر کرے گا اور وہ اسے روکنے کی کوشش کرے گی۔ دل سے نہ سہی رسماً ہی اسے رکنے کا کہہ دے گی...... عکس مراد علی نے ایسی کوئی رسم نہیں نبھائی تھی۔ یہ بالکل ایسا تھا۔ "میں جاتا ہوں۔" "سو بسم اللہ۔"

شیر دل اس رات کمرے میں آ کر بھی تپا رہا۔ اس لڑکی کی طرف سے اسے کوئی لفٹ نہیں مل رہی تھی۔ مسئلہ یہ اتنا بڑا نہیں تھا مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس شخص کو اس پر ترجیح دے رہی تھی بدقسمتی سے وہ غنی حمید تھا۔

اگلی صبح ڈائننگ روم میں ناشتے کے دوران اس کی عکس سے دوبارہ ملاقات ہوئی تھی اور اس نے خوش دلی سے اس سے اس کے گلے کے بارے میں پوچھا تھا۔ شیر دل چاہتے ہوئے بھی اس سے خفگی برقرار نہیں رکھ سکا۔ عکس مراد علی بھی کچھ عجیب طرح سے اثر انداز ہوتی تھی اس کے اعصاب اور حواس پر اور وہ جس طرح سے اسے اور اپنے batch mates کو ہینڈل کیا کرتی تھی شیر دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ستائش کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ ہر ایک سے خوش دلی سے بات کرنے کے باوجود ہر ایک کو ایک فاصلے پر رکھے ہوئے تھی...... غنی حمید کے ساتھ اگرچہ اس کی دوستی ان سب ہی کی نظروں میں تھی لیکن غنی حمید کے ساتھ دوستی کے باوجود ان سب کو وہ دونوں ہر وقت اکٹھے نظر نہیں آتے تھے۔ نہ ہی کونوں کھدروں میں بیٹھ کر باتیں کرتے پائے جاتے تھے اور نہ ہی عکس مراد علی اپنے ہر کام کے لیے غنی حمید کی خدمات کی منتظر یا طلب گار رہتی تھی...... شیر دل اپنے تمام اختلافات اور رقابت کے باوجود ان دونوں کے تعلق میں کوئی ایسی چیز نہیں ڈھونڈ پایا تھا جو سرگوشیوں کو جنم دیتی یا جو ان پر انگلیاں اٹھانے کا باعث بنتی...... وہ دونوں اکثر جہاں بات چیت کرتے پائے جاتے وہاں گروپ کے باقی لوگوں میں سے بھی کوئی نہ کوئی ہوتا اور ان کے درمیان جو بھی بات چیت ہوتی تھی وہ سب کے سامنے تھی۔ شیر دل شاید اس گروپ کا واحد شخص تھا جسے ان کی دوستی پر اعتراض تھا۔

وہ اب عکس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ وہ دانستہ طور پر اسے tease کرنے کے لیے یہ سب کر رہی تھی۔ گاڑی اس کے گھر کے پورچ میں رکی تھی جب اس نے فون پر عکس کی کال آتے دیکھی تھی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ کچھ دیر اس کے نام کو دیکھتا رہا۔ چند گھنٹوں نے کیا کچھ بدل دیا تھا ان دونوں کے بیچ میں۔

"ہیلو۔" فون اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہیلو۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز میں اس نے پہلی بار چڑیا کو شناخت کرنے کی کوشش کی اور چڑیا مل گئی تھی۔ اس نرم آواز میں آج بھی چڑیا کی ریشمی آواز کی ملائمت جھلکتی تھی۔ دونوں کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے دوران وہ بہت کم بولا تھا۔ وہ ایک رات پہلے اس کی کہی جانے والی باتوں کو

اب سمجھ رہا تھا۔ معنی پہنانے کے قابل ہو گیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس سے چند منٹ بات کرنے میں بھی عکس نے اس کے غیر معمولی رویے کو نوٹس کیا تھا۔

"ہاں، کیوں؟" شیر دل نے حیران ہوئے بغیر کہا۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی چھپا نہیں سکتے تھے اس لیے چھپانے کی کوشش میں وہ وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے لہجے کو جتنا بھی نارمل رکھتا وہ پھر بھی اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپ جاتی۔

"خاموش ہو۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں کچھ۔" یہ واحد بہانہ تھا جو سب کچھ چھپا لیتا۔ وہ اسے اپنا خیال رکھنے اور آرام کرنے کا کہتی رہی پھر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

وہ اس رات قریباً ساری رات اسموکنگ کرتا رہا۔ وہ سو نہیں سکا تھا۔ بعض جنگیں ضمیر اور بے ضمیری کے درمیان ہوتی ہیں۔ وہ بھی اس رات وہی جنگ لڑ رہا تھا۔ عکس مراد علی کے اس نئے تعارف نے اسے بہت پیچھے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک شدید احساس جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔ چڑیا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کا عینی شاہد تھا اور یہ شہادت اس کے دل پر ایک بوجھ کی طرح تھی۔ اس دائر کیے جانے والے کیس میں اس الزام کے حوالے سے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شہباز حسین کے خلاف ایک سادہ misconduct اختیارات کے غلط استعمال اور خیر دین پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کا کیس تھا اس کے باوجود شیر دل صرف اس ایک رات کے بارے میں سوچتا رہا تھا...... بہت کچھ اب اس کی یادداشت میں اس طرح محفوظ نہیں رہا تھا جیسے پہلے تھا لیکن اس کے باوجود جو کچھ اسے یاد تھا اس کے بعد عکس مراد علی سے نظر ملانا اس کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔

عکس اس وقت لاہور میں تھی اور اسے اس رات لاہور ہی میں رہ کر اگلے دن وہاں سے سنگاپور کی فلائٹ لینی تھی۔ وہ نہیں جانتا اسے کیا خیال آیا تھا لیکن اگلے دن لاہور جانے سے پہلے وہ صبح سویرے خیر دین سے ملنے چلا آیا تھا۔

☆☆☆

"تم نے ان سے کیا کہا؟" چیک ان اسٹارٹ ہونے کے اعلانات کے باوجود اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس نے شیر دل سے پوچھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار شیر دل پر بے تحاشا غصہ آیا تھا اتنا غصہ کہ...... وہ اس کے ساتھ دھوکا کر رہا تھا، اس سے پوچھے بغیر اسے بتائے بغیر اس کی عدم موجودگی میں وہ اس کے گھر خیر دین سے ملنے پہنچ گیا تھا۔

"میں ان سے ایکسکیوز کرنے گیا تھا اور میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکا...... کیونکہ تم نے انہیں ہر بات سے بے خبر رکھا ہے۔" شیر دل اس کے چہرے سے جیسے اس کے دل تک پہنچ رہا تھا۔ وہ لمحوں میں آگ سے موم ہوئی تھی۔

"کس چیز کے لیے ایکسکیوز؟"

"ہر چیز کے لیے۔" ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بالمقابل کھڑے رہے...... ساکت...... سانس روکے...... ایک دوسرے کی آنکھوں میں اس چیز کو پہچاننے اور پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جو نظر آ رہی تھی...... اس چیز کو کھوجنے کی کوشش کر رہے تھے جو چھپی ہوئی تھی۔ شیر دل کی آنکھوں میں عکس نے تھکن کو دیکھا اور اس کے پیچھے ندامت کو...... شیر دل نے اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک دیکھی اور اس کے پیچھے جھلکتی افسردگی کو...... انہوں نے بیک وقت سانس لی تھی، بیک وقت نظریں چرائی تھیں، بیک وقت سر جھکا کر دوبارہ سر اٹھایا۔ پھر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا پھر نظریں چرائیں...... یوں جیسے دونوں مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی کشش کے اثر کے حصار سے نکالنے، توڑنے، چھڑانے، چرانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

ہر چیز میں کیا کیا تھا؟ عکس نے ایک لمحے سے بھی کم میں سمجھ لیا تھا لیکن یہ ایکسکیوز وہ لینے پر تیار نہیں تھی۔ کم از کم زندگی کے اس لمحے میں نہیں۔

"دیر ہو رہی ہے میں چلتی ہوں۔" وہ اس سے کہتے ہوئے یک دم پلٹ گئی تھی۔ شیر دل وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو اندازہ تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ وہ اسے وہاں بات کرتے ہوئے روکتا تو وہ اس کے

سامنے رو پڑتی۔ وہ ان آنسوؤں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ اس کا اپنا خاندان تھا۔ وہ سنگاپور ایئرپورٹ پر "روتی ہوئی چڑیا" کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا...... اس لیے اس نے ڈاکٹر عکس مراد علی کو جانے دیا لیکن وہ تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک عکس اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

عکس نے ایک بار بھی اندر جانے کے بعد اسے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ وہاں کھڑا تھا اور جب تک وہ نظر آ رہی تھی وہ وہاں سے ہل نہیں سکے گا...... وہ اس سے ایکسکیوز کر رہا تھا اور کہاں کھڑا ہو کر کر رہا تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود اپنے چہرے کو بار بار بھیگنے سے نہیں روک پا رہی تھی۔ شیر دل نے کہا تھا کہ اس نے خیر دین سے کچھ نہیں کہا تھا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ اس نے خیر دین سے کچھ کہا ہو گا۔ وہ دونوں اس حد تک ایک دوسرے کی بات پہ یقین رکھتے اور کرتے تھے۔

امیگریشن کروانے کے بعد لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس نے شیر دل کے فون سے باری باری کچھ کالز کی تھیں۔ پہلی کال اس نے جواد کو کی تھی اس نے کال اٹینڈ نہیں کی تھی۔ اس نے چند بار اور کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ پھر اس نے پاکستان میں اپنے عملے کے اس شخص سے رابطہ کیا تھا جو ہاسپٹل میں خیر دین کی دیکھ بھال کر رہا تھا پھر اس کو شیر دل کے کروائے ہوئے کچھ انتظامات کے ذریعے لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ جواد ایک بار اس کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا لیکن اس کے بعد عملے کے اس فرد کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ عکس کو اس وقت جواد کا غائب ہو جانا کچھ عجیب لگا تھا لیکن اس وقت اپنی پریشانی میں اس نے اس کی وجوہات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جواد سے ہونے والی بات چیت میں اس نے اسے اپنے فلائٹ شیڈول کے بارے میں بتایا تھا اور اس نے اسے کہا تھا کہ وہ ایئرپورٹ پر اسے پک کر لے گا لیکن اب رابطہ نہ ہونے پر عکس نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے عملے کو ایئرپورٹ پر بلوا لیا تھا۔ پاکستان کالز کرنے کے بعد اس نے کویت حلیمہ کو کال کر کے اس سے پاکستان آمد کا شیڈول پوچھا تھا۔ وہ اگلی شام کی فلائٹ سے پاکستان پہنچ رہی تھی۔ ان تمام کالز سے فارغ ہونے کے بعد وہ چند میسجز کر رہی تھی جب اس نے فون پر شہر بانو کا نام دیکھا...... اس نے text کیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے عکس کو سمجھ نہیں آئی۔ وہ اس text کا جواب دے یا نہ دے۔ text نہ کھولنے کے باوجود اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اس سے فوری طور پر بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ عجیب کشمکش میں بیٹھی رہی۔ پھر اس نے text کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا ہاسٹل واپس پہنچ کر شیر دل، شہر بانو کو خود ہی کال کر لیتا اور اسے فون کے عکس کے پاس ہونے کے بارے میں بتا دیتا۔ اس سے پہلے کہ وہ فون رکھ دیتی سیل فون پر ایک لوکل نمبر سے کال آنے لگی تھی۔ وہ شیر دل تھا جو اس سے اس کی فلائٹ کی روانگی چیک کرنا چاہتا تھا۔

"شہر بانو کو فون کر لو...... اس کا message آیا تھا وہ تم سے ایمرجنسی میں بات کرنا چاہتی ہے۔"

"او کے میں اسے کال کر لیتا ہوں۔ تم نے اسے بتایا ہے کہ فون تمہارے پاس ہے؟" شیر دل نے جواباً پوچھا تھا۔

"نہیں، میں نے نہیں بتایا۔ مجھے عجیب لگا تھا کہ......" شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک کیا۔ میں خود اس سے بات کر لوں گا۔" چند منٹ دونوں بات کرتے رہے۔ گفتگو کے اختتام پر عکس نے ایک بار پھر شیر دل سے کہا۔

"شہر بانو کو فون کر لینا وہ ایمرجنسی میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔" اسے شیر دل کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ بہت تھکا ہوا تھا اور سونے کے موڈ میں تھا۔

"ہاں میں کر لوں گا۔" شیر دل نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

چار گھنٹے کے بعد ملائشیا میں اپنی connecting فلائٹ کے لیے ملائشیا ایئرپورٹ پر قدم رکھتے ہوئے عکس کا فون بہت سارے ٹیکسٹ میسجز سے بجنے لگا۔ اس نے ان تمام میسجز کو چیک کیا ان میں شہر بانو کا کوئی بھی میسج نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ یقیناً شیر دل اور شہر بانو کی آپس میں بات ہو گئی تھی۔ تین گھنٹے کے اسٹاپ اوور میں ملائشیا ایئرپورٹ پر بیٹھے اس نے ایک بار پھر خیر دین کی خیریت دریافت کی تھی اور ایک بار پھر جواد سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ خیر دین کی حالت ویسی ہی تھی اور جواد بھی اسی طرح غائب تھا اور جب بالآخر ان کالز سے فارغ ہونے کے بعد اس نے

فون رکھنا چاہا تو اس کے فون پر کسی مسز فاروق کی کال آنے لگی تھی۔ وہ چند لمحے اس کال کو دیکھتی رہی اور یہ طے کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اسے کال لینی چاہیے یا نہیں۔ اس نے بالآخر کال لینے کا فیصلہ کیا۔ ہیلو کہنے پر دوسری طرف کچھ دیر کے لیے آواز ہی نہیں آئی تھی۔ عکس کو دو تین بار ہیلو...... ہیلو کہنا پڑا اور بالآخر اس نے شرمین کی آواز سنی۔

''میں ایک شیر دل سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' عکس کو اس آواز میں ایک عجیب سی حیرانی اور بے یقینی کی کیفیت محسوس ہوئی جسے وہ سمجھ نہیں سکی۔

''وہ اس وقت available نہیں ہیں۔ آپ مجھے میسج دے دیں میں ان کو فارورڈ کر دوں گی، وہ آپ کو خود کال کر لیں گے۔'' عکس نے بے حد شائستگی سے کہا۔

''آپ کون ہیں؟'' مسز فاروق نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس سے کہا۔ عکس کو اپنا تعارف کرواتے میں تامل ہوا۔

''آپ اپنا میسج دے دیں میں انہیں فارورڈ کر دوں گی۔'' اس نے جواب دینے کے بجائے اپنی بات دُہرائی۔

''آپ عکس مراد علی ہیں؟'' عکس دوسری طرف سے اپنا نام لیے جانے پر یک دم حیران رہ گئی تھی۔ وہ کون تھیں جو اس کے نام سے واقف تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ اگر اس وقت وہ نمبر اس کے پاس تھا تو پھر وہ عکس مراد علی تھی۔

''جی۔'' وہ اس بار اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور پھر یک دم فون بند ہو گیا۔ عکس کو لگا شاید کال اتفاقاً ڈس کنیکٹ ہوئی تھی اور مسز فاروق کچھ دیر میں اسے دوبارہ کال کریں گی لیکن دوبارہ کوئی کال نہیں آئی تھی۔ عکس نے ایک بار مسز فاروق کا نمبر چیک کیا تھا۔ وہ امریکا کا نمبر تھا اور امریکا میں شیر دل کی آدھی سے زیادہ فیملی تھی یہ عکس جانتی تھی لیکن وہ کون تھی شہر بانو کے علاوہ جو اسے اس طرح پہچان جاتی؟ جو اس کے نام سے اس طرح واقف ہوتی کہ شیر دل کے فون پر اس کی آواز سنتی تو اسے اس کے نام سے پہچان لیتی۔ یہ انتہائی تشویشناک بات تھی اس کے لیے اور انتہائی الجھا دینے والی بھی۔ اس کا ذہن ایک لمحے کے لیے شہر بانو اور اس کی ماں کی طرف گیا تھا لیکن وہ یہ یقین نہیں کر سکتی تھی کہ شرمین اسے فون کرنے پر اسے اس کے نام سے پہچانے گی۔ شہر بانو اور اس کے درمیان ایک رسمی علیک سلیک کے علاوہ کبھی کچھ نہیں ہوا تھا اور وہ یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ شیر دل اپنی ساس کے سامنے اس کا ذکر کرتا رہا ہوگا اگر کرتا بھی رہتا تب بھی ان کا اس طرح اس کی آواز پر پہلا اندازہ اس کے بارے میں لگانا...... وہ بری بری طرح الجھی تھی۔ اسے شیر دل سے یہ معاملہ ڈسکس کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے اسے کال نہیں کی تھی اور وہ کوشش کرتی تو سیل فون میں اس کے کمرے کا نمبر ڈھونڈ کر آپریٹر کے ذریعے اس سے رابطہ کر لیتی لیکن وہ رات کا آخری پہر تھا اور وہ چاہتی تھی کہ شیر دل سوتا رہے۔ وہ اسے ایک معمولی سی بات کے لیے نیند سے جگانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ اگلی صبح گیارہ بجے خیر دین کے پاس پہنچی تھی اور آئی سی یو کے شیشے سے اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے یہ بھول گئی تھی کہ وہاں اس کا عملہ تھا اور ڈاکٹر تھا۔ اس نے بچپن سے آج تک خیر دین کو ہاسپٹل کے بستر پر بیمار نہیں دیکھا تھا، اس طرح پڑے نہیں دیکھا تھا اور اب وہ دیکھ رہی تھی تو اسے یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ خیر دین کو کچھ ہو سکتا تھا...... پہاڑ ٹوٹتے ہیں لیکن جب تک ہم انہیں اپنے سامنے ٹوٹتا ہوا نہ دیکھ لیں ان کا قابلِ شکست ہونا ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ خیر دین بھی اس کے لیے پہاڑ تھا اور پہاڑ کو ریت بنتے دیکھنا...... وہ بہت دیر بہتے آنسوؤں کے ساتھ وہیں آئی سی یو کے شیشے سے خیر دین کو دیکھتی رہی...... اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکی پھر وہ ڈاکٹر کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔

اس نرم جھریوں بھرے کمزور سوئیوں لگے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی تھی۔ حلیمہ کی شادی ہو جانے اور اپنا خاندان شروع کر لینے کے بعد خیر دین کے علاوہ اس کا دنیا میں واقعی کوئی نہیں رہا تھا۔ اس بستر پر خیر دین نہیں تھا اس کا سارا خاندان تھا۔ ماں...... باپ...... بہن...... بھائی...... دوست...... سب کچھ وہی ایک شخص تھا اس کے لیے...... وہ کئی گھنٹے خیر دین کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے اس کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے پوری کائنات تھے اور خیر دین کے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی عکس کو یقین تھا وہ اس کے ہاتھ کا لمس پہچانتا تھا۔

شام کو حلیمہ بھی پاکستان پہنچ گئی تھی۔ وہ اکیلے ہی آئی تھی۔ اس کے شوہر یا بچوں میں سے کوئی ساتھ نہیں آ سکا تھا۔ شام کو وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے ابھی اس کلب میں پہنچی ہی تھی جہاں شیر دل نے اس کی عارضی رہائش کا انتظام کروایا تھا۔ شیر دل کی کال آ گئی تھی۔ خیر دین اور اس کی خیریت کے بارے میں بات کرنے کے بعد عکس کو مسز فاروق یاد آ گئی تھیں۔

''شیر دل...... مسز فاروق کون ہیں؟'' اس نے اچانک شیر دل سے پوچھا تھا۔ وہ چونکا۔

''کون مسز فاروق؟''

''تمہارے سیل فون میں ایک نمبر saved ہے۔''

''اوہ وہ...... شہر بانو کی ممی ہیں۔'' شیر دل نے دانستہ شہباز حسین کی سابقہ بیوی کے حوالے سے شرمین کا تعارف نہیں کروایا تھا۔ عکس کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکی تھی۔

''کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ملائشیا میں اسٹاپ اوور کے دوران ان کی کال آئی تھی تمہارے فون پر......''

''میرے فون پر......؟'' شیر دل بے اختیار حیران ہوا۔

''ہاں انہوں نے تمہارا پوچھا پھر میرے بارے میں پوچھا، میں نے جب نام نہیں بتایا تو انہوں نے کہا کیا تم عکس مراد علی ہو؟''

''یہ تم سے شرمین آنٹی نے کہا؟'' شیر دل ہل گیا تھا۔

''ہاں...... وہ میرے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟'' شیر دل فی الحال جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا شرمین عکس مراد علی کے بارے میں کیسے جان پائی ہوں گی۔

☆☆☆

شرمین، مثال کی بات پر ہل کر رہ گئی تھیں۔

''شہر بانو رو رہی ہے......؟ کس لیے؟'' ایک چار سالہ بچی سے کیا جانے والا یہ سوال احمقانہ تھا لیکن وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ وہ اپنے بیڈ روم میں اپنی وارڈ روب سے کچھ کپڑے نکال رہی تھیں جب مثال دروازہ کھول کر بہت اداس سی ان کے پاس آئی تھی۔

''آؤ بیٹا......'' شرمین نے اپنے کام میں مصروف اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''نانو! ممی رو رہی ہیں۔'' مثال نے اندر آ کر کوئی تمہید باندھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ کام کرتے کرتے رک گئیں۔

”شہر بانو رو رہی ہے؟“

”Yes۔“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”ممی نے کہا میں آپ کو نہ بتاؤں کہ وہ رو رہی ہیں۔“ شرمین کو مثال کی اگلی بات پر جیسے ایک اور دھچکا لگا تھا۔ وہ وارڈ روب بند کرنا بھی بھول گئی تھی اور وہاں سے سیدھا شہر بانو کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ دروازہ بجا کر اندر آتیں لیکن اس بار انہوں نے دروازہ تک نہیں بجایا تھا۔ شہر بانو واقعی اندر بیٹھی رو رہی تھی۔ شرمین کے یک دم اندر آ جانے پر اسے اتنا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ کوئی احتیاطی تدابیر کر سکتی۔

”کیا ہوا جان؟“ شرمین کے ہاتھ پاؤں اسے اس بری طرح سے روتے دیکھ کر کچھ مزید پھول گئے تھے۔ شہر بانو جھوٹ بولنا چاہتی تھی۔ کوئی بہانہ بنانا چاہتی تھی۔ ہنس کر بات ٹال دینا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ نہیں کر سکی۔ شرمین کے پاس آ کر بیٹھنے پر وہ بلکتے ہوئے ان کی گود میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ شکست خوردگی کا کیا بلا کا احساس تھا جس نے اسے اس وقت اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا کیوں رو رہی ہو؟ کچھ تو بتاؤ؟“ شرمین گھبرائی ہوئی اس سے سوال پر سوال کر رہی تھی۔ اور اس کے پاس کہنے کے لیے جیسے ایک لفظ نہیں تھا۔ وہ شرمین اسے یہ کیسے کہہ دیتی کہ اس کی ساری پیش گوئیاں اور وارننگز ٹھیک ثابت ہوئی تھیں۔ شیر دل ویسا ہی مرد ثابت ہوا تھا جیسا وہ اسے سمجھتی تھیں۔ وہ شوہر کی محبت اور وفاداری کا جو تاج سجائے پھرتی تھی وہ آج جیسے بیچ بازار سر سے گرا تھا۔ کیا وہ اس شرمناک ذلت کے احساس کو صرف خود تک رکھنا چاہتی تھی لیکن یہ بھی مشکل تھا یہ بھی ناممکن تھا۔

ماں کی گود میں منہ چھپائے رکھتے ہوئے اس نے شرمین سے کہا۔ ”ممی! شیر دل اپنی کسی کولیگ کے ساتھ افیئر چلا رہا ہے۔“ شرمین کپکپانے لگی تھی۔

”کون کولیگ؟“

”عکس مراد علی۔“ شہر بانو نے روتے ہوئے کہا۔ جو بات تھی وہ بتا نہیں سکتی تھی...... بتا دیتی تو اس کی ماں کے اپنے زخموں کے کھرنڈ اترنے لگتے...... اس کے باپ کے حوالے سے پھر سوالیہ نشان اٹھتے...... وہ شرمین کو ایسا کوئی حوالہ دینا نہیں چاہتی تھی جو عکس مراد علی کو ”ظالم“ نظر نہ آنے دیتا۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سے کس نے کہا؟ شیر دل ایسا نہیں کر سکتا۔“ شرمین نے عجیب بے یقینی اور دل گرفتگی سے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔ ابھی کچھ گھنٹوں پہلے تک تو وہ خوش باش تھی...... ہر روز تو وہ شیر دل کی تعریفیں کرتی تھی...... اس کی کوئی بات شیر دل کے حوالے کے بغیر پوری نہیں ہوتی تھی اور اب یک دم وہ کہہ رہی تھی کہ...... شرمین کو یقین نہیں آیا۔ اس خاندان کے حوالے سے خدشات رکھنے کے باوجود اسے یقین نہیں آیا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ وہ سب کچھ ہو سکتا تھا۔

”ممی نے بتایا ہے مجھے کچھ دیر پہلے فون پر کہ......“ شہر بانو نے روتے ہوئے کہا۔

”کیا بتایا ہے؟“ شرمین نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ بس یہی بتایا ہے کہ سنگاپور میں بھی اکٹھے ہیں دونوں۔“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بیٹھے بٹھائے شیر دل کیوں ایسا کچھ کرنے لگا...... تم نے پہلے بھی......“

”ممی میں کچھ نہیں جانتی تھی...... میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔“ وہ شرمین کی بات کاٹتے ہوئے ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس ساری گفتگو میں یہ پہلا سچ تھا جو وہ بول رہی تھی۔ وہ واقعی عکس اور شیر دل کے ماضی کے اس تعلق کے حوالے سے کچھ نہیں جانتی تھی۔

شرمین کچھ دیر کے لیے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ”اس سے بات کرو تم...... پوچھو۔“ شرمین نے بالآخر جیسے عجیب

اضطراب کے عالم میں کہا۔

”ممی میں اب اس سے کبھی بات نہیں کروں گی۔“

”شہر بانو یہ ٹھیک نہیں ہے...... بات تو کرنی چاہیے اور تم نہیں تو میں بات کرتی ہوں اس سے۔“ شرمین نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ممی آپ اس سے بالکل بات نہیں کریں گی...... اس نے مجھے ہرٹ کیا ہے۔“

”میں جانتی ہوں بیٹا! لیکن پھر بھی بات تو کرنی چاہیے۔ پوچھنا تو چاہیے کہ کیا ہوا اور کیوں ہوا؟“ شرمین اسے سمجھا رہی تھی۔

”میں اس سے جو کچھ بھی پوچھوں گی اب سامنے پوچھوں گی۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”وہ اب یہاں آئے گا تو ہی بات ہوگی...... میں جب تک یہاں ہوں میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

شرمین عجیب خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی اس کی بات سنتی رہی تھی۔ عکس مراد علی کے نام نے اس کے ذہن میں بہت سی گھنٹیاں بجائی تھیں۔ اسے خیر دین اور اس کی نواسی کا نام یاد آیا تھا لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ خیر دین کی نواسی کا نام عکس مراد علی ہی تھا۔ وہ مراد علی کا نام یاد کرتے ہوئے الجھی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بچی ایک شیر دل کی کولیگ ہو سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ افیئر چلا سکتی تھی۔ یہ یقیناً کوئی اور عکس تھی جسے وہ خیر دین کی نواسی کے نام کی وجہ سے کنفیوز کر رہی تھی۔

”تم جانتی ہو شیر دل کی اس کولیگ عکس مراد علی کو......؟“ شرمین نے جیسے پھر بھی اپنے کسی واہمے کی تصدیق کی تھی۔ اس نے اور اس کے سوال نے شہر بانو کو یک دم جیسے ہوش میں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ہاں میں جانتی ہوں...... دو چار بار ملی ہوں...... ڈاکٹر ہے وہ......“ اس نے کچھ لپیٹ کر بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

”فیملی بیک گراؤنڈ کیسا ہے؟“ شرمین کے سوال نے شہر بانو کو اچی کی گئی وارننگ یاد دلائی۔

”اس کی ممی کویت میں ہوتی ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی اور خود وہ لاہور میں based ہے۔“ آخری جملہ اس کا اندازہ تھا کہ وہ لاہور سے ہی تعلق رکھتی ہوگی۔ شرمین کو اطمینان ہوا پھر یہ وہ والی عکس نہیں ہو سکتی وہ تو کسی دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتی تھی اور وہ اپنے نانا کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی ماں کی شادی ہو چکی تھی۔

”میں منزہ سے بات کرتی ہوں اگر شیر دل سے بات نہیں کرنی تو۔“ شرمین نے اسی مضطرب انداز میں کہا۔

”نہیں ممی آپ شیر دل کی ممی سے بات نہیں کریں گی۔“ شہر بانو نے فوراً سے پیشتر کہا۔

”تو پھر یہ معاملہ کیسے حل ہوگا؟“ شرمین نے کچھ حیرانی سے ہچکیاں لیتی ہوئی بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

''ہو جائے گا حل...... اگر حل ہوتا ہوا تو۔''

''ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہو۔'' شرمین نے جو جملہ کہا تھا وہ یہ جملہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔

''کیسی غلط فہمی؟'' شہر بانو نے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''شیر دل کے حوالے سے۔'' شرمین نے جیسے عجیب آس کے ساتھ کہا۔ شہر بانو کا دل کٹا تھا۔ اس کی ماں زندگی میں پہلی بار شیر دل کو defend کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور کہاں کر رہی تھی۔

''کاش غلط فہمی ہی ہوتی ممی۔'' وہ کہتے ہوئے ایک بار پھر سسک پڑی۔ شرمین بہت دیر اس کے پاس بیٹھی اسے تسلی دیتی رہی تھی لیکن وہ بے حد پریشان تھی اور اسی پریشانی میں اس نے شیر دل سے اس سارے معاملے کے بارے میں خود بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ شہر بانو کے پاس سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی اور اس نے وہاں سے شیر دل کے نمبر پر کال کی تھی اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس وقت وہ سو رہا ہو گا اسے اس وقت شاک لگا تھا جب اس کی کال کسی لڑکی نے receive کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے شرمین کو لگا آسمان اس کے سر پر آ گرا تھا۔ رات کے اس پہر...۔ شیر دل کے فون پر آنے والی کال ریسیو کرنے والی کون ہو سکتی تھی اور اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ وہ دونوں اس وقت اکٹھے کیا کر رہے تھے۔ اس نے شیر دل سے کیا بات کرنی تھی اور کیا نہیں وہ سب بھول گئی تھی اور اس نے اس لڑکی سے وہ پوچھا تھا جو وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ملنے والے جواب نے اس کی رہی سہی ہمت بھی توڑ دی تھی۔ اس نے مزید کچھ بھی پوچھے کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ آج اس کی زندگی کا ایک اور سیاہ دن تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو بہت غلط وقت پر بہت غلط طریقے سے دہرا رہی تھی۔ فون ہاتھ میں لیے وہ بیٹھی رہی...... بے حس و حرکت...... ابھی ابھی اسے جو پتا چلا تھا وہ شہر بانو کے ساتھ اسے شیئر کرنا چاہیے تھا یا نہیں......؟ یہ سوال ایک دم کسی جھکڑ کی طرح اس کے ذہن میں گونجنے لگا تھا...... اسے شہباز حسین یاد آیا تھا...... اس کے ساتھ گزاری ہوئی اچھی زندگی اور اس کے بعد آنے والی تباہی...... وہاں بیٹھے بیٹھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس درد سے دوبارہ گزری تھی جو کبھی مندمل ہوا ہی نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا...... بعض کانٹے آپ کو ساری عمر چبھتے رہتے ہیں آپ لاکھ جتن کر کے بھی ان کو نکال نہیں پاتے...... کیونکہ وہ نظر نہیں آتے۔ بس ان سے اٹھنے والی ٹیسیں آپ کو یاد دلاتی رہتی ہیں کہ وہ ''ہیں'' اور آپ کے وجود کے اندر سے آپ کو بے حال کیے ہوئے ہیں۔

''شہر بانو بتا رہی تھی کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تم بہت رو رہی تھیں۔'' شہباز اس دن آفس سے گھر آتے ہی اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اس وقت وارڈ روب سے کپڑے نکال رہی تھی۔ ہر روز کی طرح اس نے شہباز کا استقبال گھر کے دروازے پر نہیں کیا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہباز کو دیکھا تھا۔ وہ مرد جس کی وجاہت پر وہ کبھی مرمٹی تھی اس وقت اسے ایک بھوت کی شکل میں نظر آ رہا تھا۔ مکروہ آنکھوں، سیاہ داغدار شکل، طوطے جیسی مڑی ہوئی ناک اور لمبے نوکدار زرد ٹیڑھے میڑھے دانتوں والا ایک چہرہ...... جس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس سے خوف زیادہ آتا ہو گا یا گھن......

اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی شہباز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں تھی۔ سرخ سوجی ہوئی آنکھیں، ستا ہوا چہرہ اور رگڑ رگڑ کر سرخ ہو جانے والی ناک۔

''کیا ہوا ڈارلنگ؟'' وہ جیسے کچھ بے چین انداز میں اس کو console کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔

''آج میں مسز ایلکس سے ملی۔'' اس کے ٹھنڈے لفظوں نے شہباز کے قدموں میں جیسے زنجیر ڈالی تھی۔ وہ فریز ہو گیا تھا۔ اتنے سالوں بعد اس نام کی بازگشت اسے آسیب کی آواز جیسی لگی تھی۔

''تم نے چڑیا کے ساتھ کیا کیا تھا؟'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا شرمین کے اگلے سوال نے ایک پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔

''کون چڑیا؟'' وہ یہ سوال کرتے ہوئے بھی شرمین کا چہرہ دیکھتے ہوئے جانتا تھا وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔

''تم چڑیا کو نہیں جانتے؟'' شرمین نے ایک قدم آگے بڑھا کر اس سے پوچھا۔

"نہیں؟" شہباز کے پاس انکار کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک زوردار تھپڑ نے شہباز کو کسی مزید جھوٹ کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"چھپایا تمہاری بیٹی تھی...... جیسے شہربانو...... جسے ساری دنیا کے مردوں سے چھپائے پھرتے ہو تم...... اس لیے چھپائے پھرتے ہو؟" وہ چلائی تھی۔

"دیکھو تم کچھ غلط سمجھ رہی......" شہباز جانتا تھا سب کچھ ڈوب چکا تھا۔ اس نے پھر بھی جیسے اپنا گھر بچانے کی آخری کوشش کی۔

"ایک لفظ بھی مت کہنا تم شہباز حسین...... میں تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔" وہ وارڈ روب سے دوبارہ اپنے کپڑے نکالنے لگی تھی۔

"شرمین میری بات سنو۔" وہ لپکتا ہوا اس کی طرف آیا تھا۔

"تم مجھے ہاتھ بھی مت لگانا۔" اس نے اسے قریب نہیں آنے دیا تھا۔

"وہ سب سازش کر رہے ہیں میرے خلاف...... تم کو اندازہ نہیں ہے کہ سسٹر ایگنس مجھے تباہ کرنا چاہتی ہے...... کوئی بات ہوتی تو خیر دین میرے خلاف کیس کرتا...... تمہارے پاس آتا...... پریس میں جاتا...... سسٹر ایگنس بکواس کر رہی ہے۔" شہباز کو اندازہ نہیں تھا وہ اس وقت اعترافِ جرم کرنے کے بجائے جھوٹ بولنے پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہا تھا۔

"میں خیر دین سے مل کر آئی ہوں...... تم نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا وہ سن کر آئی ہوں...... جھوٹ بولنا چھوڑ دو شہباز کم از کم...... اب چھوڑ دو۔" وہ غرائی تھی۔ شہباز حسین کو جیسے قسمت نے ایک پنجرے میں ڈال دیا تھا۔

"وہ بھی بکواس کرتا ہے...... یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں...... مجھے اور میری فیملی کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں، تم ان نوکروں کی ذہنیت سے واقف نہیں ہو...... میں جانتا ہوں۔" شہباز عجیب بے بسی اور خوف سے چلایا تھا۔ اسے اپنا گھر ٹوٹتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"اور تم...... تمہاری ذہنیت کیا ہے؟ تمہیں تو جیل میں ہونا چاہیے شہباز...... اور آج نہیں تو کل تم جیل میں ہی ہو گے۔" وہ اس پر چلاتے چلاتے رو پڑی تھی۔ "تمہیں شہربانو کا سوچنا چاہیے تھا۔ میرا سوچنا چاہیے تھا...... یہ سب کرتے ہوئے...... اتنا گرتے ہوئے...... اس طرح جانور بنتے ہوئے۔" وہ روتے ہوئے اس سے کہتی گئی تھی۔ شہباز اسے وضاحتیں دینے کے لیے ایڑیاں رگڑتا رہا تھا اور اس کی ہر وضاحت اسے شرمین کی نظروں میں کچھ اور گراتی گئی تھی۔ شہباز کی سر توڑ کوشش کے باوجود وہ اس کا گھر چھوڑ کر شہربانو کو لیے وہاں سے ایک ہوٹل میں چلی آئی تھی۔ شہباز حسین کے گھر میں وہ اس کا آخری دن تھا۔

"مجھ سے یہ مت پوچھیں کہ میں شہباز کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتی لیکن مجھے اس سے الگ ہونے دیں۔" امریکا واپس آ کر پاکستان خلع کے لیے کیس فائل کرنے سے پہلے اس نے اپنے ماں باپ سے کہا تھا۔ اس کے لیے وہ وجہ اپنے ماں باپ کو بھی بتانی شرمناک محسوس ہو رہی تھی جو اس کے اور شہباز کے درمیان علیحدگی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ ایک راز تھا جو اس نے کبھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا صرف اس لیے کہ شہربانو کی زندگی پر اس انکشاف کے بہت سے منفی اثرات ہو سکتے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اس فیصلے نے شہربانو کی نظروں میں اسے ایک ولن بنا دیا تھا لیکن وہ یہ قیمت ادا کرنے پر تیار تھی۔

اور اب اتنے سالوں بعد وہ شہربانو کو اسی دوراہے پر دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

آپ نے شہربانو سے کوئی بات کی ہے؟" شیر دل نے رسمی علیک سلیک کے بعد کسی تمہید کے بغیر منزہ سے فون پر پوچھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس غیر متوقع سوال کا جواب منزہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"کیا بات؟" منزہ کو کوئی اور جواب نہیں سوجھا تھا۔

"ممی وہ میری کال نہیں لے رہی۔ آپ نے کیا کہا ہے اس سے؟" شیر دل نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے وقفے وقفے سے شہر بانو کو کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی اور وہ اب بے حد اپ سیٹ ہو رہا تھا۔

"تم نے عکس کو سمجھانے سے انکار کیا تھا تو پھر مجھے شہر بانو سے بات کرنی ہی تھی، میں نے اس سے صرف یہ کہا تھا کہ وہ تمہیں سمجھائے۔" منزہ نے بے حد آرام سے کہا۔ شیر دل ان کے انداز پر حیران رہ گیا تھا۔

"ممی میں نے آپ کو منع کیا تھا۔"

"اور میں نے بھی تم سے کہا تھا تم عکس کو یہ کیس واپس لینے پر مجبور کرو۔"

"عکس اپنی زندگی کے فیصلے مجھ سے پوچھ کر نہیں کرتی اور نہ ہی میں اسے کسی چیز کے لیے مجبور کر سکتا ہوں...... وہ اپنے ہر فیصلے میں آزاد ہے۔" شیر دل نے دو ٹوک انداز میں ایک بار پھر ماں کے سامنے وہی بات دُہرائی تھی جو وہ پہلے بھی کہہ چکا تھا۔

"تمہیں اپنی فیملی کی پروا نہیں ہے، تمہیں انکل شہباز کی پروا نہیں ہے، تمہیں اپنی بیوی کے مرے ہوئے باپ کی عزت کا خیال نہیں ہے، تمہیں پروا ہے تو اس دو ٹکے کی لڑکی کی۔" منزہ کو اس کی بات پر یک دم غصہ آ گیا تھا۔

"ممی فرض کریں وہ میری دوست نہ ہوتی، میں اس کو جانتا بھی نہ ہوتا اور یہ کیس فائل ہو جاتا انکل شہباز کے خلاف تب کیا ہوتا؟"

"تم میرے ساتھ امکانات کی بات نہ کرو حقائق کی بات کرو۔" وہ اس کی بات پر مزید خفا ہوئی تھیں۔

"حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں ممی...... ان کا سامنا کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔"

"تم میرے سامنے فلسفہ بولنے کی کوشش مت کرو۔"

"آپ کو اندازہ ہے کہ آپ نے شہر بانو کو اس کیس کے بارے میں بتا کر کتنا ہرٹ کیا ہوگا...... آپ انکل شہباز کے حوالے سے اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہیں پھر بھی آپ نے لحاظ نہیں کیا۔" شیر دل نے بات کا موضوع بدل دیا تھا۔

"شیر دل تمہیں شہر بانو کی ذہنی اور جذباتی حالت کی پروا نہیں ہے، تمہیں ٹینشن صرف اس بات کی ہے کہ شہر بانو کو عکس کے حوالے سے تمہارے تعلق اور رشتے کی نوعیت کا پتا چل گیا ہے۔" شیر دل چند لمحے جیسے صدمے سے بول نہیں سکا تھا۔

"آپ نے شہر بانو کو کیا بتایا ہے میرے اور عکس کے بارے میں؟"

"جو کچھ تھا اور جو کچھ ہے...... سب کچھ......" منزہ نے انتہائی سنگ دلی سے کہا۔ "اور میں کیوں نہ بتاتی...... میں تم سے ڈرتی تو نہیں ہوں۔"

"عکس اور میرے درمیان جو بھی تھا وہ یکطرفہ تھا...... وہ بھی میری طرف سے...... اور وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے...... پرانی بات ہو گئی ہے اب...... میں اس کے ساتھ کوئی افیئر نہیں چلا رہا اب...... اس کی شادی ہونے والی ہے میں نے آپ کو بتایا تھا...... میں بھی شادی شدہ ہوں ایک بچے کا باپ ہوں...... آپ کیا سمجھتی ہیں میرے اور اس کے رشتے کو......؟ ہم دوست ہیں اور کچھ نہیں ہے ہمارے درمیان۔" وہ اب شدید غصے میں تھا اور اس کی خفگی نے منزہ کو یک دم کچھ defensive کر دیا تھا۔

"تم دوست ہو یا جو بھی ہو...... تم اسے سمجھا سکتے ہو منع کر سکتے ہو یہ سب کچھ کرنے سے...... وہ میرے مرے ہوئے بھائی کی عزت اچھالنے پر تل گئی ہے۔" منزہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بات بدل دی تھی۔

"اگر شہباز انکل نے اس کے نانا کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو اسے پورا حق ہے کورٹ کے ذریعے اپنا حق لینے

کا...... میں اور آپ اس کا گلا نہیں دبا سکتے۔" شیر دل نے انتہائی خفگی سے آخری جملہ کہا تھا اور پھر مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا اسے پتا نہیں کیا یاد آ گیا تھا۔ انسان کا لاشعور بعض دفعہ اپنے اندر چھپے راز بیچ بازار تھوک دیتا ہے۔

"تم اپنے انکل کو جانتے ہو پھر بھی یہ باتیں کر رہے ہو...... شہباز کسی کے ساتھ ناانصافی، زیادتی کر سکتا ہے؟" منزہ نے بھی اس بار چلا کر کہا۔ "کوئی لاکھ بار بھی آ کر کہے تو بھی میں نہیں مانوں گی...... مان ہی نہیں سکتی...... وہ میرا بھائی تھا...... اس کی ساری عمر میرے سامنے گزری ہے...... اور......" شیر دل نے ماں کی بات کاٹ دی۔

"آپ انکل شہباز کی خاطر اب میرا گھر تڑوا دیں گی۔ شرمین آنٹی نے فون کیا تھا مجھے...... شہر بانو نے یقیناً سب انہیں بتا دیا ہے میں جس mess کو سمیٹنا چاہتا تھا آپ نے اسے بہت بڑھا دیا ہے میرے لیے۔" شیر دل نے بے حد تلخی سے ماں سے کہا۔ منزہ کچھ دیر بول ہی نہیں سکی۔ وہ شہر بانو سے اس کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

"شرمین نے تمہیں فون کیا تھا؟ میں نے شہر بانو کو منع کیا تھا اس سے بات کرنے سے۔" منزہ کو پہلی بار کچھ regret ہوا۔

"میں نے بھی آپ کو منع کیا تھا شہر بانو سے کچھ بھی کہنے سے...... اگر آپ میری بات اگنور کر سکتی ہیں تو شہر بانو آپ کی بات کیوں مانے گی؟" شیر دل نے تلخی سے ماں سے کہا۔

"کیا کہا شرمین نے تم سے؟" منزہ اب شدید اضطراب میں تھی۔

"میری ان سے بات نہیں ہو سکی...... اب کرنا چاہتا ہوں۔" شیر دل انہیں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ شرمین کی کال عکس نے ریسیو کی تھی اور اس کا فون عکس کے پاس تھا۔ یہ منزہ کے غصے کو نئے سرے سے جگانے کا باعث بنتا۔

"مجھے لگتا ہے مجھے اب تمہارے باپ سے بات کرنی چاہیے...... عکس کے خلاف کوئی محکمانہ کارروائی ہو گی تبھی اس مسئلے کا کوئی حل نکلے گا۔" منزہ نے یک دم جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"ممی آپ ایک mess کھڑا کر چکی ہیں ایک اور مت کریں...... آپ پاپا سے اس طرح کی کوئی چیز نہیں کروائیں گی۔ جس سے اس کے کیریئر کو کوئی نقصان پہنچے۔" شیر دل نے دو ٹوک انداز میں ماں کو خبردار کیا۔

"تم اس کو اس کیس کو واپس لینے پر رضامند نہیں کرو گے اور تم اس کے خلاف کچھ کرنے نہیں دو گے...... شیر دل تم اس کے لیے اپنے خاندان کو تماشا بنواؤ گے...... اور وہ میں نہیں ہونے دوں گی۔" منزہ نے بڑی تلخی کے ساتھ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ شیر دل فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے پہلے ازدواجی کرائسس میں پھنسا تھا اور فی الحال اسے اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ وہ شہر بانو سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا تھا...... سنگاپور میں بیٹھے آنے والے دنوں کا تصور اسے ہولا رہا تھا۔ ایک دن پہلے تک...... صرف عکس کی پریشانی تھی جو اس کی ایڑھی کا کانٹا بنی ہوئی تھی اور اب یک دم شہر بانو کی خفگی...... وہ زندگی میں پہلی بار اس سے خفا ہوئی تھی شیر دل کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی خفگی کو کس طرح دور کرے اس سے پہلے چھوٹے موٹے معمولی جھگڑے ہوتے تھے ان دونوں کے درمیان جن کا دورانیہ چند گھنٹوں سے زیادہ کبھی نہیں بڑھ پایا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے تھے اور شیر دل اسے خفا نہیں رہنے دیا کرتا تھا۔ شہر بانو بچے کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہل جایا کرتی تھی اور شیر دل نے اس کی خفگی کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ خفا تھی اور دور تھی اور اسے بات یا وضاحت کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا منزہ نے شہر بانو سے کس طرح بات کی تھی خاص طور پر عکس کے حوالے سے...... لیکن شہر بانو کے اس طرح سے غائب ہو جانے سے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی کہا گیا تھا وہ شہر بانو کے لیے بہت زیادہ پریشان کن تھا۔

سنگاپور میں قیام کے باقی دنوں میں سر توڑ کوشش کے باوجود وہ شہر بانو سے بات نہیں کر سکا تھا۔ فون اٹھایا جاتا اور اس کی آواز سنتے ہی کچھ کہے بغیر رکھ دیا جاتا اور یہ شرمین اور شہر بانو دونوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ اس نے بہت اپ سیٹ ہو کر بالآخر ایک دن فاروق کو کال کی تھی۔ فاروق کا رویہ بھی بے حد سرد مہری لیے ہوئے تھا اور اس نے بہت صاف لفظوں

میں اس سے کہا تھا کہ یہ اس کا اور شہر بانو کا مسئلہ ہے وہ اسی کے ساتھ حل کرے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے شہر بانو سے بات کرانے کے سلسلے میں بھی صاف انکار کر دیا تھا۔

شیر دل نے شدید خفگی اور ڈپریشن میں دوبارہ منزہ کو فون کیا تھا۔ ”آپ اب خود دوبارہ شہر بانو سے بات کریں...... یہ مصیبت میرے لیے آپ نے پیدا کی ہے آپ کی ذمے داری بنتی ہے کہ آپ اب اسے ختم بھی کریں۔“ شیر دل کو ماں سے شدید شکایت تھی۔ منزہ نے واقعی بیٹھے بٹھائے باہر جاتی پریشانی کو اس کے گھر لا بٹھایا تھا اور منزہ کو اب اس کا احساس ہونے لگا تھا۔

”بیٹا میں نے تم کو شیر دل کو سمجھانے کے لیے کہا تھا یہ نہیں کہا تھا کہ تم اس سے بات چیت ہی ختم کر دو۔“ منزہ نے شیر دل سے بات کرنے کے بعد اس دن شہر بانو کو فون کیا تھا۔ شیر دل کے فون کے برعکس شہر بانو نے منزہ کی کال ریسیو کر لی تھی۔

”ممی میں ایک ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہوں گی جو مجھ سے sincere نہیں ہے۔ اگر اس کے لیے کوئی دوسری عورت اہم ہے تو اسے اس دوسری عورت کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔“ شہر بانو نے دوٹوک انداز میں کہا۔

”تم کیا حماقت کرنا چاہ رہی ہو؟“ منزہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”تم یہ چاہتی ہو کہ وہ اس عورت کے ساتھ مل کر شہباز کی عزت اور نام خراب کرے؟ اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے پاپا کا ہی خیال کرو تم۔“ منزہ نے اسے سمجھانے کی کوششوں کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے تم سے کہا تھا اپنی ممی سے ذکر مت کرنا تم نے ان سے بات کیوں کی اس معاملے پر...... تم ہماری فیملی کا حصہ ہو شرمین کی فیملی کا نہیں...... شرمین نہ اس مسئلے کو سمجھ سکتی ہے نہ ہی وہ اس کا حل نکال سکتی ہے۔ وہ صرف تمہیں غلط مشورے دے سکتی ہے۔“ منزہ نے بے حد تنفر سے کہا تھا۔

”ممی انہوں نے مجھے کوئی مشورہ نہیں دیا اور میں نے ان سے پوری بات ڈسکس نہیں کی صرف شیر دل اور عکس کے افیئر کے حوالے سے بتایا ہے۔“

”بس تو پھر کافی ہے اتنا ہی...... تمہیں اس سے زیادہ شرمین کو بتانا بھی نہیں چاہیے۔ تم پاکستان آ جاؤ اور یہاں آ کر شیر دل سے بات کرو۔“ منزہ نے جیسے سکون کی سانس لی تھی کہ شہر بانو نے شرمین سے بہت کچھ چھپا لیا تھا۔ شہر بانو انکار کرنا چاہتی تھی لیکن وہ منزہ کو انکار نہیں کر سکی تھی۔ وہ شیر دل کا فون نہیں لے رہی تھی اور وہ اسے اور شرمین کو کالز پر کالز کر رہا تھا لیکن اب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات نہ کرنے سے اور امریکا میں بیٹھے رہنے سے بھی کیا ہوگا۔ اس مسئلے کا حل بات چیت سے ہی نکلنا تھا آخر میں...... اسے شیر دل کی بات سننی ہی تھی...... لیکن وہ شیر دل کے منہ سے اب عکس کا نام نہیں سننا چاہتی تھی۔ وہ اتنے سالوں بعد بڑی خوشی سے امریکا چھٹیاں گزارنے آئی تھی لیکن اب اس کی واپسی عجیب احساسات کے ساتھ ہونے والی تھی۔

”ممی آپ نے پاپا سے divorce کیوں لی تھی؟“ شہر بانو نے شرمین کو اپنے اور منزہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اس نے شرمین کو یہ ضرور بتا دیا تھا کہ وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کیونکہ وہ شیر دل سے اس سلسلے میں آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا چاہتی تھی۔ شرمین نے اسے روکنے یا منع کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن وہ خود اندر سے بہت سے خدشات کا شکار تھی۔ اس نے شہر بانو کو اس رات شیر دل کا فون ملانے پر عکس کے فون اٹھانے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ شہر بانو کو یہ بات بتا سکتی۔ شہر بانو نے اس سے کہا تھا کہ عکس کی کچھ عرصے تک شادی ہونے والی تھی اور لاشعوری طور پر شرمین کو یہ آس بندھ گئی تھی کہ اس کی شادی کے ساتھ ہی یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ کرائسس اس کی بیٹی کی زندگی سے ختم ہو جائے گا۔ شیر دل اس کی نظروں سے بری طرح گر گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جیسے اپنی بیٹی کی خوشیاں اور گھر بچانے کے لیے اسے ایک آخری موقع دے رہی تھی۔ اس ساری گفتگو کے دوران شہر بانو نے وہ سوال کیا تھا۔ شرمین کچھ دیر کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے کئی سالوں بعد اس سے دوبارہ یہ سوال پوچھا تھا اس کے باوجود کہ وہ اس کو جواب دے چکی تھی۔

”تمہیں بتایا تھا میں نے...... ہم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ نہیں تھی۔“ شرمین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے پتا نہیں کون کون سا زخم ہرا ہو گیا تھا اس کا۔

”انڈر اسٹینڈنگ نہ ہو تو انسان اتنے سال تو اکٹھے نہیں رہتا...... بس دو چار سال میں سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔“ شہر بانو نے ماں کی بات کو پہلی بار کھلے لفظوں میں رد کرتے ہوئے کہا۔

”بعض شادیاں سالوں چلنے کے بعد بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔“ شرمین نے عجیب دل گرفتگی کے عالم میں کہا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا جب شہباز سے اپنی شادی کے بارے میں بات کرتے ہوئے شہر بانو نے شرمین کو رنجیدہ دیکھا تھا ورنہ وہ ہمیشہ ایک بے تاثر چہرے اور سرد مہر لہجے میں اس ایشو پر بات کرتی تھیں یوں جیسے وہ کسی اور کی زندگی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔

”ایسا کیا ہوا تھا آپ میں اور ان کے درمیان کہ آپ نے divorce جیسا بڑا فیصلہ کر لیا۔“ شہر بانو نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔

”تمہیں آج بیٹھے بٹھائے مجھ سے یہ پوچھنے کا خیال کیسے آ گیا؟“

”ہمیشہ ہی پوچھنا چاہتی تھی آپ نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔“ شہر بانو نے ماں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بہت وقت گزر گیا بہت پرانی بات ہو گئی اب اس کے بارے میں بات کرنے کا کیا فائدہ...... زندگی بہت آگے آ گئی ہے۔“ شرمین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”میرے لیے نہیں آئی...... میری زندگی کا ایک حصہ، پاپا کے ساتھ بندھا ہوا تھا وہ آج بھی وہیں ہے۔“ بہت تکلیف وہ اعتراف تھا یہ شہر بانو کا اور اتنا ہی تکلیف دہ یہ شرمین کے لیے تھا۔ شہر بانو، شہباز سے کس طرح اٹیچڈ تھی شرمین کو اس کا اندازہ اور احساس تھا اور شادی کے اس رشتے کو توڑتے ہوئے اگر اسے کسی چیز کی سب سے زیادہ تکلیف تھی تو وہ یہی تھی۔ جھگڑے کی وجہ وہ نہ ہوتی جو تھی تو وہ شہر بانو کو شہباز سے اس طرح دور نہ کرتی لیکن پتا نہیں اسے شہباز اور شہر بانو کے حوالے سے عجیب سے وہم ہوتے تھے۔ نفسیاتی طور پر وہ شہر بانو کو شہباز کے پاس اکیلا چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور یہ ایک ایسا خوف اور وہم تھا جسے وہ کسی کے ساتھ شیئر کر کے اس سے نجات حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ شہباز، شہر بانو کا باپ تھا اور یہ سوچنا بھی شرمناک تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ کوئی غلط حرکت کر سکتا تھا لیکن شرمین اس ایک انکشاف کے بعد ہر طرح کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئی۔ اس کا گھر زمین بوس نہیں ہوا تھا، اس کی پوری شخصیت زمین پر آ گری تھی۔ شہباز اپنے جرم کا اعتراف کرنے پر تیار نہیں تھا اور اس کی اس ڈھٹائی نے شرمین کے خوف اور عدم تحفظ کو بڑھا دیا تھا۔ وہ شہباز سے اعترافِ جرم کا مطالبہ کر رہی تھی اور وہ اس سے انکاری تھا۔

”تم خود سوچو میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ میں ذہنی طور پر بیمار ہوں کیا؟“ اسے منانے کی کوششوں کے دوران وہ بار بار ایک ہی جملہ بولتا رہتا تھا اور ایک پوائنٹ پر آ کر شرمین چلا اٹھی تھی۔

”تم ذہنی طور پر بیمار ہو۔ تمہیں علاج کی ضرورت ہے۔ اس inode of denial سے باہر نکل آؤ شہباز...... کم از کم اب جب تم یہ بھی جانتے ہو کہ سب کچھ پتا چل گیا ہے مجھے۔“ شہباز پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ سب ٹھیک ہو جاتا اگر اسے منزہ کی اتنی بھرپور اور کھلی حمایت نہ ملتی۔ اسے اپنی زندگی میں کبھی اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا نہ ہوتا اگر خلع ہو جانے کے کچھ عرصے کے بعد شہباز نے خودکشی نہ کر لی ہوتی۔

اس کی موت نے شرمین کو اس سے رشتہ ختم ہو جانے کے باوجود بری طرح توڑ دیا تھا...... وہ پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے فیصلے کے نتائج کے بارے میں دوبارہ سوچنے کی کوشش کی تھی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ شہباز حسین کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی اس کی زندگی کا بہترین حصہ تھا جب تک اسے چڑیا کے بارے میں پتا نہیں چلا تھا اور زندگی کے بہترین حصے کو اپنی یادوں سے مکمل طور پر کاٹ دینا آسان نہیں تھا...... فاروق کے زندگی

میں آجانے کے بعد بھی...... وہ شہباز کے لیے کبھی کسی کے سامنے نہیں رو سکی تھی...... یہ کام اس نے ہمیشہ اکیلے میں کیا تھا۔ کسی چیز پر جج بن کر فیصلہ کر دینا ایک بات ہوتی ہے لیکن اس فیصلے کے ہاتھوں ساری زندگی suffer کرنا ایک دوسری بات...... ضمیر کی آواز پر اس نے فیصلے تو کیے تھے لیکن زندگی ان فیصلوں کے بعد بھی کبھی آسان نہیں لگی تھی شرمین کو۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا ہے پھر؟" شرمین نے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"پاکستان جا رہی ہوں میں...... شیر دل سے بات کروں گی اور اگر کوئی حل نہ نکلا تو......" شہر بانو بات مکمل نہیں کر سکی تھی۔ شرمین نے اس تو کے بعد اگلے جملے کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

"جو بھی تم بہتر سمجھتی ہو کرو لیکن بس ہمیشہ یہ یقین رکھنا کہ تم اپنے ہر فیصلے میں مجھے ساتھ پاؤ گی۔" شرمین نے اسے تسلی دی تھی۔ شہر بانو نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا کہ کہنے کے لیے اب اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ غرور اور فخر جو وہ شیر دل کی ذات کی وجہ سے لیے پھرتی تھی وہ ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

خیر دین کی حالت آہستہ آہستہ سنبھلنے لگی تھی اور اس کی حالت کے سنبھلنے کے ساتھ ساتھ جیسے عکس کی جان میں جان آنا شروع ہو گئی تھی۔ حلیمہ بھی پاکستان واپس آچکی تھی اور ہاسپٹل میں ہی اس نے جواد یا اس کی فیملی کی طرف سے کسی قسم کا رابطہ نہ ہونے پر عکس سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

"میں نے جواد کو سنگاپور سے ہی نانا کے بارے میں انفارم کیا تھا اور اس نے نانا کے پاس آنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن پتا نہیں اس کے بعد کیا ہوا...... میرے اسٹاف نے کہا کہ وہ ایک بار آیا تھا میرے پاکستان پہنچنے سے پہلے کی بات ہے...... لیکن بس اس کے بعد اس کے ساتھ میرا کوئی رابطہ نہیں۔ میں نے چند ایک بار فون کیا تھا اسے لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی پھر میں نے بھی دوبارہ کال نہیں کی...... یہاں نانا کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ آفس سے چھٹی پر ہوں لیکن وہاں سے بھی کالز پر کالز اٹینڈ کرتی رہی ہوں سارا دن۔" وہ حلیمہ کو تفصیل سے جواد سے رابطے کے حوالے سے بتا رہی تھی جو بات وہ ماں کو نہیں کہہ پا رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ جواد کے اس رویے اور بے اعتنائی سے بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔ وہ مستقبل میں اس کا لائف پارٹنر بننے والا تھا اور اس کی زندگی کے اس مشکل وقت میں اس نے اس سے مکمل طور پر رابطہ ختم کر دیا تھا۔ وہ سپورٹ جو وہ اس سے چاہتی تھی وہ اسے شیر دل سے مل رہی تھی۔ وہ پاکستان میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے رابطے میں تھا۔ ہاسپٹل انتظامیہ سے رابطے میں تھا۔ اس کی رہائش کے انتظامات فوری طور پر اس کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اس کا اسٹاف تقریباً ہر روز اس سے رابطہ کر کے کسی بھی کام کے حوالے سے اپنی خدمات پیش کر رہے تھا۔ شیر دل کا اثر و رسوخ اس کے اثر و رسوخ سے کہیں زیادہ تھا اور اس کی وجہ سے خیر دین کو ہاسپٹل میں وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جا رہا تھا...... اور وہ اگر نہ ہوتا تو عکس کو بہت سارے کاموں کے لیے بہت سارے لوگوں کو کہنا پڑتا...... اثر و رسوخ جواد اور اس کی فیملی کا بھی کم نہیں تھا لیکن ان کی طرف سے اس کے لیے کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ باقی سب کچھ وہ اگر نظر انداز کر بھی دیتی تو اس کے لیے یہ نظر انداز کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کسی نے عیادت کے لیے بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

"میں سوچ رہی ہوں میں فون کرتی ہوں جواد کو۔" حلیمہ نے اس سے کہا تھا۔

"امی آپ کو نہیں لگتا کہ یہ اس کی ذمّے داری ہے۔" عکس نے...... بے حد سنجیدگی سے ذکر نہ کرتے ہوئے بھی جواد کی بے اعتنائی جتائی تھی۔

"ہاں فرض تو بنتا تھا ان کا...... اور یہ اچھا نہیں کیا اس نے لیکن پھر بھی وہ...... چلو ایک بار ابا کو دیکھنے تو آیا تھا...... میں سوچ رہی تھی ہو سکتا ہے کوئی مصروفیت ہو۔" عکس نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مصروفیت کسی کو ایک کال کرنے سے تو منع نہیں کرتی۔"

"گلے شکوے تو ہوتے رہتے ہیں بیٹا...... سسرال والے یہی سب کرتے ہیں...... اتنا بڑا اور اونچا خاندان ہے ان کا...... ہم تو ان سے شکایت بھی نہیں کر سکتے۔" حلیمہ نے بالآخر اپنے احساسِ کمتری کا اظہار کیا تھا۔ عکس کو ماں کی اس بات پر شدید تشویش ہوئی تھی۔ اس کے لیے جواد "خاندان" نہیں تھا اس کے لیے جواد "جواد" تھا۔ زندگی میں اگر ایک چیز اس کے اندر خیر دین نے کبھی نہیں آنے دی تھی تو وہ احساسِ کمتری تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی اپنے "سابقوں" اور "لاحقوں" کو نہیں چھپایا تھا۔ اپنے "حوالوں" پر شرم محسوس نہیں کی تھی۔ وہ "اچھے" خاندان کو پہچان سکتی تھی۔ "اونچے" خاندان کی تعریف اور شناخت سے لاعلم تھی۔ اور اب حلیمہ اس کے سامنے ایک عجیب سوال لے آئی تھی۔ اس نے حلیمہ سے بحث نہیں کی تھی اس کے اصرار پر اس بار اپنے بجائے اپنے اسٹاف سے فون لے کر جواد کو کال ملائی تھی۔ کال unknown نمبر کی وجہ سے ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ بے عزتی محسوس کرنا چاہتی تو یہ بھی کافی تھی۔ غیر متوقع طور پر اس کی آواز سننے پر جواد کچھ دیر کے لیے گڑبڑا گیا تھا۔ پھر اس نے نارمل ہوتے ہوئے اس سے حال چال پوچھا، نانا کے بارے میں دریافت کیا۔

"امی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" عکس نے اس سے کہا اور اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس سے کہا۔

"میری امی بھی تمہاری امی سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ عکس پوچھے بغیر نہیں رہ سکیں۔

"کس لیے؟"

"میرے پیرنٹس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔" وہ فوری طور پر کچھ بول نہیں سکی۔ چند ہفتوں پہلے تک وہ خود اس رشتے کو ختم کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اس کے باوجود چند لمحوں کے لیے اسے عجیب ٹھیس سی لگی تھی جواد کے منہ سے یہ بات سن کر۔

"میں وجہ جان سکتی ہوں؟" اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جواد سے پوچھا۔

"وجہ تم اچھی طرح جانتی ہو عکس۔"

"اگر میں جانتی ہوتی تو تم سے کبھی نہ پوچھتی۔"

"تمہیں شیر دل اور اپنے بارے میں مجھے بتانا چاہیے تھا...... لیکن تم......" وہ رشتہ ختم کرنے کے بارے میں سن کر اتنا شاکڈ نہیں ہوئی تھی جتنا جواد کے منہ سے شیر دل کا نام سن کر۔

"تم اگر شیر دل کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھیں تو......" جواد کے لہجے میں عجیب سی خفگی تھی۔ عکس نے بے حد الجھ کر اس کی بات کاٹی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں شیر دل سے شادی کرنا چاہتی تھی؟"

"اس کی ممی نے میری ممی کو فون کیا تھا۔" عکس کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ آخری چیز جس کی توقع وہ منزہ بختیار شیر دل سے کر سکتی تھی وہ یہی تھی جو وہ کر چکی تھی۔

☆☆☆

"آپ اسے suspend کروائیں...... اس کے خلاف کوئی انکوائری کروائیں لیکن اس کو سبق سکھا دیں، اسے پتا چل جائے کہ اس طرح کی حرکت کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ آپ ذرا سوچیں ہماری فیملی کی عزت خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے...... پتا نہیں کہاں سے یہ کمی کمینوں کے بچے آ رہے ہیں سول سروس میں اور پھر آ کر خاندانی لوگوں کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں......" منزہ پچھلے پندرہ منٹ سے بختیار شیر دل کے سامنے عکس کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف تھی۔ بختیار کو اس کورٹ نوٹس کا علم ہو گیا تھا کیونکہ کورٹ کی طرف سے ویسا ایک نوٹس ایس اینڈ جی اے کو بھی موصول ہو گیا تھا اور اس کے بعد یہ خبر بختیار تک پہنچنی مشکل نہیں تھی۔ وہ جیسے کیس کی نوعیت سے زیادہ کیس کرنے والے کے بارے میں سن کر ہکا بکا ہوئے تھے۔ عکس کی شیر دل کے ساتھ دوستی سے وہ واقف تھے اور کسی کو بھی شاک

لگتا اگر انہیں ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ نہ ہوتا۔ کیس کی details شاک کی شدت بڑھانے کے لیے کافی تھیں۔

انہوں نے گھر آ کر منزہ سے اس بارے میں بات کی تھی اور منزہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہیں رہا تھا کہ وہ عکس کے خلاف جتنا زہر اگل سکتی تھی اگلتی۔

''شہباز کی reputation ایک ایماندار اور قابل آفیسر کے طور پر تھی۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ کسی ملازم کے ساتھ بغیر کسی وجہ کے اتنی بڑی زیادتی کرے اور وہ ملازم اتنے سال چپ رہنے کے بعد اب اس کے لیے کیس کر رہا ہے۔'' بختیار کے لیے بھی کیس کی مندرجات سے متفق ہونا مشکل تھا۔

''یہ آدمی چور تھا...... چوریاں کرتا رہا شہباز کے گھر میں...... اور وہ اس پر اتنا ٹرسٹ کرتا تھا۔ جب پکڑا گیا تو شہباز نے اسے نکال دیا اور اس پر ترس کھاتے ہوئے اس کے خلاف کیس نہیں کیا لیکن اس نے شرمین سے مل کر اسے شہباز کے خلاف بھڑکایا۔ شہباز پر بہت گھناؤنا الزام لگایا...... شرمین نے اسی آدمی کی باتوں میں آ کر شہباز کو چھوڑا تھا...... میرے تو یہ سامنے آجائے تو میں اسے شوٹ کردوں ......'' منزہ بالکل آگ بگولا تھی۔ معاملے کو وہ جتنا لپیٹنے اور hushed up رکھنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا ہی پھیلتا جا رہا تھا۔

''کیا الزام لگایا تھا اس نے شہباز پر؟'' بختیار نے یک دم اس سے پوچھا۔

منزہ چند لمحوں کے لیے کچھ بھی بول نہیں سکی تھیں۔ انہیں اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا انہیں بختیار کے سامنے الزامات کی بات شاید کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ یہ نہیں تھا کہ انہیں یہ خدشہ تھا کہ خیر دین کے لگائے ہوئے الزام کی نوعیت جان کر بختیار کو شہباز پر کوئی شبہ ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود وہ بختیار کے سامنے وہ الزام دہرانا نہیں چاہتی تھیں۔ شرمین اور شہباز کے درمیان طلاق والے معاملے کو بھی انہوں نے جس حد تک ممکن تھا بختیار سے چھپائے رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بختیار نے معاملہ بہت بار بگڑنے پر چند ایک بار اس معاملے کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن منزہ نے انہیں اس معاملے کے درمیان آنے نہیں دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں شرمین کے الزامات کی بازگشت بختیار تک پہنچے۔ اپنے اکلوتے بھائی کے نام اور عزت کو ہر طرح سے محفوظ رکھنے کے لیے منزہ کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھیں۔

''تم نے بتایا نہیں کہ شہباز پر کیا الزام لگایا تھا اس نے؟'' بختیار نے انہیں یوں گم صم دیکھ کر جیسے ایک بار پھر اپنے سوال کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ منزہ بے حد کنفیوزڈ تھیں۔

☆☆☆

عکس مراد علی کے suspend (معطل) ہونے کی خبر شیر دل کو لاہور ائیرپورٹ پر پہنچتے ہی مل گئی تھی۔ اس کا اسٹاف وہاں اسے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کے پی اے نے اسے مختلف معاملات پر update کرتے ہوئے عکس کی معطلی کی بھی اطلاع دی تھی شیر دل کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

''suspend ہوگئیں؟ کس لیے......؟ کب؟'' شیر دل نے بے حد اضطراب کے عالم میں پی اے سے پوچھا۔ ابھی پچھلی رات اس کی عکس سے بات ہوئی تھی اور اس سے بات چیت کے دوران اسے اس کے لہجے تک سے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کرائسس میں تھی۔

''کل آرڈرز نکلے ہیں اور وجہ کا نہیں پتا۔'' اس کے پی اے نے اسے جواباً بتایا تھا۔ شیر دل بہت اپ سیٹ ہوگیا تھا اس کی چھٹی حس نے اسے جیسے خبردار کیا تھا اور اگر یہ اس کی فیملی کی وجہ سے ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا یہ سارا معاملہ اس کے باپ تک پہنچ چکا تھا چیس بورڈ پر تمام چھوٹے پیادے پٹ چکے تھے۔ اب صرف بڑے مہرے رہ گئے تھے اور بڑے مہرے صرف سیدھی نہیں ٹیڑھی چالیں بھی چل سکتے تھے۔

(باقی آئندہ)

چند لمحے پہلے آئینے میں نظر آنے والے اپنے عکس کو اس بار اس نے خیر دین کی آنکھوں میں منعکس ہوتے دیکھا تھا۔

ایک سرخ اور سنہرے کامدار دوپٹے کے ہالے میں دلہن کا روپ لیے چمکتا ہوا اس کا چہرہ...... ماتھے کے بیچوں بیچ تاج کی طرح ٹکا اس کے لباس کے ہم رنگ سرخ پتھروں سے مرصع بیضوی شکل کا ایک ٹیکا...... اس کے کانوں میں ہلکورے لیتے لمبے لمبے جھمکے جن کے نچلے حصے پر لٹکتے سرخ باریک موتی اس کی قمیص کے گہرے گول گلے سے ہمیشہ کی طرح نمایاں کالر بون کو گردن کے ذرا سے خم پر چومنے لگتے تھے اور اس کی باریک صراحی دار گردن کے گرد موجود سرخ پتھروں کا وہ نیکلس جس کا نیچے کو نکلا ہوا سنہری بیضوی حصہ اس کی سرخ قمیص کے سرے کو چھو رہا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے شفاف اور واضح اس عکس کو دیکھ کر مبہوت نہیں ہوئی تھی۔ خیر دین کی آنکھوں میں اپنے دھند لائے ہوئے عکس کو دیکھ کر ہوگئی تھی۔ وہ اپنے نانا کی آنکھوں کی نمی میں ہلکورے لے رہی تھی یا شاید وہ اس کی اپنی آنکھوں کی نمی تھی جس نے خیر دین کی آنکھوں کی نمی میں.... دھندلاتے اس کے عکس کو کچھ اور دھندلا کر دیا تھا۔

لیکن خیر دین اور وہ پھر بھی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ...... بے یقینی کے ایک عجیب سے جہاں میں پہنچے ہوئے۔

اس کے چہرے سے بالآخر نظریں پہلے خیر دین نے ہی ہٹائی تھیں۔ وہ اپنی چڑیا کو اپنی نظر لگنے سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ یہ اس کا وہ روپ تھا جس کو دیکھنے کے لیے وہ کئی سالوں سے متمنی تھا اور آج اس روپ میں چڑیا کو دیکھتے ہوئے اس کا دل عجیب سی خوشی اور طمانیت کے ساتھ ساتھ بڑی عجیب سی کسک محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی چڑیا کو اپنا جیون ساتھی مل گیا تھا وہ اس کے ساتھ اب ایک نئے سفر پر اڑ جانے والی تھی۔

عکس نے خیر دین کو خود سے نظریں چراتے ہوئے آگے بڑھتے اور اسے اپنے ساتھ لپٹاتے دیکھا۔ وہ جذباتی نہیں تھی لیکن وہ اس لمحے رو دی تھی۔

وہ چند منٹ پہلے بیوٹی پارلر سے نکاح کی اس سادہ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچی تھی جو اسی گھر کے لان میں منعقد کی گئی تھی اور دروازے پر اس کا استقبال خیر دین نے ہی کیا تھا۔ وہ چڑیا کے چند گھنٹے پہلے پارلر جانے کے بعد سے وہاں مہمانوں کا استقبال کرتا وہاں سے ہلا نہیں تھا۔ اسے اپنی چڑیا کی واپسی کا انتظار تھا۔ دلہن کے روپ میں اس پر پہلی نظر ڈالنے کی بے قراری...... خیر دین کی نظریں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اور انہیں پائیں باغ کی طرف بھیجتے ہوئے بھی گیٹ پر جمی رہی تھیں۔

اور اب جب وہ گھر کے اندرونی دروازے کے سامنے گھر کے اندر جانے کے لیے اپنی چند دوستوں کے ساتھ کھڑی تھی تو خیر دین کا دل عجیب طرح سے بوجھل تھا۔ وہ عام لڑکی نہیں تھی نہ خیر دین نے اسے عام طرح سے پالا تھا پھر بھی وہ ایک لڑکی تھی اور خیر دین کا دل ویسے ہی اندیشوں اور خدشات سے دوچار تھا جیسے اندیشے کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو ایک انجان آدمی کے ساتھ ایک انجان سفر پر رخصت کرتے ہوئے رکھتا...... چاہے وہ انجان آدمی جیون ساتھی ہی کیوں نہ ہوتا۔ چاہے وہ انجان سفر زندگی کا سفر ہی کیوں نہیں ہوتا۔

خیر دین نے اسے کندھوں سے تھامے ہوئے اس کے جھکے ہوئے سر کو پھر ماتھے کو چوما، عکس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اپنے نانا کو دیکھا وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی اس نے خیر دین کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا دعائیں کر رہا تھا وہ اس کے ساکت ہونٹ سے بھی سن سکتی تھی۔ عکس مراد علی نے اپنی ساری زندگی میں ایسا مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شفیق تھا، رہبر تھا، دوست تھا، غم خوار تھا، اس پر جان چھڑکنے والا تھا

اور وہ اس کے لیے اپنی انا اور عزت کو ہر بار کی طرح اس بار بھی کہیں بہت پیچھے رکھ آیا تھا۔ ایسا کون ملے گا اسے جو اسے خیر دین کی طرح چاہے گا...... کبھی کوئی نہیں مل سکتا، کوئی اس جیسا ہو ہی نہیں سکتا، کوئی اس کے لیے اپنے دل میں ویسی غیر مشروط محبت رکھ ہی نہیں سکتا۔ چڑیا نے اپنے نانا کی آنکھوں میں یہ سب پڑھا تھا۔ کھلی کتاب کی طرح جس کا ایک ایک لفظ خود بول رہا تھا۔

بنا کچھ کہے اس نے خیر دین کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس ہاتھ کے لمس میں وہ تشکر جھلک رہا تھا جو عکس کے دل میں تھا اور جو اس کے نرم ہاتھ کی سخت گرفت میں تھا۔

''میں تمہارے بغیر بہت اداس ہو جاؤں گا چڑیا۔'' خیر دین نے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''نانا میں آپ کی زندگی سے کہیں جاؤں گی تو اداس ہوں گے نا آپ۔ میں کہیں نہیں جا رہی، میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہوں گی۔'' خیر دین رنجیدگی سے اس کی تسلی سنتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔ وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی۔

''رک کیوں گئیں؟'' خیر دین نے اسے گھر کے اندرونی دروازے میں رکتے دیکھ کر کہا۔

''نہیں...... ایسے ہی۔'' وہ چونکی تھی اور اس نے اپنے ان سات ساتھیوں سے نظریں ہٹا لی تھیں جو ایک بار پھر اس کا استقبال کرنے کے لیے وہاں موجود تھے اور جنہیں وہ ہمیشہ اس گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہیں نہ کہیں دیکھتی رہی تھی۔ وہ سات اس کی زندگی کے اس نئے سفر پر اسے رخصت کرنے کے لیے ایک بار پھر وہاں موجود تھے۔

ٹوفو اس کے روپہلی چوڑی دار پاجامے کی چوڑیوں کے ساتھ لٹکا اپنا توازن برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ کنفا اس کی پینسل ہیل والے جوتے کے اسٹرپ سے چپکا اس کے پیروں پر بنے مہندی کے نقش و نگار پر غور فرمانے میں مصروف تھا۔ مٹھا ایک باجا پکڑے گھر کی دہلیز پر ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے اسے بجانے میں لگا تھا۔ ڈیڈوا اچھل اچھل کر اس کے ٹخنوں تک پہنچتی سرخ قمیص کے سنہری کامدار دامن کو پکڑنے کی کوشش میں لگا تھا۔ ٹوکو اس کے زمین تک لٹکنے والے دوپٹے کے پلو سے لٹکا ہوا تھا اور کٹو اور ٹلو خوشی سے بے قابو سر پر سالگرہ والی نوکدار لمبی ٹوپیاں پہنے پھرکی کی طرح گول گول گھومتے چکراتے پھر رہے تھے۔ وہ سب اس کی خوشیوں کو سیلیبریٹ کر رہے تھے۔ چڑیا نے اس غیر مرئی دنیا کو مسکراتے ہوئے دیکھا جو صرف اسے نظر آتی تھی اور جہاں کی ملکہ وہ تھی۔

ایلس آج اپنے اس ونڈر لینڈ کو چھوڑ کر اپنے جیون ساتھی کے ساتھ ایک نئے ونڈر لینڈ کو آباد کرنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

ان دونوں نے بہت دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ شیر دل چند لمحے پہلے ہی ہاسپٹل کے اس کوریڈور میں داخل ہوا تھا جہاں خیر دین کا کمرا تھا اور عکس ابھی ابھی ہاسپٹل سے کسی کام کے لیے باہر نکل رہی تھی۔ شیر دل کو آتے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ بہت دور سے بھی دونوں نے ایک دوسرے کو ایک خیر مقدمی مسکراہٹ دی تھی۔

''کب آئے؟'' عکس نے اس کے قریب آنے پر علیک سلیک کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ابھی، ابھی۔'' شیر دل نے جواب دیتے ہوئے اس کے چہرے کو جیسے کھوجنے کی کوشش کی، وہ ہمیشہ کی

طرح ناکام رہا تھا۔ وہاں ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے علاوہ اسے کچھ نہیں ملا تھا۔ ایک انتہائی اطمینان بھری مسکراہٹ جس میں کسی قسم کا کوئی اضطراب نہیں تھا۔

''کیا ضرورت تھی اتنی جلدی یہاں آنے کی؟ ریسٹ کرتے...... کل پرسوں آ جاتے یا فون پر حال پوچھ لیتے۔'' عکس نے اسے کہا۔

''انکل کیسے ہیں؟'' شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے پہلے سے بہت بہتر ہیں۔'' عکس نے جواباً کہا۔ ''تمہاری فلائٹ کیسی رہی؟''

''ٹھیک تھی، تم نے مجھے اپنی suspension کے بارے میں نہیں بتایا۔'' شیر دل نے چھوٹتے ہی وہ سوال کیا جو ہاسپٹل تک آنے کے پورے راستے میں اسے پریشان کرتا رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے اسی اطمینان سے کہا۔

''کیا بتاتی؟'' ایک لمحے کے لیے اس کے سوال نے شیر دل کو لاجواب کیا۔

''انفارم کرتیں مجھے، کل میری اور تمہاری بات ہوئی ہے تم نے ذکر تک نہیں کیا۔'' وہ بات کرتے کرتے شکایت کر گیا۔

''فائدہ کیا ہوتا؟'' اس کا اطمینان برقرار تھا۔

''نقصان بھی کوئی نہیں تھا۔'' شیر دل نے جتایا۔

''میں نے نہیں بتایا تو بھی پتا تو چل ہی گیا نا تمہیں...... ایسا کوئی راز تو نہیں تھا کہ پتا نہ چلتا۔ نانا سے ملو گے؟'' اس نے اس کی شکایت کو بے پروائی سے نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' شیر دل نے مختصراً کہا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ عکس بھی اس کے ساتھ واپس پلٹ گئی تھی۔

''suspension کیوں ہوئی؟'' شیر دل نے ساتھ چلتے ہوئے اس سے پوچھا، وہ گردن موڑ کر اس کو دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''پوری چارج شیٹ سناؤں یا صرف بنیادی وجہ بتاؤں؟'' اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جس سے شیر دل پر گھڑوں پانی پڑا تھا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا۔'' شیر دل نے اس سے نظریں چراتے ہوئے خفگی سے کہا۔ ''اسی سب سے بچانا چاہتا تھا تمہیں، اسی سب سے بچانے کے لیے وارن کر رہا تھا تمہیں۔''

''میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے؟'' اس نے شیر دل کی بات بڑے تحمل سے کاٹ دی تھی۔ ''اب تمہیں پتا چلا میں نے تمہیں کیوں نہیں بتایا تھا اپنی سسپینشن کے بارے میں۔''

''تم اپنا سروس ریکارڈ خراب کر رہی ہو عکس۔'' شیر دل چلتے چلتے رک گیا۔

''شیر دل وہ میرا مسئلہ ہے تم اس کے بارے میں پریشان نہ ہو۔ مجھے چارج کیا گیا ہے میں انہیں explanation دے لوں گی۔ اور میرے لیے یہ سب غیر متوقع نہیں ہے۔ جس دن میں نے کیس فائل کیا تھا مجھے اندازہ تھا کہ میں کون سا پینڈورہ باکس کھولنے جا رہی ہوں۔ اس لیے تم پریشان مت ہو۔ تم اپنی فیملی اور اپنے انکل کو defend کرو...... مجھے کیس لڑنے کے لیے جو کرنا پڑا میں وہ کروں گی لیکن ہم پھر بھی دوست رہیں گے۔'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے عکس مراد علی بے وقوف لگی تھی۔

''تم عقل سے پیدل ہو۔'' وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''اچھا؟'' وہ بے اختیار ہنس دی تھی۔

’’تم اتنا آسان سمجھ رہی ہو یہ سب کچھ..... تمہارا خیال ہے کہ تمہیں اگر suspend کیا گیا ہے تو پھر تمہاری explanation لے کر تم سے معذرت کرتے ہوئے تمہیں بحال کر دیا جائے گا۔‘‘ وہ طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

’’شیر دل میں کیس واپس نہیں لوں گی اور اب تو بالکل بھی نہیں۔ تم نانا کی عیادت کرنا چاہتے ہو یا ویسے ہی واپس جانا چاہتے ہو؟‘‘ اس نے شیر دل کی بات کاٹ کر اسے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’جہنم میں جاؤ تم۔‘‘ شیر دل اس کے جملے پر بری طرح جھنجلایا...... وہ دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے مسکرائی۔

’’میں وہاں سے گزر کر آئی ہوں۔ دوبارہ بھی جانا پڑا تو باہر نکلنے کا راستہ جانتی ہوں۔‘‘ اس کا اطمینان... قابلِ داد تھا اور وہ داد دیتا اگر کیس اس کے اپنے خلاف نہ ہوا ہوتا۔

’’اور اب نانا سے میری suspension کا قصہ لے کر مت بیٹھ جانا۔‘‘ اس نے ساتھ چلتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

’’انہیں کچھ بتانا ہوتا تو سب سے پہلے اس کیس کے بارے میں بتاتا۔‘‘ وہ ساتھ چلتے ہوئے خفگی سے بولا۔

’’عقل مند ہو گئے ہو۔‘‘ وہ داد نہیں تھی راز کو راز..... رکھنے کی ترغیب تھی اور شیر دل یہ بات جانتا تھا۔

خیر دین بستر پہ لیٹے ہوئے دروازے میں داخل ہوتے شیر دل کو دیکھ کر مدھم انداز میں ہلکا سا مسکرایا تھا۔ شیر دل بھی جواباً مسکرایا۔ وہ عکس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس سے کچھ بات کرتے کرتے وہ خیر دین کے بستر کے قریب آ گیا۔ خیر دین پر ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے خیر دین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑی نرم آواز میں اس سے پوچھا۔

’’آپ کی طبیعت اب کیسی ہے انکل؟‘‘ خیر دین مسکرایا تھا۔

’’اللہ کا شکر ہے۔‘‘ شیر دل مسکراتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ عکس اسے خیر دین کے بارے میں ڈاکٹر کی رائے بتا رہی تھی۔ خیر دین ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ دراز قد...... اسمارٹ...... خیر دین نے عجیب حسرت سے ان دونوں کو اکٹھے کھڑے دیکھا تھا۔ شیر دل وہ پہلا مرد تھا جس کو دیکھ کر خیر دین کو اسے چڑیا کا نصیب دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ وہ اسے کچھ ایسا ہی اچھا لگا تھا۔ وہ پہلی نظر کی پسندیدگی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ شیر دل کے شادی شدہ ہو جانے کے باوجود خیر دین کے دل سے وہ پسندیدگی ختم نہیں ہوئی تھی اور عکس، خیر دین کی اس پسندیدگی اور خواہش دونوں سے واقف تھی تب سے جب وہ شیر دل سے ملی بھی نہیں تھی جب شیر دل اس کے لیے صرف ایک غائبانہ وجود تھا جس کا ذکر وہ خیر دین سے سنا کرتی تھی اور اسے حیرت ہوتی تھی اس کا نانا کسی سے بھی اس طرح اتنی جلدی متاثر نہیں ہوتا تھا جس طرح وہ شیر دل سے ہو گیا تھا۔

خیر دین نے شیر دل کو پہلی بار اپنی دکان پر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ شکل صورت میں تو اچھا تھا ہی لیکن خیر دین کو وہ خوش شکل اور خوش لباس لڑکا اپنی تہذیب اور شائستگی کی وجہ سے اچھا لگا تھا۔ خیر دین نے پہلی بار اسے اپنی دکان پر آتے ہوئے صرف کھانا کھا کر جاتے دیکھا تھا وہ اس سے ذاتی طور پر نہیں ملا تھا یہ چند دنوں کے بعد خیر دین کی دکان پر شیر دل کا دوسرا چکر تھا جس میں خیر دین اس سے متعارف ہوا تھا۔ وہ ان دنوں امریکا میں پڑھ رہا تھا اور چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ میل ملاقاتوں میں

وہ لاہور اور اس کے آس پاس کے شہروں میں بھی گھوم پھر رہا تھا جہاں اس کے دوستوں کے والدین یا خود اس کے قریبی رشتے دار پوسٹڈ تھے اور اسی سیر و تفریح میں اسے ایک دوست کے ہاں قیام کے دوران خیر دین کی دال جو اس شہر کا تعارف بن چکی تھی شیر دل نے دریافت کی تھی۔ وہ پاکستانی روایتی کھانوں کا کوئی زیادہ شوقین نہیں تھا مگر چند ایک چیزیں جن کے ذائقے کو وہ پاکستان میں اس قیام کے دوران بھول نہیں سکا تھا ان میں سے ایک وہ دال بھی تھی۔ وہ اس کے بعد کئی بار خاص طور پر اس دکان کی دال کھانے کے لیے لاہور سے سفر کر کے آیا تھا اور ہر بار وہ اس دکان کے مالک اس بوڑھے بے حد سلجھے ہوئے آدمی سے گپ شپ لگا کر بے حد محظوظ ہوتا جو اپنے حلیے یا کسی بھی طرح سے ایک عام دکاندار نہیں لگتا تھا۔ ایک بے حد، شفیق، مہربان، نرم خو اور اپنی گفتگو سے بڑا پڑھا لکھا نظر آنے والا وہ بوڑھا جو ہر بار اس کے وہاں جانے پر اپنے ہاں کام کرنے والے ویٹرز کو ذاتی طور پر شیر دل کو سرو کرنے کے لیے کہتا تھا۔ شیر دل کو اس کا داڑھی والا چہرہ کئی بار بے حد شناسا لگا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی آواز...... دونوں چیزیں مگر وہ اسے اپنا وہم سمجھتا تھا۔ آخر لاہور سے سیکڑوں میل دور ایک شہر کی ایک چھوٹی سی ریسٹورنٹ نما دکان کے بوڑھے مالک کو وہ پہلے کیسے جان سکتا تھا جبکہ اس نے زندگی میں پہلی بار اس دکان پر کھانے پینے کے لیے آنا جانا شروع کیا تھا۔ ایک شیر دل نے اپنے ہر خیال کو وہم سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔

جو بات ایک شیر دل کو البتہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ اسے خاص طور پر وہاں دیا جانے والا پروٹوکول تھا۔ خیر دین اسے اتنی اسپیشل توجہ کیوں دیتا تھا ایک شیر دل نے اس کی وجہ ڈھونڈنے پر بھی بڑا غور کیا تھا لیکن وہ ناکام رہا تھا۔ وہ اگر پہلے ہی اپنے دوستوں سے یہ نہ سن چکا ہوتا کہ اس دکان پر بڑی دور دور سے بہت امیر اور اثر و رسوخ والے لوگ بھی آیا کرتے تھے اور پھر خود وہ اپنی آنکھوں سے وہاں دکان کے باہر کھڑی بہت ساری سبز پلیٹوں والی سرکاری گاڑیاں نہ دیکھتا رہتا تو ایک شیر دل اس توجہ کو اس سرکاری گاڑی کی سبز نمبر پلیٹ کی مرہونِ منت سمجھتا جس میں وہ آیا کرتا تھا۔ وہ اس خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس ڈبل اسٹوری ریسٹورنٹ نما دکان کا مالک بڑی بڑی گاڑیوں میں آنے والے پرانے گاہکوں کو چھوڑ کر اس کی طرف کسی خاص لالچ میں متوجہ ہوتا تھا۔ خیر دین اور اپنی ہونے والی گپ شپ میں اس نے کبھی اپنے باپ کے عہدے کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی خیر دین نے اس سے اس کے باپ کے بارے میں کبھی پوچھا تھا تو پھر وہ کیا وجہ تھی جو اُن دونوں کے درمیان اس قسم کی شناسائی اور پسندیدگی کو وجود میں لے آئی تھی۔ شروع میں چند بار الجھنے اور سر کھپانے کے بعد شیر دل نے اس سوال کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اس کے لیے بس یہ کافی تھا کہ وہ وہاں جاتا تھا تو اسے خاص پروٹوکول دیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جانے والے اس کے دوست اس چیز کو نوٹس کرتے تھے۔

ان چھٹیوں کے بعد بھی شیر دل پاکستان میں اپنے ہر قیام کے دوران وہاں باقاعدگی سے آنے لگا تھا۔ وہ اب یہ بھی جانتا تھا کہ خیر دین کی ایک ہی نواسی ہے جو ایک میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی اور اس دکان میں آنے والے پرانے گاہکوں میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو خیر دین کی اس لائق نواسی سے واقف نہ ہوتا جو خیر دین کے دل کی دھڑکن تھی اور جس کے ذکر کے بغیر خیر دین کا دن نہیں گزرتا تھا۔

شیر دل نے خیر دین کی نواسی کا پہلی بار خیر دین سے تعارف ستائشی مسکراہٹ کے ساتھ زیادہ دلچسپی کے بغیر سنا تھا۔ خیر دین اپنی نواسی کو میڈیکل کروا رہا تھا۔ اچھی بات تھی۔ وہ نواسی لائق تھی یہ اور بھی اچھی بات تھی۔ وہ خیر دین کا جوش اور فخر سمجھ سکتا تھا اس کے بیک گراؤنڈ کے کسی آدمی کا اپنی اگلی نسل کی کسی لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دلوانا

کسی معرکے سے کم نہیں تھا اور شیر دل کے خاندان میں کسی لڑکی کا کوئی پروفیشنل ڈگری لینا ایک معمول کی بات...... شیر دل کے لیے خیر دین کی نواسی کی قابلیت قابلِ غور چیز تھی ہی نہیں لیکن وہ اسے خیر دین کی دلچسپی کا موضوع سمجھ کر سنتا رہا تھا۔ خیر دین کی وہ نواسی اس سے عنقریب کہاں ٹکرانے والی تھی شیر دل کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔

وہ STP کے دوران ایک فیلڈ ٹرپ کرتے ہوئے اپنے پورے گروپ کو وہاں لایا تھا۔ عکس بھی ان 25 لوگوں میں تھی جو اس گروپ میں شامل تھے۔ شیر دل کو وہاں ویسا ہی پروٹوکول ملا تھا جو اس کے لیے متوقع تھا۔ اس چھوٹے سے ریسٹورنٹ کی پہلی منزل پر موجود فیملی ایریا فوری طور پر ان لوگوں کے لیے خالی کروالیا گیا تھا۔ شیر دل کو وہاں داخل ہوتے ہوئے خیر دین نظر نہیں آیا تھا اور وہ پہلا موقع تھا جب اس کی وہاں آمد کے موقع پر اس کا اور خیر دین کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک ویٹر سے خیر دین کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ وہ نماز پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ فیملی ہال کی چند ٹیبلز کو چھوڑ کر ان لوگوں کے لیے ایک ہی لمبی ٹیبل تیار کردی گئی تھی۔ شیر دل نے ان ٹیبلز پر ایک دم نئے ٹیبل کور، بہت اچھی کراکری اور شیشے کے چمکتے ہوئے نئے گلاسز اور نئی کٹلری کو نوٹس کیا تھا۔ اس نے ان تین مستعد اور مؤدب ویٹرز کو بھی نوٹس کیا تھا جو صرف ان کے احکامات لینے کے لیے وہاں موجود تھے اور اس نے یہ بھی نوٹس کیا تھا کہ وہاں موجود تقریباً تمام عملے نے داخل ہوتے وقت شیر دل سے تو ہمیشہ کی طرح علیک سلیک کی تھی لیکن عکس سے بھی وہ بہت مؤدبانہ انداز میں مخاطب ہوتے رہے تھے۔

"لگتا ہے تمہیں بھی پہچانتے ہیں یہ لوگ۔ تمہارا تو شہر ہے، تم تو بہت بار آچکی ہوگی یہاں۔" شیر دل کو اس کے علاوہ اس عجیب "شناسائی" کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی جو عکس کے لیے وہاں کے عملے کے رویّے میں تھی۔

"بہت بار۔" عکس نے جواباً ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ شیر دل بھی مطمئن انداز میں مسکرادیا۔

کھانے کی ٹیبل کے گرد کھانے کا انتظار کرتے ہوئے شیر دل ان تمام لوگوں کو اس دکان کے مالک بوڑھے خیر دین کے بارے میں بتاتا رہا جو اس کے نزدیک ایک انتہائی دلچسپ بوڑھا تھا۔ ایک حیران کُن قسم کا دکان دار...... وہ خیر دین کے ساتھ ہونے والی اپنی گپ شپ ان کے سامنے دُہراتا رہا۔ گروپ کے کچھ اور لوگ بھی خیر دین کی اس مشہورِ زمانہ دال اور اس جگہ سے واقف تھے اور وہاں آچکے تھے لیکن باقی لوگوں کے لیے وہ جگہ نئی تھی لیکن وہ تمام لوگ جو پہلے وہاں آچکے تھے ان میں سے کوئی بھی خیر دین کو ان حوالوں سے نہیں جانتا تھا جن حوالوں سے ایک شیر دل جانتا تھا۔

عکس مراد علی، ایک شیر دل کی اس ساری "دلچسپ" گفتگو کے دوران پانی کا ایک گلاس پکڑے اس لمبی میز کے ہیڈ پر بیٹھی تھی اور وقفے وقفے سے پانی پیتے ہوئے ایک مدھم مسکراہٹ کے ساتھ شیر دل کی خیر دین کے حوالے سے وہ بے تکلفانہ گفتگو سنتی رہی جو وہ ایک ڈائٹ پیپسی کے کین کو پیتے ہوئے کرتا رہا تھا۔

"اور ہاں خیر دین کی ایک نواسی بھی ہے۔" گیدڑ کی جب شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے کے مصداق ایک شیر دل کو بے حد غلط وقت پر وہ "نواسی" یاد آئی تھی جو اس وقت اس سے تین کرسیوں کے فاصلے پر ٹیبل کے ہیڈ پر پڑی کرسی پر بیٹھی گلاس کو اس کی جگہ پر دائرے کی شکل میں ہلکی گردش دیتے ہوئے ایک شیر دل سے "اپنا تعارف" سن رہی تھی۔

"بتا رہا تھا مجھے کہ اس کی نواسی گولڈ میڈلسٹ رہی ہے کس میں..." شیر دل نے بات کرتے کرتے ایک لمحے کے لیے رک کر کچھ یاد کیا۔ "ہاں بورڈ کے کسی ایگزام میں۔"

"سارے ایگزامز میں۔" عکس نے بہت مدھم آواز میں تصحیح کی تھی، شیر دل نے روانی میں غور نہیں کیا۔
"لاہور کے کسی میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔"
"پڑھ لیا۔" تصحیح ایک بار پھر ہوئی۔
"شاید علامہ اقبال میڈیکل کالج میں۔"
"کنگ ایڈورڈ میں۔" وہ تیسری تصحیح تھی جس پر بالآخر شیر دل نے گلاس کے کناروں پر انگلیاں پھیرتی عکس سے پوچھا۔
"اوہ تم بھی تو KE سے ہی پڑھی ہو۔" "تم یقیناً جانتی ہوگی اسے۔" شیر دل نے ہمیشہ کی طرح سوال کا جواب آنے سے پہلے ہی اپنا اندازہ لگایا تھا۔

"بہت اچھی طرح۔" عکس مسکرائی تھی۔ شیر دل نے اس کی مسکراہٹ پر غور نہیں کیا۔ اس نے ان تین ویٹرز پر بھی غور نہیں کیا جن میں سے دو عکس کے بالکل قریب ٹیبل کے دائیں جانب تھے اور تیسرا عکس کے بائیں جانب...... شیر دل خود عکس کی دائیں جانب تیسری کرسی پر تھا اور وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ویٹرز شیر دل کے ان لوگوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے شیر دل کے قریب تھے۔ وہ انگلش میں بات کررہا تھا۔ اردو میں کرتا تو اس کی گفتگو کا موضوع ان ویٹرز کو بھی بھونچکا کردیتا۔ "عکس باجی" کے ساتھ آئے ہوئے مہمان عکس باجی کو نہیں جانتے تھے یہ بات وہاں کام کرنے والے کسی بھی شخص کو ایسے ہی حیران کردیتی۔

"Now this is amazing" شیر دل کہہ رہا تھا۔ "کوئی ملک ترقی کرسکتا ہے تو اس اسپرٹ کے ساتھ کرسکتا ہے اور مجھے حیرانی ہوئی ہے کہ ہمارے ملک میں بھی ایسی success stories ممکن ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں۔" شیر دل اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے پیپسی پیتا ہوا بڑے اطمینان سے کہتا جارہا تھا۔ کھانا سرو ہونے لگا تھا۔ وہ لوگ کھانا کھانے لگے، گفتگو کا موضوع بدل گیا۔

خیر دین بالکل اس لمحے سیڑھیاں چڑھ کر اس چھوٹے سے ہال نما کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جھجک گیا۔ اسے نیچے پتا چل گیا تھا کہ عکس کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں آئی تھی لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا وہ سارے اس کے بیچ میٹس تھے۔ وہ افسروں کے ساتھ تھی اس وقت اور زندگی میں پہلی بار خیر دین اپنی چڑیا سے جھجکا تھا۔ جو بھی تھا وہ ایک معمولی دکان دار تھا معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک معمولی شخص...... اس نے اپنی چڑیا کو اپنا خون پسینہ دے کر کامیابی کی سیڑھیوں پر چڑھایا تھا اور اب جب وہ وہاں چڑھ گئی تھی تو زندگی میں پہلی بار خیر دین کو اس کے سامنے احساسِ کمتری ہوا تھا۔ وہ اسے ان لوگوں کے درمیان اپنا حوالہ دینے سے جھجکا تھا۔ شاید یہ مناسب نہیں ہو، شاید چڑیا نے ان لوگوں کو اس کے بارے میں نہ بتایا ہو، پتا نہیں وہ چڑیا کے لیے وہاں ندامت اور خفت کا باعث نہ بن جائے۔ اس نے ہال میں جتنے جوش و خروش میں قدم رکھا تھا اسی تیزی سے وہ پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ عکس تب تک اسے دیکھ چکی تھی۔ سیڑھیوں سے اوپر آنے والا وہ راستہ اس کے سامنے تھا۔ ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ حیران ہوئی تھی خیر دین پیچھے کیوں ہٹا تھا اور پھر جیسے ایک جھماکے کے ساتھ اسے وجہ سمجھ آئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑا دوسرا لقمہ اپنی پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے وہ کھڑی ہوگئی تھی۔

"نانا۔" سیڑھی پر واپس پلٹتے خیر دین کے پیروں میں ایک بیڑی پڑی۔ ٹیبل کے گرد بیٹھے وہ سارے مرد یک دم چونکے تھے پھر انہوں نے عکس کی نظروں کے تعاقب میں اس بوڑھے باریش آدمی کو دیکھا جو آگے بڑھ رہا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب ایک شیر دل کو بھی کرنٹ لگا تھا۔

"نانا!" وہ زیرِ لب بے یقینی سے بڑبڑایا۔ ایک نظر اس نے عکس کو دیکھا پھر ٹیبل کے پار خیر دین کو۔

"میرے نانا اور دکان کے مالک۔" عکس مراد علی نے بے حد روانی اور اعتماد کے ساتھ اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے خیردین کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو چند لمحوں کے لیے سکتہ ہوا تھا پھر وہ بیک وقت اپنی اپنی کرسیوں سے احتراماً کھڑے ہوئے تھے۔ وہ تب تک خیردین کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس نے جا کر ہمیشہ کی طرح خیردین کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ فخر کے بہت سے لمحے آئے تھے اس ننھی سی لڑکی کی وجہ سے اس کی زندگی میں...... اور ایسا ہی فخر کا ایک لمحہ وہ بھی تھا خیردین کے لیے۔ وہ اسے اس جگہ پر own کر رہی تھی جہاں کا رزق اسے کھلا کھلا کر خیردین نے پالا تھا۔ ان 24 لوگوں کے سامنے جن کے خاندانوں کی سات پشتوں میں کوئی مزدور نہیں رہا تھا اور اگر کبھی رہا تھا تو وہ عکس مراد علی جیسا دل گردہ نہیں رکھتے تھے کہ اس کا اعتراف سب کے سامنے کر پاتے۔

شیر دل ایک عجیب سی بے یقینی کی کیفیت میں خیردین کو اپنے ٹیچ میٹس کے ساتھ متعارف ہوتے دیکھتا رہا پھر بالآخر عکس اور خیردین اس کے سامنے آ گئے تھے۔ خیردین کی آنکھوں میں وہی شناسائی جھلکی تھی۔ ایک عجیب سی ٹیس عکس کے دل میں اٹھی تھی، وہ اب جانتی تھی خیردین اتنے سالوں سے کس نامعلوم لڑکے کن گاتا تھا۔ وہ شیر دل کی زبان سے خیردین کی طرف سے کیے جانے والے خاص برتاؤ کے ذکر پر ہی چونک گئی تھی۔ اسے ایک عجیب انداز میں یقین ہوا تھا کہ خیردین جس لڑکے جیسے مرد کو اس کا جیون ساتھی دیکھنے کا خواہش مند تھا وہ ایک شیر دل ہی تھا۔ کیا عجیب دل تھا ان دونوں نانا نواسی کا۔ ایک ہی شخص پر آیا تھا اور وہ بھی اس پر جس کا ساتھ ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ خیردین نہیں جانتا تھا وہ خوش گمان تھا، پُرامید تھا۔ عکس جانتی تھی وہ خوش گمانیوں کو فریب سمجھتی تھی۔ امید اس چیز کی رکھتی تھی جو معجزے سے نہیں کوشش سے ملتی۔ اور وہی وہ ایک لمحہ تھا جب ایک شیر دل یہ جان گیا تھا کہ عکس مراد علی کو زندگی کا ساتھی بنانے کی خواہش اسے چھوڑنی پڑے گی۔ پہلے یہ کام مشکل تھا اب ناممکن تھا۔ اس کا خاندان جس حسب ونسب کا قائل تھا عکس مراد علی اب اس اسکیل پر چند درجے اور نیچے چلی گئی تھی۔

پنجاب کے ایک نامور جاگیردار خاندان کے سپوت اور انڈین سول سروس کے ممتاز ترین آفیسرز میں سے ایک شیر دل علی قلی کے پوتے کی شادی ایک لوہار خاندان سے تعلق رکھنے والے خیردین دال والے کی نواسی سے تو نہیں ہو سکتی تھی۔ شیر دل ساری عمر ایچی سن اور پھر ہارورڈ میں پڑھا تھا۔ بنیادی انسانی حقوق میں مساوات کا قائل تھا تب تک جب یہ روشن خیالی اور انسانیت پسندی پاکستان سے باہر دکھانا مقصود ہوتا۔ اپنے ملک اور معاشرے میں آتے ہی وہ تمام خول اور ماسک چڑھانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ جس کے بغیر اس ملک میں تفریق رکھنا اور شناخت کروانا مشکل ہوتا تھا محبت ایک عظیم اور لافانی جذبہ تھا وہ جذبات میں آ کر جان دے سکتا تھا لیکن اپنے خاندان کی اگلی نسل کو اپنے خاندان سے کمتر خاندان کی ماں اور خون دینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

اس دن عکس کو اندازہ نہیں ہوا خیردین کے اس تعارف نے ایک شیر دل پر کیا قیامت ڈھائی تھی بالکل ویسے ہی جیسے خیردین کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ جس ایک شیر دل پر جان و دل سے فدا تھا اس کا خاندان اس پر کیا قیامت ڈھا چکا تھا۔

شیر دل ایک کرسی کھینچ کر خیردین کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کی گفتگو کرتا رہا تھا اور اس ساری گفتگو کے دوران وہ خیردین سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ وہ اور اس کا خاندان اس بوڑھے کے خاندان کا بہت حوالوں سے مجرم تھا اور شیر دل ضمیر کو مسلسل سلانے کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اس

بوجھ کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔

وہ خیردین سے اس دن بھی نظر نہیں ملا سکا تھا جس دن وہ کسی حوالے سے عدالتی نوٹس ملنے کے بعد اس کے پاس گیا تھا۔ خیردین اس کی شناخت سے بے خبر تھا اگر نہ ہوتا تو کم از کم اس دن وہ ہمیشہ کی طرح اس سے معمول کی گفتگو میں مصروف نہیں رہتا۔ اس کا تعارف اگر صرف عکس مراد علی تک محدود تھا تو پھر اس کا یہ مطلب تھا کہ خیردین کو اس یقین کے حوالے سے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود یہ نہیں کر سکا۔

پھر خیردین کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ عکس کے ساتھ دوبارہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

"تمہارا فون ہے میرے پاس۔" عکس نے اپنے شولڈر بیگ کی ایک اندرونی جیب سے اس کا فون نکال کر اس کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے آف ہی رکھا تھا۔" انٹرنیشنل رومنگ کی سہولت ہونے کی وجہ سے شیر دل نے اسے اپنا فون استعمال کرنے کے لیے دیا تھا اور وہ سارے سفر کے دوران اسی فون کے ذریعے کویت اور پاکستان کے ساتھ ساتھ سنگاپور میں شیر دل سے بھی رابطے میں رہی تھی لیکن پاکستان آنے کے بعد اس نے اس فون کو بند کر دیا تھا۔ وہ مسز فاروق کی طرح کسی اور کی کال اٹھا کر شیر دل کے حوالے سے کسی سوال جواب کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ایک بات بتاؤ شیر دل، شہر بانو کی ممی مجھے کیسے جانتی ہیں؟ وہ یہ کیسے جان گئی تھیں کہ سنگاپور میں تمہارے فون پر ان کی کال ریسیو کرنے والی میں ہی ہو سکتی ہوں۔" شیر دل اس کے اس سوال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے پہلی بار سنگاپور سے اس کے اس سوال پر فون ڈس کنیکٹ کر کے خود کو بچا لیا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا وہ اس کے بالمقابل کھڑی بے حد سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے پوچھ رہی تھی۔ شیر دل کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" یہ جملہ بولتے ہوئے بھی اسے اندازہ تھا کہ وہ کتنا بودا جواب دے رہا تھا۔

"تمہارے اور شہر بانو کے درمیان میری وجہ سے کوئی ناراضی ہے؟" اس بودے جواب کا نتیجہ ایک بے حد ڈائریکٹ اور بے لحاظ سوال میں آیا تھا۔

"تمہاری وجہ سے نہیں، اس کیس کی وجہ سے۔" شیر دل نے اس بار جھوٹ بولنا ضروری سمجھا۔ اس بار وہ اس سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔

"شہر بانو کو اس کیس کا کیسے پتا چل گیا؟ تم نے ذکر کیا؟" اس بار عکس کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔

"ہاں، ممی نے بتایا ہے اسے۔" شیر دل نے کہا۔ عکس چند لمحے خاموش رہی۔

"اس کی ممی جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟" اس نے مدھم آواز میں پوچھا۔

"میں یہ بھی نہیں جانتا، وہ مجھ سے بات نہیں کر رہی لیکن پاکستان واپس آ رہی ہے چند دنوں میں...... پتا چل جائے گا۔" عکس کو اس بار پہلی بار احساس ہوا کہ وہ پریشان تھا، تھکا ہوا نہیں تھا وہ اس کے اترے ہوئے چہرے کو تھکن کا نتیجہ سمجھ رہی تھی۔ ایک لمبی بے مقصد خاموشی دونوں کے درمیان آئی پھر عکس نے کہا۔

"شیر دل ہم آج کے بعد دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے نہ ہی فون پر رابطہ کریں گے۔" وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

"کیوں؟"

"میرے پاس اس کیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔" عکس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’تمہارے پاس ہر مسئلے کا ایک ہی حل کیوں ہوتا ہے؟ مجھ کو چھوڑ دینا۔‘‘ وہ خفا ہوا تھا۔ ’’اس سے آج تک کبھی کوئی مسئلہ حل ہوا؟‘‘

’’نہیں لیکن کوئی مسئلہ پیدا بھی نہیں ہوا۔‘‘ اس نے جواباً کہا۔

’’تمہارے لیے نہیں ہوا ہوگا میرے لیے ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔‘‘ شیر دل نے بے حد کھلے لفظوں میں کہا۔

’’میں تمہارا گھر توڑنا نہیں چاہتی شیر دل۔ میں وہ وجہ نہیں بننا چاہتی جو تمہارے اور شہر بانو کے درمیان علیحدگی کا باعث بنے۔‘‘ اس نے شیر دل کی بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے کہا تھا۔

’’پھر تم یہ کیس واپس لے لو۔‘‘ وہ شیر دل کے اس جملے پر بول نہیں سکی تھی۔

’’میرے اور شہر بانو کے درمیان اگر کوئی مسئلہ ہوا تو تمہارے اس کیس کی وجہ سے ہوگا۔‘‘ وہ کہہ رہا تھا۔

’’کیوں......؟ تم تو فریق ہو اُس میں شہباز حسین کے وراث کے طور پر...... تم تو defend کرنے والے ہو شہباز حسین کے actions کو...... شہر بانو کو کیا مسئلہ ہوگا اس سے۔‘‘ وہ واقعی الجھی تھی۔

’’میری فیملی جانتی ہے تم میری دوست ہو۔‘‘ شیر دل نے مدھم آواز میں کہا۔ ’’ان کے لیے یہ قابلِ قبول اور ماننے والی بات نہیں ہے کہ تم میری دوست ہوتے ہوئے یہ کیس واپس نہیں لے سکتیں۔‘‘ شیر دل نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے سامنے اسی ایک بات پر اڑا ہوا تھا کہ وہ اسے پریشرائز نہیں کرے گا۔ عکس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

’’تو اس کا مطلب ہے اب تمہیں دشمن بنانا پڑے گا۔‘‘

’’بنا سکتی ہو؟‘‘ سوال سیدھا سیدھا تھا اور شیر دل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا لیکن صرف وہ جانتی تھی کہ وہ سوال نہیں تھا چیلنج تھا۔ وہ اس سے نظر چرا گئی۔ نظر ملائے رکھنا مشکل تھا۔

’’جانتی ہوں میں۔‘‘ عکس نے قدم بڑھا دیا۔

’’تم نے جواب نہیں دیا۔‘‘ وہ ساتھ بڑھا۔

’’تم جانتے ہو؟‘‘

’’تم ڈھیٹ ہو؟‘‘ شیر دل نے بے ساختگی سے کہا۔

’’انگلش میں اسے steadfastness کہتے ہیں اور اکیڈمی میں یہ خصوصیت ہمارے اندر پیدا کرنے پر خاص زور دیا جاتا تھا۔‘‘ وہ تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔ شیر دل اس کی بات سے محظوظ نہیں ہوا۔

وہ جس مصیبت میں پھنسا ہوا تھا اس میں وہ عکس مراد علی کی حسِ مزاح سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا۔

’’انکل کو اس سارے معاملے کا پتا تک نہیں ہے اور تم کیس لڑ رہی ہو...... تم آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟‘‘ وہ کچھ جھنجلایا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔

’’میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ہم سب انسان ہیں اور ہم سب کی عزت برابر ہوتی ہے اور ہم سب کو اپنے حق کے لیے لڑنے کا حق حاصل ہے اور میں اس پر مزید بحث نہیں کروں گی تمہارے ساتھ...... تم کو میں نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ تم اپنی فیملی کو سپورٹ کرو...... ان کی طرف سے لڑو...... میں اور میرے نانا تمہاری ذمے داری نہیں ہیں، مجھے تم سے اس معاملے میں کوئی توقعات نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی شکایت ہوگی اور ایک شیر دل ہم آج کے بعد نہیں مل رہے۔‘‘ وہ اس بار اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی تھی۔

’’تمہیں جواد نے منع کیا ہے مجھ سے ملنے سے؟‘‘ شیر دل کو پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

’’چلو تم ایسا ہی سمجھ لو۔‘‘ وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر اس نے اتنی ہی روانی سے کہا۔ شیر دل اس بار بول نہیں سکا تھا۔ وہ دونوں عجیب خاموشی میں باہر پارکنگ میں اپنی اپنی گاڑیوں تک آئے تھے۔

☆☆☆

’’پاپا ہمیں مس کر رہے ہیں نا؟‘‘ شہر بانو اپنا سامان پیک کر رہی تھی جب مثال نے بے حد ایکسائیٹڈ انداز میں اپنا ایک کھلونا پیکنگ کے لیے لا کر اس کے پاس رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ پاکستان واپس جانے کا سن کر بے حد ایکسائیٹڈ پھر رہی تھی اور اس کی ایکسائٹمنٹ شرمین اور شہر بانو دونوں کے لیے عجیب سے کرب کا باعث تھی۔

’’پتا نہیں۔‘‘ اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر پھر اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

’’میں جانتی ہوں وہ مجھے مس کر رہے ہیں۔‘‘ مثال کے یقین میں کمی نہیں آئی تھی۔

’’اچھا۔‘‘ شہر بانو نے کسی دلچسپی کے بغیر اپنے کپڑے تہ کرتے ہوئے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

’’آپ کو بھی مس کر رہے ہیں وہ۔‘‘ مثال نے چند لمحوں کے بعد جیسے ماں کو عجیب سی تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ کپڑے تہ کرتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ بچے بعض دفعہ ایک جملے سے جیسے بڑوں کو دریا میں ڈبو چھوڑتے ہیں...... شہر بانو کو خود پر عجیب سا ترس آیا تھا۔ کیا وقت آنا تھا یہ بھی کہ اسے اپنی ہی کم سن چند سالہ بچی شیر دل کے حوالے سے تسلی دیتی...... یہ بتاتی کہ وہ اسے مس کر رہا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ کپڑے تہ کرتے کرتے رک کر اس نے مثال کو دیکھا پھر اس سے کہا۔

’’مثال اِدھر آؤ۔‘‘ مثال نے اپنے کھلونے اکٹھے کرتے کرتے چونک کر ماں کو دیکھا پھر وہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کے پاس آ گئی۔ شہر بانو اسے لیے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بہت دیر وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے مثال سے پوچھا۔

’’اگر ہم کبھی ہمیشہ کے لیے امریکا آ گئے تو تمہیں اچھا لگے گا یہاں رہنا؟‘‘ وہ اس سے کوئی اور سوال کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی۔ اس کی زبان پر جملہ کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔

’’یس......‘‘ مثال نے بغیر کسی تامل کے بے حد خوشی کے ساتھ اسے یقین دہانی کروائی۔

’’ہمیشہ کے لیے؟‘‘ شہر بانو اب اپنے سوال کے مشکل حصے کی طرف آ رہی تھی۔

’’یس......‘‘ مثال نے اب بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ کچھ بھی سمجھے بغیر سر ہلایا۔ شہر بانو کچھ دیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

’’اگر صرف میں اور تم آ جائیں امریکا تو؟‘‘ مثال نے اس بار پہلی بار ماں کا چہرہ غور سے دیکھا اور اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کی جو اس سے کیا جا رہا تھا۔

’’صرف میں اور آپ کیوں؟ پاپا کیوں نہیں؟‘‘ شہر بانو کو اس سے اسی قسم کے سوال کی توقع تھی۔

’’ہو سکتا ہے پاپا نہ آ سکیں اسی لیے پوچھ رہی ہوں، میں اور تم بہت خوش رہیں گے یہاں...... تم نے دیکھا ہم نے کتنی سیر کی...... کتنا انجوائے کیا ہر جگہ...... سب نے کتنا پیار کیا تمہیں، کتنی ڈھیر ساری چیزیں لے کر دیں۔‘‘ وہ اب اسے وہ سبز باغ دکھا رہی تھی جس میں کرب چھپا ہوا تھا لیکن یہ صرف وہ جانتی تھی۔

’’لیکن پاپا ساتھ کیوں نہیں آئیں گے؟‘‘ مثال نے اس کے سبز باغ کے اندر پنہاں پھندے کو دیکھ لیا تھا۔

’’پاپا پاکستان میں بہت بزی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ یہاں آ جائیں۔‘‘ شہر بانو اسے divorce کا مطلب سمجھانے کی جرات نہیں رکھتی تھی نہ ہی ابھی اپنے ذہن میں

اس خوفناک چیز کے بارے میں غور کر رہی تھی۔

"we can wait جب پاپا کا کام ختم ہو جائے گا تو وہ بزی نہیں ہوں گے تو پھر ہم آ جائیں گے۔" مثال نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ اس نے اپنی طرف سے اس گمبھیر مسئلے کا ایک آسان حل نکالا تھا۔ وہ گمبھیر مسئلہ جو اس کی ماں سے حل نہیں ہو رہا تھا۔ شہربانو چند لمحوں کے لیے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"پاپا کا کام کبھی بھی ختم نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ بزی رہیں گے۔" مثال نے کچھ الجھ کر ماں کو دیکھا۔

"he told you that" اس نے جیسے بے یقینی سے ماں سے پوچھا۔

"yes he did" اس نے آج تک کبھی مثال سے جھوٹ نہیں بولا تھا لیکن آج وہ اس کے ساتھ جھوٹ بول رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی اب اسے مثال کے سوالوں سے بچنے کے لیے جھوٹ گھڑنا اور جھوٹ بولنا سیکھنا تھا۔

"میں ان سے پوچھوں گی وہ ضرور ہمارے ساتھ امریکا آ جائیں گے...... holi days میں۔" مثال کا باپ پر یقین ابھی بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔

"ہم دونوں اگر اکیلے امریکا میں آ گئے تو ہم بہت خوش رہیں گے۔ یہاں گھومنے پھرنے کے لیے بہت ساری جگہیں ہیں...... میں تمہیں ڈھیروں کھلونے دلاؤں گی ڈھیروں چاکلیٹس اور سوئیٹس دلواؤں گی ہم بہت مزہ کریں گے، تم پاپا کو بالکل مس نہیں کرو گی۔"

"تو ممی...... I will miss Papa" مثال نے اس کی بات کاٹ کر جیسے اعلان کرنے والے انداز میں اس سے کہا تھا۔ وہ ہل نہیں سکی پھندے کوئی ایک دو نہیں تھے جو اس کے پاؤں میں تھے وہ ہر طرح سے جکڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے پاپا۔" شیر دل نے ہاسپٹل سے گھر پہنچتے ہی بختیار شیر دل سے کہا تھا۔ وہ اس وقت آفس سے گھر آئے تھے اور شام کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہے تھے۔ شیر دل اور ان کی ملاقات لاؤنج میں ہی ہوئی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے فوراً بعد شیر دل نے انہیں کہا تھا۔

"مجھے بھی تم سے کافی ضروری باتیں کرنی ہیں سات بجے کی فلائٹ ہے میری۔ تم آج یہیں ہو؟" بختیار نے اس سے پوچھا تھا۔

"جی، میں آج یہیں ہوں۔" شیر دل کو ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس سے کس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے۔ عکس کی معطلی ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی اور اس معطلی کے لیے انہیں رضامند کرنے کے لیے بہت کچھ اُن کے علم میں لایا گیا ہوگا۔ یہ شیر دل اندازہ کر سکتا تھا۔

"چینج کر کے میرے بیڈروم میں ہی آ جاؤ، وہیں بات کر لیتے ہیں۔" بختیار نے اس سے کہا تھا۔

"تمہاری ممی بھی تب تک آ جائیں گی۔"

"میں ممی کے سامنے آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا پاپا، میں اس مسئلے پر آپ سے الگ بات کرنا چاہتا ہوں۔" شیر دل نے بالآخر کسی تمہید کے بغیر موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ بختیار نے ماتھے پر بل لیے اسے دیکھا وہ الجھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، ہم منزہ کے سامنے بات نہیں کریں گے، تم بیڈروم میں آ جاؤ۔" بختیار اس سے کہہ کر چلا گیا تھا۔

"آپ نے عکس کو suspend کروایا ہے؟" آدھے گھنٹے کے بعد بختیار کے پاس بیڈروم میں آ کر بیٹھتے ہی شیر دل نے براہ راست اس سے پوچھ لیا تھا۔

"ہاں۔" جواب مختصر تھا مگر وہی تھا جس کی شیر دل کو توقع تھی۔ "اور کیوں کروایا ہے یہ سب بھی تم جانتے ہو گے۔ وہ غیر ذمے دار ہے اور اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر رہی ہے۔" بختیار نے اسی سنجیدگی سے ایک ہی سانس میں کہا تھا۔

"وہ ایسا کچھ نہیں کر رہی۔" شیر دل نے ان کو ٹوک دیا۔

"تم میرے سامنے اس کو سپورٹ کرنے کا سوچنا بھی مت...... وہ تمہاری دوست ہے اور اس کی جرأت یہ ہے کہ وہ تمہاری ہی فیملی کو ٹارگٹ کر رہی ہے اور تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہو۔" بختیار خفگی سے کہہ رہے تھے۔

"میں ہمیشہ اس کے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتا رہا مجھے اگر یہ اندازہ ہوتا کہ وہ اس طرح کے بیک گراؤنڈ کے ساتھ اس طرح کے کریمنل ریکارڈ رکھنے والے ایک تھرڈ کلاس خاندان سے تعلق رکھتی ہے تو میں تو تمہیں کبھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا اور تم اس سے شادی کے لیے مرے جا رہے تھے کسی زمانے میں......" بختیار کا غصہ بات کرتے کرتے اور بڑھ گیا تھا۔

"آپ سے کس نے کہا ہے کہ وہ کریمنل......" بختیار نے شیر دل کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"شہباز نے اس کے نانا کو جاب سے اسی لیے نکالا تھا کہ وہ چوریاں کرتا رہا اس کے گھر اور چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔" اس سے پہلے کہ بختیار کچھ اور کہتا منزہ دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ وہ ابھی ابھی گھر پہنچی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی وہ سین نہیں تھا کہ جو اس وقت اس کے بیڈروم میں ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت سی ہو گئی تھی۔ بختیار کی بلند آواز اور شیر دل کے چہرے کے تاثرات اسے سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔

"تم کب پہنچے ہو؟" منزہ نے جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے شیر دل کے سلام کا جواب دیا۔

"منزہ تم کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ ہم ایک اہم مسئلے کو ڈسکس کر رہے ہیں۔" علیک سلیک کے بعد بختیار نے اس سے کہا تھا۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ منزہ کسی بھی طرح ان دونوں کے درمیان ہونے والی اس اہم ڈسکشن کو چھوڑ کر کہیں چلی جاتی۔

"کیس کے بارے میں؟" اس نے بختیار سے پوچھا اور شیر دل کو دیکھا جو ماں سے نظریں چرا گیا تھا۔

"ہاں۔" بختیار نے مختصراً کہا۔

"تو پھر میں کہیں نہیں جاؤں گی...... آخر اس کے بارے میں ایسا کیا ہے جو آپ دونوں میرے سامنے ڈسکس نہیں کر سکتے۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔ بختیار اور شیر دل نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بختیار نے کہا۔

"شیر دل یہ مسئلہ تمہارے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہاں، میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ کیوں یہ مسئلہ میرے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا...... وہ عکس کو reinstate کروانا چاہتا ہوگا، یہ بات تو اس سے برداشت نہیں ہو رہی ہوگی کہ اس کی چہیتی کو کچھ ہو۔" منزہ نے بے حد تلخی سے شیر دل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ممی عکس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کیس کورٹ میں لڑا جاتا ہے، اس طرح نہیں۔" شیر دل نے بے اختیار اس سے کہا۔

"اس کا قصور نہیں ہے...... وہ پچیس...... تیس سال بعد منہ اٹھا کر میری فیملی کو ذلیل کرنے آ گئی ہے اور اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ بہت غصے سے بول رہی تھیں۔

"وہ ذلیل کرنے نہیں آئی آپ کی یا ہماری فیملی کو، یہ کام شہباز انکل نے کیا تھا۔" شیردل نے یک دم ماں کو ٹوک دیا۔ منزہ کی رنگت چند لمحوں کے لیے لٹھے کی طرح سفید ہو گئی۔ وہ مر کے بھی شیردل کے منہ سے شہباز کے لیے ایسا جملہ سننے کی توقع نہیں کر سکتی تھیں۔

"تم اس لڑکی کی زبان مت بولو اس گھر میں...... تم اس لڑکی کی باتوں میں آ کر اپنے خاندان پر خود کیچڑ اچھالو گے؟" بختیار اس بات پر بری طرح برہم ہو گئے۔

"میں اس لڑکی کی زبان نہیں بول رہا ہوں پاپا۔" شیردل نے باپ کی بات کاٹی۔

"تم کیا جانتے ہو اس آدمی اور اس کے خاندان کے بارے میں جس کے لیے وہ لڑ رہی ہے، بلیک میلنگ کا طریقہ ہے۔"

منزہ کو یک دم جیسے ہوش آ گیا۔ اگر زندگی میں کبھی شہباز حسین کو ان کی ضرورت تھی تو وہ اس وقت تھی۔

"وہ کیوں ہماری فیملی کو بلیک میل کریں گے؟ پوری دنیا میں انہیں اس کام کے لیے ہمارا ہی خاندان کیوں نظر آیا ہے؟" شیردل نے بے حد عجیب انداز میں منزہ سے کہا۔ منزہ کو اس کا انداز دہلا رہا تھا۔ شیردل زندگی میں پہلی بار شہباز کے حوالے سے ان سے اس طرح بات کر رہا تھا۔

"تم جانتے ہو اس لڑکی کے نانا نے شہباز پر کیا الزام لگایا تھا؟ بختیار نے جیسے خاندان کا وہ راز شیردل سے شیئر کرنے کا فیصلہ کیا جو اُن کی بیوی نے چند دن پہلے ان سے شیئر کیا تھا۔ شیردل چند منٹ سپاٹ نظروں سے باپ کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ایک جملے نے اسے ایک بار پھر اس رات کے جہنم میں پھینک دیا تھا۔

"جانتا ہوں......" اس نے مدھم آواز میں کہا۔ "اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ الزام درست ہے۔" بختیار کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

"تم اپنے خاندان کے مرد کو اتنا گھٹیا سمجھتے ہو کہ وہ ایک خانساماں کی بیٹی کے ساتھ افیئر چلائے گا، اپنی بیوی اور بیٹی کے ہوتے ہوئے؟" بختیار نے بہت تیز اور چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

"کون سا افیئر؟" ان کی بات شیردل کے سر سے گزر گئی۔

"اس لڑکی کی ماں نے شہباز کے ساتھ تعلقات کا الزام لگایا تھا شرمین کے سامنے۔ اس لڑکی کے نانا نے چوری کے الزام سے بچنے کے لیے اپنی بیٹی کو استعمال کیا۔ شہباز کا گھر تڑوا دیا اس نے۔" بختیار کہہ رہا تھا اور شیردل صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"آپ سے ممی نے کہا یہ سب؟" یہ راکٹ سائنس نہیں تھی کہ وہ سیکنڈز میں یہ نہ جان پاتا کہ بختیار کو یہ سب باتیں بتانے والا کون ہو سکتا تھا۔

"یہ سب کچھ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا صرف اس لیے کہ تمہاری اس لڑکی کے ساتھ دوستی ہے، تم اسے پسند کرتے تھے۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی حالانکہ میں اس لڑکی کے بارے میں یہ سب کچھ پہلے دن سے جانتی تھی۔ اسی لیے منع کر رہی تھی کہ یہ بلیک میلرز کی فیملی ہے۔ تم ان کا حصہ نہ بنو ان کی باتوں میں نہ آؤ۔" منزہ نے بات شروع کی تو پھر وہ بولتی ہی چلی گئیں انہوں نے شیردل کے تاثرات نوٹس کرنے کی کوشش نہیں کی یا اگر کی بھی تھی تو انہیں نظر انداز کر دیا۔

"پاپا، شہباز انکل نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اسے قتل کرنے کی کوشش تھی جب وہ نو سال کی تھی

اور اس معاملے کو چھپانے کے لیے انکل شہباز نے عکس کے نانا پر چوری کا الزام لگا کر اسے گھر سے نکال دیا تھا۔" بختیار اور منزہ پر چند لمحوں کے لیے عجیب سا سکتہ ہوا تھا۔ پھر یہ منزہ تھی جس نے اس خاموشی کو ہذیانی انداز میں یہ کہتے ہوئے توڑا تھا۔

"Shame on you......Shame on you Sherdil" تم اپنے انکل پر اتنا گھناؤنا الزام لگا رہے ہو...... تم اس دغاباز کی باتوں پر یقین کر رہے ہو؟"

"Just stop lieing... stop lieing Mummy" شیردل اپنی آواز اور لہجے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ وہ فیصلہ جو ضمیر نہیں کروا پا رہا تھا، وہ گالی کے ایک چھوٹے سے لفظ کی گونج نے کروا دیا تھا۔ منزہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ ان کی اولاد تھی، وہ ان پر چلّا رہا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" بختیار بھی حواس باختہ ہو گئے۔

"ممی سے پوچھیں۔"

"شہباز یہ نہیں کر سکتا۔" منزہ نے عجیب انداز میں کہا۔

"ممی سچ کہیں۔" شیردل یک دم کرسی سے اٹھ کر منزہ کے پاس چلا گیا۔

"الزام ہے یہ۔"

"میں نے دیکھا تھا انکل شہباز کو اس رات یہ سب کرتے......"

"وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ آدھی رات کے وقت کیسے آئی وہ اس گھر میں...... اپنی مرضی سے آئی ہو گی...... یہ نوکروں کے بچے، بچے تو نہیں ہوتے یہ تو adult ہوتے ہیں۔ میچور ہوتے ہیں۔ یہ بچیاں جان بوجھ کر اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں۔ tempt کرتی ہیں پیسوں کے لیے۔" شیردل نے منزہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مت کہیں ممی...... یہ سب مت کہیں۔ وہ باتیں مت کہیں کہ آپ میری نظروں سے گر جائیں۔ وہ نو سال کی ایک بچی تھی۔ Just a child...... میں نے اسے اس رات بلوایا تھا...... چیس کھیلنے کے لیے، میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔" وہ انکشاف پر انکشاف کر رہا تھا اور منزہ کی آنکھوں میں عجیب التجا تھی یوں جیسے وہ چاہتی ہوں وہ وہ راز نہ اگلے جو کم از کم ان کے لیے راز نہیں تھا۔ بات کرتے ہوئے شیردل کی آواز بھرا گئی۔ اس نے منزہ کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"اس رات وہاں جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار میں بھی تھا لیکن انکل شہباز...... وہ انسان نہیں تھے He was an animal۔" وہ ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس بت پر ضربیں لگا رہا تھا جو منزہ اپنے بھائی کا لیے پھرتی تھیں۔ بختیار ساکت تھا اور منزہ گونگی ہو چکی تھیں۔

"انکل شہباز نے ایک خاندان تباہ کیا تھا اس رات...... صرف ایک نہیں...... میں باپ ہوں ایک چار سال کی بچی کا۔ ممی میں سمجھ سکتا ہوں اس تکلیف اور بے عزتی کے احساس کو جو عکس کے نانا کو ہوئی ہو گی۔ میں ان کی جگہ ہوتا تو اس شخص کو مار ڈالتا جو......" منزہ نے اس کی بات کاٹی۔

"تم نو سال کے بچے تھے تب خود شیردل...... تم کیسے سمجھ سکتے ہو یہ سب کچھ...... ہو سکتا ہے تم نے اس رات کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور یہ سب کچھ تمہارے ذہن نے خود بنا لیا ہو۔ خیر دین اور شہباز کا جھگڑا ہوتے اور ان کی باتیں سنتے ہوئے تم نے یہ سمجھ لیا ہو کہ واقعی ایسا کچھ ہوا تھا...... تم کتنی باتیں اور چیزیں اپنے پاس سے گھڑ لیا کرتے تھے۔" منزہ ایک عجیب اضطراب کے عالم میں ایک آخری کوشش کر رہی تھیں شہباز کی عزت بچانے کی۔ ایک آخری کوشش...... اپنے مرے ہوئے اکلوتے بھائی کو اس کے گناہ پر کی

جانے والی ملامت سے بچانے کی آخری کوشش۔ ''آپ کو تو یاد ہی ہو گا بختیار...... یہ کیسی کیسی باتیں سوچ لیا کرتا تھا بچپن میں...... جو ممکن ہی نہیں ہوتی تھیں اور ہم ہنستے تھے اس کی باتوں پر کہ کیا imagination ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے چند لمحوں کے لیے رک گئیں۔ بختیار کی آنکھوں میں کچھ تھا جو انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

''انہی دنوں یہ بہت اپ سیٹ تھا۔ اکثر راتوں کو ڈر جاتا تھا...... آپ کو تو یاد ہو گا آپ امریکا میں تھے اور جب واپس آئے تھے تو آپ بھی اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے...... ہو سکتا ہے اس نے خواب میں ایسا کچھ دیکھا ہو اور اس نے سچ سمجھ لیا ہو۔'' منزہ نے یک دم اپنی بات بدل دی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ ان کی بات ناقابلِ قبول تھی وہاں بیٹھے ہوئے دونوں مردوں کے لیے۔

''ممی! آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ اچھی طرح جانتی تھیں انکل شہباز نے کیا، کیا تھا۔'' شیر دل نے بے حد سرد مہری کے ساتھ ماں کو ایک بار پھر ٹوک دیا۔ ''میں شاید تیرہ چودہ سال کا تھا جب شہباز انکل اور شرمین آنٹی کے درمیان divorce ہوئی کیونکہ شرمین آنٹی کو اس سارے جھگڑے کا پتا چل گیا تھا۔ آپ نے انکل شہباز کو گھر بلایا تھا۔ ان سے بات کی تھی۔ میں نے وہ باتیں سنی تھیں۔'' منزہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''انہوں نے آپ سے کہا تھا وہ شراب پیے ہوئے تھے اس رات جب چڑیا ان کے اسٹڈی روم میں چیس کھیل رہی تھی، وہ اتفاقاً وہاں چلے گئے تھے اور انہیں نہیں یاد انہوں نے کیا کیا...... شاید کچھ غلط ہوا ہو...... لیکن انہوں نے کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کیا تھا...... وہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ آپ شرمین کو سمجھائیں اور آپ نے ان پر چلانے اور غصہ کرنے کے بعد ان سے کہا تھا کہ وہ جھوٹ بولتے رہیں۔ اس جرم کا کبھی اعتراف نہ کریں۔ I had heard every single word of your conversation اور مجھے آپ دونوں کی ایک ایک بات آج بھی یاد ہے...... مجھے شرمین آنٹی کے ساتھ آپ کا آرگومنٹ بھی یاد ہے...... کیا آپ کو وہ بھی سناؤں'' منزہ کے کندھے پہلی بار جھکے۔ تنا ہوا جسم اور گردن یک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ کچھ رازوں کو کہیں بھی دبا آؤ، وہ کہیں نہ کہیں سے باہر نکل آتے ہیں...... کچھ آوازوں کو کتنا ہی دبا لو اُن کی بازگشت کہیں نہ کہیں سے ضرور سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے شکست خوردہ انداز میں شیر دل کا چہرہ دیکھا پھر بختیار کا۔ وہ اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کو ان کی نظروں میں ولن بننے سے نہیں روک پائی تھیں۔

''Disgusting'' انہوں نے بختیار کی آواز سنی۔ وہ لفظ کوڑے کی طرح پڑا تھا ان پر۔ وہ جانتی تھیں وہ کس کے لیے کہا گیا تھا...... شہباز کے لیے...... ان کے جان سے عزیز چھوٹے بھائی کے لیے۔ وہ لوگ شہباز کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ لوگ کبھی بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ سر جھکا کر وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رونے لگیں۔ وہ شہباز حسین کو دوسری بار بھی نہیں بچا سکی تھیں۔

☆☆☆

''مونی میں چاچا کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔'' سات سالہ شہباز نے بے حد اضطراب کے عالم میں منزہ کا ہاتھ پکڑا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' وہ اصرار کر رہا تھا۔

''تم ہمیشہ مجھے اسی طرح تنگ کرتے رہتے ہو...... چاچا کے ساتھ اکیلے جانے میں تمہیں کیا مسئلہ ہے، جاؤ سوئمنگ کے لیے...... ورنہ ممی آئیں گی اور ان کو پتا چلا کہ تم نے آج پھر سوئمنگ مس کر دی ہے تو وہ ناراض

ہوں گی۔'' گیارہ سالہ منزہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے بیٹ مین کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔ ننھے شہباز پر ایک عجیب سا خوف لہرانے لگا۔ خوف، بے چارگی، بے بسی...... منزہ ہمیشہ الجھتی تھی جب شہباز بیٹ مین حفیظ گل کے ساتھ کہیں بھی جانے سے بری طرح بدکتا تھا۔ حالانکہ حفیظ گل ان کا بارہ سال پرانا بیٹ مین تھا۔ ان دونوں کی پیدائش سے بھی پہلے سے حسین کے پاس کام کر رہا تھا۔ اور بے حد وفادار اور قابلِ اعتبار تھا۔ وہ واحد ملازم تھا جس پر حسین اور اس کی بیوی اپنے بچوں کے حوالے سے اندھا اعتبار کرتے تھے۔ منزہ، حفیظ گل کے ساتھ بے حد اٹیچڈ تھی اور حفیظ گل شہباز پر جان چھڑکتا تھا لیکن وہ شہباز پر جتنا نثار رہتا تھا، شہباز اس سے اتنا ہی بھاگتا تھا۔ حفیظ گل کے ساتھ اکیلے کہیں جانے سے اس کی جان جاتی تھی لیکن جیسے ہی حفیظ گل سامنے آجاتا تھا وہ بالکل گونگا ہو جاتا تھا پھر وہ میکانیکی انداز میں اس کے ساتھ چل پڑتا تھا۔

چالیس سالہ حفیظ گل شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ وہ ایک بے حد مستعد، خوش مزاج اور محنتی آدمی تھا۔ ایمانداری اس کی ایک اور خوبی تھی اور اس کی انہی تمام خوبیوں نے اسے حسین کے گھر کا ایک فرد بنا دیا تھا۔ وہ کھلے عام گھر میں کہیں بھی آجا سکتا تھا۔ بچوں کے کمرے تک میں...... اور یہ آمد و رفت صرف حسین اور اس کی بیوی کی موجودگی میں ہی نہیں رہتی تھی ان کی عدم موجودگی میں بھی حفیظ گل کو گھر کے ہر حصے تک آنے جانے میں اتنی ہی آزادی تھی۔

شہباز حسین کو بچپن سے حفیظ گل ہی نے کھلایا تھا۔ حسین آرمی میں تھا اور حفیظ گل ان کے ساتھ جاتا تھا۔ دونوں میاں بیوی بے حد سوشل تھے خاص طور پر حسین کی بیوی۔ منزہ کے حوالے سے وہ بچپن میں کچھ محتاط رہی تھی لیکن شہباز کو بچپن سے ہی اس نے زیادہ تر حفیظ گل کے سر پر ہی ڈالا ہوا تھا۔ وہ لیڈیز کلب کی ایک سرگرم عہدے دار تھی۔ دونوں میاں بیوی کا تعلق اپر کلاس سے تھا اور ان کے شوق اور سرگرمیاں بھی بے شمار تھیں۔ وہ دونوں خود بھی نوکروں والے گھروں میں نوکروں کے ہاتھوں ہی پلے بڑھے تھے ان کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ ننھے شہباز کو حفیظ بہت بچپن میں ہی حسین یا اس کی بیوی کے کہنے پر پرام میں ڈال کر باہر سڑک پر گھمانے لے جایا کرتا تھا یا اپنے کوارٹر میں لے جاتا۔ حسین یا اس کی بیوی کو کبھی اندازہ نہیں ہوا وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کے لیے ایک جہنم تیار کر رہے تھے نہ انہیں کبھی حفیظ پر یہ شبہ ہوا کہ اس کے کردار میں کوئی خرابی ہو سکتی ہے...... نہ ہی شہباز کے آہستہ آہستہ حفیظ سے دور بھاگنے کی کوشش پر انہیں کبھی یہ احساس ہوا کہ ان کا بچہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔

پہلی بار شہباز نے دس سال کی عمر میں بالآخر اپنی بہن کے ساتھ اپنی زندگی کا وہ جہنم دکھایا تھا جس میں وہ پچھلے کئی سالوں سے جھلس رہا تھا۔ منزہ شاک میں آگئی۔ چودہ سال کی اس بچی کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ماں باپ کو یہ سب بتا دے جبکہ شہباز اس سے اصرار کر رہا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے ورنہ حفیظ گل ان سب کو مار ڈالے گا۔ اس نے منزہ کو ان چاقوؤں کے بارے میں بتایا تھا جو حفیظ گل کے پاس تھے اور اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ کس طرح ان چاقوؤں کے ساتھ اس کے ماں باپ کو ذبح کر دے گا اور پھر ان کے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دے گا جس طرح وہ ہر بقر عید پر ان بکروں کے کرتا تھا جنہیں وہ قربانی کے لیے حسین کے گھر پر ذبح کرتا تھا۔

اس نے منزہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کسی کو نہیں بتائے گی لیکن وہ اسے حفیظ گل سے بچا لے گی...اور منزہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گی لیکن وہ اپنے آپ پر کنٹرول نہیں کر سکی تھی۔ شدید طیش کے عالم میں اس نے اپنا ٹینس ریکٹ نکالا تھا اور وہ بھاگتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئی.... حفیظ گل پورچ میں کھڑی گاڑی

دھو رہا تھا۔ منزہ نے باہر نکلتے ہوئے بھاگتے ہوئے حفیظ گل کے سر پر عقب سے وہ ریکٹ مارا تھا۔
حفیظ گل خوش قسمت تھا کہ ریکٹ کی ضرب سے اس کو نقصان نہیں پہنچا لیکن وہ چلا کر بے اختیار اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ دس سالہ شہباز خوف کے عالم میں بھاگتا ہوا باہر آیا لیکن وہ بیرونی دروازے سے باہر نہیں نکل سکا۔ اس نے اپنی چودہ سالہ بہن کو اس ٹینس ریکٹ کو فرش پر گرے حفیظ گل پر برساتے دیکھا اور اس نے حفیظ کو کسی کیچوے کی طرح اپنے دفاع کی کوشش میں زمین پر لوٹتے پوٹتے اپنے سر اور چہرے کو بچانے کی کوشش کرتے دیکھا......جن مکھی بن گیا تھا......وہ جن جو ایک بچے کے پورے بچپن کو کھا گیا تھا، وہ کتنا کمزور اور ڈرپوک تھا، یہ اس بچے نے وہاں کھڑے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ منزہ جو کچھ اس پر ریکٹ برساتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی، حفیظ گل کو وہ چند جملے ہی یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اس کا بھیانک راز افشا ہو چکا تھا۔ حسین اس وقت تک کرنل بن چکے تھے اور ایک کرنل ایک بیٹ مین کے ساتھ اس واقعے کے بعد کیا کر سکتا تھا۔ حفیظ گل کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ حسین اور اس کی بیوی دونوں اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ حفیظ کے پاس اپنی زندگی بچانے کا ایک موقع تھا۔ وہ ان دونوں بچوں کو جان سے مار دیتا اور گھر میں چوری کی واردات ہو جانے کا ڈراما کرتا تو وہ بچ سکتا تھا، یہ اس کا خیال تھا۔ مار کھاتے کھاتے اس نے منزہ اور اس کے ریکٹ کو پکڑ لیا تھا اور منزہ نے یک دم بلند آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔

دروازے میں کھڑا شہباز، منزہ کو حفیظ کی گرفت میں اس طرح چلاتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بھی دروازہ کھول کر بلند آواز میں روتے اور چلاتے ہوئے باہر آ گیا تھا۔ حفیظ گل بہ مشکل منزہ کا منہ دبا کر اس کی آواز بند کر پایا تھا مگر وہ ایک وقت میں دونوں بچوں کا شور ختم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی وہاں پورچ میں دن کے وقت......صرف چند منٹ لگے تھے اور آرمی آفیسرز کی اس کالونی میں آس پاس کے گھروں سے بیٹ مین اور دوسرے لوگ نکل کر بھاگتے ہوئے وہاں آ گئے تھے۔ بند گیٹ کے پار پہلے شخص کو دیکھتے ہی حفیظ گل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بیٹ مین گیٹ کے اوپر سے کود کر اندر آ گیا تھا اور تب حفیظ گل نے بے اختیار منزہ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر بھاگتا ہوا گھر کے عقب میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا۔ وہاں اکٹھا ہونے والا مجمع جب تک اس کوارٹر تک پہنچ کر دروازہ توڑ کر اسے اندر سے نکالتا وہ اپنے پاس موجود ایک ریوالور سے اپنے آپ کو شوٹ کر چکا تھا۔

حفیظ گل ختم ہو گیا تھا لیکن اگلے کئی سال تک حسین اس کی بیوی اور وہ دونوں بچے اس trauma سے باہر نہیں نکل پائے تھے......اور شہباز حسین ساری زندگی بچپن کے ان اذیت ناک سالوں کے سائے میں رہا تھا۔ حسین نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بہترین سائیکاٹرسٹ کے پاس زیر علاج رکھا تھا۔ وہ اس کے ذہن اور اس کی مسخ شدہ شخصیت کو ایک بار پھر سے سنوارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے تھے۔ شہباز آہستہ آہستہ نارمل ہوتا گیا تھا یا کم از کم اس کے والدین کو یہ لگا تھا کہ وہ نارمل ہو رہا ہے لیکن انسانی ذہن بچپن کے تکلیف دہ واقعات اور حادثات کو بڑے عجیب طریقوں سے رجسٹر کرتا ہے۔ زندگی میں ان یادوں کا کھاتہ کبھی

بھی کھل سکتا ہے اور کھل جاتا ہے۔ شہباز کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔
شراب نوشی کی عادت اس نے امریکا میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں اپنائی تھی اور اس عادت کا تعلق اس ڈپریشن کو ختم کرنے کی کوششوں سے تھا جو کبھی کبھار اچانک بچپن کے اس حادثے کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے ہو جاتا تھا۔ اس کی زندگی میں صرف یہی ایک سیاہ داغ تھا جو اس نے شرمین کے ساتھ کورٹ شپ اور شادی کے بعد بھی اس سے شیئر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی بڑا ہو جانے کے بعد اس کے ماں باپ اور منزہ میں سے کسی نے اس سے دوبارہ کبھی ان تمام تکلیف دہ واقعات کے بارے میں بات کی تھی لیکن اس حادثے کے بعد منزہ شہباز کے ساتھ جیسے سائے کی طرح لگی رہی تھی۔ وہ اس کے علاوہ اب اور اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے ماں باپ کی طرح وہ بھی اس حادثے کے لیے خود کو بھی blame کرتی تھی۔ اگر وہ شہباز کے اصرار پر اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی اور زبردستی مجبور کر کے حفیظ گل کے ساتھ نہ بھیجتی تو شاید یہ کبھی نہ ہوتا۔ چودہ سال کی ایک بچی ہوتے ہوئے بھی وہ ایک بڑی بہن کے طور پر اپنی کوتاہیوں پر نادم تھی۔

اس حادثے کے بعد جو ایک تبدیلی حسین کے خاندان میں آئی تھی، وہ نوکروں کے لیے ان کا بدلا ہوا رویہ تھا۔ وہ نوکروں پر اب کسی بھی طرح سے اعتبار کرنے پر تیار نہیں تھے نہ اعتبار کرنے پر نہ ہی ان کے ساتھ بے تکلفی رکھنے پر......ایک واضح لکیر تھی جو اس خاندان نے مالک اور نوکر کے درمیان کھینچ دی تھی۔

اور زندگی میں اس trauma کے ساتھ پل کر بڑا ہونے والا شہباز حسین اس رات ہمیشہ کی طرح ڈپریشن کے ایک اور دورے میں تھا اور اس ڈپریشن پر قابو پانے کے لیے اس نے ہمیشہ کی طرح اس رات بھی شراب نوشی کی تھی اور شراب کے اس نشے میں اس نے اپنی اسٹڈی میں چڑیا کو دیکھا تھا۔ وہ اسٹڈی میں صوفے کے پاس پڑی ایک سینٹر ٹیبل پر اس کی میگنیٹک چیس لیے گھٹنوں کے بل ٹیبل پر اپنی کہنیاں ٹکائے بڑے اشتیاق سے بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازہ اس وقت کھلا تھا اس لیے اس نے شہباز حسین کے کمرے میں داخل ہونے کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے پورے

انہماک کے ساتھ چیس بورڈ کی طرف متوجہ تھی۔ شہباز حسین کی طرف اس کی پشت تھی۔ کمرے میں پہلا قدم رکھتے ہی شہباز نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک عجیب سی خفگی اور غصے نے اسے اپنی گرفت میں لیا تھا۔ وہ بغیر اجازت رات کے اس پہر ان کی اسٹڈی میں کس طرح آگئی تھی اور کیوں آئی تھی۔ انہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور اس بار قدموں کی چاپ پر چڑیا کچھ ہڑبڑائی اور اس نے بیٹھے بیٹھے مڑ کر دروازے کو دیکھا۔ وہاں ایک بونا کھڑا تھا...... ایک بے حد بدصورت بونا۔

☆☆☆

عکس نے اپنی آنکھیں بند کر کے رگڑیں پھر غنی سے کہا۔

''تھینک یو۔'' اس نے چند لمحے پہلے میز پر وہ خط لفافے میں ڈال کر رکھا تھا جو اس کا پی اے اس کے آفس کی کچھ دوسری ڈاک کے ساتھ اس کے لیے لے کر آیا تھا۔ وہ اس کی معطلی کی منسوخی کے آرڈرز تھے۔ اسے فوری طور پر اسی جگہ اور اسی عہدے پر دوبارہ کام کرتے رہنے کا حکم دیا گیا تھا جہاں وہ کام کر رہی تھی۔ دو دن کی معطلی میں اس کے ماتحت عملے میں جیسے ایک ہلچل مچ گئی۔ اس نے چھٹی بڑھالی تھی اور وہ ابھی بھی لاہور میں خیر دین کے پاس ہی تھی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے...... دو چار دنوں میں انکوائری بھی رک جائے گی..... شوکاز نوٹس بھی کینسل ہو جائے گا۔'' غنی اسے بتا رہا تھا۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا بختیار، شیر دل کو کیا ایشو ہوا ہے تم سے......؟ تمہارے اور شیر دل کے درمیان اب دوستی نہیں ہے کیا؟......'' غنی اپنی کافی میں چمچ ہلاتے ہوئے کچھ الجھے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ عکس کے معطل ہونے کی خبر پر سب سے پہلے اسے فون کرنے والا وہی تھا۔ عکس نے اس کا اصل مسئلہ بتانے کے بجائے ٹال مٹول والے انداز میں اس سے بات کی تھی لیکن اسے اندازہ تھا کہ غنی جب اسے بحال کروانے کی کوشش کے لیے اپنا اور اپنی فیملی کا اثر ورسوخ استعمال کرے گا تو اسے یہ جاننے میں دقت نہیں ہوگی کہ اسے معطل کرنے اور انکوائری کے لیے پریشر کہاں سے آیا تھا اور وہ یقیناً اسی طرح ہکا بکا رہ جائے گا جس طرح وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ بختیار شیر دل کی فیملی اگر establishment کا ایک ستون تھا تو غنی حمید کا خاندان دوسرا ستون تھا۔ عکس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس دوسری فیملی سے بھی کسی نہ کسی طرح وابستہ تھی...... غنی اور اس کی دوستی پسندیدگی اور غنی کی طرف سے شدید قسم کی پسندیدگی کے بہت سارے مراحل طے کرنے کے باوجود شادی جیسے رشتے میں تبدیل نہیں ہو سکی تھی...... غنی ڈرنک کرتا womanizer تھا اور جاب میں آنے کے بعد مالی بے ضابطگیوں میں بھی انوالو ہوتا رہا تھا۔ شیر دل اور اس کے خاندان کے درمیان فرق صرف reputation کا تھا۔ شیر دل کے خاندان کا دامن اس حوالے سے صاف تھا اور ان کی reputation اور کارکردگی غنی حمید کے خاندان سے بہت بہتر تھی جو سیاسی گھرانوں کے زیادہ قریب تھا اور ان پر نوازشات کرنے اور انہیں ان سے مراعات لینے کا ماہر تھا۔

غنی حمید کے خاندان کی ایسی ساکھ نہ بھی ہوتی تب بھی عکس کے لیے اس کو ریجیکٹ کرنے کے

لیے یہ وجہ کافی تھی کہ وہ شراب پیتا تھا۔ صرف غنی حمید ہی نہیں، کسی بھی مرد کو رد کرنے کے لیے اس کے لیے یہی ایک وجہ کافی تھی۔ وہ زندگی میں بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ کمپرومائز کر سکتی تھی لیکن شراب پینے والے مرد کے ساتھ نہیں۔ یہ ایک چیز تھی جسے وہ شعوری یا لاشعوری کسی بھی طرح سے نظرانداز نہیں کر پائی تھی۔ شیر دل نے غنی کی ان عادات کے بارے میں اسے بہت پہلے بتا دیا تھا اور شیر دل کے سامنے یہ ظاہر کرنے کے باوجود کہ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی، عکس، غنی کے حوالے سے یک دم بہت محتاط ہو گئی تھی۔ غنی کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنے کے بعد عکس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ شیر دل نے اس کے حوالے سے جو بھی کہا تھا، وہ صرف جیلسی نہیں تھی حقائق تھے۔ غنی نے عکس کے سامنے کسی گفتگو میں ایک بار شراب پینے کا اعتراف کیا تھا اور بہت فخریہ انداز میں کیا تھا۔ البتہ اس نے عکس کے سامنے کبھی لڑکیوں کے ساتھ اپنے افیئرز اور تعلقات کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس حوالے سے محتاط تھا۔ یہ وہ بات تھی جو کسی بھی عورت کے لیے قابلِ قبول نہ ہوتی اور اتنے کھلے اعترافات کے بعد کوئی بھی لڑکی ایسے کسی شخص کو لائف پارٹنر بنانے سے پہلے سو بار سوچتی لیکن غنی کو اندازہ نہیں تھا کہ عکس کے لیے اس کی شراب نوشی اس کے افیئرز سے زیادہ repulsive تھی۔ غنی حمید کو اس نے ان مردوں کی فہرست میں بھی شامل ہی نہیں کیا تھا جنہیں وہ لائف پارٹنر کے طور پر چننے کے لیے غور کرتی۔ غنی نے جب پہلی بار اسے پرپوز کیا تھا تو عکس نے اسے بڑے واضح اور صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ اسے بہت پسند کرتی تھی لیکن دوستی کے علاوہ اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں چاہتی۔

غنی نے اس کے انکار کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ اپنی رائے بدل دے گی خاص طور پر اس لیے کیونکہ ان کے درمیان بہت اچھی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ شیر دل کے برعکس غنی حمید status conseious ہونے کے باوجود شادی کے معاملے میں اپنی پسند کو ایک حسب نسب کی شادی پر ترجیح دینے پر یقین رکھتا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ اپنے خاندان کو عکس کے ساتھ اس کی شادی کرنے پر تیار کر لے گا اور اس کا اظہار اس نے

عکس سے کئی بار کیا تھا۔
''شیردل نے تمہیں میرے حوالے سے برین واش کیا ہے؟'' غنی حمید نے کئی بار شادی کا پروپوزل رد ہونے کے بعد بالآخر عکس سے کہا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا ان کی دوستی کے دوران میں کہ ان کے درمیان شیردل کے حوالے سے اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب عکس کو احساس ہوا کہ غنی حمید، شیردل سے ہمیشہ بے نیازی اور لاتعلقی ظاہر کرنے کے باوجود بھی اس سے خائف تھا۔ وہ شیردل کے چارم سے خائف تھا...... عورتوں میں اس کی مقبولیت سے خائف تھا اور وہ کبھی بات نہ کرنے کے باوجود بھی شیردل اور عکس کی دوستی سے خائف تھا۔
''شیردل نے مجھے کبھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہا۔'' عکس نے زندگی میں پہلی بار شیردل کے حوالے سے غنی سے جھوٹ بولا۔ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔
''یہ سفید جھوٹ ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''شیردل اور کبھی تم سے میرے بارے میں کچھ نہ کہتا ہو، وہ میرا بچپن کا حریف ہے۔ میں اور وہ ایک دوسرے کی کمینگی کو تمہارے لاکھ جھوٹ کے ساتھ بھی پہچانتے ہیں۔'' اس نے عکس کا مذاق اڑایا۔
''میری زندگی کے کسی فیصلے پر شیردل کی کسی رائے کا اثر نہیں ہوتا۔'' عکس نے ایک اور جھوٹ بولا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا تھا کم از کم اس نے اس بات پر اس کو ٹوک کر اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا تھا عکس کے ساتھ اتنا عرصہ رہنے کے بعد اسے بھی یہ اندازہ تھا کہ وہ دوسروں کی باتوں اور رائے کے مطابق اپنے فیصلہ نہیں کرتی...... لیکن اس مسئلے میں بات شیردل کی ہو رہی تھی اور وہ عکس اور شیردل کی close association سے واقف تھا...... ایک لمبی بحث تھی جو اُن دونوں کے درمیان تب ہوئی تھی اور اس بحث کا نتیجہ وہی رہا تھا جو پہلے تھا۔ غنی حمید بہت مایوس ہوا تھا لیکن اس نے عکس کے انکار کو کسی ذاتی ہتک کے طور پر نہیں لیا تھا نہ ہی انا کا مسئلہ بنایا تھا۔ ان دونوں کے درمیان دوستی اسی طرح چلتی اور قائم رہی تھی جیسے پہلے تھی۔ عکس مراد علی، غنی حمید کے بیچ میٹ کی واحد لڑکی تھی جس کے ساتھ غنی حمید کی اس طرح کی دوستی تھی...... باقی لڑکیوں کے ساتھ غنی حمید کی چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی اور اس حوالے سے بہت کم ہی کوئی لڑکی ایسی تھی جو غنی حمید کی دل سے عزت یا احترام کرتی ہو۔ شیردل اس کے برعکس ایک پرفیکٹ جنٹلمین تھا خواتین بیچ میٹس کے ساتھ وہ بھی بے تکلف تھا اور ان میں بہت پاپولر بھی لیکن اس کی بے تکلفی اور دوستیاں ایک حد تک رہتی تھیں۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ فضول چھیڑ چھاڑ کے حوالے سے بے حد محتاط تھا اور شیردل میں بے حد دلچسپی کے باوجود اس کے حوالے سے کسی لڑکی کو کوئی ناگوار تجربات نہیں ہوئے تھے۔ اس کی ریپوٹیشن اس حوالے سے بہت اچھی تھی...... اور عکس مراد علی اپنے کامن کے ''ہیرو'' اور ''ولن'' دونوں کے ساتھ قریبی دوستی رکھتی تھی۔ ''ہیرو'' اور ''ولن'' اس کے لیے ایک جیسا احترام رکھتے تھے۔ یہ ایک عجیب وغریب تکون تھی جو ان تینوں کے درمیان تھی۔ اس تکون کو غیر متوازن ہونے سے بچانے کا سارا کریڈٹ عکس مراد علی کو جاتا تھا۔

''شیر دل کے ساتھ میرا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟'' وہ غنی حمید کے سوال پر مسکرا دی۔

''پھر بختیار شیر دل نے کیوں......؟'' عکس نے غنی کو ٹوک دیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''میرے نانا نے اپنے پروفیشنل کیریئر میں اپنے ساتھ ہونے والی ایک بے انصافی کے لیے کیس کیا ہے اور وہ شیر دل کے ایک انکل کے خلاف ہے جو کبھی ان کے پاس رہے تھے۔'' اس نے بہت مختصراً غنی سے کہا۔

''wow۔'' وہ بے اختیار کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ ''وہ یقیناً ایک کارنامہ تھا۔ اور تم نے انہیں کرنے دیا؟'' غنی کے لیے حیرت کا اصل باعث یہ بات تھی۔

''ہاں۔'' عکس یہ چھپا گئی کہ کیس اس کی طرف سے تھا اور شیر دل بھی اس میں نامزد تھا ایک وارث کے طور پر۔

''Now I understand۔'' غنی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور شیر دل کے ساتھ اب اس کیس کے بعد تو......'' عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''we are still friends۔'' اس نے کہا۔ وہ بے یقینی سے مسکرا دیا۔

''یہ مشکل کام ہے۔ میں شیر دل کی جگہ ہوتا تو کبھی ایسی دوستی نہیں رکھ سکتا تھا۔'' غنی نے بے ساختہ کہا۔ عکس مسکرا دی۔

''تم شیر دل نہیں ہو غنی۔'' کیا تھا اس جملے میں کہ غنی ہل نہیں سکا تھا۔ اس نے اپنے اور شیر دل کے تعلق کو اس سے پہلے ایسے واضح لفظوں میں نہیں جتایا تھا۔ غنی بہت دیر تک بول نہیں سکا۔

''تم سمجھتی ہو کہ شیر دل اپنی فیملی کے بجائے تمہیں سپورٹ کرے گا...... کیونکہ تم اس کی دوست ہو؟'' ایک لمبی خاموشی کے بعد غنی نے عجیب مذاق اڑانے والے انداز میں اسے سلگایا۔

''سپورٹ کا میں نے نہیں کہا اور نہ ہی مجھے اس کی سپورٹ کی ضرورت ہے...... لیکن دوست ہم اس جھگڑے کے بعد بھی رہ سکتے ہیں۔''

''خوش فہمی ہے تمہاری۔'' غنی نے اسی انداز میں کہا۔ آج پہلی بار شیر دل کے لیے عکس کی یہ جانبداری اسے زہر لگی تھی۔

''انسانوں کے حوالے سے میں خوش فہمیاں رکھنے کی قائل نہیں ہوں۔ یہ کام ساری زندگی نہیں کیا تو اب کیا کروں گی۔'' وہ اسی اطمینان سے بولی۔

''مجھ سے کیوں اس کیس کی بات نہیں کی تم نے؟ میں آخری حد تک جا کر تمہاری مدد کرتا۔'' غنی نے یک دم بات بدلتے ہوئے کہا۔

''اپنے مسئلے انسان کو خود نمٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' وہ مسکرا دی۔

''مجھے جاننا ہے یہ سب۔'' غنی نے کچھ دیر خاموش رہتے ہوئے اس سے کہا۔ اس پوری گفتگو کے دوران میں پہلی بار اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے غنی کو یہ بتانا چاہیے تھا یا نہیں کہ اس کی اور

جواد کی منگنی ختم ہو چکی تھی۔

''شیر دل سے کہو وہ اس ایشو پر تمہاری مدد کرے لیکن اپنی زندگی کی اس اسٹیج پر بختیار شیر دل کے خاندان سے کسی قسم کا جھگڑا مول مت لو۔'' عکس کو یقین نہیں آیا یہ مشورہ اسے غنی حمید دے رہا تھا۔ شیر دل اور اس کے خاندان کا ازلی حریف۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ شیر دل کا خاندان اس مسئلے پر تمہیں کس حد تک تنگ کر سکتا ہے اور جواد اور اس کی فیملی کبھی تمہیں سپورٹ نہیں کرے گی۔ وہ تمہارے نانا کے ایک پرانے مسئلے کے لیے شیر دل خاندان کی دشمنی کبھی مول نہیں لیں گے نہ ہی تمہیں لینے دیں گے۔'' وہ اس وقت ایک مخلص دوست کی طرح اور صرف دوست ہی بن کر اسے مشورہ دے رہا تھا۔ جواد کے خاندان کو وہ بھی شیر دل کی طرح اچھی طرح جانتا تھا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں...... پوری کوشش کروں گا کہ کہیں بھی تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو کم از کم پروفیشنلی لیکن عکس یہ پاکستان ہے...... یہاں ایک عورت کو دھمکانے اور تنگ کرنے کے لیے بہت سے طریقے اور حربے ہیں۔ ابھی انکوائری اور شوکاز نوٹس اختیارات کے غلط استعمال کے حوالے سے ہے۔ کل کو تمہاری character assasination بھی کی جا سکتی ہے یا کروائی جا سکتی ہے۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہمارے جیسے ملک میں اس کا عورت ہونا ہے اور مرد کی سب سے بڑی طاقت اس کا مرد ہونا...... یہ پیدائشی تفریق اور امتیاز ہے جو یہ معاشرہ کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ یہ تعلیم، کیریئر اور باقی ساری چیزیں مل کر بھی اس بیلنس آف پاور (طاقت کے توازن) کو عورت کے حق میں تبدیل نہیں کروا سکتیں...... تو انکل خیر دین کو کوئی ایسا کام مت کرنے دو جس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے۔ وہ انکل خیر دین کو کچھ نہیں کہیں گے، وہ جو بھی کہیں گے تمہیں کہیں گے۔ تمہیں پہنچنے والا نقصان تمہارے نانا کے پیر اکھاڑنے اور انہیں پچھاڑنے کے لیے کافی ہو گا...... اور میں تمہیں نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ خاموش بیٹھی بڑی سنجیدگی اور غور سے غنی حمید کی ایک ایک بات سنتی رہی اور اس نے اعتراف کیا کہ اس نے غنی کو underestimate کیا تھا۔ وہ شیر دل سے کدورت اور تعصب رکھنے کے باوجود اس معاملے پر بہت حقیقت پسند ہو کر اسے اپنی رائے دے رہا تھا۔

''غنی، جواد سے میری منگنی ختم ہو چکی ہے۔'' اس نے اس کی اس گفتگو کے جواب میں کہا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

''کب؟...... کیوں؟''

''آٹھ دس دن پہلے۔ اس کی فیملی کچھ ناخوش تھی اس رشتے سے۔'' اس نے شیر دل کے حوالے سے جواد کے الزامات غنی سے شیئر نہیں کیے۔

''اس کی فیملی ناخوش تھی تو یہ مسئلہ تو رشتہ ہونے سے پہلے اٹھنا چاہیے تھا۔ اب شادی کی تاریخ طے ہونے کے بعد۔'' وہ یک دم سے بے حد خفا ہو گیا۔ ''میں اپنے کچھ رشتے داروں کے ذریعے ان کو اپروچ کرتا ہوں۔ ہمارے کچھ رشتے داران کے قریبی فیملی فرینڈز میں سے ہیں۔''

''نہیں غنی، میں اب اس رشتے کو دوبارہ جوڑنا نہیں چاہتی جو بھی ہوا اچھا ہوا اور ٹھیک وقت پر ہو گیا اور مجھے کوئی افسوس نہیں ہے اس حوالے سے۔'' اس نے غنی کو روک دیا۔ وہ واقعی نہیں چاہتی تھی کہ غنی اس کے اور جواد کے درمیان کسی پیچ اپ کی کوشش کرے اور اسے جواد سے یا اس کی فیملی سے عکس اور شیر دل کے افیئر کے حوالے سے منزہ کے الزامات کے بارے میں پتا چلے۔ جواد وہ رشتہ ختم نہ بھی کرتا تو جو کچھ اس نے جواد کے منہ سے اپنے اور شیر دل کے حوالے سے سنا تھا، اس کے بعد وہ کبھی اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش مند نہ ہوتی۔ وہ ایک تنگ نظر سوچ اور ذہنیت کے ساتھ جانتے بوجھتے ہوئے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ ایشو صرف شیر دل کا نہیں تھا، ایشو کسی بھی مرد کا ہو سکتا تھا' سو اس نے اگر یک طرفہ الزامات پر اسے صفائی کا موقع دیے بغیر اس پر فرد جرم لگا دی تھی تو یہ سب کچھ دوبارہ بھی ہو سکتا تھا۔ بار بار ہو سکتا تھا خاص طور پر اس لیے کیونکہ وہ ورکنگ وومن تھی اور ایک ایسے کیریئر میں تھی جس میں مردوں سے میل جول اس کا روزمرہ کا معمول تھا...... اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ جواد کی خواہش تھی وہ اپنی جاب کو شادی کے بعد بھی جاری رکھے۔ وہ زندگی میں بہت سے جھمیلوں سے نبرد آزما رہی تھی لیکن وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ جانتے بوجھتے صرف شادی شدہ کا لیبل لگوانے کے لیے کسی جہنم میں نہیں کود سکتی تھی۔

''میں جواد کو اتنا کمزور نہیں سمجھتا تھا کہ گھر والوں کے کہنے میں آ کر وہ اس طرح کا قدم اٹھا لے۔ اگر اتنا ہی کمزور تھا وہ تو پہلے کس طرح اپنی فیملی کو منایا تھا اس نے؟'' غنی حمید چند بار مل چکا تھا جواد سے...... اور اب وہ حیران تھا جواد اور اس کی فیملی کی طرف سے کیے جانے والے اس فیصلے پر۔

''جو بھی ہوا...... ہم دونوں کے لیے بہت اچھا ہوا۔ میں اسے اس بریک اپ کے لیے الزام نہیں دینا چاہتی۔'' عکس نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں پھر بھی کہوں گا کہ میری اس بات کے بارے میں سوچو۔'' غنی نے کہا۔ وہ اس کا ریفرنس سمجھ گئی۔

''غنی...... یہ سارے حساب کتاب اس کیس کو شروع کرنے سے پہلے میں کر چکی تھی۔ میں عورت ہوں...... یہ معاشرہ میرے لیے کتنا تعصب رکھتا ہے اور میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے مجھے اس کا فرسٹ ہینڈ ایکسپیرینس ہے۔'' اس نے کافی کا آخری سپ لیتے ہوئے کہا۔ ''اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ معاشرہ میرے لیے اپنے اصول اور ضابطے اور روایات نہیں بدلے گا لیکن میں پھر بھی انصاف کے لیے آواز اٹھاؤں گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ میں کیس ہار جاؤں گی۔ یہ ہو گا کہ مجھے کیریئر میں نقصان پہنچے گا۔ جاب سے ہٹانا آسان نہیں ہے لیکن وہ مجھے OSD بنا دیں گے اور ایک لمبے عرصے تک مجھے پوسٹنگ ہی نہیں ملے گی۔ میرے بیچ میٹس کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے اور میں کہیں بھی نہیں...... کیریئر assasination کریں گے...... الزامات لگائیں گے...... میں ایک مشکوک کردار والی آفیسر کہلائی جاؤں گی...... اور...... بس...... اس سے بڑھ کر کیا ہو گا؟'' وہ بے حد سنجیدگی سے غنی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں نے اور میرے نانا نے زندگی میں ہر چیز کے لیے بہت جدوجہد کی تھی۔ جدوجہد کا لفظ میرے لیے نیا نہیں ہے اور نہ ہی مجھے جدوجہد کرنے سے خوف آتا ہے۔ جنگ میں بھی ہر سپاہی کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہی جنگ جیتیں گے۔ صرف امید ہوتی ہے کہ وہ اگر پوری طاقت سے لڑیں تو جنگ جیت سکتے ہیں...... میں بھی اسی امید کے ساتھ یہ کیس لڑ رہی ہوں۔" وہ بول رہی تھی اور وہ اس کی بات کاٹے بغیر سن رہا تھا۔

"میں عورت ہوں اور میں کیا کرسکتی ہوں اور کیا نہیں، یہ معاشرہ اور مرد تھوڑی طے کریں گے میرے لیے...... یہ تو میں طے کروں گی کہ میں کیا کرسکتی ہوں اور مجھے کیا کرنا چاہیے اور جب ایک دفعہ ایک عورت ایک ناممکن کام بھی کرلے گی تو پھر معاشرہ اور مرد نہ بھی بدلے...... وہ سوچ گا ضرور...... میں بس اتنا سا فرق چاہتی ہوں اس معاشرے میں...... اور اتنا سا تو لا ہی سکتی ہوں...... پہلا آدمی جو ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے نکلا تھا، اسے لوگوں نے پاگل کہا تھا...... آج اس کا نام تاریخ کا حصہ ہے۔ انصاف کے لیے جدوجہد کرنا "انسان" کا حق ہے صرف "مرد" کا حق نہیں ہے...... اور میں ایک انسان ہوں...... اور ایک انسان کے طور پر اپنے حق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے میں ہر طرح کے چیلنجز کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔" غنی حمید نے اس عورت کو عجیب مرعوب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا وہ اس عورت کا احترام کرنے پر ایسے ہی مجبور نہیں ہوگیا تھا۔ اس نے کبھی "نسوانیت" کو اتنا "نڈر" نہیں دیکھا تھا۔ غیر متزلزل لہجے میں بڑی نرم آواز میں کہی گئی دوٹوک بات...... وہ اکیڈمی میں اپنے اسی انداز اور لب و لہجے کے لیے پہچانی جاتی تھی۔ اپنے اسی انداز سے کشتوں کے پشتے لگاتی تھی۔ Come what may...... والی بے جگری جو بہت سے مردوں میں بھی ناپید تھی۔

"As expected......" وہ مسکرا کر گہری سانس لیتے ہوئے بالآخر اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "مجھے پتا تھا تم سے میں یہی کچھ سننے والا ہوں Aks Murad Ali. you are one hell of a good speaker" اس نے اسے داد دی تھی۔ وہ مسکرادی۔

"میں دیکھوں گا، کیا کرسکتا ہوں تمہارے لیے اس سلسلے میں۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی غنی...... میں اپنا ہوم ورک بہت اچھی طرح کرچکی ہوں اور میں اس کیس کو میرٹ پر جیتنا چاہتی ہوں تعلقات کے ذریعے نہیں......" عکس نے اسے دوٹوک انداز میں کہا۔

☆☆☆

مثال نے شیر دل کو بہت دور سے دیکھ لیا تھا۔ شہر بانو کے دیکھنے سے بھی پہلے...... وہ ارائیول لاؤنج کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور ان کا منتظر تھا۔ مثال یک دم بے حد خوشی کے عالم میں شہر بانو کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر پاپا، پاپا کہتے ائرپورٹ کی اندرونی عمارت کے

سامنے دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کی آواز پر شیر دل نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور اس نے بہت دور سے مثال کے لیے اپنے بازو پھیلا دیے تھے۔ شہر بانو نے اس سے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ اس نے اپنی نظر کسی اور طرف کرلی۔ بختیار شیر دل کے عملے کا ایک شخص امیگریشن کاؤنٹر پر پہلے ہی ان دونوں کی انٹری کروا کر ان دونوں کا پیکیج وصول کر کے ٹرالی میں سامان لیے ان کے ساتھ تھا۔ شہر بانو نے واپسی کی اطلاع اور فلائٹ کے ٹائم کے بارے میں صرف منزہ ہی کو بتایا تھا اور اسے یہ توقع نہیں تھی کہ ائرپورٹ پر شیر دل اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگا۔ وہ فی الحال اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک عجیب سے رنج اور غصے نے ایک بار پھر اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ جب تک لاؤنج سے باہر آئی۔ مثال شیر دل کی گود میں چڑھی ہوئی اس کی گردن کے گرد بازو ڈالے اس سے باتوں میں مصروف تھی۔ شیر دل، مثال سے باتیں کرنے کے ساتھ ہمیشہ کی طرح اس کا چہرہ چوم رہا تھا لیکن ساتھ وقفے وقفے سے وہ دور سے آنے والی شہر بانو کے قریب آجانے کا بھی منتظر تھا۔ جسے اس نے ائرپورٹ کی Exit تک پہنچتے پہنچتے سن گلاسز پرس سے نکال کر آنکھوں پر چڑھاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ واضح طور پر اس سے eye contact سے بچنا چاہتی تھی۔ شیر دل سے سن گلاسز کے بغیر نظر نہ ملانا تو آسان تھا لیکن آنکھوں میں امڈتی نمی کو روک لینا بہت مشکل۔ وہ چلتے ہوئے بالآخر اس کے قریب آگئی۔ شیر دل نے ہمیشہ کی طرح ایک بازو پر مثال کو اٹھائے ایک بازو خیر مقدمی انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف پھیلایا تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازو کو نظرانداز کرتے ہوئے اس نے یک دم اپنے عقب میں آتے پروٹوکول والے اس اہلکار سے اس سامان کے حوالے سے کچھ کہا اور چند منٹوں تک وہ وہاں کھڑی اس سے بات کرتی رہی۔ شیر دل کو اندازہ ہوگیا تھا وہ کس موڈ میں تھی۔ اس کے ساتھ کھڑے اس کے ڈرائیور اور عملے کے ایک دوسرے شخص نے پروٹوکول اہلکار سے وہ سامان لے لیا تھا اور پارکنگ کی طرف جانے لگے۔ شہر بانو بھی اسے مکمل طور پر نظرانداز کیے ان کے پیچھے چل پڑی۔

"فلائٹ کیسی تھی؟" مثال کو اٹھائے اس کے ساتھ چلتے ہوئے شیر دل نے اس کے موڈ کو بحال کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

"ٹھیک تھی۔" سردمہری سے جواب آیا۔

"مثال نے تنگ تو نہیں کیا؟" شیر دل نے گفتگو کے سلسلے کو ایک اور سوال سے جوڑے رکھنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" لہجے کی خنکی برقرار تھی۔ شیر دل اس سے بات کرنے کی ایک اور کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی مثال نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

گاڑی سے گھر تک کے سفر میں دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شیر دل، مثال سے باتیں کرتا رہا۔ ڈرائیور اور گارڈ کی موجودگی میں وہ نہیں چاہتا تھا ان کے درمیان کسی قسم کا آرگومنٹ

ہو۔ نہ ہی وہ شہر بانو کی سرد مہری اور بگڑا ہوا موڈ ملازمین کے نوٹس میں لانا چاہتا تھا۔

وہ پہلا سفر تھا جس سے واپسی پر شہر بانو کو بالکل خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ائیر پورٹ سے GOR تک کے سفر میں باہر جھانکتی مسلسل ڈپریسڈ رہی۔ شیر دل اور مثال کے درمیان ہونے والی کسی گفتگو پر اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ صرف کھڑکی سے باہر آس پاس کے ٹریفک کو دیکھتی رہی۔ شیر دل، مثال سے باتوں کے دوران وقفے وقفے سے اس کو دیکھتا اور الجھتا رہا۔ ان کی شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا بڑا کرائسس آیا تھا ورنہ اس سے پہلے شہر بانو کی خفگی کو اس نے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ وہ منٹوں میں نہیں تو گھنٹوں میں مان جاتی تھی۔ کبھی اتنے دن نہیں گزرے تھے ان کی بات چیت ختم ہوئے...... اور اب اسے اپنے سامنے اس طرح کے موڈ میں دیکھ کر شیر دل کو صورت حال کی سنگینی کا صحیح معنوں میں احساس ہوا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ وہ بہر حال پاکستان آچکی تھی اور وہ اس کو سامنے بٹھا کر اس سے بات کر سکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا انہوں نے منزہ کے ساتھ کھایا تھا...... منزہ اور شہر بانو کے درمیان رسمی بات چیت کے سوا اور کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ شہر بانو کو منزہ بہت بجھی بجھی لگی تھی۔ اس کے اور شیر دل کے درمیان موجود خاموشی کو بھی اس نے نوٹس کیا تھا۔ وہ منتظر تھی کہ کھانے کی میز پر شیر دل کے سامنے نہیں تو کھانے کے بعد وہ اس سے کچھ بات چیت کرنے کی کوشش کرے گی۔ اسے صورت حال میں ہونے والی کسی نئی تبدیلی کے بارے میں آگاہ کرے گی لیکن منزہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

کھانے کے کچھ دیر بعد شیر دل نے واپسی کا اعلان کر دیا تھا۔ شہر بانو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وہ لوگ سہ پہر کو ہی گھر پہنچ گئے تھے۔ مثال راستے میں ہی شیر دل کی گود میں سو گئی تھی اور شہر بانو بھی اتنی تھکی ہوئی تھی کہ وہ بھی گاڑی کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑکی سے تقریباً چپکی ہوئی سو گئی تھی۔ شیر دل نیند کی حالت میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ سفر کے دوران اس کے ساتھ لگ کر سونے کے بجائے گاڑی کی سیٹ اور دروازے کے ساتھ ٹک کر سوئی تھی۔ شیر دل اسے ہمیشہ کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لپٹا لینا چاہتا تھا۔ سڑک پر آنے والے ہر گڑھے کے دھچکے پر وہ بے اختیار شہر بانو کو دیکھتا تھا یوں جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کا سر دروازے سے زیادہ زور سے نہ ٹکرا جائے۔ وہ کئی دفعہ ان دھچکوں سے جاگتی رہی لیکن پھر سو جاتی۔ پتا نہیں وہ پورے راستے کون کون سی چیزیں خواب میں دیکھتی رہی تھی۔ سمندر کے زیر آب مچھلیاں اور عجیب عجیب سے پودے اور جانور...... عجیب شکل کے گھونگھے اور سیپیاں...... وہ زیر آب پانی میں تیر نہیں رہی تھی قدم اٹھاتے ہوئے چل رہی تھی جیسے وہ چہل قدمی کر رہی ہو اور پھر اس نے سمندر کی تہ میں بہت سے حصوں والا اور رنگوں والا ایک عجیب و غریب آکٹوپس دیکھا جو بالکل ساکت تھا۔ وہ اس کے قریب چلتی گئی...... اور قریب...... پھر اس نے آکٹوپس کے سر پر موجود ایک آنکھ کو یک دم کھلتے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''شیبی گھر آگیا ہے۔'' گاڑی ان کے پورچ میں کھڑی تھی اور شیر دل اس کے کندھے کو تھپک

رہا تھا۔ وہ اس کا کندھا تھپتھپانے کے بعد خود سوئی ہوئی مثال کو کندھے سے لگائے ہوئے گاڑی سے نکل گیا۔ شہر بانو کچھ دیر کے لیے اسی طرح پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ وہ اس کا گھر تھا نہ اس کے اندر داخل ہونے والا شخص اس کا وہ شوہر جس پر وہ کبھی جان چھڑکتی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ وہ عجیب دل گرفتگی سے بوجھل وجود کے ساتھ نیچے اتر آئی۔

شیر دل بیڈ روم میں نہیں تھا۔ وہ یقیناً مثال کے بیڈ روم میں اس کے پاس تھا۔ شہر بانو کمرے میں داخل ہوتے ہی کپڑے تبدیل کیے بغیر بیڈ پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ شیر دل جب تک بیڈ روم میں آیا وہ گہری نیند میں تھی...... ہمیشہ کی طرح بیڈ کے ایک کونے میں کسی ننھے بچے کی طرح سکڑی سمٹی ہوئی...... شیر دل نے کمبل کھول کر اس پر پھیلا دیا پھر وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر آئے ہوئے بالوں کو اس نے غیر محسوس انداز میں بہت آہستگی سے چہرے سے ہٹا دیا تھا۔ وہ نیند میں تھی لیکن اس حالت میں بھی تھکن اور اسٹریس اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس کے قریب بیٹھا یہ طے کرتا رہا کہ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں اسے کیا کہنا تھا۔ منزہ نے اپنے غصے اور جوش میں اسے بے حد مشکل میں پھنسا دیا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو کی آنکھ کھلی تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ بیڈ روم میں اندھیرا تھا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل لیمپ جلا کر گھڑی دیکھی پھر برابر والے بیڈ پر دیکھا، وہ خالی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سات آٹھ گھنٹے سو لینے کے بعد بھی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا اور اسے بھوک لگ رہی تھی۔

کپڑے تبدیل کرنے اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد وہ کچن میں آگئی۔ انٹر کام کے ذریعے کسی ملازم کو بلانے کے بجائے وہ ایک ہلکا سینڈوچ اور کافی تیار کر کے واپس بیڈ روم میں لے آئی اور تب اس کا سامنا شیر دل سے ہوا۔ وہ واش روم سے نائٹ سوٹ پہن کر نکلا تھا۔

''فریج میں کھانا تھا، تم ملازم کو کہتیں وہ کھانا لگا دیتا۔'' اس نے شہر بانو کے ہاتھوں میں سینڈوچ اور کافی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جواب دینے کے بجائے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ شیر دل نے بیڈ سائڈ ٹیبل سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور چند لمحے کھڑے کھڑے چینل سرفنگ کرتا رہا۔ وہ شہر بانو کو دانستہ موقع دے رہا تھا کہ وہ سینڈوچ اور کافی ختم کر لے۔ چینل سرفنگ کرنے کے دوران ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنا سینڈوچ ختم کر چکی تھی۔ ٹی وی آف کرتے ہوئے ریموٹ واپس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ صوفے پر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ کافی کے سپ لے رہی تھی۔

''تم کب تک ناراض رہنے کا ارادہ رکھتی ہو؟'' اس نے بڑی نرمی سے صلح جو انداز میں کہا۔

''عکس نے پاپا کے خلاف کیوں کیس کیا ہے؟'' اس کے سوال کا جو جواب آیا تھا اس نے شیر دل کو چند لمحوں کے لیے خاموش کرا دیا تھا۔ وہ شہر بانو سے اتنے سیدھے سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ چند لمحے جیسے وہ کچھ سوچتے ہوئے وہ لفظ ڈھونڈتا رہا جس میں وہ شہر بانو کو کچھ مناسب جواب دے سکے۔

''انکل شہباز اور اس کے نانا کے درمیان کچھ مسئلہ ہوا تھا۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ شاید

انکل شہباز نے اس کے نانا کو غلط سزا دی تھی کسی کو بھی جاب سے اس طرح نکالا نہیں جا سکتا جس طرح انہوں نے عکس کے نانا کو نکالا تھا۔ وہ اس punishment کو چیلنج کر رہی ہے اور اسے revoke کروانا چاہتی ہے۔'' اس نے بڑے نپے تلے الفاظ میں شہر بانو کو سمجھایا۔ وہ شہر بانو کو خیر دین کے ساتھ ہونے والے اصل ظلم کی تفصیلات نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ منزہ نہیں تھی جسے یہ سب جتانا اور بتانا ضروری تھا۔

''اتنے سالوں بعد اسے یہ سب کیوں یاد آیا ہے؟'' وہ بے حد عجیب لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

''کوئی کبھی بھی اپنی چیز کو کلیم کر سکتا ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والی بے انصافی پر آواز اٹھا سکتا ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہ وقت کیوں chose کیا ہے۔'' شیر دل نے ایک بار پھر بڑے نپے تلے لفظوں میں اس سے کہا۔

''پاپا کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔'' اس کی بات کے جواب میں شہر بانو نے کافی کا مگ سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے مستحکم اور دوٹوک انداز میں کہا۔ شیر دل خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ یہ جملہ نہ بھی بولتی وہ تب بھی جانتا تھا کہ وہ شہباز سے کس طرح کی وابستگی رکھتی تھی۔ اسے اس سے اسی طرح کے جملوں کی توقع تھی۔ ''میں کبھی یہ نہیں مان سکتی کہ انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی کی ہوگی۔ انہوں نے جو بھی کیا ٹھیک کیا ہوگا۔'' اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تو شیر دل نے کہا۔

''ہر انسان غلطی کر سکتا ہے۔ error of judgement ہر ایک سے ہو سکتا ہے اور شہباز انکل بھی ایک انسان تھے۔'' شہر بانو اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تلخ مسکراہٹ آئی۔

''اور تمہاری غلطی کیا ہے' مجھ سے شادی؟'' شیر دل ایک بار پھر اس کی بات کے جواب میں فوری طور پر نہیں بول سکا۔

''ایک بات بتاؤ شیر دل...... تم عکس سے محبت کرتے ہو؟...... اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

☆☆☆

خیر دین لاٹھی کے سہارے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں بیٹھے مرد اور عورت میں سے مرد کھڑا ہو گیا تھا لیکن یہ صوفے پر بیٹھی ہوئی عورت تھی جس کے چہرے نے خیر دین کو فریز کیا تھا۔ اتنے سالوں کے بعد بھی اسے دقت نہیں ہوئی تھی اس عورت کو پہچاننے میں۔ وہ مصافحہ کرنے والے اس شخص کو ایک شیر دل کے والد کے طور پر پہچانتا تھا اور اس کے ساتھ موجود وہ عورت اگر بختیار شیر دل کی بیوی تھی تو پھر ایک شیر دل...... وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا آ گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

عکس

اس آئینے نے کئی سال پہلے کی طرح آج بھی شہر بانو کی نظر کو خود سے ہٹنے نہیں دیا......گزر جانے نہیں دیا۔ وہ آئینے کے سامنے رک گئی، وقت نے اس آئینے پر اپنے نشانات بڑھا دیے تھے......ہلکی سی بوسیدگی، چند داغ، کئی نئی لکیریں، آب و تاب کھوئی ہوئی چمک، بجھی ہوئی رنگت......وقت نے ایسے ہی بہت سے نشانات اس کے اپنے وجود اور اس چہرے پر بھی چھوڑے تھے جس کا عکس آئینے میں دیکھنے پر شناخت کرتے ہوئے اسے چند لمحے لگے تھے۔

وہ آئینے میں خود کو دن میں کئی بار دیکھتی تھی......لیکن اس آئینے میں نظر آنے والا عکس اس نے کئی سال بعد دیکھا تھا......ایک نظر اس نے خود کو دیکھا پھر اپنے عقب میں نمودار ہونے والے مرد کو......شیر دل کو......آئینے میں دونوں کی نظریں لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے سے ملی تھیں پھر دونوں نے ہی ایک دوسرے سے نظریں چُرا لیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے سے اسی طرح نظریں چُرائے ہوئے ہی پھر رہے تھے۔ آئینے میں ایک لمحے کے لیے جیسے ان کی زندگی جھلکی تھی......وہ زندگی جو وہ ایک دوسرے کے ساتھ گزار رہے تھے......کئی سال سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ......اور ایک دوسرے سے کئی صدیوں کے فاصلے پر......ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار......اور اس محبت کو کائی کی طرح اپنے وجود سے نوچتے ہوئے۔

شیر دل اس کے پاس سے گزر کر کھلے ہوئے اندرونی دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ شہر بانو نے سر اٹھا کر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر اس آئینے کو اور اس گھر کو دیکھا۔

زندگی میں اس گھر سے زیادہ نفرت اسے کبھی کسی دوسری جگہ سے نہیں ہوئی تھی......نفرت شاید ایک بہت معمولی لفظ تھا اپنے ان احساسات کو بیان کرنے کے لیے جو وہ اس گھر کے لیے رکھتی تھی......وہاں کی ایک ایک چیز کے لیے رکھتی تھی......اگر کوئی اسے بھی کہتا کہ دنیا میں وہ کون سی ایک جگہ تھی جسے وہ آگ لگا کر بھسم کر دینا چاہتی تھی تو شہر بانو اس گھر کا نام لیتی......اور اس تمام نفرت کے باوجود شہر بانو وہاں آنے اور وہاں رہنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ وہ اس گھر کی ملکہ تھی۔

☆☆☆

بختیار شیر دل نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے خیر دین کے سامنے بڑی سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے لیے بات کا آغاز کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈتے ہوئے انہیں بھی دانتوں پسینے آ گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی کے پاس معذرت کرنے کے لیے پہنچے تھے اور جس چیز کی معذرت وہ کرنا چاہتے تھے اس کا ذکر بھی زبان پر لاتے ہوئے وہ منوں بوجھ کے نیچے دب رہے تھے۔ وہ طبقاتی فرق پر یقین رکھتے تھے لیکن بے ضمیری پر نہیں۔ ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی منزہ نے ایک بار بھی خیر دین کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ بس بے تاثر چہرے کے ساتھ نظریں جھکائے اپنی کلائی میں موجود رولیکس گھڑی پر انگلیاں پھیرتی رہی۔ بختیار شیر دل کو اسے خیر دین کے پاس معذرت کے لیے چلنے پر تیار کرنے کے لیے زندگی میں پہلی بار بہت سخت لفظوں کا استعمال کرنا پڑا تھا اور ان لفظوں نے منزہ کی خفگی کو جیسے بڑھا دیا تھا۔ شوہر کے غصے نے انہیں ہتھیار ڈالنے اور ان کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ دل میں موجود کدورت کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ بختیار شیر دل جیسے ایک چور کو اس گھر میں اس مالک کے سامنے لے آئے تھے جس کے گھر میں ڈاکا ڈالا گیا تھا۔

''آپ کچھ لیں گے؟'' غیر متوقع طور پر گفتگو کا آغاز خیر دین نے کیا تھا۔ وہ شاید ان کی مشکل بھانپ گیا تھا۔

''نہیں کچھ نہیں......thank you۔'' بختیار نے بڑی شائستگی کے ساتھ انکار کیا۔ خیر دین نے ان کے انکار کے باوجود کارنر ٹیبل پر پڑا انٹر کام کا ریسیور اٹھا کر ملازم سے چائے کے لیے کہا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔ ہتک کی کوئی انتہا تھی جو منزہ اس وقت وہاں خیر دین کے سامنے بیٹھے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ وہ اسی گھر میں ایک مہینہ اس کی

اور اس کے بچوں کی خدمت کرتا رہا تھا۔ اس کے کپڑوں کو استری کرنے سے لے کر اس کے جوتے صاف کرنے تک...... صبح اس کو بیڈ ٹی پہنچانے سے لے کر آدھی رات کو کسی بھی وقت طلب کیے جانے پر حاضر ہو جانے تک...... اور اس کی کبھی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ سکے...... وہ ہاتھ باندھ کر آتا تھا، ہاتھ باندھ کر کھڑا رہتا تھا اور اسی طرح ہاتھ باندھے سر جھکائے چلا جایا کرتا تھا اور اب وہ ان کے لیے اس گھر کے اس صوفے پر بیٹھ کر چائے آرڈر کر رہا تھا جہاں پر میزبان بیٹھا کرتا تھا اور اب وہ ان کے ساتھ انہی برتنوں میں چائے پیے گا جن برتنوں میں وہ چیں گے اور یہ سب اس کے اس احمق شوہر کی وجہ سے ہو رہا تھا جو 21 گریڈ کا ایک سیکریٹری ہوتے ہوئے 18 گریڈ کی ایک ڈپٹی کمشنر کے گھر اپنے ضمیر کی چبھن مٹانے آیا تھا۔

''idiot۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنے شوہر کو کوسا۔ وہاں خیر دین کے برابر بیٹھنا منزہ کے لیے جیسے کوئلوں کی انگیٹھی پہ بیٹھنے کے برابر تھا۔ اتنے سال اپنے بھائی کی جس عزت کو بچانے کے لیے وہ کامیاب جدوجہد کرتی آرہی تھی وہ آج بیچ چوراہے نیلام ہونے چلی تھی اور اس کا سارا کریڈٹ اس کے ''باضمیر'' شوہر اور الو کے پٹھے بیٹے کو جاتا تھا۔

''میں اپنی فیملی کی طرف سے شہباز حسین سے ہونے والی ساری غلطیوں کے لیے معذرت کرنے آیا ہوں۔'' بختیار نے بالآخر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''شہباز اب اس دنیا میں نہیں ہے ورنہ میں اسے ساتھ لے کر آپ کے پاس آتا۔ اس نے جو کچھ بھی آپ کے اور آپ کی نواسی کے ساتھ کیا وہ کسی بھی لحاظ سے کسی اچھے انسان کا رویہ نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے طرزِ عمل کے لیے آپ سے کتنا شرمندہ ہوں آپ کو اندازہ بھی نہیں ہے۔'' آنسو خیر دین کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح ایک لمحے میں امڈ آئے تھے۔ اسے بختیار شیر دل سے اتنے کھلے لفظوں میں اس گفتگو کی امید نہیں تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آج کی ملاقات کس لیے ہو رہی تھی۔ ایک شیر دل کے والدین اگر اس سے ملنے آرہے تھے تو کس لیے آرہے تھے...... اس نے بہت سے اندازے لگانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے کسی اندازے میں شہباز حسین نہیں آیا تھا اور اب اتنے سالوں بعد منزہ کو دیکھنے پر اور بختیار کے منہ سے اسی قصے کا ذکر سننے پر وہ جیسے بُری طرح دل گرفتہ ہوا تھا۔ وہ بختیار شیر دل سے اکیڈمی کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب کے بعد بھی دو تین سرکاری فنکشنز میں ایک شیر دل کے ساتھ مل چکا تھا لیکن وہ منزہ سے پہلی بار مل رہا تھا۔ بختیار کی گفتگو سنتے ہوئے اس کا ذہن ابھی بھی یہ ماننے پر تیار نہیں ہو رہا تھا کہ چڑیا اس سے ایک شیر دل کے بارے میں اتنا بڑا راز چھپا سکتی تھی...... کیا وہ بھی اسی کی طرح اس خاندان کی شناخت سے بے خبر تھی؟ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور تبھی بختیار نے اس کیس کا ذکر شروع کر دیا۔ خیر دین کو کرنٹ لگا تھا تو اس کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا وہ جانتی تھی ایک شیر دل کون تھا اور اس نے پھر بھی خیر دین کو کبھی اس کے بارے میں نہیں بتایا...... کیوں؟ خیر دین کو زندگی میں پہلی بار اپنی چڑیا سے گلہ ہوا تھا۔

☆☆☆

شیر دل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ شہر بانو سے ان دو سوالوں کی ان الفاظ میں توقع نہیں کر رہا تھا۔ نہ وہ عکس کا ذکر اس انداز میں سننے کی امید رکھے ہوئے تھا۔

شہر بانو کو اس کی اس خاموشی سے خنجر کی کاٹ جیسی تکلیف ہوئی جو ان دو سوالوں کے جواب میں اسے شیر دل سے ملی تھی۔ سارے خدشات، ساری بدگمانیوں، سارے گلے شکووں کے باوجود بھی کہیں نہ کہیں اسے بھی جیسے ایک عجیب سی امید تھی کہ وہ بے ساختہ انکار کرے گا، تردید کرے گا...... اس نے ایسا تو کچھ نہیں پوچھا تھا اس سے کہ اس کے سامنے کھائی آجاتی۔ شیر دل کی خاموشی نے اس کے اندر کے شور کو یک دم اور بڑھا دیا تھا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جواب اتنا مشکل ہے تمہارے لیے۔'' شہر بانو نے عجیب شکست خوردگی کے ساتھ اس

کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔ شکست اس کے غصے کو عجیب طرح سے بھڑکانے لگی تھی۔

''احمقانہ باتوں اور سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔'' شیر دل نے بالآخر جیسے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔

''احمقانہ؟'' وہ تلخی سے ہنس پڑی۔ ''شیر دل تم اپنے دل سے پوچھو کہ تمہیں یہ سوال احمقانہ لگا ہے؟'' اس نے عجیب چیلنج کرنے والے انداز میں اس سے کہا۔

''ہاں، مجھے لگا ہے۔ اسی لیے کہا ہے تم سے......'' شیر دل نے بڑی خفگی کے ساتھ اس سے کہا۔ ''ہم کیس کو ڈسکس کر رہے تھے...... میرے اور عکس کے حوالے سے کوئی ڈسکشن نہیں ہو رہی تھی۔''

''یہ کیس تمہاری وجہ سے شروع ہوا ہے۔ تمہارے اور عکس کے اس تعلق کی وجہ سے شروع ہوا ہے جس پر تم بات نہیں کرنا چاہتے۔ اس ساری کہانی میں یہ تیسرا اینگل نہ ہوتا تو یہ کیس بھی کورٹ میں نہ ہوتا۔'' شہر بانو نے بے حد تلخی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''شی اس کیس کو تم بھول جاؤ تم اس میں فریق نہیں ہو۔ تم اس کی تفصیلات نہیں جانتیں...... تم حقائق نہیں جانتیں...... اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں تم اس سارے معاملے سے الگ رہو۔'' شیر دل نے اس کی بات کے جواب میں بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''میں الگ رہوں......؟ میرے باپ کے خلاف ہے یہ کیس...... میں کیسے الگ رہ سکتی ہوں۔'' وہ شیر دل کی بات پر جیسے کچھ اور طیش میں آگئی۔ ''وہ پاپا کو بدنام کرنا چاہتی ہے اور تم اس کا ساتھ دے رہے ہو اور میں اس سارے معاملے سے الگ رہوں کیونکہ تم کیس میں فریق ہو...... میں نہیں...... اور تم اس لیے فریق بنائے گئے ہو کیونکہ وہ جانتی ہے تم اس کو سپورٹ کرو گے...... تم یہ کیس plead نہیں کرو گے...... And she will walk away with the cake۔'' وہ بے حد طیش میں بول رہی تھی۔ ''اسے مجھے پارٹی بنانا چاہیے تھا...... میں شہباز حسین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ تم تو صرف بھانجے ہو۔''

''اس نے اگر تمہیں یا ممی کو فریق بنانے کے بجائے مجھے فریق بنایا ہے تو یہ اس کی favour ہے۔ تم کو اندازہ ہی نہیں ہے پاکستان کے کورٹ سسٹم کا...... تمہیں اگر پیشیاں بھگتانی پڑتیں اور گواہوں اور ثبوتوں کا انتظام کرنا پڑتا تو تمہاری عقل دو دن میں ٹھکانے آجاتی وہ بھی اس صورت میں جب یہ کیس 26 سال پرانا ہے۔'' شیر دل نے بنا لحاظ اسے کہا تھا۔ شہر بانو اس کی بات پر تلخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں پاپا کے لیے کچھ بھی کرتی۔ کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' شیر دل ذرا سا اس کی طرف جھکا اور اس نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔

''اب تم سمجھ سکتی ہو وہ کیوں 26 سال بعد بھی اپنے نانا کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ صرف تم ہی تو محبت نہیں کرتیں اپنے پاپا سے...... ہو سکتا ہے وہ بھی اتنی ہی محبت کرتی ہو۔'' شہر بانو کچھ دیر کے لیے بول نہیں سکی تھی اور پھر جب وہ لفظ ڈھونڈ پائی تو وہ بری طرح اشتعال میں تھی۔

''تم اس سارے معاملے میں کس کے ساتھ کھڑے ہو؟ کس کو سپورٹ کر رہے ہو؟'' اس بار چپ ہونے کی باری شیر دل کی تھی۔ سامنے پڑی ٹیبل پر سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے اس نے شہر بانو سے کہا۔

''یہ میرا dilemma (دہری مشکل) ہے کہ میں کس کو سپورٹ کروں۔'' شہر بانو کو اس کے جملے سے زیادہ اس الجھن نے تکلیف دی جس کے ساتھ وہ یہ بات کہہ رہا تھا۔

''تمہارے لیے عکس مجھ سے زیادہ Important ہے نا؟'' وہ سوال کرتے ہوئے اس کی آواز میں آجانے

والی جھنجھلاہٹ نے خود شہر بانو کو جھنجلایا۔ اسے لگا وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی۔

"تم بات کو ایک بار پھر غلط ٹریک پر لے کر جا رہی ہو۔" وہ پھر برہم ہوا تھا۔

"نہیں، یہ بالکل صحیح ٹریک ہے۔ تمہیں یہ dilemma صرف اس لیے ہے کہ تمہیں عکس اور میرے درمیان چوائس کرنی پڑ رہی ہے اور اس عورت کے ساتھ تمہاری bonding اتنی strong ہے کہ تمہیں میں نظر نہیں آ رہی...... تمہیں اپنے انکل نظر نہیں آ رہے...... خونی رشتے نظر نہیں آ رہے...... تمہیں صرف عکس نظر آ رہی ہے...... اس کا نانا نظر آ رہا ہے...... اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ مجھے غلط فہمی ہے...... میں بات کو غلط ٹریک پر لے جا رہی ہوں۔" وہ خفگی سے بولتی گئی۔ "تم مجھے صرف ایک بات بتاؤ...... یہ عکس کا نانا نہ ہوتا اور ایسا کوئی کیس کسی اور نے میرے پاپا کے خلاف کیا ہوتا تو تم کیا کرتے؟" شیر دل سگریٹ پیتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس کا dilemma صرف عکس ہی کی وجہ سے تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اس لیے کیونکہ وہ اس 'ماضی' کا چشم دید گواہ تھا جسے وہ شہر بانو کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ شہر بانو کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے عکس مراد علی کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

"تمہارے پاس جواب نہیں ہے نا؟ میں تمہیں بتاتی ہوں۔" اس کو خاموش دیکھ کر شہر بانو نے چند لمحے کے بعد خود ہی کہنا شروع کیا۔ "عکس کی جگہ کسی اور نے ایسا کوئی کیس کیا ہوتا تو تم اس کا حشر کر دیتے۔"

"اگر کیس غلط ہوتا تو!" شیر دل نے اسے ٹوکا تھا وہ اس کی بات پر اور برہم ہوئی تھی۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ عکس کا نانا جھوٹ نہیں بول رہا اور پاپا غلط ہیں۔ تم کیسے 26 سال پہلے ہونے والے ایک واقعے پر judgement دے سکتے ہو۔ صرف اس لیے کیونکہ عکس کہہ رہی ہے۔" وہ شدید غصے میں تھی۔

"اب تم پاپا کو کیس چلنے اور اس کا کوئی فیصلہ ہونے سے پہلے ہی مجرم قرار دے رہے ہو۔"

"شی میں نے کیس کی details دیکھی ہیں۔ documents دیکھی ہیں۔ کسی بھی سرکاری ملازم کی ملازمت سے برخاستگی اس طرح نہیں کی جاتی...... انکل شہباز نے قواعد وضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عکس کے نانا کو ملازمت سے نکالا تھا۔ کوئی جرم ثابت ہوا یا نہ ہو وہ اسی بنیاد پر ہی اپنی پنشن اور مراعات بحال کروا سکتے ہیں کہ ان کو ملازمت سے نکالتے ہوئے مروجہ طریقۂ کار کو اختیار نہیں کیا گیا۔" شیر دل اسے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بھاڑ میں جائیں تمام قواعد وضوابط اور طریقۂ کار...... I don't care...... میرے لیے اتنا کافی ہے کہ پاپا نے اس کے نانا کو کسی غلط بات پر سزا دی اور یہ بات ختم ہوگئی......" شیر دل اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

"کوئی بھی بات اس طرح ختم نہیں ہو جاتی شی...... اگر انکل شہباز نے rules کو follow کیا ہوتا تو آج ان کے خلاف یہ کیس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ غلط کام انہوں نے کیا۔"

"جو بھی ہوا ہو گیا۔" شہر بانو نے اسی اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔ "پاپا جا چکے ہیں اس دنیا سے اور میں تمہاری کسی گرل فرینڈ کو یہ تماشا کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" شیر دل نے اس کے جملے میں موجود اس قابلِ اعتراض لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"تو میں کیا کروں؟ تم بتاؤ مجھے میں کیسے یہ ثابت کروں کہ انکل شہباز غلط نہیں تھے۔" وہ کچھ جھنجلا گیا تھا۔

"کچھ بھی کرو...... تمہارے اور پاپا کے لیے تو یہ مشکل نہیں ہے۔" وہ صاف لفظوں میں شیر دل کو جو کہہ رہی تھی اس نے شیر دل کی برہمی میں اضافہ کیا تھا۔

"شی وہ اس شہر میں اس سیٹ پر کام کر رہی اور ضلعی انتظامیہ کی ہیڈ کے طور پر وہ سب کچھ کر سکتی ہے اور کر رہی ہے...... وہ اس سیٹ پر نہ بھی ہوتی تب بھی اس کیس میں انکل شہباز کو defend کرنا مشکل ہوتا۔"

"وہ suspend ہو چکی ہے اور اس کے باوجود وہ اتنی طاقتور ہے کہ تم اور پاپا اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے؟" شہر بانو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"وہ suspend تھی لیکن اب بحال ہو چکی ہے۔" وہ شیر دل کی اطلاع پر جیسے چونک گئی تھی۔

"کیسے بحال ہوگئی؟ پاپا نے اسے suspend کروایا تھا پھر وہ کیسے بحال ہوگئی؟" اس بار اس کی بات پر شیر دل چونکا تھا۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ پاپا نے اسے suspend کروایا تھا؟"

"ممی نے بتایا تھا مجھے امریکا میں۔" شہر بانو نے جواباً کہا۔

"اور یہ تمہارے مشورے پر ہوا ہوگا۔" شیر دل نے بے حد چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر اس نے کہا۔

"ہاں میں نے ممی سے کہا تھا۔"

"تو اب وہ دوبارہ آ چکی ہے۔" شیر دل نے اسی برہمی سے کہا۔

"اور یہ تمہاری کوششوں سے ہوا ہوگا۔" شہر بانو نے تلخی سے کہا۔

"شی تم اپنے ذہن سے یہ بات نکال دو کہ مجھے عکس کے کام نمٹانے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے اور اس کا ہر کام میری مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔" وہ اس بار شہر بانو کی بات پر جھنجلایا تھا۔ شہر بانو پر اس کی خفگی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"اگر پاپا نے اسے suspend کروایا ہے اور وہ چند ہفتے بھی suspend نہیں رہ سکی اور دوبارہ اپنی پوسٹ پر واپس آ گئی ہے تو یہ تمہاری مدد کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے......؟ یا وہ تم سے اور پاپا سے زیادہ powerful ہے؟"

"شی یہ سوال تم پاپا سے کرنا مجھ سے نہیں۔" شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "اور شی تم ایک بات اپنے دماغ سے نکال دو کہ اس طرح powers کا استعمال کر کے کوئی فائدہ ہوگا۔ پاپا یا میں اس کو ساری عمر suspend نہیں رکھ سکتے۔ وہ ایک سینئر آفیسر ہے ڈی ایم جی کی۔ ایک باورچی نہیں ہے کہ اس کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ گورنمنٹ نے 60، 70 لاکھ روپیہ لگوا کر اسے ہارورڈ سے دو سال train کروایا ہے۔ تمہیں لگتا ہے کہ گورنمنٹ اسے کسی fake انکوائری میں سالوں suspend رکھ سکتی ہے۔ she is one of the best officers that we have وہ اگر آج جاب چھوڑ دے تو بھی اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہ ڈاکٹر ہے...... ہارورڈ گریجویٹ ہے۔ ڈی ایم جی میں دس سال کام کر چکی ہے...... شی وہ پاکستان کے اندر اور باہر کسی بھی آرگنائزیشن میں اس سے بھی اچھی پوسٹ پر کام کر سکتی ہے۔ یہ پوسٹ اس کے لیے مجبوری نہیں ہے اور اس نوکری کو ہم اس کے لیے پھندا نہیں بنا سکتے جو تم چاہتی ہو۔"

"تم یہ سب بتا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو مجھ پر؟"

"کچھ ثابت نہیں کرنا چاہتا صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی آنکھوں پر لگی ہوئی تعصب کی اس عینک کو اتار کر اس سارے معاملے کو دیکھو...... عکس مراد علی جو بھی کر رہی ہے وہ کسی بھی لحاظ سے غلط نہیں ہے۔" شیر دل نے بات کرتے ہوئے نرمی سے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی جو شہر بانو نے انتہائی بے رخی کے ساتھ جھٹک دی۔

"شیر دل تم اس عورت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کس حد تک جاؤ گے؟"

"شی تم بار بار یہ بات کیوں کر رہی ہو؟ تم بار بار اس عورت کو اپنے اور میرے بیچ کیوں لا رہی ہو؟" اس بار

شیر دل نے بالآخر بہت خفگی کے ساتھ اس سے کہا تھا۔
"میں لا رہی ہوں؟ شیر دل اسے ہم دونوں کے درمیان لا کر تم نے کھڑا کیا ہے۔" شہر بانو نے جواباً تلخی سے اس سے کہا تھا۔

"تم کیا چاہتی ہو مجھ سے، میں کیا کروں؟" شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے یک دم اس سے پوچھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"تم اسے کہو گے کہ کیس واپس لے لے تو وہ لے لے گی۔" شہر بانو نے بالآخر اس سے کہا۔

"میں نہیں کہوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں وہ نہیں لے گی۔" شیر دل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"شیر دل تم اس عورت کے لیے......" شیر دل نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"شی وہ میری دوست ہے اور دوست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس لیے تم بار بار اس کے اور میرے حوالے سے کچھ ایسا مت کہو جسے سن کر مجھے تمہاری mentality پر افسوس ہو۔" شہر بانو اس کی بات پر یک دم برہم ہوگئی۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے......مر رہے تھے ایک دوسرے سے شادی کے لیے...... اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں تم دونوں کو صرف دوست سمجھوں۔"

"وہ ماضی کی بات ہے اور وہ سب گزر چکا ہے۔ میں happily married ہوں اور اس کی بھی شادی ہونے والی ہے تو تم بار بار وہ والا chapter مت کھولو جسے میں بند کر چکا ہوں۔" شیر دل نے اس بار بہت خفگی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ وہ واقعی عکس اور اپنا اس پیرائے میں بار بار ذکر سن کر تنگ آ گیا تھا۔ شہر بانو اور اس کے درمیان زندگی میں پہلی بار اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی اور شیر دل کے لیے شہر بانو کی زبان سے اس طرح کی باتیں سننا سخت تکلیف دہ تھا۔

"تم نے مجھ سے کبھی اپنی زندگی کا یہ chapter شیئر نہیں کیا......کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم عکس میں انٹرسٹڈ تھے۔" شہر بانو نے عجیب سی رنجیدگی کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

"شی کوئی فائدہ ہوتا اس کا......اور اب بھی اگر ہم یہ ڈسکس کر رہے ہیں تو کوئی فائدہ ہے اس کا۔" شیر دل نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی تمام تر جھنجلاہٹ اور بیزاری کے باوجود وہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس کی ماں سے عکس اور اس کے حوالے سے اس طرح کے انکشافات سن کر بہت اپ سیٹ ہوئی ہوگی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تو وہ بھی اپ سیٹ ہو جاتی اور شیر دل کم از کم اس حد تک وضاحت اور صفائی دینے کا پابند خود کو ضرور سمجھتا تھا کہ اس کی یہ غلط فہمی دور ہو جاتی اور وہ کسی عدم تحفظ کا شکار نہ رہتی۔

"ہم زندگی میں بہت ساری اسٹیجز میں بہت سارے لوگوں میں انٹرسٹڈ ہو جاتے ہیں پھر وقت اور حالات بدل جاتے ہیں، کچھ اور لوگ ہماری زندگی میں آ جاتے ہیں تو ان کی اہمیت بدل جاتی ہے۔"

"تمہاری زندگی میں عکس کی اہمیت اور جگہ نہیں بدلی۔" شہر بانو نے اسے ٹوکا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ جیسے اسے شیشہ دکھا رہی تھی۔

"وہ میرے لیے تم سے زیادہ اہم نہیں ہے شی۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شہر بانو سے کہا یہ جانے بغیر کہ اس کی ان چند لمحوں کی خاموشی نے شیر دل کے منہ کھولنے سے بھی پہلے شہر بانو تک اس کا جواب پہنچا دیا تھا۔

"میں تمہاری بیوی ہوں شیر دل اس لیے اہم ہوں......وہ کیا ہے؟ وہ کس حیثیت سے اہم ہے تمہارے لیے؟" اس نے عجیب رنج سے اس سے کہا تھا۔

"شی میرے لیے تم سب سے زیادہ Important ہو۔" شیر دل نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔ شہر بانو تلخی سے ہنس دی۔

"لیکن وہ بھی important ہے۔"

"شی وہ ایک دوست ہے اور بس میرے اور اس کے درمیان اب ایسا کچھ نہیں ہے جس پر مجھے تمہارے سامنے شرمندگی ہو۔ نظریں چرانی پڑیں۔" شیر دل نے بے اختیار کہا۔

"تم اس سے محبت نہیں کرتے؟" شہر بانو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے یک دم کہا۔ "کہو نہیں۔" وہ اسے چیلنج کر رہی تھی۔

"میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" شیر دل نے جواباً اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔ اس کو پہلی بار اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا جس میں وہ منزہ کی مہربانی کی وجہ سے پھنس گیا تھا۔ جس سے وہ آج مل رہا تھا وہ ایک نئی شہر بانو تھی۔

"تم کم از کم اس سوال کا جواب دینے کے پابند ہو، تم کہہ دو تم عکس سے محبت نہیں کرتے۔" شہر بانو نے اصرار کیا۔

"شی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔" شیر دل نے جواباً اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم اس سے "بھی" محبت کرتے ہو۔" شہر بانو کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ شیر دل صرف اس کا نہیں تھا۔ کون سا غرور کہاں مٹی ہوا تھا۔

"شی......" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شہر بانو اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے صوفے سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ وہ رات اس نے مثال کے بیڈروم میں جاگ کر گزاری تھی اور شیر دل نے اپنے بیڈروم میں......وہ دونوں پوری رات نہیں سوئے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی میں وہ پہلی رات تھی جب وہ ایک گھر میں ایک چھت کے نیچے ہوتے ہوئے بھی دو مختلف کمروں میں رہے تھے۔ وہ دونوں نہیں جانتے تھے وہ صرف پہلی رات تھی آخری نہیں۔

☆☆☆

عکس کو اس شام گھر آ کر خیر دین کے موڈ سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ کسی بات پر اپ سیٹ تھا لیکن وہ کیا بات ہو سکتی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ڈنر ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے اس نے پہلی بار خیر دین کو اپنے آپ کو بے حد عجیب نظروں سے دیکھتے پایا تھا اور عکس نے ان نظروں کو خود پر جما ہوا پایا۔

"نانا کیا بات ہے؟ آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟" اس نے بالآخر کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے خیر دین سے پوچھا۔ خیر دین نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے ٹیبل پر اپنی بائیں طرف پڑا ایک لفافہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ عکس نے حیران ہو کر اس لفافے کو دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑا چمچ اور کانٹا پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے اس نے لفافے کو اٹھاتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

"یہ کیا ہے؟" خیر دین نے جواب نہیں دیا تھا۔ عکس نے ڈنر ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے وہ لفافہ ٹیبل کے ایک کونے میں دیکھا تھا لیکن اس نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ خیر دین کئی بار کسی نہ کسی جاننے والے کی کوئی درخواست اسی طرح ڈنر ٹیبل پر لے کر بیٹھا ہوتا تھا اور ڈنر کے بعد اس سے بات چیت کرتے ہوئے وہ اس درخواست پر بھی بات کر لیتے تھے۔ آج پہلا موقع تھا کہ ڈنر کے دوران خیر دین نے اس کے سامنے کوئی لفافہ بڑھایا تھا۔

لفافے میں سے کاغذ نکال کر اس نے اسے کھول لیا۔ وہ سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن (SAGAD) کی طرف سے ایشو ہونے والا ایک سرکاری نوٹیفکیشن تھا جس میں خیر دین کی طرف سے اپنی ملازمت کی برخاستگی کو غیر قانونی

اور بلا جواز قرار دینے کے اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی پنشن، واجبات اور مراعات کی بحالی کا اعلان تھا۔ وہ کوئی لمبا چوڑا خط نہیں تھا۔ ایک سرکاری کاغذ پر تحریر کچھ سطریں تھیں جنہیں رکی ہوئی سانس کے ساتھ لاشعوری طور پر اس نے کئی بار پڑھا تھا۔ بے یقینی کی ایک عجیب سی کیفیت میں...... یہ کام اتنی آسانی سے ہو جانے والا تو اس نے کبھی بھی نہیں سمجھا تھا لیکن وہ کام ہو گیا تھا۔

''یہی وہ دوسرا کام تھا نانا جو تم کرنا چاہتی تھیں۔'' اس نے خیر دین کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔ خیر دین کی آنکھوں میں جو خوشی اور فخر وہ دیکھنا چاہتی تھی وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اس کاغذ کو دوبارہ اسی طرح تہ کر کے واپس لفافے میں ڈالتے ہوئے لفافہ اسی جگہ پر رکھ دیا جہاں سے خیر دین نے اٹھایا تھا اور پھر بڑے پُرسکون انداز میں خیر دین سے کہا۔

''جی نانا۔''

''تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں...... مجھ سے مشورہ کیے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ میں تم سے اس طرح کی حماقت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔'' وہ خیر دین سے یہ سارے جملے سننے کی توقع کر رہی تھی لیکن خیر دین نے اسے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اس نے اسے کچھ اور کہہ کر اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی۔

''آج ایک شیر دل کے ماں باپ آئے تھے۔'' چمچ کو دوبارہ تھامتا ہوا عکس کا ہاتھ ایک بار پھر فریز ہو گیا تھا۔ اس نے عجیب بے یقینی کے عالم میں خیر دین کو دیکھا تھا۔ اس نوٹیفکیشن کا معمہ جیسے سیکنڈز میں حل ہوا تھا۔ وہ ایک شیر دل کی مہربانی تھی۔

''کس لیے آئے تھے؟'' عکس نے اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''معذرت کے لیے۔'' خیر دین نے مدھم آواز میں کہا۔ عکس ہمت نہیں کر سکی کہ اس سے پوچھ پاتی کہ کس چیز کی معذرت، بہت سارے زخم ایک بار پھر سے رسنے لگے تھے لیکن وہ انہیں ادھیڑنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

''انہیں شہباز حسین کے رویے پر شرمندگی اور افسوس تھا۔ تم سے بھی معذرت خواہ تھے وہ۔'' خیر دین نے رک کر اپنی آواز کی بھرّاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ عکس نے بھی خیر دین سے نظریں ہٹا لیں۔ کئی سالوں کے بعد وہ دونوں آج اس ایک موضوع کو دوبارہ چھیڑ بیٹھے تھے جس پر وہ اتنے سالوں میں گونگے بن کر رہے تھے۔ لیکن زندگی خاموشی کو بھی خاموش کہاں رہنے دیتی ہے۔ درد کو بھی وقت بن کر کہاں گزر جانے دیتی ہے۔ عجیب طرح سے چپ توڑتی ہے، عجیب طرح سے ٹیس بن کر اٹھتی ہے۔

معذرت کے وہ چند لفظ اس خاندان کی طرف سے 26 سال بعد آئے تھے اور اس معذرت نے مرہم بننے کے بجائے درد کو جیسے کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ 26 سال بعد اس خاندان نے انہیں اس قابل سمجھا تھا کہ ان کے سامنے اپنی شرمساری کا اظہار کر کے ان سے معذرت کرتا۔ 26 سال بعد انہیں جیسے ''انسان'' اور ''برابر کے حقوق'' والے انسان سمجھ لیا گیا تھا اور یہ جس طرح بھی ہوا تھا اس ٹیبل پر بیٹھے ان دو لوگوں کے لیے راحت اور فخر کا باعث نہیں تھا۔ عکس کے لیے ایک شیر دل کے خاندان کی طرف سے کی جانے والی معذرت شاکنگ تھی۔ وہ اس کی توقع ان سے نہیں رکھتی تھی۔ رکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے میز پر پڑا وہ ایک خط بہت تھا جس کے لیے وہ جدوجہد کر رہی تھی۔ معذرت تو بہت غیر متوقع تھی۔

''آپ نے کیا کہا اُن سے؟'' عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

''میں نے انہیں معاف کر دیا۔'' خیر دین یہ بات نہ بھی کہتا عکس کو تب بھی اس کے جواب کا اندازہ تھا۔ ''تم بھی ان کو معاف کر دو چڑیا۔'' خیر دین نے اب اس سے کہا۔ عکس نے سر اٹھا کر خیر دین کو نہیں دیکھا وہ نہیں چاہتی تھی وہ اس

کی آنکھوں کی نمی دیکھے۔ وہ اس نمی کو پینے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اس نے زندگی کی بہت ساری تلخی اور زہر کو پیا تھا لیکن اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ آنکھیں بھی کبھی پیمانوں کی طرح کم ظرفی اور چھوٹا پن دکھانے لگتی ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے ہوئے اس نے انگلیوں سے آنکھوں کو رگڑ کر جیسے ان کی نمی پی جانے کی ایک اور کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ہاتھ ہٹاتے ہی اس کی آنکھیں ایک بار پھر چھلکی تھیں اور پھر برستی ہی چلی گئیں۔

ایسی ہی برسات خیر دین کی آنکھوں سے بھی ہو رہی تھی۔ معذرت کا ایک چھوٹا سا لفظ ان کی زندگی میں کچھ بھی بدل نہیں سکتا تھا...... اذیت، رسوائی کا کوئی داغ دھبا ان کے دامن سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا مگر وہ ان کے دلوں کے غبار کو نکل جانے کا موقع دے رہا تھا جیسے کسی بھرے ہوئے آبلے کو کوئی پھٹ کر بہہ جانے دے اور اندر سے نکلنے والا مواد سارا زہر اور ٹیس اپنے ساتھ ہی لے جائے۔

اتنے سالوں بعد وہ معذرت بے وقعت اور بے معنی تھی۔ ان کو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں یہ جنگ اس ایک معذرت سے بہت پہلے جیت چکے تھے لیکن اس کے باوجود ایک شیر دل کے ماں باپ کا وہاں آ کر معذرت کا اظہار عکس اور خیر دین کے لیے عجیب کتھارسس کا باعث بنا تھا۔

''تم نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ ایک شیر دل......'' خیر دین نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ اب اپنے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔ جملہ ادھورا چھوڑا تھا اس نے لیکن وہ جملہ ادھورا سمجھ کر نہیں چھوڑا گیا تھا۔ عکس جانتی تھی وہ اس سے کیا کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے پاس خیر دین کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ٹیبل پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر وہ اب اپنی آنکھیں اور ناک اس سے رگڑ رہی تھی۔ کسی ملازم کے وہاں آنے اور اسے اس حالت میں دیکھنے سے پہلے وہ جیسے خود پر قابو پا لینا چاہتی تھی۔ خیر دین چند لمحے اس کے جواب کے انتظار میں اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

''تم ایک شیر دل کے خاندان کے بارے میں کب سے جانتی تھیں؟''

''انٹر سے...... آپ کو یاد ہوگا ایک debate ہاری تھی میں نے...... وہاں پہلی بار شیر دل کو دیکھ کر پہچانا تھا میں نے۔'' وہ خیر دین سے نظریں ملائے بغیر اپنی پلیٹ میں کانٹا پھیرتے ہوئے اسے بتاتی رہی۔

''اور تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' عکس نے اس بار بھی خیر دین کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا...... اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس...... وہ خیر دین کو یہ کیسے بتا دیتی کہ وہ کبھی شیر دل کے اصلی تعارف کو اس کے سامنے پیش کرنے کی ہمت ہی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی۔ اسے ڈر تھا خیر دین اسے شیر دل سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ اسے خدشہ تھا خیر دین کو اتنے سالوں بعد یہ جان کر تکلیف ہوگی کہ وہ ایک بار پھر اس خاندان سے رابطے میں ہے جو ان کی تباہی کا ذمے دار تھا۔ وہ شیر دل سے دوستی ہو جانے سے بھی پہلے اس بات سے خوف زدہ تھی کہ خیر دین سے اس خاندان کا دوبارہ ذکر کرے...... اس خاندان کا ذکر جیسے اس واقعے سے منسلک اس تکلیف اور بے عزتی کے احساس کو دوبارہ لے بیٹھنے کے مترادف تھا۔ خیر دین اور وہ کبھی اس واقعے کے بارے میں بات نہیں کرتے تھے اور وہ جیسے عکس کے لیے ایک نوگوایریا بن گیا تھا جہاں سے وابستہ کوئی یاد وہ دُہرانا نہیں چاہتی تھی...... وہاں سے منسلک کسی فرد کو وہ اس حوالے سے شناخت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خیر دین کے ساتھ خدشات اور اندیشوں کے اس ڈھیر میں سے کون کون سا اندیشہ اور خدشہ شیئر کرتی۔

''میں نے ضروری نہیں سمجھا۔'' وہ خیر دین کو یہ جواب نہیں دینا چاہ رہی تھی جو اس نے دیا تھا لیکن جیسے وہ اس کے لاشعور سے کہیں باہر آیا تھا۔ خیر دین نے اسے بے یقینی سے دیکھا وہ اس کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

''چڑیا تم نے ضروری نہیں سمجھا؟'' خیر دین نے جیسے اسی بے یقینی کے ساتھ اسی کا جواب دُہرایا۔ ندامت اور

شرمساری کے ایک عجیب سے احساس نے عکس کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ وہ اپنے نانا سے کوئی بات راز میں نہیں رکھتی تھی لیکن یہ ''راز'' نہیں تھا یہ ان کی زندگی کا وہ mess تھا جس کو اس نے خیر دین کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''میں اس کی شناخت کے بارے میں آپ کو بتا کر آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔'' عکس نے بالآخر ایک توجیہہ دینے کی کوشش کی۔ وہ اس سے اب بھی نظریں نہیں ملا رہی تھی، اب بھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اس ضلع کی حاکم تھی۔ اس ضلع میں پتا بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہلتا تھا۔ اس کے فیصلوں اور احکامات پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ ایس اینڈ جی اے ڈی کے rules اور ریگولیشنز اس کی فنگر ٹپس پر ہوتی تھی اور پاکستان پینل کوڈ کی دفعات اسے طوطے کی طرح رٹی ہوئی تھیں...... وہ گورنمنٹ آف پاکستان کی Ace officer تھی جس کے سامنے اچھے اچھوں کو پسینہ آجاتا تھا لیکن وہ خیر دین کی چڑیا تھی جو اس کی گودوں کھلائی ہوئی تھی اور جس کو وہ اندر باہر سے شیشے کی طرح دیکھ اور پہچانتا تھا۔ وہ اس کی چپ کو کتاب کی طرح پڑھتا تھا اور اس کے جھوٹ کی پیاز کی طرح پرتیں اتار لیتا تھا...... اور اس کے باوجود وہ حیران تھا چڑیا اتنی بڑی بات اس سے کیسے چھپا سکتی تھی۔ وہ خیر دین کو تکلیف سے بچانا چاہتی تھی یا وہ ایک شیر دل کو خیر دین کے کسی متوقع شدید ردِعمل سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

خیر دین کو آج بھی یاد تھا بچپن میں ایک شیر دل کے ساتھ کھیلنے سے منع کرنے پر وہ کتنی ناخوش ہوئی تھی اور اس نے ہمیشہ کی طرح خیر دین کی بات او کے کہہ کر مان لینے کے بجائے بہت ساری تاویلیں اور وضاحتیں دے دے کر خیر دین کو اسے ایک شیر دل کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دینے کے لیے منانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک کے لیے اس کے بچپن کے اُنس سے واقف تھا۔ وہ شیر دل کے لیے اس کی ماضی اور حال کی پسندیدگی اور دوستی سے بھی واقف تھا لیکن اسے اس رشتے کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا یا پھر شاید اسے ایک شیر دل کے حوالے سے چڑیا کی فیلنگز کی صحیح نوعیت اور شدت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا تھا۔

''آپ کو برا لگا؟'' وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی عجیب سے جانچنے اور پرکھنے والے انداز میں... بے حد محتاط سی۔

''یہ اتنا برا نہیں لگا جتنا یہ بُرا لگا کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ کیس کرنے کا فیصلہ کیا۔'' خیر دین نے اس سے کہا۔

''میں آپ سے پوچھتی تو آپ مجھے اجازت دے دیتے؟'' عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

''نہیں۔'' خیر دین نے بنا تامل کہا۔

''میں نے اسی لیے نہیں پوچھا آپ سے۔'' عکس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تم اتنی سمجھدار نہیں ہو چڑیا جتنا میں تمہیں سمجھتا تھا۔'' خیر دین نے بے حد سنجیدگی سے اس سے کہا۔ وہ خیر دین کی بات پر مسکرا دی۔

''میرا بھی اپنے بارے میں یہی خیال ہے...... اس لیے میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔'' خیر دین اس کے تبصرے سے محظوظ نہیں ہوا تھا۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے اپنے لیے کتنی بڑی مصیبت کو کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی؟'' خیر دین اب اس سے کہہ رہا تھا۔

''نانا آپ ضرورت سے زیادہ ڈرتے ہیں۔'' عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''تم اسی وجہ سے suspend ہوئی تھیں؟'' خیر دین کو اب اس پر غصہ آرہا تھا۔ اسے عکس نے اپنی معطلی کے

حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن گھر شفٹ ہو جانے کے بعد خیر دین کو ملازموں سے اس چند روزہ معطلی کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ عکس سے پوچھنے پر اس نے بات کو ٹالتے ہوئے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ کسی کیس پر سیاسی مداخلت کو resist کرنے کی وجہ سے وقتی طور پر اسے معطل کیا گیا لیکن اب فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ خیر دین کو تشویش پھر بھی ہوئی تھی۔ اس کے دس سالہ کیریئر میں پہلی بار ایسا کچھ ہوا تھا۔ وہ بہت tactful آفیسر تھی۔ غلط اور ناجائز کام نہیں کیا کرتی تھی لیکن بھاری بھرکم دباؤ اور سفارشوں کو بڑے طریقے سے ٹالتی تھی۔

''نانا آپ tension مت لیا کریں' اب میں سینئر آفیسر ہوں۔ زیادہ پاورز ہیں میرے پاس...... زیادہ پاورز کے ساتھ زیادہ پریشر آئے گا...... لیکن میں ہینڈل کر لوں گی...... آپ بس اپنی صحت کا خیال رکھیں۔'' اس نے خیر دین کو دلاسا دیا تھا۔ ''میں اسی لیے suspend ہوئی۔'' عکس نے اس بار جھوٹ بولنے کے بجائے بے حد اطمینان سے خیر دین سے کہا تھا۔ ''اور suspend ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے جو حالات اس ملک میں ہیں ان میں کوئی آفیسر suspend ہوئے بغیر اپنی مدت پوری کر لے تو وہ معجزہ ہوتا ہے۔''

''چڑیا وہ جنگیں لڑنا بے وقوفی ہوتی ہے جن میں ہونے والی جیت بھی ہماری زندگی کے لیے ضروری نہ ہو۔'' خیر دین نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا۔ ''یہ میرا کیس تھا میرا معاملہ تھا میں اسے چھوڑ چکا ہوں بھول چکا ہوں کیونکہ مجھے پنشن کے ان چند ہزار روپے اور ریٹائرڈ سرکاری ملازم ہونے کے لیبل کی اب ضرورت نہیں ہے...... وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا جب یہ سب کچھ میرے لیے کچھ معنی رکھتا تھا۔'' خیر دین نے نرمی سے اس سے کہا تھا۔

''آپ کا کوئی معاملہ صرف آپ کا معاملہ نہیں ہے۔'' عکس نے اتنی ہی نرمی سے خیر دین سے کہا تھا۔ ''آپ کا ہر معاملہ میرا معاملہ ہے...... ہر مسئلہ میرا مسئلہ اور ہر پریشانی میری پریشانی ہے اور آپ مجھ سے یہ مت کہیں کہ آپ سب بھول چکے ہیں اور جاب سے اس طرح کی برخاستگی آپ کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے خیر دین کی بات کے جواب میں کہا تھا۔

''ضروری نہیں ہوتا چڑیا کہ ہم جس چیز کو بھولے نہ ہوں' ہمیں اس کی ضرورت بھی ہو...... تمہاری کامیابیوں نے میری زندگی کے سارے پچھتاوے، ساری حسرتیں ختم کر دی ہیں...... میں اگر اپنی اس نوکری کو یاد رکھے ہوئے ہوں تو اس کی وجہ وہ ذلت تھی جس کے ساتھ مجھے اس نوکری سے نکالا گیا...... اس نوکری کے چھوٹ جانے کی کوئی حسرت نہیں تھی جسے میں اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔'' خیر دین نے اس سے کہا تھا۔

''وہ نوکری میری وجہ سے چھنی تھی وہ ذلت بھی میری ہی وجہ سے اٹھانی پڑی تھی۔'' وہ بہت سالوں بعد پہلی بار اس واقعے کے حوالے سے اپنی اس شرمندگی کو خیر دین کے ساتھ بانٹ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خیر دین کو وہ نو سالہ چڑیا یاد آئی جسے اس نے تھانے سے رہا ہونے کے بعد اس دن اس رشتے دار کی چھت پر کباڑ خانے میں چھپا دیکھا تھا۔ اسے آج بھی ان معصوم آنکھوں کا خوف اور شرمندگی یاد تھی۔ وہ آنکھیں آج خوف اور شرمندگی نہیں لیکن درد کا وہی رنگ لیے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں چڑیا جو بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا اور میں نے اتنے سالوں میں یہ کبھی سوچا تک نہیں کہ میری زندگی میں آنے والی کسی تکلیف اور ذلت کا باعث تم بنی ہو...... تم میری زندگی کا واحد روشن باب ہو جس کے بارے میں ہر دفعہ سوچتے ہوئے خوشی اور فخر کے علاوہ مجھے اور کوئی احساس نہیں ہوتا۔'' وہ بہت دفعہ کی دُہرائی ہوئی باتوں کو اس کے سامنے ایک بار پھر دُہرا رہا تھا۔ عکس مراد علی ہمیشہ کی طرح ایک مسمرائزڈ سامع کی طرح اس کو سن رہی تھی۔ جیسے کوئی بچہ کسی بڑے سے پریوں کی کوئی ایسی کہانی سن رہا ہو جو ناقابلِ یقین حد تک قابلِ رشک ہو یوں جیسے وہ کسی اور کی کہانی ہو۔

"تمہیں زندگی میں اس اسٹیج پر اگر میری وجہ سے کوئی نقصان پہنچتا تو میں برداشت نہ کر پاتا......تم نے یہ کیس کرتے ہوئے یہ سوچا تھا کہ تم اپنا سب کچھ میرے لیے داؤ پر لگا رہی ہو۔" خیردین نے اب اسے ڈانٹا تھا۔
"زندگی میں آپ نے بہت بار اپنا سب کچھ میرے لیے داؤ پر لگایا ہے۔ ایک بار میں نے لگا دیا تو کیا ہوا؟"
اس نے خیردین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ "میں صرف ریکارڈ ٹھیک کرنا چاہتی تھی۔ ہم تاریخ اور ماضی نہیں بدل سکتے لیکن ان کا ریکارڈ ضرور بدل سکتے ہیں اور ہمیں بدل دینا چاہیے جب بھی ہم بدل سکیں...... میرے نانا چور اور بددیانت نہیں ہیں اور میں ایک جھوٹ کو آپ کی سروس ریکارڈ کا حصہ رہنے نہیں دے سکتی تھی...... اور نانا زندگی میں کسی بھی نقصان سے ڈرنا تو آپ نے ہی مجھے نہیں سکھایا...... اب میں کسی نقصان سے ڈروں تو کس طرح؟" وہ بے حد اطمینان سے خیردین سے پوچھ رہی تھی۔
"میں پھر بھی تمہیں بے وقوف کہوں گا۔" خیردین نے اس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ وہ ہنس پڑی۔
"کہہ لیں...... دنیا میں بس دو لوگ مجھے بے وقوف کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔" اس نے عجیب روانی اور بے ساختگی سے کہا پھر ہاتھ میں پکڑے کانٹے سے پلیٹ میں پڑے کباب کو اٹھاتے اٹھاتے اسی بے ساختگی سے رکی۔
"دوسرا شخص شیر دل ہوگا۔" خیردین نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ گہری سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ پہلا لمحہ تھا جب اس نے شیر دل کے لیے حسد محسوس کیا تھا۔ اسے یہ حسد ایبک سلطان سے نہیں ہوا تھا۔ غنی حمید سے نہیں ہوا تھا۔ جواد ملہی سے نہیں ہوا تھا لیکن ایک شیر دل...... خیردین نے بے اختیار گہری سانس لی۔ کباب کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے عکس مراد علی نے نظریں اپنی پلیٹ پر جمائے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے خیردین کا اندازہ سنا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

"Thank you" کے دو لفظ عکس کے نام کے ساتھ شیر دل کے سیل فون کی اسکرین پر جگمگا گئے تھے۔ وہ اس وقت آفس میں بیٹھا فون ہاتھ میں لیے کسی کو کال کرنے ہی والا تھا جب عکس کا نام وہاں نمودار ہوا تھا۔ شیر دل کال کرتے کرتے رک گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس text کے جواب میں اسے کال کرتا لیکن فی الحال وہ جس ذہنی کیفیت میں تھا اس میں وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہی ڈویژن میں service کر رہے تھے۔ کتنی بھی کوشش کر لیتے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دفتری معاملات کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے بات نہ کرتے لیکن پچھلی رات شہر بانو کے ساتھ ہونے والے جھگڑے کے بعد شیر دل نے یہ طے کیا تھا کہ وہ عکس سے دور رہنے کی کوشش کرے گا۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے دور رہنا اب اس کی ازدواجی زندگی میں آنے والی ممکنہ بہتری کے لیے ضروری تھا۔ عکس نے جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا۔ سیل فون پر ان دو لفظوں کو دیکھتے ہوئے وہ سیکنڈز میں پتا نہیں کیا کیا سوچ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ شکریہ کس چیز کے لیے تھا لیکن اس وقت اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ بختیار شیر دل کے ساتھ بیٹھ کر کیے جانے والے اس فیصلے نے اس کے اپنے گھر کو داؤ پر لگا دیا تھا۔
"سب ٹھیک ہے؟" وہ اس کے text کا جواب ٹائپ کر رہا تھا جب اس کا ایک اور text آ گیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے اور شہر بانو کے حوالے سے پوچھ رہی تھی۔
"Perfect" اس نے جواباً ایک جھوٹ بولا۔ وہ اپنا اور شہر بانو کا مسئلہ کسی اور سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا اور عکس سے اس معاملے کو ڈسکس کرنے کا مطلب مزید خرابی تھا۔
"Great" ایک smiley کے ساتھ عکس کا text اسے آیا تھا۔ شیر دل نے کال کرنے کے بجائے سیل فون بڑی بے دلی کے عالم میں میز پر رکھ دیا۔

شہر بانو اور اس کے درمیان آج صبح بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ مثال کے بیڈروم میں اس کے بیڈ پہ جاگتے ہوئے بھی سو رہی تھی۔ وہ آفس کے لیے نکلنے سے پہلے مثال کو دیکھنے گیا تھا جو جاگ رہی تھی اور صبح سویرے جاگنے کے بعد اس کے پاس بیڈروم میں آ گئی تھی۔ وہ فجر کے آس پاس کا ہی کوئی وقت تھا اور شیر دل کچھ دیر پہلے ہی سونے کے لیے لیٹا تھا لیکن نیم تاریکی میں بھی مثال سیدھا باپ کے پاس جا کر اس کا کندھا ہلانے لگی تھی۔ اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں کھولتے ہوئے شیر دل نے لیٹے لیٹے ہی اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر کمبل کے اندر اپنے سینے پر لٹا لیا تھا۔ وہ نیند میں بھی آنکھیں بند کیے لاشعوری طور پر اس کا سر چومنے لگا۔
"Papa you missed me?" مثال نے اس کے سینے پر اوندھے منہ لیٹے لیٹے پوچھا تھا۔
"I missed you a lot" شیر دل نے ایک بار پھر اسی طرح آنکھیں بند کیے اس کا سر چومتے ہوئے کہا۔
"I missed you too" مثال نے پاپا کے اس اعتراف سے بے حد مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔
"I know" شیر دل اب جیسے ہلکی غنودگی میں تھا۔
"پاپا آپ زیادہ بزی ہیں؟" شیر دل نے چند لمحوں بعد غنودگی میں مثال کی آواز سنی۔ اس نے نیند کو جھٹکتے ہوئے اسے جواب دینے کی کوشش کی۔
"Not for you honey" اس نے ایک بار پھر اس کے بالوں کو چوما تھا۔
"But Mummy said you are busy and you can't live with us in America." (لیکن ممی کہتی ہیں کہ آپ بہت مصروف ہیں اور ہمارے ساتھ امریکا میں نہیں رہ سکتے)۔
شیر دل نے اسے جواباً کہتے سنا اور اس نے نیند میں ہی اس کا جملہ سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ نہیں سمجھ پایا۔
"Honey we don't have to live in America" (ہنی ہمیں امریکا میں نہیں رہنا ہے)۔ شیر دل نے کہا۔
"But Mummy said we will live there" (مگر ممی کہتی ہیں کہ ہم وہیں رہیں گے)۔ مثال نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ شیر دل غنودگی میں ہی اس کی باتیں سن رہا تھا۔ "Only Mummy and I not you because you are busy and you can't live with us in America" (صرف ممی اور میں، آپ نہیں کیونکہ آپ مصروف ہیں اور ہمارے ساتھ امریکا میں نہیں رہ سکتے)
شیر دل کی آنکھوں سے نیند ایک دم اڑ گئی تھی۔ مثال اسی طرح اس کے سینے پر اوندھے منہ لیٹے بول رہی تھی۔
"But I have told Mummy I can't live without you Papa I really love America. Can you please come with us?" (لیکن میں نے ممی کو بتا دیا ہے کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پاپا مجھے امریکا بہت پسند ہے۔ پلیز ہمارے ساتھ چلیں)
شیر دل کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔ ان دونوں نے آج تک کبھی مثال کے سامنے کوئی argument نہیں کیا تھا، کبھی اونچی آواز سے بات نہیں کی تھی یہ جیسے ان دونوں کے درمیان طے پا جانے والا ایک unsaid rule تھا کہ وہ مثال کو اپنے اختلافات سے دور رکھیں گے اور اب وہی بچی اسے شہر بانو کے ساتھ کی جانے والی گفتگو کا خلاصہ پیش کر رہی تھی جس کا سر پیر سمجھ میں نہ آنے کے باوجود شیر دل کم

ضرور اندازہ لگا سکتا تھا کہ شہر بانو نے اس سے کیا ڈسکس کیا تھا اور اسے شاک اس بات پر لگا تھا کہ وہ سب کچھ پہلے ہی طے کر آئی تھی کہ اسے کس صورت حال میں کیا کرنا تھا۔ کیا ان دونوں کا رشتہ اس قدر کمزور تھا کہ وہ شہباز حسین کے مسئلے پر اسے بھی چھوڑ دینے کا تہیہ کیے ہوئے بیٹھی تھی۔ شیر دل کے لیے یہ سب جیسے نا قابل یقین تھا۔

"Misal we are not going any where" (مثال ہم کہیں نہیں جا رہے) شیر دل نے بالآخر اس خفگی کو جھٹکتے ہوئے مثال سے دوٹوک انداز میں کہا جو اس وقت وہ شہر بانو کے لیے محسوس کر رہا تھا۔

"But why Papa?" (لیکن کیوں پاپا؟) مثال نے احتجاج کیا۔

"Because I want you to live with me" (کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو) شیر دل نے اس سے کہا تھا۔ مثال اگلا سوال کرنے کی تیاری میں تھی لیکن شیر دل فی الحال سوال و جواب کے اس سلسلے کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مثال کو ٹوکتے ہوئے پیار سے کہا۔ "Papa wants to sleep sweetie"

"oh ok" مثال نے فوراً کہا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ شیر دل نے آنکھیں بند کر لیں۔

"Papa do you want me to give you a Paarie" (پاپا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو پیار کروں) مثال نے چند لمحے بعد یک دم سر اٹھا کر شیر دل سے کہا۔

"Oh yes honey how can I forget that?" (او ہاں ہنی یہ میں کیسے بھول سکتا ہوں) شیر دل نے جواباً کہا۔ مثال نے بڑی خوشی خوشی اس کے سینے پر ہی کچھ آگے کھسکتے ہوئے اس کے دونوں گال باری باری چومے۔ یہ بھی ایک معمول تھا۔ وہ اگر شیر دل کے پاس سو رہی ہوتی اور شیر دل تھکا ہوا ہوتا اور سونا چاہتا تو مثال اس کے گال چومتی تھی اور شیر دل ظاہر کرتا جیسے اس کے بعد اسے فوراً نیند آ گئی تھی۔ مثال اس کے گال چومنے کے بعد ایک بار پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر اطمینان سے لیٹ گئی تھی۔ اس کے وجود کے گرد اپنے بازو لپیٹے شیر دل نے آنکھیں بند کر لیں۔ فی الحال دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ سکون کی اس جنت سے بدلنا چاہتا تھا جو اس کے سینے پر اس وقت دھری تھی۔

وہ جس وقت الارم کی آواز پر دوبارہ جاگا تھا اس نے مثال کو اپنے پاس نہیں پایا۔ اسے اندازہ تھا وہ اٹھ کر یا تو واپس شہر بانو کے پاس چلی گئی ہو گی یا پھر اس وقت صبح سویرے اپنے معمول کے مطابق گھر میں ادھر ادھر پھر رہی ہو گی اپنی کسی سائیکل پر یا کسی کھلونے کے ساتھ۔

گھر کا اندرونی دروازہ ملازموں کے لیے کھولنے کے بعد وہ آ کر آفس کے لیے تیار ہونے لگا تھا اور ناشتا کرنے کے بعد وہ آفس جانے سے پہلے مثال کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ شہر بانو جاگ رہی تھی لیکن اس کے کمرے میں داخل ہونے پر اس نے کمبل خود پر کھینچتے ہوئے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شیر دل نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اگر اس نے صبح سویرے مثال کی وہ گفتگو نہ سنی ہوتی تو وہ اس سے بات کرنے کی ایک اور کوشش ضرور کرتا لیکن اس وقت اس نے بستر میں ایک ٹیڈی بیئر کے ساتھ لیٹی ہوئی مثال کے ساتھ چند باتیں کر کے اسے پیار کر کے خدا حافظ کہا اور آفس آ گیا تھا۔

آفس میں اس دن کام کے دوران وہ لاشعوری طور پر شہر بانو کی طرف سے کسی ٹیکسٹ میسج یا کال کا منتظر رہا۔ اس نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی میں یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ آفس میں پورے دن کے دوران ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہ ہوا ہو۔ وہ دونوں دن میں ایک آدھ بار ضرور کال کر لیتے تھے چاہے چند منٹ ہی کے لیے..... شہر بانو اسے سارا دن text کرتی رہتی تھی اور وہ مصروف ہونے کے دوران بھی ان ٹیکسٹ میسجز کو reply کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اس کے بھیجے ہوئے Jokes اور quotes بھی شیر دل کے لیے آفس کی تھکا دینے والی مصروفیات کے دوران جیسے relaxation دینے والے چند Invaluable لمحے تھے جن کا وہ منتظر رہتا تھا اور آج سیل فون پر اس کے نام کی عدم موجودگی نے شیر دل کے اسٹریس میں بغیر کسی وجہ کے اضافہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے فرینڈز اور بیچ میٹس سے سنتا رہتا تھا کہ بیویوں کے ساتھ ہونے والے تنازعات کس طرح ان کی ذہنی اور کام کی استعداد کو متاثر کرتے تھے لیکن وہ خود پہلی بار اس کا سامنا کر رہا تھا۔

اس دن وہ آفس میں اتنا زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار رہا تھا کہ شام کو خلاف معمول آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ شہر بانو مثال کے ساتھ لان میں تھی۔ شیر دل ڈرائیو وے میں اترنے کے بعد گھر کے اندر جانے کے بجائے سیدھا لان میں ہی چلا گیا تھا۔ شہر بانو لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور مثال سائیکل چلا رہی تھی۔ شیر دل نے ملازم سے اپنے لیے بھی چائے وہیں لانے کو کہا تھا۔ مثال کچھ دیر اس کے ساتھ بات کرتی رہی اور اس دوران شہر بانو چائے پیتی رہی۔ جب تک شیر دل کے لیے چائے آئی وہ اپنی چائے ختم کر چکی تھی۔ مثال اب دوبارہ اپنی سائیکل کے ساتھ مصروف ہو چکی تھی۔ شہر بانو کو بنا بات کیے اٹھتے دیکھ کر شیر دل نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"چائے بنا دو مجھے۔"

"ملازم کو بھیجتی ہوں وہ بنا دے گا۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اسے وہاں سے جاتے دیکھ کر شیر دل کا دل کچھ عجیب انداز میں ہر چیز سے اچاٹ ہوا تھا۔ اس تنازعے کے حل ہونے کے کوئی امکانات نظر نہیں آ رہے تھے سوائے اس کے کہ وہ اس سے جھوٹ بولتا اور وہ اب یہی کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

"یہ جو کچھ بھی ہوا ہے شیر دل کی وجہ سے ہوا ہے۔" منزہ نے فون پر شہر بانو سے کہا۔ "تمہیں اس کے بارے میں اسی سے پوچھنا چاہیے۔"

"ممی آپ مجھ سے پوچھے بغیر صرف شیر دل کے کہنے پر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی ہیں؟" شہر بانو نے شدید برہمی کے عالم میں منزہ سے کہا۔ منزہ نے اس کے فون کرنے پر اسے یہ اطلاع دے دی تھی کہ وہ بختیار کے مجبور کرنے پر عکس کے گھر ان کے ساتھ گئی تھیں اور وہاں بختیار نے شہباز کی غلطی تسلیم کرتے ہوئے خیر دین کا دعویٰ درست قرار دیتے ہوئے اس کے واجبات اور مراعات کا نوٹیفکیشن جاری کروا دیا تھا۔ البتہ انہوں نے شہر بانو کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دونوں وہاں معذرت کے لیے گئے تھے نہ ہی انہوں نے اس معذرت کی اصل وجہ شہر بانو کو بتائی تھی۔ شہر بانو کو بتانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ بختیار اور شیر دل نے شہباز کو defend کرنے کے بجائے اس کی غلطی تسلیم کر لی تھی۔

"اگر میرے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو تم دیکھتیں میں عکس اور خیر دین کا کیا حشر کرتی، میں انہیں مزہ چکھا دیتی اس قسم کا کیس کرنے پر..... لیکن شہر بانو میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا یہ سارا مسئلہ شیر دل کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ اگر اس عورت کو اس طرح blindly سپورٹ نہ کرتا تو بختیار کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن شیر دل کو عکس کے سامنے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ ماں نہیں...... بیوی نہیں...... وہ انکل نہیں جو سارا بچپن اسے سر پر اٹھائے پھرتا رہا۔" شہر بانو کے ساتھ بات کرتے ہوئے منزہ کو وہ ہتک یاد آ رہی تھی جو انہوں نے شیر دل کے انکشافات کی وجہ سے اپنے شوہر کے سامنے اٹھائی تھی۔ شیر دل نے ان کے شوہر کے سامنے ان کے اپنے خاندان کی جیسے دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں اور منزہ کے لیے ہتک اور ہزیمت کے اس احساس کو بھلانا آسان نہیں تھا لیکن شیر دل کے خلاف شہر بانو سے یہ ساری گفتگو کرتے ہوئے انہیں اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ شہر بانو اور شیر دل کے درمیان اختلافات کے جو بیج بو رہی تھیں وہ ان دونوں کا رشتہ توڑ دینے کا باعث بنے گا۔

اپنے شوہر کی ماں کے منہ سے سننے والے آخری جملے شہر بانو کے لیے بے حد تکلیف دہ اور حوصلہ شکن تھے۔

منزہ نے جیسے اس کے ان خدشات پر مہرِ تصدیق ثبت کردی تھی جو وہ عکس اور شیر دل کے کسی تعلق کے حوالے سے رکھتی تھی۔ وہ یہ ساری باتیں کسی دوسرے شخص سے سن رہی ہوتی تو وہ کبھی یقین نہ کرتی لیکن شیر دل کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہ ساری باتیں شہر بانو سے کہنے والی خود منزہ تھیں جو سازشی یقیناً نہیں تھیں لیکن فی الحال لاجواب بے وقوفی کا مظاہرہ کررہی تھیں۔

''آپ لوگ میرے پاپا کے خلاف یہ نہیں کرسکتے...... You can't disgrace his name۔'' شہر بانو بات کرتے کرتے رو پڑی تھی اور اس کے رونے پر منزہ کی آنکھیں بھی نم ہونے لگی تھیں۔

''بیٹا میں تمہاری فیلنگز سمجھتی ہوں، میں تمہیں بتا چکی ہوں بختیار اور شیر دل کے سامنے میں helpless ہوں۔'' انہوں نے گلوگیر آواز میں اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''آپ helpless ہوں گی ممی...... میں نہیں ہوں۔ اگر پاپا کے خلاف کوئی فیصلہ ہوتا ہے تو پھر کورٹ میں ہو...... کیس چلے...... شیر دل یا پاپا کون ہوتے ہیں میرے پاپا کے نام کو اس طرح خراب کرنے والے...... انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان الزامات کو مان لیں جو عکس اور اس کے نانا کی طرف سے لگائے گئے ہیں۔'' شہر بانو اسی رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ''میں شیر دل سے خود بات کروں گی۔ وہ مجھے بتائے بغیر یہ سب کیسے کرسکتا ہے۔''

''تم اس سے اب بات مت کرو۔ اب بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' منزہ نے اسے یک دم ٹوک کر کہا۔ انہیں پہلی بار ایک نیا خدشہ ہوا تھا۔

''ممی مجھے بات کرنی ہے اس سے...... کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔'' شہر بانو نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''تم شیر دل کے شہباز پر لگائے ہوئے کسی الزام پر یقین مت کرنا۔ وہ اس وقت وہی سب کچھ کہہ رہا ہے جو عکس کہہ رہی ہے۔'' منزہ نے جیسے حفظِ ماتقدم کے تحت اس کو پہلے سے شیر دل کے ممکنہ الزامات کے انکشاف پر ان سے بدظن کرنے کی کوشش کی۔ شہر بانو کو منزہ کی بات اور اس کا کوئی سیاق وسباق سمجھ آیا تھا نہ ہی اس نے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ منزہ اسے کوئی وارننگ نہ بھی دیتی تب بھی وہ شیر دل کی کسی بات پر یقین کرنے والی نہیں تھی۔

اس رات ان کا ایک اور شدید جھگڑا ہوا تھا اور وہ شیر دل کے جھوٹ سے شروع ہوا تھا۔ اس نے مصالحت کی ایک اور کوشش کا آغاز کرتے ہوئے ڈنر ٹیبل پر شہر بانو سے کہا تھا کہ عکس نے کیس واپس لے لیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اب اتنا جھوٹ بول دینے کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ شہر بانو کو کبھی پتا نہیں چل سکتا تھا کہ کیس واپس لیا گیا تھا یا اسے نمٹایا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب عکس کے ساتھ معاملہ مصالحت آمیز انداز میں حل کرلینے کے بعد شہر بانو سے ایک چھوٹا سا جھوٹ بول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا لیکن اسے اپنی بدقسمتی کا اندازہ نہیں تھا۔

''تم دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے ہو شیر دل۔'' شہر بانو اس کے انکشاف پر یک دم جیسے آگ بگولا ہوگئی تھی اسے یوں لگا تھا جیسے وہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کررہا تھا۔ شیر دل اس کی بات پر کچھ دیر کے لیے فریز ہوگیا تھا۔ وہ اس ردِعمل کی توقع نہیں کررہا تھا۔

''بیٹا تم نے کھانا کھالیا؟'' شیر دل نے شہر بانو کی بات کے جواب میں مثال سے کہا تھا جو بہت ہکا بکا سی ماں کو دیکھ رہی تھی۔

''Yes'' اس نے بمشکل شیر دل سے کہا اور پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بے حد عجلت کے عالم میں وہ کرسی سے اتر گئی پھر وہ عجیب خوف کے عالم میں وہاں سے چلی گئی تھی یوں جیسے اسے اندازہ تھا کہ اب اسے ان دو بڑوں کے درمیان نہیں ہونا چاہیے تھا۔

''تم مثال کے سامنے کس طرح بات کررہی تھیں؟'' مثال کے وہاں سے چلے جانے کے بعد شیر دل نے بے

حد خفگی سے اس سے کہا۔

''I don't care۔'' شہر بانو نے جواباً بے حد تلخی سے اسے کہا۔ ''اگر تمہیں میرے باپ کی پروا نہیں ہے تو مجھے تمہاری بیٹی کی پروا نہیں ہے۔'' شیر دل اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔

''تم مجھے کیا سمجھتے ہو شیر دل...... idiot؟...... تمہیں کیوں ساری دنیا میں ایک میں ہی عقل سے پیدل لگتی ہوں۔'' وہ بے حد خفگی سے بول رہی تھی۔

''شہر بانو میں یہاں تم سے argument نہیں کروں گا کیونکہ میں نوکروں کو کوئی تماشا نہیں دکھانا چاہتا۔ تم بات کرنا چاہتی ہو کھانا کھانے کے بجائے تو چلو بات کرلیتے ہیں۔'' شیر دل بھی کچھ برہمی کے عالم میں کھانا چھوڑ کر ٹیبل سے اٹھ گیا تھا۔

آگے پیچھے چلتے وہ دونوں بیڈروم میں آگئے تھے اور بیڈروم کا دروازہ بند کرتے ہی شیر دل نے اس سے بے حد خفگی سے کہا۔ ''شہر بانو اب اس سارے تماشے کو ختم کردو...... I have had enough of it مجھے تمہیں جتنی وضاحتیں دینی تھیں میں دے چکا، جتنی صفائیاں پیش کرنی تھیں میں نے کرلیں...... انکل شہباز کا کیس ختم ہو چکا تھا اور ہم اب اس معاملے پر بات نہیں کریں گے۔''

''کیس ختم نہیں ہوا تم نے کیس ختم کروایا ہے۔ میرے پاپا کو جھوٹا اور غلط ثابت کرکے اور اس پر تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے کہ عکس نے کیس واپس لے لیا۔'' شہر بانو پر اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''اگر ممی نے تمہیں ہر چیز کے بارے میں update کردیا ہے تو ان سے یہ بھی پوچھ لینا چاہیے تھا تمہیں کہ ہم یہ کیس عکس کی terms پر حل کرنے پر کیوں تیار ہوئے۔'' شیر دل نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''عکس کی وجہ سے ہوا یہ سب کچھ۔'' شہر بانو نے بے ساختہ کہا اور وہ بری طرح مشتعل ہوگیا۔

''تم نے اگر اب ایک بار بھی میرے اور اس کے حوالے سے کوئی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ مجھے اگر افیئر چلانا ہوتا تو میں دس سال پہلے اس کے ساتھ شادی کرکے بیٹھا ہوتا۔ تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو تم مجھے نہیں جانتیں کیا؟'' وہ بہت خفگی میں کہہ رہا تھا۔

''شیر دل میں واقعی تمہیں نہیں جانتی۔ جس شیر دل کو میں جانتی تھی وہ تم نہیں ہو۔'' وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ اس کے ساتھ شہباز حسین کے معاملے کو ڈسکس کرلینا چاہیے اس سے شہر بانو کو کتنی بھی تکلیف کیوں نہ ہوتی۔ شہر بانو کی بات سنتے ہوئے شیر دل نے سوچا تھا اور اسے ایک بار پھر اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک اور غلط فیصلہ غلط وقت پر کررہا تھا۔

''شہر بانو بیٹھو۔'' شیر دل نے بالآخر اس کو بازو سے پکڑ کر زبردستی صوفے پر بٹھالیا تھا۔ شہر بانو پر بہت غصہ ہونے کے باوجود شیر دل کو اس وقت سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اگر شہر بانو کو شہباز حسین کے حوالے سے تفصیلات بتائے تو کس طرح بتائے۔ اسے وہ بُت توڑنا تھا جو شہر بانو ساری عمر پوجتی رہی تھی اور اس بت کے ٹکڑے شہر بانو کو بھی بری طرح زخمی کرنے والے تھے۔ وہ خفگی بھرے انداز میں منتظر تھی اس کے کچھ بولنے کی۔

''میں تمہیں کبھی یہ سب بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا ہوں اس سے تمہیں بہت تکلیف پہنچے گی لیکن تم نے مجھے بہت مجبور کردیا ہے۔ تم نے میرے پاس دوسرا کوئی آپشن چھوڑا ہی نہیں۔'' شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے کہنا شروع کیا تھا۔ وہ ماتھے پر بل لیے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر شیر دل نے کہا۔ ''شہباز انکل نے عکس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ اس وقت نو سال کی تھی اور خیر دین کو نوکری سے انکل شہباز نے صرف اپنے اس جرم کو چھپانے کے لیے نکالا تھا۔'' شیر دل نے

شہر بانو کا چہرہ سفید ہوتے دیکھا..... شاک، بے یقینی، خوف...... کیا نہیں تھا اس چہرے پر...... اسے شہر بانو پر ترس آیا تھا۔ وہ بات جاری رکھنا چاہتا تھا اور اس نے آگے بات شروع کرنے کی کوشش کی جب شہر بانو نے اس کے چہرے پر پوری قوت سے تھپڑ کھینچ مارا۔ شیر دل نے دوسرے تھپڑ سے پہلے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"Don't you dare do this again...... ہاتھ اٹھانا مجھے بھی آتا ہے لیکن بہتر۔.. ہم اس کا استعمال نہ کریں۔" اس نے شہر بانو کی دونوں کلائیوں کو بہت طیش کے عالم میں جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"تم اتنا گر سکتے ہو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی شیر دل۔" اس نے شہر بانو کو کہتے سنا۔ اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

"اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو اپنی ممی سے پوچھو اور......" شیر دل نے سرد مہری سے کہا لیکن شہر بانو نے تقریباً چلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں کسی سے کچھ نہیں پوچھوں گی اور تم دوبارہ پاپا کے بارے میں ایسی کوئی بات کرنے کی جرأت بھی مت کرنا۔" شیر دل نے اسے زندگی میں پہلی بار چلاتے سنا تھا یہ ناقابلِ یقین تھا وہ اس انکشاف پر اس سے اس ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"تمہاری ممی نے کہا تھا مجھ سے کہ تم اب یہی کرو گے...... اس عورت کے کہنے پر پاپا پر الزامات لگاؤ گے لیکن میں کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ تم ایک دو ٹکے کی عورت کے لیے اپنی فیملی، اپنے خونی رشتے پر کیچڑ اچھال سکتے ہو۔" وہ مزید کچھ کہے بغیر اس کے قریب سے اٹھ گئی تھی۔ شیر دل کو زندگی میں کبھی منزہ پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا انہوں نے اپنے بھائی اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کی کوشش میں اس کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

شہر بانو اب وارڈ روب کھول کر اس میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر پھینکنے لگی تھی۔ اس کا ذہن اس وقت صدمے اور غصے سے ماؤف ہو رہا تھا۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" شیر دل نے اسے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے دیکھ کر پوچھا مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔

"میں تمہارے جیسے آدمی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ تم سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ ممی تمہارے بارے میں جو بھی کہتی تھیں وہ ٹھیک کہتی تھیں کہ تمہاری فیملی کے مرد......" وہ بے حد غصے میں بات کرتے کرتے رک گئی۔

"جملہ پورا کرو اپنا شہر بانو...... رکو مت۔" شیر دل نے اسے جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔

"تمہاری ممی کے اس جملے میں جس مرد کا ذکر ہے وہ انکل شہباز ہیں اور اس جملے میں ان کا ذکر کیوں ہے میں تمہیں ابھی یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔" شیر دل نے سرد مہری سے اس سے کہا۔ وہ فی الحال شہر بانو کو سمجھا بجھا یا منا کر روکنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کو سامان پیک کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی خفگی جیسے کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ شہر بانو جذباتی اور امیچور تھی اس کا اندازہ اسے اس سے شادی کرتے وقت بھی تھا لیکن اس سے شادی کے تمام سالوں میں آج پہلی بار اس کی وہ دو خامیاں اس کے لیے مسائل کھڑے کر رہی تھیں۔

"میں تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں شیر دل تمہیں اب یہ سب بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ایک بار پھر اس پر چلائی تھی۔ شیر دل کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے تمہیں جانا ہے تم جاؤ...... مثال تمہارے ساتھ نہیں جائے گی...... تم امریکا جا کر چند ہفتے اپنی ممی کے

پاس رہو۔ ٹھنڈے دل سے اس ساری صورتِ حال کے بارے میں سوچو جب تمہارا غصہ ختم ہو جائے اور تمہیں عقل آ جائے تو تم واپس آ جانا۔" شیر دل نے سرد مہری سے کہا تھا۔

"مثال کو میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تم مثال کو کیسے روک سکتے ہو؟" شہر بانو نے تلخی سے اس سے کہا تھا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں تم مجھے یہ دکھانے کے لیے challenge مت کرو...... مثال تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔" شیر دل نے دوٹوک انداز میں اس سے کہا۔

"تم اسے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے سنا تم نے۔" شہر بانو نے ایک بار پھر چلا کر کہا تھا۔

"چلانے کی ضرورت نہیں ہے شہر بانو...... چلانے سے تمہاری بات کی زیادہ سمجھ نہیں آ رہی مجھے۔ میں مثال کو تمہارے ساتھ جانے نہیں دوں گا اور میں اس کا باپ ہوں اسے روک سکتا ہوں۔" شیر دل نے تحکمانہ انداز میں اسے بتایا۔

"شادی کے پیپرز میں تم نے اولاد کی کسٹڈی مجھے دے دی تھی شیر دل۔" شیر دل کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ وہ ایک جھگڑے پر نہ صرف طلاق تک جا پہنچی تھی بلکہ شادی کے پیپرز میں لکھی ہوئی شرائط اور حقوق کو اس کے سامنے دُہرا رہی تھی۔

"شہر بانو میں شہباز حسین نہیں ہوں کہ اپنی بیٹی تمہیں تھما کر پھر ساری عمر اس کی شکل دیکھنے کے لیے ترسوں۔ تمہیں مجھ سے الگ ہونا ہے تو بھی تمہیں پاکستان میں ہی رہنا ہوگا اگر تم مثال کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو تو...... میں تمہیں اس کو امریکا ساتھ لے جانے نہیں دوں گا۔" وہ بھی اب بالکل ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ وارڈ روب کے سامنے کھڑی بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھتی رہی۔ وہ مثال کے بغیر وہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور وہ شیر دل کے ساتھ مر کر بھی اب رہنا نہیں چاہتی تھی۔

"تم میری بیٹی کو مجھ سے چھین نہیں سکتے۔"

"وہ صرف تمہاری بیٹی نہیں ہے، تمہیں اگر اس کی اتنی پروا ہے تو تم رہو یہاں پر۔" شیر دل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، میں اتنی گری ہوئی ذہنیت کے آدمی کے ساتھ کبھی نہیں رہوں گی۔" شیر دل ہونٹ بھینچے اس کی بات سنتا رہا۔

"Thank you very much میں ایسا ہی ہوں اور میں ایسا ہی رہوں گا اور مجھے تم پر اپنی اچھائی

ثابت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو ٹھیک ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن مثال کو میں تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔'' شیر دل نے حتمی انداز میں اس سے کہا۔

''میں entitled legally ہوں اسے اپنے پاس رکھنے کی۔'' وہ بات کرتے کرتے بے بسی سے رو پڑی۔ شیر دل ایک لمحے کے لیے ہل نہیں سکا۔ ان کی شادی شدہ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ شہر بانو کسی بات پر روئی ہو اور شیر دل موم نہ ہو گیا ہو لیکن یہ مثال کا معاملہ تھا اور وہ اپنی بیٹی کے لیے ہر قسم کے جذبات کی قربانی دے سکتا تھا۔

''تم اسے امریکا میں رکھ کر اس کی برین واشنگ کرتی رہیں...... تم اسے یہ بتاتی رہیں کہ میں بہت بڑی ہوں تم لوگوں کے ساتھ وہاں نہیں رہ پاؤں گا اس لیے اسے تمہارے اور تمہاری ممی کے ساتھ ہی وہاں رہنا پڑے گا اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دوں تاکہ سال چھ مہینے کے بعد وہ میری شکل تک دیکھنا نہ چاہے...... تم شہر بانو یہ سارا تماشا پہلے سے پلان کر کے آئی تھیں۔ تم طے کر کے آئی تھیں کہ تمہیں میرے ساتھ نہیں رہنا۔'' شیر دل چاہنے کے باوجود اپنے لہجے کو نرم نہیں رکھ سکا تھا۔ چند دنوں میں ان دونوں کے بیچ میں اتنی دراڑیں اور دیواریں آگئی تھیں کہ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہ ہوں۔

''شیر دل میں تم سے کوئی مزید argument نہیں چاہتی، میں صرف اپنی بیٹی کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں یہاں سے۔'' شہر بانو نے اس کی بات کے جواب میں روتے ہوئے کہا۔

''تم ممی کے پاس لاہور چلی جاؤ وہاں چند ہفتے رہو اس کے بعد......'' شیر دل نے جیسے اس کے آنسوؤں سے مجبور ہوتے ہوئے کہا۔ شہر بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں تمہاری فیملی کے پاس نہیں اپنی فیملی کے پاس جانا چاہتی ہوں، تم لوگوں کی sincerity اور loyalities میرے ساتھ نہیں ہیں۔'' وہ اسی طرح روتے ہوئے تلخی سے بولتی جا رہی تھی۔ ''You all are a bunch of cheaters and liers'' (تم سب جھوٹوں اور دھوکے بازوں کا ٹولا ہو) اس کے جملے نے شیر دل کو دوبارہ تپا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ...... تمہیں واقعی اپنی ہی فیملی کے پاس جانا چاہیے اور مثال اپنی فیملی کے پاس رہے گی۔ No more argument.'' وہ بے حد غصے میں کہتا ہوا اپنے بیڈ روم سے اوپر اسٹڈی میں آگیا تھا۔ وہ اس کی زندگی کی بدترین راتوں میں سے ایک تھی۔ آپ کو اپنا گھر ٹوٹتا نظر آ رہا ہو اور آپ کچھ بھی نہ کر سکتے ہوں اور آپ اس گھر کو قائم رکھنے کی شدید خواہش رکھتے ہوں۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگاتا ہوا وہ بیٹھا صرف یہ سوچتا رہا کہ وہ کیا کرتا تو اس صورت حال سے بچ سکتا تھا اور وہ کیا نہ کرتا تو یہ جھگڑا اتنا نہ بڑھتا۔ اسے اپنی غلطیاں نظر آ رہی تھیں لیکن جو بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اب کیا کرے اس ساری صورت حال سے نکلنے کے لیے...... اپنے گھر کو بچانے کے لیے۔

☆☆☆

شہر بانو اگلی صبح دس بجے جاگی تھی۔ بھاری سر اور بوجھل آنکھوں کے ساتھ اس نے مثال کو بتایا تھا کہ وہ لوگ دوبارہ امریکا جا رہے ہیں اور اس کے سوالوں کا جواب دیے بغیر اس نے فون اٹھا کر آپریٹر سے rent a car سے ایک گاڑی منگوانے کے لیے کہا تھا۔ جواباً اس نے آپریٹر سے جو سنا تھا اس نے اس کے دماغ کا فیوز اڑا دیا تھا۔

''سوری میڈم ڈی سی صاحب کا حکم ہے کہ یہاں کوئی گاڑی وغیرہ نہیں آئے گی اور ان کی اجازت کے بغیر آپ گھر سے کہیں نہیں جا سکتیں۔'' شہر بانو نے ایک لفظ بھی کہے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔ تذلیل کا ایسا احساس اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک ملازم اس کی بات ماننے سے انکار کر رہا تھا کیونکہ اس کے صاحب نے اس کے سامنے اس کی

کوئی عزت نہیں رکھی تھی۔ شیر دل کے خلاف اس کے دل میں لگنے والی گرہوں میں ایک اور گرہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی اور وہ یہ سلوک deserve نہیں کرتی تھی کہ وہ اسے اپنے ہی گھر میں ایک قیدی بنا دیتا۔ بے حد غم اور خفگی کے عالم میں اس نے اس لاکر میں سے اپنا اور مثال کا پاسپورٹ نکالنا چاہا تھا جہاں ان لوگوں کے travel documents رکھے ہوتے تھے۔ وہاں اس کا پاسپورٹ تھا لیکن مثال کا پاسپورٹ نہیں تھا۔ شیر دل یقیناً حفظِ ماتقدم کے طور پر صبح آفس جاتے ہوئے مثال کا پاسپورٹ وہاں سے لے گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ساکت اس لاکر کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ شیر دل نے جیسے ان دونوں کے رشتے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

☆☆☆

شیر دل چار بجے کے قریب اپنے آفس میں مارکیٹ کمیٹی کی ایک میٹنگ کو چیئر کر رہا تھا جب اس کے آفس کا آپریٹر بہت گھبراہٹ کے عالم میں اندر آیا تھا۔ میٹنگ روم میں کالز دینے کی اجازت نہیں تھی۔ شاید وہ اس لیے خود آگیا تھا۔

''سر، گھر میں ایمرجنسی ہو گئی ہے۔'' شیر دل کے دل کی دھڑکن چند لمحوں کے لیے جیسے عجیب خوف کے عالم میں رکی تھی۔

''کیا ہوا؟''

''سر گھر سے آپریٹر کا فون آیا ہے امریکن قونصلیٹ کے لوگ وزارتِ داخلہ کے چند آفیسرز کے ساتھ وہاں آئے ہیں۔'' آپریٹر نے بہت نپے تلے لفظوں میں ان لوگوں کی آمد کا مقصد بتائے بغیر شیر دل کو آنے والی مصیبت سے خبردار کیا۔ زندگی میں پہلی بار شیر دل کے قدموں کے نیچے سے زمین جیسے واقعی نکل گئی تھی۔ اسے کسی مزید سوال و جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا امریکی قونصلیٹ کو مدد کی کال کس نے دی تھی اور وہ کس کو rescue کرنے وہاں آئے تھے مگر جس چیز پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا وہ یہ تھی کہ شہر بانو اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر یک دم میٹنگ کو کینسل کرنے کا اعلان تک کیے بغیر وہاں سے نکل گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو گھر چلنے کا کہہ کر اس نے بختیار شیر دل کو فون کر کے اس معاملے کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ وہ بھی اس کی طرح شاکڈ رہ گئے تھے۔

''آپ ان دونوں کا نام ECL میں ڈلوا دیں ورنہ شہر بانو مثال کو لے کر چلی جائے گی۔ امریکن قونصلیٹ والے ان کے travel documents گھنٹوں میں تیار کر لیں گے۔'' وہ اب باپ سے کہہ رہا تھا جو اب

برہم تھا۔
"شہر بانو اس طرح کی حرکت کیسے کر سکتی ہے؟ اس نے تمہاری عزت اور reputation کا خیال نہیں کیا
فیملی کے نام کا خیال نہیں کیا۔ دو چار گھنٹوں میں ڈویژن میں اس چھاپے کا شور مچ جائے گا...... your wife is
an idiot۔" بختیار اب شدید برہم تھے۔ ان کے خاندان کو پہلی بار اتنی سبکی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔
"پاپا میں وہ فصل کاٹ رہا ہوں جو ممی نے میرے لیے تیار کی ہے۔ ممی کی false pride اور جھوٹ
میرا گھر توڑ دیا۔" اس نے مزید کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔
اس کی رہائش گاہ پر بھاری بھرکم گاڑیوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی اور گیٹ کھلے ہوئے تھے۔ وہ public
humiliation تھی جس کا وہ اس وقت سامنا کر رہا تھا اور جو شہر بانو کی طرف سے اس کے لیے تحفہ تھی۔
وہ اس کی سرکاری رہائش گاہ تھی اور اس کا دروازہ اس کی اجازت کے بغیر نہ کوئی کھول سکتا تھا نہ وہاں کوئی آ سکتا
لیکن اس وقت اس کے لاؤنج میں دس بارہ مرد موجود تھے جن میں ایک سفید فام تھا۔ بے حد سرد مہری سے ہونے وا
چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد شیر دل نے ان سے کہا کہ وہ شہر بانو کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس بات
اس سفید فام کے ساتھ آئے ہوئے امریکن قونصلیٹ کے ایک پاکستانی اہلکار نے بڑی بدتمیزی اور رکھائی کے ساتھ رد
تھا اور وزارت داخلہ کے ساتھ آئے ہوئے ان اہلکاروں نے اسے اپنے بیڈ روم کی طرف جانے سے روک دیا۔
"میری بیوی جانا چاہتی ہے آپ اسے لے جائیں لیکن آپ لوگ میری بیٹی کو نہیں لے جا سکتے۔" شیر دل
برہمی کے ساتھ کہا۔ وہ اپنے غصے پر قابو رکھنے کی شدید کوشش کر رہا تھا کیونکہ اسے صورت حال کی سنگینی کا اچھی طرح
اندازہ تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی مزید جھگڑے کے نتیجے میں معاملہ مزید خراب ہو لیکن خود پر کنٹرول کرنا اس وقت
بالکل آسان نہیں تھا۔ وہ اس کا گھر تھا اور وہ اسے اس کے اپنے گھر میں اس کمرے سے نکلنے نہیں دے رہے تھے ا
سے بڑھ کر کوئی اس کی کیا بے عزتی کر سکتا تھا۔
پانچ منٹ گزر رہے تھے اسے ان لوگوں سے بحث کرتے جب قونصلیٹ کی ایک خاتون اہلکار کے ساتھ شہر بانو
مثال کو اٹھائے ہوئے وہاں آئی تھی اور اس کے آتے ہی وہاں موجود تمام لوگ جانے کے لیے کھڑے ہو گئے تھے
مثال نے باپ کو دیکھتے ہی بہت خوشی کے عالم میں دونوں بازو اس کی طرف پھیلائے تھے۔ شیر دل بے اختیار اس
طرف گیا تھا لیکن ایک اہلکار ان دونوں کے درمیان آ گیا۔
"شہر بانو میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں، ہم یہ مسئلہ خود حل کر سکتے ہیں۔" شیر دل نے اپنے سارے غصے سا
انا کو ایک طرف رکھتے ہوئے مصالحت کی ایک اور کوشش کی تھی۔
"میں تم سے کسی بھی قسم کی بات کرنا نہیں چاہتی۔ You are not worth it۔" شہر بانو نے بے
چہرے کے ساتھ اسے کہہ کر ان تمام لوگوں کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔
"پاپا...... پاپا...... I want to go to Papa۔" مثال نے ایک دم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے حوا
باختگی میں رونا شروع کر دیا تھا۔ اسے شاید پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ شہر بانو اسے شیر دل سے دور لے جانے کی کوشش
کر رہی تھی۔ شیر دل اس کے بلکنے پر بے قرار ہو کر اس کے پیچھے گیا تھا۔ وزارت داخلہ کے لوگوں نے اس کا راستہ
روک لیا تھا اور تب تک اسے وہیں رکھا جب تک شہر بانو قونصلیٹ کے افراد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے
نہیں گئی۔ ان کے وہاں سے جانے کے بعد وہ لوگ بھی شیر دل سے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں بات کرتے ہو
چلے گئے۔ شیر دل جانتا تھا کہ وہ لوگ اب وہاں سے جا چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ میکانیکی انداز میں ڈرائیو وے
میں نکل آیا تھا جو اس وقت مکمل طور پر خالی تھا۔ وہاں فور وہیلز گاڑیوں کے ٹائرز کے نشانات کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا

وہ ماؤف ذہن اور حواس کے ساتھ بے یقینی کے ایک عجیب عالم میں بہت دیر وہاں کھڑا بہت دیر بند گیٹ کو دیکھتا رہا جہاں سے وہ گاڑیاں گئی تھیں۔ اس کے کانوں میں مثال کے رونے کے علاوہ کسی کی آواز نہیں آرہی تھی اور وہ جانتا تھا وہ گاڑی میں بھی اسی طرح رو اور چلا رہی ہو گی۔

☆☆☆

”ECL پر نام ہیں دونوں کے...... وہ کم از کم پاکستان سے باہر نہیں جا سکتے۔ میں امریکن قونصلیٹ میں کسی جاننے والے کے ذریعے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ شہر بانو سے کسی طرح رابطہ ہو سکے۔“ بختیار نے شیر دل کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ شیر دل، شہر بانو کے وہاں سے جانے کے بعد فوری طور پر لاہور بختیار کے پاس چلا آیا تھا۔ منزہ تب تک اس سارے معاملے کے بارے میں جان چکی تھیں اور وہ بھی اسی طرح کے شاک میں تھیں جیسا شاک بختیار اور شیر دل کو لگا تھا جو آخری چیز وہ شہر بانو سے expect کر سکتے تھے وہ ایسا کوئی قدم تھا۔ بختیار، شیر دل کے لاہور پہنچنے سے پہلے منزہ پر بھی خاصا برس چکے تھے۔ کوئی عام حالات ہوتے تو منزہ، بختیار کی اس ڈانٹ ڈپٹ کو کبھی برداشت نہ کرتیں لیکن اب وہ بھی بے حد ندامت کے عالم میں یہ سب کچھ سنتی رہی تھیں اور وہ ندامت دو گھنٹے کے بعد شیر دل کو اپنے گھر پر دیکھ کر بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے شیر دل کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف شہباز حسین تھا جسے شرمین کے شہر بانو کو لے جانے کے بعد وہ اس حال میں دیکھتی رہی تھیں اور شیر دل اور شہباز میں نظر آنے والی اس مماثلت نے منزہ کو ہولا دیا تھا۔

شیر دل نے گھر آکر منزہ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے منزہ کو دیکھنے کے باوجود انہیں مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے ملازم سے بختیار کا پوچھا تھا اور ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ منزہ نے اسے روک کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شیر دل نے بے حد درشتگی سے ان سے کہا تھا۔

”میں آپ سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں اور پاپا آپ کے سامنے کوئی بات کریں گے۔ آپ مت آئیں میرے پیچھے۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ منزہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئیں، وہ جیسے انہیں shutup کال دے کر گیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو منزہ شیر دل کے ایسے جملوں پر اسے اپنے گھر میں کھڑے رہنے تک نہ دیتیں لیکن آج وہ اس کے ان توہین آمیز جملوں کے باوجود اس کے خلاف اپنے دل میں کچھ برا نہیں لا سکی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کی نظروں میں اپنی غلطیوں کی وجہ سے گری تھیں اور انہیں اس وقت پہلی بار بری طرح سے احساس جرم ہو رہا تھا۔ شہر بانو کا مثال کو اس طرح سے لے جانا ان سے بھی ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاریخ جیسے ایک ہی گھر میں اپنے آپ کو پھر سے دہرانے لگی تھی۔

شیر دل کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کمرے میں آنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکی تھیں جہاں وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے بات چیت کرتے کرتے منزہ کو اندر آتا... دیکھ کر کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کی تھی لیکن اس کے بعد پھر بات کرنے لگے تھے۔ اس وقت منزہ سے زیادہ بڑا مسئلہ ان کے لیے شہر بانو اور مثال کو پاکستان سے چلے جانے سے روکنا تھا۔ منزہ کو لعنت ملامت بعد میں بھی ہو سکتی تھی۔

بختیار، شیر دل کے ساتھ گفتگو کے دوران مسلسل مختلف جگہوں پر فون کرنے میں مصروف تھے اور شیر دل نے لاہور آنے کے سفر کے دوران اپنے کچھ سینئر آفیسرز کی کالز ریسیو کر کے ان سے صورت حال کی وضاحت کی تھی جو اس کے گھر پر ہونے والے اس واقعے سے باخبر ہو چکے تھے۔ شیر دل کو اندازہ تھا کہ صرف اس کے ڈویژن کے آفیسرز ہی نہیں اس وقت پورے پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ میں اس کے گھر پر ہونے والا یہ چھاپا ہی ڈسکس ہو رہا ہو گا۔ وہ جیسے صرف چند گھنٹوں میں ایک قابل آفیسر سے صرف ایک ”برا شوہر“ بن کر رہ گیا تھا جو اپنی امریکن بیوی پر اتنا بھی

کنٹرول نہیں رکھ سکا کہ اسے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر لیتا۔

شیر دل نے چند ایک سینئر آفیسرز کی کالز کے بعد دوسرے آفیسرز اور اپنے بیچ میٹس کی طرف سے آنے والی کالز لینا بند کر دیں۔ اس میں فی الحال بار بار اس سارے قصے اور شہر بانو اور اپنے اختلافات کو دُہرانے کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی اسے ان میں سے کسی کی solidarity اور سپورٹ کی ضرورت تھی...... ان میں سے کسی کی سپورٹ اس کی زندگی کے اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتی تھی۔

بختیار اور شیر دل شام تک بیٹھے مختلف جگہوں پر فون کرتے ہوئے شہر بانو سے رابطہ کی کوشش کرتے رہے۔ صرف اس اطمینان کے ساتھ کہ وہ پاکستان میں ہی تھی لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ امریکن قونصلیٹ کی مدد کے ساتھ شیر دل کے گھر سے آنے کے صرف چار گھنٹے کے بعد مثال کے وزارتِ داخلہ کی مدد سے بنوائے گئے ایمرجنسی ٹریول ڈاکومنٹس کے ساتھ پاکستان سے جا چکی تھی۔ یہ بختیار کی خوش فہمی تھی کہ اس کی ہدایات پر ان دونوں کا نام ECL پر ڈالا جا چکا تھا۔ ان دونوں کا نام ECL پر ڈالنے کے احکامات تو یقیناً ایشو ہو چکے تھے لیکن ان احکامات کو امریکی قونصلیٹ کی مداخلت اور دباؤ کی وجہ سے تب تک مؤخر رکھا گیا جب تک شہر بانو اور مثال اپنی فلائٹ پر بیٹھ نہیں گئیں۔

شیر دل اس تمام عرصے کے دوران پاگلوں کی طرح بار بار شہر بانو کے فون پر کال کرنے کی کوشش کرتا رہا صرف اس امید پر کہ شاید اس کا بند فون کسی دوسرے سے بات کرنے کے لیے کھلا ملتا اور اس کی کال آنے پر شاید شہر بانو اس کی کال ریسیو کر لیتی۔ شاید تب تک اس کا غصہ ختم ہو چکا ہو۔ اس نے اسے درجنوں نہیں سیکڑوں text کیے تھے معذرت کے...... ایک دفعہ بات کرنے کی request کے...... اس کی ہر بات ماننے کے وعدے کے...... اس کی تمام شکایات دور کرنے کے...... اور ان میں سے ہر text کو ٹائپ کرتے اور بھیجتے ہوئے شیر دل نے اپنی انا اور عزتِ نفس کو بار بار روندا تھا...... اسے شہر بانو پر جتنا غصہ تھا اس کے بعد وہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا تھا...اس کے ساتھ رہنا دور کی بات تھی لیکن اس کے پاس مثال تھی۔ روتی ہوئی مثال...... وہ طوطا جس میں جن کی جان تھی...... اور شیر دل اپنی بیٹی کی خاطر اس وقت اپنے غصے اور انا کو بھلا بیٹھا تھا۔

اس کے کسی text کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ شہر بانو کا فون مسلسل بند ہی رہا تھا۔ شام کو سات بجے بختیار کو بالآخر قونصلیٹ کے کسی اہلکار نے شہر بانو اور مثال کے پاکستان سے چلے جانے کی اطلاع دی تھی۔ بختیار اور شیر دل کے لیے یہ جیسے ایک اور بڑا سیٹ بیک تھا۔ ECL پر نام ہونے کے باوجود وہ دونوں کیسے چلی گئی تھیں یہ بھی بہت دیر تک راز نہیں رہا تھا۔ وہ لوگ جیسے سکتے میں چلے گئے تھے۔ ابھی تک جو امید شیر دل کو جدوجہد کرتے رہنے پر اُکسا رہی تھی وہ یہی تھی کہ وہ دونوں پاکستان میں ہی تھیں اگر فوری طور پر نہیں تو چند دنوں میں اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا لیکن ان دونوں کا تمام رکاوٹوں کے باوجود پاکستان سے نکل جانا جیسے شیر دل کے لیے پھانسی کے پھندے سے لٹک جانے کے مترادف تھا۔ بُری خبر صرف یہ نہیں تھی کہ وہ دونوں پاکستان سے چلی گئی تھیں۔ بری خبر یہ تھی کہ شیر دل کی شہر بانو کے ساتھ شادی امریکا میں ہوئی تھی اور وہ نکاح نامے میں طلاق کا حق شادی کے وقت شہر بانو کو تفویض کر چکا تھا۔ شہر بانو کو اب اس سے طلاق کے لیے پاکستان واپس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

پتا نہیں غصے کی وہ کون سی حالت ہوتی ہے جس میں انسان برسوں کے ساتھ اور ساتھی کو لمحوں میں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ پیار، محبت، اعتماد، دوستی کوئی چیز پاؤں کی زنجیر نہیں بن پاتی۔

شہر بانو، شیر دل کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور اسے اس شخص کو زندگی سے نکال دینے کا فیصلہ کرنے میں چند منٹ لگے تھے۔ شہباز حسین کے بارے میں کیے جانے والے اس کے انکشاف نے شہر بانو کو جس

بُری طرح سے ہرٹ کیا تھا کہ وہ اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں سب بھول گئی تھی۔ اگر کوئی چیز اسے یاد رہی تھی تو صرف یہ کہ شیر دل نے اس کے پاپا پر ایک عورت کی باتوں میں آ کر گھناؤنا الزام لگایا تھا...... اس کے آئیڈیل پاپا پر...... جو کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتے تھے...... جن کو وہ سارا بچپن آئیڈیلائز کرتی رہی تھی۔ وہ اس mode of denial (کسی بات سے انکاری ہونا) میں تھی جس میں ہم سب اپنے اپنے آئیڈیل کو defend کرنے کے لیے آخری حد تک جانے کو تیار رہتے ہیں۔ حقائق کو جھوٹ کہتے ہیں اور اس کے لیے دیے جانے والے دلائل کو بکواس...... کیونکہ ہم اپنے بہت اندر کہیں نہ کہیں اس یقین کے جڑ پکڑنے سے ڈرتے ہیں جو ہمیں آئینے میں حقیقت کا اصل عکس دکھا رہا ہوتا ہے۔ آنکھیں اور کان بند کر کے کبوتر بن کر ہم اپنے آئیڈیل اور عزیز ترین شخص کے بُت کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیتے ہیں۔ شہر بانو نے بھی یہی کیا تھا وہ اپنے ''آئیڈیل پاپا'' کے image (ساکھ) کو بچاتے بچاتے اپنی ''آئیڈیل زندگی'' کو گنوا بیٹھی تھی بالکل منزہ کی طرح جو ایک ''آئیڈیل بھائی'' کے image کا دفاع کرتے کرتے اپنے شوہر اور اولاد کی نظروں میں گر گئی تھی۔

شہر بانو کے لیے ''حقیقت'' شاید اتنا بڑا مسئلہ نہ بنتی اگر اس نے حقیقت کو منزہ یا شرمین کی کسی سرگوشی میں سنا ہوتا لیکن وہ حقیقت اس نے شیر دل کے منہ سے علی الاعلان سنی تھی اور اس وقت سنی تھی جب خود شیر دل کا image عکس کی وجہ سے اس کی نظروں میں مسخ ہو چکا تھا۔

امریکن قونصلیٹ کو فون کرنے سے ان کی آمد، پھر شیر دل کے گھر سے روانگی اور پھر پاکستان سے امریکا جانے والی فلائٹ پر چڑھنے تک وہ اشتعال میں تھی...... ہوش و حواس کو کھا جانے والا اشتعال...... شیر دل یک دم جیسے وہ punching bag (باکسروں کے پنچ مارنے کی پریکٹس کرنے والا بیگ) بن گیا تھا۔ جس کی شہر بانو کو ساری عمر ضرورت رہی تھی کوئی ایسا شخص جس پر وہ سارا غصہ نکال سکے جو اس نے شہباز حسین کو کھو دینے پر محسوس کیا تھا اپنے بچپن کی وہ ساری فرسٹریشن جو باپ کے ایک دم کسی وجہ کے بغیر زندگی سے غائب ہو جانے پر اس کے پورے بچپن کو مسخ کرتی رہی تھی۔ وہ شرمین پر بچپن میں بھی اپنا غصہ اس طرح سے نہیں نکال پائی تھی جس طرح وہ نکالنا چاہتی تھی کیونکہ لاشعوری طور پر اسے کہیں نہ کہیں یہ احساس تھا کہ اب اس کے علاوہ دنیا میں فیملی نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں تھی اور وہ مالی، جسمانی، جذباتی طور پر اس کی مدد اور سہارے کی محتاج تھی۔ فاروق سے شرمین کی شادی نے ماں کے حوالے سے اس کے عدم تحفظ کو جیسے اور بڑھا دیا تھا لیکن شیر دل کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ اسے دشمن بنانا آسان تھا کیونکہ شہر بانو کی نظروں میں اب وہ ایک پیار کرنے والا وفادار ساتھی اور شوہر نہیں تھا صرف ایک cheater (دھوکے باز) تھا جو اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسری عورت کے ساتھ بھی افیئر چلا رہا تھا اور اس عورت کی محبت میں وہ اس کے باپ پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔ اس کے پاس مثال کی شکل میں اب فیملی تھی وہ تنہا نہیں تھی۔ وہ شیر دل کی محتاج نہیں تھی۔ وہ شیر دل کو اتنا ہی ہرٹ کرنا چاہتی تھی جتنا وہ ہوئی تھی۔

مثال، شیر دل کے گھر سے صرف لاہور کے سفر کے دوران ہی روتی نہیں رہی تھی، وہ امریکا کی فلائٹ میں بھی اسی طرح روتی رہی تھی۔ شہر بانو کی دھمکیوں، ڈانٹ ڈپٹ، پیار، تسلیوں اور کسی جھوٹ اور دلاسے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اسے اس کے باپ سے بہت دور لے کر جا رہی تھی کیونکہ اس کے اور اس کے باپ کے درمیان اب ''فائٹ'' ہو چکی تھی اور اس کی ممی اب کبھی بھی اس کو واپس شیر دل کے پاس نہیں لے جانے والی تھی۔ وہ بے حد کم عمر تھی نہ مسائل سمجھ سکتی تھی نہ وجوہات نہ نتائج لیکن وہ ''جدائی'' اور ''جھگڑے'' کو سمجھ سکتی تھی۔ بچوں کی چھٹی حس ان دو چیزوں کو بڑوں سے بھی جلد بھانپتی ہے۔ اس کے مسلسل رونے اور سوالوں سے تنگ آتے ہوئے ایک اسٹیج پر آ کر شہر بانو نے اس کو چپ کرانے کی ہر کوشش چھوڑ دی تھی۔ اس کے پاس مثال سے بولنے کے

لیے اب کوئی جھوٹ نہیں رہا تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔

شرمین سے اس کی بات امریکن قونصلیٹ میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ اس نے شرمین کو بتا دیا تھا کہ وہ شیر دل کا گھر چھوڑ آئی ہے تاہم اس نے وجوہات نہیں بتائی تھیں نہ ہی شرمین نے اس سے اس وقت کچھ بھی پوچھا تھا لیکن اس کی امریکا روانگی سے پہلے شیر دل نے ان سے رابطہ اور بات کرنے کی کوشش کی تھی جسے انہوں نے بہت خفگی کے عالم میں جھٹک دیا تھا لیکن بختیار کی کال لینے سے وہ کوشش کے باوجود انکار نہیں کر سکی تھیں اور وہ کال لینے کے بعد وہ اس کال کو لینے پر بہت پچھتائی تھیں۔ ان کی دنیا دوسری دفعہ بل کر رہ گئی تھی۔ عکس نام کی بازگشت نے اس بار ان کی بیٹی کی پرسکون زندگی میں طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ شہباز حسین کے اس گناہ پر انہوں نے ساری عمر پردہ ڈالا تھا ساری عمر انہوں نے شہر بانو سے اس کو چھپایا تھا۔ اس کی نظروں میں خود برا بن کر بھی انہوں نے شہباز حسین کے "بت" کو اس کے ذہن اور نظروں میں ٹوٹنے نہیں دیا تھا اور وہ بت کہاں اور کس عمر میں آ کر ٹوٹا تھا۔ ماں باپ کے کیے ہوئے بعض گناہ صرف ان کی اپنی زندگی برباد نہیں کرتے وہ وراثت کی طرح چلتے ہوئے ان کی اولاد کے سامنے پاتال بن کر آ جاتے ہیں اور کس طرح...... کہ انسان کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا......

شرمین، بختیار شیر دل کی بات صرف سنتی رہی تھیں، انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنا غصہ بھول گئی تھیں اور شہر بانو کے اٹھائے ہوئے قدم پر کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس کوئی الفاظ نہیں تھے۔ عکس مراد علی کا سایہ کبھی بھوت بن سکتا تھا یہ انہیں اندازہ نہیں تھا۔ اگر انہوں نے رات کے اس پہر شیر دل کے فون پر تب عکس سے بات نہ کی ہوتی تو آج وہ شہر بانو کو ہی قصوروار سمجھ کر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر شرمین خود اسی غلط فہمی کا شکار تھیں کہ شیر دل، عکس کے ساتھ نہ صرف افیئر چلا رہا تھا بلکہ وہ افیئر بہت غلط حدود تک جا پہنچا تھا۔ انہوں نے اس کے باوجود اس فون کال کو شہر بانو سے چھپا کر جیسے اسے ایک بار پھر اپنا گھر بچانے اور بنائے رکھنے کا موقع دیا تھا لیکن اب وہ اس راز کو بھی شہر بانو سے چھپانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ اگر باقی سب کچھ چھپا نہیں رہ سکا تھا تو پھر اس ایک راز کو چھپانے کا بھی کیا فائدہ تھا لیکن اس دن عکس مراد علی کے لیے اتنے سالوں سے ان کے دل میں موجود ہمدردی اور اس کے حوالے سے ان کا احساس جرم ختم ہو گیا تھا۔ انسان اپنی اولاد پر آنے والی تکلیف کو بھی justify نہیں کر سکتا نہ ان لوگوں سے ہمدردی رکھ سکتا ہے جو اس تکلیف کے ذمہ دار ہوں۔

☆☆☆

عکس کو اس سارے واقعے کے بارے میں چند گھنٹوں میں پتا چل گیا تھا۔ وہ لوگ ایک ہی ڈویژن میں کام کر رہے تھے یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ واقعہ اس سے زیادہ دیر تک چھپا رہتا۔ کچھ دیر کے لیے وہ بھی شاکڈ ہی رہ گئی تھی۔ وہ شیر دل کو directly اور شہر بانو کو indirectly جانتی تھی اور وہ یہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ ان دونوں میں اچانک ایسا کیا ہوا تھا کہ شہر بانو کو امریکن قونصلیٹ والوں کی مدد لینی پڑی تھی۔ صرف ایک دن پہلے تک شیر دل اس کو سب "Perfect" بتا رہا تھا اور ایک دن بعد...... اس نے یقیناً اس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اس سے فون کر کے بات کرنا چاہتی تھی لیکن چاہتے ہوئے بھی اس نے شیر دل کو فون نہیں کیا۔ وہ اس کے اور شہر بانو کے درمیان ہونے والے کسی مسئلے میں نہیں آنا چاہتی تھی لیکن اس کے باوجود اسے شیر دل سے پوری ہمدردی تھی۔ وہ اس وقت اس کی ذہنی حالت کا بھی اندازہ کر سکتی تھی۔ جو چیز اسے رہ رہ کر پریشان کر رہی تھی وہ اس کا یہ شک تھا کہ اس سارے واقعے کی وجہ دو دن پہلے شہباز حسین کے معاملے پر شیر دل کے خاندان کی خود اختیار کردہ پسپائی اور مصالحت نہ ہو۔ وہ اس دن عجیب ذہنی اضطراب کے عالم میں گھر آئی تھی اور وہ خیر دین سے یہ بات ڈسکس کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

"شیر دل تو بہت اچھا لڑکا ہے...... ایسا کیا ہو گیا کہ اس کی بیوی کو اس طرح کا قدم اٹھانا پڑا؟" خیر دین بھی اسی طرح حیران اور متفکر ہوا تھا۔ عکس کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ خیر دین کو یہ بتائے کہ شیر دل کی بیوی شہباز حسین کی بیٹی تھی...... وہی باربی ڈول جس پر بچپن میں عکس کا بری طرح دل آ گیا تھا اور وہ جس کے گرد منڈلاتی رہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس وقت وہ چاہتے ہوئے بھی خیر دین کو یہ بات نہیں بتا سکی۔

"تمہاری شیر دل سے بات ہوئی؟" خیر دین نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے بے اختیار کہا۔

"کیوں؟" خیر دین جیسے کچھ حیران ہوا تھا۔

"اس کا فون آف تھا میں نے کوشش کی رابطہ کرنے کی...... ایک دو دن تک بات کروں گی۔" اس نے کچھ بے ربطی سے کہا۔ خیر دین اسے دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

عکس نے شیر دل کو آنے والے دنوں میں بھی کال نہیں کیا تھا...... شدید خواہش رکھنے کے باوجود اور یہ احساس ہونے کے باوجود کہ وہ شدید پریشانی کی حالت میں ہو گا...... وہ چاہتی تھی کہ اگر یہ کرائسس اس کی وجہ سے آیا ہے تو وہ اس کو اپنی کسی مداخلت سے مزید بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

خیر دین اگلے چند دن اس سے شیر دل کے بارے میں پوچھتا رہا تھا لیکن اس کی خاموشی اور عدم دلچسپی پر بالآخر اس نے بھی اس مسئلے پر بات کرنا چھوڑ دی تھی۔

حلیمہ ان دنوں اپنے سسرال گئی ہوئی تھی اور جب وہ واپس آئی تو اس نے ایک بار پھر عکس کی شادی کے حوالے سے بات شروع کر دی تھی۔ وہ اس بار اپنے شوہر کے دور پار کے رشتے داروں میں کسی ڈاکٹر کے پروپوزل کے بارے میں خیر دین اور عکس سے بات کر رہی تھی جو دبئی کے کسی ہاسپٹل میں کام کر رہا تھا اور ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا۔ جواد ملغی سے منگنی ختم ہونے کا خیر دین کو اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا حلیمہ کو ہوا تھا۔ اسے جواد ملغی سے بھی زیادہ اس کا خاندان پسند تھا اور اس کے لیے یہ بہت فخر کی بات تھی کہ اس کی بیٹی اتنے بڑے خاندان کا حصہ بننے والی تھی۔ وہ ایک سال سے عکس کے مستقبل کے حوالے سے نہ صرف مطمئن ہو گئی تھی بلکہ فخریہ انداز میں اپنے سسرالی خاندان میں سب کو اس کے بارے میں بتاتی بھی رہی تھی اور اب خیر دین کی بیماری کے دوران اس طرح ان لوگوں کا رشتہ توڑ دینا نہ صرف اس کے لیے بہت صدمے اور سبکی کا باعث تھا بلکہ پریشانی کا بھی اور وہ اسے عکس کی خوش قسمتی سمجھتی تھی کہ جواد سے رشتہ ختم ہونے کے چند دنوں کے اندر عکس کے لیے ایک اور رشتہ آ گیا تھا۔

عکس نے خیر دین اور حلیمہ کے اصرار کے باوجود انہیں جواد کے خاندان سے رابطہ کر کے منگنی توڑنے کی وجوہات کے بارے میں پوچھنے نہیں دیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جواد یا اس کا خاندان شیر دل کی ماں کے لگائے ہوئے الزامات دہرائے گا اور وہ خیر دین اور حلیمہ کو اس شاک اور ایک نئے تماشے سے بچانا چاہتی تھی لیکن بعض چیزیں لاکھ کوشش کے باوجود ہو کر رہتی ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ شرمین، خیر دین سے رابطہ کر کے اس سارے معاملے پر بات کر سکتی تھی۔

"بہت اچھا لڑکا ہے چڑیا وہ...... ایک بار مل لو اس سے...... ابھی پورا مہینہ یہاں ہے۔" حلیمہ اس دن بھی صبح سویرے ناشتے کی میز پر اسے اس لڑکے سے ملنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ عکس خاموشی سے ناشتا کر رہی تھی۔

"اور وہ تمہیں جانتا بھی ہے تمہارے ساتھ پڑھا ہوا ہے...... کہہ رہا تھا تم بھی اسے جانتی ہو۔" وہ ناشتا کرتے کرتے چونکی تھی۔

"میرے ساتھ پڑھا ہوا ہے......؟ کیا نام ہے اس کا؟" اس نے کچھ دلچسپی لیتے ہوئے ماں سے پوچھا تھا۔

(باقی آئندہ)

طغرل نے اس آئینے میں پہلے اپنے آپ کو دیکھا پھر اپنے عقب میں آئے شیر دل اور عکس کو دیکھا۔ اسے وہاں رکے دیکھ کر شیر دل بھی وہاں چند لمحوں کے لیے رک گیا تھا۔ عکس نے پلٹ کر ایک بار پھر باذل کا ہاتھ پکڑ لیا جس نے بڑی مہارت سے گاڑی سے نکل کر یہاں برآمدے میں آنے تک چند قدموں کے فاصلے میں دو بار اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا۔ اس پر قابو پانا صرف اسی کا کمال تھا۔

''تمہیں پتا ہے میں نے تمہاری ممی کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا؟'' عکس نے آئینے کے سامنے کھڑے شیر دل کو طغرل سے کہتے سنا۔

''کہاں پاپا؟'' طغرل نے بڑی دلچسپی سے گردن موڑ کر باپ کو دیکھا۔

''اسی گھر میں۔'' عکس کی نظریں آئینے میں شیر دل سے ملی تھیں۔ ان آنکھوں میں شیر دل کو حیرانی نظر آئی۔ وہ مسکرایا تھا اور وہ حیرانی پل بھر میں ایک کھلکھلاہٹ میں بدل گئی تھی۔ عکس ہنس پڑی تھی۔ اسے یاد آگیا تھا شیر دل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اسے اسی آئینے میں دیکھا تھا جب وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹینس شاٹس کی پریکٹس کرتا تھا اور وہ برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے چھپی اسے دیکھتی رہتی تھی...... کسی میکانیکی انداز میں اس نے بے اختیار گردن موڑ کر اس ستون کو دیکھا تھا۔ ستون اب بھی وہیں تھا لیکن اس کے گرد وہ بیل نہیں تھی شاید نمی کے اثرات کو روکنے کے لیے ان تمام بیلوں کو ستونوں اور دیواروں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا جو کئی سال پہلے اس گھر کی شناخت تھیں۔ عکس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ گھر بہت بدل گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی ایک، ایک چیز کو آج بھی آنکھیں بند کیے چھو کر بھی پہچان سکتی تھی۔ وقت زندگی کو کس طرح بہا کر لے جاتا ہے کہ انسان خود بھی اسے روکنے بیٹھے تو روک نہ سکے...... گزر جانے والے لمحوں کو گننے بیٹھے تو گنتی بھول جائے۔

''آپ مذاق کر رہے ہیں۔'' نو سالہ طغرل نے پہلے الجھ کر پھر ہنس کر اسی آئینے میں دیکھتے ہوئے شیر دل سے کہا۔ اس کے تبصرے نے عکس کی توجہ ایک بار پھر اپنی طرف کھینچ لی۔

''کیوں؟'' شیر دل نے طغرل سے پوچھا۔

''ممی اس مرر میں کیسے ہو سکتی ہیں؟'' طغرل نے جیسے اپنی بے یقینی کی وضاحت کی۔

''دیکھو ابھی ہیں یا نہیں؟'' شیر دل نے اس کی وضاحت کے جواب میں آئینے میں نظر آتی عکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔ طغرل نے آئینے میں عکس کو دیکھا۔ باپ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی آئینے میں تھی۔ طغرل الجھا پھر ہنس پڑا۔

''پاپا یہ تو ان کا reflection ہے۔'' اس نے جیسے شیر دل کی کم علمی بتائی۔

''یعنی عکس ہے۔'' شیر دل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عکس تب تک ان کے قریب آچکی تھی۔ اس نے شیر دل کے کندھے کو ہولے سے چھوتے ہوئے کہا۔ ''تم بس کر دو اب...... کب تک اس بے چارے کو تنگ کرتے رہو گے۔ ذرا اسے سنبھالو تو پھر پتا چلے'' اس نے باذل کا ہاتھ شیر دل کے ہاتھ میں دے دیا۔

شیر دل نے ایک نظر سات سالہ باذل کو دیکھا پھر جیسے کچھ احتجاجی انداز میں عکس سے کہا۔ ''تم ہمیشہ مجھے مشکل چیلنج دیتی ہو۔''

''تم ہر آسان چیلنج کو بھی مشکل بنا لیتے ہو اپنے لیے۔'' وہ اطمینان سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ آج اس

آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اس آئینے میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ کسی اور چیز کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تلاش کئی سال پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔

''پاپا! آپ کیا مجھے اٹھا سکتے ہیں؟'' شیر دل کے ساتھ اندرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے باذل کے قدم تھمے اور اس نے بڑی معصومیت سے شیر دل سے پوچھا۔

''میں اٹھا سکتا ہوں لیکن اٹھاؤں گا نہیں۔'' شیر دل نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ممی اٹھا سکتی ہیں مجھے۔'' باذل نے جیسے باپ کی مردانگی کو چیلنج دیا جسے شیر دل نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کیا۔ عکس بڑی خاموشی کے ساتھ باپ بیٹے کی گفتگو سنتے ہوئے اندر کی جانب بڑھتی رہی۔

''تمہاری ممی اس گھر میں dwarfs (بونے) دیکھا کرتی تھیں جب وہ چھوٹی تھیں۔'' شیر دل نے چلتے چلتے یک دم جیسے کچھ یاد آنے پر طغرل کو بتایا۔

''Really mummy?'' طغرل چلتے چلتے بے یقینی کے عالم میں رک کر عکس کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی ٹھٹک گئی تھی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

''dwarfs...... بونے...... آئینہ......'' شیر دل نے اسے کیا یاد دلا دیا تھا۔ اسے وہ سات ساتھی بونے بھی یاد آگئے تھے۔ اس کے تصوراتی دوست...... لیکن جس برق رفتاری سے وہ یاد آئے تھے اسی برق رفتاری سے ان کے حلیے، حرکتیں اور نام یاد نہیں آئے تھے...... اس میں وقت لگا تھا...... اس میں اگلے دو دن لگ گئے تھے۔

''پاپا مذاق کر رہے تھے۔'' عکس نے مدھم انداز میں طغرل کی حیران آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ شیر دل نے .... پلٹ کر جیسے پُرحیرت نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں مذاق کر رہا ہوں؟ تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا ایک بار کہ تم نے یہاں......'' عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بچپن کی بات تھی وہ اور بچپن میں انسان کو پتا نہیں کیا کیا وہم ہوتے رہتے ہیں۔'' وہ بڑی سہولت سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ شیر دل نے کچھ حیرانی سے اسے جاتے دیکھا۔

''پاپا، ممی نے really ہی dwarfs دیکھے تھے یہاں؟'' طغرل کا تجسس کم نہیں ہوا تھا۔

''اپنی ممی سے پوچھنا، وہ آپ کو بتائیں گی۔'' شیر دل بھی اسے ٹالتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

اس گھر میں عکس مراد علی کی وہ دوسری پوسٹنگ تھی۔ پورے دس سال کے بعد...... لیکن اس بار وہ وہاں کمشنر کی حیثیت سے آئی تھی۔ اس شہر کو ڈویژن کا درجہ حاصل ہو جانے کے بعد وہاں تعینات ہونے والی پہلی کمشنر...... کمشنر کی رہائش گاہ زیرِ تعمیر تھی اور اس کے زیرِ تعمیر ہونے کی وجہ سے ڈپٹی کمشنر کی سرکاری رہائش گاہ کو وقتی طور پر کمشنر ہاؤس کا سرکاری درجہ دے دیا گیا تھا۔ گھر میں سامان کی شفٹنگ کا کام پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا لیکن یہ کام شیر دل کی نگرانی میں ہوا تھا۔ وہ آج پوسٹ ہونے کے بعد پہلی بار اس گھر میں آئی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ دس سال پہلے ہونے والی یہاں اپنی پہلی پوسٹنگ کی طرح وہ آج اس طرح جذباتی نہیں ہوئی تھی نہ ہی اتنی ایکسائٹڈ تھی...... شاید اس لیے کیونکہ اس کے نانا اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اس بار وہ ایک قلعہ فتح کرنے وہاں نہیں آئی تھی۔

اس گھر کے ہال کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عکس مراد علی نے عجیب سی اداسی محسوس کی۔ نانا اسے ایک بار

پھر بُری طرح یاد آنے لگے تھے۔ وہ آج ایک بار پھر اسے اس گھر میں کمشنر کے طور پر آتے دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے۔ بہت سارے خواب صرف ان کے تھے اس کے حوالے سے...... جو صرف وہ دیکھتے تھے اور ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد عکس مراد علی کے نزدیک کامیابی کا مفہوم وہ نہیں رہا تھا جو نانا کی زندگی میں تھا۔

ہال کمرے میں کھڑی ان در و دیوار کو اداسی سے دیکھتے ہوئے وہ یک دم چونکی تھی۔ شیر دل نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلایا تھا۔ وہ اب اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس لمس میں عجیب دلگیری تھی، کچھ کہے اور سنے بغیر بھی جیسے دنیا جہان کی گفتگو تھی...... ہر مرہم بننے والا پھاہا محسوس ہونے والا لفظ......

ساری عمر وہ دونوں ایک دوسرے کی خاموشی کو اسی طرح پڑھتے رہے...... لفظوں کے بغیر...... اداسی کو بیرومیٹر کی طرح بھانپ لیتے تھے اور خفگی کو راڈار کی طرح...... اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

عکس مراد علی نے ایک شیر دل کے چہرے کو گردن موڑ کر دیکھا۔ اس نے اس کی نظریں محسوس کرتے ہی جیسے بڑی حیرانی سے اس سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ مسکرا دی۔ اس نے اس کے گال پر نظر آنے والے پلک کے ایک بال کو انگلیوں کی پوروں کی غیر محسوس حرکت سے ہٹایا تھا۔ زندگی میں ایسا جیون ساتھی بہت خوش قسمت عورتوں کے حصے میں آتا تھا۔ عکس مراد علی نے وہاں کھڑے چند لمحوں کے لیے جیسے عجیب تعجب سے سوچا۔ اس گھر میں اپنا بچپن گزارتے ہوئے اس نے جتنی بھی خواہشیں کبھی کی تھیں وہ تمام پوری ہوئی تھیں اور اس بات کا ادراک اسے عجیب وقت پر ہوا تھا۔ یہ گھر خوش قسمتی اور بدقسمتی کا عجیب امتزاج لیے ہوئے تھا اس کے لیے۔

☆☆☆

شرمین اور فاروق نے شہر بانو کو ائر پورٹ پر ریسیو کیا تھا لیکن دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شہر بانو نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں مثال کو ماں کو پکڑا دیا تھا۔ وہ مثال کو بہلانے پھسلانے یا ڈرانے کسی بھی چیز میں پورا راستہ کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اب شرمین کی صورت میں اسے جیسے کچھ دیر کے لیے اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے ایک اور کندھا مل گیا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مثال شرمین سے بھی بہلنے والی نہیں تھی۔ ایک بچے کے طور پر بھی وہ صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپ گئی تھی۔ وہ چند ہفتے پہلے والی مثال نہیں تھی جو خوشی خوشی امریکا اپنی نانی اور نانا کے پاس چھٹیاں گزارنے آئی تھی اور ائر پورٹ سے لے کر گھر تک شرمین کو پتا نہیں کیا کیا قصے سناتی رہی تھی۔ اس بار مثال، شرمین کی بے تحاشا کوششوں کے باوجود صرف اِس ایک جملے کے سوا کچھ بولنے پر تیار نہیں تھی کہ اسے پاپا کے پاس جانا ہے۔ وہ پاپ کو مِس کر رہی تھی۔ فاروق خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہے تھے۔ شہر بانو ان کے برابر والی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے اس خوفناک خواب کے بارے میں سوچتی رہی تھی جو اس نے حقیقت میں دیکھا تھا۔ عقبی نشست پر شرمین، مثال کو لیے بیٹھی کسی طرح اس کو بہلانے کی کوششوں میں مصروف تھیں اور ہر بار اس کے منہ سے نکلنے والے جملے شہر بانو کے اعصاب پر جیسے ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ وہ مثال کو اپنی ''ساری فیملی'' سمجھ کر سمیٹ لائی تھی اور مثال کی ساری فیملی سمٹ کر جیسے شیر دل کی ذات پر آکر ٹھہر گئی تھی...... تو وہ...... خود وہ شہر بانو کہاں کھڑی تھی۔

اگلے دو دن شہر بانو اور شرمین کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن شرمین اسے یہ ضرور بتاتی رہی تھیں کہ

پاکستان سے کس کس کا کتنی کتنی بار فون آیا تھا اور امریکا میں ان کے کس کس رشتے دار نے شیر دل کی فیملی کے دباؤ پر ان سے رابطہ کیا تھا۔ شہر بانو نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے عجیب گم صم سی حالت میں تھی۔ عجیب سوتی جاگتی کیفیت جس میں وہ اپنی زندگی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بار بار رکھ کر جوڑنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جارہی تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس سارے معمے کا کوئی حل، کوئی شکل نکال پاتی...... ہر بار وہ ناکام رہی۔ مثال کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی صرف اب اگر کوئی فرق پڑا تھا تو یہ کہ وہ ہر وقت روتی نہیں رہتی تھی لیکن وہ بھی شہر بانو کی طرح کوئی کھلونا پکڑے کسی کونے میں بیٹھی رہتی پھر یک دم کسی بات پر ضد شروع کر دیتی اور پھر کتنی کتنی دیر بیٹھ کر روتی رہتی۔ شہر بانو عجیب میکانیکی انداز میں اسے روتا دیکھتی رہتی۔ اسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مثال کے اس طرح رونے کو اتنی سرد مہری کے ساتھ نظر انداز کر سکتی تھی، اس کی چیخ و پکار کے سامنے اس طرح بے حس ہو سکتی تھی لیکن وہ ہو گئی تھی۔

انسان بعض دفعہ اپنی ذات کے بہت سے پہلوؤں سے اس وقت آگاہ ہوتا ہے جب دوسرے اسے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا اس سے واسطہ پڑ جاتا ہے وہ اس پر بات کرنے لگتے ہیں اور تب انسان جیسے شاک کے عالم میں اپنی ذات کے اس پہلو کو دیکھتا ہے۔ حیران ہوتا ہے...... میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں ایسا کس طرح ہو سکتا ہوں؟ لیکن سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ سوال بہت سارے ہوتے ہیں جواب نہیں...... جواب بس ایک ہوتا ہے......اور وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا...... شہر بانو کو بھی نہیں مل پا رہا تھا۔

''اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟'' دو دن کے بعد بالآخر شرمین نے ایک رات اس سے اس موضوع پر بات کی۔ وہ کچن صاف کر رہی تھیں اور وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پڑے اسٹول پر کافی کا مگ لیے بیٹھی تھی۔

''پتا نہیں۔'' شرمین کو پتا تھا وہ کیا کہے گی۔ وہ بھی اس کے قریب کاؤنٹر کے دوسری طرف اسٹول پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''تم شیر دل کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟'' انہوں نے بالآخر ایک لمبی خاموشی کے بعد کہا۔

''نہیں۔'' جواب کسی توقف کے بغیر آیا تھا۔

''divorce چاہتی ہو؟'' شرمین نے اگلا سوال کیا۔

''شاید۔'' جواب اس بار بھی جلدی آیا تھا لیکن اُلجھن لیے ہوئے تھا اور اُلجھن کیوں تھی، شہر بانو کے پاس اس بات کا بھی جواب نہیں تھا۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' شہر بانو نے یک دم ماں سے پوچھا۔ شرمین اس کے سوال پر جیسے کچھ حیران ہوئی تھیں۔ شہر بانو نے زندگی میں بہت کم اہم فیصلے کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔ شیر دل سے شادی کے وقت بھی اس نے ماں سے مشورہ نہیں کیا تھا صرف اپنی خواہش اور فیصلہ انہیں بتایا تھا اور پھر ان کے مخالف دلائل کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی تھی۔

''تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تم کیا چاہتی ہو؟ مثال کے لیے کیا بہتر ہے؟'' شرمین نے بے تُلے انداز میں اس سے کہا۔

''آپ میری جگہ ہوتیں تو آپ کیا کرتیں؟'' اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ شرمین اس کا چہرہ دیکھنے لگیں پھر انہوں نے کہا۔

''میرے لیے کسی بھی ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہوتا جو مجھ سے وفادار نہیں جو ایک دوسری عورت

کے ساتھ انوالوڈ ہو۔'' کسی دوسرے کی زبان سے شیر دل کی فردِ جرم کا سن کر اسے نہ چاہنے کے باوجود عجیب سی تکلیف ہوئی تھی...... اب بھی ہوئی تھی اور شاید ساری عمر ہونے والی تھی...... یہ کانٹا دل میں گڑا تھا ایڑھی میں چبھا ہوتا تو نکل جاتا۔

''میں بھی نہیں رہ سکتی۔'' اس نے کافی کا مگ کاؤنٹر پر گھماتے ہوئے شرمین سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ شیر دل اور اس کی بے وفائی اور اس کا کردار ڈسکس کرنا ان دونوں کے لیے آسان تھا...... جو چیز دونوں کے لیے مشکل تھی وہ شہباز حسین کو ڈسکس کرنا تھا۔ وہ چڑیا کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کو ڈسکس کرنا تھا۔ شیر دل کی بے وفائی نے جیسے شہباز حسین کو مزید ذلیل وخوار ہونے اور اپنی اولاد کی نظروں میں گرنے سے بچالیا تھا۔ وہ دونوں دن رات شہباز حسین اور عکس اور ان تمام الزامات کے بارے میں سوچتے رہنے کے باوجود اس پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شرمین، شہر بانو سے نہ شہر بانو شرمین سے...... شہباز حسین بُرا تھا اور شیر دل بھی بُرا ہی نکلا کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا مرد تھا...... شرمین کا نتیجہ اس کے اندیشوں کے مطابق ہی نکلا تھا لیکن وہ کوشش کرنے اور خواہش ہونے کے باوجود شہر بانو کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی تھیں۔ شیر دل اور عکس کے درمیان موجود غیر اخلاقی تعلقات کو ایک فون کال کی وجہ سے وہ بہت پہلے جان گئی تھیں۔ وہ شہر بانو کی اذیت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

دونوں میں سے کسی نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا...... بس خاموشی سے وہ دونوں اسی طرح کچن کاؤنٹر کے اطراف اسٹول پر بیٹھی چپ چاپ کافی پیتی رہیں۔ اس کی کڑواہٹ زندگی کی کڑواہٹ کے مقابلے میں شیریں بن گئی تھی۔

☆☆☆

شیر دل نے زندگی میں کبھی سونے کے لیے خواب آور ادویات کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن شہر بانو اور مثال کے اس طرح گھر سے چلے جانے کے بعد وہ دو راتیں نہیں سو سکا تھا۔ سگریٹ پھونکنے، کالز پر کالز ملانے کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ آہستہ آہستہ insomnia (بے خوابی) کا مریض بننے والا تھا۔ اس کی زندگی سے گھر اور سکون نام کی چیزیں جیسے منٹوں میں نکل گئی تھیں اور اس کی ذمے دار شہر بانو تھی۔ اس کے اقدام سے ملنے والا ابتدائی شاک اب شدید غصے میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس غصے کو شہر بانو پر نکالنے کے لیے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ شہر بانو جلتی پر تیل چھڑکنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنے والی تھی۔

بختیار شیر دل نے شہر بانو کے ساتھ رابطہ کرنے میں ناکام ہو جانے اور شرمین کے ساتھ بار بار ہونے والی بات چیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلنے پر بالآخر امریکا جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس معاملے کو طول دے کر اس کی سنگینی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے منزّہ اور شیر دل کے ساتھ اپنی سیٹ ایمرجنسی میں بُک کروائی تھی لیکن اس واقعے کے چوتھے دن وہ جب شام کو نیویارک کی فلائٹ لینے کے لیے ائرپورٹ پہنچے تو امیگریشن کاؤنٹر پر شیر دل کے پاسپورٹ کو ہاتھ میں لیتے اور کمپیوٹر پر چند بٹن دباتے ہی امیگریشن اہلکار نے شیر دل کو امریکن ایمبیسی کی طرف سے اس کے پانچ سالہ ملٹی پل ویزے کی منسوخی کی اطلاع اسے دے کر پاسپورٹ واپس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ شیر دل کا رنگ سیکنڈز میں فق ہوا تھا۔ وہ پاسپورٹ پکڑے بغیر بے یقینی سے اس اہلکار کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مثال سے ملنے اور اسے دیکھ پانے کی ایک آخری امید بھی پل میں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ اس واقعے کے بعد اس کا ویزا کینسل کیا جا سکتا تھا اور وہ بھی انفارم کیے بغیر...... اس کا ذہن جیسے ایک عجیب سے بلیک آؤٹ کا شکار ہوا

تھا۔ غصے، بے بسی اور نا اُمیدی کی ایک عجیب سی کیفیت...... ایک عجیب جنون خیز کیفیت...... اگر زندگی میں وہ کسی عورت کی دوبارہ شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا تو وہ شہر بانو تھی۔

خوش قسمتی سے بختیار اور منزّہ کے ویزے کینسل نہیں ہوئے تھے اور شیر دل کے ویزے کے کینسل ہونے پر بہت اَپ سیٹ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے سفر کو ملتوی کرنے کے بجائے اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ منزّہ اس ساری صورتِ حال میں بالکل چُپ سادھے ہوئے تھیں۔ وہ اس ساری صورتِ حال کا ملبا کسی کے سر ڈالنا چاہتی تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہر بار ایسی کسی کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہی تھیں۔ بختیار اور شیر دل نہ بھی کہتے...... کوئی بھی نہ کہتا تو بھی وہ جانتی تھیں یہ ساری تباہی ان کی وجہ سے آئی تھی۔ شیر دل کا گھر ان کے علاوہ کسی اور کی وجہ سے نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ شرمین اور شہباز کا گھر بھی انہی کی ضد، جھوٹ اور شہباز کی بے جا اور بے وقت کی طرف داری سے ٹوٹا تھا لیکن وہ بھائی تھا اُن کا گھر ٹوٹنے کے بعد انہوں نے کبھی ایسی صورتِ حال میں اپنے کردار کو analyze نہیں کیا تھا نہ ہی کسی نے ان کے اوپر انگلیاں اٹھائی تھیں۔ وہ ساری عمر اسی ایک بات پر فخر کرتی رہی تھیں کہ ان سے جس حد تک ممکن تھا انہوں نے شہباز کی حمایت کی تھی اور اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔

ایک شیر دل کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس میں دِنوں میں ان کے جھوٹ کھل کر سامنے آگئے تھے اور انہیں ایک اور شوہر کے ساتھ ساتھ اپنی دوسری اولاد کے سامنے بھی خفت اٹھانی پڑ رہی تھی۔ ان کی تنقید اور خفگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ شیر دل کی حالت دیکھ رہی تھیں اور ایک ماں کے طور پر ان کا دل اس کی حالت پر کٹ رہا تھا لیکن جو ندامت اور غصہ انہیں اپنے آپ پر آنا چاہیے تھا، وہ شہر بانو اور شرمین پر آرہا تھا۔ شہر بانو سے بھی زیادہ شرمین پر کیونکہ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلا لیا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا شرمین کی وجہ سے ہو رہا تھا ان کی برین واشنگ کی وجہ سے...... وہ ان کے خاندان سے بدلہ لینا چاہ رہی تھیں اور وہ اتنے سالوں بعد کامیاب ہوگئی تھیں۔ وہ امریکا بھی انہی شکوک وشبہات، غلط فہمیوں کے ساتھ پہنچی تھیں اور ان کی خفگی اور غصے میں اس وقت اضافہ ہوگیا تھا جب شرمین نے انہیں اپنے گھر بُلانے یا شہر بانو سے کہیں بھی ان کی ملاقات کروا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بختیار شیر دل ان کے ساتھ نہ ہوتے تو منزّہ ایک بار پھر غصے میں کوئی مزید ہنگامہ کرتیں لیکن بختیار نے اس معاملے پر شرمین کے میاں فاروق سے بات کر کے انہیں کسی نہ کسی طرح شہر بانو کے ساتھ ایک ملاقات کروانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ فاروق نے شرمین اور شہر بانو کو اس ملاقات پر کیسے تیار کیا تھا وہ ایک الگ کہانی تھی لیکن شہر بانو اور شرمین بالآخر ان لوگوں سے ملاقات پر آمادہ ہوگئی تھیں اور بختیار نے یہ خبر شیر دل کو پاکستان میں بھی پہنچا دی تھی۔

☆☆☆

''سجاد قادر'' عکس نے حلیمہ کے نام بتانے پر وہ نام دُہرا کر جیسے اپنی یادداشت تازہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک دُبلے پتلے سانولے رنگ کے لڑکے کا تصور ابھرا تھا لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

''میں نام سے واقف ہوں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی، مجھے شکل تک ٹھیک سے یاد نہیں اس کی۔'' اس نے حلیمہ سے کہا۔

''اچھا؟ لیکن اس کو تو بڑی اچھی طرح سے یاد ہو تم۔'' حلیمہ کو اس کی بات پر جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ ''لیکن خیر یہ تو ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں، میں ان لوگوں سے بات کر کے ملاقات کروا دیتی ہوں تم دونوں کی۔'' حلیمہ نے اس سے کہا۔

''امی وہ دبئی میں کام کرتا ہے، میں یہاں پاکستان میں...... اور میرا اپنی جاب چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

عکس نے دوٹوک انداز میں حلیمہ کو اپنی ترجیحات بتا دی تھیں۔

''میں نے یہ بھی بات کی تھی ان لوگوں سے...... سجاد نے ایک دو سال تک واپس پاکستان آجانا ہے۔ یہاں بڑے اچھے ہاسپٹلز سے آفرز ہیں اسے...... لیکن وہ شاید اپنا ہاسپٹل بنانا چاہتا ہے لاہور میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کے...... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔'' حلیمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''ٹھیک ہے، آپ ملاقات کروا دیں۔'' وہ کہہ کر حلیمہ کے پاس سے اٹھ گئی۔ شادی یک دم اسے ایک بوجھ محسوس ہونے لگی تھی۔ خاص طور پر ان اوپر نیچے بار بار ہونے والے حادثات کی وجہ سے...... ایک بار پھر سے کسی نئے آدمی سے ملنا کسی نئے آدمی کو جیون ساتھی کے طور پر دیکھنے کے لیے ملنا...... اپنے ذہن اور دل میں اس کے لیے گنجائش یا کوئی نرم جگہ نہ ہونے کے باوجود پیدا کرنے کی جدوجہد...... عکس مراد علی کہیں نہ کہیں اس ساری جدوجہد سے تنگ آگئی تھی۔ اگر خیر دین اور حلیمہ کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ کم از کم اس وقت پھر سے کسی نئے شخص سے ملنے کی کوشش نہ کر رہی ہوتی۔

اگلی صبح آفس میں آتے ہی اسے شیر دل کی چھٹی کی اطلاع ملی تھی۔ وہ ایک مہینے کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اسے یک دم اس کے حوالے سے مزید تشویش ہوئی تھی۔ بہت دیر تک وہ اس اُلجھن میں رہی تھی کہ اسے شیر دل سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر جیسے اس نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اس کے موبائل پر کی جانے والی کال بے مقصد ثابت ہوئی تھی۔ اس کے دونوں نمبرز آف تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اس نے اپنے پی اے کو شیر دل کی رہائش گاہ پر اس کی موجودگی چیک کرنے اور اس کے موجود ہونے پر اس سے رابطہ کرانے کی ہدایات دی تھیں۔ پی اے کے جواب کے انتظار میں وہ اپنی میز پر پڑے ہوئے وہ تمام Invitation دیکھنے لگی جو شہر کی مختلف تنظیموں اور اداروں کی طرف سے مختلف تقریبات کی صدارت کے لیے اس کے پاس آتے رہے تھے۔ ٹرے میں پڑا وہ چوتھا کارڈ تھا جس کو ہاتھ میں لیتے ہی وہ رک گئی تھی۔ وہ اس کے اپنے کانونٹ اسکول کی طرف سے تھا...... سالانہ اسپورٹس ڈے کے انعقاد اور اس تقریب میں مہمانِ خصوصی کے طور پر اس کی شرکت کی دعوت...... اس نے سیکنڈز میں کارڈ پر لکھی تحریر پڑھی تھی اور پھر ایک نام پر رک گئی تھی۔ وہ اسکول کی پرنسپل سسٹر ایگنس فرانس کا نام تھا۔ وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ ان کا نام زیرِ لب دہرانے لگی۔ وہ ایک بار پھر اس کے اسکول کی پرنسپل کے طور پر وہاں موجود تھیں۔ اتنے سال گزر گئے تھے اور اتنے سالوں میں اس کانونٹ سے سسٹر ایگنس کے ٹرانسفر کے بعد اس کی دوبارہ ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی حالانکہ اسے بہت بار ان کا خیال آتا رہتا تھا۔ کئی بار خیر دین اور وہ بیٹھے ماضی کو یاد کرتے تو وہ دونوں سسٹر ایگنس کا ذکر بھی کرتے۔ بہت دفعہ اس نے خواہش بھی کی تھی کہ وہ کبھی کہیں ان سے ملاقات کر پاتی لیکن زندگی اتنی تیز رفتار رہی تھی کہ وہ خواہش کے باوجود ان کو ڈھونڈنے اور ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکی تھی۔ انٹر کام اٹھا کر اس نے پی اے کا نمبر ملایا تھا۔ پی اے نے اس کی آواز سنتے ہی اسے شیر دل کے اپنی رہائش گاہ پر نہ ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ لاہور میں تھا۔ اس نے پی اے کو لاہور میں اسے ٹریس کرنے کی ہدایات دینے کے بعد ہاتھ میں پکڑے کارڈ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔

''جی ان کا فون بھی آیا تھا دوبارہ اسی فنکشن کے حوالے سے آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن آپ سیٹ پر نہیں تھیں۔'' پی اے نے اُسے سسٹر ایگنس کے حوالے سے بتایا۔ عکس نے اس فنکشن میں جانے کی بابت..... پی اے کو اسکول انتظامیہ کو آگاہ کرنے کی ہدایات دیں اور فون ایک بار پھر رکھ دیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر شیر دل میں اُلجھ

گیا تھا۔

☆☆☆

”شیر دل کا مسئلہ حل ہوا؟“ اس رات کھانے پر خیر دین نے ایک بار پھر وہ موضوع چھیڑ دیا تھا جو سارا دن اس کے ذہن پر سوار رہا تھا۔

”وہ ایک مہینے کی چھٹی پر چلا گیا ہے۔“ عکس نے کھانا کھاتے ہوئے خیر دین کو اطلاع دی۔

”اللہ خیر کرے..... تمہاری بات ہوئی اس سے؟“ خیر دین کو تشویش ہوئی۔

”دونوں موبائل نمبرز آف ہیں اس کے اور وہ لاہور میں ہے اپنے پیرنٹس کے گھر پر..... اس کے آپریٹر نے نمبر دیا ہے وہاں کا۔ میں نے پیغام چھوڑا ہے اس کے لیے..... اگر کل وہ کال نہیں کرتا تو پھر میں کروں گی اُسے کال۔“ عکس نے خیر دین کو تفصیل سے بتایا۔

”تم نے پہلے کبھی اس سے بات کرنے کے لیے اس کی کال کا انتظار نہیں کیا تھا۔“ وہ خیر دین کی طرف سے آنے والے اس غیر متوقع سوال پر کچھ گڑبڑا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ خیر دین اس کی اس تفصیلات میں سے کوئی ”حیران کُن تجزیہ“ نکال سکتا ہے۔

”نانا یہ اس کا اور اس کی بیوی کا معاملہ ہے، ایک پرسنل ایشو ہے، مجھے نہیں پتا کہ اسے اس مسئلے کو کسی دوسرے کے ساتھ ڈسکس کرنا اچھا لگے گا یا نہیں۔“ اس نے بالآخر خیر دین کے ساتھ اپنی الجھن شیئر کی۔

”تم اس کے ساتھ کچھ ڈسکس کرو یا نہ کرو کم از کم اس پریشانی میں اس کو حوصلہ تو دلا سکتی ہو ناں... بیوی تو اچھی تھی اس کی تم ہی کہا کرتی تھیں پھر یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔“ خیر دین نے بات کرتے کرتے بات کا رخ بدل دیا اور جیسے عکس کو اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے بچا لیا۔

”ماں تو بہت اچھی عورت تھی شیر دل کی بیوی کی۔“ خیر دین اب شرمین کے بارے میں سوچتا ہوا بول رہا تھا۔ ”پتا نہیں ایسا کیا ہو گیا کہ اس طرح گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اُس کی بیوی۔“ عکس کو خیر دین کی بات سنتے ہوئے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب طرح کا احساسِ جُرم ہونے لگا تھا۔ اگر خیر دین کو یہ پتا چل جاتا کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک اس بگاڑ میں انوالو تھی تو پتا نہیں اس کا ردِعمل کیا ہوتا۔

”نانا سسٹر ایگنس دوبارہ اسی کانونٹ میں آ گئی ہیں۔“ عکس نے یک دم خیر دین کو اس موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

سسٹر ایگنس کو اپنے آفس میں آکر بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی جب reception پر بیٹھے آفس اسسٹنٹ نے انہیں ایک اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں بتایا جو اُن سے ملنا چاہتی تھی۔ سسٹر ایگنس نے اپنے اسسٹنٹ کو پہلے اُن وزیٹرز کو اندر بھیجنے کے لیے کہا جو ایڈمیشن اور اپنے بچوں کے حوالے سے مختلف ایشوز ڈسکس کرنے آئے تھے اور اس اولڈ اسٹوڈنٹ کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ اسکول کے اکثر اولڈ اسٹوڈنٹس کتنی بار ان سے ملنے وہاں آجایا کرتے تھے۔ یہ ہر روز نہیں ہوتا تھا لیکن یہ اکثر اوقات ہوتا تھا اور سسٹر ایگنس ایسی ملاقاتوں کو اپنی اپائنٹمنٹس میں سب سے نیچے رکھتی تھیں کیونکہ ایسی ملاقاتوں میں زیادہ تر گپ شپ ہوتی تھی یا پھر بعض اولڈ اسٹوڈنٹس اسکول میں اپنے بچوں یا فیملی کے بچوں کے لیے کچھ favours لینے کی کوشش کرتے

تھے..... آج بھی ہمیشہ کی طرح سسٹر ایگنس نے اس وزیٹر کو سب سے آخر میں رکھا تھا۔ بالآخر جب وہ اپنی باقی تمام ملاقاتیوں سے فارغ ہو گئیں تو انہوں نے اسسٹنٹ سے اس اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں پوچھا۔

”وہ مجھ سے پوچھ کر چلی گئی تھیں کہ سسٹر کب تک فری ہو کر ان سے ملیں گی؟ میں نے کہا ”لنچ بریک کے بعد“ تو وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ تب دوبارہ آجائیں گی لیکن ابھی......“ اسسٹنٹ نے سسٹر ایگنس سے بات کرتے کرتے عکس مراد علی کو دوبارہ آفس میں آتے دیکھ لیا۔ وہ بالکل اس وقت پر آئی تھی جس وقت کا اسسٹنٹ نے اُسے بتایا تھا۔ اسسٹنٹ نے سسٹر ایگنس کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔ ”ڈاکٹر عکس نام ہے۔“ اسسٹنٹ نے سسٹر ایگنس کے استفسار پر بتایا پھر عکس کو اندر جانے کے لیے کہا۔

”Good afternoon sister“ سسٹر ایگنس نے سر اٹھا کر اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور پھر جیسے سیکنڈز میں اسے پہچان لیا۔

”عکس مراد علی۔“ انہوں نے اس کی greeting کا جواب دیتے ہوئے بے حد بے یقینی سے اس کا پورا نام لیا۔ عکس بے اختیار ہنس پڑی اسے کوئی زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ سسٹر ایگنس اس کے بچپن میں بھی اسکول میں پڑھنے والے سیکڑوں بچوں کو اسی طرح ان کا پورا نام لے کر یاد رکھا کرتی تھیں لیکن اب اس عمر میں بھی ان کی یادداشت کا اسی طرح شاندار رہنا ایک عام آدمی کے لیے حیران کُن تھا۔

”ڈاکٹر عکس مراد علی؟“ ٹیبل کے اوپر سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اب انہوں نے دوسری بار ستائشی انداز میں اس کا نام لیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سسٹر ایگنس کی اس ستائش آمیز حیرت پر مسکرا دی تھی۔ اس سے بڑی گرم جوشی سے باتیں کرتے ہوئے سسٹر ایگنس نے جیسے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ایک سیاہ سوٹ کے اوپر ایک آف وائٹ ٹی کالر ڈ جرسی پہنے اس دُبلی پتلی سانولی لڑکی میں انہیں وہی تنک اور تمکنت نظر آئی تھی جو اس ننھی بچی کی بھی شناخت تھی جس کی ملائم ریشمی آواز پر وہ جان چھڑکتی تھیں۔ ان آنکھوں کی چمک آج بھی اس کی ذہانت کو عیاں کر رہی تھی۔ اس حادثے کا کوئی رنگ انہیں اس مسکراتے ہوئے پُراعتماد چہرے میں کہیں نہیں دِکھا تھا جس نے تب کئی مہینوں تک اس ننھے وجود کو کُملائے رکھا تھا۔ سسٹر ایگنس کو دِلی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس ذہین لڑکی کو ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا اس ذہین لڑکی نے اس سے زیادہ بڑے پہاڑ سَر کر لیے تھے جن پر وہ اس کا نام دیکھنا چاہتی تھیں۔ ٹیبل پر پڑا اس کا فون وہاں رکھے جانے کے چند ہی منٹ بعد بجنے لگا تھا جسے عکس نے بہت معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر silent کیا تھا لیکن silent ہونے کے باوجود سسٹر ایگنس اس پوری گفتگو کے دوران بار بار اس فون پر جلتی بجھتی روشنیوں کا سیلاب دیکھتی رہیں وہ ہر چند منٹ بعد کسی میسج یا کال کا اعلان کر رہا تھا۔

”بہت busy ڈاکٹر ہو تم!“ سسٹر ایگنس نے مسکراتے ہوئے اس کے فون کی طرف اشارہ کیا۔

”میں پریکٹس نہیں کرتی سسٹر۔“ عکس نے ان کی بات پر ایک لمحے کے لیے اپنے فون کو دیکھا پھر ان سے کہا۔

سسٹر ایگنس کے تاثرات سیکنڈز میں بدلے تھے انہوں نے بہت خفگی سے اسے جھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ عکس مسکراتے ہوئے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی، اسے ان سے اسی بات کا خدشہ تھا۔ جب سسٹر ایگنس کی ناراضی زیادہ بڑھ گئی تو عکس نے انہیں اپنے موجودہ پروفیشن کے متعلق نرم آواز میں بتایا۔ سسٹر ایگنس چند لمحوں

کے لیے بھونچکا رہ گئی تھیں۔ شہر میں تعینات ہونے والی پہلی خاتون DCO کے بارے میں وہ واقف تھیں، نام سے بھی واقف تھیں اور چند دن پہلے انہوں نے...اسے اسپورٹس ڈے... پر دعوت دینے کے لیے کارڈ بھیجا تھا لیکن انہیں بالکل شائبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ یہ عکس مراد علی ہوگی...... وہ جو اِن کے بالمقابل میز کے دوسری طرف پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر بڑی تمیز اور شائستگی سے کرسی کے ہتھوں پر بازو ٹکائے، گھٹنے جوڑے، پاؤں ملائے بالکل سیدھی پشت کے ساتھ بے حد مؤدب انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ اس شہر کی DCO تھی جو اپنے آفس میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے ریوالونگ چیئر پر بے حد کرّوفر سے بیٹھتی تھی۔ کہیں پہنچنے پر لوگ اس کا باہر نکل کر استقبال کرتے تھے۔ وہ وزیٹرز روم میں بیٹھ کر انتظار کر کے اٹھ جانے کے بعد دوبارہ اسی طرح وہاں نہیں آجاتی تھی۔

''میں اسپورٹس ڈے پر آنا چاہتی تھی اس لیے میں نے سوچا میں آکر آپ کو بتا دوں اور آپ سے مل بھی لوں۔'' وہ اُسی انکسار سے سسٹر ایگنس کو بتا رہی تھی۔ سسٹر ایگنس کو چند لمحے واقعی کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ ان کے ایکس اسٹوڈنٹس میں سے بڑے عہدوں پر پہنچنے والوں کی کمی نہیں تھی مگر زندگی میں کامیابی کے اوپر والے زینے پر کھڑے ہو کر بھی چلّا کر بات کرنے کے بجائے جھک کر مدھم آواز میں بات کرنے والے انہوں نے بھی بہت کم دیکھے تھے اگر خاندان، ذات برادری کو کہتے تھے تو پھر وہ کوئی خاندان نہیں رکھتی تھی اور اگر خاندانی اخلاقی اقدار اور تمیز و تہذیب کو کہتے تھے تو پھر سسٹر ایگنس نے ڈاکٹر عکس مراد علی سے بڑھ کر خاندانی کوئی نہیں دیکھا تھا۔

''بہت غلط فیصلہ تھا یہ!'' ابتدائی شاک سے نکل آنے کے بعد سسٹر ایگنس نے ایک بار پھر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک جھینپی ہوئی زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی اسے اندازہ تھا کہ وہ میڈیسن پریکٹس نہ کرنے پر اسے یہی کہیں گی۔ خیر دین کے بعد وہ دوسری شخص تھیں جن کے لیے میڈیسن مسیحائی تھی اور دنیا کا اور کوئی پروفیشن اس کے قریب بھی نہیں آسکتا تھا۔

''اور جب تک میں یہاں ہوں اگر میں آپ کے لیے، اسکول کے لیے کچھ بھی کر سکی تو پلیز مجھے ضرور بتائیے گا۔'' چائے پیتے ہوئے اُٹھنے سے چند لمحے پہلے اس نے سسٹر ایگنس سے کہا تھا۔ سسٹر ایگنس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اسکول کے عقب میں واقع ایک سرکاری پلاٹ کا ذکر کرنا شروع کیا جسے اسکول بہت عرصے سے اسکول کے گراؤنڈ میں توسیع کے لیے خریدنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ سسٹر ایگنس کو اب امید تھی کہ عکس مراد علی کے اس سیٹ پر ہونے کی وجہ سے اسکول بالآخر وہ پلاٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس پلاٹ کی شمولیت سے اسکول میں بچوں کے لیے گیمز کی بہتر سہولیات میسّر آسکیں گی۔ عکس نے خاموشی سے بغور سسٹر ایگنس کی بات سنی۔ وہ مطالبہ اور درخواست کوئی نیا مطالبہ نہیں تھا۔ اسکولز اور کالجز اپنی تقریبات میں مدعو کرنے کے بہانے عام طور پر ضلعی انتظامیہ کے سامنے اس طرح کے مطالبے پیش کرتے تھے یا پھر مختلف گرانٹس کے لیے درخواستیں......

''میں دیکھوں گی میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس پلاٹ کے سلسلے میں، میں آپ کی کوئی مدد کر پاؤں گی۔'' عکس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے متانت سے سسٹر ایگنس کو بتایا۔ انہیں اس کے جواب نے حیران کر دیا تھا۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں ''انکار'' کی توقع عکس مراد علی کے

وہاں اس طرح آنے اور بیٹھنے کے بعد خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

''لیکن تم کر سکتی ہو تمہیں authority ہے اس کی۔'' سسٹر ایگنس نے اصرار کیا۔

''authority ہے لیکن rules کو violate کیے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اسکول پرائیویٹ ہے۔ privilaged class کے لیے کام کر رہا ہے اور مالی طور پر بہت مستحکم ہے۔ کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن سے بہت زیادہ فنڈنگ بھی مل رہی ہے اسے...... اور قواعد و ضوابط کے مطابق میں ایسے کسی ادارے کو سرکاری زمین الاٹ نہیں کر سکتی۔ یہ میں بھی کر سکتی ہوں جب میں تمام rules کو بائی پاس کر دوں اور وہ میں نہیں کر سکتی۔ وہ زمین ویسے بھی اس علاقے کے ایک چلڈرن پارک کے لیے مختص ہے اور ضلعی انتظامیہ نے اس سال بجٹ میں اس کے لیے فنڈز رکھے ہیں چند مہینوں تک اس پر کام شروع ہو جائے گا۔'' سسٹر ایگنس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

''You know Dr. Aks Murad Ali...... اس اسکول کے بھی بہت سارے rules تھے لیکن میں نے تمہیں دوبارہ ایڈمیشن دِلانے کے لیے اور پھر تمہاری تعلیم کو ہر طریقے سے جاری رکھوانے کے لیے بہت سے rules کو violate بھی کیا تھا اور بائی پاس بھی۔'' انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے جتایا۔ انہیں اس کا انکار کھَلا تھا۔

''اگر آپ سسٹر ایگنس کی اسٹوڈنٹ رہی ہوتیں تو آپ کے لیے بھی rules کو violate کرنا میری طرح مشکل ہوتا۔'' جواب اُسی متانت اور ذہانت سے آیا تھا۔ سسٹر ایگنس بے اختیار لاجواب ہوتے ہوئے ہنس پڑیں۔ اس نے انہیں tribute نہیں کیا تھا لیکن ان کے لیے اپنے کیس کو argue کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا تھا۔

''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟'' اُسے باہر چھوڑنے کے لیے آتے ہوئے سسٹر ایگنس نے اس سے پوچھا۔

''وہ گیٹ سے باہر ہے سسٹر۔'' عکس نے کہا۔

''میں گیٹ کھلوا رہی ہوں تم گاڑی اندر منگوا لو۔'' سسٹر ایگنس نے اس سے کہا۔

''Thank you sister...... لیکن میں کبھی کسی اسکول یا کالج کے اندر گاڑی لے کر نہیں جاتی۔'' عکس نے جواباً ان سے کہا تھا۔

سسٹر ایگنس اس کے منع کرنے کے باوجود اسے پارکنگ تک چھوڑنے آئی تھیں اور پارکنگ میں اسے رخصت کرتے ہوئے انہوں نے عکس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''I am very proud of you.''

عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ مؤدب انداز میں ان کی بات سننے لگی۔

''میری خواہش ہے کہ تم اپنے اصولوں اور ویلیوز کو ہمیشہ اسی طرح رکھنا That is your real strength.''

''I will.'' وہ کہہ کر مسکرائی اور اس نے سسٹر ایگنس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سسٹر ایگنس نے اسے اپنی سیاہ اسٹاف کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جس کا ڈرائیور اب اس کے لیے دروازہ کھولے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی اس کے سیکورٹی گارڈ نے ڈرائیور کی طرح اس کے برابر والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی اسٹاف کار کے عقب میں موجود پولیس موبائل بھی حرکت میں آگئی تھی۔ سسٹر ایگنس وہیں کھڑی اس کی گاڑی کو

پارکنگ سے سڑک اور پھر سڑک سے موڑ مڑ کر غائب ہوتے دیکھتی رہیں۔ یہ وہ تعظیم تھی جو وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی کار کو نہیں دے رہی تھیں، نہ DC عکس مراد علی کو...... یہ وہ تعظیم تھی جو وہ انسانی ہمت، حوصلے، ثابت قدمی کی اس چھوٹی سی کہانی کو دے رہی تھیں جس کی ایک چشم دید گواہ وہ بھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کردار اس کہانی میں ان کا بھی تھا اور انہیں فخر ہوا تھا، واقعی فخر ہوا تھا۔

انہوں نے جس سُبک قدم، باوقار لڑکی کو سبز نمبر پلیٹ والی سرکاری گاڑی پر پولیس escort اور پروٹوکول کے ساتھ کچھ دیر پہلے وہاں سے جاتے دیکھا تھا اسے ایک ننھی بچی کے روپ میں اپنے نانا کی ایک پرانی سائیکل پر بیٹھے سردی، گرمی، برسات، خزاں، بہار کے ہر موسم میں وہاں اس سڑک پر آتے دیکھا تھا...... کئی بار...... اور بار بار...... چلچلاتی دھوپ میں پسینے میں شرابور سرخ چہرے کے ساتھ...... کہر آلود سردی میں خنکی سے یخ بستہ سرخ ناک اور سرخ گالوں کے ساتھ ٹھٹھرتے کانپتے...... اس پرانی سائیکل سے اس سرکاری گاڑی کا سفر اس ایک انتخاب کا نتیجہ تھا جو انسان مصائب کے پہاڑ کے سامنے کانپتے پیروں پر کھڑے رہنے یا گھٹنوں پر گر جانے کی شکل میں کرتا ہے۔ سسٹر ایگنس کے پاس آج اپنے لیکچرز میں quote کرنے والی ایک اور مثال آگئی تھی۔

☆☆☆

بختیار اور منزّہ، شرمین اور شہر بانو کو کسی طرح واپس لے آنے پر تو کامیاب نہیں ہو سکے لیکن شہر بانو divorce کے لیے کیس فائل کرنے سے پہلے شیر دل سے فون پر بات کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ شیر دل کو تب تک شہر بانو کے حوالے سے کوئی خوش فہمی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے بدترین حماقت کی بھی توقع کر رہا تھا اور بختیار سے یہ سن کر اُسے اس توقع کے باوجود شاک لگا تھا کہ وہ divorce کے لیے کیس فائل کرنے کا طے کر چکی تھی۔ کسی بھی پُرسکون شادی شدہ زندگی گزارنے والے مرد کو ان حالات میں اسی طرح کی کیفیات سے گزرنا پڑتا۔ شہر بانو سے وہ گفتگو اس کی شادی شدہ زندگی کو بچانے کا جیسے ایک آخری موقع تھا شیر دل کے لیے اور اس نے اپنے دل و دماغ کو ایک عجیب حالت میں پایا تھا۔ اسے شہر بانو کو اپنی زندگی میں دوبارہ واپس لانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ محبت اور اعتماد نام کا وہ رشتہ جس میں وہ اتنے سالوں سے جُڑے ہوئے تھے وہ اتنی بُری طرح سے اور اتنی جگہوں سے ٹوٹا تھا کہ اب کم از کم شیر دل کو اس کو پھر سے جوڑ لینے کی کوئی خواہش نہیں تھی یا کم از کم فی الحال نہیں تھی لیکن اس کی مجبوری اور کمزوری وہ اولاد تھی جو شہر بانو کے پاس تھی۔ مثال اس کے پاس نہ ہوتی تو شیر دل، شہر بانو سے لاکھ محبت رکھنے کے باوجود بھی اس طرح کے حالات میں اس سے علیحدگی اختیار کرنے میں چند دن بھی نہ لگاتا۔

''اس سے بہت تحمل سے بات کرنا، وہ اس وقت عقل سے پیدل ہو رہی ہے لیکن تم سمجھ دار ہو، اس کا اتنا نقصان نہیں ہونا جتنا تمہارا ہوگا۔'' بختیار نے اسے شہر بانو سے بات کرنے سے پہلے بہت سمجھایا تھا۔ وہ شیر دل کی ذہنی و جذباتی کیفیت کو ایک باپ کے طور پر سمجھتے تھے۔ شیر دل نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اس سے یہ سب نہ بھی کہہ رہے ہوتے تب بھی اسے پتا تھا نقصان کس کا ہو رہا تھا اور کس کا ہونے والا تھا۔

دوسرے دن بالآخر اس کی اور شہر بانو کی بات ہو گئی تھی۔ فون پر اس کی آواز سنتے ہی شیر دل کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ کرنے والا مرد نہیں تھا، نہ ہی انا اور خود پرستی کا مارا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود شہر بانو کے سامنے اسے ایک عجیب سی تضحیک اور ذلّت کا احساس ہو رہا تھا اور تضحیک کے اس احساس کے ساتھ اس کے ساتھ نارمل، خوشگوار انداز میں بات کرنا بے حد مشکل تھا...... ہیلو کے تبادلے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے حال احوال نہیں پوچھا تھا۔ بات کہاں سے شروع کی جائے یہ شیر دل کا مسئلہ تھا شہر بانو کا نہیں کیونکہ اسے شیر دل سے کچھ نہیں کہنا تھا نہ ہی مصالحت کی کوشش کرنی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرنا شیر دل کی ذمے داری تھی۔ مرد کے لیے عورت کے سامنے جُھکنا ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے اور خاص طور پر تب، جب غلطی عورت کی ہو اور جُھکنا پھر بھی مرد کو پڑ رہا ہو۔ یہ جیسے اس کے لیے کٹ مرنے کا مقام ہوتا ہے اور شیر دل کے سامنے آزمائش کا یہ پہاڑ لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

''شہر بانو میں patch up چاہتا ہوں جو بھی کچھ ہوا۔ Let's get over with it...... تم اگر چاہتی ہو کہ میں معذرت کروں...... تو میں، وہ کرنے پر بھی تیار ہوں لیکن واپس آجاؤ، ہم ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔'' شیر دل نے زندگی میں کبھی تھوک کر نہیں چاٹا تھا اور اب اُسے چاٹنا پڑ رہا تھا۔ یہ چند جملے زبان سے ادا کرنے کے لیے اس نے جیسے اپنی انا اور عزتِ نفس نام کی چیزوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

''کون سا مسئلہ؟'' ریسیور پر اس نے شہر بانو کو بے حد سرد مہری سے کہتے سنا۔ اس کی آواز میں کوئی شناسائی تھی نہ کوئی پچھتاوا۔ وہ اس سے یوں بات کر رہی تھی جیسے زندگی میں پہلی بار ایک شیر دل نام کے آدمی سے بات کر رہی ہو۔ ''تمہارے اور میرے بیچ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں اور اگر کبھی تھا بھی تو ختم ہو چکا ہے۔ تم ایک اچھے لائف پارٹنر بننے کے قابل ہی نہیں تھے۔ میں نے تمہارا انتخاب کر کے غلطی کی اور اب وہ غلطی ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے شیر دل کے کہنے کے لیے جیسے کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ایک کے بعد ایک جوتا اس کے منہ پر مارا تھا۔ اس نے پھر بھی ڈھیٹ بن کر اس سے کہا۔

''میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو اور......'' شہر بانو نے بے حد تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''خفا؟...... میں تم سے خفا نہیں ہوں میں صرف اپنے آپ سے خفا ہوں، تمہارے ہاتھوں بے وقوف بننے کی وجہ سے...... اتنے سال تمہیں ایک وفادار شوہر سمجھنے کی وجہ سے۔'' شیر دل نے اس کی بات یک دم کاٹ دی۔

''میں تم سے ہمیشہ وفادار رہا ہوں شہر بانو...... اور مجھے اس حوالے سے کوئی احساسِ جُرم نہیں ہے۔'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ہاں، تمہیں کیوں کوئی احساسِ جُرم ہوگا۔ عکس مراد علی جیسی عورتوں کے ساتھ افیئر چلاتے ہوئے احساسِ جرم تھوڑی رکھتے ہیں۔ وہ تو فخر اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔''

''شہر بانو، عکس میری زندگی کا حصہ نہیں ہے، بہتر ہے تم اس پر بات نہ کرو...... تم اور مثال میری زندگی کا حصہ ہو۔'' شیر دل نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔

''ہم تھے، اب نہیں ہیں۔'' اس نے شیر دل کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔ ''میں نے تمہارے لیے وہ انتخاب آسان کر دیا ہے جو تم خود نہیں کر پا رہے تھے۔ تم مجھ سے نہیں، عکس سے محبت کرتے ہو وہ matter

کرتی ہے تمہارے لیے...... اس لیے تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔'' شہر بانو کے مؤقف میں اب بھی ذرا برابر تبدیلی نہیں آئی۔ شیر دل کو لگا وہ جیسے کسی پتھر سے سر پھوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ ہونٹ بھینچے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن تم مثال کو اس طرح باہر نہیں لے جاسکتیں۔'' اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ غصہ جھلکنے لگا تھا جو وہ اپنے اندر دبائے پھر رہا تھا۔

''میں مثال کو اپنے ساتھ لا چکی ہوں اور میرا اسے واپس لانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' شہر بانو نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم بچے کی کسٹڈی شادی کے وقت مجھے لکھ کر دے چکے ہو۔''

''میں نے کسٹڈی تمہیں دی ہے، یہ نہیں کہا تھا کہ تم اسے اس طرح لے جاؤ اور پھر اس سے ملنے کے لیے مجھے تنگ کرو۔'' شیر دل نے دُرشتی سے کہا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ شادی کے وقت ان دو شرائط کو ماننے پر اب بُری طرح پچھتا رہا تھا۔

''میں چاہتی ہوں تم ہم دونوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ اور عکس کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزارو۔''

''شہر بانو میں شہباز حسین نہیں ہوں، میں مثال کو اس طرح کہیں رہنے نہیں دوں گا۔'' شیر دل نے ایک بار پھر اس کی گفتگو میں عکس کے حوالے سے کیے جانے والے طنز کو نظر انداز کیا تھا۔

''مثال تم سے نہیں ملنا چاہتی اور وہ تمہارے بغیر میرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔'' شہر بانو نے بھی اسی سرد مہری سے کہا۔ وہ ایک موہوم آس جو اسے اِس حوالے سے تھی کہ وہ محبت کی بات کرے گا اسے اپنے تعلق کے حوالے سے واپس بلائے گا۔ اس سے کہے گا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ شیر دل کے لہجے میں کہیں وہ حلاوت، وہ محبت، وہ طلب نہیں تھی جس پر وہ قربان ہو جاتی تھی۔

بالکل اس لمحے جب شیر دل اس سے کچھ کہنے لگا تھا اس نے شہر بانو کے ریسیور پر دور سے مثال کی آواز سُنی وہ شہر بانو سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ شیر دل سے بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز پر شیر دل بے اختیار بے تابی سے اپنا غصہ بھول کر بولا۔

''میری بات کرواؤ اس سے۔''

''نہیں، میں تمہارے پاپا سے بات نہیں کر رہی، تم باہر جا کر کھیلو۔'' شہر بانو نے شیر دل کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں اس سے میری بات کرواؤ۔'' شیر دل اس بار اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نہیں کرواؤں گی۔'' شہر بانو نے اُسی اکھڑ انداز میں کہا تھا۔ شیر دل اس کے انکار پر ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ اس نے بلند آواز میں چلّاتے ہوئے شہر بانو کو زندگی میں پہلی بار گالیاں دینا اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا...... شہر بانو ریسیور ہاتھ میں لیے فق چہرے کے ساتھ بے یقینی کے عالم میں شیر دل کی گالیاں سنتی رہی۔ وہ اس مرد کو نہیں پہچانتی تھی جس کی آواز وہ فون پر اس وقت سن رہی تھی، گالی تو دور کی بات اس نے کبھی شیر دل کی بلند آواز تک نہیں سنی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ، خفگی نام کی ہر چیز سے ایک شیر دل نے اسے کبھی آشنا کیا ہی نہیں تھا اور اب وہ اس کے لیے وہ سارے الفاظ استعمال کر رہا تھا صرف اس لیے کیونکہ وہ

ایک عورت ہے...... بلکہ اسے اس وقت بھی عکس ہی کا خیال آیا تھا، وہ اب بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ وہ بہت جذباتی ہو کر سوچ رہی تھی اور شیر دل کا ردِعمل اس کی غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر شیر دل کی بار بار آنے والی کالز کو بھی اس نے ریسیو نہیں کیا تھا۔ اس کے اور شیر دل کے بیچ اس دن کچھ باقی نہیں بچا تھا یا کم از کم شہر بانو کو یہی لگا تھا۔

☆☆☆

عکس بے یقینی سے خیر دین کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ یوں جیسے اس کو یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ یہ سب کچھ اس نے خیر دین کے منہ سے سنا تھا۔

''نانا یہ سب آپ سے شہر بانو کی ممی نے کہا؟'' اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ثمین امریکا سے کال کر کے خیر دین سے اس کے اور شیر دل کے حوالے سے بات کریں گی لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ انہوں نے نمبر کہاں سے لیا تھا؟ اور یہ مشورہ کس کا تھا...... اس سے بھی بڑا سوال عکس کے لیے یہ تھا کہ انہوں نے اس کی ضرورت کیسے محسوس کی تھی۔ خیر دین بھی اسی کی طرح رنجیدگی اور صدمے کا شکار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حواس باختگی کا بھی...... چڑیا پہلی بار ان کے لیے کسی کے سامنے رُسوائی اور ندامت کا باعث بنی تھی۔ وہ بھی کس کے سامنے شہباز حسین کی سابقہ بیوی کے سامنے...... اور کس چیز کے لیے...... بھرے بازار میں جیسے ایک بار پھر کسی نے اس کی ریڑھی اُلٹا دی تھی...... اور کچھ ویسی ہی حالت عکس کی ہو رہی تھی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے نانا کے سامنے کبھی کوئی اس کی ایسی شکایت کرے گا اور اسے صفائی دینی پڑے گی۔

''نانا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں شہر بانو کی ممی سے خود بات کرلوں گی۔ انہیں اور شہر بانو کو غلط فہمی ہو رہی ہے اور اس کی وجہ اس کیس پر شیر دل کی حمایت ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے بالآخر خیر دین کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت وہ مکمل طور پر حواس باختہ تھی۔

''جواد کے گھر والوں نے شیر دل کی وجہ سے رشتہ ختم کیا تھا؟'' خیر دین نے اس کے سر پر جیسے ایک اور بم پھوڑا۔ پتا نہیں خیر دین آج کتنے انکشافات کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر لفظ ڈھونڈنے کی جدوجہد کرنے لگی۔

''آپ سے کس نے کہا؟'' اس نے بہ مشکل خیر دین سے پوچھا۔

''شہر بانو کی ممی نے ہی بتایا۔'' عکس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ندامت سی ندامت تھی وہ امریکا میں بیٹھے ہوئے بھی سب کچھ جانتی تھیں۔

''نانا میں شیر دل سے محبت کرتی ہوں، میں زندگی میں ایک شیر دل سے زیادہ کسی کو نہیں چاہ سکتی لیکن مجھے اس کی زندگی کا ساتھی بننے کی تمنا نہیں ہے۔ یہ ایک خواب میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بھرّا گئی تھی۔ ''میں نے اس سے تب بھی شادی نہیں کی جب وہ غیر شادی شدہ تھا تو اب اس کا گھر توڑ کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کیوں کروں گی میں......؟ میں نے آپ سے یہ نہیں سیکھا...... میں شہباز کا کوئی بدلہ شہر بانو سے نہیں لوں گی، نہ ہی آپ ایسا سوچیں۔ اس نے اپنے اعتراف سے خیر دین کو ششدر کر دیا تھا۔ اسے عکس سے اس اعتراف کی توقع تھی نہ اس کے اس طرح کمزور پڑنے کی۔

''میں شیر دل کو بُلوا کر اس سے بات کروں گا۔'' خیر دین کو خود سمجھ نہیں آئی کہ اس کے منہ سے یہ جملہ کیوں

نکلا تھا۔ وہ آخر شیر دل کو بُلوا کر اس سے کیا بات کر سکتا تھا۔

''نانا آپ اس سے کچھ بات نہیں کریں گے، نہ ہی اس سے کوئی شکایت کریں گے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ میں نہیں چاہتی اس کے لیے مزید شرمندگی کا کوئی ذریعہ بنے آپ کی کوئی شکایت یا بات......''

عکس نے فوری طور پر خیر دین سے اختلاف کیا تھا۔

خیر دین بہت دیر چُپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم پر بداعتمادی یا بے یقینی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے میرے لیے چڑیا...... میں تم پر اندھا اعتماد کرتا ہوں لیکن اندھا نہیں ہو سکتا۔ شہر بانو کی ماں ایک اچھی عورت ہے۔ بہت احسانات ہیں اس کے ہم پر۔'' عکس چُپ چاپ خیر دین کی بات سننے لگی۔ اس نے ساری زندگی خیر دین کو لوگوں کے احسانات گنواتے دیکھا تھا اور احسان فراموشی کو چُھپاتے۔ وہ اب بھی سننا چاہتی تھی کہ اس کے پاس شہر بانو کی ماں کے حوالے سے گنوانے کے لیے کون سے احسانات تھے۔

☆☆☆

شرمین کو بالکل توقع نہیں تھی کہ عکس انہیں خود کال کر سکتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے عکس کو اس کی خیر دین کو کال کی توقع نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں انہیں بھی یہی توقع تھی کہ وہ کبھی اتنی ہمت نہیں کر پائے گی کہ اس ایشو پر بات کرنے کے لیے انہیں بھی کال کرتی لیکن اس نے کر دی تھی۔

چند سیکنڈز کے لیے فون پر اس کا نام سننے پر انہیں سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ فون بند کریں' اس کی بات سننے سے انکار کریں یا اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے پر اس پر چلّائیں۔

''ہیلو۔'' عکس نے انہیں اس طرح خاموش پانے پر بے ساختہ ان کی لائن پر موجودگی چیک کی تھی۔

''میں سُن رہی ہوں۔'' شرمین نے بے حد سرد مہری کے ساتھ کہا۔ زندگی میں انہوں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ آکورڈ سچویشن میں کبھی نہیں پایا تھا۔

''مسز فاروق آپ کو میرے اور شیر دل کے حوالے سے جو غلط فہمی ہے، میں اسے کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔''

عکس نے کسی تمہید کے بغیر کہا تھا۔ ''شیر دل ایک دوست ہے اور بیچ میٹ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' شرمین نے بے حد خفگی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

''کولیگ اور بیچ میٹ... آدھی رات کو ایک دوسرے کے بیڈروم میں نہیں پائے جاتے۔'' عکس سے بات نہیں ہو سکی۔ وہ اس پر بڑا سنگین الزام لگا رہی تھیں لیکن کس طرح۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔'' اس نے جیسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا۔

''میں کیا کہہ رہی ہوں تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ پچھلی بار جب تم سے میری بات ہوئی تھی تو کہاں تھی تم؟ کس کے فون پر تم نے مجھ سے بات کی تھی اور رات کے کس وقت کی تھی؟ تم سنگاپور میں شیر دل کے بیڈروم میں اس کے فون سے بات کر رہی تھیں اور تم مجھے کہہ رہی ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے، تمہاری یادداشت کمزور ہو گی میری نہیں۔'' ایک زلزلہ وہ تھا جو ریسیور کے دوسری طرف موجود عکس نے اپنے گرد آتا محسوس کیا تھا اور دوسرا زلزلہ وہ تھا جو دروازے میں کھڑی شرمین کی باتیں سنتی ہوئی شہر بانو کے اندر آیا تھا۔ شرمین نے ایک بار بھی عکس کا نام نہیں لیا تھا لیکن وہ سیکنڈز میں ان کی مخاطب کو بُوجھ گئی تھی اور گفتگو کی نوعیت سننے کے بعد اسے لگا

تھا کہ وہ وہیں گر جائے گی۔ اس کے پاؤں یک دم جیسے مَن مَن بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ شیر دل پر مسلسل عکس کے ساتھ افیئر کا الزام لگا رہی تھی۔ اس سے محبت کرنے پر اسے معتوب ٹھہرا رہی تھی لیکن وہ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شیر دل اور عکس کا رشتہ کبھی ان حدوں کو چھو سکتا تھا۔ شیر دل اتنا گر سکتا تھا۔

شرمین کو آخری جملہ بولتے بولتے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا تھا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ گردن موڑنے پر انہیں کھلے دروازے میں کھڑی شہر بانو نظر آئی تھی جس کا چہرہ اس طرح فق تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شرمین بھی فریز ہو گئیں پھر انہوں نے عکس سے کچھ بھی کہے بغیر لائن ڈسکنکٹ کر کے فون آف کر دیا تھا۔ انہوں نے شہر بانو کو سہارا لے کر کمرے کے دروازے کے ساتھ والی دیوار کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھتے دیکھا۔ وہ جیسے خود کو گرنے سے بچا رہی تھی۔ شرمین سب کچھ چھوڑ کر بے اختیار لپک کر اس کے پاس آئی تھیں۔ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، وہ بے حد سرد ہو رہا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' شرمین نے بے ساختہ اس کے سر و پڑتے ہوئے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ؟'' اس نے جواباً جیسے بہ مشکل شرمین سے کہا تھا اس کی آواز جیسے کسی کھائی سے آ رہی تھی۔ وہ ماں کی طرف دیکھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

''میں تمہیں اس تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔'' شرمین نے رنج کے عالم میں اس سے کہا۔ ''میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا جس پر تمہیں اتنا ناز تھا۔'' وہ اس کا مذاق نہیں اُڑا رہی تھیں لیکن شہر بانو کو یونہی لگا تھا جیسے شرمین نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اُڑایا تھا، جیسے ساری دنیا ہنستے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

''میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا۔ جس پر تمہیں اتنا مان تھا۔'' گھر......کون سا گھر؟...... مان......کون سا مان؟......رشتہ کون سا رشتہ......؟ اعتبار......کون سا اعتبار۔

کُھلے دروازے سے مثال اندر آئی تھی۔ ایک ٹیڈی بیئر ہاتھ میں پکڑے...... ماں اور شرمین کی کیفیت سے بے خبر......اور اس نے اندر آتے ہی ہمیشہ کی طرح وہی ایک بات کہی تھی جو وہ صبح شام سیکڑوں بار دُہراتی تھی۔

''ممی مجھے پاپا کے پاس جانا ہے، میں ان کو مِس کر رہی ہوں۔'' شہر بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر اس نے کہا۔

''تمہارے پاپا مر چکے ہیں۔'' مثال نے عجیب خوف اور بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔ پھر شرمین کو......

☆☆☆

ایک زلزلے کی لپیٹ میں آئے ہوئے شخص کی طرح عکس نے شرمین کے فون بند کر دینے کے بعد بھی کئی بار اسے کال ملانے کی کوشش کی تھی۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اسے پہلی بار اب ہوا تھا اور ساتھ شیر دل کی پریشانی کا بھی......وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی بھی طرح سے کسی کی ازدواجی زندگی میں آنے والے بھونچال کا ذمے دار قرار دی جا سکتی تھی اور وہ بھی شیر دل کی زندگی میں......

اسے اندازہ نہیں تھا کہ شرمین نے خیر دین سے کیا کہا تھا......کیا یہ سنگین اور گھٹیا الزام انہوں نے نانا کے

سامنے بھی دُہرایا تھا؟ اسے جیسے شرم آئی تھی لیکن اگر خیر دین سے شرمین نے ایسی کوئی بات کی ہوتی تو وہ اس کے بارے میں بھی پوچھتا۔ وہ جیسے مکڑی کے جالے کے تار میں اُلجھی لٹک رہی تھی، زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے اس طرح کی مدد لی تھی اور وہ مدد اب اس کے حلق میں ہڈی بن کر اٹک گئی تھی۔ وہ اب بُری طرح پچھتا رہی تھی کہ اس نے شیر دل کا فون استعمال کیوں کیا...... کر لیا تھا تو شرمین کی کال کیوں لی...... لیکن بعض دفعہ بدقسمتی انسان سے وہ کام کروا رہی ہوتی ہے جو وہ عام حالات میں کبھی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

اس دن اس نے ایک بار پھر شیر دل سے رابطہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی اور ایک بار پھر ناکام رہی تھی۔ اس کا سیل فون ہمیشہ کی طرح بند تھا اور اس کے والدین کی لاہور کی رہائش گاہ سے اس کے ''غیر موجود'' ہونے کی خبر کے علاوہ کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ عکس کو اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا اور اسے ہی نہیں شاید ساری دنیا کو نظر انداز کر رہا تھا کیونکہ اس کی ازدواجی زندگی میں ہونے والے سارے مسئلے اس کی وجہ سے ہوئے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ اس سے رابطہ مستقل طور پر منقطع رکھ کر وہ اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا۔

وہ ایک کے بعد ایک توجیہہ پیش کرتی اور اسے رد کرتی رہی پھر اس نے جیسے خود بھی یہی طے کیا تھا کہ وہ شیر دل سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اگر اس کو لگتا تھا کہ وہ اس کی مدد کے بغیر اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا تو پھر اسے شیر دل کو یہ کام کرنے دینا چاہیے تھا۔

''نانا آپ سجاد سے میری شادی طے کر دیں۔'' شرمین سے ہونے والی گفتگو کے تیسرے دن رات کے کھانے کے بعد اس نے خیر دین سے کہا تھا۔ حلیمہ اگلے ویک اینڈ پر پاکستان سے واپس جا رہی تھی اور اس نے اپنی سسرال سے فون کر کے اس صبح عکس سے سجاد کے سلسلے میں دوبارہ بات کی تھی۔ خیر دین اس کی بات پر حیران ہو گیا تھا۔

''لیکن تم تو پہلے ملنا چاہتی تھیں اس سے۔''

''ہاں لیکن اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ امی مل چکی ہیں اس سے...... آپ بھی مل لیں۔ اس کی فیملی ایک فنکشن میں مجھ سے مل چکی ہے۔ ہم دونوں کی ایک ملاقات کی اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کو وہ ٹھیک لگتا ہے تو بس کافی ہے۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور اس کی یہ سنجیدگی خیر دین کو جیسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ شادی کے لیے اس طرح فوری طور پر مان جانا...... اور وہ بھی لڑکے سے ملے بغیر جبکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ ملے بغیر کسی بھی لڑکے سے شادی کے خلاف تھی اور خیر دین کو بھی ہمیشہ یہی مناسب لگا تھا کہ وہ لڑکے سے خود مل لے اگر اسے مناسب لگتا پھر ہی وہ لوگ بات آگے بڑھاتے۔

خیر دین نے اس سے وجہ پوچھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ انہیں لگا تھا وہ شیر دل کے معاملے کی وجہ سے شادی میں جلدی کرنا چاہتی تھی۔ شرمین کے حوالے سے بھی ان دونوں کے درمیان اس ایک گفتگو کے علاوہ کوئی اور گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ عکس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خیر دین سے شرمین کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی تفصیلات جاننے پر اصرار کرتی، نہ ہی شرمین کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کو وہ خیر دین کے سامنے دُہرا سکتی تھی لیکن اسے یہ احساس ہوا تھا کہ شرمین نے شاید خیر دین سے اس واقعے کا ذکر کیے بغیر اس پر الزامات لگائے تھے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو وہ اس کے لیے شرمین کی بہت احسان مند تھی اور احسان مندی کی بعض شکلیں مذاق سے کم

نہیں لگتیں۔

اگلے چند دنوں میں خیر دین نے سجاد کی فیملی کو بُلوا کر عکس کے نہ چاہنے کے باوجود اس کی اور سجاد کی ملاقات کروا دی تھی۔ وہ ایک مناسب شکل صورت کا ایک اچھا قابل ڈاکٹر تھا اور اچھا بیک گراؤنڈ تھا اس کا...... عکس اور اسے دونوں کو اپنے پانچ سالہ دورِ تعلیم کے دوران کسی آمنے سامنے کی کوئی یاد ہیں نہیں تھیں لیکن سجاد پھر بھی کلاس کی بہترین اسٹوڈنٹ کے طور پر اسے بہت اچھی طرح یاد رکھے ہوئے تھا اور اس حوالے سے اس کے لیے اچھی فیلنگز رکھتا تھا...... ایک اور مشکل مرحلہ آیا تھا اور ایک اور مشکل مرحلہ طے کر لیا تھا اس نے۔ اس بار منگنی کی کوئی باقاعدہ رسم نہیں کی گئی تھی صرف بات طے کر کے چند مہینوں بعد سجاد کے پاکستان کے اگلے وزٹ پر شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔

وہ جواد سے رشتہ طے ہوتے ہوئے خوش تھی لیکن سجاد سے نسبت طے ہوتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی بے حسی محسوس کی تھی یوں جیسے یہ کوئی آفیشل ورک تھا...... اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ناخوش نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا تھا لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی یا کم از کم خوشی نام کی اس شے کو محسوس نہیں کر پا رہی تھی جسے وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کی ''وجہ'' جانتی تھی لیکن وہ اس وجہ کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی......

اگلے چند ہفتوں میں اسے شیر دل کی چھٹی بڑھ جانے کا پتا چل گیا تھا۔ وہ اب چھ ماہ کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا اور اس کی سیٹ پر کسی اور کو تعینات کر دیا گیا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرنے کے باوجود بے نیاز نہیں رہ سکی تھی...... بے چینی اور اضطراب میں اس نے ایک بار پھر اس سے رابطے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور ایک بار پھر ناکام رہی تھی۔ اس کے سیل فونز آف تھے اور یہ ایک تشویشناک بات تھی...... کوئی بھی مہینوں اپنے سیل فون آف نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے کسی بیچ میٹ سے رابطے میں نہیں تھا۔ اس نے چند بار اس کے والدین کے گھر پر خود فون کیا تھا لیکن ہر بار اسے یہی پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں ہے لیکن وہ کہاں ہے کب آئے گا اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ دونوں اس سے پہلے بھی مہینوں ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں رہتے تھے لیکن اس نے ایسا اضطراب اور وحشت کبھی محسوس نہیں کی تھی کیونکہ اسے شیر دل کی خیر خبر ملتی رہتی تھی، وہ کہاں

تھا کیا کر رہا تھا پتا چل جاتا تھا لیکن اب جیسے وہ صفحۂ ہستی سے ہی غائب ہو گیا تھا۔

تقریباً دو ماہ کے بعد بالآخر جیسے اس کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔ وہ اس دن بھی شیردل کے گھر کال کر رہی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح فون آپریٹر نے ہی اٹھایا تھا۔ وہ نیا آپریٹر تھا اور اس نے اس کا تعارف لینے کے بعد شیردل سے اس کی بات کروانے کے بجائے منزّہ کے ساتھ لائن ملا دی تھی۔ وہ منزّہ کی آواز سننے پر چند سیکنڈز عجیب گومگو کے عالم میں رہی جیسے طے نہ کر پا رہی ہو کہ اسے ان سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ایک نیا پنڈورا باکس نہیں کھولنا چاہتی تھی۔

چند ہی منٹوں بعد اس کا فون بجنے لگا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور اس کا دل یک دم جیسے خوشی سے اُچھلا تھا۔ وہ شیردل کے گھر کا نمبر تھا وہاں سے کال بیک ہو رہی تھی یقیناً آپریٹر نے شیردل کو اس کی کال کے بارے میں اطلاع دی تھی۔

اس نے بہت ایکسائٹمنٹ کے عالم میں فون اٹھایا، آپریٹر نے اسے اطلاع دی تھی کہ منزّہ اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ شش و پنج میں پڑی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اُن سے بات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتی اس نے دوسری طرف سے ان کی آواز سن لی وہ اس بار اس کا نام لے کر اسے مخاطب کر رہی تھیں یعنی وہ جانتی تھیں کہ وہ کس کو کال بیک کروا رہی تھیں۔ اس نے بڑے محتاط سے انداز میں منزّہ سے علیک سلیک کی۔

”میں شیردل کی خیریت دریافت کرنا چاہتی تھی۔ بہت دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی تھی کچھ آفیشل کام بھی تھا۔“ اس نے چھوٹتے ہی منزّہ کو بتایا اور ساتھ ہی جھوٹ بولنا بھی ضروری سمجھا۔

”شیردل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے اسے منزّہ کی آواز بے حد بجھی ہوئی لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اسے یک دم تشویش ہوئی۔

”نروس بریک ڈاؤن...... بہت زیادہ ڈپریسڈ ہے وہ...... ڈاکٹر نے ریسٹ کے لیے کہا تھا...... بار بار بیمار ہو رہا ہے وہ؟“

عکس تشویش سے سنتی رہی۔

”آپ اس سے میری بات کروا دیں۔“ اس نے اُن کی بات سننے کے بعد کہا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے کہا۔

”میں نے شیردل سے کتنی بار کہا ہے کہ تم سے بات کرے یا مل لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کسی سے بھی بات نہیں کرتا...... کسی دوست سے نہیں ملتا۔ گھر سے نکلتا ہی نہیں۔ میں پورا ایک مہینہ اس کو ساتھ لے کے مری گزار کر آئی ہوں کہ کچھ بہتر ہو جائے گا لیکن چند دن ٹھیک رہتا ہے پھر دورے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں تم اس سے ملنے کے لیے آؤ...... آ کر سمجھاؤ اُسے۔ تم سے تو بہت کلوز تھا۔“

عکس نے ان کی آواز میں اُتری بے بسی محسوس کی۔ وہ عام حالات میں کبھی اس سے مدد نہیں مانگ سکتی تھیں، کبھی اس سے یہ ساری گفتگو نہیں کر سکتی تھیں لیکن شیردل کی حالت نے منزّہ کو جیسے عجیب خوف اور وسوسوں کا شکار کر دیا تھا۔

”میں آؤں گی اسے دیکھنے۔“ عکس نے ایک لمحے کے تذبذب کے بغیر کہا، کوئی دوسرا جواب اس کے پاس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اور اس نے وہاں جانے میں دیر نہیں کی تھی، وہ دوسرے دن آفس سے جلدی فارغ ہونے کے بعد لاہور چلی آئی تھی۔ منزّہ نے خلافِ توقع بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ ان سے گفتگو کے دوران عکس کی تشویش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ منزّہ خود بھی شیردل کی وجہ سے بہت زیادہ ڈپریسڈ تھیں۔ شیردل کی وجہ سے ان کی سوشل سرگرمیاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ سائے کی طرح ہر وقت شیردل کے ساتھ رہتی تھیں۔ انہوں نے شہباز حسین کو اسی Phase سے اسی تکلیف دہ انداز میں گزرتے دیکھا تھا اور وہ اپنی اولاد کو ویسے انجام سے بچانے کے لیے ہلکان ہو رہی تھیں۔ وہ رعونت اور غرور یک دم جیسے کہیں اُڑ گیا تھا جو منزّہ بختیار کی پہچان تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران وہ کئی بار بات کرتے کرتے رو پڑی تھیں۔ شیردل کی بیماری اُن کے اپنے اعصاب کو مفلوج کر رہی تھی اور اس پر ان کی اپنی فیملی کا اس سارے مسئلے کے لئے انہیں موردِ الزام ٹھہرانا اور وہ احساسِ جرم سے فرار کے لیے ڈوبتے کی طرح تنکے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ عکس مراد علی بھی ایسا ہی ایک تنکا تھا جس سے وہ اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ان سے بات چیت کے دوران ہی عکس کو یہ پتا چلا کہ شیر بانو اور شیردل کی طلاق ہو گئی تھی، دونوں فیملیز کے کچھ مشترکہ دوستوں اور رشتے داروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود شہر بانو نے طلاق کے لیے کیس فائل کر دیا تھا۔ نکاح نامے میں طلاق کا حق اور بچے کی کسٹڈی کا حق پہلے ہی اسے تفویض کیے جا چکے تھے اس لیے کیس کو اس کے حق میں ختم ہونے میں چند ہفتے لگے تھے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ منزّہ سے یہ سب سنتی رہی۔

تبھی وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی عکس کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ منزّہ نے اس کی بیماری اور تکلیف کے بارے میں کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں اور کم و بیش پندرہ کلو وزن کی کمی کے بعد کوئی بھی اسے دیکھ کر صحت مند نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ بالوں میں اب جگہ جگہ سفید بال دِکھ رہے تھے۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آ رہی ہو۔“ اس نے اندر آتے ہی بڑے معمول کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود جواباً مسکرا نہیں سکی۔

”کیسے اطلاع دیتی، تم نے تو فون ہی بند کیے ہوئے ہیں سارے۔“ اس نے عکس کی اس بات کا جواب

نہیں دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا سگریٹ کا پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے وہ خود اس کے ساتھ والے صوفے کے کونے میں بیٹھ گیا تھا۔

''تم لوگ باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں۔'' منزّہ واضح طور پر انہیں اکیلے باتیں کرنے کا موقع دینا چاہتی تھیں۔

''میرا خیال ہے ہم لوگ باہر کا چکر لگا آتے ہیں، مجھے ایک دو کام بھی ہیں وہ بھی کرلوں گی۔'' عکس نے یک دم اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں ضرور بلکہ اچھا ہے شیر دل بھی بہت دنوں سے باہر نہیں نکلا، اسی بہانے اس کی بھی تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی۔'' منزّہ نے ایک لمحے کا تامل بھی نہیں کیا تھا۔ شیر دل نے حیران اور الجھی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا پھر جیسے بادلِ ناخواستہ وہ اٹھ گیا تھا۔

''کیا کام ہیں تمہیں؟'' اس نے گاڑی سڑک پر لاتے ہی عکس سے پوچھا تھا وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔

''تمہیں میری کالز اور میسجز مل رہے تھے نا؟'' عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''ہاں۔'' شیر دل نے کوئی بہانہ بنائے بغیر کہا۔

''اور تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔''

''فائدہ کیا تھا؟'' وہ سڑک کو دیکھتے ہوئے عجیب بے بسی سے بولا۔

''تم نے حالت دیکھی ہے اپنی؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے عکس کی بات کاٹی اور گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

''کیا ہوا؟'' عکس نے کچھ حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

''تم ڈرائیو کرو، میں مین روڈ پر ڈرائیو نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟''

''میرا سر چکرانے لگتا ہے بہت ساری گاڑیاں اور ان کی اسپیڈ دیکھ کر دو دفعہ گاڑی مار چکا ہوں اور تم guest ہو میں نہیں چاہتا تمہیں ایمبولینس کی ضرورت پڑے۔'' وہ بات کو خوش دلی سے کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ عکس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

''مین روڈ پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کسی چھوٹے موٹے پارک میں چلو۔''

''شام ہو رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا تھا پھر دروازہ بند کر کے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اگلا موڑ مڑتے ہی بچوں کے ایک پلے ایریا کے سامنے اس نے گاڑی روک دی تھی۔

''آنٹی نے مجھے بتایا کہ تمہاری divorce......'' پارک کی ایک بینچ پر آ کر بیٹھنے اور چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے شیر دل سے کہنے کی کوشش کی۔ شیر دل نے اسے ٹوک دیا۔

''بس اب اس ایشو کے بارے میں بات مت کرنا...... کوئی اور بات کرو۔'' وہ جیسے تکلیف میں کراہا تھا یوں جیسے اس کے ہاتھ سے اس کا کوئی کھرنڈ کھرچا گیا تھا۔ عکس کا دل بُری طرح دُکھا۔

''جاب پہ واپس کیوں نہیں آرہے؟'' اس نے بات بدل دی۔
''آجاؤں گا۔'' اس نے اسی بیزاری سے کہا۔ وہ اب سگریٹ سلگا رہا تھا۔
''ٹینس کیسی چل رہی ہے تمہاری۔'' اسے پہلی بار شیر دل کے لیے سوال ڈھونڈتے ہوئے دقت ہو رہی تھی۔
''چھوڑ دی۔'' وہ ایک کش لیتے ہوئے ایک جھولے پر جھولتی بچی کو دیکھنے لگا، عکس نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔
''تم اتنے کمزور تو نہیں تھے شیر دل۔'' عکس نے اس کی توجہ بٹائی۔
''میں سوچ رہا تھا اب تک تمہاری شادی ہو چکی ہو گی...... کافی مہینے گزر چکے ہیں۔'' شیر دل نے اس کے سوال کے جواب میں اس سے بات بدل کر کہا۔ ''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے، کیسا ہے جواد؟''
''اگر تم میرے بھی سوالوں کا جواب نہیں دو گے تو میں بھی نہیں دوں گی۔''
''یہ تو بہت اچھا ہے سوال جواب کر کے کیا کرنا ہے ہم نے...... ایسے ہی خاموش بیٹھتے ہیں۔'' وہ دوسرا سگریٹ نکالنے کے لیے پیک اٹھانے لگا جب عکس نے ہاتھ بڑھا کر اس سے پہلے پیک اٹھا لیا۔
''مشکل وقت ہے لیکن گزر جائے گا شیر دل۔'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا پھر اس نے بینچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
''ہاں گزر جائے گا لیکن فی الحال نہیں گزر رہا۔''
''اس طرح گزارنے سے نہیں گزرے گا، تم جاب پر واپس آؤ۔''
''آجاؤں گا، ساری زندگی گھر میں بیٹھ کے تو نہیں گزار سکتا میں۔'' اس نے بیزاری سے کہتے ہوئے عکس کے ہاتھ سے سگریٹ کا پیک لینے کی کوشش کی۔
''مجھے استھما ہے تم اگر پھر بھی میرے پاس بیٹھ کر اسموکنگ کرنا چاہتے ہو تو لو کرو۔'' عکس نے نرمی سے وہ پیک اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جیسے کچھ دیر پیک ہاتھ میں لیے الجھتا رہا پھر اس نے پیک رکھتے ہوئے کہا۔
''تم جانتی تھیں میرے ساتھ کیا ہوا لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے کال کر کے میرا حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔'' وہ بالآخر اپنے دل کا غبار نکالنے لگا تھا۔
''مجھے بہت دیر سے پتا چلا کئی دن بعد۔''
''جھوٹ مت بولو۔'' شیر دل نے اسے ٹوکا۔
''تمہارا ذاتی معاملہ تھا یہ اور میں کیسے......''
''shut up'' شیر دل نے اس بار پھر اس کی بات کاٹی۔
''تم اس وجہ سے خفا تھے مجھ سے؟'' عکس نے بالآخر ایک گہری سانس لے کر کہا۔
''تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا تھا...... تمہیں کم از کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔''
''میں نے تمہیں کالز اور میسیج کیے تھے۔''
''کئی دن بعد آئے تھے وہ میسیج۔'' اس نے پھر بات کاٹ کر کہا۔
''اور پھر کئی مہینے میں جو کالز اور میسیج تمہیں کرتی رہی وہ......'' وہ اب ایک دوسرے سے اسی طرح بات کرنے لگے تھے جیسے ہمیشہ کرتے تھے۔ وہ دقت، دشواری آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھی۔

''وہ اگلے ماہ شادی کر رہی ہے۔'' مدھم آواز میں کہے ہوئے جملے پر عکس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اسے اس ''وہ'' کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی کہ وہ بھی اگلے مہینے شادی کر رہی تھی۔

''کس سے؟''

''کزن ہے ایک اس کا...... داؤد۔''

''میں جانتی ہوں تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ہے یہ۔'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں، میرے لیے یہ سب تکلیف دہ نہیں ہے، مجھے اس عورت میں دلچسپی نہیں ہے اب...... لیکن میرے لیے تکلیف دہ بات صرف یہ ہے کہ میں مثال سے الگ ہوں' میں اسے دیکھ نہیں پا رہا، اس سے بات نہیں کر سکتا مجھے اس کا خیال آتا ہے تو میں سو نہیں پاتا۔'' وہ بے بسی اور تکلیف سے کہہ رہا تھا۔

''وہ کب تک ایسا کر سکتی ہے...... ابھی غصے میں ہے...... تھوڑا ٹائم دو اُسے...... چند مہینے...... پھر سب کچھ نارمل ہونا شروع ہو جائے گا، پھر وہ اپنی زندگی میں بزی ہو جائے گی پھر اسے احساس ہوگا کہ وہ مثال کو ساری زندگی کے لیے تم سے دور نہیں رکھ سکتی۔'' عکس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''تب تک مثال مجھے بھول جائے گی۔'' شیر دل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''تم امریکا جا کر اس سے مل آؤ۔''

''میرا ویزا کینسل کر دیا ہے امریکن ایمبیسی نے...... شہربانو نے میرے خلاف رپورٹ کی ہے کہ میرے امریکا آنے سے اُسے اور مثال کو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔ عکس کچھ دیر بول نہیں سکی۔ وہ اب سمجھ پا رہی تھی کہ اس کا اگر نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا تو بلاوجہ نہیں ہو گیا تھا، شہربانو کی جذباتیت نے اسے دیوار سے لگا دیا تھا۔

''شہربانو ایسی نہیں تھی۔ میں حیران ہوں اس نے......'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''شہربانو ایسی ہی تھی اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے تمہیں بہت شروع میں بتا دیا تھا کہ وہ بہت جذباتی ہے۔ وہ بہت ناپختہ کار ہے، میری اور اس کی شخصیت میں بہت فرق ہے لیکن تم مجھے مجبور کرتی رہی تھیں۔ وہ کم عمر ہے اس لیے ایسی ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی صرف سپورٹ ملنے کی دیر ہے...... وہ تم سے پاگلوں جیسی محبت کرتی ہے تمہارے ساتھ رہے گی تو یہ چھوٹی موٹی خامیاں چلی جائیں گی۔ اس شادی میں تم نے مجھے پھنسا دیا......'' وہ اس پر برسنے لگا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شہربانو نے اس کے سارے اندازے اور توقعات غلط ثابت کر دی تھیں۔

☆☆☆

اس رات وہ بہت دیر سے واپس گھر پہنچی تھی۔ خیر دین ہمیشہ کی طرح اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

''بہت دیر ہو گئی۔''

''جی نانا۔''

''کیا کام تھا لاہور میں؟'' وہ اس غیر متوقع سوال پر خیر دین کی شکل دیکھنے لگی۔ لاہور جانا اس کا معمول تھا اور خیر دین کبھی وہاں کام کی نوعیت اور اس کی مصروفیات کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔

''شیر دل کی عیادت کے لیے گئی تھی، وہ بیمار ہے۔'' اس نے بھی یک دم جیسے خیر دین سے جھوٹ بولنے کا

ارادہ ترک کرتے ہوئے اسے صاف صاف بتایا۔

''کیا ہوا اسے؟'' خیر دین چونک گیا تھا۔

''ڈپریسڈ ہے بہت زیادہ...... بہت کمزور ہو گیا ہے۔'' وہ مدھم آواز میں کہہ کر اندر چلی گئی۔ خیر دین وہیں کھڑا رہا۔

اپنے بیڈروم میں آ کر اس نے ابھی اپنا بیگ رکھا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے بیگ میں سے سیل فون نکال کر اسے دیکھا، اس پر شیر دل کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''تم گھر پہنچ گئی ہو؟'' علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں، ابھی ابھی پہنچی ہوں۔'' وہ فون پر بات کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگی۔

''آج بہت دیر ہو گئی تمہیں لاہور سے نکلتے ہوئے، مجھے تمہارے جانے کے بعد وقت کا اندازہ ہوا اس لیے فون کر کے پوچھ لیا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی کافی دیر سے لاہور سے نکلی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح بے مقصد باتیں کرتے رہے۔ وہیں پارک میں بیٹھے پھر شیر دل ایک قریبی ریسٹورنٹ میں اس کے منع کرنے کے باوجود اسے کھانا کھلانے لے گیا۔ عکس کو اندازہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے مزید دیر ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

''اینڈ آئی ایم سوری۔'' وہ اس کے اگلے جملے پر حیران ہو گئی تھی۔

''یہ کس لیے؟''

''ابھی بیٹھ کے سوچ رہا تھا تو مجھے احساس ہوا تم سے بہت ساری الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں میں نے...... جو نہیں کہنی چاہیے تھیں جو کچھ ہوا اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں تھا۔'' وہ اب کچھ نادم سا کہہ رہا تھا۔

''لیکن آج کل بس اسی طرح کی باتیں کرتا پھر رہا ہوں کچھ سمجھ نہیں آتا کون سی بات کس سے کہنی چاہیے اور کس سے نہیں۔ صرف اس لیے میں کسی سے بھی بات نہیں کر رہا۔'' وہ جیسے بڑی بے بسی کے عالم میں اس سے اپنی شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔

''تم مجھ سے تو بات کر سکتے ہو اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر دو...... ساری عمر تم نے اس بات کی پروا نہیں کی تو اب تمہیں یک دم گفتگو کے آداب کیسے یاد آ گئے؟'' شیر دل اس کی بات پر ہولے سے ہنس پڑا۔ وہ اس کا طنز سمجھ گیا تھا۔

''نہیں، اتنی الٹی سیدھی باتیں بھی نہیں کی ہیں تم سے...... صرف تمہیں الٹی سیدھی لگتی رہی ہیں۔''

''اسی لیے کہہ رہی ہوں مجھ سے بات کر سکتے ہو تم...... تمہاری الٹی سیدھی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے میں مہارت ہے مجھے۔'' وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا چلو بس میں نے یہی پوچھنا تھا پھر بات کریں گے۔'' شیر دل نے یکدم بڑے abrupt انداز میں فون بند کر دیا تھا۔

وہ فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ وہ clinically depressed تھا اور اسے شیر دل کو اس طرح دیکھ کر بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً پانچ گھنٹے اکٹھے بیٹھے رہے تھے اور وہ تقریباً چار گھنٹے مثال کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کا ہر دوسرا جملہ اس بات پر ختم ہو رہا تھا۔ ''شہربانو میرے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتی ہے...... "What have I done to deserve all this" (میں نے ایسا کیا برا کیا ہے جس کی سزا مجھے ملے)

اور اس ایک سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن ہر بار اس کا یہ جملہ عکس کو عجیب سے احساسِ جرم کا شکار کر دیتا تھا شیر دل کی زندگی کے اس میس کا آغاز اس کی کوششوں سے ہوا تھا جو اس نے اپنی زندگی کے میس کو صاف کرنے کے لیے کی تھیں کہیں نہ کہیں وہی اس سارے مسئلے اور خرابی کی ذمے دار تھی اور وہ اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا پارہی تھی۔ شیر دل کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ جاتی پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کرتی کہ اس کے کسی اقدام سے کسی دوسرے کی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب خود وہ بھی اس طرح ایسی کسی فیملی کے ہاتھوں مسائل کا شکار ہو چکی ہوتی...... لیکن یہاں سارا فرق اس کے لیے شیر دل ڈال رہا تھا۔ ضمیر کی یہ ساری چبھن اسے اس ایک شخص کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ جسے وہ بری طرح چاہتی تھی اور جسے وہ کبھی تکلیف میں نہ دیکھنے کی خواہش کے باوجود تکلیف میں دیکھ رہی تھی۔

شیر دل نے اس سے شہر بانو کے اس کے ساتھ افیئر کے حوالے سے کوئی الزام نہیں دہرایا تھا وہ بھی اس کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی ان کے بریک اپ کی وجہ کون سے الزامات بنے تھے۔

اس رات عکس مراد علی سو نہیں سکی تھی۔ زندگی میں بہت سے درست سمجھے جانے والے فیصلے بہت غلط نتائج لے کر آتے ہیں اس کیس کو فائل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے عکس نے اسے بہت درست اور ضروری سمجھا تھا لیکن اس رات بیٹھ کر اس نے پہلی بار بہت غیر جانب داری اور حقیقت پسندی سے اس کیس کو فائل کرنے کے فیصلے پر دوبارہ غور کیا تھا بہت ساری زندگیاں متاثر ہوئی تھیں اور کس حد تک متاثر ہوئی تھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ فائدہ کیا ہوا تھا؟...... صرف ایک...... خیر دین پر سے وہ الزام ہٹ گیا تھا جس کی اب اسے پروا تک نہیں تھی جس کو کوئی یاد تک نہیں رکھے ہوئے تھا سوائے چڑیا کے...... کیونکہ وہ اس کے بچپن کا ناقابلِ فراموش زخم تھا۔

''ان جنگوں کو لڑنا بے وقوفی ہوتی ہے چڑیا جن میں ہونے والی جیت بھی ہماری زندگی کے لیے ضروری نہ ہو۔'' اسے خیر دین کی بات یاد آئی تھی۔ اپنے ماضی کی تباہی کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں اس نے کسی دوسرے کا مستقبل تباہ کر دیا تھا...... جو بھی کچھ ہوا تھا جان بوجھ کر نہیں ہوا تھا لیکن ہو گیا تھا۔

وہ ساری رات اپنے کمرے میں ٹہلتی رہی تھی، صبح ناشتے کی میز پر خیر دین نے اس کی سرخ سوجی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے چڑیا؟'' انہیں تشویش ہوئی۔

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ وہ چاہتی تھی خیر دین اس سے شیر دل کے بارے میں پوچھے...... کوئی بات کرے...... خیر دین نے جو کہا تھا اس نے عکس مراد علی کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

''تم سے ایک بات میں نے بھی چھپائی تھی چڑیا...... بہت بار بتانا چاہا لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر سکا۔'' وہ خیر دین کے جملے پر حیران رہ گئی تھی۔ اسے یک دم کون سا راز شیئر کرنا یاد آیا تھا۔ اس وقت تو وہ کچھ اور بات کر رہے تھے۔

''کون سا راز ہے نانا! جو آپ نے بھی مجھے نہیں بتایا؟'' خیر دین چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''شہر بانو کی ماں کئی سال پہلے ایک بار مجھ سے ملنے آئی تھی۔''

''میں جانتی ہوں نانا، آپ نے مجھے بتایا تھا۔'' عکس نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں لیکن میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ......'' وہ بات کرتے کرتے رکا اور اس کے اگلے جملے نے ڈاکٹر عکس مراد علی کو مٹی کر کے رکھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

اس اسٹینڈنگ مرر میں اپنے عکس پر پہلی نظر پڑتے ہی شہر بانو نے اپنی یادداشت کے سارے خانوں کو جسم سے اترے ہوئے لباس کی جیبوں کی طرح کھنگالنا اور جھاڑنا شروع کردیا تھا۔ کتنے سال بعد اس نے اس ہیرو کو دیکھا تھا اور اس مرر میں کیا کیا دیکھا تھا۔

آئینہ اتنے سالوں کے بعد آج بھی وہیں کا وہیں کھڑا تھا...... کم آب و تاب کے ساتھ لیکن اسی وقار کے ساتھ جس کے ساتھ شہر بانو نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ گھر کا ایکسٹیریئر مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ وہ آئینہ جیسے کسی شہزادی کا وہ رومال تھا جسے وہ پہاڑ کے پھٹنے اور اس کے اندر غائب ہوجانے سے پہلے شہزادے کی رہنمائی کے لیے باہر چھوڑ گئی تھی...... واحد سراغ...... ہر بھید تک لے جانے اور اسے پانے والا...... چند لمحوں کے لیے اس آئینے کو دیکھتے ہوئے شہر بانو کو یوں لگا تھا جیسے وہ تب ہی وہاں سے ہٹے گا، غائب ہوگا جب اسے کھڑے کھڑے دیمک لگ جائے گی پھر ایک دن وہ لکڑی کے فریم سے برادے کے ایک ڈھیر اور اس آئینے سے شیشے کے ٹکڑوں میں تبدیل ہوکر وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ پتا نہیں وہاں کھڑا وہ کس، کس کا عکس دیکھتا اور دکھاتا رہا تھا۔

شہر بانو نم آنکھوں کے ساتھ اس آئینے میں نظر آنے والی عمارت کے بیرونی حصے کے عکس کو دیکھنے لگی۔ انگلیوں کی پوروں پر اس نے جیسے دو سال گنے تھے جب وہ آخری بار اس گھر سے گئی تھی۔ وہ گھر جو اس کی زندگی کا خوب صورت ترین اور بدصورت ترین باب تھا۔ وہ گھر جس سے زیادہ محبت اور نفرت اسے کبھی کسی جگہ سے نہیں ہوئی تھی لیکن وہ گھر جو وہاں آکر بسنے والے انسانوں کے تمام احساسات سے بے نیاز آج بھی اسی تمکنت سے وہاں کھڑا تھا۔

پھر آئینے میں اپنے اور اس گھر کے عکس کے درمیان اس نے یک دم باذل کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار مسکرائی۔ اس نے زندگی میں اس مرد کے علاوہ صرف ایک مرد کو...... وہ آگے کچھ سوچ نہیں پائی۔

باذل اب اس کے عقب میں کھڑا اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اس کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "You look lovely"۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسے ایسی باتیں کرنے کی عادت تھی۔

"Thank you for flattering me"۔ شہر بانو نے جواباً کہا۔ باذل اس کے عکس پر نظر جمائے ہوئے بے اختیار مسکرایا۔ گہری، گرم جوش، بہت کچھ یاد دلا دینے والی آنکھیں...... بے حد باریک ہونٹوں پر آنے اور پھیلنے والی بے ساختہ اور خمار مسکراہٹ...... اور یہ مسکراہٹ کیا، کیا طوفان نہیں اٹھا دیتی تھی...... کون کون سی قیامت تھی جو برپا نہیں کردیتی تھی...... اسے اپنی بہو روشین کی شکایتیں یاد آئیں۔

"You are more than welcome"۔ باذل نے ذرا سا ہنس کر جیسے کسی ندامت کے بغیر بے حد دھڑلے سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے میں پہلی بار اس گھر میں کب آئی تھی؟" شہر بانو نے آئینے میں باذل کے عکس کے عقب میں موجود عمارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

وہ اب بھی اس کے کندھے پر اسی طرح دونوں ہاتھ جمائے ٹکائے کھڑا تھا۔ شہر بانو اس کے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کررہی تھی...... نرم، سہارا دیتا ہوا دباؤ۔ چند لمحوں کے لیے جیسے اس کا دل باذل سے لپٹ جانے کو چاہا۔

"جب......" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق سے نہیں نکل سکی۔ آنسوؤں کے ایک ریلے نے اس کی

قوتِ گویائی اور بینائی دونوں کو بیک وقت مفلوج کیا تھا۔ یاد نہیں تھیں..... درد کے آبلے تھے جو گرم پانی کے چشموں کی سطح پر ابھرنے والے بلبلوں کی طرح پھٹنے لگے تھے۔ کندھوں پر ٹکے وہ دونوں ہاتھ سرعت سے اس کے بازوؤں پر آئے پھر انہوں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ حصار جس نے زندگی میں کبھی اس کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا..... وہ حصار جو اس کے لیے ایک عطا تھا..... کسی کا تحفہ..... باؤل کے بازوؤں کے حصار میں روتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کون سے کانٹے پہلے نکال کر اسے دکھائے ..... وہ جو پاؤں میں تھے یا وہ جو دل میں تھے..... سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ جو یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی..... اس کو دوبارہ بھلانے کے لیے وہ کیا کرے گی۔

اس آئینے کے سامنے کھڑے اسے شہباز حسین یاد آتے تھے وہ اس گھر میں پہلی بار ان کے ساتھ آئی تھی اپنے ماں باپ کے ساتھ اور پھر وہ اور اس کی زندگی اس گھر کی بھول بھلیوں میں کہیں کھوگئی تھی اور پھر اسی گھر میں کئی سالوں بعد اسے بھول بھلیوں سے نکلنے کا راستہ دکھا تھا۔

اس گھر کے برآمدے میں لگا وہ آئینہ شہزادی تک پہنچانے والا واحد سراغ..... اب جیسے شہزادے کو اس پہاڑ کی اس کھوہ میں لے آیا تھا جہاں ایک شہزادی کو کئی سال پہلے گہری نیند سلادیا گیا تھا اور وہ شہزادی آنکھ کھلنے کے بعد ملکہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

''شہر بانو کی ماں نے ایک لاکھ روپے کا چیک دیا تھا مجھے اس وقت ..... میں نہیں لینا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے زبردستی مجبور کیا۔ وہ ان نقصانات کی تلافی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی جو اس کے شوہر کی وجہ سے مجھے اور تمہیں ہوئے۔''

عکس مراد علی گنگ خیر دین کو بولتے سنتی رہی وہ مدھم آواز میں بول رہا تھا۔

''میں نے اسی رقم سے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس وقت ایک لاکھ کی وہ رقم میرے بہت کام آئی تھی۔ وہ نہ ملتی تو شاید میں اور تم آج یہاں نہ کھڑے ہوتے۔ شہر بانو کی ماں نے بہت بڑا احسان کیا تھا ہم پر..... میرے کندھے آج بھی اس کے اس احسان کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں..... شہباز نے جو کیا وہ شہباز کا فعل تھا مگر اس کی بیوی نے ہمارے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی اور اس کی بچی بھی ویسی ہی نیک ہوگی۔ میں دعا کرتا رہتا ہوں اس بچی کے لیے..... گھر بڑی مشکل سے بنتے ہیں..... اللہ اس کے گھر کو سلامت رکھے۔ تمہیں شیر دل کو سمجھانا چاہیے تھا۔''

بعض دفعہ سانس لینا مشکل ہوجاتا ہے نظر ملانا اس سے مشکل اور سر اٹھانا اس سے دوبھر..... وہ بھی خیر دین کے سامنے بیٹھی اس وقت انہی کیفیات کا شکار ہورہی تھی..... شاک، بے یقینی، رنج اور شرمندگی..... وہ خیر دین کی کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ ان انکشافات نے اس کی عزتِ نفس کو مٹی کردیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کا نانا جھوٹ نہیں بولتا تھا۔

''مجھے آفس کے لیے نکلنا ہے نانا۔'' کئی منٹ ایک بت کی طرح بیٹھے حیرانی و پریشانی کے عالم میں خیر دین کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ بے ساختہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اسے اس ایک جملے میں بھی اپنی ہی آواز میں عجیب سی شکستگی اور لرزش محسوس ہوئی تھی اور اسے یقین تھا وہ دونوں چیزیں خیر دین سے بھی نہیں چھپی ہوں گی۔ وہ خیر دین کو اب شیر دل اور شہر بانو کی طلاق کے بارے میں نہیں بتانا چاہتی تھی، نہ ہی یہ کہنا چاہتی تھی

کہ..... جس گھر کی سلامتی کے لیے وہ دعائیں کررہا تھا وہ چند مہینے پہلے ٹوٹ چکا تھا۔

وہ اس صبح ایک عجیب سی ذہنی کیفیت کے ساتھ اس گھر سے نکلی تھی۔ خیر دین، شرمین سے کوئی مالی مدد لینے پر کیسے آمادہ ہوگیا تھا، اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ وہ یہ سب چڑیا کو اب کیوں بتا رہا تھا۔ وہ اسے کیا جتانا چاہتا تھا..... کیا باور کروا رہا تھا..... یہ کہ وہ شیر دل اور شہر بانو کے درمیان نہ آئے..... یہ کہ وہ ان کا گھر توڑنے کی کوشش نہ کرے..... کیونکہ ان کی زندگی پر شرمین کا بہت بڑا احسان تھا..... وہ بچی نہیں تھی اور بچی ہوتی تب بھی خیر دین کی پہیلیاں بوجھنا چڑیا کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا..... کہیں نہ کہیں خیر دین اس کے حوالے سے بداعتمادی کا شکار ہورہا تھا۔ شیر دل کے حوالے سے اس کا اعتراف سننے کے بعد شاید زیادہ ہوگیا تھا..... وہ بند باندھنے کی کوشش کررہا تھا جس سے اسے وہ روک لیتا اور جیسے شہر بانو اور شیر دل کا گھر بھی بچالیتا..... اور عکس کو اسی بات پر رنج ہورہا تھا..... وہ اس کا نانا تھا پھر بھی اسے اس پر شک ہوا تھا..... اپنی دی گئی تربیت اور عکس کے اس صاف اعلان کے باوجود کہ وہ شیر دل سے شادی نہیں کرنا چاہتی، وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ شیر دل کے ساتھ انوالوڈ تھی اور وہ اس سے ان دونوں کا گھر بچانے کی کوشش کررہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار چڑیا کو اپنے نانا سے گلہ ہوا تھا اسے دلی رنج ہوا تھا۔ اس دن وہ آفس میں بہت اپ سیٹ رہی پچھلے دن شیر دل سے ہونے والی ملاقات اور اس کی حالت دیکھ کر ہونے والا اضطراب وہ بھول گئی تھی۔ اگر کچھ اسے اب اضطراب میں ڈالے ہوئے تھا تو وہ خیر دین کا یہ انکشاف اور یہ رویہ تھا..... چاہنے کے باوجود وہ پورا دن شیر دل کو کال یا میسج نہیں کرسکی۔

شام کو وہ گھر واپس آئی تو یقیناً اس کا چہرہ اتنا ستا ہوا تھا کہ خیر دین صبح کی طرح اس بار بھی اس کی طبیعت کے بارے میں فکرمند ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

''میں ٹھیک ہوں نانا۔'' اس نے خیر دین سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''مجھے کیوں ٹھیک نہیں لگ رہیں؟'' خیر دین نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا اور اس کی اس بات پر عکس نے خیر دین کو بے حد شاکی نظروں سے دیکھا۔

''آپ کو اب میری بات پر یقین نہیں آتا اس لیے۔'' اس جواب میں جو سوال تھا اس کا جواب خیر دین کے پاس نہیں تھا۔ ان دونوں نے ایک عمر ساتھ گزاری تھی، ایک دوسرے کی رمزوں اور ان کہی باتوں کو سمجھنے کے لیے انہیں کسی لغت اور ستارہ شناسی کی ضرورت نہیں تھی۔ خیر دین نے اسے صبح جو سمجھانا چاہا تھا وہ جانتا تھا وہ بات چڑیا سمجھ گئی تھی اور اب چڑیا کا ردعمل..... وہ رنجیدہ تھی اور خیر دین بے قرار ہورہا تھا۔

''کھانا کھالو..... تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔'' خیر دین نے بات بدل دی تھی۔ وہ روز ہی اس کے انتظار میں بیٹھا رہتا تھا..... وہ اور عکس دونوں ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے اور خیر دین یہ بھی جانتا تھا کہ چڑیا کبھی کھانا چھوڑ کر نہیں بیٹھتی تھی..... بھوک نہ ہونا، کھانا نہ کھانے کی وجہ بن سکتی تھی لیکن رزق سے ناراض ہوکر بیٹھنا خیر دین نے اسے کبھی نہیں سکھایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے عکس کا دل چاہا وہ ان سے شکایت کرے، وہ کام جو اس نے ساری زندگی نہیں کیا..... صرف ایک لمحے کے لیے اور پھر وہ خاموش ہی رہی تھی..... وہ گلہ کرتی تو خیر دین کو تکلیف ہوتی۔ ویسی تکلیف جیسی آج صبح ان کے ایک انکشاف سے اُسے ہوئی تھی۔ وہ ایسا نادانستگی میں کرگئے تھے وہ اگر کرتی تو دانستہ کرتی..... وہ خیر دین کو جیسے غلطی کی گنجائش دے رہی تھی۔

''بعض دفعہ انسان حالات کے ہاتھوں مجبور ہوجاتا ہے۔'' خیر دین نے اس کی خاموشی کو شاید زندگی میں پہلی بار غلط پڑھا تھا اس کا خیال تھا وہ شرمین سے لی جانے والی مدد پر اپ سیٹ تھی۔

''نانا آپ نے جو کیا ٹھیک کیا آپ کو مجھے کوئی بھی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی اس ایک لاکھ روپے کی وجہ سے میری نظر میں آپ کی قدر و قیمت میں کوئی کمی ہوئی ہے۔'' عکس نے خیر دین کو بیچ میں ہی ٹوک دیا تھا۔ صبح سے اس کے سینے پر دھرا بوجھ پل بھر میں سرک گیا تھا۔ خیر دین نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

''کھانا کھاتے ہیں۔'' وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے ایک بار پھر وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

شیر دل نے بے یقینی سے منزہ کو دیکھا اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے اس طرح کی بات کر سکتی تھیں۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی رات کا کھانا کھانے کے لیے آیا تھا۔ بختیار شہر سے باہر تھے اور ڈنر ٹیبل پر وہ اور منزہ ہی تھے۔

''آپ کس کی شادی کی بات کر رہی ہیں؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

''تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں شیر دل۔'' منزہ نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''ممی آپ ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟'' شیر دل اب بھی جیسے اس شاک سے سنبھل نہیں پایا تھا۔ عکس مراد علی کل اس سے ملنے آئی تھی اور آج منزہ اس سے اس کی شادی کے حوالے سے بات کر رہی تھیں۔

''تم اسے ہمیشہ سے پسند کرتے تھے...... محبت کرتے تھے...... شادی کرنا چاہتے تھے اس سے...... تمہیں یاد ہے؟'' وہ بہت معمول کے انداز میں اس سے اس طرح بات کر رہی تھیں جیسے اس کی یادداشت بحال کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''میں بے وقوف تھی کہ میں نے اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ تمہیں شادی کرنے نہیں دی، میری غلطی تھی وہ۔''

شیر دل نے ان کی بات کو بے حد خفگی کے ساتھ کاٹا۔

''ممی وہ چیپٹر بند ہو چکا ہے۔ وہ انگیجڈ ہے اور مجھے شادی نام کی کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اس نے دوٹوک انداز میں ماں سے کہا۔

''اس کی انگیجمنٹ ختم ہو چکی ہے۔'' منزہ نے بے اختیار کہا اور جیسے کہہ کر پچھتائیں۔

''آپ سے کس نے کہا؟'' وہ حیران ہوا۔ پچھلی رات وہ دونوں بہت دیر بات کرتے رہے تھے لیکن عکس نے اپنے حوالے سے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور اب وہ یک دم منزہ کے منہ سے اس کی منگنی کے ختم ہونے کی بات سن رہا تھا۔

''تم جانتے ہو اس کے منگیتر کی فیملی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں...... میں نے کسی فنکشن میں ان کی فیملی کے کسی ممبر سے یہ بات سنی تھی۔'' انہوں نے حتی الامکان اپنے لہجے اور چہرے کو بے تاثر رکھا تھا۔ وہ شیر دل کو کوئی اور اندازہ لگانے کا موقع دینا افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ چند لمحے خاموش رہا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ منزہ کی بات پر کس طرح ری ایکٹ کرے۔

''اگر اس کی انگیجمنٹ ختم ہو گئی ہے تو بھی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ میرے ساتھ اس کی شادی کا سوچنے لگیں۔'' اس نے چند لمحوں بعد منزہ سے کہا۔ ''اس کے پاس مجھ سے بہتر آپشنز ہیں اور میں چاہتا ہوں وہ ان میں سے کسی کا استعمال کرے۔'' شیر دل نے دوٹوک انداز میں ماں سے کہا۔

''وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے، نہ ہوتی تو یہاں کبھی نہ آتی۔'' منزہ نے بے اختیار کہا۔

''ممی مجھے شادی میں انٹرسٹ نہیں ہے اور میں جس فیز سے گزر رہا ہوں اس میں، میں کسی بھی صورت سے شادی کر کے اس کی زندگی عذاب میں نہیں ڈالوں گا...... خاص طور پر عکس کی۔'' اس نے منزہ کو بات مکمل کرنے سے پہلے ٹوک دیا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم بالکل ٹھیک ہو۔ نروس بریک ڈاؤن ہو جانے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ......''

شیر دل نے ایک بار پھر بڑی درشتگی سے ماں کی بات کاٹی۔

''ممی میری چھ سال پرانی شادی ختم ہوئے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے، میرے پاس میری بیٹی کی کسٹڈی نہیں ہے اور نہ مجھے کوئی امید نظر آ رہی ہے اس سے ملنے کی...... میں اس بریک اپ سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا ہوں اور آپ مجھے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی ہیں۔ آپ کو لگتا ہے یہ اتنا آسان ہے میرے لیے ایک گھر ٹوٹنے کے بعد دوسرا گھر بنا لینا اتنا آسان ہے۔'' وہ بری طرح خفا ہو رہا تھا۔ منزہ نے عکس سے ملاقات کے بعد اس میں آنے والی تمام خوشگوار تبدیلیوں کو منٹوں میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔

''تم اسی سے تو شادی کرنا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے...... عکس سے ہی تو......'' منزہ نے جیسے بڑی بے چارگی سے کہا۔

''ہاں کرنا چاہتا تھا دس سال پہلے...... اب نہیں۔'' شیر دل نے اسی خفگی کے ساتھ ماں کی بات کاٹی۔

''میری غلطی تھی کہ میں نے اس وقت عکس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہونے دی۔ کاش میں اس وقت مان جاتی۔'' منزہ نے اداسی، رنجیدگی اور پچھتاوے کا بڑے کھلے الفاظ میں اظہار کیا۔

''ممی میں فی الحال یہاں بیٹھ کر آپ کے پچھتاوے اور غلطیاں نہیں سننا چاہتا۔ I have had enough of it آپ نے میری زندگی میں جتنا mess کرنا تھا آپ کر چکی ہیں، بس اور کچھ نہ کریں...... اور عکس اور میں صرف دوست ہیں۔ میں اس کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ سوچنا نہیں چاہتا...... نہ ہی سوچوں گا۔'' وہ [illegible] تے ٹیبل سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ منزہ نے بے حد بے چارگی سے اسے جاتا دیکھا۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد نہیں تھا لیکن وہ اس کے سامنے شرمساری کی وجہ سے بے حد تکلیف میں تھیں۔ اس کا گھر ان کی وجہ سے ٹوٹا تھا۔ یہ سب جانتے تھے اور کوئی نہ بھی جانتا تو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ شیر دل کے بریک اپ کی ساری ذمے داری شہر بانو کے سر ڈالنے کی کوششوں کے باوجود انہیں یہ احساس جرم تھا کہ یہ تباہی ان کی وجہ سے آئی تھی، اس سارے مسئلے میں وہ اگر شیر دل اور اپنے شوہر کو سپورٹ کرتیں تو یہ مسئلہ اتنا خراب نہ ہوتا۔

عکس مراد علی کو انہوں نے خود اپنے لیے ایک ''بھوت'' بنایا تھا وہ بھوت نہیں تھی۔ جھوٹی انا، ضد، خاندانی تفاخر دوبارہ ان کے خاندان میں تباہی لایا تھا اور انہیں اس کا احساس پہلی بار ہو رہا تھا۔ خود غرضی تھی جو اب بھی ویسے ہی ان کے وجود پر پر پھیلائے بیٹھی تھی...... انہیں اپنے بڑے بیٹے کی زندگی میں ایک بار پھر سے سکون اور استحکام چاہیے تھا اور انہیں یہ سکون اور استحکام عکس مراد علی کی شکل میں نظر آ رہا تھا تو وہ یک دم سب کچھ بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے رشتہ جوڑنے پر تیار ہو گئی تھیں۔

شیر دل کے اس طرح کے رویے کے بعد بھی انہوں نے عکس اور خیر دین سے اس سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اور بختیار، شیر دل کے حوالے سے بہت متفکر تھے اور چاہتے تھے کہ فوری طور پر اسے بھی اپنی زندگی دوبارہ کسی کے ساتھ گزارنے پر آمادہ کریں لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔ شہر بانو سے طلاق کے بعد

ابتدائی چند دنوں میں شیر دل سے اس حوالے سے کچھ بات کرنے پر وہ بھنے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ پہلے ہی panic attacks کے بعد اس کے sedates (مسکن ادویہ) پر تھا اور اس ایشو کے زیر بحث آنے کے بعد اس کے (ذہنی دورے) بڑھ گئے تھے۔ بختیار نے منزہ کو دوبارہ اس سے ایسے کسی معاملے پر بات کرنے سے روک دیا تھا لیکن وہ خود شیر دل کے حوالے سے منزہ ہی کی طرح فکر مند تھے۔ منزہ کے سامنے اس بات کا اظہار نہ کرنے کے باوجود وہ شیر دل کے لیے خائف تھے۔ انہوں نے شہباز کو بھی ایسی ہی حالت سے گزرتے دیکھا تھا اور اس نے ایسے ہی ڈپریشن میں خودکشی کر لی تھی اور بہت بہادر اور دلیر ہونے کے باوجود بختیار کو اس بات کا خدشہ تھا کہ شیر دل anxiety (ہیجان) میں ایسا کوئی قدم نہ اٹھا لے۔ اسے مستقل طور پر گھر میں اپنی نگرانی میں رکھے رہنا کوئی حل نہیں تھا۔ بختیار کی اپنی بہت ساری مصروفیات تھیں اور وہ ان پروفیشنل مصروفیات کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ منزہ کی بھی ڈھیروں ڈھیر سوشل سرگرمیاں تھیں لیکن وہ اتنے مہینوں سے شیر دل کے لیے سب کچھ چھوڑ کر بیٹھی تھیں اور اب کئی بار ایسا ہونے لگا تھا کہ منزہ کو بھی اسٹریس کی وجہ سے سونے میں دقت ہونے لگی تھی۔ وہ بھی سونے کے لیے اکثر اوقات خواب آور ادویات کا سہارا لینے لگی تھیں اور ان کی یہ حالت بختیار کی تشویش میں اضافہ کر رہی تھی۔ شیر دل کے بریک اپ نے پوری فیملی کو ہر طرح سے ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان حالات میں عکس کی صورت میں منزہ کو جیسے روشنی کی ایک کرن دکھی تھی اور ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ اس کی طرف نہ جاتیں...... اپنے گھر کو گھپ اندھیرے میں ڈوبا رہنے دیتیں۔

☆☆☆

''سوری یار میں کچھ لیٹ ہو گیا۔'' داؤد نے ٹیبل کی دوسری طرف اس کے بالمقابل اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ شہر بانو نے مسکرانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ جانتی تھی اس کی مسکراہٹ بہت پھیکی ہوگی۔ اس ریسٹورنٹ میں اس ریزرو ڈ ٹیبل پر بیٹھے وہ قد آدم کھڑکی کے شیشے سے باہر سڑک اور سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کو پچھلے ایک گھنٹے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ داؤد کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کرنے کے لیے وہاں آئے تھے۔ داؤد نے ایک دن پہلے اسے یہاں ڈنر پر لانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اسے چھ بجے شہر بانو کو گھر سے پک کرنا تھا لیکن پانچ بجے کے قریب اس نے شہر بانو کو کال کر کے وہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ٹائم پر اس کے پاس پہنچ نہیں پائے گا اور وہ اگر اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر اسے پک کرنے کے بعد ریسٹورنٹ لایا تو وہ دونوں بہت لیٹ ہو جائیں گے کیونکہ شرمین کا گھر داؤد کے گھر کے بالکل مخالف سمت میں تھا اور وہ ریسٹورنٹ ان دونوں کے گھروں کے درمیان کسی جگہ پر تھا۔

''بس زارا آئی ہوئی تھی یہاں کوئی سیمینار اٹینڈ کرنے...... اس نے کال کر لیا۔ کافی پر چلے گئے تو تھوڑا ٹائم لگ گیا...... تم کیا لو گی؟'' داؤد نے مینیو کارڈ اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔ زارا کا نام سن کر شہر بانو کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آیا تھا۔ داؤد ہمیشہ اس طرح اس کی بات کرتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی سے کہیں گئی ہی نہ ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا ان دونوں کے بیچ...... کوئی بریک اپ نہیں...... کوئی divorce نہیں...... کوئی تلخی نہیں...... ایک عجیب سے احساس نے اس کے حلق کو کڑوا کیا تھا۔ بھوک پہلے بھی نہیں تھی، اب بالکل ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک گھنٹے سے وہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی...... مثال کو گھر پر چھوڑے...... اور وہ اپنی سابقہ بیوی کے ساتھ بیٹھا کافی پیتے ہوئے گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ اس سے یہ کہنا چاہتی تھی...... خفا ہونا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگا یہ موقع مناسب نہیں تھا، وہ اس کا اسپیشل دن تھا وہ کوئی جھگڑا نہیں کر سکتی تھی کم از کم اس

شام کو......

اس کے کانوں میں شرمین کی آواز گونجنے لگی تھی۔ ''اپنے اندر کچھ تبدیلی لاؤ شہر بانو...... تم بہت زیادہ temperamental (غصیلی) ہو گئی ہو...... اتنی rudeness (بے اعتنائی، بے رخی) ٹھیک نہیں...... داؤد نے بھی ایک دو بار شکایت کی ہے تمہاری...... کہہ رہا تھا۔'' آنٹی شہر بانو کو سمجھائیں...... زارا کے ساتھ بھی یہی پرابلم تھا وہ بھی اپنے پروفیشن کی وجہ سے اتنی مصروف اور stressed out (ذہنی تناؤ میں) رہتی تھی کہ بات بات پر میرا اور اس کا جھگڑا ہوتا تھا...... میں نہیں چاہتا شہر بانو اور میرا ریلیشن شپ بھی ویسا ہی ہو جائے...... میں جانتا ہوں وہ اپنے بریک اپ کی وجہ سے اپ سیٹ ہے لیکن...... she should move on...... اتنا bitter (تلخ) ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم خود کو بدلو...... تم دونوں کی دوسری شادی ہے۔ زیادہ برداشت اور انڈر اسٹینڈنگ دکھانے کی ضرورت ہے تمہیں۔''

وہ چاہتے ہوئے بھی ذہن سے انہیں جھٹک پا رہی تھی کیونکہ وہ مسلسل داؤد کے حوالے سے ان کی ہدایات سننے کی عادی ہو گئی تھی۔

اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا گفٹ باکس نکال کر اس نے داؤد کے سامنے رکھ دیا لیکن وہ ایکسائٹمنٹ جو اس گفٹ کو خریدتے وقت تھی وہ اسے اب نہیں تھی۔

''اوہ thank you...... کیا ہے اس میں؟'' داؤد نے مسکراتے ہوئے وہ گفٹ باکس لے لیا۔

''تم خود دیکھ لینا۔'' شہر بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ داؤد نے باکس کو کھولے بغیر بس اسے ہلا کر جیسے کچھ اندازہ کرنے کی کوشش کی۔

''پرفیوم؟'' داؤد نے بالکل ٹھیک guess کیا۔ شہر بانو کچھ حیرانی کے عالم میں ہنسی۔

''تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟''

''یار! ساری عمر پرفیوم ہی ملتے رہے ہیں مجھے زارا سے...... اب تو پرفیوم نہ بھی ہو کسی گفٹ میں تو مجھے لگتا ہے پرفیوم ہی ہوگا۔ زارا نے مجھے دنیا کا ہر پرفیوم گفٹ کر ڈالا ہے۔ کریزی ہے وہ پرفیومز کے معاملے میں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ باکس اس نے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو شہر بانو نے بڑی مشکل سے چہرے پر سجائی تھی وہ ایک بار پھر غائب ہو گئی تھی اور اس بار شہر بانو نے اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ڈنر یک دم ہی ایک بے حد بے مقصدی چیز بن گیا تھا...... بیکار...... غیر ضروری...... اضافی...... وہ دونوں وہاں نہ بھی آتے تو بھی کیا تھا...... شہر بانو نے سوچا۔

وہ زارا کا ذکر اسی طرح کیا کرتا تھا...... روانی میں...... لاشعوری طور پر...... اور بے تحاشا...... جیسے اس کا معمول تھا...... شکایتاً یا تذکرتاً لیکن داؤد کی گفتگو زارا کے ذکر سے اب بھی خالی نہیں تھی اور اگر گفتگو خالی نہیں تھی تو اس کا دل اور زندگی کیسے خالی ہو سکتی تھی اور اس نے یہ بات داؤد سے ایک بار پوچھ ہی لی تھی جب فون پر اس کی دوسری یا تیسری بار بات ہوئی تھی اور شہر بانو، زارا کے بار بار کے ذکر سے بری طرح چڑی تھی اور داؤد جواباً اس کے اس طرح چڑنے پر حیران ہوا تھا۔

''میری کلاس فیلو رہی ہے وہ...... کورٹ شپ رہی پھر شادی رہی...... اتنے سال ساتھ گزارنے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری باتوں میں اس کا ذکر ہی نہ آئے یا وہ مجھے یاد نہ آئے...... تمہیں شیر دل یاد نہیں آتا کیا؟'' وہ اس کے سوال پر بہت دیر کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ وہ عام سے انداز میں کیا جانے والا ایک سوال

تھا۔ داؤد کے لہجے میں کوئی چبھن، کوئی طنز نہیں تھا پھر بھی اس کی بات شہربانو کو بری طرح چبھی تھی۔

''یاد آتا بھی ہو تب بھی میں بات، بات پر اس کا ذکر تو نہیں کرتی۔'' اس نے بہت دیر کے بعد جیسے خود کو سنبھال کر لیکن پہلے سے زیادہ چڑ کر کہا۔

''تو تم کرلیا کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' داؤد نے بے ساختہ کہا۔

''مجھے اگر بات، بات پر اس کا ذکر کرنا ہوتا تو میں اسے چھوڑتی کیوں؟'' اس نے جواباً کہا اور داؤد جیسے کچھ مزید حیران ہوا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا..... دو لوگ اتنا عرصہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں اور پھر ایک دوسرے کو مکمل طور پر بھول جائیں۔ کبھی ایک دوسرے کا ذکر بھی نہ کریں..... یہ نارمل نہیں ہے۔''

''کیا سوچ رہی ہو؟'' وہ داؤد کی بات پر یک دم چونکی تھی۔ وہ بہت talkative (باتونی) تھا بہت دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد اس کو یک دم احساس ہوا تھا کہ شہربانو کی توجہ کہیں اور تھی۔

''کچھ نہیں۔'' شہربانو نے اپنی توجہ اس پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور وہ ناکام رہی..... اس کو یقین تھا۔ داؤد کو وہ بچپن سے جانتی تھی۔ وہ ایک ہی ہائی اسکول میں پڑھے تھے۔ یونیورسٹی تک ان کی بہت گہری دوستی رہی تھی..... انڈر اسٹینڈنگ اور دوستی میں بعض دفعہ فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ داؤد کی گفتگو میں زارا اور شہربانو کی گفتگو میں شیردل آنے لگا تھا پھر ان دونوں کی زندگیوں میں زارا اور شیردل نے وہ جگہ لے لی تھی جو ان دونوں کے نہ آنے پر شاید وہ ایک دوسرے کی زندگی میں لیتے۔

اور اب جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک نیا رشتہ جوڑنے کی کوشش کررہے تھے تو عجیب وقت ہورہی تھی۔ وہ انڈر اسٹینڈنگ اور compatability جو دونوں کو گھنٹوں ایک دوسرے سے مصروف گفتگو رکھتی تھی یک دم پتا نہیں کہاں غائب ہوگئی تھی۔ شہربانو اس کا موازنہ شیردل سے نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سارا وقت یہی کرتی رہتی تھی۔ داؤد مرد تھا کھل کر اس عورت کا ذکر کرتا تھا جس کے بارے میں سوچتا تھا۔ شہربانو عورت تھی، وہ اپنے آپ کو دھوکا اور فریب دینے میں لگی رہتی کہ وہ شیردل کو بھول چکی تھی، زندگی سے نکال چکی تھی۔

زندگی میں سائن بورڈز اور روڈ سائنز کو بھولنا مشکل ہوتا ہے..... پھر زندگی میں آنے والے انسانوں کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے..... جس راستے سے ایک بار گزر ہوجائے وہاں کی نشانیاں ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں اور سالوں بعد بھی دوبارہ اسی راستے پر گزرتے ہوئے انسان پہچان، شناخت، تلاش اور دریافت کے جذباتی مراحل سے گزرتا ہے تو زندگی میں ساتھ چلنے والے انسان کیسے ہمارے ذہن پر اپنے نقوش اور یادیں نہ چھوڑ جائیں۔ آواز، انداز، نقش، نظر، لفظ، لمس، عادت، آہٹ یہ کیسے ممکن ہے انسان کو بھولنے کے ساتھ ساتھ یہ سب بھی بھول جائے..... کبھی وہم نہ ہو، کبھی شائبہ سا نہ گزرے، کبھی یادوں کی پرچھائیاں فریب نہ دیں۔ داؤد ٹھیک کہتا تھا اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو یہ نارمل بات نہیں تھی لیکن نارمل تو شہربانو بھی نہیں رہی تھی۔ وہ صرف تب تک نارمل رہی تھی جب تک شہباز اور شرمین کے ساتھ ایک خوش و خرم گھر اور خاندان کا حصہ رہی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے گہری سانس لے کر داؤد سے کہا۔

''ویسے تمہاری یہ عادت پسند ہے مجھے..... تم بہت زیادہ باتیں نہیں کرتیں..... آج کل یہ عادت بہت کم ہوتی ہے عورتوں میں..... جب میں زارا کے ساتھ ہوتا تھا تو صرف زارا بولا کرتی تھی اور.....'' داؤد بات کررہا

تھا..... اسے سراہتے سراہتے پھر سے اسے زارا یاد آگئی تھی۔ شہربانو پھر کہیں چلی گئی تھی۔ شہربانو کو یاد آیا وہ شیردل کے ساتھ بہت باتیں کرتی تھی..... اتنی باتیں..... اتنی باتیں..... جتنی اس نے شاید کبھی بچپن میں شہباز حسین سے کی ہوں گی..... شیردل بھی بولتا تھا لیکن اس کے ساتھ وہ صرف اسی کی سنتا تھا، اس کی گفتگو سے وہ جیسے محظوظ ہوتا تھا..... آفس کا کام کرتے ہوئے وہ روز رات کو اس کے کندھے پر سر رکھے اسے کچھ نہ کچھ سناتی رہتی تھی اور وہ کام کرتے ہوئے سنتا جاتا تھا..... شہباز حسین کے بعد صرف وہی ایک تھا جس سے اس نے کبھی باتیں کرنا چاہی تھیں اور باتیں کی تھیں..... کسی اور کو کچھ بتانے یا کسی اور سے کچھ شیئر کرنے کے لیے اب اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں..... وہ گھنٹوں داؤد کی باتیں ایک خاموش تماشائی کی طرح سن سکتی تھی اگر داؤد چاہتا.. لیکن کم از کم اس میں ایک دوسری عورت کا ذکر نہ آتا خاص طور پر اس عورت کا جسے وہ چھوڑ چکا تھا۔

''تم پھر کہیں اور پہنچی ہوئی ہو؟'' داؤد نے پھر بہت دیر بعد اس کی عدم توجہی اس وقت محسوس کی جب ویٹر کھانا سرو کرنے آیا تھا۔

''ٹھیک ہے یار تم باتیں کیا کرو لیکن اب اتنی بھی کم نہیں کہ بوریت ہونے لگے۔'' اس نے بالآخر چڑ کر کہا۔ شہربانو چاہتے ہوئے بھی اسے کہہ نہیں پائی کہ وہ اس بوریت کو ختم کرنے کی پچھلے دو گھنٹے سے کوشش کررہی تھی اور کامیاب نہیں ہوپائی تھی۔ وہ کنکشن اور وہ اسپارک جو ہمیشہ سے ان دونوں کے بیچ تھا اب یک دم ہی کہیں غائب ہوگیا تھا۔ داؤد کے لیے کسی بھی عورت کے ساتھ گپ شپ لگالینا آسان تھا شہربانو کے لیے یہی سب سے مشکل کام تھا۔

''کیسا رہا ڈنر؟'' گیارہ بجے کے قریب بالآخر گھر واپس آنے پر شرمین نے اس سے پوچھا تھا۔ حالانکہ شہربانو کا چہرہ اسے بتارہا تھا کہ ڈنر کیسا تھا۔

''مثال سوگئی؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے اندر آتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''بڑی مشکل سے سلایا ہے، کتنی دیر تو فاروق اسے لے کر باہر پھرتے رہے۔'' شرمین نے جواباً کہا۔

شہربانو مزید کچھ بولے بغیر اپنے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس کا چہرہ اتنا ستا ہوا تھا کہ شرمین جیسے تشویش کے عالم میں اس کے پیچھے اس کے بیڈروم میں چلی آئیں وہ گم صم صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' شرمین نے شہربانو کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''Mummy it won't work'' شہربانو نے اسی تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ شرمین کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا جب وہ داؤد کے حوالے سے اس طرح کی رائے دے رہی تھی۔ شرمین کا خیال تھا مسئلہ اس کے ساتھ تھا داؤد کے ساتھ نہیں۔

''اب کیا ہوا؟'' شرمین نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ممی اس کے ذہن پر اب بھی زارا ہی سوار ہے۔ وہ آج بھی آدھا وقت اسی کی باتیں کرتا رہا۔ وہ آئی ہوئی تھی یہاں کسی سیمینار کے لیے..... لیکن مجھے لگتا ہے وہ اس کی برتھ ڈے ہی کے لیے یہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ اسے کافی پر لے گیا اس بات کی پروا کیے بغیر کہ میں ریسٹورنٹ میں بیٹھی اس کا انتظار کررہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب انہیں چوبیس گھنٹے ایک دوسرے سے رابطے میں رہنا ہے تو پھر طلاق کی کیا ضرورت تھی۔'' شہربانو بہت جھنجلائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ فوری طور پر شرمین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہیں۔

''میں داؤد سے بات کروں گی۔'' انہوں نے بالآخر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''لیکن بیٹا مجھے نہیں

لگتا یہ کوئی بہت معیوب بات ہے یہاں لوگ divorce کے بعد بھی سابقہ بیوی یا شوہر سے ملتے رہتے ہیں۔ اچھے تعلقات رکھتے ہیں آپس میں...... بعض دفعہ بچوں کی وجہ سے...... داؤد اور زارا بہت پرانے فیملی فرینڈز ہیں۔ ساتھ ملے بڑھے ہیں، بڑی حد تک امریکن سوچ ہے ان کی...... لیکن پتا نہیں میں تمہیں کیوں سمجھا رہی ہوں یہ سب کچھ...... تمہیں تو خود پتا ہونا چاہیے...... تم نے زندگی گزاری ہے یہاں...... کوئی اور چکر ہوتا تو داؤد چھپاتا تم سے...... جیسے شیر دل چھپا رہا تھا...... اس طرح ہر بات سامنے نہ کر رہا ہوتا۔'' شرمین نے بہت غلط موقع پر شیر دل کی مثال دی تھی۔ شہربانو بری طرح ہرٹ ہوئی۔

''ممی! آپ اس کی مثال مت دیں مجھے۔'' اس نے بے حد خفا ہو کر ماں سے کہا تھا۔ ''ہم اس وقت داؤد کی بات کر رہے ہیں۔''

''داؤد بہت اچھا لڑکا ہے...... پروفیشنلی بہت برائٹ ہے...... بہت اچھی نیچر کا ہے، یہاں امریکا میں رہ کر بھی کوئی خراب عادتیں نہیں اس میں...... اتنا اچھا رشتہ کہاں ملے گا تمہارے لیے امریکا میں۔'' شرمین نے ہمیشہ کی طرح اسے داؤد کی خوبیاں گنوانی شروع کر دی تھیں۔

''وہ بہت اچھا ہے ممی لیکن مجھے ہر بار اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اسے میری ضرورت نہیں ہے......'' شرمین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ضرورت نہ ہوتی تو شادی کیوں کرنا چاہتا وہ تم سے؟''

''شادی تو انسان کسی سے بھی کر لیتا ہے۔'' شہربانو نے کہا اسے پتا نہیں کیا، کیا یاد آیا تھا۔

''کسی سے بھی نہیں کر لیتا انسان شادی...... کسی کی قدر اور ویلیو ہوتی ہے تبھی انسان اس سے شادی کا سوچتا ہے...... کسی کے لیے کچھ محسوس کرتا ہے تبھی اس کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتا ہے۔'' شرمین ہمیشہ کی طرح اسے داؤد کے حوالے سے سمجھا رہی تھیں۔ شہربانو ان کی گفتگو کو کسی ''اور'' کے حوالے سے سن رہی تھی۔

''کوئی دوسرا کبھی مثال کو اس طرح پیار اور توجہ نہیں دے سکتا جس طرح داؤد دے گا۔ فاروق کی فیملی کا ہے وہ۔ تم کو یاد ہے فاروق نے ہمیشہ تمہیں کتنی توجہ دی ہے۔'' وہ اس دلیل پر آ کر ہمیشہ کمزور پڑ جاتی تھی...... مثال...... بس مثال کو کوئی اس طرح سنبھال لیتا جیسے شیر دل سنبھالتا تھا اور داؤد یہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ داؤد کو شروع سے جانتی تھی۔ اس کی زندگی میں آنے والا کوئی اور مرد مثال کے لیے بالکل اجنبی ہوتا اور مثال ہر ایک کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتی تھی۔

اتنے مہینے گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی طرح شیر دل کے لیے روتی اور چلاتی تھی اور ہر دفعہ جب وہ باپ کے لیے رونا شروع کرتی پھر وہ کئی گھنٹے اسی طرح روتی رہتی، اسے اس وقت کسی بھی چیز کے ساتھ بہلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ شہربانو تب اسے صرف بے بسی کے عالم میں چپ چاپ دیکھتی رہتی تھی۔ مثال میں پہلے کبھی اس طرح کا aggression نہیں تھا جو وہ اب دکھتی تھی۔ وہ چیزیں اور کھلونے توڑنے میں سیکنڈ نہیں لگاتی تھی۔ بعض دفعہ شہربانو پر چلاتی، اس کی بات ماننے سے انکار کرتی۔

شہربانو کے لیے سب سے تکلیف دہ بات تب ہوئی تھی جب عدت کے دوران مثال اسکول جانے لگی تھی تو ایک دن اسکول سے آنے کے بعد کسی بات پر ضد کرتے ہوئے اس نے شہربانو سے کہا۔

''Mummy you are a bad woman'' شہربانو اس کے الفاظ پر ششدر رہ

گئی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ اس سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی جو کر رہی تھی لیکن اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں یک دم مفلوج ہو گئی تھیں۔ اپنی اولاد کے منہ سے اپنے بارے میں ایسا جملہ سن کر کسی بھی ماں کا یہی حال ہو سکتا تھا۔

شہربانو اس پوری رات سو نہیں سکی تھی۔ اس نے زندگی میں ایسی خود ترسی اور احساسِ کمتری کا سامنا نہیں کیا تھا جتنا مثال کے اس ایک جملے نے اسے کروایا تھا۔

اگلے کئی دن وہ چاہنے کے باوجود مثال سے کچی کچی کھنچی کھنچی رہی۔ مثال نے ماں کی اس خفگی یا بے مہری کو محسوس کیا یا نہیں کیا لیکن وہ بھی جواباً شہربانو سے اور کھنچ گئی تھی۔ شیر دل ان دونوں کے درمیان جیسے ایک عجیب سی دیوار بن گیا تھا اور صرف شرمین تھیں جو اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ مثال کی ذہنی کیفیت کو بھی سمجھ پا رہی تھیں۔

انہی دنوں میں داؤد نے فاروق کے ذریعے شہربانو میں اپنی دلچسپی کا اظہار اور شادی کا پیغام بھجوایا تھا اور شرمین کے لیے جیسے صحرا میں نخلستان والا معاملہ ہوا تھا۔ شہربانو کی فوری شادی انہیں ان تمام مسائل کا حل لگی تھی جن کا شہربانو سامنا کر رہی تھی۔ وہ ان کے سامنے بریک اپ کے بعد بڑے حوصلے کا مظاہرہ کرتی رہی تھی اس نے شیر دل کا نام تک لینا چھوڑ دیا تھا لیکن شرمین کو اس کے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ کا اندازہ تھا۔ وہ آگ کے اس دریا سے گزرتے ہوئے اپنے وجود کو جلا چکی تھیں...... شہربانو کیسی تکلیف کا سامنا کر رہی تھی انہیں اندازہ تھا۔

ان کی اپنی زندگی میں فاروق کے آ جانے نے بہت حد تک ان کی تکلیف ختم کر کے ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا اور انہیں یقین تھا شہربانو کو داؤد کی صورت میں ویسا ہی ساتھی مل جاتا تو وہ بھی اس تکلیف سے بہت جلدی گزر جاتی۔

شہربانو نے غیر متوقع طور پر داؤد کے پرپوزل پر کسی شدید ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا حالانکہ شرمین کو اس کی توقع تھی لیکن وہ فوری طور پر شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ چند سال اس گرداب سے نکلنے کے لیے چاہتی تھی جس میں وہ پھنس گئی تھی۔

''جلدی کسی سے شادی ہو گئی تو مثال بھی بہت جلد تمہارے اس نئے رشتے کو بھی accept کر لے گی اور اس آدمی کے ساتھ اٹیچ بھی ہو جائے گی۔ چند سالوں کے بعد تمہارے لیے دوسری شادی کرنا زیادہ آسان ہو گا لیکن مثال کے لیے اس نئے رشتے کو قبول کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ اب بھی تمہارے لیے کتنی پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ تب تو بالکل ہی......'' شرمین کے پاس شہربانو کو اس وقت فیصلے پر تیار کر لینے کے لیے جیسے ترپ کا پتا مثال تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ شہربانو ماں کی اس بات کو نہ مانتی اس کے سامنے اپنا بچپن تھا...... اپنے بچپن کا mess تھا اور وہ مثال کو ایسی کسی بھی صورتِ حال سے بچانا چاہتی تھی۔

لیکن اب جب وہ ذہنی طور پر داؤد سے شادی کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی...... اسے بار بار شیر دل کا خیال آتا تھا اور الجھن اور اضطراب تھا کہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا...... رابطہ نہیں تھا...... یہ فاصلہ بہت زیادہ تھا...... جدائی ہو چکی تھی۔ واپسی ناممکن تھی...... پر خیال اور یادیں کہ دل کا دامن چھوڑنے پر تیار ہی نہیں تھے۔

☆☆☆

زندگی میں ایک گولی ایسی بھی ہونی چاہیے جسے کھانے کے بعد انسان اس شخص، چیز اور یاد کو فوری طور پر

بھول جائے جسے وہ بھولنا چاہتا ہے..... آپ اسے کھا کر سوئیں اور جاگیں تو آپ کے پورے وجود اور ذہن کے سسٹم میں سے صرف وہ شخص، وہ چیز وہ یاد نکل چکی ہو جس سے آپ جان چھڑانا چاہتے ہوں۔ جو آپ کے لیے تکلیف کا باعث ہو۔

ہر روز صبح بستر میں آنکھیں کھولنے کے بعد جو پہلا خیال اور پہلا تصور شیر دل کے ذہن اور آنکھوں میں آتا تھا وہ مثال اور شہر بانو کا ہوتا تھا۔ اتنے مہینوں کے بعد بھی کوئی ایک دن ایسا نہیں تھا جب اس کے دن کا آغاز کسی اور خیال سے ہوا ہو...... ہزیمت، ذلت، تکلیف اور صدمے کی ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے وہ صبح سویرے گزرتا تھا۔

وہ کمزور اعصاب کا مالک نہیں تھا۔ وہ کبھی کمزور اعصاب کا مالک نہیں رہا تھا لیکن جو کچھ ہوا تھا اس نے اسے عجیب انداز میں traumatized کیا تھا۔ وہ پچھلے کتنے سالوں سے اپنی زندگی شہر بانو اور مثال کے ساتھ گزار رہا تھا وہ دونوں اس کے شعور اور لاشعور دونوں کا حصہ تھیں اور ان کا اس طرح غائب ہو جانا......

وہ ہر روز بیٹھ کر اپنے آپ کو ان تمام واقعات کی توجیہات دیا کرتا تھا...... کیا چیز کیوں ہوئی اور پھر یہ سوچتا تھا کہ وہ کون سی چیز کرتا یا نہ کرتا تو یہ سب نہ ہوتا...... شہر بانو سے اسے محبت تھی...... اب کیا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا...... نفرت وہ اس سے نہیں کر سکتا تھا...... محبت کرنے کے قابل وہ اب اسے سمجھتا نہیں تھا...... غصہ اسے اس پر بے تحاشا آتا تھا اور اس کے ساتھ وہ خود بھی یاد آتی تھی...... رات اور دن کے بہت سے پہروں میں...... اپنی بہت ساری باتوں اور عادتوں کی وجہ سے...... ان اوقات میں جب مثال اسے وقتی طور پر بھولتی۔

شک شہر بانو کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ کم از کم شیر دل کو اس سے یہ شکایت کبھی نہیں رہی تھی...... بداعتمادی اور بدگمانی کی عادت بھی اسے نہیں تھی...... وہ بدمزاج اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرنے اور لڑنے جھگڑنے کی بھی عادی نہیں تھی...... شادی سے پہلے اگر اس کی چند چھوٹی موٹی عادتوں پر شیر دل کو خفگی محسوس ہوتی تھی تو شادی کے ان پانچ چھ سالوں میں شہر بانو میں وہ عادتیں بھی نہیں رہی تھیں۔ وہ کاغذ پنسل لے کر بیٹھتا تو اسے شہر بانو کی خامیاں اور عیب ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا...... بالکل اسی طرح جس طرح شہر بانو کے لیے شیر دل میں عیب ڈھونڈنا مشکل تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو اس سے پہلے کبھی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ کبھی ہرٹ نہیں کیا تھا اور شاید اسی وجہ سے پہنچنے والی تکلیف کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

شہر بانو حساس تھی ضرورت سے زیادہ حساس تھی صرف یہ ایک چیز تھی جسے شیر دل کبھی اس کی personality میں سے دور نہیں کر سکا تھا...... لیکن اس نے شہر بانو کو اس کی اس خامی اور عادت کے ساتھ قبول کیا تھا...... وہ اس کے ماضی کی تلخ یادوں سے واقف تھا اور اسے یقین تھا وہ اپنی محبت اور ساتھ سے اس کے اندر موجود عدم تحفظ کا ہر احساس نکال دے گا...... لیکن جو کچھ ہوا تھا...... ایک مرد کے طور پر وہ یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اس کے اور شہر بانو کے بیچ میں عکس کے لیے اس کے جذبات اور محبت مسئلہ بنی تھی۔

عکس وہ پہلی اور واحد عورت نہیں تھی جس کے بارے میں وہ شہر بانو سے بات کرتا تھا اس کا حلقۂ احباب عورتوں سے بھرا ہوا تھا...... اس کی اندرون ملک اور بیرون ملک کزنز، کالج یونیورسٹی فرینڈز، کولیگز...... اس کے حلقۂ احباب میں بہت پرانی فرینڈز بھی تھیں۔ شہر بانو کو کبھی کسی کے ساتھ مسئلہ نہیں ہوا تھا...... صرف عکس کے لیے پسندیدگی رکھنا...... اور وہ اس پسندیدگی اور محبت کا کچھ نہیں کر سکتا تھا...... کر سکتا تو کر لیتا...... وہ عکس کے لیے اپنے جذبات کے سامنے بے بس تھا بالکل اسی طرح جس طرح وہ یہ سب ہو جانے کے باوجود بھی شہر بانو

سے نفرت کرنے اور اسے یاد نہ کرنے میں بے بس تھا۔

شہر بانو کا خیال تھا کہ عکس اس کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے کا باعث بنی تھی اور شیر دل کا خیال تھا یہ کام شہباز حسین اور اس کی اپنی ماں نے اس کے لیے کیا تھا اور اب منزہ اس کے سامنے وہ option لے کر آ گئی تھی جس کے بارے میں وہ سوچنا تک نہیں چاہتا تھا۔ بعض دفعہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ منزہ پر غصہ کرے، ترس کھائے یا افسوس کرے۔ وہ اپنی خود غرضی میں اسے بار بار کچوکے دے رہی تھیں اور خود بھی درد سے بے حال ہو رہی تھیں۔ خود غرضی کا اس سے زیادہ گھناؤنا چہرہ ایک شیر دل نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

منزہ کی اس گفتگو کا اس پر ان کی توقعات کے برعکس اثر ہوا تھا۔ اس نے عکس کو اگلے تین چار دن کوئی میسج اور کال نہیں کی وہ جیسے یہ طے کر بیٹھا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اس mess کو عکس مراد علی تک نہیں پہنچنے دے گا۔

☆☆☆

عکس نے بھی اسے کوئی کال نہیں کی تھی...... خیر دین کے الفاظ اور ان میں چھپی تنبیہ سے زیادہ ان کی بداعتمادی نے اسے اس قدر ڈسٹرب کیا تھا کہ اس نے شیر دل سے دوبارہ رابطہ نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہ کام بہت مشکل تھا خاص طور پر اب جب وہ شیر دل کی حالت دیکھ آئی تھی۔ وہ چند دن تک خود پر پہرے بٹھائی رہی تھی لیکن اس کے بعد اسے میسج کیے بغیر نہیں رہ سکی۔ اس میسج کا جواب نہیں آیا تھا۔ ایک لمبے انتظار کے بعد اس نے ایک اور میسج کیا پھر ایک اور...... دوسری طرف مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی نے عکس کو عجیب انداز میں مضطرب کیا۔ اس نے اس بار شیر دل کو کال کی تھی۔ سیل فون ایک بار پھر آف تھا۔ اس نے اگلی کال اس کے گھر کی لینڈ لائن پر کی تھی۔ آپریٹر نے اسے پہلی بار والا جواب دیا۔ اس نے شیر دل کے علاوہ گھر میں موجود کسی دوسرے شخص سے بات کروانے کے لیے کہا اور ایک بار پھر لائن پر منزہ ہی آئی تھیں اور ایک بار پھر عکس ہلکا سا پچھتائی، اس کے باوجود کہ وہ پچھلی بار ان کے غیر معمولی اور غیر متوقع اچھے سلوک سے حیران رہ گئی تھی۔

”ویسا ہی ہے کچھ بہتری نہیں آئی۔ تمہارے جانے کے بعد ایک دن کچھ بہتر رہا لیکن کل پھر panic attack کے بعد سارا دن کمرا بند کیے بیٹھا رہا ہے۔“ منزہ نے سلام دعا کے بعد شیر دل کا حال پوچھنے پر اسے بتایا۔ بات کرتے کرتے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

”بیٹا! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اس سے بات کیا کرو...... اسے سمجھاؤ...... تمہاری بات کو تو بڑی ویلیو دیتا ہے...... اس کی زندگی میں تمہاری بڑی importance ہے۔“ عکس نے ان کے ان تمام جملوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ بہت بے معنی اور کھوکھلا خراج تحسین تھا جو وہ اس کے اور شیر دل کے تعلق کو بالآخر پیش کر رہی تھیں۔ عکس کو اب ایسے کسی اعتراف کی ضرورت نہیں تھی۔

”بات میں تب کر سکتی ہوں آنٹی جب وہ فون آن رکھے اور فون اٹھائے۔“ اس نے مدھم آواز میں منزہ کو اپنا مسئلہ بتایا۔

”پتا نہیں اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا ہے پہلے سے بہتر ہے وہ، اس نے میڈیسن بھی کم کر دی ہے اس کی...... لیکن وہ اب بھی فون پر کسی سے بات نہیں کرتا...... موڈ ہو گا بات کرے گا پھر کسی نہ کسی بات پر خفا

ہو کر بات کرنا بند کر دیتا ہے۔ میری تو بالکل کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' وہ واقعی بہت بے بسی کی حالت میں تھیں۔

''آپ کوشش کریں وہ دوبارہ آفس جوائن کرے...... اس کا ذہن کام کی وجہ سے بٹے گا۔'' عکس نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ وہ اس صورت حال کو سمجھ پا رہی تھی جس میں منزہ پھنس گئی تھیں۔

لیکن منزہ کی طرح خود اسے بھی اس مسئلے کا حل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ منزہ ماں تھیں اور شیر دل کے قریب تھیں پھر بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتی تھیں اس کے لیے یہ دونوں ہی آسانیاں نہیں تھیں۔

اس شام وہ پھر الجھی ہوئی واپس گھر آئی تھی اور خیر دین سے اس کا اضطراب چھپا نہیں رہا تھا۔ اس کے سوال و جواب کو وہ ٹال گئی۔ وہ اس رات بھی دیر تک جاگتی شیر دل کے لیے فکرمند ہوتی رہی اس کی تکلیف اور پریشانی اب آہستہ آہستہ جیسے اس کے اپنے اعصاب کو مشتعل کرنے لگی تھی...... اور حل...... حل کہیں نہیں تھا کسی کے پاس نہیں تھا...... کم از کم حل وہ نہیں تھا جو منزہ نے چند دن بعد خیر دین کو فون کر کے نکالا تھا...... اور جس نے خیر دین کو بری طرح سے برانگیختہ کیا تھا۔

''شیر دل کی ماں نے فون کیا تھا آج مجھے۔'' منزہ سے ہونے والی اس گفتگو کے تین یا چار دن بعد کی بات تھی جب وہ ویک اینڈ پر صبح بہت دیر سے اٹھ کر آئی تھی۔ پچھلی ساری رات وہ چیف منسٹر کے کسی وزٹ کی وجہ سے معروف رہی تھی اور اس کی گھر واپسی بھی فجر سے کچھ پہلے ہوئی تھی۔

چائے کا کپ اٹھاتے اٹھاتے وہ رک گئی۔ خیر دین سے اس کی ملاقات پچھلی رات نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ابھی ہوئی تھی۔ اسے فوری طور پر سمجھ نہیں آیا۔ منزہ نے خیر دین کو پچھلی رات کال کی تھی یا آج صبح۔ وہ سوالیہ نظروں سے خیر دین کو دیکھنے لگی۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں کہ شیر دل اور شہر بانو کی طلاق ہو گئی ہے؟'' خیر دین نے اس سے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

''شاید مجھے خیال نہیں رہا۔'' مدھم آواز میں کہتے ہوئے اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ خیر دین نے ابھی نظروں سے اسے دیکھا وہ اتنی عام سی بات نہیں تھی کہ اسے خیال نہ رہتا۔

''شیر دل سے تمہارے رشتے کی بات کی ہے انہوں نے مجھ سے۔'' چائے کا پہلا سپ لیتے ہوئے خیر دین کے نکلے جملے پر اس کا ہاتھ بری طرح لرزا تھا لیکن اس نے اپنی لرزش پر قابو پا لیا، وہ چند لمحوں کے لیے اندر باہر سے مکمل طور پر بل کر رہ گئی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ منزہ ایسی کوئی بات خیر دین سے کر سکتی تھیں...... ان کے بدلے ہوئے رویے کے باوجود وہ منزہ سے اس چیز کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

''میں نے صاف انکار کر دیا۔'' خیر دین نے رکے بغیر اگلا جملہ ادا کیا۔ وہ جملہ متوقع ہونے کے باوجود اس نے بھی اسے ہلایا تھا پر اس بار زلزلے کی شدت کم تھی۔ ''میں نے انہیں بتا دیا کہ تمہاری شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور تیاریاں ہو رہی ہیں۔'' خیر دین بتا رہا تھا لیکن وہ چائے پیتے ہوئے چپ چاپ خیر دین کی بات سنتی رہی...... اس کے لہجے میں ایک خفگی جھلکنے لگی تھی۔ ''اتنا سب کچھ کرنے کے بعد انہیں مجھ سے اس طرح کی بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ انہیں خود احساس ہونا چاہیے تھا کہ وہ تم پر کیسے کیسے الزامات لگا چکی ہیں۔ تمہارا رشتہ تڑوا چکی ہیں اور پھر آج دوبارہ اپنے بیٹے سے رشتے کی بات کرنے بیٹھ گئیں۔ وہ بھی فون پر...... جیسے ہم ایسے ہی گرے پڑے اور گئے گزرے ہیں کہ وہ ایک فون کریں گی اور میں تمہاری شادی ان کے بیٹے سے کر دوں گا۔'' خیر دین کی آواز کی خفگی اب جیسے کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ عکس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا لیکن اس نے چائے کا آدھ بھرا کپ ٹیبل پر رکھ دیا تھا، وہ گھر کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خیر دین کی کرسی کے عقب میں نظر آنے والے لان میں بھاگتی دوڑتی بلیوں کو دیکھنے لگی...... توجہ بھٹکانا بے حد ضروری تھا۔

''سجاد بہت اچھا لڑکا ہے اور میں زبان دے چکا ہوں...... اتنے اچھے رشتے کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے بیٹے کے بارے میں سوچنے کی بھی کیا ضرورت ہے......'' خیر دین دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ چپ سنتی رہی، پتا نہیں اسے یہ کیوں لگ رہا تھا کہ منزہ کی اس گفتگو کے بارے میں شیر دل بالکل لاعلم ہو گا۔

''ہمارے اور ان کے درمیان بہت فرق ہے...... اور یہ فرق ساری عمر رہے گا۔ تم سجاد کے ساتھ خوش رہو گی چڑیا...... میں جانتا ہوں تم کسی کے ساتھ بھی خوش رہ سکتی ہو...... شیر دل تمہاری ضرورت نہیں ہے......''

وہ خاموشی سے خیر دین کو دیکھتی رہی اس کی خاموشی کو انہوں نے ایک بار پھر اپنی مرضی کا مفہوم دے کر جیسے اپنے فیصلے کی توجیہہ اسے دینے کی کوشش کی تھی۔

''شیر دل بہت اچھا ہے لیکن سجاد......'' عکس نے مدھم آواز میں ان کی بات کاٹ دی۔

''نانا آپ نے جو کیا ٹھیک کیا، آپ نے جو فیصلہ کیا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے خیر دین کا ہاتھ پکڑ لیا پھر چند لمحے اس ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیے بیٹھی رہی یوں جیسے اپنے لفظوں کے بجائے ہاتھ کے اس لمس سے خیر دین کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کر رہی ہو...... پھر وہ کچھ کہے بغیر خیر دین کا ہاتھ چھوڑ کر وہاں سے اندر چلی گئی۔ خیر دین بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ خوشی اور اطمینان ہونا چاہیے تھا...... نہیں ہوا تھا...... سکون ملنا چاہیے تھا، وہ بھی نہیں ملا تھا...... فخر کی بات تھی اس کے لیے...... لیکن پتا نہیں اسے کیوں نہیں لگی۔

اسے کئی سال پہلے چڑیا کا بچپن یاد آ گیا تھا جب وہ اس کے پاس شکایت لے کر آئی تھی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں لیے ایبک اس کے ساتھ ٹینس نہیں کھیل رہا تھا۔ نہ ہی اسے اپنا ریکٹ دے رہا تھا...... اور خیر دین نے بڑی سنجیدگی سے دو ٹوک انداز میں اسے دوبارہ ایبک کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا تھا...... پھر ایبک اسے منانے آ گیا تھا اور وہ خیر دین کے حکم اور ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس کے ساتھ کھیلنے تو نہیں گئی تھی لیکن گم صم ہو گئی تھی...... اسے آج بھی وہ ویسی ہی گم صم لگی تھی لیکن وہ کیا کرتا...... وہ ایبک شیر دل کو اس کا جیون ساتھی چاہتے ہوئے بھی نہیں بنانا چاہتا تھا، وہ اپنی چڑیا کو اس خاندان کا حصہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جس نے...... اور پھر وہ سجاد کے خاندان کو زبان دے چکا تھا۔ زبان دے کر اور شادی کی تاریخ طے کر کے کیسے مکر جاتا...... خیر دین نے اپنی زبان کا پاس تو ساری عمر کیا تھا پھر اب کیسے نہ کرتا۔

☆☆☆

عکس مراد علی نے زندگی میں بہت ساری بے خواب راتیں گزاری تھیں۔ وہ رات بھی انہی راتوں میں سے ایک تھی۔ بہت سی چیزیں بھی اس وقت آپ کو ملنے کا امکان پیدا ہوتا ہے جب آپ کو ان کی خواہش اور ضرورت دونوں نہیں رہتیں لیکن ان کے ساتھ منسلک محبت اور تعلق ویسے ہی رہتے ہیں۔

عکس مراد علی نے زندگی میں کبھی ایک شیر دل کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنانے کا نہیں سوچا تھا...... خواب میں بھی نہیں...... اور جو چیز اس کے خوابوں خیالوں میں کبھی نہیں آئی وہ option بن کر کیسے آ گئی تھی۔ وہ اپنی اداسی کی وجہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کس چیز نے بے چین کر رکھا تھا اسے...... اس پروپوزل

کے آنے یا اس پروپوزل کے ریجیکٹ ہو جانے سے......
''بس ممی نہیں مانتیں...... وہ مان جائیں ناں تو تم سے شادی کا پہاڑ بھی سر ہو جائے۔'' کئی سال پہلے ایک بار ایک شیردل نے اس کے سامنے منزہ کو منانے میں بار بار ناکام ہونے کے بعد اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تم ممی کو منانے کی کوشش کر ہی کیوں رہے ہو...... وہ مان بھی جائیں تو نکاح نامے پر ان کے نہیں، میرے دستخط چاہیے ہوں گے تمہیں شادی کے لیے۔'' عکس نے اس کی بات سے ہونے والی تکلیف کو مسکراہٹ کے بہت سارے پردوں میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

''تم تو مان جاؤ گی......'' شیردل نے عجیب بے پروائی سے کہا تھا۔

''خوش فہمی ہے تمہاری...... مجھے تم سے شادی میں دلچسپی نہیں ہے...... تمہاری ممی، پاپا مان بھی جائیں تو بھی...... اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کی نظروں میں اپنا امیج خراب مت کرو...... تمہاری کزن شہربانو زیادہ سوٹ ایبل ہے تمہارے لیے...... تم اس کے بارے میں سوچو۔'' اس نے شیردل سے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''اب اگر میں نے تمہیں یہ بتا دیا ہے کہ صدیوں بعد ایک کزن دریافت کر لی ہے میں نے امریکا میں تو اس کا یہ مطلب نہیں تم اس سے میرا رشتہ جوڑنے بیٹھ جاؤ۔'' شیردل فون پر اس سے بات کرتے ہوئے برا مان گیا تھا۔

''تم چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ پھرتے ہو اور......'' شیردل نے عکس کی بات کاٹی۔

''چوبیس گھنٹے......؟ ہم ایک اپارٹمنٹ شیئر کر رہے ہیں یار...... اور تم کیا جیلس ہو رہی ہو؟''

''کس بات سے جیلس ہونا ہے میں نے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''شہربانو سے...... I really like her Sherdil۔''

''کیوں......؟'' ایک لمحے کے لیے اس اچانک آ جانے والے سوال کا جواب اسے نہیں آیا۔

''وجہ ضروری تو نہیں ہوتی کسی کو پسند کرنے کے لیے۔'' اس نے بالآخر سنبھل کر کہا۔

''تم شہربانو میں بہت Interest لیتی ہو۔'' شیردل نے اگلے تبصرے سے ایک بار پھر اسے لاجواب کیا۔

''تم interest نہیں لے رہے اس میں کیا؟'' عکس نے جواباً کہا۔

''میں ہر لڑکی میں لیتا ہوں۔'' شیردل نے ڈھٹائی سے کہا۔

''صرف اسی وجہ سے میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' عکس نے اسی انداز میں کہا۔

''تم سے شادی کے بعد کسی میں نہیں لوں گا۔'' شیردل نے بے ساختہ کہا۔

''میں نہیں چاہتی تم اتنی بورنگ لائف گزارو...... شہربانو......'' شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یار میں اس کا اتنا ذکر نہیں کرتا جتنا تم کرنے لگی ہو...... آخر تم کیوں چاہتی ہو کہ میں اس سے شادی کر لوں اگر تمہارے علاوہ ہی کسی سے شادی کرنی ہے تو پھر میرے پاس بھی کچھ اور options ہیں۔''

''ان options میں کوئی آپشن شہربانو جیسا اچھا نہیں ہے۔''

پتا نہیں اسے آج وہ سب کچھ کیوں یاد آنے لگا تھا۔ باربی ڈول اب بھی اس کے دل کے کسی کونے میں سمائی ہوئی تھی جیسے ایک شیردل...... چڑیا کے لیے ان دونوں کی محبت سے دامن چھڑانا بہت مشکل تھا۔

وہ اور شیردل امریکا میں اس کے قیام کے دوران آپس میں رابطے میں تھے۔ شہربانو سے تعارف ہونے سے لے کر شہربانو کے ساتھ گزارے جانے والا کوئی ایسا وقت اور سرگرمی نہیں تھی جس کا ذکر اس نے عکس سے نہ کیا ہو۔ یہ راز بھی اس نے اپنی فیملی سے بھی پہلے عکس ہی کے ساتھ شیئر کیا تھا کہ شہربانو اس کے اکلوتے ماموں شہباز حسین کی بیٹی تھی جس سے وہ ایک طویل مدت کے بعد متعارف ہوا تھا...... اور وہ پہلا موقع تھا جب عکس نے شیردل سے شہربانو کی تصویر ای میل کرنے کے لیے کہا تھا...... وہ باربی ڈول کو دیکھنا چاہتی تھی...... اتنے سالوں کے بعد بھی اسے یاد تھا وہ کس طرح بے قراری سے صرف اس سے بات کرنے کے لیے اس کی کلاس کے چکر لگاتی رہی تھی ...... بچپن کی اچھی اور بری کوئی یاد عکس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی تھی۔

شیردل نے اسے شہربانو کی صرف ایک تصویر ای میل نہیں کی تھی بہت ساری کر دی تھیں۔ چڑیا اتنے سالوں بعد بھی باربی ڈول کو دیکھ کر اس سے نظر نہیں ہٹا سکی تھی...... وہ آج بھی سحر زدہ کرنے والے حسن کی مالک تھی اور چڑیا آج بھی اس پر اسی طرح دل و جان سے فدا ہوئی تھی جس طرح بچپن میں۔ وہ بہت سی تصویروں میں شیردل کے بہت قریب تھی...... کسی میں اس کا بازو تھامے، کسی میں ہاتھ...... کسی میں شیردل کے برابر بالکل ساتھ بیٹھی ہوئی...... کوئی بھی ان تصویروں پر نظر ڈالتے ہی یہ جان جاتا کہ تصویروں میں نظر آنے والے جوڑے کے درمیان صرف دوستی نہیں تھی۔ شیردل نے جان بوجھ کر اسے اپنی اور شہربانو کی ایسی تصاویر بھیجی تھیں جنہیں دیکھ کر عکس کو تھوڑا بہت حسد تو ضرور ہو جاتا مگر اس پر الٹا اثر ہوا تھا۔ شیردل اب جیسے اس کے لیے وہ candy بن گیا تھا جو باربی ڈول کو پسند تھی اور چڑیا وہ candy باربی ڈول کو ہر قیمت پر دلانا چاہتی تھی اور اس نے دلا دی تھی۔

☆☆☆

منزہ اس وقت گھر سے کہیں جانے کے لیے نکل رہی تھیں جب آپریٹر نے انہیں عکس کی کال کے بارے میں بتایا۔ ایک دن پہلے خیر دین کے صاف اور دوٹوک انکار کے بعد بھی وہ عکس کی کال پر ایک دم ایکسائٹڈ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اسی ایکسائٹمنٹ میں آپریٹر کو کال بند کرنے کا کہا اور اپنے بیڈروم میں جا کر اپنے سیل فون سے عکس کو کال کی۔

''بیٹا تم اگر کال نہ کرتیں تو میں ہی تمہیں کال کرنے والی تھی۔'' عکس کی آواز سنتے ہی انہوں نے چھوٹتے ہی اس سے کہا تھا۔

''تمہارے نانا نے تمہیں بتایا ہوگا کہ میں نے ان سے تمہارے اور شیردل کے رشتے کی بات کی ہے۔''

''میں شیردل سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے منزہ کا پہلا جملہ سنتے ہی سنجیدہ آواز میں انہیں ٹوک دیا۔ ''اور میں چاہتی ہوں آپ میرے نانا سے اس سلسلے میں دوبارہ بات نہ کریں۔'' انہیں چند لمحے سمجھ نہیں آیا کہ وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہیں۔ انہوں نے خیر دین سے انکار سنا تھا لیکن انہیں عکس سے انکار کی توقع نہیں تھی۔

''میں بہت خلوص سے تمہیں اپنی فیملی کا حصہ بنا کر شیردل کی زندگی میں لانا چاہتی ہوں۔'' منزہ نے بالآخر کہا۔ ''شیردل اس وقت بہت مشکل وقت سے گزر رہا ہے تمہارا ساتھ اسے مل جائے گا تو......'' عکس نے ایک بار پھر ان کی بات کاٹ دی۔

''آنٹی میں ایک دوست کے طور پر شیر دل کی مدد کر سکتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے اور اسے آپس میں کوئی نیا رشتہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے اور اس کے درمیان محبت والا رشتہ اور تعلق نہیں ہے۔۔۔ہم بہت اچھے دوست ہیں اور میں اس رشتے کو بس یہیں تک رکھنا چاہتی ہوں۔ آپ نانا سے دوبارہ اس سلسلے میں بات مت کریں کیونکہ وہ میرے لیے بہت upsetting ہے۔'' اس کے لہجے میں اتنی قطعیت تھی کہ منزہ جواباً کچھ نہیں کہہ سکیں......زندگی واقعی بڑی عجیب اور بے رحم چیز ہوتی ہے انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بھی ایسے کسی خاندان کی لڑکی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی کے لیے گڑگڑائیں گی اور وہ انکار کر دے گی۔ انکار تو ہمیشہ ان کا اور ان کے خاندان کا استحقاق رہا تھا۔۔۔کسی کمتر خاندان والے کو کیسے مل جاتا۔

''تم شیر دل سے اس کا ذکر مت کرنا۔'' منزہ نے ایک دم بے قراری سے کہا۔ انہیں اچانک ہی یاد آ گیا تھا کہ کچھ ایسی ہی گفتگو چند دن پہلے شیر دل نے بھی ان سے کی تھی لیکن انہوں نے اس کی گفتگو کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے خیر دین سے بات کی تھی۔ ہاں البتہ انہیں اگر اس دفعہ ٹینشن کم تھی تو صرف اس وجہ سے کم تھی کیونکہ انہوں نے خیر دین سے بات کرنے سے پہلے بختیار سے بات کر لی تھی اور بختیار کی اجازت ملنے کے بعد ہی انہوں نے خیر دین سے رابطہ کیا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں، میں شیر دل سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔'' ان کے جملے نے عکس کے اس اندازے کی تصدیق کی تھی جو اس نے پہلی رات لگایا تھا۔ شیر دل اس سارے معاملے سے بالکل بے خبر تھا۔ منزہ نے اس سے مزید بات نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے وہ اتنی بددل ہوئی تھیں کہ انہوں نے چند اختتامی کلمات کے ساتھ فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

''مجھے بڑا افسوس ہوا تم لوگوں کی seperation کا سن کر......آئیڈیل کپل تھا تم لوگوں کا......آخر ایسا کیا ہوا کہ اس طرح ہفتوں میں divorce ہو گئی۔'' آ کلہ کو واقعی بہت افسوس ہوا تھا لیکن شہر بانو کے لیے وہ سب کچھ سننا ایک عجیب تکلیف کا باعث بن گیا تھا۔

آ کلہ، شیر دل کے ایک بیچ میٹ یوسف کی بیوی تھی۔ وہ ان چند عورتوں میں سے تھی جن کے ساتھ شہر بانو کی بہت اچھی علیک سلیک ہی نہیں تھی بلکہ کسی حد تک بے تکلفی بھی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آ کلہ خود بھی امریکا میں ہی پلی بڑی تھی۔ شہر بانو اور اس کے درمیان اسی ایک commonconnection (باہمی تعلق) نے بے تکلفی پیدا کر دی تھی۔

وہ اب اپنے ایک بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے امریکا آئی تھی تو شہر بانو سے فون پر بات کرنے کے بعد وہ اس سے ملنے بھی چلی آئی۔

''میں نے تم سے اس سارے جھگڑے کا پتا چلنے پر بہت دفعہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم فون ہی نہیں لیتی تھیں۔'' آ کلہ کہہ رہی تھی۔

''ہاں، میں بہت اپ سیٹ تھی ان دنوں اس لیے۔'' شہر بانو نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''یوسف سنگاپور میں شیر دل کے ساتھ کورس کر رہا تھا، اسی نے وہاں سے واپس آنے کے بعد مجھے بتایا کہ شیر دل اور تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ شیر دل وہاں بھی بڑا اپ سیٹ تھا اس نے یوسف سے کسی بات پر ذکر کیا تھا تم نے شاید تب اس سے بات کرنا بند کر دی تھی۔'' آ کلہ کی بات پر شہر بانو کو غصہ آیا۔

''اوہ، تو وہ مجھے ہر جگہ بدنام کرتا پھر رہا ہے اور میں سمجھتی تھی کہ وہ ایک ذاتی ایشو کو لوگوں کے ساتھ ڈسکس نہیں کرے گا۔'' آ کلہ اس کے ردعمل پر حیران ہوئی۔ وہ پہلی بار شہر بانو کو اس طرح ری ایکٹ کرتے دیکھ رہی تھی اور وہ جیسے کچھ محتاط ہو گئی تھی۔

''نہیں، شیر دل کچھ اپ سیٹ تھا اسی لیے یوسف نے پوچھا ہو گا تو اس نے ذکر کیا لیکن اس نے details نہیں بتائی تھیں۔ یوسف کورس کرنے کے بعد واپس آیا۔ تب اس نے مجھ سے ذکر کیا کہ شیر دل بہت اپ سیٹ رہا ہے پورے کورس کے دوران......اس کے اور شہر بانو کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے شاید......میں نے تب بھی سوچا تھا کہ تم سے بات کروں لیکن یوسف نے منع کر دیا کہ یہ مناسب بات نہیں ہے۔'' آ کلہ نے اس بار جیسے اسے تفصیلات دینے کی کوشش کی......وہ لاشعوری طور پر شیر دل کی پوزیشن بھی کلیئر کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور شہر بانو......یہ نوٹس کر رہی تھی۔

''شیر دل میری وجہ سے اپ سیٹ نہیں ہو گا وہ اگر اپ سیٹ ہو گا تو عکس کی وجہ سے ہو گا۔'' وہ عکس کا نام نہیں لینا چاہتی تھی اور اب تو بالکل بھی نہیں......جو ہونا تھا......ہو گیا تھا......گزر چکا تھا......اب ایسے ذکر اور الزام تراشی کا کیا فائدہ ہوتا تھا......وہ کسی پر کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتی تھی جس کے چھینٹے اس کے اپنے دامن تک آتے لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ عکس کا نام لیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''عکس......؟ عکس مراد علی؟'' آ کلہ نے جیسے کچھ حیران ہو کر اس سے پوچھا۔ ''اس کی فیملی میں ہونے والی ایمرجنسی کی وجہ سے وہ کورس چھوڑ کر چلی گئی تھی!'' آ کلہ کو اب بھی شہر بانو کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے اس پہیلی کو بوجھنے کے لیے ایک اندازہ لگایا جو شہر بانو نے اس کو بوجھنے کے لیے دی تھی۔

شہر بانو نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ''عکس کورس چھوڑ کر چلی گئی تھی؟'' آ کلہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں اس نے کورس نہیں کیا۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن ہی وہ واپس چلی گئی تھی۔ شیر دل کا اس کی فیملی میں ہونے والی ایمرجنسی سے کیا تعلق ہے؟ وہ اس کی وجہ سے کیوں اپ سیٹ ہو گا؟'' آ کلہ اب اس سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ اسی طرح بھونچکا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ عکس کے پاس شیر دل کا فون تھا لیکن وہ سنگاپور میں نہیں تھی......شیر دل کا فون......شیر دل کا فون......اس نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی کہ شیر دل نے اسے

سنگاپور سے کس نمبر سے کال کی تھی...... اس نے سنگاپور جا کر اسے اپنے ہی فون سے کال کی تھی...... دو دن شیر دل اسے اپنے ہی فون سے کال کرتا رہا تھا پھر اس نے دوسرے نمبرز اور کالنگ کارڈ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے یہ بات اس لیے یاد تھی کیونکہ وہ بعض دفعہ شیر دل سے بات نہ کرنے کے فیصلے پر جمے رہنے کے باوجود اس کا فون اس وقت غلطی سے اٹھا لیتی تھی جب وہ فون پر کوئی اور نمبر دیکھتی تھی پھر شیر دل کی آواز سن کر وہ فوری طور پر فون بند کر دیتی اور اس وقت وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ شیر دل شاید صرف اس سے بات کرنے کے لیے یہ نمبر استعمال کر رہا تھا اور جان بوجھ کر کالنگ کارڈ استعمال کرنا شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسے شیر دل کی ای میل یاد آئی جس میں اس نے شہر بانو کو کہا تھا کہ اس کا فون کام نہیں کر رہا سو فی الحال وہ فون پر اس سے رابطہ نہ کرے۔

"تو فون کام کر رہا تھا لیکن عکس پاکستان میں تھی اور اگر وہ پاکستان میں تھی تو......" وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکی اس کے دماغ میں ایک دم جیسے کوئی جھکڑ چلنے لگا تھا۔ شرمین اور عکس کی بات کب ہوئی تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اسے اب ہر قیمت پر چاہیے تھا۔

آنکلہ سے ٹال مٹول کرنے کے بعد اس کے جاتے ہی اس نے شرمین سے جا کر یہی سوال کیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے شرمین بھی اسی طرح بھونچکا رہ گئی تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ اگر وہ پاکستان میں تھی تو شیر دل کا فون اس کے پاس کیسے ہو سکتا تھا......" اس نے بھی ویسی ہی بے یقینی کے عالم میں اس سے کہا۔

"ہو سکتا ہے شیر دل نے اسے دے دیا ہو...... وہ ایمرجنسی میں پاکستان جا رہی تھی شاید اس کی ضرورت تھی یا کوئی بھی اور وجہ ہو سکتی ہے۔" وہ بہت الجھی ہوئی شرمین کے پاس بیٹھی یہ معاملہ حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"لیکن پھر شیر دل نے تم سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ فون خراب ہو گیا۔" شرمین کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ممی وہ کبھی مجھے ان حالات میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے اپنا فون استعمال کے لیے عکس کو دیا تھا......
وہ" شہر بانو بات کرتے کرتے رک گئی اس کی آواز کانپنے لگی تھی she had ...... committed the blunder of her life ......(اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی) اور اسے اب احساس ہوا تھا...... غلطی کسی سے بھی ہو سکتی تھی اور غلط فہمی بھی...... شرمین کو بھی...... اس نے شیر دل کو اپنی زندگی سے فوری طور پر نکال دینے کا فیصلہ اس ایک فون کال کی وجہ سے کیا تھا...... شیر دل کے کسی دوسری عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات...... یہ وہ غلطی تھی جس کے لیے وہ شیر دل کو بھی معاف نہیں کر سکتی تھی...... اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے جلد بازی ہو گئی تھی۔

شرمین سے مزید کچھ کہے بغیر شہر بانو نے فون اٹھا کر آنکلہ کا نمبر ملایا اور اسے یوسف سے عکس کے سنگاپور سے روانہ ہونے کی تاریخ اور وقت پوچھنے کو کہا۔ آنکلہ اس تفتیش پر بے حد حیران ہوئی تھی اور حیرانی سے زیادہ الجھن تھی جس کا وہ شکار تھی لیکن اس نے شہر بانو سے سوال جواب نہیں کیے تھے اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کرنے کو کہا۔

"میں نے اسے 15 تاریخ کو کال کی تھی سنگاپور میں رات تھی اس وقت۔" شرمین نے شہر بانو کو فون رکھتے

دیکھ کر اس کے کسی بھی سوال سے پہلے کہا۔ وہ چاہتی بھی تو اس تاریخ کو بھلا نہیں سکتی تھی۔ شہر بانو کو وہاں آئے ابھی چند دن ہی تو ہوئے تھے۔ شہر بانو نے جواب میں کچھ نہیں کہا اس کی چھٹی حس بار بار جیسے کسی خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

سٹنگ ایریا میں چپ چاپ مجسموں کی طرح بیٹھی وہ دونوں اس وقت صرف ایک دعا کر رہی تھیں کہ ان کی غلط فہمی غلط نہ ہو۔

پندرہ منٹ بعد آنکلہ نے فون کیا تھا شہر بانو چند لمحے سفید چہرے کے ساتھ فون سنتی رہی پھر فون رکھتے ہوئے اس نے ستے چہرے کے ساتھ شرمین کو دیکھا۔ اس کی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے شرمین کا دل جیسے ڈوبا تھا۔

"وہ 14 کو پاکستان چلی گئی تھی۔" زندگی میں ایسی چپ شرمین کو دوسری بار لگی تھی شہر بانو نے فون رکھ دیا تھا۔ بہت دیر تک وہ دونوں گم صم بیٹھی رہیں پھر شرمین نے جیسے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"تم شیر دل کو صرف ایک کال کی وجہ سے تو چھوڑ کر نہیں آئی تھیں شہر بانو۔" شرمین نے جیسے اسے یاد دلایا تھا...... اس نے نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

"لیکن میں نے اس سے طلاق صرف اسی ایک کال کی وجہ سے لی تھی۔" اس کے حلق سے ایک سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

☆☆☆

"چڑیا؟" وہ خیر دین کی آواز پر ہڑبڑا کر چونکی تھی۔ "تم ابھی تک سوئی نہیں؟" خیر دین تہجد کے لیے جاگا تھا جب گھر میں ہونے والی آہٹوں پر اپنے کمرے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ عکس تھی جو رات کے پچھلے پہر راہداری کی کھڑکیوں سے باہر جھانکتے ہوئے وہاں ٹہل رہی تھی اور کسی گہری سوچ میں گم تھی اس نے نہ خیر دین کے کمرے کے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی تھی نہ ان کے باہر نکلنے کی۔ وہ راہداری کے چکر لگاتے ہوئے میکانکی انداز میں وقفے وقفے سے قد آدم کھڑکیوں سے باہر لان میں جلتی لائٹ میں نظر آنے والے پودوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میں بس سونے جارہی تھی۔'' اس نے خیر دین کے سوال کے جواب میں بے حد عجلت سے کہا اور رُکے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ خیر دین وہیں کھڑا رہا وہ پچھلی رات نہیں تھی جب اس نے عکس کو راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھر میں پھرتے اور اس راہداری میں ٹہلتے دیکھا تھا۔ وہ پچھلے چند دنوں میں کئی بار عکس کو اسی طرح رات کے پچھلے پہر گھر میں پھرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ بے چین، مضطرب اور اداس تھی...... اور اسے خیر دین کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی...... خیر دین کے دل پر عجیب سا بوجھ دھرا تھا...... بعض دفعہ اسے لگتا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنے رات گئے وہاں آتی تھی اور پھر اس کے کمرے میں جانے کی ہمت کیے بغیر وہیں ٹہلتی رہتی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بچپن سے ہی ایسی تھی...... اکیلی پھرتی...... اکیلی کھیلتی...... اکیلی جاگتی...... خود سے باتیں کرتی...... پر وہ بچپن تھا اور بچپن کی تنہائی بڑوں کو تنگ نہیں کرتی۔

''تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے کیا چڑیا؟'' صبح آفس جاتے ہوئے ناشتے کی میز پر خیر دین نے عکس سے کہا، وہ چونک گئی۔

''مجھے؟ نہیں تو......؟''

''پتا نہیں مجھے کیوں ایسا لگتا ہے جیسے تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو اور اگر تم کچھ کہنا چاہتی ہو تو مجھ سے کہہ دو چڑیا، میں تمہاری بات سنوں گا...... میں تمہاری کوئی بات نہیں ٹالوں گا۔'' پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جس میں خیر دین نے چڑیا کی خوشی کے سامنے ہار مان لی تھی لیکن وہ اپنی زبان سے یہ بات کہنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا کہ وہ شیر دل سے چڑیا کی شادی کرنے پر تیار ہے۔

''مجھے کچھ بھی نہیں کہنا نانا...... اور جو کہنا ہوتا ہے میں کہہ دیتی ہوں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھتی۔'' توس پر مکھن لگاتے ہوئے اپنے ہی آخری جملے پر اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ وہ جھوٹ تھا اور یہ بات وہ دونوں جانتے تھے...... عکس مراد علی سے زیادہ بہتر راز رکھنا کسی کو نہیں آتا تھا۔

''آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟'' خیر دین کے پاس اس سوال کا جواب تھا لیکن بتا دینے کی ہمت نہیں۔

☆☆☆

سیا تو اس آسمان ان کے سر پر آ گرتا تو انہیں اتنا شاک نہ لگتا جتنا شیر دل کی بات پر لگا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا...... منزہ اور بختیار ابھی کچھ دیر پہلے ہی کسی ڈنر سے واپس آئے تھے اور وہ ابھی لاؤنج میں بیٹھی اس کے ابھی تک گھر نہ آنے پر کچھ مضطرب سی ہو کر اسے کال کر رہی تھیں جب وہ اندر آ گیا تھا۔

''تم صبح سے کہاں غائب ہو شیر دل؟'' منزہ کو یک دم جہاں اطمینان ہوا تھا وہاں ایک عجیب سی بے چینی بھی۔

''آپ کو بتا کر گیا تھا ممی کہ مجھے کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے وہیں صوفے پر ان کے پاس بیٹھ گیا اور پھر بغیر کسی تمہید کے اس نے جو بات منزہ سے کہی اب وہ اسی بات کو سن کر شاید اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

''تم نے کیا کہا؟'' انہیں یک دم احساس ہوا کہ انہیں غلطی بھی ہو سکتی تھی ضروری تھا کہ وہ اس سے ایک بار پھر سوال کر لیتیں۔

''میں نے آپ سے کہا کہ آپ اور پاپا عکس کے نانا کے پاس جا کر اس سے میرے رشتے کی بات کریں۔'' شیر دل نے اپنی بات دُہرادی۔ منزہ نے اب بھی وہی سنا تھا جو پہلے سنا تھا۔ ان کا دل یک دم جیسے ایک عجیب سی خوشی سے بھرا تھا۔ وہ جیٹھے بٹھائے اس بات پر کیسے مان گیا تھا۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھیں لیکن انہوں نے سارے سوالات کو فوری طور پر بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم کب چاہتے ہو کہ ہم عکس کے گھر جائیں؟''

''کل ہی چلے جائیں۔'' شیر دل نے اسی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن تم نے عکس سے بات کی ہے؟ اس سے پوچھ لیا ہے؟'' منزہ کو جیسے کسی خدشے نے ستایا۔

''ضرورت پڑی تو پوچھ لوں گا...... فی الحال تو ضرورت نہیں ہے...... عکس کو کسی بات پر اعتراض ہوا بھی تو اس کے نانا اسے منالیں گے...... میں بس چاہتا ہوں آپ کل جا کر اُن سے رشتے کی بات کریں۔'' شیر دل اسی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''میں کر تو لوں گی لیکن شاید تمہیں یہ نہیں پتا کہ عکس کی جاوید سے منگنی ٹوٹنے کے بعد ایک اور منگنی ہو چکی ہے اور اس کی شادی کی تیاریاں شروع ہیں، ایسے میں وہ تمہارے رشتے پر کیسے رضامند ہوگی؟'' منزہ نے اپنی تشویش جیسے اس کے ساتھ بانٹی......

''آپ وہاں جا کر رشتے کی بات کریں، یہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔'' وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ پتا نہیں منزہ کو کیوں ایسا لگا کہ وہ عکس سے مل کر آیا تھا اور یقیناً اسے رشتے پر آمادہ کر آیا تھا...... لیکن چند دنوں میں اس کی یہ کایا کلپ کیسے ہوگئی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ لیکن وہ بے انتہا خوش تھیں اور خوش ہونے سے بھی زیادہ وہ مطمئن تھیں۔ آج انہوں نے ایک بار پھر شیر دل کو ایک نارمل انسان کی طرح ایک نارمل زندگی کی بات کرتے دیکھا تھا اور کسی نے ان کے کندھوں سے جیسے منوں بوجھ اتار دیا تھا۔

☆☆☆

''کیا چاہیے تمہیں؟''

''کچھ نہیں......'' شہر بانو نے ساتھ چلتی مثال کو دیکھا۔ مثال کا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت میں ضرور تھا لیکن وہ مکمل طور پر اس سے بے نیاز سائڈ واک پر دکانوں کی کھڑکیوں میں لگی چیزیں دیکھتی اور کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کیے بغیر چل رہی تھی۔ شہر بانو کو یاد تھا کہ وہ پہلے ایسی نہیں تھی، صرف کچھ مہینے پہلے جب وہ اور شیر دل اسے لے کسی شاپنگ والی جگہ پر جاتے تو مثال کو جیسے کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ شاپنگ اسٹورز میں پڑا ہر کھلونا اور ہر کھانے پینے کی چیز اٹھا کر گھر لے جائے۔ وہ ہر کھلونا اور ہر کھانے پینے کی چیز اٹھا کر، شہر بانو اور شیر دل کو باقاعدہ بحث سے قائل کرنے کی کوشش کرتی تھی کہ اسے اس کھلونے اور چیز کی کتنی اشد ضرورت تھی۔ شہر بانو کو تب اس کے ساتھ دماغ کھپانا نہیں پڑتا تھا، اس کام کے لیے شیر دل تھا۔ مثال کو سنبھالنا اور اس کی بحث کو سننا اس کی ذمے داری ہوتی تھی۔ وہ پچھلے چند مہینوں میں امریکا آنے کے بعد بالکل بدل گئی تھی۔ شہر بانو کو اب اسے زبردستی کھلونے یا کھانے پینے کی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا پڑتا...... زبردستی کھلونے خرید خرید کر تھمانے پڑتے جنہیں مثال عدم دلچسپی اور عجیب بے حسی کے عالم میں پکڑتی اور چل پڑتی تھی، ایک بچے والی خوشی اور ایکسائٹمنٹ اس کے چہرے یا انداز میں کبھی

نہیں جھلکتی تھی۔ اس کے بندھنوں کی نوعیت اور محور اب بدل گئے تھے۔

آج شہر بانو نے کئی دنوں کے بعد اسے ساتھ لے کر آؤٹنگ کے لیے آنے کا ارادہ کیا تھا، وہ جیسے بار بار مثال کے ساتھ اپنے شکست و ریخت کے شکار رشتے کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور یہ کچھ صبر آزما کام تھا۔

''مثال تمہیں کیا چاہیے؟'' شہر بانو نے جیسے ڈھیٹ بنتے ہوئے کوئی دسویں بار وہ سوال کیا تھا۔

''Nothing'' جواب اسی بیزاری اور روکھے پن کے ساتھ دیا گیا تھا جس کے ساتھ پہلے جواب آتے رہے تھے۔

''آئس کریم کھاتے ہیں ابھی!'' شہر بانو نے اس کی زکھائی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ مثال نے انکار یا اقرار دونوں نہیں کیے تھے...... جیسے کہہ رہی ہو...... آپ کی مرضی۔

کچھ دلبرداشتہ سی ہو کر شہر بانو نے اپنی توجہ ونڈو شاپنگ پر مرکوز کرلی۔ ایک شو اسٹور کی ونڈو میں لگے ہوئے ایک جوتے نے اس کی نظر اپنی طرف بھٹکائی تھی۔ وہ چلتے چلتے رک گئی وہ اس جوتے کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ونڈو میں لگے دوسرے جوتوں اور ان کی قیمتوں پر بھی نظر دوڑانے لگی۔ مثال بھی اس کے برابر میں کھڑی بے مقصد ان جوتوں پر نظر دوڑا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ شہر بانو کے ہاتھ میں تھا، شہر بانو کو وہاں رک کر ان جوتوں کا جائزہ لیتے ہوئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے جب مثال نے ایک دم عجیب جوش و خروش کے عالم میں بلند آواز میں کہا۔

''ممی، پاپا......'' اس نے کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے شہر بانو سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ شہر بانو ہڑبڑا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی پھر اس طرف دیکھنے لگی جدھر مثال دیکھتے ہوئے جا رہی تھی۔ وہ پاپا، پاپا کہتے ہوئے سائڈ واک پر چلتے درجنوں لوگوں کے درمیان سے جگہ بناتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی یوں جیسے کسی کے تعاقب میں ہو۔ شہر بانو برق رفتاری سے اس کے پیچھے گئی۔

''مثال، مثال......'' اس نے مثال کو آوازیں دے دے کر روکنے کی کوشش کی، وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ اس کے پکارنے پر عقب میں دیکھے بغیر کچھ اور تیز رفتاری سے آگے بھاگنے لگی تھی یوں جیسے اسے خدشہ ہو کہ شہر بانو اسے زبردستی روک لے گی۔ شہر بانو کو اسے نظروں سے اوجھل ہونے سے روکنے کے لیے اس کے پیچھے تقریباً بھاگنا پڑا تھا۔ اور پھر اس نے اس دراز قد آدمی کو دیکھ لیا جس کے پیچھے مثال بھاگتے ہوئے جا رہی تھی۔ وہ شیر دل نہیں تھا، شہر بانو نے ایک نظر میں ہی پہچان لیا تھا لیکن وہ عقب سے بالکل شیر دل ہی لگ رہا تھا۔ اس کی طرح دراز قد اور پُراعتماد انداز میں کسی لڑکی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے چلتے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ شہر بانو، مثال کو پکڑ لیتی وہ بھاگ کر اس آدمی کی ایک ٹانگ سے پاپا، پاپا کہتے لپٹ گئی تھی۔ وہ آدمی یک دم چونک کر رک گیا اور اس نے پلٹ کر اپنی دائیں ٹانگ سے لپٹی ہوئی بچی کو دیکھا تبھی اس نے بھی سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور پھر اس نے جتنی تیز رفتاری سے اس کی ٹانگ کو پکڑا تھا اتنی ہی تیز رفتاری کے ساتھ اس نے ٹانگ چھوڑ دی۔ شہر بانو نے اس آدمی اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی لڑکی کو مسکرا کر ایک دوسرے سے کچھ کہتے سنا پھر وہ دونوں آگے چل پڑے تھے۔ مثال اسی طرح کھڑی تھی۔ شہر بانو تھکے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور گھٹنوں کے بل اس کے عقب میں زمین پر بیٹھ کر اس نے مثال کو اپنی طرف موڑا۔ مثال کا چہرہ دھواں دھواں تھا اور اس کی آنکھوں میں شہر بانو نے

مایوسی کا ایک جہان دیکھا۔ وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑتے ہوئے کچھ دیر کے لیے چلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ اس کا اپنا چہرہ تھا۔ وہ بھی اسی طرح کئی بار شہر مین کے ساتھ چلتے، چلتے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ پڑتی تھی کسی بھی ایسے شخص کے پیچھے جو اسے شہباز حسین جیسا لگتا تھا۔ چہروں میں اپنے باپ کے چہرے کو کھوجتا...... اور لوگوں میں سے صرف ایک شخص کو ڈھونڈتا...... شہر بانو ان چند منٹوں میں پل کر رہ گئی تھی...... اس نے کبھی نہیں سوچا تھا...... پزل اور اسٹوری بکس کی بھول بھلیوں میں سے راستہ تلاش کرنے والی اپنی بیٹی کو وہ یہ تلاش سونپ دے گی۔

کچھ بھی کہے بغیر اس نے مثال کو گلے لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کے گلے لگنے کے بجائے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"I want to go to Papa
I want to go to Papa "

بعض دفعہ جس انا اور ضد کو کوئی دلیل اور کوئی ثبوت نہیں توڑ پاتے انہیں ایک بچے کے آنسو توڑ دیتے ہیں۔ شہر بانو بھی اس لیے وہاں اس فٹ پاتھ پر بیٹھے بری طرح ٹوٹی تھی۔ وہ فیصلہ جو عام حالات میں وہ کبھی مر کر بھی نہ کرتی، وہ اس نے مثال کو چپ کروانے کی کوشش میں اپنے سینے کے ساتھ لگا کر کر لیا تھا۔ وہ شیر دل کے پاس واپس جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

گھر میں داخل ہوتے ہی حلیمہ کا سامنا کرتے ہوئے پہلی نظر میں ہی عکس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ یا تو اپ سیٹ تھی یا غصے میں تھی۔

''آپ کو کیا ہوا؟'' عکس نے ملازم کو اپنی کچھ فائلز کے حوالے سے ہدایات دینے کے بعد حلیمہ سے کہا۔ اس کا اندازہ تھا شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں وہ کسی بات پر ناخوش تھی آج کل وہ اسی کام کے لیے آئی ہوئی تھی۔ فیملی کے باقی لوگوں نے ایک ہفتے تک پاکستان آجانا تھا۔ حلیمہ اسے بار بار آفس سے اب چھٹی کر لینے کا کہہ رہی تھی اور وہ مسلسل ٹال رہی تھی وہ شادی سے ہفتوں پہلے چھٹی لے کر نہیں بیٹھ سکتی تھی وہ بھی صرف اس لیے کہ اس پر ''روپ'' آئے مگر حلیمہ ایک روایتی ماں کی طرح اصرار کر رہی تھی۔

''ابا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' حلیمہ نے جواباً بڑی خفگی سے اس سے کہا۔ عکس نے ہکا بکا ماں کی شکل دیکھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار حلیمہ کے منہ سے ایسی بات سن رہی تھی اور وہ بھی خیر دین کے بارے میں۔

''امی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!'' عکس نے جیسے برا منا کر ماں کو ٹوکا تھا۔ ''کیا کیا ہے نانا نے کہ آپ ایسی بات کر رہی ہیں؟'' حلیمہ نے اسی خفگی سے اس سے کہا۔

''تم ابا سے بات کرو اور سمجھاؤ۔''

''کیا سمجھاؤں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ اس کا خیال تھا شادی کی تیاریوں اور انتظامات کے حوالے سے ہی حلیمہ اور خیر دین کے درمیان کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہوا ہوگا۔ مگر ایسا کون سا اختلاف تھا جس کے بعد حلیمہ خیر دین کا دماغ خراب قرار دے رہی تھی۔

''ابا سجاد کے ہاں جا کر انکار کر آئے ہیں۔'' حلیمہ نے خفگی سے اسے بتانا شروع کیا۔ عکس کی کچھ سمجھ

میں نہیں آیا۔

''کیا انکار کر آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''شادی سے انکار کر آئے ہیں۔'' حلیمہ اسی انداز میں بولتی رہی۔ اس بار عکس بھونچکا ہو کر رہ گئی تھی

''نانا نے سجاد سے رشتہ ختم کر دیا میرا؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں..... اور ایک شیر دل کے ماں باپ آئے تھے آج ابا نے ایک کے ساتھ رشتہ طے کر دیا.... ذرا سوچو وہ طلاق یافتہ ایک بچی کا باپ ہی ابا کو نظر آیا تمہارے لیے...... اور وہ بھی سجاد جیسا اچھا رشتہ چھوڑ کر..... اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ ابا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' حلیمہ بولتی جا رہی تھی اس بات کا اندازہ کیے بغیر کہ عکس پر کیا گزر رہی تھی۔

''نانا نے شیر دل کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیا؟'' اس نے بے یقینی میں حلیمہ کی بات دہرائی پھر کہا۔ ''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے امی۔ نانا ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ شیر دل کے ماں باپ آئے ہوں گے لیکن نانا نے انہیں انکار کر دیا ہوگا۔'' اس نے ماں کو سمجھانے سے زیادہ خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا تھا...... یہ واقعی کیسے ہو سکتا تھا؟

''مجھے غلط فہمی..... ہو میرے سامنے ساری بات چیت ہوئی ہے اور میرے احتجاج کے باوجود ابا نے رشتہ توڑ دیا اور ان لوگوں کو شادی کی وہی تاریخ دے دی۔'' حلیمہ بہت پریشانی کے عالم میں بول رہی تھی۔

عکس کچھ دیر ماں کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''اس شادی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو کبھی شیر دل سے شادی نہیں کروں گی۔'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔

''یہی تو..... اس لیے تو میں بھی ابا سے کہتی رہی کہ ساری عمر جس خاندان کا لایا ہوا عذاب ہم اٹھا اٹھا کر پھرتے رہے کم از کم اب تو انہیں جانے دیں۔ رہنے دو۔ میری بیٹی کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے تو ہم کیوں کسی طلاق یافتہ سے رشتہ کرتے پھریں۔'' حلیمہ کا پارا شاید اب بھی نیچے نہیں آیا تھا۔

''اسی لیے کہہ رہی ہوں تم ابا سے بات کرو..... صاف انکار کر دو انہیں۔ تمہاری بات ابا نہیں ٹالیں گے تم ضد پر اڑ جاؤ۔ سجاد کے ماں باپ سے میں بات کر لوں گی۔'' حلیمہ نے جیسے اسے پوری پلاننگ بتائی۔

''امی میں نانا سے بات کر لوں گی کسی ضد اور پلاننگ کی ضرورت نہیں ہے، نانا میرے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے۔'' وہ کہتے ہوئے وہاں سے اندر چلی گئی تھی۔ یک دم اس کا دماغ جیسے آندھیوں کی لپیٹ میں آیا تھا۔

☆☆☆

شیر دل کچھ دیر کے لیے سانس بھی نہیں لے سکا تھا۔ اس کے سیل فون پر شہر بانو کا نام چمک رہا تھا۔

اسے لگا اسے دھوکا ہوا ہے۔

(آخری قسط انشاءاللہ اگلے ماہ)

عکس
آخری قسط
عمیرہ احمد
آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے
کرداروں کو نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار
زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور
پراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی
ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ
صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ
دیکھیں گے بلکہ ان کی ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے
کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہوجائیں گے... یوں بھی اپنا
عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی
کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری
یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی
ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول
شاعر:
ان کی بات محبت میں ہم اہل عشق و ہنر کے لیے
اک ذرا رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے
Ayesha

''کیا دیکھ رہی ہیں آپ اس آئینے میں؟'' مشال نے کچھ تجسس آمیز انداز میں عکس سے پوچھا جو اس Cheval mirror کے سامنے کھڑی اس آئینے کے فریم کو اپنی انگلیوں سے غیر محسوس انداز میں یوں چھو رہی تھی جیسے اس کے ہونے کا احساس چاہتی ہو...... فریم پر موجود بار بار کی جانے والی پالش بھی اب اس کی بوسیدگی اور خستگی کو چھپانے میں ناکام ہو رہی تھی۔
فریم کو چھوتے ہوئے اس پر موجود گرد کو اپنی پوروں کو آپس میں رگڑ کر محسوس کرتے ہوئے وہ مشال کی بات پر مسکرائی تھی۔
''میں اس آئینے میں تاریخ دیکھ رہی ہوں۔''
''کیسی تاریخ؟'' مشال کا تجسس کچھ اور بڑھا۔
''اپنی زندگی کی تاریخ...... اپنا ماضی...... اس ماضی سے جڑے چہرے......'' اس نے فریم سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے آئینے میں جھلکتے اپنے عکس کو ایک بار پھر دیکھا پھر اپنے برابر میں کھڑی مشال پر ایک مسکراتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
''اچھا...... ممی بھی اس آئینے کے سامنے اسی طرح فریز ہو گئی تھیں جس طرح آپ ہوئی ہیں...... میں نے ان سے بھی پوچھا تھا کہ وہ اس میں کیا دیکھ رہی ہیں؟'' مشال نے اسی دلچسپی سے اس آئینے پر نظر دوڑاتے ہوئے آئینے میں نظر آتی ہوئی عکس سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔
''کیا کہا انہوں نے؟'' عکس نے اس بار پلٹ کر مشال کو دیکھا۔
''انہوں نے کہا وہ اس آئینے میں مستقبل کو دیکھ رہی ہیں۔ آنے والے دنوں کا عکس جو اس میں کہیں چھپا ہے...... عجیب بات ہے ناں...... آپ اس میں ماضی دیکھ رہی ہیں...... ممی مستقبل...... مجھے کیا دیکھنا چاہیے...... حال؟'' مشال نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ عکس اس کی بات پر مسکرا دی پھر اس نے پلٹ کر دوبارہ آئینے کو دیکھا۔
''میرا بچپن اس آئینے کے ساتھ گزرا ہے...... میرا، شہر بانو اور شیر دل تینوں کا بچپن دیکھا ہے اس نے۔''
''ممی آپ بھول رہی ہیں۔ میرا، طغرل اور باذل کا بچپن بھی تو دیکھا ہے اس نے۔'' مشال نے اسے ٹوکا۔
''ہاں اور تم بھول رہی ہو کہ تو ران کا بچپن بھی تو دیکھ رہا ہے یہ۔'' اس نے مشال کو جیسے یاد دلایا۔
''اوہ ہاں...... یہ آئینہ تو واقعی ہماری فیملی heritage کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اسے یہاں نہیں ہمارے خاندانی گھر میں ہونا چاہیے۔''
''آئیڈیا برا نہیں ہے لیکن سرکاری ملکیت ہے یہ۔'' عکس نے کہا۔
''ممی میں اور ابراہیم گھر کو renovate کرنے والے ہیں...... فرنیچر بھی بدلا جائے گا اور کاٹھ کباڑ میں یہ آئینہ بھی نکالنے والے ہیں ہم...... بہت زیادہ پرانا اور outdated ہو گیا ہے یہ۔'' مشال نے اس کے ساتھ جیسے اپنا پلان شیئر کیا۔
''کیوں...... ابھی تو ٹھیک ہے یہ۔'' عکس نے اعتراض کیا۔
''ممی ٹھیک نہیں ہے...... کم از کم سو سال پرانا ہو گیا ہے یہ...... میں اور ابراہیم تو حیران تھے اس بات پر کہ آخر اب تک ٹکا کیسے ہوا ہے یہ...... کسی آفیسر یا اس کی وائف نے ہٹایا کیوں نہیں اسے یہاں سے...... نانا، نانی سے لے کر آپ اور پاپا تک کسی کو بھی اسے یہاں سے ہٹانے کا خیال نہیں آیا۔'' وہ کچھ حیرانی سے کہہ رہی تھی۔ عکس نے ایک پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''میں نے تمہیں بتایا ہے ناں یہ ہماری زندگیوں کا حصہ رہا ہے...... اس میں ہم لوگ اپنا، اپنا عکس دیکھتے رہے ہیں...... اپنی اپنی زندگیاں بنانے یا بگاڑنے والے چہروں کا عکس۔'' مشال کو لگا عکس بات کرتے کرتے جیسے کچھ سنجیدہ ہوئی تھی۔
''آپ نے اس میں کوئی ایسا چہرہ دیکھا جس نے آپ کی زندگی بگاڑی ہو؟'' مشال نے دلچسپی سے کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنی طرف سے ایک معمول کا سوال کیا تھا۔ اس سوال نے عکس کو کچھ دیر کے لیے بولنے نہیں دیا۔ اس کے لیے اس سوال کا جواب بہت مشکل تھا۔ وہ ہاں کہتی اور مشال اس سے اس شخص کا نام پوچھتی...... وہ جھوٹ جو اسے بعد میں بولنا تھا وہ شاید پہلے ہی بول دینا چاہیے تھا۔
''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟'' مشال نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔
''میں نے اس چہرے کو اپنی زندگی بگاڑنے نہیں دی۔'' وہ عکس کی بات پر تجسس آمیز انداز میں مسکرائی۔
''یعنی آپ نے بھی اس آئینے میں کوئی ایسا چہرہ دیکھا تھا؟'' وہ اب جیسے زور دینے والے انداز میں بولی تھی۔ ''آپ کو پتا ہے ہم لوگوں نے اس گھر کے بارے میں بھی ملازموں سے بہت عجیب و غریب باتیں سنی ہیں۔ پاپا اور آپ یہاں نہ رہ چکے

ہوتے تو میں اور ابراہیم تو کبھی یہاں نہ رہتے۔'' وہ اب عکس کو بتا رہی تھی وہ دلچسپی سے سننے لگی۔ ''آپ نے کبھی اس گھر کے بارے میں کچھ سنا تھا؟'' مشال نے اب عکس سے ڈائریکٹ پوچھا۔
''مثلاً کیا؟'' عکس نے دھیمی آواز میں اس سے نظر ملائے بغیر کہا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مشال نے اس گھر کے بارے میں کیا سنا ہوگا۔
''بہت ساری باتیں کہہ رہے ہیں ملازم لیکن سب سے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس گھر میں جو کپل بھی رہتا ہے ان کا break up ہو جاتا ہے...... کتنی خوفناک بات ہے ناں ممی...... میں تو ڈر ہی گئی یہ سن کے لیکن ابراہیم کو بالکل یقین نہیں ہے ایسی باتوں پہ...... آپ یقین کرتی ہیں ایسی باتوں پہ؟'' اس نے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''نہیں۔'' عکس نے بلاتوقف کہا۔ مشال نے ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ عکس کو دیکھا۔
''مجھے پتا تھا، آپ کہاں یقین کرنے والی ہیں ایسی باتوں پہ۔ ابراہیم بھی آپ ہی کی مثال دیتا ہے کہ ممی کو دیکھو وہ کتنی بار Serve کر چکی ہیں اس شہر میں۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو ان پر بھی کوئی effect ہوتا...... لیکن وہ تو ہمیشہ گھر جوڑنے والی رہی ہیں۔ ان کو تو ہمیشہ فائدہ ہی ہوا ہے اس گھر میں...... ہے ناں ممی؟'' اس نے بات کے آخر میں استفہامی انداز میں عکس سے پوچھا۔ وہ مسکرا دی۔ پھر وہ آہستہ قدموں کے ساتھ برآمدے سے باہر نکل آئی۔ مشال بھی اس کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔ وہ دونوں اب ساتھ چلتے ہوئے گھر کے بالکل سامنے موجود لان میں آ گئی تھیں۔ عکس نے لان میں پہنچ کر پلٹ کر روپہلی دھوپ میں روشن اس قدیم گھر کو دیکھا۔ مشال بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں اس گھر کو دیکھنے لگی۔ عکس نے چند لمحے اس گھر کو دیکھتے رہنے کے بعد کہنا شروع کیا۔
''اس گھر میں اور زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے...... کم از کم میرے نزدیک...... اس گھر میں داخل ہونا جیسے دنیا میں آنے کے برابر ہے...... دنیا میں کچھ اچھے لوگ ملتے ہیں، کچھ برے لوگ...... اچھوں کی اچھائی بھی زندگی بدل سکتی ہے، بُروں کی برائی بھی...... پر جگہوں میں کچھ نہیں ہوتا۔ جو بھی کچھ ہوتا ہے وہاں بسنے والے انسانوں کی وجہ سے ہوتا ہے...... تمہیں سمجھ آ رہی ہے میری بات؟'' عکس نے گردن موڑ کے برابر کھڑی مشال کو دیکھا۔ وہ جواباً مسکرا دی۔
''سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' عکس بھی اس کی بات پر مسکرائی۔ پھر وہ دوبارہ گھر کو دیکھنے لگی۔
''گھروں میں کچھ نہیں ہوتا، وہ انسانوں کو جوڑنے یا توڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ بس اینٹوں، سیمنٹ، سریے اور لکڑی کی ایک عمارت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے...... ان کے اندر آ کر رہنے والے انسان اپنی سوچ، عمل اور رویوں سے اپنی زندگی بناتے یا بگاڑتے ہیں۔'' مشال بہت سنجیدگی سے عکس کی بات سن رہی تھی وہ ہمیشہ اس کی بات اسی سنجیدگی اور انہماک سے سنا کرتی تھی، عکس مراد علی اس کا آئیڈیل تھی۔ وہ ہمیشہ اس جیسا بننا چاہتی تھی۔ لیکن ہر بار وہ یہ اعتراف کرتی تھی کہ ان جیسا بننا بہت مشکل کام تھا۔ کم از کم مشال شیر دل کے لیے...... یا کسی کے لیے بھی۔ مشال نے زندگی میں عکس مراد علی جیسی کوئی شخصیت نہیں دیکھی تھی اور اسے فخر تھا وہ ''شخصیت'' اس کی زندگی کا حصہ تھی، اس کی ماں تھی۔
''میں اس گھر کے ایک کوارٹر میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ کوارٹر اب وہاں ہے بھی نہیں۔'' عکس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ''میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کوارٹر سے باہر نکل کے میں کبھی اس گھر میں آ کے رہوں گی...... اس گھر میں اپنی ماں اور نانا کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ وہ دونوں کام کرتے تھے یہاں...... یہاں پوسٹ ہونے والے آفیسرز اور ان کی فیملیز کی خدمت کیا کرتے تھے...... میں اس back ground کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی پھر اس گھر میں رہنے والے ایک کپل نے مجھے اچھی تعلیم دلوانے کے میرے نانا کے خواب کو پورا کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس گھر میں میری زندگی کی بنیادیں ہیں۔ وہ بنیادیں جن پر آج میری زندگی کی عمارت کھڑی ہے...... یہاں پر میں اپنے بہترین دوست اور جیون ساتھی سے ملی۔ یہاں میری پہلی اولاد ہوئی...... میری زندگی کے بہت سارے Milestones اس گھر سے وابستہ ہیں۔''
''آپ کے لیے تو یہ گھر بڑا Lucky رہا ہے پھر۔'' مشال نے مرعوب انداز میں کہا۔ عکس اس کی بات پہ ہنس پڑی اور اس نے اس طرح مسکراتے ہوئے اس گھر کو دوبارہ دیکھا پھر کہا۔
''اس گھر میں، میں نے اپنے باپ کو کھویا، اپنی زندگی کے سب سے قیمتی اثاثے، اپنے نانا کو کھویا...... یہاں میں اپنے بچپن میں Child abuse کا شکار ہوئی...... بہت ذلت اور بے عزتی کی حالت میں اپنی فیملی کے ساتھ دھکے دے کے

نکالی گئی۔ میرے کیریئر میں واحد معطلی بھی اسی گھر میں ہوئی۔'' عکس نے مسکراتے ہوئے مثال کو دیکھا۔ وہ اب الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''اب تم سوچ رہی ہوگی کہ نہیں، یہ گھر تو میرے لیے بہت Unlucky ثابت ہوا۔'' مثال کچھ بے بسی سے مسکرائی تھی۔ ''میں نے تم سے کہا ناں، گھروں میں کچھ نہیں ہوتا۔ انسان نے چوٹ کھا کے گرنا ہے یا تکلیف سہتے ہوئے بھی کھڑے رہنا ہے؟ یہ فیصلہ اس کی ہمت کرتی ہے، گھر نہیں۔'' عکس نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

''لیکن ممی اس گھر کے ملازم کہتے ہیں کہ یہاں انہوں نے بونے دیکھے ہیں، اور ہم نے بھی کچھ عجیب عجیب آوازیں اور چیزیں experience کی ہیں۔'' مثال کی بات پہ عکس مسکرائی اور اس نے کہا۔

''میں بھی بچپن میں یہاں بہت عجیب چیزیں دیکھتی تھی۔'' مثال اس کے اس غیر متوقع جملے پر کچھ حیران ہوئی پھر اسی حیرانی سے کہا۔

''اوہ، ریئلی ممی۔'' عکس مثال کو دیکھنے لگی۔

''ہاں۔'' پھر اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''آپ نے بھی یہاں بونے دیکھے؟'' مثال نے بڑے تجسس سے پوچھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے عکس کی آنکھوں کے سامنے پتا نہیں کیا کچھ گزر کر چلا گیا تھا۔ وہ سارے Mental Block چند لمحوں کے لیے جیسے بالکل بیکار ہو کے رہ گئے تھے، جس سے اس نے اپنی زندگی کی اس سیاہ ترین رات کو چھپایا ہوا تھا۔

''آپ خاموش کیوں ہیں ممی؟'' مثال نے اسے خاموش دیکھ کے جیسے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی، عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''بتائیں ناں، آپ نے کبھی اس گھر میں بونے دیکھے؟''

''ہاں۔'' عکس نے مدھم آواز میں کہا۔ مثال یکدم excited ہوئی۔

''Oh my God...... آپ نے واقعی بونے دیکھے؟'' عکس نے سر ہلایا۔ اس نے اسی انداز میں عکس سے پوچھا۔ ''کتنے بونے دیکھے؟''

''ایک۔'' عکس نے مدھم آواز میں کہا۔ مثال نے ایک بار پھر excited انداز میں کہا۔ ''wow! وہ بونا دیکھنے میں کیسا تھا؟ آپ کو ڈر لگا اس سے؟ اس نے آپ سے کچھ کہا......؟ کچھ کیا؟'' مثال نے جیسے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ عکس نے ایک گہری سانس لی۔

اتنے بہت سارے سوالوں کا جواب اور وہ بھی اس کے بچپن کے اس تکلیف دہ واقعے کے بارے میں جس کو سوچنا زخموں پر پاؤں رکھ کر گزرنے جیسا تھا۔

''آپ کو اس کی شکل یاد نہیں آرہی؟'' مثال نے اسے خاموش دیکھ کر کُریدا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ جیسے اسے سوال کا جواب نہ دینے کا موقع دے رہی تھی۔

''بعض چہرے انسان چاہے تو بھی نہیں بھول سکتا۔'' اس نے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''وہ بونا بہت خوب صورت تھا...... اچھی شکل صورت کا...... انسانی شکل صورت اور وجود...... بہت دراز قد......''

''ممی میں ''بونے'' کی بات کر رہی ہوں......'' مثال نے عکس کو ٹوکا۔ ''مافوق الفطرت، خوفناک چیز...... آسیب ٹائپ کی۔'' اس نے عکس کو اپنے ذہن میں آنے والی ہر مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے لگا تھا کہ عکس بونے کے بارے میں بتاتے بتاتے کسی اور چیز کے بارے میں بتانے لگی تھی۔

''ہاں، بونے ہی کے بارے میں بتا رہی ہوں تمہیں...... خوفناک، مافوق الفطرت، آسیب ٹائپ کی چیز......'' عکس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن بونوں کے قد لمبے کیسے ہو سکتے ہیں؟'' مثال اس کے بیان سے الجھ گئی تھی۔

''بعض بونوں کے قد لمبے ہوتے ہیں، خوب صورت ہونے کے باوجود ان سے کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ انسانی شکل صورت میں ہونے کے باوجود ان سے خوف آتا ہے۔ مافوق الفطرت نہ ہونے کے باوجود ان سے خوف آتا ہے۔ مافوق الفطرت نہ ہونے کے باوجود وہ دوسروں کی زندگی کو آسیب زدہ کر دیتے ہیں۔'' مثال کو یک دم احساس ہو گیا تھا عکس کا اشارہ کس

طرف تھا۔ اس نے عجیب تسلی دینے والے انداز میں کچھ بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ عکس نے جواباً مسکرا کر اسے دیکھا ......نم آنکھوں والی مسکراہٹ کے ساتھ......

''زندگی میں انسانوں کے شر سے بڑھ کر خوفناک چیز کوئی نہیں، کوئی بھوت، بلا یا بونا برائی میں انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور زندگی میں انسانوں کی ہمت اور دلیری کے سامنے کوئی آسیب نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ لوگ بے وقوف اور بزدل ہوتے ہیں جو گھروں اور جگہوں میں جن، بھوت، بونے ڈھونڈتے رہتے ہیں اور پھر ان کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنی زندگی کی خوش قسمتی یا بدقسمتی کو طے کرتے ہیں۔'' مثال نے عکس مراد علی کو کہتے سنا۔ وہ نصیحت نہیں تھی، تجربہ تھا اور اسے...... وکیل کی مار نہیں ماری جا سکتی تھی۔

''اس گھر کے بونوں سے مجھے کبھی تکلیف نہیں پہنچی لیکن انسانوں کی شکل میں ملنے والے بہت سے بونوں سے مجھے بہت تکلیف پہنچی۔'' وہ اب بھی مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''اور پتا ہے میں نے ایسے ہر بونے سے ملنے کے بعد کبھی اس جیسا نہ بننے کا سوچا اور ہر بونے سے ملنے کے بعد میں نے سوچا میں اپنی ذات سے ایسی تکلیف ایسا نقصان...... کبھی کسی دوسرے انسان کو نہیں پہنچاؤں گی میں کبھی دوسرے کسی انسان کے لیے بونا نہیں بنوں گی...... میں اس کے لیے انسان ہی رہوں گی ..... وہ روپ جو اللہ نے ہمارے لیے پسند کیا ہے اور جس میں ہمیں زمین پر بھیجا ہے۔'' مثال پلکیں جھپکائے بغیر کسی معمول کی طرح پاکستان بیورو کریسی کی اس قابل ترین خاتون بیورو کریٹ کے الفاظ سن رہی تھی۔ 22 گریڈ میں پہنچنے والی اس پہلی خاتون DMG آفیسر کے لفظوں میں اسے جو پرکار دانائی دِکھتی تھی وہ میراث تھی، حاصل نہیں تھی...... وہ خیر دین کی نواسی تھی اور اس کی گفتگو میں اب اتنی دہائیوں کے بعد خیر دین کے حوالے نہیں ہوتے تھے...... وہ خود بولنے لگا تھا۔

☆☆☆

''نانا مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے؟'' خیر دین اس وقت ابھی مغرب کی نماز سے فارغ ہی ہوا تھا جب عکس اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے ڈنر کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ خیر دین کو اس کی آمد کی توقع تھی اور اس سے اس جملے کی بھی۔ تسبیح ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ مصلے سے اٹھ گیا اور اس صوفے پر جا کر بیٹھ گیا جس کے دوسرے کنارے پر چند لمحے پہلے وہ آکر بیٹھی تھی۔

''مجھے بھی تم سے بات کرنی تھی۔ اچھا ہوا تم خود آگئیں......'' خیر دین نے مدھم آواز میں بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے نانا۔'' عکس نے تمہید نہیں باندھی تھی...... تمہیدوں کا وقت گزر چکا تھا۔

''کیا برائی ہے اس میں؟'' خیر دین نے جواباً تحمل سے پوچھا۔ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' عکس نے انہیں جتایا۔

''ہاں، تمہارے پاس مجھ سے بہتر جواب ہونے لگے ہیں اب۔'' انہوں نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جیسے خراج تحسین نہیں پیش کیا تھا اپنی کمزوری کا اعتراف کیا تھا۔

''پر جو سوال اس بار آپ مجھ سے کر رہے ہیں اس کا کوئی جواب ہی نہیں ہے میرے پاس۔'' اس نے خیر دین کی ستائش کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اس رشتے سے جو خرابی ہو سکتی ہے، آپ جانتے ہیں...... مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔'' وہ سنجیدہ تھی اور وہ ان چند مواقع میں سے ایک تھا جب وہ خیر دین سے بالکل متفق نہیں تھی۔ وہ ان کا فیصلہ بدلنے کی نیت سے آئی تھی۔

''ہر فیصلے میں کچھ اچھائی اور کچھ برائی ہوتی ہے، برائی کا اندازہ اگر پہلے سے ہو جائے تو انسان اپنے آپ کو نقصان سے بھی بچا سکتا ہے اور تکلیف سے بھی۔'' خیر دین نے اس سے کہا۔

''آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کے لیے جس حماقت انگیز دلیری کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔'' عکس نے ان سے جواباً کہا۔

''میں صرف تمہاری خوشی چاہتا ہوں چڑیا...... زندگی میں آج تک تمہاری خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں رہی میرے لیے۔'' خیر دین نے اپنی لاجک کی جڑ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ وہ یہ نہیں بھی کہتا تو بھی عکس جانتی تھی۔

''شیر دل میری خواہش نہیں رہا نانا...... اس سے شادی میری زندگی کے مقاصد یا حسرتوں میں کبھی شامل نہیں رہی۔'' اس نے مدھم آواز میں خیر دین سے کہا۔ اس آدمی کی منسلق ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے کندھوں کے بوجھ کو بڑھانے لگی تھی۔

''لیکن تم اس کے لیے میرے سامنے روئیں۔'' اس نے نظریں اٹھا کر خیر دین کے چہرے اور اس معصوم سے رنج کو اس

کی آنکھوں میں دیکھا جسے اس کے آنسوؤں نے خیر دین کے اندر پیدا کیا تھا۔ بہت دیر وہ خیر دین کے سامنے اسی دل شکستہ انداز میں کوئی ایک لفظ کہے بغیر بیٹھی رہی۔ کیا سمجھائے اور کیا نہ سمجھائے۔ کیا بتائے اور کیا نہ بتائے...... خیر دین کے ایک جملے نے جیسے اسے کچھ دیر کے لیے اس مرد کے سامنے گونگا کر دیا تھا جس نے اسے پالا تھا۔

''میرے رونے کو جانے دیں آپ...... وہ آنسو کسی خواہش کا اظہار نہیں تھے......'' اس نے بالآخر لفظوں کو ڈھونڈ لیا تھا بات شروع کرنے کے لیے۔

''میں نے تمہیں اس کے لیے جتنا پریشان دیکھا ہے اس سے پہلے صرف تب دیکھا تھا جب ایک یاد ہے تمہارا میڈیکل کالج والا کلاس فیلو......'' عکس نے خیر دین کو بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

''اس کا ذکر رہنے ہی دیں۔ اس پریشانی اور اس پریشانی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں...... میں پریشان ہوں شیر دل کے لیے اور اسے نظر انداز کرنا بھی میرے لیے مشکل ہے لیکن وہ ٹھیک ہو رہا ہے...... ٹھیک ہو جائے گا اور میری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔'' اسے اندازہ تھا اس کی ساری باتیں جھوٹ کا پلندہ لگ رہی تھیں اس کے سچ کے باوجود......

''میں نے شیر دل سے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔'' خیر دین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ عکس نے عجیب حیرت سے... خیر دین کو دیکھا۔ وہ اس سے لمبی بات کرنا چاہتی تھی لیکن خیر دین جیسے اس سے اس معاملے پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''میں بس یہ نہیں چاہتا چڑیا کہ میں زندگی میں کوئی پچھتاوا۔ ہم دونوں صرف اپنی انا اور ضد کی وجہ سے اور مجھے لگا تمہاری شیر دل سے شادی سے انکار وہ واحد معاملہ ہو سکتا ہے میرے لیے پچھتاوے کا۔'' خیر دین کہہ رہا تھا۔ ''میں نہیں چاہتا کسی اور سے شادی کرنے کے بعد راتوں کو اس طرح سے بے چین پھرو جس طرح تم آج کل پھر رہی ہو۔ اولاد کی خوشی کے سامنے انسان انا کا جھنڈا گاڑ کے تو نہیں بیٹھ سکتا...... بیٹھ جائے تو نقصان دونوں کا ہوتا ہے۔ میری بس اب یہی خواہش ہے کہ تم خیر خیریت سے اپنے گھر بار کی ہو جاؤ اور خوش رہو...... اور میں جانتا ہوں تم شیر دل کے ساتھ بہت خوش رہو گی...... وہ اچھا لڑکا ہے۔'' خیر دین تسبیح کے دانے گھماتا ہوا کہتا گیا تھا۔ عکس اسے صرف دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس سے بحث کر کے اس کا فیصلہ تبدیل کروانے آئی تھی مگر وہ اس سے بحث نہیں کر سکی۔

''شیر دل کے ماں، باپ بہت مشکور ہو کر گئے ہیں یہاں سے...... آج بھی ماضی میں ہونے والی اپنی تمام کوتاہیوں کے لیے معذرت کر کے گئے ہیں...... بہت وعدے دے کر گئے ہیں تمہارے لیے کہ تمہیں بہت خوش رکھیں گے۔ اپنے خاندان میں بہت عزت دیں گے...... اب اس طرح زبان دینے کے بعد میں اپنی زبان سے کیسے پھر جاؤں اور کہوں چڑیا نہیں مان رہی۔'' خیر دین نے کہا...... عجیب معصوم اور سادہ انداز تھا اس کا...... چڑیا کے لیے انکار کو ناممکن کر دیا تھا اس نے...... وہ کسی سے بھی شادی کا کہتا اس طرح تو وہ کر لیتی یہ تو پھر شیر دل تھا...... جس سے وہ محبت کرتی تھی۔

''تمہیں اب بھی اعتراض ہے؟'' خیر دین نے اس سے گفتگو کے آخر میں پوچھا۔

''نہیں، ٹھیک ہے اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں اعتراض کیسے کر سکتی ہوں۔'' اس نے خیر دین کو مدھم آواز میں جواب دیا۔ وہ کڑوی گولی خیر دین نے اس کے لیے نگلی تھی۔ اپنے کندھوں کا بوجھ اس کے لیے بڑھایا تھا ایک بار پھر اور اس احساس نے عکس کو سر اٹھانے کے قابل تک نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تشکر یا احسان مندی نہیں تھی صرف شرمندگی تھی۔

''وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا، وہ کہہ کے گیا ہے۔'' خیر دین نے دعا دینے والے انداز میں بہت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

''شیر دل آیا تھا؟'' عکس نے کچھ حیرانی سے خیر دین کو دیکھا۔

''کل آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت پریشان لگ رہا تھا وہ۔'' خیر دین کی آواز میں تفکر جھلکا تھا۔ ''اللہ کسی کو بھی اولاد کی پریشانی نہ دکھائے۔'' پتا نہیں اس نے کس کے لیے دعا کی تھی۔ شیر دل کے لیے...... یا اپنے لیے......؟ ''گھر ٹوٹنا کوئی اچھی بات نہیں ہوتی...... پرندے کا گھونسلا بھی ٹوٹ جائے تو وہ کتنے دن وہیں اڑتا...... کرلاتا ہے انسان کی تکلیف تو جانور کی تکلیف سے زیادہ ہوتی ہے۔'' وہ اب کہہ رہا تھا۔ ''تم اس کے ساتھ بہت اچھا گھر بنانا۔'' خیر دین جیسے اسے نصیحت کر رہا تھا۔

''بڑا مشکل کام دے رہے ہیں آپ مجھے نانا۔'' وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ ''میں پرندہ نہیں ہوں اور میں یہ نہیں جانتی کہ پرندہ جب دوسری بار گھر بناتا ہے تو اس کے احساسات کیا ہوتے ہیں لیکن میں انسانوں کے جذبات اور احساسات سے ضرور

واقف ہوں...... جانتی ہوں کہ دوسری بار گھر بنانا مرد اور عورت دونوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ جو پہلا جیون ساتھی ہوتا ہے وہ اچھا ہو یا برا مگر وہ زندگی سے جاتا کبھی نہیں...... ساری عمر مقابلوں اور موازنوں کا حصہ بنا رہتا ہے۔'' وہ اب خیر دین کو اس دریا کی گہرائی اور اس کے اندر موجود خطرات و مشکلات کے بارے میں آگاہ کر رہی تھی۔ جس میں اس نے چڑیا کو سوچے سمجھے بغیر اتارا تھا۔

''میں جانتا ہوں چڑیا لیکن زندگی موازنوں اور مقابلوں کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں...... تمہیں لگتا ہے مرد یا عورت اپنے پہلے جیون ساتھی کا موازنہ کسی سے نہیں کرتے...... کرتے ہیں، پریشانی کی بات تب ہے جب ہم ان موازنوں میں بدتر ثابت ہونے لگیں اور ہوتے ہی رہیں...... تب تشویش بھی ہونی چاہیے اور تکلیف بھی لیکن اگر ہم اس موازنے کو اپنے حق میں کر لیں تب تو وہ تشویش کا باعث نہیں رہتا۔'' خیر دین اسے کہہ رہا تھا۔

''یہ آسان کام نہیں ہوتا نانا...... یہ اتنا آسان کام نہیں ہے نانا جتنا آپ کہہ رہے ہیں۔'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

''تم نے زندگی میں آسان کام کب کیے ہیں چڑیا......؟ سارے امتحان مشکل آئے...... سارے کام مشکل ہی تھے جو تم نے کیے۔'' خیر دین نے عجیب فخر سے ہنس کر کہا۔

''ہاں لیکن کبھی کبھار انسان آسانیاں بھی چاہتا ہے۔'' اس نے کسی ننھے بچے کی طرح خیر دین سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''چڑیا تم جس مرد کی زندگی کا حصہ بنو گی وہ بڑا خوش قسمت ہوگا...... تم کہیں بھی کسی کے ساتھ بھی ایک اچھا گھر بنا سکتی ہو ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہو...... کیونکہ تم اچھی لڑکی ہو اور شیر دل بھی اچھا لڑکا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں یہ فیصلہ چاہتے ہوئے بھی نہ کر پاتا لیکن شیر دل تمہاری قدر کرے گا...... ویسی ہی قدر جیسی میں کرتا ہوں۔'' عکس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے تھے۔

''آپ جیسی قدر میری کوئی نہیں کر سکتا۔ شیر دل بھی نہیں...... آپ جیسا تو کوئی نہیں اور کبھی نہیں ہو سکتا۔'' اس نے خیر دین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں لیکن میری خواہش اور دعا ہے شیر دل مجھ سے بڑھ کے تمہاری قدر کرے اور کرے گا۔'' خیر دین نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ اس دن عجیب بوجھ لیے خیر دین کے پاس سے آئی تھی۔ نانا اسے وہ کھلونا دے بیٹھے تھے جو اس کے لیے خطرناک تھا اور وہ اپنی محبت اور جوش میں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کر سکے تھے۔ شیر دل سے ان حالات میں عکس کی شادی دونوں کو بُری طرح اسکینڈلائز کرنے والی تھی۔ خاص طور پر تب، جب وہ ایک ہی ڈویژن میں کام کر رہے تھے اور دو قریبی شہروں میں پوسٹڈ رہے تھے۔ شیر دل اور شہر بانو کے درمیان ہونے والا جھگڑا ان کے تمام سوشل سرکل میں ہر ایک کی زبان پر تھا لیکن ابھی تک اس سارے جھگڑے میں کوئی شیر دل پر انگلی نہیں اٹھا سکا تھا لیکن اب چند مہینوں کے اندر ہی عکس کے ساتھ شادی کی صورت میں صرف شیر دل ہی نہیں بلکہ خود اس کی ساکھ اور نام بھی بری طرح خراب ہونے والا تھا اور الزامات و تبصروں کا یہ طوفان کتنا شدید ہو سکتا تھا۔ خیر دین کو اس کا اندازہ نہیں تھا، عکس کو اندازہ تھا۔ خیر دین کا فیصلہ اس کے لیے ایک بہت غلط اور خطرناک فیصلہ تھا اور اپنے کمرے میں آنے کے بعد وہ بیٹھی اس کے مضمرات کو ہی سوچتی رہی تھی۔ وہ اپنے لیے خود بھی وہ فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی جو خیر دین نے کر دیا تھا اور وہ خیر دین کو let down نہیں کر سکتی تھی اس کے آگے کنواں اور پیچھے کھائی آ گئے تھے اور اسے اگر اس وقت کسی سے خفگی محسوس ہوئی تھی تو وہ شیر دل تھا۔ وہ اگر خیر دین کے پاس نہ آتا تو یہ مسئلہ کھڑا نہ ہوتا یا کم از کم وہ آنے سے پہلے اس سے بات کر لیتا تو وہ اسے وہ سب کچھ سمجھا اور دکھا پاتی جو وہ یقیناً کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے نظر انداز کر رہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے حیرت ہے عکس کا نانا اس رشتے پر کس طرح تیار ہو گیا؟'' منزہ نے عکس کے گھر نسبت طے کر کے واپس آنے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر کہا۔ وہ اور بختیار ابھی کچھ دیر پہلے واپس آئے تھے اور شیر دل بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

''تمہیں وجہ جان کر کیا کرنا ہے؟'' بختیار نے ٹوک دیا تھا۔

''حیران ہوں بہت اس لیے پوچھ رہی ہوں۔'' منزہ نے کہا۔

''حالانکہ تمہیں حیران ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔'' بختیار نے ان سے کہا۔

''اتنی خوش ہوں میں کہ مجھ سے بڑھ کر تو شاید آپ کا بیٹا بھی خوش نہیں ہے۔'' منزہ نے فوراً کہا۔ شیر دل نے ماں کے اس تبصرے پر بے حد سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

''یہ پہلی شادی نہیں ہے میری..... نہ ہی بہت خوشگوار حالات میں ہو رہی ہے..... میں نہیں جانتا کوئی ایسی شادی پر کس طرح بہت خوش ہو سکتا ہے یا آپ سمجھتی ہیں میں انسانی صفات نہیں رکھتا۔'' وہ اتنا bitter (تلخ) نہیں ہونا چاہتا تھا جتنا ہو گیا تھا۔ منزہ نادم سی ہو گئیں۔

''میں نے ویسے ہی ایک بات کی ہے کوئی غلط معنی مت لو۔ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے جو بھی ہو رہا ہے کوئی زبردستی تو نہیں ہو رہی..... تم نے خود فیصلہ کیا ہے عکس سے شادی کا..... خود کہیں اس کے گھر جانے کا کہا۔'' منزہ نے جیسے مدافعانہ انداز میں کہا۔ وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے یک دم وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں اس طرح ڈسکشن دوبارہ شروع کرنے کی.....؟ وہ اپنا گھر دوبارہ آباد کرنے پر تیار ہو گیا..... یہ کافی نہیں ہے کیا تمہارے لیے.....؟ یا یہ ضروری ہے کہ تم ایک بار پھر سے کیوں اور کیسے کے چکروں میں پڑو۔'' بختیار نے شیر دل کے اس طرح وہاں سے اٹھ کر جاتے ہی بہت ناگواری اور خفگی سے منزہ کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''اور اب عکس سے بھی کسی طرح کی کوئی بحث نہ کرنا، وہ ہمارے خاندان کا حصہ بننے جا رہی ہے، تمہاری کسی بات سے اس کی دل شکنی نہیں ہونی چاہیے ابھی..... نہ ان دونوں کی شادی کے بعد..... ان لوگوں کی اتنی favour بہت ہے کہ انہوں نے ماضی کو بنیاد بنا کر کسی اور تنازعے کو کھڑا کرنے کے بجائے ہماری بات مان لی۔ ہمارے divorced اور بچے والے بیٹے کے ساتھ وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر تیار ہو گئے..... ہمیں اس کے لیے ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور بس۔'' بختیار نے بھی جیسے بات ہی ختم کر دی تھی اور وہ بھی وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

منزہ بہت دیر وہیں بے مقصد بیٹھی رہیں۔ شادی کا یہ سلسلہ انہوں نے شروع کیا تھا اور وہ خوش اور مطمئن بھی تھیں کہ شیر دل کا گھر دوبارہ آباد ہو جائے گا لیکن اس احساس کے باوجود عکس مراد علی سے انہیں عجیب سے خدشات تھے اور وہ ان خدشات کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھیں۔ کوئی دوسرا کوشش کرتا تو یہ کام بڑی آسانی سے کر لیتا..... وہ شکست خوردگی کے احساس سے دوچار ہو رہی تھیں یا آسان لفظوں میں انہیں اپنا تھوکا چاٹنا پڑ رہا تھا۔ حسب نسب کی وہ اونچی دیواریں جنہیں اپنے گرد کھڑا کر کے وہ فخر محسوس کرتی تھیں ان پر بہت بری طرح چوٹ پڑی تھی..... ایسی زوردار چوٹ کہ ان دیواروں میں آ جانے والی دراڑیں زمین تک پہنچ گئی تھیں۔

انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ اپنی تقدیر کے سامنے بھی اور دوسرے کی تقدیر کے سامنے بھی..... وہ نہ اپنی بدقسمتی کو خوش قسمتی میں بدل سکتا ہے نہ دوسرے کی خوش قسمتی کو بدقسمتی میں..... اور نہ ہی اس بے بسی کے احساس کو ختم کر سکتا ہے جو اسے اس صورت حال میں ہوتا ہے۔

☆☆☆

''شیر دل سے بات ہوئی تمہاری؟'' نانا نے دو دن بعد صبح ناشتے کے بعد پورچ میں اسے آفس کے لیے رخصت کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں نانا.....'' وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر اس نے خیر دین کو جواب دیا۔ ''لیکن میں کر لوں گی، ابھی مصروف ہوں۔'' اس نے خیر دین کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی وضاحت اور جواب دیا تھا۔

''اس کا مجھے فون آیا تھا کل..... تمہارا پوچھ رہا تھا۔'' خیر دین نے اسے بتایا اس نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ اسے اگر واقعی عکس سے بات کرنی ہوتی تو خیر دین کے فون پر کال کر کے اس کا پوچھنے کے بجائے سیدھا سیدھا وہ اس کے فون پر کال کر سکتا تھا مگر وہ بھی اس سے بات کرنے میں متامل تھا، وہ محسوس کر سکتی تھی۔

''میں اس سے ایک دو دن میں بات کر لوں گی۔'' عکس نے گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے خیر دین سے کہا۔ خیر دین نے

اسے جواباً کچھ نہیں کہا تھا۔ تھکن کا ایک عجیب سا احساس تھا جو پہلے سے اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ خوشی کی کوئی رمق اسے کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔ وہ سجاد سے شادی کی تیاری میں بھی بہت زیادہ ایکسائٹڈ نہیں تھی لیکن کم از کم اس کے ساتھ شادی طے پانے نے اسے اس طرح کی کیفیت سے دوچار نہیں کیا تھا جس طرح کی کیفیت کا شکار وہ اب ہو رہی تھی۔

حلیمہ اب خیر دین کے ساتھ ساتھ اس سے بھی بری طرح خفا تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ خیر دین کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی خراب ہو گیا تھا کہ وہ خیر دین کو کچھ سمجھانے یا قائل کرنے کے بجائے اس کے کہنے پر ایک طلاق یافتہ ایک بچے کے باپ سے شادی پر تیار ہو گئی تھی اور وہ بھی اس خاندان میں جس نے ان کی زندگی میں تکلیف اور تباہی لانے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ دو دن سے مسلسل خیر دین اور عکس کے ساتھ بحث و مباحثے میں مصروف تھی اور اب دو دن کے بعد ان میں سے کسی کو بھی قائل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنی کوششوں کو بالآخر ترک کر دیا تھا لیکن اس کی خفگی اپنے عروج پر تھی۔ اسے اپنی سسرال میں شدید قسم کی خفگی اور تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس رشتے کے اس طرح اچانک بغیر کسی وجہ کے کارڈز بانٹنے کے بعد ختم کرنے پر..... اور وہ نہ صرف نادم اور شرمندہ تھی بلکہ اس معاملے پر اس تنقید اور مخالفت کو بالکل جائز بھی سمجھ رہی تھی۔ خیر دین پر یک دم پورے خاندان میں تنقید اور الزامات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ نہ صرف حلیمہ کے سسرالی رشتے دار بلکہ خیر دین کا اپنا خاندان بھی اس تنقید میں پیش پیش تھا۔

ان کے خاندان میں شادی کے کارڈ بھی تقسیم ہو جانے کے بعد کسی لڑکی کی شادی رُک جانے کا یہ پہلا واقعہ ہوا تھا اور ہر ایک کے پاس کہنے اور اندازے لگانے کے لیے بہت کچھ تھا اور یہ ساری باتیں حلیمہ، خیر دین تک بھی پہنچا رہی تھی۔ وہ تنقید اور مخالفت کے اس طوفان کی توقع رکھنے کے باوجود کسی نہ کسی حد تک ان باتوں سے ہرٹ ہوا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا جب اسے کسی پر غصہ اور کسی سے گلہ نہیں ہوا تھا۔ اپنے فیصلے پر جمے رہنے کے باوجود اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ غلط کیا تھا۔ سجاد کی فیملی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اس سارے معاملے میں اور خیر دین کو اگر کسی بات پر شدید رنج اور شرمندگی تھی تو وہ یہی ایک بات تھی..... ورنہ وہ اپنے خلاف جو کچھ سن رہا تھا اسے اس سب کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ چڑیا کی ایک اور خواہش پوری کرنے جا رہا تھا۔ اسے وہ دے رہا تھا جو اس کے دل کی خواہش تھی۔

اور عکس اس سارے معاملے میں ایک خاموش تماشائی کی طرح ماں اور نانا کے درمیان میں ہونے والی اس جنگ کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے حلیمہ اور خیر دین کے درمیان کوئی اختلاف دیکھا تھا اور وہ بھی اپنی وجہ سے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خیر دین نے اس کی خوشی کی خاطر خود کو ہیرو سے ولن کر لیا تھا لیکن وہ خود اس سے کم از کم اس فیصلے پر متفق نہیں تھی اس کے باوجود حلیمہ کی حمایت بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ماں بھی جو اسٹینڈ لے رہی تھی وہ اس کی محبت میں ہی لے رہی تھی۔

اور ان تمام خاندانی جنگوں کے درمیان اسے ایک لمحے کے لیے بھی شیر دل کا خیال نہیں آیا تھا۔ نہ اس کا خیال آیا تھا نہ اس سے بات کرنے کی خواہش ہوئی تھی..... حالانکہ ہونی چاہیے تھی، خیال بھی آنا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں شیر دل یک دم جیسے ایک اجنبی کی صورت میں اس کے سامنے آنے لگا تھا..... وہ کچھ دیر کے لیے جیسے اس کا بہترین دوست بھی نہیں رہا تھا۔ اس سے بات کرنا ضروری تھا لیکن موضوع صرف ایک رہ گیا تھا اور وہ صرف اسی ایک موضوع پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی میں کبھی اسے شیر دل سے ایسی بیزاری نہیں ہوئی تھی جیسی ان چند دنوں میں ہوئی تھی۔

زندگی میں ہر انسان سے ہر فیصلہ صحیح نہیں ہو سکتا تھا بعض فیصلے انسان غصے اور جلد بازی میں کرتا ہے اور بعض جذبات میں مجبور ہو کر..... اور کہیں نہ کہیں عقل و ہوش کچھ دیر کے لیے انسان کا ساتھ ضرور چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی حماقت، عقل پر قبضہ ضرور کر لیتی ہے چاہے وہ چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

وہ آفس میں سارا دن بیٹھے دفتری کام انجام دیتے ہوئے خیر دین کے اس فیصلے سے ممکنہ نقصانات کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور damage control کے طریقے بھی..... نقصان تو ہونا تھا لیکن کم سے کم کیسے کیا جا سکتا تھا ساکھ اور نام بہت بڑی چیزیں تھیں اور اب وہ دونوں چیزیں داؤ پر لگنے والی تھیں۔ شیر دل مرد تھا بہت سی چیزیں اس کے لیے matter ہی نہیں کرتی تھیں جس کے پیچھے بختیار شیر دل کا خاندان تھا جہاں وہ خود نہ بچ سکتا وہاں اس کا خاندان اسے بچا لیتا..... کوئی اس کے اسکینڈلائز ہونے پر اس کے خاندان کے بارے میں سوال کرنے اور اٹھانے والا نہیں تھا۔ وہ ایک فرد کی غلطی بھی اور error of judgement (فیصلے کی غلطی) سمجھ کر معاف کر دی جاتی۔

عکس مراد علی عورت تھی، سیلف میڈ تھی اور ایک کمتر خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس کی غلطی پر اس کے بجائے اس کے خاندان کے بارے میں سوال جواب اور تبصرے ہوتے...... اپنے کیریئر کے اتنے سالوں میں بھی اس کا کوئی اسکینڈل نہیں آیا تھا اور اس ایک اسکینڈل کے بعد ڈاکٹر عکس مراد علی کا نام جہاں بھی آتا اسی حوالے سے آتا۔ وہ عزت اور احترام جس کے ساتھ سب اس کا نام لیتے تھے وہ تضحیک آمیز ہنسی اور تبصروں میں تبدیل ہونے والی تھی اور یہ بہت بڑی قیمت تھی جو اسے شیر دل کے ساتھ کے بدلے میں ادا کرنی تھی...... خیر دین نے جذبات میں یہ نہیں سوچا تھا اس نے صرف ایک نا بن کر اپنی نواسی کی خوشی کا سوچا تھا لیکن نواسی یہ سب سوچ رہی تھی کیونکہ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی جذباتی نہیں رہی تھی۔ جذبات سے فیصلے وہ پہلے بھی کم ہی کرتی تھی لیکن اس پروفیشن میں آنے کے بعد اس نے جذبات کو سائنٹڈ دے کر سلا دیا تھا۔ وہ اب چاہتی بھی تو جذبات کو عقل پر ترجیح نہیں دے سکتی تھی اور اب اسے یہی کرنا پڑ رہا تھا...... خیر دین کی محبت میں آنکھوں دیکھی وہ مکھی نگلنا پڑ رہی تھی جس سے اسے کم از کم بدہضمی تو ضرور ہوتی اگر کوئی بڑی بیماری نہ بھی ہوتی تو...... وہ اس دن بھی اسی کش مکش میں پھنسی آفس پہنچی تھی جب ٹی بریک کے دوران اسے آفس کے باہر شور کی آواز آئی تھی اس نے انٹر کام اٹھا کر PA کو اس شور کی وجہ معلوم کرنے کو کہا، وہ پانچ دس منٹوں کے بعد بے حد بوکھلایا ہوا آفس میں آیا تھا۔

''میڈم وہ ایک آدمی خودکشی کرنے کے لیے آپ کے آفس کی چھت پر چڑھ گیا ہے اس نے چھت کا دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے اور اب وہ کہہ رہا ہے کہ وہ وہاں سے کود کر جان دے دے گا۔'' عکس کو چند لمحوں کے لیے جیسے بات کی سمجھ نہیں آئی تھی اور جب سمجھ میں آئی تو وہ بہت panicked ہو کر فوری طور پر آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے آفس کے اردگرد موجود جگہ میں اب ایک مجمع تھا جو چھت پر موجود کسی آدمی سے بہ آواز بلند بات چیت کرنے میں مصروف تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس کا اپنا اسٹاف اور گارڈ بھی پہنچ گئے تھے۔ باہر موجود لوگوں کے ہجوم کو انہوں نے ہٹانا شروع کر دیا تھا جو زیادہ تر ان افراد پر مشتمل تھا جو DC آفس اور اس کے آس پاس موجود دوسرے انتظامی عہدے داران کے آفس میں اپنے کاموں کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے یا پھر درجہ چہارم کے ملازمین جو ان دفتروں میں کام کرتے تھے اور انہیں صبح صبح ہی سنسنی خیز تفریح میسر آ گئی تھی۔

وہ آفس سے برآمدے اور برآمدے سے باہر نکل آئی تھی...... دو منزلہ عمارت کی چھت پر اس وقت ایک آدمی موجود تھا جو چھت کے بالکل ہرے پر تھا۔ صرف عکس نے اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا، اس آدمی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور وہ چلا چلا کر کچھ کہنے لگا تھا جو شاید اسے سمجھ میں آ جاتا اگر نیچے کھڑا مجمع بھی بھانت بھانت کی بولیاں نہ بول رہا ہوتا۔

''میڈم کوئی سینٹری ورکر ہے پہلے بھی ایک بار اسی طرح اوپر چڑھ گیا تھا بڑی مشکل سے اتارا تھا اسے۔ پچھلے ڈی سی صاحب نے معطل کیا ہوا ہے اسے اور کئی مہینوں سے اس کی pay بھی رکی ہوئی ہے۔'' اس کے اسسٹنٹ کمشنر نے اسے دیکھتے ہی بتانا شروع کر دیا تھا، وہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں موجود تھا اور صورتِ حال کے بارے میں معلومات اور اس آدمی کے کوائف حاصل کر چکا تھا۔

''میگا فون پر اسے بتاؤ کہ وہ نیچے اترے اور آ کر بات کرے...... اس کے دونوں مسئلے حل ہو جائیں گے لیکن اس طرح نہیں۔'' اس نے ایک نظر اس مجمع پر ڈالی جس میں سے اب آدھے اس کی طرف متوجہ تھے اور آدھے اس آدمی کی طرف جو چھت پر چڑھا ہوا تھا۔

عکس اسسٹنٹ کمشنر کو ہدایات دے کر وہاں رکی نہیں تھی۔ یہ جیسے اپنے آپ کو تماشا بنانے والی بات تھی۔ چھت پر چڑھا ہوا آدمی اسے اپنے اسٹاف کے ساتھ وہاں سے غائب ہوتے دیکھ کر جیسے مزید جوش میں آ گیا تھا۔ اس نے کچھ اور بلند آواز میں وہ تقریر جاری رکھی جو وہ اس سسٹم اور اسے چلانے والے آفیسروں کے خلاف کر رہا تھا جو سب حکومت کے آلۂ کار بن کر غریبوں کا خون چوس رہے تھے اور ان پر ظلم کر رہے تھے۔

عکس کے لیے یہ صورتِ حال سنگین ہونے سے زیادہ مضحکہ خیز تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ کسی خاتون آفیسر کے ساتھ اس طرح کی صورتِ حال پیش آنے پر اس کی انتظامی صلاحیتوں پر سوالات اٹھنے کے ساتھ ساتھ اس پر پھبتیاں کسنے کا بھی ایک اچھا موقع ہاتھ میں آ جاتا ہے اور جو یقیناً آ گیا تھا۔

☆☆☆

شیر دل اس وقت نہا کر نکلا تھا اور ابھی اپنے بیڈ روم میں آیا ہی تھا جب اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ caller ID نظر نہیں آ رہی تھی یعنی کالر کسی سرکاری نمبر سے کال کر رہا تھا اس نے تولیا کرسی پر رکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عکس کے آفس کا آپریٹر تھا جس نے اسے ایمرجنسی کی اطلاع دیتے ہوئے فوری طور پر عکس سے connect کیا تھا۔ وہ بھی کچھ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بیٹھے بٹھائے اتنی صبح صبح کیا ایمرجنسی آ گئی تھی۔

''تم نے کسی سینٹری ورکر کو معطل کیا تھا؟'' عکس نے اس کی آواز سنتے ہی علیک سلیک اور تمہید کے بغیر پوچھا۔

''کہاں...... تمہاری جگہ پر؟'' شیر دل نے حیرانی سے اس کا سوال سنا۔

''ہاں......''

''شاید...... کیوں، کیا ہوا؟'' شیر دل کو فوری طور پر کوئی معطلی یاد نہیں آئی لیکن اس نے انکار بھی نہیں کیا تھا۔

''وہ میرے آفس کی چھت پر چڑھا ہوا ہے اور خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے۔'' عکس نے جواباً کہا۔ شیر دل نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔

''الو کا پٹھا...... جیکب مسیح......'' اسے نہ صرف وہ سینٹری ورکر یاد آ گیا تھا بلکہ اس کا نام بھی......

''جیکب مسیح نام ہے...... او کے...... کیا کیس تھا اس کا؟'' عکس کے لہجے میں عجلت تھی۔

''کیا کیس ہونا ہے؟ دو دفعہ کوڑے کے ڈرم اٹھا کر لے جاتے ہوئے پکڑا گیا، میں نے وارننگ دے کر چھوڑ دیا، تیسری بار میرے آفس کے باتھ روم میں فٹنگ کے لیے آیا ہوا کچھ سامان غائب کر دیا اس نے...... انکوائری میں اس پر الزام ثابت ہو گیا تو بھی میں نے معطل نہیں کیا اسے...... pay ضبط کی اس کی۔'' شیر دل اسے کچھ خفگی کے عالم میں بتا رہا تھا۔

''لیکن سب تو کہہ رہے ہیں وہ suspend (معطل) ہونے کی وجہ سے یہ سب کر رہا ہے۔'' عکس نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''suspend (معطل) میں نے اسے ڈی سی آفس کی چھت پر چڑھ کر خودکشی کی دھمکی دینے پر کیا تھا۔ pay کاٹے جانے پر چھت پر چڑھ گیا تھا اور پتا نہیں کہاں سے تقریر لکھوا کر لایا تھا۔ کوئی دس صفحوں کی، وہ پڑھنا شروع کر دی تھی۔'' شیر دل نے بتایا۔ ''تو میں نے اس جرم میں suspend (معطل) کیا تھا اسے۔''

''اب بھی یہی کر رہا ہے وہ...... لیکن زبانی کر رہا ہے تقریر۔'' وہ صورتِ حال مضحکہ خیز تھی نہیں لیکن اب لگنے لگی تھی۔

''تم کیا کر رہی ہو؟'' شیر دل نے جواباً پوچھا۔

''میں نے فائر بریگیڈ والوں کو بلایا ہے، سیڑھی اور نیٹ لانے کے لیے...... ایمبولینس کو بھی بلوایا ہے۔ میرا اسسٹنٹ کمشنر میگا فون پر اس سے دروازہ کھولنے اور نیچے آ جانے کے لیے کہہ رہا ہے اور اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس کی suspension (معطلی) ختم کر دوں کہ وہ نیچے تو آئے...... ابھی کوئی میڈیا ٹیم یہاں آ گئی تو اور مسئلہ ہو جائے گا...... تم نے کیا، کیا تھا جب وہ اس طرح چھت پر چڑھ گیا تھا۔'' عکس نے تشویش کے عالم میں تفصیلات بتاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میں نے اسے کہا تھا کہ کود جاؤ اور اگر پھر بھی بچ گئے تو میں تمہیں suspend (معطل) کروں گا کم از کم ایک سال کے لیے اور پھر میں اندر چلا گیا تھا۔'' عکس کو لگا وہ مذاق کر رہا ہے۔

''تم بکواس کر رہے ہو۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''یہاں مجھے مصیبت پڑی ہوئی ہے تمہاری وجہ سے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خفا ہوئی تھی۔

''میں نے وہی کہا تھا جو میں نے تمہیں بتایا ہے۔ جو تم کر رہی ہو اس کے بعد تو وہ سارا دن چھت پر بیٹھا رہے گا اور نیچے کراؤڈ بڑھتا چلا جائے گا اور میڈیا والوں کو دیر نہیں لگے گی وہاں پہنچنے میں۔'' شیر دل نے سنجیدگی سے اس سے کہا۔

''تم نے اسے کہا کہ کود جاؤ اور وہ نیچے آ گیا؟'' عکس کو اب بھی یقین نہیں آیا۔

''ہاں...... پندرہ منٹ میں نیچے آ گیا تھا، اس کے بعد میں نے اسے دو دن تھانے میں رکھوایا پھر suspend کر کے گھر بھجوا دیا۔ تمہاری طرح اسے چھت پر چڑھا دیکھ کر تماشائی اکٹھے نہیں کرنے دیے...... تم عورتوں نے شہر سنبھالنا ہے......؟ ایک جیکب مسیح تو کنٹرول ہوتا نہیں تم سے۔'' شیر دل کے آخری جملے میں موجود طنز کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ پہلا موقع نہیں تھا جب وہ اس طرح کا شاونزم دکھا رہا تھا۔

"یعنی میں اسے کہہ دوں کہ وہ کود جائے تو وہ نیچے اتر آئے گا؟" عکس نے جیسے اس سے یقین دہانی چاہی تھی۔

"ہاں...... لیکن اس سے پہلے نیچے موجود اس سارے کراؤڈ کو ہٹا دو وہاں سے۔" شیر دل نے کہا اور چند اور جملے کہہ کر عکس نے فون بند کر دیا۔ فون بند ہونے کے بعد بھی شیر دل مسلسل اسی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد اس نے کچھ اضطراب اور تجسس کے عالم میں updates لینے کے لیے عکس کو دوبارہ فون کیا تھا۔ چند لمبے فون بجتا رہا لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر نمبر ٹرائی کرتا اسے عکس کا ٹیکسٹ آ رہا تھا اور ٹیکسٹ پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا تھا۔

"مدد کا شکریہ...... جیکب کود گیا۔"

☆☆☆

منزہ کو شہر بانو کی آواز سن کر جتنا شاک لگا تھا اتنا ہی شاک انہیں اس کا وہ جملہ سن کر لگا تھا جو اس نے ابتدائی رسمی جملوں کے بعد یکدم منزہ سے کہا تھا۔

"میں شیر دل سے reconciliation مصالحت چاہتی ہوں، واپس آنا چاہتی ہوں۔" منزہ کچھ دیر کے لیے جیسے کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ اتنے مہینوں سے ان سے بات کرنے پر تیار نہیں تھی۔ مثال کی آواز تک انہیں سنانے کو تیار نہیں تھی...... اور اب طلاق کا اپنا حق استعمال کر لینے کے بعد وہ شیر دل سے مصالحت چاہتی تھی۔ آخر بیٹھے بٹھائے ایسا کیا ہو گیا تھا کہ داؤد کے ساتھ شادی کرنے کے بجائے وہ واپس شیر دل کی طرف آنا چاہتی تھی۔ وہ طلاق کا تفویض شدہ حق استعمال کرنے کے بعد اگر واپس شیر دل کے ساتھ مصالحت کرنا چاہتی تو کر سکتی تھی کیونکہ ان کے درمیان علیحدگی تفویض شدہ طلاق کے ساتھ ہوئی تھی اور وہ بھی ایک طلاق کے ساتھ...... مرد کی طرف سے تین بار دے دی جانے والی تین طلاقوں کے ساتھ نہیں۔ شہر بانو چاہتی تو اس طلاق کو واپس لے کر حلالہ کے بغیر شیر دل کے ساتھ دوبارہ صرف نکاح کر کے رہ سکتی تھی اور ان دونوں کی طلاق ہو جانے کے بعد بھی منزہ کچھ عرصہ یہ کوشش کرتی رہی تھیں کہ شہر بانو اس طلاق کو واپس لے لے اور شیر دل کے ساتھ مصالحت کر لے۔ یہ صرف شرمین کا اعلان تھا کہ وہ داؤد کے ساتھ شہر بانو کی شادی کرنے والی تھیں۔ جس کے بعد منزہ نے مصالحت کی کوششوں کو بالآخر بے حد مایوسی کے عالم میں ترک کر دیا تھا۔

اور اب اتنے مہینوں کے بعد جب وہ عکس اور شیر دل کی شادی طے کر آئی تھیں تو شہر بانو ایک بار پھر ان کے خاندان میں لوٹنے پر تیار ہو گئی تھی اور اس کی آفر نے منزہ کو یک دم بہت مشکل میں ڈال دیا تھا۔

"شرمین نے بتایا تھا کہ تم داؤد کے ساتھ شادی کرنے والی تھیں؟" منزہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی۔

"اب نہیں کر رہی۔" اس نے جواباً کہا۔ منزہ کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ اس سے مزید کیا کہیں۔ شہباز حسین کی اکلوتی اولاد اور نشانی ہونے کی وجہ سے شہر بانو انہیں ہمیشہ عزیز تھی۔ شیر دل کے ساتھ اس کی شادی پر وہ اس سے زیادہ وہ خوش تھیں اور ان دونوں کے درمیان ہمیشہ سے بہت (قربت) closeness رہی تھی۔ شہر بانو ایک بار پاکستان آ جانے کے بعد شرمین کے بجائے منزہ پر زیادہ rely (انحصار) کرنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مصالحت کا فیصلہ کرنے کے بعد شیر دل کو فون کرنے کے بجائے اس نے منزہ کو فون کیا تھا۔

"تمہیں میں نے کتنا سمجھانے کی کوشش کی تھی، کتنا منع کیا تھا کہ چلو ناراضی ٹھیک ہے، میاں بیوی میں ہو جاتی ہے تم کچھ وقت گزرنے دو لیکن اتنا بڑا قدم نہ اٹھاؤ...... تم نے میری کسی بات کی پروا نہیں کی۔ شرمین کی طرح سوچے سمجھے بغیر جو دل میں آیا کرتی چلی گئیں۔ اس نے بھی شہباز سے اختلافات کے بعد اپنا ابارشن کروا لیا تھا۔ divorce تو چلو جو ہونی تھی ہوئی لیکن اس بچے کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ تم نے بھی یہی کیا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ شیر دل مثال کے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اس سے بُری طرح اٹیچڈ ہے تم بچی کو لے گئیں اور وہ بھی اس طرح کہ تم نے نہ ہمیں، نہ شیر دل کو اس سے ملنے دیا، شکل تک دیکھنے کے لیے ترسا دیا تم نے۔" شہر بانو خاموشی سے منزہ کے گلے شکوے سنتی رہی اسے اندازہ تھا کہ یہ ساری گفتگو اور باتیں اسے سننی پڑیں گی۔ بعض دفعہ ہم کسی کی ایک بات سننے پر تیار نہیں ہوتے اور پھر ہمیں زندگی بھی اتنا مجبور کر دیتی ہے کہ ہم اسی شخص کی ہزار باتیں سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

"تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری اس جذباتیت سے شیر دل کی زندگی کس طرح متاثر ہو گی امریکن ایمبیسی کو اس طرح

انوالو کر کے تم نے شیر دل اور ہماری فیملی کو سوشل اور پروفیشنل سرکلز میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ شیر دل نروس بریک ڈاؤن کی وجہ سے مرتے مرتے بچا ہے...... کوئی چھوٹا mess تو create نہیں کیا تم نے ہمارے لیے۔" شہر بانو کو عجیب سا اضطراب ہوا۔

"نروس بریک ڈاؤن......" شیر دل اتنا کمزور تو نہیں تھا یا شاید اس نے اسے ضرورت سے زیادہ مضبوط سمجھ لیا تھا۔

"اب وہ ٹھیک ہے؟" اس نے یک دم منزہ کو ٹوک کر پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے لیکن جو مہینے میں نے اسے سنبھالتے گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں اور خدا نہ کرے کسی ماں کو اپنی اولاد کو اس طرح تکلیف میں دیکھنا پڑے۔"

"میں نے جو بھی کیا میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں اور مجھے افسوس ہے۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں مجھے اتنی جلد بازی میں اتنے بڑے بڑے فیصلے نہیں کرنے چاہیے تھے لیکن بس غصے میں بعض دفعہ انسان کو کچھ سمجھ نہیں آتا۔" شہر بانو نے جیسے کچھ بے بس انداز میں اعتراف ندامت کیا تھا۔ اسے کم از کم اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں تھی کہ اس نے شیر دل کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ وہ جس طرح اس کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہے اس سے شیر دل کو لوگوں کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا اور اب جب وہ اپنے لائے ہوئے طوفان کے گزر جانے کے بعد ہونے والی تباہی دیکھ رہی تھی تو وہ پہلی بار ندامت کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ وجہ تنازعہ جس پر اس نے اتنا بڑا طوفان اٹھایا تھا اب اتنی infuriating (طیش میں لانے والی بات) نہیں لگ رہی تھی بلکہ بچکانہ لگ رہی تھی۔

"اچھی بات ہے تم شرمندہ ہو لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا۔ شیر دل کی شادی طے کر دی ہے میں نے...... اگلے مہینے ایک سادہ سی تقریب میں نکاح ہے اس کا۔" شہر بانو کو توقع ہونی چاہیے تھی کہ اگر وہ move on کر رہی تھی تو یہ کام شیر دل بھی کر سکتا تھا...... وہ اس کی زندگی سے نکل رہی تھی تو وہ اس جگہ کو کسی دوسری عورت سے پُر کر دیتا...... وہ پھر بھی چند سیکنڈز کے لیے جیسے سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔ شیر دل اپنی زندگی میں کسی اور عورت کو لا رہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔ عجیب بچکانہ جذباتیت کا شکار ہوئی تھی وہ...... شیر دل وہ کھلونا تھا جسے اس نے پھینک دیا تھا لیکن اب (محض خیال ہی میں) کسی دوسرے کو اس کھلونے سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر اسے یک دم وہی کھلونا اچھا لگنے لگا تھا...... وہی کھلونا چاہیے تھا۔ منزہ نے دانستہ اس کے سامنے یہ انکشاف کرتے ہوئے عکس کا نام نہیں لیا تھا اور شاید زندگی میں پہلی بار عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"میں پھر بھی یہ کہوں گی کہ تم شیر دل کو فون کرو...... اس سے بات کرو...... اگر کوئی ایسا حل نکل آتا ہے کہ تم اور وہ دونوں اکٹھے رہ سکو تو یہ مثال کے لیے بہت اچھا ہے لیکن ایسا کوئی حل شیر دل ہی نکال سکتا ہے، میں کچھ نہیں کر سکتی...... تم پاکستان آ جاؤ تو شاید یہ مسئلہ جلد اور زیادہ بہتر طریقے سے حل ہو جائے...... شیر دل، مثال کو دیکھے گا تو اس کا دل بھی نرم پڑے گا۔" منزہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی امیدیں دلا رہی تھیں اور لاشعوری طور پر جیسے وہ، وہ کہنا شروع ہو گئی تھیں جو وہ چاہتی تھیں۔ ایک سانس میں شیر دل کی شادی کی اطلاع اور دوسری سانس میں یہ دبی ہوئی خواہش کہ ایسا نہ ہو...... اور شیر دل، شہر بانو کی طرف لوٹ جائے اور اس لاشعوری سوچ کے پس منظر میں عکس کے حوالے سے ان کی ازلی ناپسندیدگی کارفرما تھی۔ اگر ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا لینے کا کوئی عملی مظاہرہ کرنا ہوتا تو منزہ وہ بلا مقابلہ جیت جاتیں۔ شہر بانو پر انہیں غصہ تھا، خفگی تھی...... شرمین سے انہیں نفرت تھی لیکن اس کے باوجود شہر بانو ان کے خاندان کا حصہ تھی...... ان جیسا حسب نسب رکھنے والی...... ان کا اپنا خون...... عکس ساری زندگی ان کے لیے احساس شکست کے سوا کچھ نہیں رہتی...... انہوں نے شیر دل کی زندگی کی خاطر اس کے سامنے جھکنا قبول کیا تھا اور اب اگر انہیں دوبارہ اس کے سامنے کھڑا ہونے کا موقع مل رہا تھا تو وہ ہر قیمت پر اس موقع کو استعمال کرنا چاہتی تھیں۔

"شیر دل کس سے شادی کر رہا ہے؟" وہ جواب جو انہوں نے خود شہر بانو کو دینے سے گریز کیا تھا وہ اس نے خود پوچھ لیا تھا۔

☆☆☆

"تم شیر دل سے شادی کر رہی ہو؟" عکس کو غنی کے غیر متوقع سوال پر کرنٹ لگا۔ اس نے کچھ دیر پہلے ہی فون کیا تھا اور دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے فوراً بعد اس نے عکس سے یک دم یہ سوال کر دیا تھا۔

"تم سے کس نے کہا؟" وہ جواب دینے سے ہچکچائی تھی۔ پی اے اس کی ٹیبل پر اس کے دستخط لینے کے لیے کچھ کاغذ رکھ رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا۔ اس وقت جیکب سیج کے ساتھ معاملے کو نپٹانے میں سارا دن کھپانے کے بعد غنی کے اس سوال نے اس کے جیسے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ خبر اگر اسلام آباد میں بیٹھے غنی تک پہنچ گئی تھی تو وہ خبر اس سے کہیں زیادہ برق رفتاری سے سفر کر رہی تھی جتنا اس نے سوچا تھا۔

"یعنی تم کر رہی ہو؟" غنی نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

"ہاں۔" اس بار عکس نے بالآخر تمہید اور کسی جھجک کے بغیر کہا۔ غنی کے سامنے تمہیدوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"اچھا فیصلہ ہے......" اس کے اگلے جملے نے عکس کو حیران کر دیا تھا۔ وہ کم از کم غنی سے اس جملے کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

"اوہ...... تمہیں واقعی لگتا ہے اچھا فیصلہ ہے یا تم صرف طنز کر رہے ہو؟"

"طنز کیوں کروں گا میں...... تمہاری زندگی ہے تمہیں حق ہے اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کرنے کا...... اور شیر دل مجھے برا لگتا ہے لیکن تمہارے لیے اچھا ہے وہ۔" غنی کا لہجہ بے تاثر تھا، وہ کوشش کے باوجود کسی قسم کا طنز یا گلہ کہیں ڈھونڈ نہ سکی تھی۔

"میں ویسے بھی بہت عرصے سے اس خبر کی توقع کر رہا تھا تم سے لیکن میں اگر حیران تھا تو صرف اس بات پر کہ شہر بانو کے ہوتے ہوئے...... تم شیر دل سے شادی کرنے پر تیار ہو گی لیکن......" غنی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا عکس نے بے اختیار گہری سانس لی۔ بالآخر وہ کانٹا دکھنے لگا تھا جو چبھا ہوا تھا۔

"تم کیوں اس خبر کی توقع کر رہے تھے؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے غنی سے پوچھا۔

"مجھے جواد نے تم دونوں کے بارے میں ایسی کچھ باتیں کہی تھیں جس کے بعد مجھے توقع تھی تمہاری طرف سے ایسی کسی خبر کے آنے کی۔ میں نے جواد سے تب صرف اس لیے بات کی تھی کہ اگر ممکن ہو سکے تو میں تم دونوں کے درمیان Patchup کرا سکوں۔ تمہیں تو پتا ہے ناں، اس کی فیملی کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں...... لیکن جواد نے جوابا جو کچھ بتایا اس کے بعد مجھے لگا کہ اس کے ساتھ منگنی ختم کرنا تمہاری خواہش تھی، اس کی نہیں۔" عکس خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی وہ اگرچہ کچھ تلخ باتیں کہہ رہا تھا لیکن اس کا انداز دوستانہ تھا۔ تلخی نام کی کوئی شے اس میں نہیں تھی۔ عکس نے اس کی بات ختم ہونے پر بڑی متانت سے اس سے کہا۔

"میں جواد کی کسی بات پر Comment نہیں کروں گی کیونکہ جواد کی بات پہ تبصرہ کرنا بیکار ہے۔ لیکن میں اس بات پر ضرور حیران ہوں کہ تم دوست ہوتے ہوئے بھی جواد کی یہ ساری باتیں سن کے مجھ سے بات کرنے کے بجائے خاموش رہے۔ کم از کم تمہیں اس وقت مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا کہ میں نے تمہارے بارے میں یہ سنا ہے۔ بیٹھے بٹھائے خود سے کچھ بھی assume کر لینا کم از کم مجھے تم سے اس چیز کی توقع نہیں تھی۔" غنی نے بھی اس کی بات اسی خاموشی سے سنی تھی جس طرح وہ اس کی بات سنتی رہی تھی۔

"تمہارا ذاتی مسئلہ تھا اور میں اگر حیران تھا تو صرف اس بات پہ کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں شیر دل سے شادی کرنے کا شوق کیسے پیدا ہو گیا۔ اگر ایسا کچھ تھا تو تمہیں بہت پہلے اس سے شادی کر لینی چاہیے تھی جب ابھی وہ غیر شادی شدہ تھا۔" جب عکس نے اپنی بات ختم کر لی تو غنی نے کہا۔

"اس کی شادی میری وجہ سے ختم نہیں ہوئی تھی۔" عکس نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔ "کم از کم میرے اور شیر دل کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں تھا جسے بنیاد بنا کر اس کی بیوی اس سے علیحدہ ہوتی۔ لیکن میں یہ مانتی ہوں کہ شہر بانو میرے حوالے سے کچھ خدشات کا شکار ہوئی، یا شاید مجھے یہ کہنا چاہیے کہ وہ کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہوئی...... میں directly نہ سہی لیکن Indirectly ان دونوں کی شادی ختم ہونے کا باعث بن گئی اور مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔"........ غنی نے اس کی بات کاٹی۔

"یار! چھوڑو اب اس سارے افسوس وغیرہ کو، ان دونوں کی طلاق ہو گئی، بات ختم ہو گئی۔"

"بات ختم نہیں ہوئی، ختم ہو بھی جائے، تو بھی اس کی بازگشت بہت دیر تک گونجتی رہتی ہے۔ جس طرح تم نے منہ اٹھا کے کہہ دیا کہ تم شیر دل اور میرے بارے میں بہت دیر سے جانتے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ہم دونوں عنقریب شادی کر لیں گے۔ اس طرح اور بھی ڈھیروں لوگ یہاں اسی طرح کی باتیں سوچ اور کر رہے ہوں گے۔" عکس نے اس سے کہا۔

"تو کیا فرق پڑتا ہے؟ تمہیں کیا لگتا ہے کہ افواہیں صرف تب پھیلتی ہیں جب واقعی کچھ ہو رہا ہو؟ ایسا نہیں ہے۔ کوئی بات نہ ہو تب بھی بہت باتیں کی جا سکتی ہیں اور بہت باتیں بنائی جا سکتی ہیں۔ یہ انسانوں کی پسندیدہ activity ہے۔ ویسے بھی جو قوم جتنی فارغ ہو، اس کے پاس بات کرنے کے لیے اتنا ہی زیادہ فالتو وقت ہوتا ہے تمہیں پروا کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔" غنی نے بے پروائی سے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

"تم مجھے سپورٹ کیوں کر رہے ہو؟ اس مسئلے پر؟" عکس تھوڑا سا مسکرائی۔

"تمہیں، غلط فہمی بالکل نہیں ہونی چاہیے کہ میں تمہیں سپورٹ کر رہا ہوں۔ تم نے کون سا مجھ سے پوچھ کے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔ تم تو سب کچھ مجھ سے اس طرح چھپائے ہوئے تھیں جیسے مجھے بھی کچھ پتا ہی نہیں چلے گا لیکن دیکھ لو، میں جانتا ہوں اور بہت دیر سے جانتا ہوں۔"

"تم جانتے ہو، تو اور لوگ بھی جانتے ہوں گے، ہمارے batch mates میں سے۔" عکس نے اس کی بات غور سے سنتے ہوئے اس سے کہا۔

"یقیناً جانتے ہوں گے تو کیا ہوا؟ تم خائف کیوں ہو اس بات سے؟" غنی ایک لمحے کے لیے رکا، پھر اس نے کہا۔

"خائف ہونے والی بات ہے، اس لیے خائف ہوں۔" اس کی بات سن کر عکس نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

"تم سول سروس میں جس سے بھی شادی کرتیں، تمہارے بارے میں کچھ نہ کچھ افواہیں بنتی۔ کہیں باہر کرتیں تو شاید بچ جاتیں۔ اب شیر دل کے ساتھ کر رہی ہو تو بھی تھوڑی بہت باتیں تو ضرور ہوں گی۔ ہم فرشتے نہیں ہیں، جن کے بارے میں لوگ بات نہ کریں اور اگر کریں تو ہمیشہ اچھی بات ہی کریں۔ شیر دل کی شادی ختم ہونے کی جو بھی وجوہات ہوں لیکن وہ ختم ہو گئی ہے۔ اس لیے تم شہر بانو اور شیر دل کے بریک اپ کو اپنے اعصاب پر سوار کیے بغیر اس رشتے کو شروع کرو۔" وہ بڑی سنجیدگی سے اسے نادانستگی میں بہت ساری ایسی چیزیں سمجھا گیا تھا جو عکس کو کسی دوسرے سے سمجھ میں نہ آتیں۔

"تمہیں شادی کی خبر کس نے دی ہے؟" عکس نے پوچھا۔

"شیر دل نے ایک دو batch mates سے ذکر کیا ہے کل۔ مجھے انہی میں سے ایک سے پتا چلا تو میں نے تڑپ کے تمہیں فون کیا۔ آخر تم میرے ساتھ بے وفائی کیسے کر سکتی ہو؟"

"اس طرح کی باتیں کسی دوسرے کے سامنے کی ناں تم نے تو شیر دل تک بھی پہنچیں گی۔ اس کے بعد تم خود اندازہ لگا سکتے ہو، کہ وہ کیا کرے گا تمہارے ساتھ۔" وہ اس کے آخری جملے پہ ہنس پڑی تھی۔

"میں اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا کیا؟ اور شیر دل کی دھمکیاں دینا بند کر دو۔" غنی نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"تم اپنے جذبات کا اظہار اپنی بیوی سے جا کے کیا کرو یا پھر میں خود تانیہ کو فون کر کے تمہارے جذبات پہنچاؤں اس تک؟" عکس نے جواباً کہا۔

"تم اب مجھے میری بیوی سے جوتے پڑوانا چاہتی ہو۔ اسے پہلے ہی تم سے شدید قسم کی insecurity ہے۔" غنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس insecurity کی وجہ تم خود ہو اور دس دفعہ تو تمہاری بیوی خود مجھ سے کہہ چکی ہے کہ میں بڑی سمجھدار اور خوش قسمت تھی کہ غنی کی کوشش کے باوجود اس سے شادی نہیں کی۔ کاش وہ بھی ایسی عقل مندی کا مظاہرہ وقت پر کر دیتی۔" غنی نے اس کی بات سے ذرہ برابر بھی متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"وہ ہر اس لڑکی سے ایسی ہی باتیں کرتی رہتی ہے جس کے بارے میں اسے تھوڑا سا بھی یہ شک ہو کہ میں بھی اس کو پسند کرتا تھا۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے ایک دوسرے کے سامنے اس طرح کی باتیں کرنے کی۔"

"تانیہ کے سامنے تمہاری بولتی بند ہو جاتی ہے یہ مثالیں اس کے سامنے کبھی نہیں سنیں تمہارے منہ سے۔" عکس نے اسے tease کیا تھا۔

"میں بے وقوف نہیں ہوں صرف شوہر ہوں۔" غنی نے مسکراتے ہوئے کہا ساتھ ہی اس سے پوچھا۔ "اس کی فیملی تمہیں قبول کر لے گی؟"

''اس کی فیملی ہی نے initiate کیا ہے یہ جو کچھ بھی ہوا ہے۔'' عکس بھی سنجیدہ ہوگئی۔

''یہ سب کچھ ویسے بہت ناقابلِ یقین ہے۔'' غنی نے کہا۔

''کیوں......؟'' وہ غنی کی بات کے جواب میں کہنا چاہتی تھی کہ تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ جواباً سوال کر بیٹھی تھی۔

''are you sure کہ اس شادی کے پیچھے کوئی اور مقصد نہیں ہے؟'' غنی اگر ایسا سوچ رہا تھا تو اتنا غلط نہیں سوچ رہا تھا۔ جو خاندان اپنی ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا ہو وہ یک دم آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے پر تیار ہو جائے تو یہ بات کسی کو بھی شک وشبہ اور اچنبھے میں ڈال سکتی ہے۔

''قسمت میں ہے اس لیے ہو رہا ہے یہ سب کچھ......ان کی نیت اور ارادے پر تو مجھے کوئی شک نہیں۔'' عکس نے اپنی ہونے والی سسرال کی حمایت کی۔

''شیر دل کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا انہیں قائل کرنے میں۔'' غنی نے یک دم کہا۔

''ہاں یقیناً شیر دل نے ہی قائل کیا ہوگا انہیں۔'' وہ چاہتے ہوئے بھی یہ نہیں کہہ سکی کہ یہ محبت سے زیادہ ضرورت تھی جو اس رشتے اور تعلق کے پیچھے محرکات میں سے ایک تھی۔ اسے شیر دل کی اپنے لیے فیلنگز پر کبھی کوئی شبہ نہیں رہا تھا لیکن اسے شیر دل کے ماں، باپ کے حوالے سے کوئی خوش فہمی بھی نہیں رہی تھی۔ وہ جانتی تھی شیر دل اگر اس طرح بیمار نہ پڑتا تو اس کے والدین کبھی اس رشتے پر رضامند نہیں ہوتے۔ غنی سے اس کی بہت دوستی تھی لیکن وہ غنی سے یہ سب شیئر نہیں کرسکتی تھی۔ کچھ باتیں انسان اپنے آپ سے بھی نہیں کہہ پاتا خود بھی جھٹلاتا رہتا ہے وہ بھی ایسی ہی بے قدری کی ایک بات تھی جو وہ کسی دوسرے سے نہیں کہنا چاہتی تھی خاص طور پر اس خاندان کے ایک شخص سے جو شیر دل اور اس کے خاندان کا rival تھا۔

''شیر دل سے شادی کے ساتھ ہی یقیناً تمہاری اور میری دوستی کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔'' غنی نے بالآخر اس خدشے کا اظہار کیا جسے ڈسکس کرنے کے لیے اس نے اسے فون کیا تھا۔

''کیوں...... بیٹھے بٹھائے یہ دوستی کا کیا مسئلہ ہوگیا تمہیں؟'' عکس ہنس دی تھی اسے اچانک احساس ہوا غنی کے خدشات کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔

''مجھے بیٹھے بٹھائے کوئی مسئلہ نہیں ہوا...... تمہیں ہونے والا ہے بلکہ تمہیں نہیں، تمہارے ہونے والے شوہر کو ہونے والا ہے۔'' غنی نے بہت جتانے والے انداز میں کہا۔

''شیر دل میچور ہے۔'' عکس نے بہت گھما کر بات کی تھی۔ غنی جواباً قہقہہ مار کر ہنسا۔

''تم ایک انتہائی خبیث آدمی ہو۔'' وہ بھی کچھ شرمندہ انداز میں ہنس دی۔

''شیر دل سے بہت کم'' غنی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''تم جسے خبیث کہہ رہے ہو وہ میرا ہونے والا شوہر ہے۔'' وہ خفا ہوئی تھی۔

''اور میں تمہارے ہونے والے شوہر کو تب سے جانتا ہوں جب اسے جوتے کے laces تک ٹھیک سے باندھنے نہیں آتے تھے خیر وہ تو شاید اب بھی ٹھیک سے نہ باندھ سکے اگر laces والے شوز پہننے پڑ جائیں تو......'' غنی نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

''تم اگر اس طرح کی باتیں کیا کرو گے اب میرے ساتھ تو تمہاری اور میری دوستی واقعی نہیں رہے گی۔'' اس بار عکس اس کے مذاق سے محظوظ نہیں ہوئی تھی۔

''مجھے اسی بات کا خدشہ ہے کہ اب تم شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار بننے کی کوشش نہ کرنے لگو۔'' غنی نے اسی انداز میں کہا تھا۔

''غنی تم میرے اچھے دوست ہو اور میں کبھی تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہوں گی، تمہیں خائف ہونے یا خدشات کا شکار ہونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شیر دل سے شادی ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مجھے ہر اس شخص سے بات کرنے سے منع کردے گا جسے وہ پسند نہیں کرتا۔'' اس نے بہت نرمی اور متانت سے غنی کی بات کے جواب میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''لیکن جہاں تک وفاداری کا سوال ہے تو ظاہر ہے شوہر کے طور پر اس کے ساتھ میری وفاداری کی نوعیت کسی دوست کے ساتھ وفاداری کی نوعیت سے مختلف ہو جائے گی اور میں چاہتی ہوں تم بھی اس معاملے پر اتنی ہی سمجھداری کا مظاہرہ کرو جتنا

تم شیر دل سے چاہتے ہو۔'' وہ کہتی گئی تھی۔ ''تم دونوں کے خاندان کے درمیان ماضی میں کیسے اختلافات رہے ہیں اور تم اور شیر دل ایک دوسرے کو کیوں پسند نہیں کرتے مجھے اس سب کی تاریخ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں جاننا چاہتی ہوں۔'' اس نے بات ختم کی۔

''تم سیریس ہوگئیں میں مذاق کر رہا تھا۔'' غنی نے یک دم اس سے کہا۔

''میں چاہتی ہوں اب تم اپنے تمام jokes میں سے شیر دل کو نکال دو...... دنیا میں اور بہت سی چیزیں اور لوگ اس سے۔ وہ funny ہیں تم چاہو تو میں کچھ لوگوں کے نام تمہیں بتا سکتی ہوں۔'' وہ بہت سہولت سے گفتگو کو اس موضوع سے ہٹا لے گئی تھی جس پر وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ غنی نے بھی موضوع بدلنے دیا تھا۔ وہ شیر دل کا خیر خواہ مر کے بھی نہیں ہوسکتا تھا لیکن وہ عکس کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور یہ بات عکس جانتی تھی عجیب بات تھی، لیکن زندگی میں اس کی ساری دوستیاں ہمیشہ لڑکوں سے ہی ہوتی رہی تھیں...... کم دوستیاں لیکن بہت مضبوط اور قابلِ بھروسا تعلقات...... اسکول میں پھر بھی کسی حد تک اس کی کچھ چھوٹی موٹی دوستیاں لڑکیوں سے رہی تھیں لیکن میڈیکل کالج، اکیڈمی اور پھر جاب میں آنے کے بعد اس کے دوستوں کا سب سے قریبی سرکل مردوں پر مشتمل رہا تھا۔ کئی بار اس نے بیٹھ کر اس چیز analyse بھی کیا تھا اور ہر بار اسے اس کی ایک ہی وجہ سمجھ آئی تھی...... خیر دین...... اس کی زندگی پر حلیمہ کے بجائے خیر دین کا اثر رہا تھا۔ اس کا پورا بچپن ایک مرد کے گرد گھومتا رہا تھا۔ جو اس کے ساتھ صرف ایک خونی رشتہ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کا بہترین دوست اور استاد بھی تھا اور جس نے اسے زندگی میں کبھی انسانوں کو صنف کی بنیاد پر تعصب کا شکار ہونے نہیں دیا تھا جس نے اچھائی اور برائی کے بارے میں بات کرتے وقت اس کے سامنے ہمیشہ انسانوں کی اچھائی اور برائی کی بات کی تھی مردوں یا عورتوں کی نہیں، اپنی زندگی میں مردوں سے ہونے والے تمام تلخ تجربات کے باوجود اگر عکس مراد علی کے لیے کوئی رول ماڈل رہے تھے تو مرد ہی رہے تھے...... خیر دین کی شکل میں، میڈیکل کالج کے پروفیسرز کی شکل میں...... اکیڈمی میں انسٹرکٹرز اور پروفیشنل لائف میں سینئر آفیسرز کی شکل میں...... شیر دل اور غنی کی شکل میں، چند عزیز ترین دوستوں کی شکل میں جن کے مشوروں اور رائے کو وہ ہمیشہ بہت اہمیت دیتی رہی تھی لیکن اپنی زندگی میں مردوں کی اتنی نمایاں اہمیت اور اثر ہونے کے باوجود ایک عورت کے طور پر اس نے نہ اپنی شخصیت پر صنفِ مخالف کی کوئی چھاپ لی تھی نہ وہ صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے ذہنی طور پر کسی عدم تحفظ اور کمپلیکس کا شکار تھی۔ وہ ایک عورت اور ایک انسان کے طور پر اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے تھی...... اور وہ کتنا مشکل کام کر رہی تھی خود اسے بھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

کسی کی زندگی سے خود نکل جانا اور بات ہے لیکن اپنی جگہ کو بڑی آسانی سے پُر ہوتے دیکھنا اور بات...... کسی سے نفرت ہو تو بھی تکلیف ہوتی ہے اور وہ شخص جو اپنی زندگی میں آپ کو replace کر رہا ہو وہ آپ کی پہلی اور آخری محبت ہو تو پھر صرف تکلیف نہیں ہوتی...... انسان سولی پر لٹک جاتا ہے، نہ بھول سکتا ہے نہ نظر انداز کرسکتا ہے...... صبر کر لینا تو ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔

شہر بانو بھی عکس اور شیر دل کی شادی کی خبر سن کر کچھ ایسی ہی تکلیف سے گزر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ عکس کی جگہ شیر دل کی زندگی میں کوئی اور عورت آتی تو اس کا ردِعمل کیسا ہوتا...... تکلیف تو اسے یقیناً تب بھی ہوتی لیکن یہ غصہ اور غم جو وہ اپنی چیز اس شخص کی ہوتی دیکھ کر محسوس کر رہی تھی جس سے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی...... یہ غصہ شاید وہ تب محسوس نہ کرتی وہ شیر دل کو چھوڑتے ہوئے اسے option دے آئی تھی کہ وہ عکس سے شادی کرلے کیونکہ وہ اس سے نہیں عکس ہی سے محبت کرتا تھا لیکن اب جب وہ ہونے جا رہا تھا تو وہ عجیب صدمے اور بے بسی کی کیفیت سے دوچار تھی...... کہیں نہ کہیں اسے امید تھی کہ اس ایشو پر اس کی طلاق ہونے کے بعد شیر دل کسی سے بھی شادی کرتا لیکن عکس سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اسے یقین تھا منزہ اور بختیار کبھی عکس کو اپنی بہو بنانے پر رضامند نہیں ہوسکتے تھے خاص طور پر اس بیک گراؤنڈ اور اس ٹریجڈی کے بعد جس کا ایک کردار اگر عکس تھی تو دوسرا کردار شہباز حسین تھا...... اس کا باپ...... منزہ کا اکلوتا بھائی...... اس خاندان کو چھوڑ آنے کے باوجود وہ یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ اپنوں اور غیروں میں فرق رکھیں گے...... جنہیں وہ ناپسند کرتی تھی وہ سب بھی ان کے لیے اتنی ہی ناپسندیدگی اور بے مہری رکھیں گے...... اور اب جب سب کچھ اس کی توقعات اور

اندازوں کے برعکس ہوا تھا تو وہ سکتے سے زیادہ صدمے میں بیٹھی تھی۔

غلط توقعات، غلط اندازے، غلط فیصلے اور جلد بازی ہی شہر بانو کی زندگی کو define کرتے تھے۔ ضرورت سے زیادہ حساسیت اور انا پرستی وہ دوسرے مسائل تھے جن سے وہ دوچار تھی اور وہ ان میں سے کسی ایک خامی کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی کیونکہ وہ اپنی شخصیت میں ان خامیوں کی کبھی نشاندہی کر ہی نہیں پائی تھی۔ سب سے آسان کام وہ تھا جو وہ بھی بے وقوف کی طرح کرتی تھی۔ اپنی زندگی میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے کی ذمے داری دوسروں کے سر تھوپ دینا...... خود ترس کھانا اور کھاتے ہی چلے جانا...... اور وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی...... کہانی کی پرفیکٹ ہیروئن...... بے پناہ حسین، نازک، خاندانی، کمزور، بات بات پر گھبرا کر رو دینے والی، مصیبتوں میں گھری ہوئی...... اور ہمیشہ کسی ایسے شہزادے کی منتظر جو اس کی زندگی کے ہر مسئلے اور مصیبت سے بچا کر اپنے ساتھ اپنے محل میں لے جاتا جہاں وہ دونوں ہمیشہ ہنسی خوشی زندگی گزارتے...... اور پڑھنے والے ایک اطمینان بھری سانس اور مسکراہٹ کے ساتھ کہانی کا آخری صفحہ پلٹ کر کتاب بند کرتے...... اور ناظرین اپنی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے تالیاں پیٹ پیٹ کر اور اپنی سیٹوں سے کھڑے ہو کر سینما اسکرین پر ابھرنے والے اس خوش و خرم جوڑے کے آخری shot پر داد دیتے جس میں وہ اپنے محل کی بالکونی سے ایک دوسرے کی بانہوں میں بالکونی کے نیچے موجود لوگوں کی طرف ہاتھ ہلاتے۔

زندگی کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ کہانی کے آخری صفحے سے شروع ہوتی ہے اس میں بعض دفعہ شہزادے کی آمد بھی ہیروئن کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی...... اور کئی بار محل میں پہنچ جانے کے بعد بھی ہیروئن اپنے لیے مصیبت کا انبار کھڑا کر لیتی ہے۔

شہر بانو نے بھی یہی کیا تھا اور اب وہ پچھتا رہی تھی لیکن شہزادے کی دوبارہ آمد کہیں سے ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

''تو تم اب کیا کرنا چاہتی ہو؟'' شرمین نے یہ سب کچھ جاننے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔ شہر بانو کو کم از کم ماں کو اپنی mental anguish (ذہنی اذیت) کے بارے میں بتانے کے لیے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا چہرہ اور پورا وجود یہ بتا رہا تھا۔

''میں شیر دل سے پھر بھی رابطہ کروں گی شادی کے لیے نہیں...... لیکن میں چاہتی ہوں مثال اس سے ملتی رہے۔'' زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کوئی صحیح فیصلہ کیا تھا اور شرمین نے اسے ٹوکا نہیں تھا اس نے بس ایک سوال کیا تھا۔

''مثال سے کیسے ملے گا وہ؟ وہ یہاں آ نہیں سکتا...... تو کیا تم وہاں جاؤ گی؟ اور اگر جاؤ گی تو پھر داؤد اعتراض کر سکتا ہے۔''

☆☆☆

''I am so sorry میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ اتنی جرات کیسے آ گئی اس میں، صبح سے اسی ایک بات کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' ایک شیر دل بہت معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ کل سے اس کی بات سنتی رہی وہ اس وقت ڈنر کرنے کے بعد اپنے بیڈروم میں آئی تھی جب شیر دل نے اسے کال کیا تھا۔ اس نے آفس میں بھی کئی بار اسے فون کیا تھا لیکن عکس اس قدر مصروف اور الجھی ہوئی تھی کہ اس نے شیر دل کی کال نہیں لی۔ شیر دل کو لگا کال نہ لینے کی وجہ اس کا وہ مشورہ تھا جو عکس کو مہنگا پڑ گیا تھا۔ وہ اس لیے بھی کچھ panicked (پریشان) تھا کہ اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ کودنے کے بعد جیکب مسیح کا کیا بنا تھا...... اس کے بہت دفعہ کے text کے بعد بھی عکس نے اسے جواب نہیں دیا تھا اور اس کی خاموشی نے شیر دل کو کچھ پریشان کر دیا تھا۔ ڈی سی آفس کی چھت سے کود کر کسی کا مر جانا اس صورت میں اور بھی سنگین معاملہ تھا اگر یہ ردعمل ڈی سی کے کود جاؤ...... کے اعلان کے بعد ہوا تھا...... اور خاص طور پر ایک خاتون آفیسر کی طرف...... عکس کے جواب نہ دینے کے باوجود اس نے اپنے اسٹاف کے ذریعے یہ معلوم کر لیا تھا کہ جیکب مسیح خودکشی کی اس کوشش کے باوجود زندہ سلامت تھا اور شیر دل نے اس خبر کے ملنے کے بعد جیسے سکون کی سانس لی تھی لیکن اس کے باوجود عکس سے بات کر کے معذرت کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

''تو کیا نتیجہ اخذ کیا تم نے اتنی لمبی سوچ بچار کے بعد؟'' اس کا لب و لہجہ طنزیہ نہیں تھا لیکن شیر دل جانتا تھا کہ وہ طنز ہی تھا۔

''میرا خیال ہے وہ کسی عورت کی طرف سے کیے ہوئے اس چیلنج کو برداشت نہیں کر سکا اگر تمہاری جگہ کوئی مرد اسے یہ

کہتا تو وہ کبھی نہ کودتا لیکن...... تم نے کہا تو اس کے لیے یہ عزت کا مسئلہ بن گیا۔'' شیر دل نے سنجیدہ لہجے میں مذاق کیا تھا۔

''مجھے تم سے اسی طرح کے نتیجے کی امید تھی۔'' عکس نے اسی تحمل سے کہا۔

''یار مذاق کر رہا ہوں میں۔'' شیر دل فوراً سنبھلا تھا اسے احساس ہوا شاید یہ کوئی زیادہ مناسب موقع نہیں تھا ایسی بات کے کہنے کا۔

''ویسے for you kind information میں نے تمہارے مشورے پر عمل نہیں کیا تھا۔''

''اوہ اچھا تو میں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہا ہوں۔'' شیر دل یک دم مطمئن ہوا تھا۔ ''لیکن پھر کیوں کودا وہ؟''

''کیونکہ وہ کودنے ہی آیا تھا...... بچ اس لیے گیا کیونکہ نیچے فائر بریگیڈ والوں نے net لگایا ہوا تھا۔ they scooped him in time'' وہ اب اسے بتا رہی تھی۔ ''لیکن میں نے بہرحال اسے جاب پر بحال کر دیا ہے۔''

''ویری گڈ...... اب تم دیکھنا جس کے خلاف بھی کوئی disciplinary action (تادیبی کارروائی) ہوگی وہ سیدھا تمہارے آفس کی چھت پر اسی کام کے لیے پہنچ جائے گا۔'' شیر دل نے ناپسندیدگی سے کہا۔

''اب تم کہہ دو poor woman, poor management۔'' عکس نے بے ساختہ کہا۔ وہ جواباً ہنس دیا۔

''تم ہر بات کو اب زیادہ ہی دل پر لینے لگی ہو۔'' وہ اب ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگا تھا۔

''ہاں دماغ نے کام کرنا چھوڑا ہوا ہے میرے آج کل...... اس لیے دل پر بوجھ ڈال دیا ہے سارا۔'' اس نے جواباً کہا۔

''ویسے بھی تم ہو ناں دماغ استعمال کرنے کے لیے...... آج کل بہت سارے نئے نئے کاموں میں دماغ لگا رکھا ہے تم نے۔'' عکس نے دوسرے جملے میں اسے چوٹ کی تھی۔ شیر دل کو ریفرنس بوجھنے میں سیکنڈز لگے۔

''بعض ''نئے کام'' بہت پہلے ہو جاتے تو نہ تمہارا دماغ کام کرنا چھوڑتا نہ میرا دل۔''

''ساری عمر تم مجھے اسی ایک بات کے طعنے دو گے۔'' وہ ہنس پڑی تھی۔

''میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔''

''نانا کے پاس آنے سے پہلے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔ مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا...... تم نے میرے لیے بہت مشکل صورت حال پیدا کر دی ہے۔'' شیر دل اس کی بات کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہا۔

''اب کوئی فائدہ ہے ان باتوں کا...... دوبارہ زیرو سے بات شروع کریں کیا؟'' پھر ایک گہری سانس لے کر شیر دل نے کہا۔

''ہاں، اب کوئی فائدہ نہیں ہے ان باتوں کا نانا نے ہاں کی ہے میں ان کی بات نبھاؤں گی۔'' اس نے جواباً کہا۔

''اوہ...... صرف نانا کی بات نبھاؤ گی...... ورنہ تو تمہیں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے...... نہ پہلے تھی...... نہ اب ہے...... نہ آئندہ ہوگی۔'' شیر دل کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا تلخی تھی اور عکس حیران رہ گئی تھی، وہ چھوٹی سی بات پر تلخ ہو جانے کا عادی نہیں تھا یہ ایک نئی عادت تھی اس کی یا حالات کا نتیجہ...... چند لمحوں کے لیے عکس کو واقعی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

''تم اظہارِ محبت چاہتے ہو مجھ سے؟'' اس نے چند لمحوں کے بعد...... مدھم آواز میں کہا۔

''تمہیں اعتراض ہے کیا؟'' اس نے جواباً کہا۔ عکس نے جواب نہیں دیا۔ کہنے کو بہت الفاظ تھے عکس کے پاس پر کہہ دینے کی ہمت نہیں تھی۔

''تم بہت بڑی قربانی دے رہی ہو میرے لیے۔'' شیر دل نے چند لمحوں بعد کہنا شروع کیا۔ ''زندگی میں ایک بہت مشکل موڑ پر میرا ساتھی بننے کا فیصلہ کیا ہے، وہ بھی میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود...... ایک بہتر آپشن کو چھوڑ کر تم میری طرف آ رہی ہو اور میں اس کی بہت قدر کرتا ہوں۔'' وہ خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی، اس کے لہجے میں تھکن تھی یا شاید اداسی تھی اور عکس کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کا ساتھی دوسری بار چننا اور اس طرح چننا کسی کے لیے بھی بہت خوشگوار فیصلہ نہیں ہوتا۔

اس کائنات میں محبت ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں

اک رابطہ مسلسل ہے اِک فاصلہ مسلسل ہے
میں خود کو بیچ دوں پھر بھی میں تجھ کو پا نہیں سکتا
میں عام سا ہمیشہ ہوں تو خاص سا مسلسل ہے

وہ خاموش ہو گیا تھا۔ وہ بھی خاموش ہی رہی تھی۔ زندگی واقعی بہت عجیب چیز ہے...... کہاں کب کس کو کس سے کیسے ملا ہے اور ملا سکتی ہے انسان عقل کی ساری گتھیاں سلجھالے پھر بھی جان نہیں پاتا...... جان سکتا ہی نہیں۔

ہم اپنی زندگی میں پسند اور ناپسند کے گوشوارے میں جو جو کچھ تحریر کرتے ہیں وہ اپنی جگہ بدلتا رہتا ہے ان دونوں کی زندگی میں بھی کوشش کیے بغیر ہی بدل گیا تھا...... کوئی تکلیف سے گزرا تھا اور کوئی تعجب سے گزر رہا تھا...... پر کہیں بھی کچھ رکتا ہی نہیں، نہ وقت، نہ موسم، نہ ہوا نہ آنکھ کا پانی۔

''تم رو رہی ہو؟'' کسی سسکی ہچکی یا آواز کے بغیر بھی شیر دل نے اس کی آنکھوں کی نمی دیکھ لی تھی۔

''ہاں......'' اس نے بھرائی ہوئی مدھم آواز میں کہا۔

''بہت اچھا کر رہی ہو صرف یہ ایک خصوصیت ہے جس کی وجہ سے تم مجھے کیوٹ لگتی تھیں۔'' بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے اس جملے پر وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی۔

''میں بیوی بننے کے بعد تمہیں رُلا بھی سکتی ہوں، عورتوں کی یہ خصوصیت بھی ہے مجھ میں۔'' اس نے اپنی ناک رگڑتے ہوئے شیر دل سے کہا۔

''دیکھیں گے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

اس رات زندگی میں پہلی بار وہ ساری رات فون پر بات کرتے رہے تھے۔ جیسے پل باندھنے، دیواریں توڑنے رشتوں کو جوڑنے کی کوشش میں معروف رہے...... کام مشکل تھا پر ناممکن نہیں تھا۔ وہ ملبے کے جس ڈھیر کو صاف کر کے دوبارہ عمارت بنانے کی کوشش کر رہے تھے اس کی بنیادیں پہلے سے ہی موجود تھیں صرف تلاش باقی تھی اور ان کے پاس اس کام کے لیے بہت وقت تھا۔

☆☆☆

خیر دین کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔ اس عمر میں انسان اکثر اونچا سنتا ہے اور غلط بھی۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا منزہ بہن؟'' اس نے جیسے تصدیق کرنے کے لیے منزہ سے دوبارہ پوچھا تھا، وہ ابھی کچھ دیر پہلے بغیر اطلاع کیے اچانک وہاں پہنچی تھیں۔ خیر دین نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا تھا اس کا خیال تھا وہ عکس کے لیے کی جانے والی جیولری اور کپڑوں کی شاپنگ کے لیے کسی ناپ کے لیے وہاں آئی تھیں۔ حلیمہ بھی اس وقت عکس کے ساتھ ایسے ہی چند کاموں کے لیے بازار گئی تھی۔ خیر دین نے انہیں فون کر کے فوری طور پر بلوانا چاہا تو منزہ نے روک دیا۔ انہیں اس سے کچھ باتیں کرنی تھیں اور اکیلے میں کرنی تھیں۔ خیر دین کچھ الجھا...... انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تھا۔ لمبی تمہید کے بعد انہوں نے کہا تھا وہ بھی تمہیدوں کی طرح خیر دین کو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''بھائی صاحب شیر دل کی بیوی مصالحت چاہتی ہے اور واپس گھر آنا چاہتی ہے۔'' منزہ نے ایک بار پھر اپنا جملہ دُہرایا تھا۔ اس دفعہ پہلے سے کچھ زیادہ مضبوط انداز میں۔

''لیکن ان دونوں کی تو طلاق ہو چکی ہے اب مصالحت کیسے ہو سکتی ہے؟'' خیر دین کے ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ اس جملے کا اصل مطلب کیا تھا وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا اور اس کھائی کی گہرائی بھی جس میں اس نے عکس کو نادانستگی میں دھکیل دیا تھا۔

''طلاق کا حق تفویض کیا تھا لیکن صرف طلاق سے علیحدگی کا...... شہر بانو نے وہی حق استعمال کیا تھا لیکن وہ اب مصالحت چاہتی ہے تو مذہبی اور قانونی طور پر وہ دونوں صرف نکاح کر کے دوبارہ گھر آباد کر سکتے ہیں۔'' منزہ نے کہا تھا... خیر دین کے پاس کہنے کے لیے جیسے کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ منزہ بولتی رہیں۔ ''ایک چھوٹی بچی کا معاملہ ہے، ہماری پوری فیملی بہت اپ سیٹ ہے...... شیر دل بھی بہت الجھا ہوا ہے لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا، میں نے سوچا میں آپ سے خود بات کرلوں، آپ کے سامنے یہ سارا معاملہ رکھوں گی تو آپ خود ہی اچھا فیصلہ کریں گے۔ عکس کو تو کوئی بھی مل سکتا ہے لیکن شہر بانو اور اس کی بچی کی زندگی تباہ ہو رہی ہے، وہ معصوم بچی اپنے باپ کے بغیر کیسے رہے گی۔ شیر دل کا اس بچی کو نہ مل پانے کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اب اگر ایک امید پیدا ہوئی ہے اس فیملی کے دوبارہ اکٹھے ہونے کی تو بھائی صاحب آپ اس امید کو ختم مت کریں۔'' منزہ نے لجاجت سے کہا تھا مگر وہ لجاجت بھی اس خود غرضی کو نہیں چھپا سکی تھی جو ان کے لہجے میں تھی۔

''میں نے عکس کا رشتہ ختم کر کے شیر دل سے اس کی بات طے کی ہے۔ آپ کو اندازہ ہے اس بات کا۔'' خیر دین خفا نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن تلخی اور خفگی پھر بھی اس کی آواز میں عود کر آئی تھی۔

''مجھے اندازہ ہے اور بہت شرمندگی ہے لیکن میں پھر اس فیملی سے بات کرلیتی ہوں ابھی زیادہ دن تو نہیں ہوئے...... بات ختم ہوئے...... عکس اتنی اچھی لڑکی ہے وہ لوگ بہت خوش ہو کر دوبارہ......'' خیر دین نے منزہ کی بات کاٹ دی۔

''مجھے اس معاملے میں آپ کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ شیر دل کیا چاہتا ہے؟''

''وہ بہت الجھا ہوا اور پریشان ہے، نہ آپ کو انکار کر سکتا ہے اور شہر بانو سے مصالحت بھی چاہتا ہے۔'' منزہ نے بلا توقف فرانے سے جھوٹ بولا۔

''میں شیر دل سے خود بات کروں گا۔ جو وہ چاہے گا وہ ہو جائے گا۔'' خیر دین نے کہا اور اس کی بات پر منزہ کو گھبراہٹ ہوئی۔

''بھائی صاحب شیر دل سے اس معاملے میں کوئی بات نہ کریں، آپ جو فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کریں ہمیں خوشی سے قبول ہوگا لیکن آپ بس شیر دل سے کچھ بھی ڈسکس نہ کریں...... وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ میں نہیں چاہتی اس کی اور ہماری ٹینشن بڑھے۔'' خیر دین نے ہاں یا نہ میں کچھ نہیں کہا۔ منزہ اس کے بعد وہاں زیادہ دیر تک رکی نہیں تھیں۔

ہر ایک اپنی، اپنی فیملی اور اولاد بچانے کی کوشش میں آخری حد تک جا رہا تھا۔ منزہ بھی چلی گئی تھیں۔ ایک جھوٹ سے اگر شہر بانو اور مثال واپس آجاتے اور عکس ان کی زندگی سے نکل جاتی تو یہ مہنگا سودا نہیں تھا۔ وہ آج یہاں ایک بار پھر سب کچھ داؤ پر لگا کر آئی تھیں اور ان کے جانے کے بعد خیر دین گم سم سا بیٹھا رہا تھا۔ منزہ اس سے عظمت اور اعلیٰ ظرفی کا مینارہ بننے کا مطالبہ کر کے گئی تھیں اور وہ، وہ نہیں بن سکتا تھا۔ ہم ساری زندگی بے غرضی اور اعلیٰ ظرفی نہیں دکھا سکتے۔ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ہم کمزور ضرور پڑتے ہیں۔ خیر دین بھی اس دن منزہ کے جانے کے بعد ترازو میں سب کچھ رکھ کر پڑ گیا تھا۔ یہ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں تھا اس کی چڑیا کی زندگی تھی۔ وہ بار بار اس سے اس کی پسندیدہ چیز چھین کر کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ اس وقت سونے کے لیے بیڈروم ... میں آیا تھا اور اس نے چند لمحے پہلے ہی اپنا سیل فون سائڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ سیل فون رکھتے ہوئے اس پر شہر بانو کا نام چمکا تھا، divorce ہو جانے کے بعد بھی وہ نام اور نمبر اس کے سیل فون میں محفوظ تھا بالکل اسی طرح جس طرح وہ اب بھی اس کی زندگی اور ذہن پر نقش تھی۔ اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھ کر جیسے ایک بار پھر

یقین دہانی کی تھی کہ وہ اسی کا نام تھا اور پھر وہ الجھا تھا...... کال لے نہ لے...... اور پھر اسے مثال کا خیال آیا تھا اور اس نے ایک میکانکی انداز میں برق رفتاری سے کال ریسیو کی تھی۔

''ہیلو!'' اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف بہت دیر خاموشی رہی۔ شیر دل کو لگا جیسے لائن ڈس کنیکٹ ہوگئی اس نے دوبارہ ہیلو کہا اور اس بار اس نے دوسری طرف شہر بانو کی آواز سنی تھی۔

''ہیلو......'' اس ہیلو کے بعد اگلے چند سیکنڈز دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

''مثال کیسی ہے؟'' خاموشی بالآخر شیر دل نے توڑی تھی اور شہر بانو کو توقع تھی کہ وہ اس کا حال نہیں پوچھے گا۔

''وہ ٹھیک ہے۔'' اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے شیر دل سے کہا۔ ''تم کیسے ہو؟'' اسے سوال پوچھنے کے انداز ہوا اس نے غلط سوال کیا تھا۔

''اس سے میری بات کراؤ۔'' شیر دل نے اس غلط سوال کا جواب دینے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

''اسکول میں ہے وہ اس وقت...... لیکن میں تمہاری بات کراؤں گی۔'' شہر بانو نے اس سے کہا تھا۔

''کب......؟'' شیر دل نے بے تابی سے پوچھا۔

''جب وہ اسکول سے واپس آئے گی لیکن تب تک تم سو چکے ہو گے...... میں ویک اینڈ پر کروا دوں گی۔'' شہر بانو کو خیال آیا کہ پاکستان میں کچھ گھنٹوں کے بعد رات کا پچھلا پہر شروع ہو جاتا۔

''میں جاگ لوں گا، میں ویسے بھی جاگتا رہتا ہوں اس وقت۔'' شیر دل نے فوری طور پر کہا۔ شہر بانو چپ سی ہوگئی تھی

''ممی نے بتایا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اب کیسے ہو تم؟'' شیر دل کو فوری طور پر سمجھ نہیں آیا کہ وہ کس ممی کی بات کر رہی تھی...... یقیناً منزہ کی ورنہ شرمین کو اس کی طبیعت کی خرابی کا پتا کیسے چل سکتا تھا۔ وہ منزہ سے بھی بات کر چکی تھی۔ شیر دل کو اچنبھا ہوا۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا اس کال کی وجہ کیا تھی، وہ بیٹھے بٹھائے یوں اسے اور منزہ کو کال کیوں کر رہی تھی۔ مثال سے بات کرانے پر تیار کیوں ہوگئی تھی۔

''کیا ممی نے تمہیں کال کی تھی؟'' شیر دل کو ایک دفعہ خدشہ ہوا۔

''نہیں، انہوں نے نہیں کی تھی میں نے انہیں کی تھی۔'' شہر بانو نے اسی مدھم آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' شیر دل کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس سے معذرت کرنا چاہتی تھی...... اب وقت گزر گیا تھا۔ شرمندگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی...... اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا وہ واپس آنا چاہتی تھی...... وہ سمجھ نہیں سکا تھا...... اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ عکس کو کیوں اپنی زندگی میں لا رہا تھا...... اور ایسے سوالوں کا حق نہیں رہا تھا...... گفتگو پھر ہوتی کس موضوع پر ہوتی...... شہر بانو نے یک دم بڑے بوجھل دل کے ساتھ فون رکھ دیا۔ شیر دل بہت دیر تک فون پکڑے اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ ایک فون کال سے اس کے سارے زخم ادھیڑ گئی تھی۔ وہ اگلے کئی گھنٹے اسی طرح فون ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا...... ایک بار پھر ان چند تکلیف دہ ہفتوں کو دوبارہ زندہ کرتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ گھر ٹوٹنے کے بعد وہ دوبارہ کبھی مثال کو نہیں دیکھ سکے گا اور اگر کبھی دیکھ پایا بھی تو تب تک وہ اس کا چہرہ تک بھول چکی ہو گی...... اور اب...... امکان کی کھڑکی ایسے کھلی تھی کہ اسے اندر آنے والی روشنی کو روشنی سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔

ٹھیک ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اس کے فون پر ایک بار پھر شہر بانو کا نمبر چمکا تھا، اس بار فون اٹھانے پر کان میں پڑنے والی آواز نے کرو وہ جیسے لمحوں بعد موم کی طرح پگھلا تھا۔ مثال نے ہیلو کہنے کے بعد باپ کی آواز سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے پاس کھڑی شہر بانو ہل کر رہ گئی تھی۔ درد اور تکلیف کا اس سے مکمل تر اظہار ایک بچہ اور کیا کرتا۔ دوسری طرف اس کی آواز سنتا شیر دل بھی رو پڑا تھا۔ وہ اس کی اولاد تھی اور وہ اس سے اتنی دور تھی کہ وہ اسے سینے سے لپٹا کر اس کے آنسو تک نہیں پونچھ سکتا تھا، پونچھ سکتا تو اسے کبھی اس طرح رونے نہ دیتا...... شہر بانو نے اس کے اور اس کی اولاد کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ اپنی بیٹی کو یوں بلکتے دیکھ کر شیر دل کے اندر شہر بانو کے لیے خفگی اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی جذباتیت اور بے وقوفی نے اس کا ہنستا بستا گھر لمحوں میں تباہ کر دیا تھا۔

''Papa I want to come back'' مثال روتے ہوئے شیر دل سے بار بار کہہ رہی تھی

اور شہر بانو نے عجیب رنج کے عالم میں اسے دیکھا۔ بچے خوش قسمت ہوتے ہیں ان میں کوئی انا نہیں ہوتی...... وہ کبھی کچھ بھی کہتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی بات سے ان کی عزت میں کمی آئے گی وہ بھی یہی جملہ شیر دل سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ واپس آنا چاہتی تھی لیکن وہ نہیں کہہ سکتی تھی کبھی کبھار بڑا ہونا آپ کا سب سے بڑا عیب بن جاتا ہے۔

اس رات مثال کو بہ مشکل سلانے کے بعد شہر بانو پہلی کئی راتوں کی طرح جاگتی اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ شاید پہلی بار اس نے اس mess کا حقیقت پسندی اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا تھا جو اس نے اپنے شیر دل اور مثال کے لیے پیدا کر لیا تھا۔ تھوڑی سی برداشت، تھوڑی سی اعلیٰ ظرفی، تھوڑا سا حوصلہ...... کچھ زیادہ تو نہیں چاہیے تھا اسے اس سارے مسئلے سے نمٹنے کے لیے جو رائی کا ایک ٹیلا تھا پر وہ اسے اپنے لیے ماؤنٹ ایورسٹ بنا بیٹھی تھی۔

''شہر بانو، مثال کو لے کر آ رہی ہے 27 کو۔'' شیر دل نے اگلی صبح ناشتے کی میز پر بختیار اور منزہ کو بتایا۔ وہ آج خلافِ معمول ناشتے کی میز پر موجود تھا ورنہ وہ ہر روز بہت دیر سے سو کر اٹھتا تھا۔ منزہ کو حیرت نہیں ہوئی لیکن بختیار آملیٹ کو کاٹنے اور چھری سے کانٹے کا ٹتے چونک گئے تھے۔

''شہر بانو نے تمہیں فون کیا ہے؟'' انہوں نے تعجب سے شیر دل سے پوچھا۔ شیر دل نے سر ہلا دیا اور منزہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ممی کو بھی کیا تھا but I am surprised ممی نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا۔'' اس نے جیسے کچھ کھوجنے اور کریدنے والی نظروں سے منزہ کو دیکھا تھا۔

''میں نے صرف اس لیے نہیں بتایا کہ وہ خود تمہیں فون کرے اور بات کرے تو بہتر ہے، میں تم سے کوئی بات کرتی تو تمہیں غصہ آتا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں بھی فون کرے گی اس لیے میں انتظار میں تھی کہ وہ فون کر لے اور تم خود ہی بات کر لو تو بہتر ہے۔'' منزہ نے اطمینان سے کہتے ہوئے شیر دل کو غور سے دیکھا، اس کی آنکھیں رات بھر جاگنے کی وجہ سے بے حد سرخ ہو رہی تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر وہ اضطراب اور تھکن نہیں تھی جو اتنے مہینوں سے وہ ہر روز دیکھنے کی عادی تھیں۔ عجیب سا سکون اترا تھا منزہ کے دل میں...... چیزیں بالآخر ٹھیک ہونے لگی تھیں۔

''بیٹھے بٹھائے اسے فون کرنے کا خیال کیسے آ گیا؟ اور اب یہ سب کچھ کرنے کے بعد؟'' بختیار کے ماتھے پر بل تھے۔ ''کیا داؤد سے شادی ہو گئی اس کی؟''

''میں نے پوچھا نہیں۔'' شیر دل نے بختیار کے سوال کا جواب دیا۔

''نہیں ہوئی۔'' منزہ نے شیر دل کے مزید کچھ کہنے سے پہلے کہا۔ شیر دل اور بختیار نے چونک کر منزہ کو دیکھا تھا۔ ''اور میں تو خوش ہوں کہ نہیں ہوئی...... اب اگر وہ مثال کو لے کر واپس آ رہی ہے تو یقیناً مصالحت کا بھی کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ بہت شرمندہ تھی وہ اور اس نے اس کا اظہار بھی کیا تھا...... ہونا بھی چاہیے تھا اسے شرمندہ۔'' منزہ چائے پیتے پیتے کہتی گئی تھیں لیکن شیر دل صرف ایک لفظ مصالحت پر اٹک گیا تھا۔

''کیسی مصالحت......؟'' اس نے منزہ کی بات ختم ہونے کے بعد اس سے بے حد خشک لہجے میں کہا۔ منزہ ایک لمحے کے

لیے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئیں۔ شہر بانو نے کیا شیر دل سے مصالحت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ انہوں نے بے حد الجھ کر سوچا۔

میز پر چند لمحے خاموشی رہی پھر منزہ نے بے حد سنبھل کر اس سے کہا۔

''اب وہ واپس آ رہی ہے تو ہو سکتا ہے تمہارا اور اس کا patch up ہو جائے بلکہ میں چاہتی ہوں ایسا ہو ہی جائے تم لوگوں کے ساتھ ساتھ مثال کی زندگی پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔''

''آپ نے اسے میری اور عکس کی شادی کے بارے میں بتایا؟'' شیر دل نے ان کی بات کے جواب میں ان سے پوچھا تھا۔

''نہیں، میں نے نہیں بتایا...... لیکن مجھے لگا اس کی ضرورت نہیں تھی اگر تمہاری اور شہر بانو کی مصالحت ہو جائے تو......'' شیر دل نے ماں کی بات بے حد درشتگی سے کاٹی۔

''میری اور شہر بانو کی divorce ہو چکی ہے اور میری اور عکس کی شادی بھی طے ہو چکی ہے۔ آپ کون سی مصالحت کی بات کر رہی ہیں؟'' منزہ نے بختیار کو دیکھا ان کے ماتھے پر بھی ویسے ہی بل تھے جیسے شیر دل کے ماتھے پر تھے۔

''شہر بانو تو بہت شرمندہ ہے، اس نے مجھ سے معافی مانگی ہے۔ وہ سب کچھ بھول کر واپس آنا چاہتی ہے۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے...... تم بھی جانتے ہو، تم دونوں اگر چاہو تو صرف نکاح کر کے دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکتے ہو۔'' منزہ نے بالآخر ہمت کر کے وہ بات کہہ دی جو وہ کہنا چاہتی تھیں۔ شیر دل ساکت بیٹھا ماں کو دیکھتا رہا...... بے حس و حرکت پلکیں جھپکائے بغیر اس کے دماغ نے جیسے کچھ دیر کے لیے کام ہی کرنا چھوڑ دیا تھا۔

''اور میں ایسا نہیں چاہتا، آپ کو لگتا ہے کہ میں ایک ایسی عورت کو دوبارہ اپنے گھر میں لا کر آباد کروں گا جس نے گھر چھوڑتے ہوئے پورے شہر میں میرے اشتہار لگا کر مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' اس نے بے حد تلخی سے ماں سے کہا تھا۔

''وہ بہت شرمندہ ہے بیٹا۔'' اس نے ماں کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

''اس کو میری اور عکس کی شادی کے بارے میں پتا چل گیا ہو گا اور اس نے سوچا ہو گا یہ بہت پرفیکٹ موقع ہے ایک بار پھر مجھے ایموشنلی بلیک میل کرنے کا...... اولاد کا ہتھیار استعمال کر کے۔''

''تم غلط سمجھ رہے ہو شیر دل اسے تو......'' منزہ نے شہر بانو کی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ شیر دل نے خفگی سے ایک بار پھر اُن کی بات کاٹی۔

''ممی میں عکس کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں آپ لوگ اس کی فیملی کے ساتھ تاریخ طے کر کے آئے ہیں اور میں اپنے وعدے کو dishonour کبھی نہیں کر سکتا۔'' اس نے دو ٹوک انداز میں ماں سے کہا۔

''تم مثال کا سوچو......'' شیر دل نے ایک بار پھر بہت تند لہجے میں ماں کی بات کاٹی۔

''ممی وہ میری اولاد ہے اور آپ اسے اولاد رہنے دیں، مجھے بلیک میل کرنے کا ہتھیار مت بنائیں، شہر بانو اور میری شادی ختم ہو چکی ہے وہ چیپٹر اب دوبارہ کبھی نہیں کھل سکتا۔'' وہ کہتا ہوا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

''آپ ہی کچھ سمجھائے اسے۔'' منزہ نے اس کے جانے کے بعد قدرے بے بسی سے بختیار سے کہا۔

''سمجھانے کی ضرورت اسے نہیں تمہیں ہے...... تم نے اور تمہاری فیملی کی عورتوں نے شادی کو کیا سمجھ رکھا ہے مذاق......؟'' بختیار نے بہت سخت الفاظ میں انہیں سرزنش کی تھی۔ ''چھ ماہ جس طرح پوری فیملی شہر بانو کے پیچھے خوار ہوتی رہی ہے وہ تمہیں یاد نہیں ہے؟ اور اب اگر وہ دوبارہ اپنا گھر بنانے کی کوشش کر رہا ہے تو تمہیں ایک بار پھر اپنی بھتیجی یاد آ گئی ہے اور تم نے یہ سوچا ہے کہ ہم لوگ عکس کی فیملی سے کیا کہیں گے؟ کیا apology (معذرت) دے کر رشتہ ختم کریں گے؟'' بختیار شیر دل ہی کی طرح برہم تھے۔

''میں عکس کے نانا سے پہلے ہی بات کر آئی ہوں۔'' منزہ نے یک دم کہا۔ ''شاید وہ خود ہی رشتہ ختم کر دیں...... مجھے لگتا ہے۔'' بختیار نے بے یقینی سے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھا۔ وہ منزہ بختیار کا چہرہ نہیں تھا...... وہ خود غرضی اور طبقاتی تقسیم کو پتھر کی لکیر ماننے والے ایک موقع پرست کا چہرہ تھا۔

☆☆☆

''نانا آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟'' عکس نے خیر دین سے پوچھا۔

''نہیں۔'' خیر دین نے نظریں ملائے بغیر انکار کیا۔

''شیر دل یہاں آتا ہے آپ مجھے نہیں بتاتے، اس کی ممی آتی ہیں آپ مجھے نہیں بتاتے...... میں شیر دل سے پوچھتی ہوں وہ کچھ نہیں بتاتا...... ان بے مقصد ملاقاتوں کی کوئی وجہ نہیں ہے؟'' عکس کو خیر دین کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسے پچھلے دو تین دنوں میں وہاں آنے والے لوگوں کی تفصیلات آج ملی تھیں اور وہ حیرت زدہ تھی۔

''شادی کے ہزار انتظامات ہوتے ہیں اب اگر ان کے لیے وہ لوگ یہاں آ جا رہے ہیں تو اس میں ایسی کیا بات ہے۔'' خیر دین نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''لیکن آپ پریشان کیوں لگ رہے ہیں پچھلے چند دن سے؟'' عکس نے کریدا۔

''تمہارا وہم ہے۔''

''میں آپ کا چہرہ پڑھ سکتی ہوں۔'' وہ نہیں مانی تھی۔

''تمہاری شادی کا سوچ کر اداس ہوں۔'' خیر دین نے کہا اس نے یقین نہ آنے والے انداز میں خیر دین کو دیکھا۔

''میں شادی کے بعد بھی آپ کو اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔ میں شیر دل سے یہ بات کر چکی ہوں۔'' عکس نے کہا۔

''نہیں چڑیا میں اب......'' عکس نے خیر دین کو بات مکمل کرنے نہیں دی اس نے بہت مستحکم آواز میں خیر دین سے کہا۔

''نانا مجھ سے وہ روایتی باتیں مت کیجیے گا کہ بیٹیوں کے گھر رہنا مناسب نہیں۔ وغیرہ وغیرہ...... نہ میں روایتی ہوں نہ میں ایسی روایات پر یقین رکھتی ہوں جو انسانیت اور اخلاقی قدروں کے بجائے تعصبات پر بنائی گئی ہوں۔ میں اس عمر میں آپ کو تنہائی کے کسی عذاب کو اکیلا جھیلنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتی خاص طور پر اس صورت میں جب آپ بیمار بھی ہیں اور شیر دل روایتی مرد نہیں ہے، اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے آپ کے ہمارے ساتھ رہنے پر...... ہوگا بھی تو میں دور کر سکتی ہوں۔'' عکس نے دوٹوک انداز میں خیر دین سے کہا اور خیر دین چاہتے ہوئے بھی اس سے بحث نہیں کر پایا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑے گی وہ لاکھ کوشش کرتا تب بھی نہیں۔

☆☆☆

لاہور کے علامہ اقبال انٹرنیشنل ائرپورٹ کے arrival launge سے باہر نکلنے سے بھی پہلے مثال نے شیر دل کو دور سے دیکھ لیا تھا...... ہمیشہ کی طرح اس نے شہر بانو سے اپنا ہاتھ چھڑانے اور باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اگر کوئی شیر دل کو پہلی نظر میں نہیں پہچان سکا تھا تو وہ شہر بانو تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی رنگت زرد، آنکھوں کے گرد حلقے اور سر میں جا بجا سفید بال تھے۔ وہ بازو مثال کے استقبال کے لیے پھیلائے گھٹنوں کے بل عجیب بے اختیاری کے عالم میں لاؤنج کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ مثال لپکتی ہوئی اس کی گود میں سما گئی تھی۔ شیر دل زندگی میں پہلی بار آتے جاتے لوگوں کے ہجوم میں اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ مثال کو اپنے بازوؤں میں بھینچے وہ رو پڑا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ہر روز فون پر مثال سے بات کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اسے اپنے سامنے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ شہر بانو اپنا بیگ سنبھالے ہوئے باہر اس کے نزدیک آ گئی تھی۔ شیر دل نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا، وہ مثال کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے اسی طرح اٹھ کر کھڑا ہو گیا نہ اس نے شہر بانو سے علیک سلیک کی، نہ اس کا حال پوچھا، نہ اس کا سامان پکڑا۔ مثال کو اٹھائے وہ پلٹ گیا تھا۔ شہر بانو بھیجے ڈھیلوں کی طرح اس کے پیچھے چلنے لگی تھی...... ایک وقت وہ تھا جب وہ اس کے پیچھے پیچھے آتا تھا اور وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تنفر سے چلتی رہتی تھی اور ایک وقت یہ تھا جب وہ یہ دیکھنے کی زحمت تک نہیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ تھی یا نہیں۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر ڈرائیور نے اس سے سامان لے لیا تھا۔ شیر دل ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ پیچھے نہیں بیٹھا تھا۔ وہ مثال کو لیے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ پورا راستہ صرف مثال بولتی رہی تھی۔ اتنے مہینوں میں شہر بانو نے اسے پہلی بار اس طرح خوش ہو کر باتیں کرتے دیکھا تھا...... بالکل اسی طرح جیسے وہ ہمیشہ کرتی تھی۔ پچھتاوا کچھ اور گہرا ہوا تھا۔

گھر پہنچنے پر منزہ نے اس کا استقبال کیا تھا۔ گرم جوشی دکھانے کی شدید کوشش کے باوجود شہر بانو کو ان کے انداز میں ٹھنڈک نظر آئی تھی۔ وہ گھر کچھ عرصے پہلے اس کی سسرال تھا، وہ وہاں ملکیت کے احساس کے ساتھ آتی تھی آج وہ وہاں صرف

ایک مہمان کے طور پر آئی تھی...... ایک ہفتے کے لیے۔

عکس، شیر دل کی زندگی میں آ چکی تھی اس کا اندازہ اسے گاڑی میں ہی ہو گیا تھا جب اس نے عکس کی کال ریسیو کی اور اسے فلائٹ کے آنے اور گھر کی طرف روانگی کے بارے میں بتاتے ہوئے اس سے کچھ اور باتیں کی تھیں۔ ایک وقت جب وہ سوچتی تھی شیر دل کی زندگی میں کوئی اور عورت آ گئی تو وہ جیسے مر ہی جائے گی، وہ سانس بھی نہیں لے سکے گی شیر دل کا نام کسی اور عورت کے نام کے ساتھ دیکھ کر...... اور اب...... وہ زندہ بیٹھی ان دونوں کی چند منٹ کی وہ گفتگو سن رہی تھی اور بھی رہی تھی اور سانس بھی پا لیتی رہی تھی...... آسمان بھی نہیں ٹوٹا تھا...... زمین بھی نہیں پھٹی تھی...... شہر بانو، شیر دل سے وہ ایک بار پھر شہر بانو شہباز ہو چکی تھی اور وہ نام کسی اور کے نام کے ساتھ لگ چکا تھا۔

اسے اس بار گیسٹ روم میں رکھا گیا تھا اور ایک گیسٹ والے پروٹوکول اور فارملیٹی کے ساتھ...... شیر دل کو پوسٹنگ نہیں ملی تھی وہ یقیناً اس کی وجہ سے وہاں مقیم تھا ورنہ یقیناً عکس کے ساتھ ہی رہ رہا تھا...... وہ ایک ہفتہ وہاں رہی تھی اس ایک ہفتے میں مثال اس کے پاس دن رات کے کسی وقت نہیں آئی تھی، وہ شیر دل کے پاس ہی سوتی جاگتی رہی تھی۔ شیر دل کے ساتھ ہی سارا سارا دن گھومتی پھرتی رہتی۔ شہر بانو کا ہونا یا نہ ہونا جیسے فیملی کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کے بھی میٹر نہیں کرنے لگا تھا خود شیر دل سے اس کا آمنا سامنا کھانے کی میز پر بھی نہیں ہوتا تھا، وہ جان بوجھ کر اس کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا اور اس سمیت گھر کے باقی لوگ بھی...... نند اور دیور سے بھی صرف ایک بار اس کی ملاقات ہوئی جب وہ کسی فنکشن میں شرکت کے لیے لاہور آئے تھے اور تب اسے احساس ہوا اس فیملی فنکشن میں عکس بھی لاہور آ کر شریک ہوئی تھی لیکن وہ اس گھر میں نہیں آئی تھی...... یقیناً اس کی وجہ سے...... وہ ایک اضافی اور غیر ضروری چیز بن گئی تھی اس فیملی کی زندگی میں...... جہاں اس سے مشورہ کیے بغیر کچھ نہیں ہوتا تھا...... ان سب کی زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ اس کا اپنا فیصلہ تھا اس کے باوجود شہر بانو کو وہ سب دیکھتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی۔

منزہ اور اس کے درمیان ایک ہفتے کے قیام کے دوران کسی قسم کا کوئی ڈسکشن نہیں ہوا اور یقیناً منزہ کو اس کے لیے خاص طور پر ہدایات دی گئی تھیں ورنہ وہ کچھ نہ کچھ کہنے سے باز رہنے والی نہیں تھیں۔

اپنی زندگی کا ایک اور مشکل ہفتہ وہاں گزار کر وہ روتی دھوتی مثال کو لے کر واپس امریکا آ گئی تھی اور واپس آنے کے بعد ایک بار پھر سے مثال اسی رویے کا مظاہرہ کرنے لگی تھی جو وہ یہاں آنے کے بعد کرتی تھی، شیر دل سے فون پر ہر روز بات کرنے نے بھی اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی...... وہ شہر بانو کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ شہر بانو سے بے حد ناخوش تھی...... وہ ''پاپا'' کے پاس رہنا چاہتی تھی۔ ممی کے پاس نہیں اور اسے ممی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس کی ناخوشی اور عدم دلچسپی میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا تھا جب اس کی ''ممی'' نے داؤد کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا اور انہیں نانو کا گھر چھوڑ کر ایک نئے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ وہ عکس سے نہیں ملی تھی نہ ہی شیر دل نے اس سے ''نئی ممی'' اور اپنی شادی کا ذکر کیا تھا اس لیے سالہ اس بچی کی نظروں میں باپ اچھا تھا صرف ماں بری تھی جو اسے ہر اس جگہ اور شخص سے توڑنے اور الگ کرنے کا باعث بنی تھی جس سے وہ پیار کرتی تھی۔

داؤد کے ساتھ شادی ایک مشکل فیصلہ تھا خاص طور پر اب جب شہر بانو کو اپنی بہت سی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا لیکن اب اس کے پاس چوائس نہیں رہی تھی۔ شیر دل نئی زندگی کا آغاز کر چکا تھا اور وہ کسی کہانی کی ہیروئن ہوتی تو اکیلے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتی لیکن وہ حقیقی زندگی میں شرمین کے گھر پر اکیلے نہیں رہ سکتی تھی خاص طور پر شادی کے لیے شرمین کے دباؤ کی وجہ سے بھی۔

اس کی زندگی داؤد سے شادی کے بعد بھی سنبھل نہیں سکی تھی بس اس کی زندگی اور ذات میں ایک اور خانے کا اضافہ کیا تھا جس میں وہ ایک بیوی تھی کچھ ذمے داریوں کا بھی اضافہ ہو گیا تھا اور بس...... اور کچھ نہیں ہوا تھا۔ نہ داؤد، شیر دل جیسا ساتھی تھا، نہ اسے داؤد سے محبت ہو سکتی تھی اور نہ داؤد شیر دل کی جگہ لے پایا تھا۔ وہ شہر بانو سے صرف شادی کے لیے ایک تھا، شادی ہو جانے اور اسے اپنے گھر لے آنے کے بعد وہ یک دم ہی اس کے لیے ایک بہت ثانوی سی چیز بن گئی تھی۔ یہ داؤد بھی نہیں تھا جسے وہ اتنے سالوں سے جانتی تھی، اس داؤد اور اس داؤد کی زندگی، ترجیحات اور دلچسپیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اس رشتے میں زمین شہر بانو تھی۔

''تم کوئی جاب کیوں نہیں کرتیں...... اتنی اچھی ڈگری ہے تمہارے پاس اور یہاں تو اس ڈگری کی بہت ویلیو ہے۔'' داؤد نے شادی کے چند ہفتے بعد ہی اس سے ایک رات کہا تھا۔ وہ ابھی ہنی مون سے واپس آئے تھے اور شہر بانو، مثال کو شرمین کے گھر سے اپنے گھر لے کر آئی تھی۔

''جاب؟'' شہر بانو نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔ ان کی اتنے مہینوں کے میل ملاپ میں کبھی جاب کا تذکرہ نہیں ہوا تھا نہ داؤد نے کیا تھا نہ ہی اس نے کیا تھا۔

''ہاں۔'' داؤد نے کہا۔

''میں نے تو انٹرن شپ کے بعد کبھی جاب کی ہی نہیں۔''

''ہاں لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ تم شادی کر کے پاکستان چلی گئی تھیں اگر امریکا میں رہ رہی ہوتیں تو یقیناً کرتیں۔'' داؤد نے اس کا جملہ اچکا۔

''گھر اور جاب دونوں کو اکٹھے چلانا بہت مشکل ہے۔'' اس نے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔

''اسی (80) فیصد عورتیں جو یہاں رہتی ہیں وہ یہ مشکل کام بڑی آسانی اور مہارت سے کرتی ہیں تم کرنا شروع کرو گی تو تمہیں بھی آسان لگنے لگے گا۔'' داؤد اپنی بات پر جما ہوا تھا۔ ''ویسے بھی یہاں صرف ایک پارٹنر کے کام کرنے سے گزارہ نہیں ہوتا۔ میں نے نیا نیا گھر mortgage کیا ہے اس کی بہت heavy installments دے رہا ہوں ابھی نئی گاڑی لی ہے اس کا بھی قرض ہے میرے سر پر...... صرف میرے کام کرنے سے یہ گھر نہیں چل سکے گا۔'' وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی بات سنتی رہی۔ وہ نپے تلے لفظوں میں اسے کیا بات صاف صاف بتا رہا تھا وہ سمجھ سکتی تھی...... کہ اسے بھی اس کے ساتھ کام کر کے گھر میں contribute کرنا پڑے گا ورنہ وہ اس کے اور اس کی بیٹی کے اخراجات نہیں اٹھائے گا۔ وہ امریکا تھا اور وہاں داؤد کا وہ مطالبہ غلط نہیں تھا مگر وہ کچھ دیر کے لیے سکتے میں ضرور آ گئی تھی۔ سالوں گھر بیٹھے رہنے کے بعد اگر یک دم کوئی نوکری تلاش کرنے کے لیے کہتا تو کوئی بھی اس کی طرح پریشان ہوتا بعد میں اس نے سوچا اسے کام کرنا ہی چاہیے۔ شیر دل، مثال کے اخراجات کے لیے اسے رقم دے رہا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی اب شادی کر لینے کے بعد کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ اسے کچھ دیتا یا نہیں، اس وقت اس کا ذہن شیر دل کو اچھی طرح جاننے کے باوجود اس کی جانب سے شکوک و شبہات کا شکار تھا۔

داؤد اور مثال کے درمیان بھی اس طرح کا کوئی رشتہ نہیں بن سکا تھا جس خواہش اور امید میں شہر بانو نے داؤد کے ساتھ شادی کی تھی۔ داؤد کے پاس بیوی کی سابقہ شوہر سے ہونے والی اولاد کے ساتھ وقت گزارنے یا اس کے ساتھ اچھے تعلقات بنانے کی کوشش سے زیادہ دلچسپ اور اہم کام تھے۔ مثال اس کے نزدیک ایک unfriendly چائلڈ تھی جس کو بگاڑنے کا سارا کریڈٹ وہ شہر بانو کے ناز و نعم کو دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا اسے مثال کے پیچھے ہر وقت بھاگتے رہنے کے بجائے اسے وہ سب کرنے کی آزادی دے دینی چاہیے تھی جو وہ کرنا چاہتی تھی...... شہر بانو، مثال کے حوالے سے اس کے مشوروں اور رائے پر کان بھی نہیں دھرتی تھی۔ وہ اس کی اولاد نہیں تھی اور وہ نہ اولاد کی اہمیت کو سمجھتا تھا، نہ ہی اپنی اولاد پیدا کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اور یہ ایک اور مسئلہ تھا جو شہر بانو کو اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ داؤد کو زارا کے ساتھ بھی یہی مسائل تھے جب وہ اولاد چاہتی تھی اس وقت داؤد کو اس میں دلچسپی نہیں تھی اور جب داؤد کو اس کا خیال آیا، اس وقت زارا کو اپنے کیریئر کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور زارا کے ساتھ ہونے والے بریک اپ کے بعد داؤد کو اب اگر کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنی ذات، اپنی خوشی، اپنی خواہشات تھیں۔ شادی سے پہلے وہ جس طرح شہر بانو کو شادی پر آمادہ کرنے کے لیے اس کے آگے پیچھے پھرتا، اس کی ناز برداریاں کرتا پھرتا، شادی کے بعد سب سے پہلے غائب ہونے والی چیز وہ ناز برداریاں ہی تھیں۔ وہ اب جیسے ایک بار پھر سے اپنی زندگی جینے لگا تھا جو میں، مجھے، میرا سے شروع ہو کر وہیں ختم ہوتی تھی۔ زندگی میں آنے والا وہ دوسرا مرد کسی بھی طرح سے شہر بانو کے لیے دلاسے کا باعث نہیں بنا تھا...... صرف اس کے پچھتاوے میں اضافے کا باعث بن گیا تھا پہلے پچھتاوا شیر دل کو چھوڑنے کا تھا...... اب پچھتاوا اتنی جلد بازی میں داؤد کو اپنی زندگی میں شامل کر لینے کا بھی تھا۔

☆☆☆

''تم ایسا نہیں کرو گے شیر دل۔'' عکس نے دوٹوک انداز میں اسے جیسے خبردار کیا تھا۔ ان کی شادی کو ابھی کچھ گزرے تھے اور شہر بانو، مثال کو لے کر پاکستان آئی تھی اور اس کے آنے کے فوراً بعد شیر دل نے مثال کی کسٹڈی کے حوالے سے کورٹ میں کیس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں اسے دوبارہ شہر بانو کے ساتھ واپس بھیجنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بختیار اور منزہ سے بھی یہ معاملہ ڈسکس کر لیا تھا اور ان دونوں کی بھی رائے یہی تھی کہ انہیں مثال کو شہر بانو سے لے لینا چاہیے یہ کام اس لیے بھی ضروری تھا کہ شہر بانو واپس جا کر داؤد سے شادی کرنے والی تھی اور مثال جس طرح شیر دل سے اٹیچڈ تھی، شیر دل کو بالکل نہیں لگتا تھا کہ اسے اس کی پرورش کرنے میں کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ لیکن عکس کے ساتھ یہ مسئلہ ڈسکس کرتے ہی وہ بھتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ ''تم اب ایک ماں سے اس کی بچی چھینو گے...... وہ تم پر اعتبار کرتے ہوئے اسے یہاں لے کر آئی ہے۔'' اس نے شیر دل کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''اس نے بھی تو مجھ سے میری بیٹی کو چھینا تھا۔ میں نے بھی تو اس پر اعتبار کرتے ہوئے اسے marriage nuptials (ازدواجی بندھن کے ناتے) میں جوائنٹ کسٹڈی دی تھی لیکن اس نے اسی ایک اجازت کو میرے خلاف استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنی ہی بیٹی کی شکل دیکھنے کے لیے ترسا دیا تھا۔'' شیر دل کے انداز میں بے حد سرد مہری تھی۔

''اس نے غلط کیا اور اب تم اس کی غلطی کو اپنی ایک بڑی غلطی سے بدلنا چاہتے ہو۔'' عکس نے کہا۔

''I dont care''

''You have to...... یہ ایک چھ سالہ بچی کی زندگی کا سوال ہے، تم دونوں اپنی جنگیں اس پر لڑنا بند کر دو۔ تمہیں کیا لگتا ہے تم اسے شہر بانو سے لے لو گے تو وہ آرام سے چلی جائے گی؟ وہ ایک کے بعد دوسری اپیل کرے گی اور وہ بھی امریکن ایمبیسی کی سپورٹ کے ساتھ...... تم چاہتے ہو جیسا سین پہلے ہوا ہے ویسا ہی دوبارہ ہو...... مزید شرمندگی اور ذلت اٹھاؤ تم۔'' وہ اسے اس کے فیصلے کے مضمرات بتا رہی تھی۔

''تب میں دھوکے میں مارا گیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے کی وجہ سے...... لیکن اب وہ لے آئے جس کو اپنی سپورٹ کے لیے لانا چاہتی ہے، میں دیکھوں گا وہ میری بیٹی کو پاکستان سے باہر کیسے لے کر جاتی ہے۔'' عکس اس کی دیکھ کر رہ گئی تھی۔ شیر دل کو اس نے کبھی اس طرح کی scheming کرتے نہیں دیکھا تھا نہ وہ اسے کبھی بے وقوفانہ حد تک انا پرست لگا تھا لیکن اس وقت وہ اسے صرف ایک مرد لگ رہا تھا جس کے لیے سب سے اہم بات صرف اس pride بحال کرنا تھا جو اس سے اس کی بیوی چھین کر لے گئی تھی۔

''تم نے سوچا ہے مثال کیسی زندگی گزارے گی۔ اس طرح کی قانونی جنگ کا اس پر کیا اثر ہو گا؟'' شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''وہ میرے اور تمہارے ساتھ ایڈجسٹ کر لے گی...... وہ بہت خوش رہے گی یہاں۔''

''تم اس equation میں سے مجھے اور میرے گھر کو نکال دو...... میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھوں گی۔'' عکس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ شیر دل کو جیسے یقین نہیں آیا۔

''تم میری اولاد کو نہیں پالو گی؟'' اس نے جیسے عکس کو جتانے والے انداز میں کہا۔

''میں تمہاری صرف وہ اولاد پالوں گی جو میں پیدا کروں گی میں کسی دوسری عورت کی اولاد چھین کر اس کی ماں بننے کا خواہش مند نہیں ہوں اور تمہیں اگر یہ کام کروانا ہے تو پھر تمہیں ایک تیسری شادی کرنی پڑے گی۔ I would not support you۔'' عکس نے بہت صاف لفظوں میں اسے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

''میں تم سے ایسی بات کی توقع نہیں کر سکتا۔'' شیر دل کو یقیناً شاک لگا تھا۔

''میں بھی تم سے اس طرح کے غلط کام کی توقع نہیں کر سکتی جو تم کرنے جا رہے ہو۔ تم نے شادی کر لی ہے لیکن تم شہر بانو کو punish کرنا چاہ رہے ہو کہ وہ شادی کر کے اپنی زندگی میں سیٹل ہونے کے بجائے یہاں کورٹس میں خوار ہوتی پھرے۔ تم ایسا کیسے کر سکتے ہو شیر دل...... تم مرد ہو، تعلیم یافتہ ہو...... ایک باشعور انسان سے ایک جاہل اجڈ جانور کیوں بننا چاہتے ہو اس عورت کے ساتھ تم نے اتنے اچھے سال گزارے ہیں اور کچھ نہیں تو تمہیں انہی سالوں کی پروا کرنی چاہیے۔ لحاظ کرنا چاہیے اس ایک رشتے کا جو کبھی تمہارے اور اس کے درمیان تھا۔'' وہ اس کی باتوں سے سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھتا جا رہا

تھا وہ اسے ملامت کر رہی تھی، شرم دلا رہی تھی، عقل دے رہی تھی اور شیر دل کو انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔

''وہ مجھے مثال سے دوبارہ ملنے نہیں دے گی اگر اس بار وہ اسے لے گئی تو......'' اس نے بالآخر جیسے ایک توجیہہ دینے کی کوشش کی تھی اپنے ان اقدامات کے لیے۔

''یہ تمہاری assumption ہے اور ایک وہم کی بنیاد پر تم اپنی بچی اور سابقہ بیوی کو کورٹس کے دھکے نہیں کھلوا سکتے۔ تم تو کورٹس میں جاتے ہو وہاں کا سسٹم اور حال دیکھا ہے تم نے...... تم شہر بانو کو وہاں کے چکر لگوانا چاہتے ہو؟'' وہ اب کچھ نہیں بول سکا تھا۔

''جب وہ نہیں ملنے دے گی تو دیکھا جائے گا ابھی تو وہ اچھے طریقے سے اسے یہیں لائی ہے، یہاں رہ رہی ہے اگر اس نے تم سے مثال کو دور رکھنا ہوتا تو وہ اب بھی اسے یہاں نہ لے کر آتی۔'' عکس نے کہا۔

''وہ یہاں اس لیے آئی ہے تاکہ اگر میرے ساتھ patch up ہو سکتا ہے تو کر لے...... اسے پتا نہیں تھا کہ میں نے تم سے شادی کر لی ہے اگر اسے امریکا میں یہ پتا چل جاتا تو وہ کبھی مثال کو یہاں لے کر نہیں آتی...... میں نے صرف ایسی کسی صورت حال سے نبٹنے کے لیے تم سے ایمرجنسی میں نکاح اور رخصتی کی۔'' عکس حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی اسے شیر دل کی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

''patch up کیا مطلب...... ؟ تم دونوں کی divorce ہو چکی ہے پھر patch up کیسے ہو سکتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''طلاق کا حق تفویض کیا تھا میں نے اسے اور وہ ایک طلاق کے ساتھ علیحدگی کی شرط کے ساتھ تھا۔ ہم دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر کے رہ سکتے ہیں۔'' اس نے ممی سے بات کی تھی اس بارے میں اور ممی نے مجھے پریشرائز کیا تھا تمہارے نانا سے بھی بات کی تھی، عکس کا دماغ جیسے گھوم کر رہ گیا تھا۔

''انہوں نے مجھے ایسا کچھ نہیں بتایا۔'' عکس نے کہا۔

''ہاں لیکن انہوں نے مجھے بلوا کر بات کی تھی۔'' وہ خاموش اسے دیکھتی رہی وہ اس شادی کے حوالے سے جو خدشات لے کر چلی تھی وہ غلط نہیں تھے...... اور وہ سارے مسائل اب آہستہ آہستہ اس کے سامنے آنے لگے تھے۔

شہر بانو کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ پاکستان میں اس کے ایک ہفتے کے قیام کے دوران وہ عکس کی وجہ سے مصیبتوں کے کس پہاڑ سے بچی تھی۔ وہ ایک بلا تھی جو عکس نے اس دن شیر دل کو مجبور کر کے شہر بانو کے سر پر آنے سے ٹالی تھی۔

شیر دل مثال کے پاکستان سے چلے جانے کے کئی دن بعد تک بہت اپ سیٹ رہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ نارمل ہونے لگا تھا۔ مثال امریکا جانے کے بعد بھی اس سے رابطے میں تھی اور اس کے ذہنی سکون کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اس کی پوسٹنگ انہی دنوں NWFP ہو گئی تھی اور وہ جو پہلے عکس کے ساتھ لاہور یا کراچی میں ایک ہی شہر میں پوسٹنگ کروانے کا خواہش مند تھا اسے ایمرجنسی میں وہاں جانا پڑا تھا۔ عکس نے بھی اس کی پوسٹنگ والی جگہ پر اپنی پوسٹنگ کروانے کے لیے کوششیں ترک کر دی تھیں کیونکہ شیر دل NWFP میں جہاں پوسٹڈ تھا وہ فیملی کے لیے کچھ زیادہ محفوظ علاقہ نہیں تھا اور نہ ہی وہاں اچھی میڈیکل سہولیات تھیں عکس ان دنوں امید سے تھی اور وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

''آپ نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا؟'' شہر بانو اور شیر دل کی مصالحت کے حوالے سے ہونے والے انکشاف کے بعد عکس نے خیر دین سے بات کی تھی اور اس سے شکایتاً کہا تھا۔

''اگر تمہیں بتا دیتا تو تم شیر دل کو چھوڑ دیتیں۔'' خیر دین نے کہا اور ٹھیک کہا تھا اگر اسے یہ پتا چلتا کہ شہر بانو نے شیر دل کے درمیان اب بھی مصالحت کی کوئی گنجائش تھی تو وہ ان دونوں کے درمیان سے ہٹ جانے میں ایک لمحے کا بھی تامل نہ کرتی بلکہ شاید وہ خود شیر دل کو اس مصالحت پر مجبور بھی کرتی۔

''اور اگر ایسا ہو جاتا تو ہم سب کے لیے ٹھیک ہوتا...... میرے لیے...... شیر دل کے لیے...... شہر بانو اور مثال کے لیے......'' اس نے خیر دین سے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''آپ نے بہت خود غرضی دکھائی نانا...... اور زندگی میں پہلی بار خود غرضی دکھائی۔'' اس نے مدھم آواز میں خیر دین کو جتایا تھا۔

’’تم ٹھیک کہتی ہو لیکن بڑھاپا اور اولاد انسان کو مجبور کر دیتے ہیں...... میں کتنی بار تمہیں تکلیف میں پڑتے دیکھا...... سے رشتہ ختم نہ ہو چکا ہوتا تو اور بات تھی لیکن رشتہ ختم ہونے کے بعد...... اور وہ بھی میری جلد بازی کی وجہ سے...... میں نے ٹھیک سمجھا کہ تمہاری شادی شیر دل کے ساتھ ہو جانی چاہیے۔‘‘ خیر دین کی آواز میں ندامت تھی۔ وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح کسی بڑے کے سامنے خود سے ہونے والی کسی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔

’’جو بھی تھا یہ ٹھیک نہیں تھا نانا...... میں آپ کو اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔‘‘ اس نے کچھ ناپسندیدگی سے کہا۔

’’جب تمہاری اپنی اولاد ہو جائے گی تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ اولاد انسان کو کس طرح کمزور کرتی ہے۔ اس کے اصول اور اخلاقیات کو کس طرح بدل کر رکھ دیتی ہے۔‘‘ خیر دین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا وہ کچھ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بے اختیار ہنس پڑی۔ اسے خیر دین سے ایسی مثال کی توقع نہیں تھی۔

☆☆☆

شیر دل کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز ایک آسان آغاز نہیں تھا...... یہ وہ شیر دل نہیں تھا جسے عکس اتنے سالوں سے جانتی تھی۔ وہ خوش مزاج، تحمل مزاج شخص اب بہت چھوٹی سی بات پر غصے میں آ جاتا تھا...... فطرتاً اچھا ہونے کے باوجود شہر بانو اور مثال سے علیحدگی نے اس کے مزاج کو بہت بری طرح بدلا تھا۔ وہ پہلے کی نسبت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اگر بات نہ کرتا تو کئی کئی دن بات نہیں کرتا تھا...... فون نہیں کرتا تھا...... اور اگر فون کرنے پر آتا تو دن میں کئی کئی بار اسے فون کرتا...... وہ متلون مزاج ہو گیا تھا اور وہ پہلے ایسا نہیں تھا عکس کو اس کے mood swing بری طرح پریشان کرتے تھے لیکن اس کے باوجود شیر دل کے ساتھ شروع کے چھ ماہ اس نے بڑے تحمل کے ساتھ گزارے تھے پھر آہستہ آہستہ بچے کی آمد کا وقت نزدیک آتا گیا تھا اور شیر دل کا مزاج بدلتا گیا۔ وہ پرانا شیر دل لوٹنے لگا تھا اس کی توجہ، محبت اور خیال بڑھ گیا تھا، اس کی متلون مزاجی میں کچھ کمی آنے لگی تھی۔ شاید اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ عکس کے ساتھ اتنا اچھا شوہر بن کر نہیں رہا تھا جتنا وہ شہر بانو کے ساتھ ہمیشہ رہا تھا۔

☆☆☆

شہر بانو کو طغرل کی پیدائش کا پتا مثال سے چلا تھا۔ وہ اپنی چھٹیوں میں پاکستان شیر دل سے ملنے گئی تھی اور اس بار شہر بانو نے اسے اکیلے بھجوا دیا تھا۔ وہ اپنی جاب کی وجہ سے چھٹی نہیں لے سکتی تھی اور نہ ہی اب وہ ایک بار پھر شیر دل کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ جب زندگی بدل نہیں سکتی تھی تو پھر حقیقت سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے فرار بہتر تھا وہ بھی اب یہی کرنا چاہتی تھی، نو سے پانچ بجے کی ایک تھکا دینے والی نوکری، ایک شوہر جو اسے بیوی سے زیادہ ایک ہاؤس کیپر سمجھتا تھا اور ایک بیٹی جو اس کے کسی فیور، کسی خدمت سے خوش نہیں ہوتی تھی...... شہر بانو کے پاس اس ’’baggage‘‘ کے ساتھ زندگی ویسے ہی ایک ہی دائرے میں گھومنے لگی تھی جس میں وہ کولہو کے بیل کی طرح کچھ سوچے سمجھے بغیر چکر کاٹتی جا رہی تھی۔ شیر دل کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی، اس کی محبت، وہ ناز برداریاں وہ آرام و آسائش خواب ہو چکے تھے۔ جو اب باقی تھا وہ ایک مشکل زندگی تھی جس میں obligations تھیں options نہیں تھے اور اس ٹھہرے ہوئے پانی میں مثال نے جیسے ایک تلاطم پیدا کر دیا تھا۔

وہ پاکستان جانے کے پانچویں دن اس سے فون پر بات کر رہی تھی جب مثال نے اسے بے حد ایکسائٹڈ انداز میں ایک چھوٹا اور پیارا سا بھائی آنے کی اطلاع دی تھی۔ شہر بانو بل بھی نہیں سکی تھی، یہ غیر متوقع نہیں ہونا چاہیے تھا اس کے لیے...... پھر بھی غیر متوقع تھا...... تکلیف نہیں ہونی چاہیے تھی اسے پھر بھی ہوئی تھی، سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ وہ مثال سے کیا کہتی یا کسی سے بھی کیا کہتی...... مثال دوسری طرف سے بڑے پرجوش انداز میں اسے بھائی کے حلیے کی تفصیلات دے رہی تھی۔ اس نے عجیب کم ہمتی کے عالم میں فون رکھ دیا تھا۔ تھکن اتنی تھی کہ اسے لگا وہ اب کبھی اٹھ نہیں سکتی۔ ایک بیٹا اس کی اور شیر دل کی خواہش تھی۔ وہ پلان کر رہے تھے اگر یہ سب ان کی زندگی میں نہ ہوتا تو شاید اس سال وہ بیٹا اس کا بیٹا ہوتا۔ وقت اس سے سب کچھ چھین کر لے گیا تھا اور جو چھین کر لے گیا تھا وہ دوسروں کو دے رہا تھا۔ واؤ دکے ساتھ اس کی شادی کو بھی ایک سال ہونے والا تھا لیکن وہ اولاد نہیں چاہتا تھا اور کم از کم چند سال تو اس کے لاکھ سر پٹخنے کے باوجود وہ اس ایک بات پر اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

’’تمہاری اولاد ہے...... بیٹی ہے پھر تمہیں کیا ٹینشن ہے اگر کوئی ٹینشن ہونی چاہیے تو وہ مجھے ہونی چاہیے۔‘‘ اس کے پاس ہر وقت اس ایشو پر بحث کے دوران ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

وہ چھوٹے دل کی اور کم ظرف نہیں تھی لیکن بس وہ ایک چیز کے معاملے میں اپنا دل بڑا کر کے شیر دل یا عکس کو مبارک باد بھی نہیں دے سکی تھی نہ خود نہ ہی مثال کے ذریعے...... اس نے اس خبر کے ملنے کے بعد اگلے کئی دن مثال سے بھی بات نہیں کی تھی وہ اس سے اس بچے کے بارے میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی تھی...... اور مثال نے جیسے اس کی کال کے آنے نہ آنے کو محسوس تک نہیں کیا تھا...... وہ بھی طغرل کے ساتھ اس طرح مصروف تھی کہ اسے کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ جتنی اٹیچڈ وہ اس بچے کے ساتھ ہو گئی تھی اتنی ہی اٹیچڈ وہ عکس سے بھی ہو رہی تھی...... وہ ڈھٹائی جو وہ شہر بانو کو دکھاتی تھی وہ عکس کے سامنے ایک بار بھی نہیں جھلکی تھی۔ وہ ایک ماہ شیر دل اور عکس کے پاس رہی تھی اور شیر دل واپس پشاور جاتے ہوئے اس کی ضد پر اسے عکس اور طغرل کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا اور اس ایک ماہ میں وہ طغرل سے زیادہ عکس کی پرچھائیں بن کر رہی تھی، وہ relationship جو اس نے بھی شہر بانو کے ساتھ جانے کے بعد بداعتمادی میں کھویا تھا وہ اس نے ایک اور جگہ دریافت کیا تھا۔ مثال کے اپنے ساتھ بہت اٹیچ ہونے کے باوجود شیر دل کو ان مسائل کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ تھا جو مثال کے رونے اور عادتوں میں تھے اور پشاور جانے کے بعد بھی وہ اس حوالے سے بار بار اسے اور عکس کو فون کرتا تھا لیکن اسے حیرت ہوئی تھی جو ضد اور بدتمیزی وہ اسے دکھاتی تھی عکس نے اس کی شکایت نہیں کی تھی۔ اسے لگا تھا شاید وہ لحاظ میں اس کی شکایت سے اجتناب کر رہی تھی مگر چند دن بعد دوبارہ عکس کے پاس اس کے گھر آنے پر اس نے مثال کو ویسا ہی فرمانبردار اور باتمیز پایا تھا جیسا عکس اسے فون پر بتاتی تھی۔ وہ شیر دل کے آنے پر اس سے ضد کرنے لگی تھی لیکن عکس کے ایک بار منع کرنے پر وہ فوراً مان جاتی تھی اور اس اطاعت میں خوف اور سختی کا کوئی element نہیں تھا۔ وہ طغرل پر جان چھڑکتی تھی مگر وہ عکس کی توجہ پانے کے لیے ہر وقت اس کے اردگرد ہی منڈلاتی رہتی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب وہ دونوں ملی تھیں یا انہوں نے بات کی تھی اور وہ عجیب طرح سے ایک دوسرے سے connect ہوئی تھیں۔

ایک مہینہ گزر جانے کے بعد مثال بہت مشکل سے واپس امریکا جانے پر تیار ہوئی تھی۔ شہر بانو کے پاس واپس جانا جیسے اس کی زندگی کا ایک بھیانک خواب تھا جسے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ شہر بانو کے پاس وہی مثال واپس پہنچی تھی جو وہاں سے گئی تھی۔ خاموش، بدتمیز، خفا، irritated اور کنفیوژڈ جو عکس اور شیر دل کے پاس 24 گھنٹے چہکتی رہتی تھی اس کے پاس شہر بانو سے کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کی آواز میں وہ کھنک اور خوشی تک نہیں تھی جو شہر بانو اس سے پاکستان میں بات کرتے ہوئے محسوس کرتی تھی ہاں البتہ اس کی کبھی کبھار کی جانے والی باتوں میں دو نام آ گئے تھے۔ طغرل اور عکس آنٹی، اسے پہلے نام نے نہیں توڑا تھا۔ دوسرے نام نے کسی شیشے کی طرح کاٹا تھا، مثال جتنی بار طغرل کا ذکر کرتی تھی عکس کا بھی ذکر کرتی تھی اور بعض دفعہ شہر بانو کو لگتا طغرل کا ذکر تو بہانہ ہوتا تھا عکس کا ذکر خصوصاً...... اس عورت میں کوئی witch کی...... کوالٹی تھی جو وہ سب کو اپنی مٹھی میں کر لیتی تھی لوگ جس کے پاس بھی ہوتے ان کا دل و دماغ عکس مراد علی کے قبضے میں رہتا۔ اس نے شیر دل کے ساتھ یہی کیا تھا اور اب وہ مثال کے ساتھ بھی یہی کر رہی تھی۔ کیوں؟ وہ اب کیا چاہتی تھی؟ اس کی بیٹی؟ شہر بانو بے وجہ خفا ہوئی، بے وجہ خوف زدہ ہوئی۔

’’ممی، عکس آنٹی نے کہا ہے جب میں next ٹائم ان کے پاس جاؤں گی تو وہ طغرل کے ساتھ ساتھ میرا بھی ایک بہت اچھا سا روم بنا دیں گی پھر میں اپنے روم میں رہوں گی۔‘‘ وہ اس دن اسے صبح اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی تھی جب مثال کو یک دم پتا نہیں کیا یاد آیا تھا، اس نے بڑے ایکسائٹڈ انداز میں ماں سے کہا۔

’’وہ بھی تمہارے لیے کچھ نہیں بنائیں گے، اب ان کے پاس اپنا baby ہے تمہارے پاپا اور طغرل کی ممی کو تم میں دلچسپی نہیں ہے، ان کے لیے اپنا baby کافی ہے۔ وہ تم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔‘‘ اس نے مثال کا سفید پڑتا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا وہ بس غصے کے عالم میں اس کے اس محل کو اپنے پیروں تلے روندتی چلی گئی تھی جو اس بچی نے بنایا تھا۔ وہ ان پڑھ، جاہل عورتوں کی طرح یہ باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کو صحت مندانہ سوچ اور رویہ ہی دینا چاہتی تھی مگر حسد اور غصے نے کچھ دیر کے لیے جیسے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ اس کے پاس صرف مثال رہ گئی اور وہ کم از کم اس کی محبت عکس کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی تھی۔ وہ پورا دن مثال گم صم رہی تھی۔ رات کو اس نے شیر دل سے Skype پر بات کرنے کی ضد کی۔

وہ اسے laptop دے کر خود چلی گئی تھی۔ وہ دو گھنٹے کے بعد کچن کا کام نمٹا کر اس کے کمرے میں آئی تھی۔ مثال بستر laptop کے پاس ہی سو چکی تھی۔ اس نے laptop میں skype کی ونڈو آف کرنا چاہی اور رک گئی، شیر دل کی ڈی میں طغرل کی تصویر تھی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے میں شیر دل کی واضح شباہت تھی۔ سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھوں اور معصوم مسکراہٹ والا ایک گول مٹول چہرہ...... وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے لیے غصہ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ laptop بند کر کے کمرے سے چلی گئی۔

''عکس آنٹی نے کہا ہے طوغی کے آنے سے میری importance میں کوئی کمی نہیں آئی، پاپا نے بھی یہی کہا ہے'' اگلی صبح وہ اسے اسکول چھوڑنے جارہی تھی جب مثال نے یک دم اس سے کہا تھا۔ وہ بری طرح چونکی۔

''عکس سے بات کب ہوئی تمہاری؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا تھا۔

''پاپا نے رات کو skype پر بات کروائی ہے۔ میں نے طوغی کو بھی دیکھا۔'' مثال نے بے حد خوشی سے اسے بتایا۔ شہر بانو کا پارہ یک دم چڑھ گیا تھا۔

''تم نے اگر دوبارہ طغرل کی ممی سے بات کی تو میں تمہیں دوبارہ کبھی تمہارے پاپا سے بات نہیں کرنے دوں گی۔'' اس نے بلا جھجک اسے دھمکایا تھا۔

''لیکن کیوں، عکس آنٹی بہت اچھی ہیں...... I really like her۔''

''Stop it...... تمہیں ضرورت نہیں ہے مجھے بتانے کی کہ تمہیں کون پسند ہے اور کون نہیں، میں نے تمہیں کہہ دیا عکس سے بات نہیں کرو گی تو تم نہیں کرو گی۔'' اس نے بری طرح اسے جھڑکا تھا۔ مثال کچھ دیر الجھی نظروں سے ماں کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ ایک دم کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ شہر بانو کچھ دیر خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی پھر اس نے جیسے کچھ بے چین ہو کر مثال کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی جسے اس نے جھٹک دیا۔

''وہ تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ تمہیں پیار کر رہی ہے۔ وہ تمہیں genuinely (خلوص) میری طرح پیار نہیں کرتی۔'' شہر بانو نے عجیب بے چینی سے اس سے کہا۔ مثال نے اس پر ایک اور الجھی نگاہ ڈالی اور کہا۔

''ممی میں پاپا اور عکس آنٹی کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، میں طوغی کو miss کرتی ہوں۔'' اس نے اتنے کھلے ڈلے الفاظ میں اس سے کہا تھا کہ چند لمحوں کے لیے شہر بانو کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

''میں تمہیں کبھی وہاں نہیں بھیج سکتی، تم میری اکلوتی بیٹی ہو تم مجھے چھوڑ کر اس کے پاس کیسے رہ سکتی ہو۔ you loved them more then me? (تم انہیں مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہو؟)۔ بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''yes۔'' ایک لفظی جواب نے اس کی ہمت ختم کر دی تھی۔

وہ باقی کا سارا راستہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی تھی۔ مثال بے حد سرد مہری اور بے نیازی کے عالم میں پورا راستہ گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

بعض دفعہ اولاد انسان کے لیے نعمت سے زیادہ ایک نارچہ بن جاتی ہے۔ تو دے نارچہ...... وہ آپ کو کچھ کہیں تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے، آپ ان کو کچھ کہیں تو بھی آپ ہی کو تکلیف ہوتی ہے...... اور وجہ صرف یہ ہے کہ آپ نے انہیں پیدا کیا ہے انہوں نے آپ کو نہیں...... وہ آپ کو چھوڑ سکتے ہیں آپ ان کو نہیں۔

مثال کے ساتھ ہونے والے یہ بار بار کے arguments (مکالمے) جیسے شہر بانو کے دل میں ایک اور اولاد کی خواہش شدت سے پیدا کر رہے تھے وہ ایک سیکنڈ چانس لینا چاہتی تھی شاید ایک اور تجربہ جو اس کے اور داؤد کے کھوکھلے رشتے کی بنیاد بدل دے اور اگر نہیں بھی ہوتا تو وہ بچہ مثال اور اس کے درمیان communication (تعلق) کے کم کرتے ہوئے پل کو تو سہارا دے سکتا تھا۔ اس نے مثال کی طغرل کے لیے دیوانہ وار محبت دیکھی تھی اور اسے یوں لگتا تھا کہ وہ یہ محبت اس کے اور داؤد کے بچے کے ساتھ بھی کر سکتی تھی۔

اگلا سال اس کی زندگی کا ایک اور مشکل سال تھا۔ داؤد، شرمین اور فاروق کے مجبور کرنے پر اس فیملی کا آغاز کرنے پر تیار ہو گیا تھا لیکن ان دونوں کے باہمی تعلقات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے تھے اور تعلقات کی یہ خرابی اس وقت اور

بڑھ گئی جب داؤد کو اچانک اسی کمپنی سے Lay off (نوکری سے نکالنا) کر دیا گیا جہاں وہ کئی سالوں سے کام کر رہا تھا۔ شہر بانو پہلے جاب سے اپنے اخراجات پورے کرتی تھی اور گھر میں تھوڑا بہت کنٹری بیوشن کرتی تھی اب یک دم گھر کے سارے اخراجات اس کے سر آگئے تھے۔ گھر mortgage ہونے کی وجہ سے ان دونوں پر شدید فنانشل پریشر تھا۔ ایک اور بچہ ان حالات میں پیدا کرنا اس گلے میں پھندا ڈالنے کے برابر تھا جس میں پہلے ہی بہت سے پھندے پڑے ہوئے تھے۔ ان حالات میں مثال کے لیے ہر ماہ شیر دل کی طرف سے بھیجی جانے والی رقم ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ وہ رقم جو پہلے کچھ معنی نہیں رکھتی تھی۔ اب یک دم بہت جگہوں پر کام آنے لگی تھی۔

سال ختم ہونے پر ایک بار پھر چھٹیوں میں مثال پاکستان گئی تھی، وہ اس بار بھی اکیلی تھی شہر بانو کو اس سال بقا کی ایسی جنگ لڑنی پڑی تھی کہ اس کے دل سے مثال اور عکس کے حوالے سے سارے خدشات اور وسوسے نکل گئے تھے اور وہموں اور وسوسوں کو پالنے کے لیے وقت کا ہونا ضروری تھا اور اس کے پاس... آفس، گھر اور باہر کے کاموں کے بعد صرف اتنا وقت بچتا تھا کہ وہ چند گھنٹے سو کر اگلے دن دوبارہ اسی جنگ کے لیے تیار ہوتی اور ایسے حالات میں جب اس کے پاس مثال سے بات تک کرنے کے لیے وقت نہیں تھا وہ اس کے بارے میں واہمے پالنے کیسے بیٹھ جاتی۔

مثال اس بار شیر دل اور عکس دونوں کو پچھلے دو سالوں کی نسبت کم صم اور بدلی ہوئی لگی تھی۔ وہ اب بھی طغرل کے آگے پیچھے پھرتی رہی تھی مگر انہوں نے ویسے اسے بہت خاموش اور فکر مند پایا۔ شیر دل اور عکس کے بہت زیادہ کریدنے کے باوجود بھی وہ کچھ جاننے اور سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

عکس کو مثال بہت اچھی لگتی تھی، وہ ہمیشہ اسے باربی ڈول کی یاد دلاتی تھی وہ شکل صورت میں اسی کا بچپن تھی۔ اسے لڑکیاں ہمیشہ اچھی لگتی تھیں اور اس کی وجہ اسے کبھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ طغرل کو accept کرتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں ایک بیٹی کی خواہش اپنے دل میں پالے ہوئے تھی اور وہ پوری نہیں ہوئی تھی لیکن مثال کے اپنے پاس قیام کے دوران مزید بڑھ ضرور گئی تھی۔ مثال ڈسٹربڈ تھی اس کا اندازہ اسے پہلی دفعہ بھی ہو چکا تھا لیکن اس کو ہینڈل کرنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا، وہ اس کی بات سنتی بھی تھی اور مانتی بھی تھی کسی اور کی بات سنتی نہ سنتی اور وہ اس کی توجہ کی بھی خواہش مند رہتی تھی۔ عکس کی ستائش جیسے اس کے لیے ایک certification تھی وہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی عکس سے رابطے میں رہی تھی۔ ہر دفعہ شیر دل کے اس کے گھر پر ہوتے ہوئے وہ عکس کی بھی بات اس سے ضرور کرواتا تھا۔

''آنٹی کیا آپ ممی کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتیں؟'' اس نے ایک دن لان میں طغرل کے ساتھ کھیلتے کھیلتے اچانک عکس سے کہا تھا، وہ حیران ہوئی تھی اس غیر متوقع اور عجیب و غریب فرمائش کو سن کر سوال کا جواب کمال مشکل تھا۔

''تمہاری ممی آ کر رہنا چاہیں تو most wel come لیکن مجھے نہیں لگتا وہ یہاں آ کر رہنا چاہیں گی وہ امریکا میں جاب کرتی ہیں، وہاں ان کا اپنا گھر ہے، ان کے husband ہیں...... وہ کیوں یہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آنا چاہیں گی؟'' اس نے بڑی نرمی سے مثال کو آسان لفظوں میں جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

''وہ آ بھی سکتی ہیں۔'' مثال نے جیسے کسی گہری سوچ میں الجھتے ہوئے اس سے کہا، عکس کو اب بھی اس کی بات کی سمجھ میں نہیں آئی۔

''ان کے لیے یہاں آنا مشکل ہے، میں نے تمہیں بتایا نا کہ وہ اپنے گھر اور شوہر کو چھوڑ کر کہیں اور تو نہیں جا سکتیں۔ وہ وہاں بہت خوش ہیں۔''

''No she is not'' اس نے مثال کو کہتے سنا عکس نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا، یہ مناسب نہیں تھا لیکن وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''وہ خوش نہیں ہیں؟''

''no'' مثال نے یک لفظی جواب دیا، وہ اب ایک بچے کی اس الجھن کا شکار ہو رہی تھی جو اسے راز رکھنے نہ رکھنے کے درمیان فیصلہ نہ کر پانے والی صورت حال میں رکھے ہوئے تھی۔ اس ایک لفظی جواب نے عکس کو مزید سوالوں پر مجبور کر دیا تھا۔

''کیوں خوش نہیں ہیں؟'' مثال اس کے سوال کے جواب میں کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے جیسے کچھ پریشان سے انداز میں مدھم آواز میں کہا۔

”because he hit him“ (کیونکہ وہ انہیں مارتے ہیں) مدھم آواز میں کہے ہوئے اس جملے نے عکس کو کچھ دیر کے لیے فریز کر دیا تھا۔ ”only sometimes......I mean not always“ مثال نے یک دم خود ہی جیسے کچھ تصحیح کی یوں جیسے اپنی ندامت میں وہ معاملے کی سنگینی کو کم کرنا چاہتی ہو۔

بعض انکشاف انسان کی سمجھ میں نہیں آتے عکس کو بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اس راز کو جاننے کے بعد کیا کرے...... مثال کو مزید کریدے یا اس کی طرح خاموش ہو جائے یا داؤد کو ملامت کرے یا شہر بانو سے ہمدردی...... مثال سر جھکائے اسکریبل کے پیسز جوڑنے میں مصروف تھی یوں جیسے وہ اس راز کو اس کے ساتھ شیئر کر لینے کے بعد اب نادم تھی۔ عکس شاک کے عالم میں اس کے پاس بیٹھی رہی...... اتنے عرصے میں اسے یہ اندازہ تھا کہ مثال اور شہر بانو کے درمیان بہت مسئلے ہیں مگر شہر بانو اور داؤد کے درمیان بھی سب کچھ ٹھیک نہیں تھا یہ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ یہ بات شیر دل سے شیئر کرے یا نہ کرے...... اور وہ مثال کے پورے قیام کے دوران اس ایک الجھن کا شکار رہی تھی۔

”شرمین آنٹی کو یہ سب پتا ہے؟“ اس نے اس دن مثال کے انکشافات کے بعد مثال سے پوچھا تھا۔

”I dont know“ جواب پھر مختصر تھا۔ عکس نے جیسے کوئی راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی جو ناکام ہوئی تھی۔

مثال کے واپس جانے کے بعد بھی عکس اس انکشاف کو اپنے ذہن سے نہیں نکال سکی اور اس نے بالآخر شیر دل سے جب ویک اینڈ پر یہ بات شیئر کی تو وہ بھی کچھ دیر کے لیے اسی کی طرح ہکا بکا رہ گیا تھا۔

”تمہیں مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا۔“ اس نے کہا تھا اور وہ اب بے حد متفکر نظر آنے لگا تھا۔

”میں بتانا چاہتی تھی لیکن ڈبل مائنڈڈ ہو گئی تھی۔“

”داؤد ایسا آدمی تو نہیں ہے کہ مار پیٹ کرے۔“ شیر دل بہت الجھ گیا تھا، وہ داؤد کو بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اس سے بہت بار مل بھی چکا تھا۔

”لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو رہا ہے ان کے گھر میں جو مثال کو ڈسٹرب کر رہا ہے۔“ عکس نے کہا تھا۔

”اگر وہاں یہ سب ہو رہا ہے تو پھر مثال کو وہاں نہیں ہونا چاہیے، میں اپنی بیٹی کو وہاں سے لے آؤں گا۔“ شیر دل کو بات کرنے کے بعد احساس ہوا، وہ اسے بہت عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا؟“

”تم صرف مثال کے بارے میں فکر مند ہو، شہر بانو کے بارے میں نہیں......؟“ وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کچھ دیر کے لیے بے حد خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر شیر دل نے اس سے نظریں ہٹا لیں۔

”نہیں۔“ اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا شیر دل۔“ عکس نے جیسے اسے ملامت کرنے والے انداز میں کہا۔

”مجھے کیوں پروا ہونی چاہیے؟ میرا اور اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ شیر دل نے کچھ اکھڑے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

”وہ تمہاری بیوی رہ چکی ہے۔ تمہاری بیٹی کی ماں ہے، کبھی تم اس سے بہت محبت کرتے تھے۔“ عکس نے جیسے اسے یاد دلایا۔

”تو......؟“ اس نے بات کاٹتے ہوئے اسی انداز میں اس سے پوچھا۔

”تو تمہیں اس کی پروا ہونی چاہیے۔ بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت...... کم از کم اتنی جتنی ایک انسان کو کسی دوسرے انسان کے لیے ہوتی ہے۔“ شیر دل کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”میرے پروا کرنے سے کیا ہوگا، میں کچھ نہیں کر سکتا اس کے لیے...... داؤد اس کا اپنا انتخاب تھا، اب اگر وہ انتخاب اس کے لیے ٹھیک نہیں نکلا تو میں کیا کر سکتا ہوں...... افسوس کرنے کے علاوہ......“ وہ کہتا ہوا اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا...... عکس وہیں بیٹھی رہی۔ شیر دل نے جو بھی کہا تھا بالکل ٹھیک کہا تھا کوئی بھی سمجھدار آدمی یہی کہتا۔ اس کے باوجود اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہر بانو سے اس حد تک لاتعلق ہو سکتا تھا اور کیسے ہو سکتا تھا اس نے اس کا اور شہر بانو کا تعلق ان کی شادی دیکھی تھی...... وہ شہر بانو کے بارے میں شیر دل کی فیلنگز سے بھی واقف تھی۔ وہ کبھی اس کی گفتگو کے ہر دوسرے جملے میں آتی تھی اور وہ اب اس بات سے بھی بے حس تھا کہ وہ تکلیف میں تھی۔ انسان کسی کو اتنی آسانی سے بھلا سکتا ہے؟ اتنی آسانی سے اس سے بے

نیاز ہو سکتا ہے...... وہ کتابوں میں محبت کے بارے میں لکھی باتوں پر یقین نہیں کرتی تھی لیکن محبت پر کرتی تھی اور اس کا یہ یقین اس شام بری طرح ڈگمگایا تھا۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر کا کوئی وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی چند لمحوں کے لیے اسے لگا جیسے طغرل جاگا ہوا تھا اور اس کی آنکھ طغرل کے ہلنے سے کھلی ہوگی۔ کروٹ لینے پر اسے طغرل تو اسی طرح گہری نیند میں نظر آیا لیکن شیر دل اپنے بستر پر نظر نہیں آیا تھا۔ باتھ روم کی لائٹ بھی آف تھی۔ عکس کچھ تشویش اور حیرانی سے اٹھ کر بیڈ روم سے باہر آئی تھی وہ باہر کاریڈور کی نیم تاریکی میں قد آدم کھڑکیوں کے پاس پڑی ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا...... دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے نیم تاریکی میں عکس کو دیکھنے کی کوشش کی...... عکس نے کاریڈور کی ایک فینسی لائٹ آن کر دی۔ وہ اسی طرح سگریٹ پیتا رہا، وہ آ کر اس کے برابر میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”نیند نہیں آ رہی تھی مجھے۔“ شیر دل نے سگریٹ کو منہ سے نکالتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”میں جانتی تھی آئے گی بھی نہیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔ شیر دل نے اس کا چہرہ دیکھا پھر نظر چرا لی۔

”اس سے بات کرو...... آخر وہ مصیبت میں ہے تو تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے، تم اس کے کزن بھی ہو...... خون کا رشتہ ہے تمہارا اس سے...... محبت کا رشتہ نہیں بھی نبھاتے تو......“ عکس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

”سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔“ شہر بانو نے کچھ دیر کے لیے ماں کو دیکھتے رہنے کے بعد نظریں ہٹائی تھیں۔ شرمین کا وہ سوال اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا لیکن شرمین کا اس طرح ایک دوسرے شہر سے اچانک اس کے پاس آنا غیر متوقع تھا۔ داؤد اور اس کے درمیان شروع سے ہی اختلافات ابھرنا شروع ہو گئے تھے اور شرمین ان اختلافات سے واقف تھی اس لیے شہر بانو نے اس کے اس سوال کو ہمیشہ کی طرح ایک روٹین کا سوال سمجھا تھا وہ دونوں ابھی رات کے کھانے کے بعد کافی کے مگ لے کر بیٹھی تھیں جب شرمین نے یہ سوال کیا تھا۔

”داؤد تم پر ہاتھ اٹھاتا ہے کیا؟“ شرمین کے اگلے سوال نے کافی کا سپ لیتی شہر بانو کو منجمد کر دیا تھا۔ اس کا رنگ اڑا تھا اور شرمین نے بے حد تکلیف سے اپنی اولاد کے تاثرات نوٹس کیے تھے۔ ان کا دل اس کے تاثرات دیکھ کر جیسے ڈوبا تھا۔

”آپ سے کس نے کہا؟“ شہر بانو نے ہاں یا نہ کہنے کے بجائے کافی کا کپ نیچے رکھ کر کچھ اضطراب کے عالم میں شرمین سے پوچھا۔

”شیر دل نے“ شہر بانو کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ ”اس نے پرسوں فون کیا تھا مجھے...... مثال نے اسے تمہارے اور داؤد کے حوالے سے کچھ بتایا ہے وہ بہت اپ سیٹ تھا۔ میں بھی بہت اپ سیٹ ہوئی جھگڑوں کا تو میں جانتی تھی لیکن تم نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ معاملات اس حد تک بگڑ چکے ہیں۔“ شرمین بے حد اضطراب کے عالم میں کہتی رہیں اور شہر بانو اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ عجیب صدمے کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ وہ بھی شیر دل کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی داؤد کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہی تھی ویسی ہی اچھی زندگی جیسی وہ عکس کے ساتھ گزار رہا تھا لیکن اس کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوٹا تھا اور مثال وہ کیسے جانتی تھی...... وہ پل بھر میں بہت سے لوگوں کے سامنے نظریں اٹھانے اور نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

”اس نے مثال کو واپس لینے کے حوالے سے کچھ کہا ہے کیا؟“ شہر بانو نے بے حد اضطراب کے عالم میں کہا۔

”نہیں اس نے مثال کے حوالے سے کچھ نہیں کہا۔ صرف تمہارے حوالے سے بات کی۔“ شرمین نے کہا۔

”لیکن پھر کس لیے اسے آپ سے بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔“ شہر بانو بے چین تھی وہ یہ ماننے پر تیار ہی نہیں تھی کہ شیر دل اس کے اور صرف اس کے حوالے سے متفکر ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر بوکھلائی ہوئی تھی کہ وہ مثال کی کسٹڈی کے حوالے سے اب ضرور اس سے بات کرے گا۔

”اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ مجھے تمہارے بارے میں پتا ہونا چاہیے۔“ شرمین نے کہا۔ ”اگر داؤد اور تمہارے درمیان کوئی اختلافات ہیں تو مجھے ان کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ شرمین اسے بتا رہی تھی۔ ”لیکن میں اسے کیا کہتی......“

”آپ نے اسے میرے اور داؤد کے جھگڑوں کے بارے میں بتایا؟“ شہر بانو کچھ اور اپ سیٹ ہوئی تھی۔

''تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ داؤد تم پر ہاتھ اٹھاتا ہے؟'' شرمین نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''پہلے ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا...... جب سے (بے روزگار) ہوا تھا بات بات پر بہت اینگری ہو جاتا ہے......'' اس نے چندلمحوں کے بعد عجیب سی ندامت کے ساتھ شرمین کو بتایا۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں اور فاروق تو دماغ درست کر دیتے اس کا...... ایک بار پولیس کو کال کر دیتیں چار دن پولیس اسٹیشن رہ کر آتا تو دوبارہ تم پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے سو بار سوچتا۔'' شرمین بہت غضبناک ہو کر اس سے کہہ رہی تھیں وہ ٹوکے بغیر ان کی بات سنتی رہی۔

''پھر اس کے بعد کیا ہوتا ایک بار پھر بریک اپ...... ممی میں بار بار گھر توڑ اور بنا نہیں سکتی۔'' وہ بات کرتے کرتے آبدیدہ ہوگئی تھی۔

''but you don't deserve this life'' شرمین بھی رنجیدہ ہوئی تھیں۔

''پتا نہیں میں کیا deserve کرتی ہوں کیا نہیں...... لیکن بس ایک گھر بنائے رکھنا چاہتی ہوں میں اب...... کچھ عرصے میں جاب ہو جائے گی تو اس کا یہ ڈپریشن وغصہ بھی ختم ہونا شروع ہو جائیں گے۔'' وہ پتا نہیں کیا توجیہہ دے رہی تھی اور کس کو دے رہی تھی۔

''اور اگر نہ ہوئے تو؟'' شرمین نے اس سے پوچھا۔

''آپ صرف میرے لیے دعا کریں۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ماں سے کہا۔

''میں داؤد کا دماغ درست کر دوں گی۔''

''ممی آپ اس سے اس ایشو پر کوئی بات نہیں کریں گی...... میں گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتی...... آپ چلی جائیں گی لیکن مجھے تو یہیں رہنا ہے۔'' اس نے ماں کو دیکھا تھا۔

''تم ایک abusive relationship میں رہنا چاہتی ہو...... کیوں؟'' اس نے بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

''ممی میں expect کر رہی ہوں۔'' چندلمحوں تک شرمین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔

''لیکن تم نے تو فیملی اسٹارٹ کرنے کا ارادہ ابھی ترک کر دیا تھا۔'' وہ الجھی تھیں۔

''ہاں...... لیکن بعض چیزیں unexpected ہوتی ہیں۔'' اس نے مدھم آواز میں کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم abort کروا سکتی ہو اس بچے کو...... اس mess میں پڑے رہنے کے لیے یہ بچہ زنجیر نہیں ہونا چاہیے تمہارے پیروں میں۔'' شرمین نے چندلمحوں کے بعد کہا۔

''جیسے آپ نے abort کروایا تھا۔'' اس کے سوال نے شرمین کو چندلمحوں کے لیے گونگا کر دیا تھا۔ ''میں یہ نہیں کر سکتی...... میں اس بچے کو کسی چیز کی سزا نہیں دے سکتی......'' وہ رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ''آپ اس بچے کو abort نہ کرواتیں تو میرا کوئی بہن، بھائی ہوتا، کسی سے اپنی تکلیف شیئر کر سکتی میں۔''

''حماد اور اسد......''

''وہ دونوں میرے بھائی نہیں ہیں۔ وہ آپ کے اور انکل فاروق کے بیٹے ہیں لیکن میرے بھائی نہیں ہیں۔'' شہر بانو نے اسے بات کرنے سے روک دیا۔

''تم نے ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں سے الگ تھلگ رکھا، گھلنے ملنے کی کوشش کرتیں تو ان کے ساتھ بھی تمہارا کوئی ریلیشن شپ بن ہی جاتا۔'' شرمین نے اس کو blame کیا تھا اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ ذہنی طور پر کس اذیت اور خود ترسی کا شکار تھی۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں...... سارے flaws (خامیاں) مجھ میں ہی ہیں...... ساری غلطیاں صرف میری ہیں...... ساری قیمت بھی تو میں ہی ادا کر رہی ہوں اور میں ہی ادا کروں گی۔'' وہ رنجیدگی سے کہتے ہوئے کافی کا کپ وہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''تم اپنے پاپا سے میرے بارے میں بھی کبھی کوئی بات نہیں کرو گی۔'' شرمین دوسرے دن داؤد سے بات کیے بغیر چلی گئی تھیں اور ان کے جانے کے بعد شہر بانو نے مثال کو پاس بٹھا لیا تھا۔

''میں نے پاپا سے آپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی......'' مثال نے جواباً کہا۔

''stop lieing'' (جھوٹ بولنا) شہر بانو نہ چاہتے ہوئے بھی rude ہوگئی تھی۔

''I am not lieing'' مثال بھی ماں کے اس طرح بات کرنے پر irritate ہوئی تھی۔

''تم نے پاپا سے کیوں کہا کہ......'' شہر بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس جملے کو کس طرح مکمل کرے۔ مثال اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ ''میرے اور داؤد کے درمیان جو کچھ بھی ہو وہ تمہارے پاپا کا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں ان کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے، تم نے شیر دل سے کیوں کہا کہ داؤد مجھے مارتا ہے۔''

''میں نے پاپا کو نہیں بتایا عکس آنٹی کو بتایا تھا۔'' اس کے جواب نے شہر بانو کی رہی سہی عزت نفس بھی اتار کر رکھ دی تھی۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ وہ جیسے تماشا بن گئی تھی۔ ایک کے بعد ایک شکست عکس، شیر دل کے سامنے اس کی زندگی کی بساط پر موجود مہروں میں سے کوئی چال نہیں پار رہا تھا۔

''آئندہ بھی ان لوگوں سے میرے بارے میں کچھ مت کہنا...... I am warning you'' اس نے حلق کے بل چلا کر مثال سے کہا اور پھر روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ مثال سہم گئی تھی۔ ممی اب ویسے کیوں نہیں رہتی تھیں جیسے پہلے رہتی تھیں...... خوش...... مسکراتے ہوئے...... مجھ سے ڈھیروں باتیں کرنے والی...... ممی عکس آنٹی جیسی کیوں نہیں ہوسکتیں...... وہ غصہ نہیں کرتیں...... وہ shout نہیں کرتیں...... وہ تو طوطی کے ساتھ اس طرح بات نہیں کرتیں جیسے ممی میرے ساتھ...... آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ مثال نہیں جانتی تھی وہ ایک ایسا موازنہ کر رہی تھی جو اگر شہر بانو جان جاتی تو اس کی اذیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

☆☆☆

خیر دین کی موت نے کچھ مہینوں کے لیے عکس اور شیر دل کی توجہ شہر بانو سے ہٹا دی تھی۔ وہ عکس مراد علی کی زندگی کا ایک اور تکلیف دہ دور تھا۔ شیر دل جیسا ساتھی اگر اس کی زندگی میں نہ ہوتا تو اس تکلیف سے گزرنے اور سنبھلنے میں اسے بہت وقت لگ جاتا لیکن شیر دل نے اسے سنبھال لیا تھا، وہ جانتی تھی خیر دین دنیا سے بہت مطمئن اور پرسکون ہو کر گیا تھا اور اس کی ایک وجہ شیر دل اور طغرل بھی تھے اور اس دوسرے بچے کی خبر بھی جو اسے خیر دین کی اس آخری علالت سے کچھ دن پہلے ملی تھی۔

خیر دین کے انتقال کے تین ماہ بعد عکس کو ایک دن مثال سے بات کرتے ہوئے اس مسئلے کا خیال آیا تھا۔ جو مثال نے اس سے شیئر کیا تھا۔

''وہ expect کر رہی ہے اور وہ داؤد کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔'' skype پر بات ختم کرنے کے بعد اس نے شہر بانو کے متعلق شیر دل سے پوچھا تھا اور اس نے مدھم آواز میں اسے بتایا۔ وہ مزید سوال نہیں کر سکی۔ فیصلہ صحیح تھا یا غلط شہر بانو کا فیصلہ تھا اور ان حالات میں کیا گیا تھا جب اس کے پاس آپشنز نہ ہونے کے برابر تھے۔ بات وہیں ختم ہوگئی تھی اور شاید یہ موضوع دوبارہ زیر بحث نہ آتا اگر چند ماہ کے بعد انہیں شہر بانو کے miscarriage کا پتا نہ چلتا، وجوہات کیا تھیں، شرمین یا مثال شیر دل کو یہ نہیں بتا سکے تھے...... مگر وہ اور عکس دونوں ہی اس خبر کو سن کر اپ سیٹ ہوئے تھے۔ عکس شہر بانو کی تکلیف اور ذہنی کیفیت کا اندازہ شیر دل سے زیادہ اچھی طرح لگا سکتی تھی، خاص طور پر تب جب وہ خود ایسی حالت میں تھی......

وہ پہلا موقع تھا جب وہ شہر بانو کو فون کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی، تب شہر بانو کے miscarriage کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔ عکس مراد علی کے تعارف سے پہلے ہی صرف اس کی آواز سننے پر بھی وہ اسے پہچان گئی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کال اتنی ہی unexpected تھی۔

''مجھے آپ کے miscarriage کا پتا چلا...... بہت افسوس ہوا ہے۔ صرف اس لیے بات کرنا چاہتی تھی میں۔'' اس نے شہر بانو سے علیک سلیک کے بعد کہا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ شہر بانو اسی طرح چپ رہی...... عکس نے چند اور جملے بولے تھے۔ شہر بانو نے اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ وہ اگر کبھی عکس مراد علی سے بات کرے گی تو اسے

اس پر شدید غصہ آئے گا وہ اسے بہت برا بھلا کہے گی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر وقفے وقفے سے اس کے جواب کے انتظار میں بولتی رہی تھی اور شہر بانو روتی رہی تھی۔ اسے زندگی میں کم از کم اس عورت کی ہمدردی نہیں چاہیے تھی لیکن اسی عورت کی ہمدردی سے اس کے اندر کا غصہ اور خفگی آنسو بن کر بہنے لگے تھے۔

''میں نے طغرل کی تصویریں دیکھی ہیں وہ بہت خوب صورت ہے۔'' شہر بانو کو سمجھ میں نہیں آیا اس وقت طغرل کیسے یاد آ گیا تھا اور اس کا ذکر وہ بھی تب...... جب عکس اس سے کچھ اور بات کر رہی تھی۔

عکس نے اس کی آواز کی بھراہٹ محسوس کی تھی پھر اس کے لفظوں کی بے ربطی بھی...... وہ آنسو جو فون لائن کے ایک طرف تھے اب دوسری طرف بھی بہنے لگے تھے۔ اس نے شہر بانو سے مزید کچھ کہنے کی کوشش کی مگر شہر بانو نے فون بند کر دیا......

وہ عکس مراد علی کے سامنے ریت کی دیوار کی طرح ڈھے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اپنا کچھ بھرم رکھنا چاہتی تھی۔ عکس نے اس کے بعد کئی بار اسے فون کرنے کی کوشش کی تھی وہ یا تو کال ہی نہیں لیتی تھی اور اگر لیتی تو اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیتی......

پانچویں مہینے میں ہونے والے اس miscarriage نے شہر بانو کی صرف ذہنی اور جذباتی کیفیت کو متاثر نہیں کیا تھا بلکہ اس کی شادی کو بھی بری طرح ہلا دیا تھا۔ شہر بانو اس ایک حادثے سے اتنی اپ سیٹ نہیں ہوئی تھی جتنی اس پریگننسی کے دوران مس کیرج کے بعد داؤد کی سرد مہری اور بے نیازی سے...... اسے نہ اس کی پریگننسی کی ایکسائٹمنٹ تھی نہ ہی بچے کے ضائع ہونے پر کسی طرح کی کوئی پریشانی یا افسوس۔ وہ اس کے مس کیرج کے دن اسے اسپتال میں اکیلا چھوڑ کر کسی جاب انٹرویو کے لیے چلا گیا تھا۔ فنانشل کرائسز اور روپے پیسے کی تنگی انسان کو صرف توڑتی ہے لیکن اپنے خونی رشتوں اور لائف پارٹنر کی خود غرضی اور بے حسی انسان کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ شہر بانو کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

تقریباً چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ بالآخر اس شادی کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی۔ اسے تب تک یوں لگنے لگا تھا کہ وہ اگر چند ماہ اور اس شادی میں رہی تو پھر شاید وہ اس کے بعد ذہنی امراض کے کسی اسپتال میں پائی جائے گی۔

مثال ان دنوں ایک بار پھر چھٹیوں میں پاکستان تھی۔ جب شہر بانو اور داؤد کے درمیان طلاق ہوئی تھی۔ وہ اس طلاق کے بعد شرمین اور فاروق کی ہزار کوششوں کے باوجود ان کے پاس جا کر رہنے پر تیار نہیں ہوئی۔ وہ اب مثال کے ساتھ کوئی اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ جاب اس کی اچھی تھی اور وہ مثال کے ساتھ آرام سے رہ سکتی تھی۔ اسے اب شیر دل کی اس ماہانہ بھیجی جانے والی رقم کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

''آنٹی میں ممی کے پاس نہیں جانا چاہتی آپ مجھے یہیں رہنے دیں میں طوبیٰ اور باذل کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

چھٹیاں ختم ہونے کے قریب پہنچنے پر مثال نے ایک دن بہت اکتاہٹ آمیز انداز میں عکس سے کہا۔

''بیٹا تمہاری ممی کو اس وقت تمہاری بہت ضرورت ہے وہ وہاں اکیلی ہیں۔'' عکس نے اسے سمجھایا تھا وہ شہر بانو اور داؤد کی طلاق کے بارے میں جان چکی تھی۔

''ممی کو میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرے بغیر بھی بہت خوش ہیں۔ She can live without me'' وہ عکس کے سمجھانے پر جیسے بہت مایوس ہوئی تھی اور بہت دیر تک عکس سے امریکا نہ جانے کے لیے ضد کرتی رہی تھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب اس نے عکس سے کسی بات پر ضد کی تھی، عکس حیران تھی وہ کیوں شہر بانو کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں تھی۔

''وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ ممی کے پاس میرے لیے ٹائم ہی نہیں۔ میں سارا دن اکیلے رہتی ہوں، اکیلے کمپیوٹر پر گیمز کھیل کھیل کر تھک جاتی ہوں۔'' اس آٹھ سالہ بچی نے عجیب بے بسی اور بے چارگی سے عکس کے ساتھ اپنی تکلیف شیئر کی تھی وہ بہت دیر اسے بیٹھ کر سمجھاتی رہی تھی۔ مثال نے بالآخر ضد ختم کر دی تھی لیکن وہ بے حد مایوس اور دل گرفتہ گئی تھی۔

وہ پہلا موقع تھا جب اس کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد بھی عکس کئی دن اس کے بارے میں سوچتی اور پریشان ہوتی رہی۔ ہمیشہ کی اس طرح امریکا جاتے ہی اس نے Skype پر ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ کئی ہفتوں کے بعد Skype پر آئی تھی اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی عکس اور شیر دل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہے لیکن وہ

ان کے ساتھ کچھ بھی شیئر کرنے کو تیار نہیں تھی۔

وہ اس سے اگلے سال پاکستان نہیں آ سکی تھی۔ شہر بانو اس کے اور شرمین کے ساتھ چھٹیوں میں آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ شیر دل اپنی پروفیشنل مصروفیات میں اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اس کی امریکا کی جانے والی کالز میں بھی وقفہ آنے لگا تھا صرف عکس تھی جو اب بھی Skype کے ذریعے ہر دوسرے تیسرے دن طغرل اور باذل کے ساتھ مثال کی بات کروانے کی کوشش کرتی رہتی۔

☆☆☆

جاب بہتر ہو گئی تھی لیکن جاب اور جاب سے متعلقہ مصروفیات بھی بہت زیادہ ہو گئی تھیں اور شہر بانو بالآخر اس زندگی اور اس مصروفیت کی عادی ہونے لگی تھی، مصروفیت اچھی تھی کم از کم یہ اسے بار بار پچھتاوؤں کے لیے وقت اور موقع نہیں دیتی تھی۔ میکانکی زندگی تھی لیکن پھر بھی بہتر تھی۔

وہ مثال کی گیارہویں سالگرہ کے چند دن بعد کی بات تھی جب وہ آفس میں تھی اور اسے لنچ ٹائم کے قریب مثال کے اسکول سے فون آیا تھا۔ انہوں نے اسے تفصیلات نہیں بتائی تھیں لیکن اسے فوری طور پر اسکول پہنچنے کا کہا تھا۔ شہر بانو بے حد گھبراہٹ اور بدحواسی میں اسکول پہنچی تھی اور جو کچھ اسے وہاں جا کر پتا چلا تھا اسے لگا تھا جیسے آسمان اس کے سر پر گر پڑا تھا۔ مثال کا ایروبک انسٹرکٹر اس سے زیادتی کی کوشش میں کسی دوسرے ٹیچر کی نظر میں آیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ خوش قسمتی صرف یہ ہوئی تھی کہ مثال بروقت بچ گئی تھی۔

اسکول ہیڈ مسٹریس اس واقعے کی تفصیلات بتاتے ہوئے اس سے معذرت کر رہی تھی اور شہر بانو کنگ، کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، یہ کیسے ہو سکتا تھا اور پھر اس ہی کی بیٹی کے ساتھ۔ زندگی میں ابھی مصیبتیں کم تھیں۔ اس نے اپنے ٹھنڈے ہوتے ہوئے وجود کے ساتھ سوچا، پھر جیسے وہ شدید غم و غصے کا شکار ہو کر پرنسپل پر برستی رہی تھی جو اس کی باتیں سنتی ہوئی اسے وضاحتیں دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا اگر بس چلتا تو وہ اس کے انسٹرکٹر کو جا کر ابھی شوٹ کر دیتی۔ یہ کیسے ہوا کہ اس نے اس کی مثال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔ پرنسپل نے اسے مثال کے رویے کے بارے میں کچھ بتانے کی کوشش کی تھی مگر وہ تشویش کے عالم میں اس آفس سے نکل کر مثال کے پاس آ گئی تھی وہ ایک دوسرے آفس میں بیٹھی تھی، اس نے ماں کو ایک نظر دیکھا تھا لیکن پھر اسی طرح سر جھکا لیا جیسے اس نے پہلے جھکایا ہوا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اس نے اسے گلے لگایا تھا مثال نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ گم صم تھی، شہر بانو کو لگا وہ شاک میں تھی وہ اسے لے کر گھر آ گئی۔

ایرک چند مہینے پہلے ہی اس کے اسکول میں آیا تھا اور مثال مسلسل اس سے اس کا ذکر کر رہی تھی اور یہ بے حد Unusual تھا کیونکہ مثال بہت کم اس طرح اسکول کے کسی ٹیچر کی تعریف یا باتیں کرتی تھی اور اب وہی ایرک اس کی زندگی تباہ کر دینے کا سبب بنتے بنتے رہ گیا تھا۔

وہ رات شہر بانو کی زندگی کی ایک اور مشکل راتوں میں سے ایک تھی۔ وہ ایک چیز جس کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا وہ اس رات جا کر اس نے بالآخر تسلیم کر لی تھی۔ وہ بھی تب جب وہ ماں کے طور پر اس anguish سے گزری تھی، پہلی بار زندگی میں اس نے مان لیا تھا کہ اس کے پاپا نے عکس مراد علی کے ساتھ زیادتی کی ہوئی تھی۔ وہ اس کی زندگی کے ہیرو اور فرشتے تھے۔ عکس مراد علی کی زندگی کے ولن تھے...... اور عکس مراد علی نے ان پر جو الزام لگایا تھا وہ ناقابلِ یقین سہی لیکن ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ اس رات پہلی بار اس نے آئینے میں حقیقت اور سچ کا وہ چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی جو وہ ہمیشہ جھٹلاتی رہی تھی...... شرمین کے انکشافات کے باوجود بھی...... پہلی بار اس نے اپنے باپ کی بیٹی بن کر نہیں صرف غیر جانبداری سے سوچا تھا اور وہ اپنے آپ سے نظریں نہیں ملا سکی تھی اور شاید یہی وہ احساس تھا جس سے بچنے کے لیے وہ اتنے سالوں سے اپنے باپ کو مجرم ماننے سے انکار کر رہی تھی...... وہ اسے مجرم مان لیتی تو وہ ایک شخص بھی اس کی زندگی کی اس فہرست سے غائب نہ ہو جاتا جسے اس نے آئیڈیل کا درجہ دیا ہوا تھا...... اور زندگی میں ایک آئیڈیل کو انسانیت سے گرتے دیکھنا انسان کی ساری قدریں بھلا دیتا ہے خاص طور پر تب جب وہ آئیڈیل ایک خونی رشتہ بھی ہو۔

☆☆☆

''شہر بانو نے فون کیا تھا مجھے...... وہ پاکستان آ رہی ہے۔'' شیر دل ڈنر پر اس رات عکس کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔

''تمہیں فون کیا تھا......؟ اکیلی آرہی ہے؟''

''ہاں...... مشال کو لے کر آرہی ہے، مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''کس لیے......؟''

''پتا نہیں...... مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی......'' وہ دونوں ہی کچھ حیران اور الجھے ہوئے تھے۔ عکس نے شیر دل سے یہ بات شیئر نہیں کی لیکن پتا نہیں کیوں اسے یہ لگا تھا جیسے شہر بانو، مشال کو اس کے پاس چھوڑنے کے لیے آرہی تھی۔ شاید وہ دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھی اور مشال کی وجہ سے اسے کسی پریشانی کا سامنا تھا اس لیے اس نے اسے شیر دل کو دے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ عکس سوچ رہی تھی اور وہ تب تک یہ سارے اندازے لگاتی رہی جب تک شہر بانو ان کے گھر آنہیں گئی۔

پہلی نظر شہر بانو پر ڈالتے ہی اس کو شاک لگا تھا۔ دس بیس سال نہیں گزرے تھے بس پانچ سال ہی تو گزرے تھے مگر وہ اپنی عمر سے کئی سال بڑی لگنے لگی تھی۔ تھکن اور شکستگی جیسے اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ عکس کو اسے دیکھ کر تکلیف ہوئی تھی۔

''تم نہیں ملو گے اس سے؟'' اس نے پچھلی رات شیر دل سے پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''ملنا چاہیے۔''

''کیا کروں گا؟'' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور ٹھیک کر رہا تھا کہ اس سے ملنے کے لیے وہاں نہیں تھا۔ عکس نے سوچا تھا شہر بانو کے لیے اس گھر میں اسے اور شیر دل کو ایک جوڑے کے طور پر دیکھنا بہت تکلیف دہ ہوتا۔ کسی کے لیے بھی ہوتا...... اور شیر دل کے لیے ان دونوں عورتوں کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھنا بہت آکورڈ ہو جاتا۔

عکس کا اندازہ ٹھیک تھا وہ مشال کو مستقل طور پر وہاں چھوڑنے آئی تھی اور وہاں آنے کے چند منٹوں بعد ہی اس نے عکس کو یہ بتا دیا تھا۔

''کل واپسی کی فلائٹ ہے میری...... بس رک نہیں سکتی، میں چاہتی تھی کہ مشال کو خود یہاں چھوڑ جاؤں۔'' عکس نے اسے رکنے کے لیے کہا تھا اور اس نے جواباً کہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت لان میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ان سے کچھ فاصلے پر مشال، طغرل اور بازل کے ساتھ بڑے جوش و خروش کے عالم میں کھیل رہی تھی۔ وہ ایک happy family تھی جس کا شہر بانو حصہ نہیں تھی۔ شہر بانو نے ایک لمحے کے لیے ان سب کو دیکھتے ہوئے سوچا اور کم از کم اب اس کی زندگی اس تنہائی میں نہیں گزرے گی جس میں اس کا اپنا بچپن گزرا تھا۔

''کل رات کی فلائٹ ہے...... تم اگر کل دوپہر کو بھی نکلو تو بہت آرام سے پہنچ سکتی ہو...... لاہور زیادہ دور تو نہیں ہے یہاں سے۔'' عکس نے اس کے آج ہی واپس جانے کے ارادے کو جان کر کہا۔ ایک عجیب سے آکورڈ کیفیت کا شکار تھیں وہ دونوں اس وقت...... بات کرنے میں جھجک ہو رہی تھی۔ خاموش بیٹھے رہنے میں شرمندگی۔

''مشال یہاں رہے گی تو تم اکیلے امریکا میں کیسے رہو گی؟'' عکس نے اس سے پوچھا۔ یہ اندازہ کر لینے کے باوجود کہ وہ مشال کو اس کے پاس چھوڑ دینے کے ارادے سے آرہی تھی۔ حیران تھی کہ شہر بانو نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا۔

''میں اور مشال ایک ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ ہم دونوں ساتھ رہتے ہوئے بھی اکیلے ہیں۔ مجھے اس زندگی کی عادت ہو گئی ہے لیکن میں نہیں چاہتی مشال کو اس زندگی کی عادت ہو۔ میں چاہتی ہوں وہ شیر دل کے پاس رہے۔ اس کے پاس پلے بڑھے۔'' شہر بانو نے مدھم آواز میں کہا۔ وہ اب بھی اسے وہ وجہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی جس نے اسے اتنا بڑا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ ایک غیر ذمے دار ماں ہے جو ایک بچی کی بھی حفاظت نہیں کر سکتی...... اور مشال کے ساتھ آئندہ کچھ برا نہ ہو اس خوف نے اسے مشال کو شیر دل کے پاس لانے مجبور کر دیا تھا۔

''میں تم سے معافی بھی مانگنا چاہتی تھی۔'' عکس اس کی بات سنتے سنتے اس کے جملے پر چونک پڑی۔

''مجھ سے معافی...... کس چیز کی؟'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

بہت دیر خاموش رہنے اور کچھ کہنے کی ہمت جمع کرنے کے بعد اس نے بالآخر عکس سے کہا۔

''پاپا نے جو کچھ کیا تھا بہت غلط کیا تھا...... بہت غلط...... am sorry for what he did to you۔'' (جو کچھ انہوں نے کیا میں اس پر معافی چاہتی ہوں) زندگی عجیب شے ہے بعض دفعہ وہ باتیں ان سے کہلواتی ہے جن سے آپ کو کبھی وہ سننے کی توقع تک نہیں ہوتی۔ عکس اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی جس کی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اٹک اٹک کر زبان سے کی گئی معذرت سے زیادہ مؤثر اس کی آنکھوں اور چہرے پر تحریر شرمندگی اور ندامت کا احساس تھا۔

عکس نے خود پر قابو پا لیا تھا وہ یہاں لان میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا نہیں چاہتی تھی بہت نرمی سے اس نے شہر بانو کے اپنی کے ہاتھے پر دھرے ہاتھ کو تھپکا۔

''وہ سب گزر گیا...... بہت عرصہ ہو گیا۔ میں نے اب اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہی کسی معذرت کی۔ اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔''

''ہاں لیکن میں اس فیملی کا حصہ ہوں اور اس حوالے سے اپنے رول پر شرمندہ ہوں۔ صرف پاپا نے تمہیں تکلیف نہیں پہنچائی میں نے بھی......'' شہر بانو بات کرتے کرتے رک گئی تھی۔

''تمہاری فیملی نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی لیکن تمہاری ممی نے میرے نانا کی مالی مدد بھی کی تھی اس وقت جب ہم مالی طور پر بالکل تباہ ہو چکے تھے۔'' اس نے جیسے شہر بانو کا احساس جرم کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ایک لاکھ کی وہ رقم جو انہوں نے میرے نانا کو دی تھی۔ انہوں نے اسی رقم سے اپنی اور میری زندگی دوبارہ بنائی تھی۔''

شہر بانو نے کچھ الجھتے ہوئے اسے بات جاری رکھنے سے ٹوک دیا۔

''ممی نے تمہارے نانا کو کوئی رقم نہیں دی تھی۔ وہ چیک لے کر گئی تھیں اور انہوں نے تمہارے نانا کو وہ رقم لینے پر مجبور کیا تھا لیکن انہوں نے وہ رقم نہیں لی تھی۔ ممی نے مجھے خود بتایا تھا۔'' عکس چند لمحے پلکیں جھپکائے بغیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ خیر دین کی زندگی کا پہلا جھوٹ تھا اس سے اور وہ جھوٹ بھی کس جگہ آکر کھلا تھا۔ وہ اسے شہر بانو کی ماں کا احسان مند کر کے شہر بانو کا گھر توڑنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چڑیا کے گرد احسان کی لکشمن ریکھا کھینچی تھی کیونکہ اسے یقین تھا وہ احسان فراموشی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس شخص کی بیٹی کا گھر اور زندگی بچانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے خود اس کی اور اس کی چڑیا کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ وہ کیسا انسان تھا۔ عکس بہت دیر تک چپ رہی، تھی سلجھانے میں اسے چند سیکنڈز لگے تھے لیکن اس کیفیت سے نکلنے کے لیے بہت دیر...... وہ جو ایک بوجھ اس کے نانا نے اس کے کندھوں پر رکھ کر اسے جھکایا تھا وہ اس انکشاف نے اٹھا لیا تھا۔ کیسا سکون اور اطمینان تھا جو عکس مراد علی نے محسوس کیا تھا۔

''Thank you۔'' اس نے شہر بانو سے کہا۔

''کس چیز کے لیے؟'' وہ الجھی۔

''ایک بوجھ ہٹا لینے کے لیے۔''

☆☆☆

شیر دل کو لگا عکس کا دماغ خراب تھا۔

''اب تم یہ مت کہنا کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' اس نے شیر دل کو جیسے کسی کتاب کی طرح پڑھا تھا۔ مشال کو پاکستان میں دو ہفتے ہو چکے تھے۔ شیر دل اتنے سالوں بعد اپنی بیٹی کے اپنے پاس آجانے پر بے حد خوش اور پُرسکون تھا۔ اسے لگا تھا زندگی ایک بار پھر سے مکمل ہو گئی تھی اور اب اچانک اس رات عکس نے اس سے یہ بات کہہ دی تھی۔

''اگر یہ مذاق ہے تو بیہودہ مذاق ہے۔'' شیر دل نے کچھ خفا ہو کر اس سے کہا تھا۔

''میرا سینس آف ہیومر برا ہے لیکن اتنا برا بھی نہیں کہ میں اس طرح کی باتیں مذاق میں کرنے لگوں۔'' عکس نے جواباً بہت سنجیدگی سے کہا۔

''میں شہر بانو سے شادی کر لوں؟'' شیر دل نے بے یقینی سے اس کے جملے کو دہرایا۔

''ہاں۔'' اس کے انداز میں اطمینان تھا جس نے شیر دل کو ہلا دیا۔

''میں ساری زندگی بس یہی کرتا رہوں کہ ہر چار پانچ سال بعد شادی...... تم سمجھتی ہو شادی کے علاوہ میرے پاس کرنے کے لیے اور کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے نہیں پتا تمہیں بیٹھے بٹھائے شہر بانو سے ہمدردی کا دورہ پڑا ہے یا کوئی اور وجہ ہے

لیکن مجھے اس طرح کی مصیبت اپنے گلے میں ڈالنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تمہیں شہر بانو نے ایسا کچھ کہا ہے؟'' شیر دل اس کی بات پر بری طرح مجھے سے اکھڑا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ پاکستان سے جانے کے بعد بھی شہر بانو اور عکس آپس میں رابطے میں نہیں تھیں اور یہ روز روز کا رابطہ اس کے لیے غیر متوقع یا حیران کن تھا۔ لیکن اس کا خیال تھا اس کی وجہ صرف مثال تھی اور کچھ نہیں۔

''مجھے شہر بانو نے کچھ نہیں کہا۔'' عکس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

''پھر؟''

''میں صرف تمہاری بیٹی کی زندگی بچانا چاہتی ہوں۔'' وہ اس کی بات پر بری طرح ٹھٹکا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ مثال کو کیا ہوا ہے؟ وہ میرے پاس ہے...... بہت خوش اور مطمئن ہے۔'' وہ عکس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔

عکس کچھ کہنے کے بجائے کمرے میں پڑا ہوا اپنا لیپ ٹاپ اٹھا لائی تھی۔ اس نے فیس بک کھولی، وہ مثال کی آئی ڈی تھی وہ عکس کا لیپ ٹاپ استعمال کرنے کے بعد سائن آؤٹ کرنا بھول گئی تھی۔ عکس نے اس کی سینٹ ای میل کھولی۔ وہ بہت ساری میلز سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں سے زیادہ بڑی تعداد ارک ٹموتھی کے نام تھیں اور کچھ دوسرے مردوں کے نام جو سب بڑی عمر کے مرد تھے، انہیں پڑھتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ شیر دل کی گود میں رکھ دیا، وہ الجھے ہوئے انداز میں ان ای میلز کو دیکھنے لگا۔

وہ ایک گیارہ سالہ لڑکی کی زندگی کے demons تھے۔ سوشل نیٹ ورک اور اپنے آس پاس کے لوگوں میں اپنے لیے ایک باپ جیسے شخص کی تلاش کی کوشش...... اس بے لوث پدری محبت کی تلاش کی کوشش جس کے لیے وہ کچھ بھی کرنے پر تیار تھی۔ کسی بھی حد تک جانے پر تیار تھی۔ وہ محبت' باپ کی محبت اور exploitation میں فرق نہیں کر پا رہی تھی۔ ان مردوں کو لکھی ہوئی ہر ای میل کے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں صرف ایک ہی پکار تھی۔ ''مجھے بچالیں...... مجھے بچالیں۔'' وہ ان تمام بڑی عمر کے مردوں کو بتا رہی تھی کہ وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتی تھی اور وہ ان کی سویٹ ہارٹ، ہنی، ڈارلنگ کے القابات میں چھپی ہوئی ہوس کو بھی شیر دل کی اپنے لیے محبت کے برابر لا کر کھڑا کر رہی تھی۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا...... وہ اپنی ممی کے پاس رہتی ہے جس کے پاس اس کے لیے وقت نہیں اور وہ اس سے نفرت کرتی تھی...... اور اس طرح اس کی پاپا کی زندگی میں آنے والی ایک witch (چڑیل) نے ان کا خوب صورت گھر توڑ دیا تھا۔ وہ اب شیر دل سے بھی نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ طغرل اور باذل سے اس سے زیادہ محبت کرتا تھا اور اس نے اس کی ممی کو چھوڑ دیا تھا۔ ان ای میل میں یہ بھی لکھا تھا کہ وہ کئی بار شہر بانو کو راتوں کو روتے دیکھتی تھی اور وہ اس گھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی کیونکہ وہ ممی کے لیے کچھ نہیں کر سکی لیکن وہ ممی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی اور وہ سوچتی تھی probably اگر ممی کو ایک اچھا آدمی مل جائے جو ممی اور اس سے دونوں سے پیار کرے تو وہ بھی ایک اچھا گھر بنا سکتے ہیں...... جیسے شیر دل اور عکس اور طغرل اور باذل کا تھا۔

عکس نے اس دن مثال کے laptop استعمال کرنے کے بعد اتفاقاً ای میل کرنے کے لیے laptop اٹھایا تھا اور وہ id facebook سامنے آجانے پر غیر ارادی طور پر اس کی ای میلز پڑھنے لگی تھیں۔ وہ ای میلز نہیں تھیں، مثال کی زندگی کا جہنم تھا جسے اسے دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ ایک گیارہ سالہ بچی جو اپنے ماں باپ کی طلاق کے بعد ان دونوں سے love-hate ریلیشن شپ میں تھی اور جو ان لوگوں سے اپنی تکلیف شیئر کر رہی تھی جو اسے fatherly, loving and kind لگ رہے تھے اور وہ ان کی توجہ اور محبت پانے کے لیے ان کے ساتھ رہنے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی جو وہ چاہتے تھے۔ عکس کسی بت کی طرح ماؤف ذہن کے ساتھ ان مردوں کی ای میلز پڑھ رہی تھی...... گویا گدھوں کی ای میلز جو ایک گیارہ سالہ بچی کے ذہن، شخصیت اور زندگی کو اپنی شہوت اور ہوس بھرے الفاظ اور ذہنی گندگی کے نوکیلے پنجوں سے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے جو اس بچی کو بتا رہے تھے کہ وہ اسے باپ جیسی محبت دیں گے اور اس کی ممی کے ساتھ مل کر رہ بھی سکتے ہیں لیکن اس کے بدلے وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ وہ...... عکس بہت ساری ای میلز مکمل پڑھ بھی نہیں سکی تھی، اسے لگا وہ غلاظت اور گندگی کے ڈھیر پر بیٹھی تھی۔ باہر کی کوئی غلاظت اور تعفن انسان کے ذہن کے اندر موجود غلاظت اور تعفن کا مقابلہ نہیں کر سکتا، عکس کو بھی یہی لگا تھا وہ بھی غلاظت کے ایسے ہی تعفن زدہ ڈھیروں کو دیکھ رہی تھی جو معاشرے کے اچھے اور فعال شہریوں کے طور پر بہ ظاہر اپنی اپنی زندگیاں دوسروں کی زندگیوں کے پرخچے اڑا کر گزار رہے تھے۔ digital کیمرے سے بنائی ہوئی وہ تصویریں اس نے پتے کی طرح لرزتے وجود کے ساتھ ان ای میلز سے delete کر دی تھیں جو ان میں سے چند لوگوں کے مطالبے پر گیارہ سال کی اس بچی نے ان کو بھیجی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی شیر دل ان تصویروں کو دیکھے، ایک باپ کے طور پر وہ ان تصویروں کو دیکھ کر شاید دوبارہ کبھی سر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ انہی ای میلز میں سے ایک ای میل میں ارک کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کی تفصیلات بھی تھیں جو مثال نے انہی میں سے کسی دوسرے مرد سے شیئر کی تھیں۔ وہ ایڈگر نامی اس دوسرے شخص کی جوابی ای میل پوری نہیں پڑھ سکی تھی۔ وہ بچی اور اس کی تکلیف ان سب مردوں کے لیے فٹ بال کا کام کر رہی تھی...... یا شاید ایک رولنگ اسٹون......

مثال کی زندگی میں چڑیا کی طرح سات دوست بونے نہیں تھے جن کے لیے وہ اسنو وائٹ تھی۔ اس کی زندگی میں چند گدھ تھے جن کے سامنے وہ ایک مردار سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

عکس نے ای میلز پڑھنی بند کر دیں۔ وہ اس جہنم سے گزری تھی، اس درد سے واقف تھی جس جہنم کی لپیٹ میں اس نے مثال کو دیکھا تھا...... اور اسے لگا اس کا وجود ایک بار پھر جلنے لگا تھا۔ وہ بھی تو شہباز حسین کی طرف اسی لیے جاتی تھی کیونکہ وہ اس کی، شرمین اور شہر بانو کی زندگی کا حصہ بننا چاہتی تھی۔ اس پرفیکٹ لائف کا حصہ جسے وہ ہر روز لان میں اور اس گھر میں دیکھتی تھی...... وہ بھی کہیں نہ کہیں شہباز حسین میں وہ باپ دیکھتی تھی جو اگر اس کے اور حلیمہ کے ساتھ ہوتا تو وہ

اسے بھی بہت پیار کرتا۔ ویسے ہی ہوا میں اچھالتا جیسے شہباز باربی ڈول کو اچھالتا تھا ویسے ہی اٹھائے پھرتا جیسے وہ اس کو اٹھائے پھرتا تھا اس کی امی کے لیے ویسی ہی چیزیں لاتا جیسی وہ شرمین کے لیے لاتا تھا۔ خیر دین نے بہت ساری کمیاں پوری کی تھیں لیکن وہ بہت ساری خواہشوں کو حسرت میں بدلنے سے نہیں روک سکا تھا۔

ہر بار جب شہباز حسین اسے ذرا سی بھی توجہ دیتا تو چڑیا خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی اور خیر دین کو اس کا احساس تھا لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ شہباز حسین، چڑیا کے لیے کیا ہوتا جا رہا تھا۔

اس رات بھی یہی ہوا تھا شہباز کے لہجے کی نرمی اور اس کی توجہ کو وہ ویسی ہی محبت سمجھی تھی جیسی وہ شہر بانو سے کرتا تھا۔ وہ وہاں سے وقت پر بھاگ سکتی تھی اگر وہ اس کو باپ جیسا نہ سمجھ رہی ہوتی۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہوتا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا...... عکس بلک بلک کر روئی تھی۔ یہ کام اس نے پہلی بار کیا تھا۔ وہ دام جس میں وہ آئی تھی، اس میں کسی اور کو آتے دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی زندگی میں خیر دین آ گیا تھا، وہ بچ گئی تھی...... لیکن مثال کی زندگی میں کوئی خیر دین نہیں تھا، وہ اس کے لیے شہباز کی 'نواسی' نہیں تھی، شیر دل کی بیٹی تھی۔ چیس کی بساط پر موجود بادشاہ جس کی طاقت محدود تھی اور وہ کمزور تھا لیکن کوئین کمزور نہیں تھی اور وہ بہت طاقتور تھی...... وہ بادشاہ کو چیک میٹ ہونے سے بچانے کے لیے ہر چال چل سکتی تھی۔

''شہر بانو سے کچھ مت کہنا اس سب کے بارے میں...... میں اور تم پہلے بھی الگ الگ جگہوں پر پوسٹڈ ہیں اب بھی الگ رہ سکتے ہیں' تم شہر بانو کو اپنے پاس رکھو تب تک جب تک مثال بڑی نہیں ہو جاتی اس عمر سے گزر جائے پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔''

وہ اب بت بنے شیر دل کے بازو پر ہاتھ رکھے اس سے کہہ رہی تھی۔ وہ شیر دل کی تکلیف کو سمجھ پا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آج اسے خیر دین کا چہرہ نظر آیا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ خیر دین کے چہرے پر اسے کبھی شکست نظر نہیں آئی تھی جو شیر دل کے چہرے پر نظر آئی تھی۔

''ابھی سب کچھ بچ گیا ہے شیری...... ابھی کچھ بھی نہیں گیا۔'' اس نے شیر دل کا بازو دبایا تھا، شیر دل نے اس ملکہ کو دیکھا جو بادشاہ کو بچانے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ رہی تھی۔

''کوئین ہر جگہ جا سکتی ہے، ہر چال چل سکتی ہے، اسی لیے کوئین میرا فیورٹ چیس پیس ہے۔''

اسے یاد آیا تھا اس نے گرمیوں کی ان چھٹیوں میں پہلی بار چڑیا کے ساتھ چیس کھیلنے کے لیے چیس بورڈ سیٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''کوئین کی طرح کوئی نہیں، کوئین، کوئین ہوتی ہے اور اس کو knight کی طرح کا کوئی کام نہیں کرنا پڑتا...... but she is still powerful کیونکہ وہ کنگ کی وائف ہوتی ہے اور بادشاہ اس سے محبت کرتا ہے۔''

''لیکن میں ایک ایسی گیم بناؤں گی بڑی ہو کر جس میں کوئین ہی کنگ ہوگی جب وہ زیادہ powerful ہے تو بورڈ بھی کوئین کا ہونا چاہیے کنگ کا نہیں۔'' چڑیا نے جواباً اس سے کہا تھا اور اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ وہ زندگی کے اس کھیل میں کوئین ہوتے ہوئے بھی بادشاہ بن گئی تھی...... بورڈ بھی اس کا تھا، مہرے بھی، پاورز بھی...... نام بھی......

وہ خیر دین کی نسل میں سے تھی اور اس کے جینز میں خیر کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا۔

ایک شیر دل نے زندگی میں کبھی اس عورت کی برتری کو تسلیم نہیں کیا تھا...... وہ آج کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

طغرل نے ہاتھ میں پکڑی ڈور کو جھٹکا دیا۔ مثال نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی اس پتنگ کو اچھال کر ہوا میں چھوڑا۔ باذل نے بے حد خوشی سے ایک چیخ مارتے ہوئے جیسے اپنے بڑے بہن، بھائی کی مہارت کو داد تحسین دیتے ہوئے فضا میں بلند ہوتی ہوئی پتنگ کو فخریہ انداز میں دیکھا، اس کے ہاتھ میں ڈور والی چرخی تھی جو وہ ان دونوں کے لاکھ منع کرنے

کے باوجود چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

برآمدے کی قدِ آدم کھڑکی کے سامنے کھڑے شیر دل نے لان میں ایک پتنگ کو بلند سے بلند کرنے کی سر توڑ جدوجہد میں مصروف اپنے تینوں بچوں کو مدھم مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں شیر دل کی پوسٹنگ کے دوران وہاں آئے تھے۔ عکس اسلام آباد میں کسی کانفرنس میں مصروف تھی اور اسے ایک ہفتے کے بعد وہاں سے فارغ ہونا تھا ابھی کچھ دیر پہلے وہ فون پر اس سے بات کر رہا تھا اور وہ چند منٹ پہلے ہی فون رکھ کر باہر آیا تھا جب شام کو ٹینس کھیلنے کے لیے جاتے جاتے وہ ان لوگوں کو دیکھ کر رک گیا تھا۔

''تم نے جانا نہیں؟'' شہر بانو کی آواز نے اسے چونکایا تھا، وہ شاید لان میں بچوں کے پاس جانے کے لیے نکلی تھی۔

''جا رہا تھا بچوں کو دیکھ کر رک گیا۔'' اس نے پلٹ کر شہر بانو کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ بھی اس کے قریب آ گئی اور باہر دیکھنے لگی۔

''طغرل کائٹ فلائنگ میں ایکسپرٹ ہوتا جا رہا ہے۔'' اس نے فضا میں بلند اس پتنگ کو مہارت سے اڑاتے ہوئے طغرل کو دیکھ کر ستائشی انداز میں شیر دل سے کہا۔

''ہاں بیٹا کس کا ہے۔'' شہر بانو اس کی بات پر مسکرا دی۔

''عکس کا۔'' وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔

''میں ذرا باہر جا رہی ہوں، باذل کو کیوں نہیں پکڑا رہے یہ دونوں پتنگ...... وہ بے چارہ کس طرح بار بار کہہ رہا ہے...... یہ ہمیشہ اس کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں۔'' وہ کھڑکی سے باہر پتنگ پکڑنے کے لیے ان دونوں کے پیچھے بھاگتے باذل کو دیکھ کر پھر بے چین ہوئی تھی۔ شیر دل کے کچھ کہنے سے پہلے وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئی تھی۔ وہ تب بھی وہیں کھڑا رہا۔

کئی سالوں کے بعد بالآخر ان سب کی زندگی میں وہ مدوجزر اور تلاطم ختم ہو گیا تھا جو انہیں گرداب کی گردش بنائے ہوئے تھا۔ باذل، شہر بانو کو باہر آتے دیکھ کر اس کی طرف شکایت کرنے کے لیے بھاگ پڑا تھا۔ وہ اب ان کے درمیان صلح صفائی کروانے میں مصروف تھی۔ پتا نہیں کس بے دھیانی میں پتنگ طغرل کے ہاتھ سے چھوٹی تھی یا ڈور کہیں سے ٹوٹ گئی تھی شیر دل نے ان سب کو پتنگ کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش میں بھاگتے دیکھا صرف شہر بانو تھی جو باذل کو اس باڑ سے کودنے سے بچا رہی تھی جس پر سے اگر وہ کودتا تو بری طرح گرتا۔

پتنگ کو بالآخر انہوں نے لان میں سے باہر جانے سے پہلے ہی دوبارہ پکڑ لیا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی بہت بلند نہیں تھی۔

زندگی اور پتنگ بعض دفعہ انسان کو ایک ہی طرح خوار کرتے ہیں۔ ایک ہی طرح fantacise کرتے ہیں...... ایک ہی طرح اپنے پیچھے دوڑاتے ہیں...... ایک ہی طرح خوشی سے پاگل کرتے ہیں اور ایک ہی طرح مایوس کرتے ہیں...... لیکن نہ پتنگ کو کوئی آسمان میں اڑنے سے روک سکتا ہے نہ زندگی کو چلنے سے۔

شیر دل نے اپنے سیل فون پر لان میں ہونے والی اس اچھل کود کو capture کیا اور اسے عکس مراد علی کو MMS کر دیا......

ایک smiley کے ساتھ جواب فوراً آیا تھا۔ "My clan"۔

شیر دل ٹیکسٹ پڑھتے ہوئے مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

(ختم شد)

معزز قارئین! عمیرہ احمد کے اس ناول کے بارے میں اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہو یا آپ کوئی بات جاننا چاہیں تو بذریعہ خطوط پوچھ سکتے ہیں۔ ہمیں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

(مدیرہ)